اُسوۃ الرّسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اوّل

تالیف

مورخِ اسلام علامہ

سید اولاد حیدر فوق بلگرامیؒ

تلخیص و تصحیح

مولانا الیاس رضا یزدانی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُسوۃ الرّسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اوّل

مصنف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مؤرخِ اسلام علامہ سید اولاد حیدر بلگرامیؒ

تلخیص و تصحیح ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مولانا الیاس رضا یزدانی

ترتیب و تنظیم نو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قلب علی سیال

کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)

سال اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 2011

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ تین جلد مکمل سیٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 1500 روپے

ہدیہ تین جلد گفٹ پیک بکس ۔۔۔۔۔۔۔ 1800 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے سید سہیل حیدر رضوی صاحب نے تعاون فرمایا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے قرآن کریم اور دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اُسوۃ الرسولؐ سلطان الانبیاء خاتم النبیین، سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر تقریباً ایک صدی قبل مؤرخِ اسلام علامہ سید اولاد حیدر فوق بلگرامی کی تصنیف و تالیف ہے۔ تنقیدی و تحقیقی اعتبار سے ایسی لاجواب کتاب ہے۔ جس میں تاریخ عرب، خاتم النبیین کے عظیم آباؤ اجداد کے حالاتِ زندگی اور آخر میں سیرتِ سید المرسلینؐ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف کا اپنا ایک خاص اسلوب بیان، طرزِ قلم و وجدان ہے۔ جسے خاطر خواہ برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ کتاب کے پرانے پرنٹ شدہ نسخہ میں کتابت کی متعدد اغلاط موجود تھیں۔

لہٰذا کتابت کی اغلاط کی درستگی اور محاورات و فقرہ بندی کی تصحیح کے لئے ٹرسٹ نے مولانا عابد عسکری کا انتخاب کیا اور انہیں کثیر رقم بطور حق زحمت ادا کردی۔ مگر مولانا موصوف کتاب میں موجود اغلاط کی خاطر خواہ درستگی کرنے میں ناکام رہے۔ کتاب کی کمپوزنگ مکمل ہونے کے بعد بمطابق وعدہ مولانا موصوف نے پروف ریڈنگ مکمل کرنی تھی۔ لیکن حالات واضح طور پر پروف ریڈنگ میں مزید تاخیر کا اشارہ دے رہے تھے۔ چونکہ ٹرسٹ نے ماہ رمضان المبارک میں کتاب کی اشاعت کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔ لیکن کتاب کی اشاعت کی تکمیل کا مرحلہ بوجہ مولانا موصوف مکمل ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ درج بالا تاخیری وجوہات کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹرسٹ نے کتاب کی تلخیص و پروف ریڈنگ کا کام قلب علی سیال کی مشاورت سے مولانا الیاس رضا یزدانی کے حوالے کردیا۔ لیکن ماہِ رمضان المبارک میں مولانا موصوف بھی اپنی ناگہانی مصروفیات کی وجہ سے بروقت کتاب نہ دے سکے۔

یوں کتاب ہذا کی اشاعت میں تاخیر در تاخیر کا سلسلہ طول پکڑتا گیا۔ بلاشبہ کتاب کی تاخیر میں قلب علی سیال کی غفلت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کتاب کی تصحیح و پروف ریڈنگ میں کئی ماہ لگ گئے۔ بالآخر ماہ ذیقعد میں کتاب کی پہلی جلد کی تصحیح و پروف ریڈنگ مکمل ہوئی۔ جس کی اشاعت مکمل ہونے کے بعد کتاب ''اُسوۃ الرسولؐ جلد اوّل'' آپ کے ہاتھ میں موجود ہے۔ امید ہے آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

حرفِ مصنف بقلمِ مصنف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَصلیّٰ اللّٰہُ علی مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَخَاتِمَ النبِیِّیۡنَ وَاٰلِہٖ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡن۔

میرے سلسلہ سوانحات حضرات چہاردہ معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین کی یہ آخری کتاب ہے اور ایسی آخری ہے جو ظاہر میں آخر اور حقیقت میں اول ہے اس لئے کہ یہ سیرۃ الرسول ﷺ ہے جو سابق اجزائے سیزدہ گانہ کی اصل الاصول۔ آخر اس لئے کہ سب سے آخر میں لکھی گئی ہے۔ اور نیز اس رعایت خاص سے کہ ختم الرسل اور نبی آخرالزمان کے حالات میں صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ جن کی ذات قدسی صفات منازل رسالت کی مکمل اور مناصب نبوت کی متمم ثابت ہو چکی ہے۔

وجہ تاخیر

ایسے متمم رسالتؐ کے حالات وواقعات کی تحقیق تفصیل اور تشریح کیلئے مؤلف کو کلی جمعیت اور انتہائی ہمت سے کام لینا ہے میری سابقہ تالیفات اسی کل کی جزئیات تھیں اور اسی اصل کی فروعات جن میں سوائے اندرونی پیچیدگیوں کے بیرونی مشکلات کی تنقید و تفصیل اور جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے ان کی تدوین و ترتیب کے منازل و مراحل بالتدریج و ترتیب پہلے طے کر لئے گئے اور اُن سے کلی فراغت اور خاطر خواہ جمعیت حاصل کر کے اُسوۃ الرسول ﷺ کی مبارک تدوین سے سعادت اندوز ہونے کی کوشش کی گئی۔

ترتیب تالیف میں تقدیم و تاخیر کا الزام تنہا مجھ پر عائد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مجھ سے اکثر اصحاب سیر و تاریخ اور ارباب تحقیق نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، میری اس کتاب میں میرے مخاطب اصلی شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

> ''میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا۔ مگر یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔''

یہ عبارت لکھ کر گویا شبلی صاحب نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ بلفظہ اور بجنسہ میری تاخیر اور عدم تحریر سیرۃ نبویؐ کیلئے بھی یہی مجبوریاں سمجھی جائیں۔ ممکن تھا کہ ابھی اور تاخیر ہوتی۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ تمام سرتین علی الترتیب تمام ہو چکی تھیں اور ایک یہی باقی تھی۔ دوسری یہ کہ شبلی صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی اشاعت، اسکی مبہم، مجمل، غیر مفصل اور نہ مکمل صورت نے میری کتاب کی تالیف میں ایسی عجلت

پیدا کر دی کہ پھر میں اپنے اس قصد وارادے کو ذرا بھی نہ روک سکا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں ان دنوں اپنی کتاب الزہرا سلام اللہ علیہا تمام کر کے اس کا دیباچہ لکھ رہا تھا۔ جس کو میں نے فوراً متروک وموقوف کر دیا۔ اور بالآخر میری وہ کتاب بغیر کسی دیباچہ اور مقدمہ ہی کے چھپ گئی ۔ یہ میں نے گوارا کر لیا مگر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرۃ کی تالیف وترتیب سے پھر ایک دم کیلئے بھی غافل نہ ہوا۔

عجلت کی ضرورت

اس عجلت کی کیا ضرورت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بالکل اچھوتی طرز کی سیرت نے شائع ہو کر عموماً قوم وملت میں اور خصوصاً قومِ شیعہ کی جمعیت میں وہی کیفیت پیدا کر دی جو سر ولیم میور صاحب کی لائف آف محمدؐ کی اشاعت نے آج سے پچاس برس پہلے پیدا کر دی تھی، جس کو سر سید احمد خان نے مفصل ذیل عبارت میں قلمبند فرمایا ہے۔

> ''جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو لوگوں نے نہایت ذوق وشوق سے پڑھا۔ مگر جب ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرتؐ کے حالات کی نہابت سدھی، سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے اسی سطح پر اس کتاب کا لکھنا مقصود اور مرکوز خاطر تھا تو ان کا وہ شوق وذوق بالکل ٹھنڈا پڑ گیا مگر جو نوجوان طالب علم، علم انگریزی کی تحصیل کرتے تھے اور اپنی دینیات سے محض ناواقف تھے ان میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگرچہ سر ولیم میور صاحب نے سیدھی، سادی اور صاف باتوں کو بھی بڑے پہلو پر لے جا کر لکھا ہے تو فی الواقع ان کی اصلیت کیا ہے خطبات احمدیہ، دیباچہ، ص18، مطوعہ لاہور۔''

شبلی صاحب کی سیرۃ النبیؐ کی بھی بجنسہ یہی کیفیت ہوئی، یہ کتاب والیان ملک کی فیاضانہ امداد سے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی۔ لوگوں نے بڑے اشتیاق سے خریدا۔ مگر جب کتاب پڑھی تو معلوم ہوا ؎

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

پھر تو قوم وملت کے ہر ہر فرقے اور ملک ووطن کے ہر ہر گوشے سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ: شبلی صاحب نے۔۔۔۔۔۔

(ا)۔ اگر راہب بحیرہ کی بشارت آنحضرتؐ کو جھٹلایا۔

(۲)۔ آنحضرتؐ کا اہل مکہ کی بکریاں اُجرت ومزدوری پر چرانا قبول کر لیا۔

(۳)۔ آنحضرت صلعم کی قبل بعثت ہی سہی، عرب کی قدیم داستان گویوں کی فضول صحبت میں رات بھر بیٹھنا۔

(۴)۔ ایک بار انہیں صحبتوں میں جاتے ہوئے راہ میں ایک شادی کے جلسہ کا تماشا دیکھنے کھڑے ہو جانا اور پھر وہیں سو کر شام سے صبح کر دینا۔

(۵)۔حضرت علی مرتضیٰؑ کا شراب پینا تسلیم کرلیا ہے۔اوراُن کی ایسی کثیر التعداد مثالیں جن سے سیرۃ النبیؐ کی متعدد جلدیں سیاہ کی گئی ہیں ایسی ہی ہیں تو فی الواقع ان کی اصلیت کیا ہے۔

میری موجودہ کتاب اسوۃ الرسولؐ انہیں مستفسرات کا جواب ہے اور شبلی صاحب کی غلط بیانیوں کی حقیقت کا دفتر انکشاف۔مگر میں اپنی موجودہ تالیف کی اس وقت تک کوئی تفصیل کرنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ شبلی صاحب کے دیباچہ پر کامل تبصرہ نہ کرلوں اور اس کی حقیقت اور اصلیت کا بھی اسی طرح صاف صاف اظہار و انکشاف نہ کروں جس طرح آپ کی اصل کتاب کے تمام غلط مشکوک اور مبہم واقعات وحالات کے متعلق تحقیق وتنقید سے کام لیا گیا ہے۔

دیباچہ سیرۃ النبیؐ پر تبصرہ

سیرۃ النبیؐ کے مجلدات دیکھ کر مفصلہ ذیل رائے قائم کی گئی ہے۔

استخفاف واستیصال حقوق بنی ہاشم

حقوق بنی ہاشم کے استخفاف واستیصال کے علاوہ جو مدت سے آپ کا شعار تالیف قرار پایا ہے۔جس کے لئے اخلاقاً آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوسکتی۔اس لئے کہ بنی امیہ کی جانبداری کیلئے آپ فطرتاً مجبور ہیں۔بہت سے واقعات قدیمہ اور مشاہدات عظیمہ۔جو تاریخ عرب،آثار اسلام اور اخبار جناب سید الانام علیہ وآلہ السلام سے پورا تعلق رکھتے تھے۔قطعاً مرفوع القلم اور کالعدم فرما دیئے گئے

بے ضرورت کوتاہ قلمی

ان میں سے بعض لکھے بھی گئے تو ان کی تفصیل و بیان میں بے ضرورت اور بے موقع اس قدر کوتاہ قلمی اختیار کی گئی کہ ان مختصرات کو اشارات واستعارات شاعرانہ کہیں تو بے جا۔اور عموماً پہیلی اور چیستان سمجھیں تو ناز یبا نہ ہوگا۔

بے ضرورت تنقید

بہت سے واقعات کی تحقیق میں اپنی ناقدانہ مخترعات ومصنوعات کا بے ضرورت اضافہ کیا گیا ہے جو حقیقت اور واقعیت سے بمراحل دور ہے۔

تاریخ قدیمہ عرب کے متواترات سے انکار

اکثر ایسے واقعات سے جو تاریخ و مرویات عرب میں متواترات کے درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور مشاہدات کئے جا سکتے تھے ،صرف اس ہمہ قیاس کی بنا پر کہ آپ کے نوایجاد فلسفہ تاریخی کے حدود میں ظاہری طور پر نہیں آ سکتے تھے۔ انکار کر دیا گیا۔ اور قدمائے عرب کے ان اخبار و اقوال متفقہ اور اثار مسلمہ پر تکذیب و تغلیط کا حاشیہ چڑھا دیا گیا۔

مقررہ معیار سے انکار

جس طمطراق اور تکلفات مالا یطاق سے تنقید و تحقیق واقعات کے کثیر التعداد معیار ایجاد کئے گئے ان میں سے کسی کی بھی پابندی نہیں فرمائی گئی۔

ترجیح حدیث علی التاریخ

اسناد کی تفصیل اور تعین میں سیرت پر تاریخ اور تاریخ پر حدیث کو ترجیح دی گئی ہے اور پھر حدیثوں میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو اور صحاح ستہ کی حدیثوں میں صحیح بخاری و مسلم کی حدیثوں کو ترجیح بالمرجح عنایت کی گئی ہے مگر افسوس کہ آغاز کتاب ہی میں امام بخاری پر حدیث کے غلط معنی لگانے کا الزام ثابت کر دیا گیا ہے (دیکھو لفظ قراریط ،سیرۃ النبی ج 1 ص 129) اور ان کے شارح حافظ ابن حجر پر رواۃ پرستی کا جرم لگایا گیا (راہب بحیرہ کے حالات ص 1 3 1) ان بنا پر ان محدثین اور ان کی حدیثوں کی کیا وقعت باقی رہتی ہے اور کیا اعتبار۔ اس لئے آپ کا قائم کردہ معیار بالکل طومارِ بیکار ثابت ہوا اور کچھ بھی نہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

حدیث صحیحہ کی شرط مقرر کردہ سے انحراف

اسناد حدیث کی تصدیق و توثیق کے علاوہ معمولی واقعات تاریخی کی تحقیق و اثبات کی نسبت بھی۔ اگرچہ وہ متواترات ہی کیوں نہ ہوں۔ اس قدر شدت احتیاط کی تاکید فرمائی گی ہے کہ غیر مقید اور غیر مستند کوئی واقعہ نہ قلمبند کیا جائے مگر اپنی ہی کتاب میں اپنے ہی دست و قلم سے اپنے دلائل کے اسناد و اثبات میں صرف اس لکھ دینے پر اکتفا فرما دی گئی کہ اکابر صوفیہ نے لکھا ہے۔ (ذکر ذبح اسماعیل ص 106)۔

استنباط کتب معتبرہ کی شرط تقرر کردہ سے انحراف

اسلاف کی غیر محققانہ اور محض کورآنہ تقلید کے غلط اصول سے بظاہر تو قطعی انکار کیا گیا ہے مگر اپنے مفید مطلب مضامین کی تصدیق و تحقیق میں آنکھیں بند کر کے قول سلف کی تقلید کی قدیم لکیر پیٹی گئی ہے اور پھر اس سختی اور مضبوطی سے کہ اگرچہ اس کے خلاف میں کیسی ہی معتبر اور مستند اقوال و اسناد آپ کے پیش نظر ہوں مگر آپ ایک کو بھی نہیں مانتے۔ منافرۂ بنی امیہ با بنی عبدالمطلب اور منافرہ بنی ثقیف یا بنی عبدالمطلب کے متواتر اسقاط واقعات۔ باب الاجارہ بخاری کے خلاف طبقات ابن سعد کے قوی الاسناد مرویات سے قطعی انکار وغیرہ

کثیر التعداد واقعات جو اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر پوری تحقیق سے لکھے گئے ہیں موجود ہیں۔

کتاب مستدہ اور نا اعتبار کردہ سے استباط

جن کتب حدیث ،تاریخ وسیر کو دیباچۂ کتب میں ساقط الاعتبار ٹھہرایا گیا ہے۔ اصل کتاب میں انہیں کے اسناد و حوالوں سے کثیر التعداد مقامات پر کام لیا گیا ہے۔ مواہب الدینہ قسطلانی کے متعلق تحریر ہے۔

''مشہور کتاب ہے اس کے مصنف قسطلانی ہیں، جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے شاگرد تھے یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے اور متاخرین کا بھی ماخذ ہے لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔ سیرۃ النبی، دیباچہ۔ ص27''

لیکن تمام کتاب آپ کی مواہب لدینہ کے حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ مثال کیلئے ملاحظہ ہوں صفحات 178و182و184وغیرہ وغیرہ ۔طُرفہ تو یہ ہے کہ غرانیق العلیٰ والی موضوع روایت کی تنقید میں ابن حجر شارح بخاری کی تردید تکذیب میں مواہب لدینہ ہی کی عبارت پیش کی گئی ہے ملاحظہ ہو ص179

(الف) اس طرح کتب احادیث کے متعلق ہر واقعہ کی صداقت کم سے کم صحاح ستہ تک کے اندراج تک مشروط کردی گئی مگر اپنی کتاب میں اپنے حصول مطلب کیلئے یہ تمام قیود وحدود توڑ کر تمام چھوٹی بڑی ۔ عام وخاص اور معتبر وغیر معتبر کتب احادیث سے استخاذ واستخراج فرمایا گیا۔ کمالا یخفی علی ناظر کتاب

(ب) یہی کتب تاریخ کی بھی کیفیت ہے لکھنے کو تو تاریخ قدیمہ عرب کے جدول مفصل اور فہرست مکمل دیباچہ کتاب میں لکھی گئی ہے اور ان میں سے ،ابن ہشام، ابن اسحاق، طبری ، اور ابن سعد کے منقولات ومرویات پر اعتبار کیا گیا ہے مگر اپنی کتاب میں مفید مطلب واقعات تاریخی کے نقل کے وقت ابوالفدا، ابن اثیر، ابن شحنہ، مسعودی، ابن لوردی، غرض کوئی متاخرین نہیں چھوڑا گیا۔ اور سب کے اقوال وارشاد، بلاتحقیق وتنقید داخل اسناد کر لئے گئے پھر سابق معیار کے تعین بالکل بیکار رہوئے۔

(ت) سیرت کی بھی یہی صورت ہے دیباچہ میں عرب کے تمام قدیم سیرت نگاروں کی بڑی لمبی چوڑی فہرست داخل ہے (ملاحظہ ہو از صفحہ 20۔تا26) ان میں سے سیرت ابن اسحٰق ،روض الالف ،سیرت ابن سید الناس ،سیر ابن عبدالبر وغیرہم کی ایسی معدودے چند سیرتوں کو قابل الاسناد بتلایا گیا ہے مگر اصلی کتاب میں حصول مطلب کیلئے وہی معمولی بھرتی ہے اور جلد دوم تک تو پہنچتے پہنچتے ۔ملفوظات حضرت اشرف جہانگیر تک کے حوالوں کی نوبت پہنچائی گئی ہے فَاعْتَبِرُوْا يَاُولِي الْاَبْصَارِ ۲ جب ان معیار پر کام کرنا ہی نہیں تھا تو پھر ان کا یہ طومار اور انبار کیوں تیار کیا گیا۔

مؤلفِ کتاب اُسوۃ الرسولؐ کا دیباچہ کتاب تقریباً 225 صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ اس دیباچہ کا مکمل جواب کتاب ھذا میں اپنے اپنے مقام پر پوری وضاحت سے دیا گیا ہے۔ اس لئے قاری حضرات کی سہولت کے پیشِ نظر اسے کتاب سے خارج کیا جارہا ہے

جو کی تلخیصِ کتاب کے حوالہ سے ایک اہم قدم ہے۔

ہماری کتاب اسوۃ الرسول

دیباچہ میں مختصراً شبلی صاحب کے اصول تعمیم کا طریقہ ظاہر کر دینا ضروری تھا۔ جو حقیقتاً ان کے اصول عقائد کا ایک خاص ضمیمہ ثابت ہوتا ہے اس اصول کو شبلی صاحب نے جس حفظ ماتقدم اور عزم و احتیاط سے اپنی تالیف میں از اول تا آخر مدنظر رکھ کر تمام واقعات کو اسی کے مطابق قلم بند فرمایا ہے۔ اس کی حقیقت اور ماہیت ہر موقع اور ہر مقام پر کھول دی گئی ہے۔ اور اصلیت دکھلا دی گئی ہے اسی کے ساتھ آپ کی عالم فریب انشاپردازی کی اصلی اور بے وجودی بھی ثابت کر دی گئی ہے۔ جو اپنے اپنے خاص موقع پر مذکور ہیں۔

تبصرہ میں ہر مبہم واقعہ کی صحیح تنقیح۔ ہر غلط واقعہ کی کامل تنقید و تحقیق اور ہر مشکوک قصہ کی تصحیح و ترمیم بطور تمثیل مختصراً قلمبند کر دی گئی ہے اور تفصیل اصل کتاب میں اپنے مقام پر مندرج ہے تبصرہ میں زیادہ تر ان واقعات کی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے جن کو شبلی صاحب نے کسی مصاحت سے مرقوع القلم فرما دیا تھا یا گھٹا بڑھا دیا تھا یا تاریخ و سیرت کی ہیت وصورت سے نکال کر عقائد کے قالب میں اتار دیا تھا اور اس حیلۂ قلمی سے اپنے مسلمات عقائد کو تاریخ و سیر کے واقعات و مشاہدات بتلا کر عوام سے تسلیم کرانا چاہا تھا۔

اس میں کوئی عذر نہیں ہے کہ ہمیں ان کے عقائد کی تنقید کی نہ کوئی ضرورت لاحق تھی اور نہ ان کی تردید کا کوئی حق حاصل تھا۔ اس لئے میری تنقید بیکار سمجھی جائے گی لیکن اتنی عرض کر دینا ضروری ہے کہ عقائد اسلام کے متعلق۔ وہ واقعات مندرجہ سیرۃ النبی صلعم جو منافی شان رسالت ظاہر ہوتے ہیں یا وہ مرویات جو مخالف قرآن اور معارض احادیث متفق علیہ ثابت ہوتے ہیں ان کو بغیر تنقید کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔

جس طرح ہر ایسے واقعہ کے متعلق تنقید و تحقیق سے کام لیا گیا ہے اسی طرح شبلی صاحب کی عبارت و مضمون میں جن جن مقامات پر ضرورت خاص سے تلمیحات اور استعارات، صرف استخفاف واقعات کیلئے کام میں لائے گئے ہیں یا انشا پردازی اور عبارت آرائی کی قلمکاریوں سے سطحی الذہن اور محدود الاطلاع افراد قوم و ملت کو صرت مرغوب کر دینے کیلئے کہیں منطق کے اسباب و علل، معانی و مطول، کہیں فلسفہ اور کلام کے رموز و غوامض، دلائل و مباحث پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ان کی اصلی تصریح و تشریح بھی کر دی گئی ہے۔

عبارت کتاب کے اکثر مقامات میں اغراق، انفکاک اور خلاف سیاق اور دیگر اقسام کے اغلاط و اسقام کے عام حرف گیریوں سے چشم پوشی اختیار کی گئی ہے اور ان کی حقیقت شناسی اور اصل فہمی کو ناظرین کے مطالعہ و مشاہدہ کیلئے چھوڑ دیا گیا ہے۔

یہی ناگزیر ضرورتیں تھیں جنہوں نے سیرۃ النبی صلعم کے بعد اسوۃ الرسولؐ کی تالیف و اشاعت کو خاص اہمیت دے رکھی مؤلف نے ابتدا سے لے کر انتہائے تالیف تک انہیں امور ضروری کو کامل شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ مذہبی اور دینی واقعات کے حالات کو پہلے قرآن کے ارشادات سے۔ پھر احادیث صحیحہ کی مرویات سے مقابلہ کر کے قلمبند کیا ہے۔

ملکی اور قومی وقائع اور سوانح کو تاریخ و سیر کے معتبر اور مستند ماخذوں سے مستنبط کیا ہے استناد و استخراج کے طریقوں میں ہر واقعہ کی

صحت اسناد میں وہ تمام اصول تحقیق قائم رکھے گئے ہیں جو ایک روایت کی تصدیق و توثیق کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔

تمدنی اور اخلاقی حالات و مرویات میں انہیں واقعات کے اندراج پر اکتفا کی گئی ہے جو اخلاق الٰہیہ، آداب نبویہ اور نیز ملک وقوم کی مروجہ تہذیب و شائستگی کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔

تالیفات و تصنیفات کے ان اصول مسلمات کی تفصیل و تعمیل میں شبلی صاحب کی طرح خود غرضانہ اور جانب دارانہ فیصلہ جات اور اقتباسات و استخراجات کا غلط طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے اور بلا وجہ و ضرورت صرف حصول مدعا کی ضرورت سے ایک فن کو دوسرے فن سے فروتر اور کم پایہ نہیں قرار دیا گیا۔ یا ایک فن خاص کو مرویات و مندرجات میں دوسرے فن کے مرقومات و مذکورات ملا کر غلط مبحث کا معجون مرکب تیار نہیں کیا گیا ہے۔

سیرت نگاری کے موجودہ سیاق تحریر میں حدود تنقید و تحقیق ضرور قائم رکھے گئے ہیں اور ضرورت میں استدلال کلامیہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن واقعات کی تنقید و تحقیق میں نہ اتنی جدت دکھلائی گئی ہے اور نہ اپنی اصابت رائے قائم رکھنے کی بنا پر اتنی شدت اختیار کی گئی ہے کہ تاریخ و سیرت کے مضامین کلام و مناظ کے میگزین بن جائیں۔ یا اپنی جدید تحقیق اور مجدد بننے کے شوق و تمنا میں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے عام فہم اور سلیس طریقہ تحریر کو۔ جو آغاز فن سے لے کر اس وقت تک تمام علمائے متقدین و متاخرین کا نظریہ قرار پا چکا ہے۔ فلسفہ تاریخ کی جدید اور یوروپین طریقہ تالیف کی تقلید کی موجودہ صورت ہیئت میں بدل دیا گیا ہے اور نہ علم قدامت کے انکشافات جدیدہ کے ہر ممکن و ناممکن قیاسات کی بنا پر واقعات تاریخی کی اتنی چھان بین اور ان کی اتنی ہندی کی چندی کی گئی ہے کہ ثبوت استدلال کے طومار و انبار میں اصل مطلب مفقود اور لا وجود ہو جائے اور جس سے حقیقت واقعہ اور اصلی صورت حال تو غائب ہو جائے اور مصنف کا صرف خارجی اور سطحی استدلال رہ جائے۔

اس مسلک اور طریقہ تالیف کے خلاف اسوۃ الرسول میں ہر مسئلہ ہر واقعہ کی اصل حقیقت کے انکشاف کر دیئے جانے کو فرض اول قرار دیا گیا ہے اور ان کی تفصیل و بیان میں اسی قدر وسعت دی گئی ہے جس قدر سہولت اور عالم قبولیت کے لحاظ و اعتبار سے ضروری تھے مختلف فیہ مسائل میں کثرت رائے کو ترجیح دی گئی ہے اور وہی واقعات درج کئے گئے ہیں جو مقبولیت اور معقولیت دونوں حیثیت رکھتے ہیں۔ نقل روایات میں صغاف واعاد سے کہیں بھی کام نہیں لیا گیا۔ اگرچہ شبلی صاحب نے ان کی قابل الاستناد ہونے کا بھی عام فتوی دے دیا ہے۔ (دیباچہ سیرۃ النبی ص 61 و 71)

واقعات کی ترتیب باعتبار سنین کی گئی ہے اور ہر سال کے سلسلہ واقعات میں تقدیم و تاخیر وقوع کی ترتیب قائم رکھی گئی ہے ایسے واقعات جن کے ایام وقوع کی تعین میں اختلاف ہے کثرت اقوال پر اعتبار کیا گیا ہے ایسے واقعات جن کی تفصیل ضروری نہیں سال وقوع کے آخر میں تذکرہ لکھ دیئے گئے ہیں۔

مرقومہ بالا ترتیب و تدوین کے مطابق اسوۃ الرسول تین جداگانہ حصوں (جلدوں) میں مرتب اور مدون کی جا رہی ہے۔

صنف تالیف اور شغف تصنیف میں تحقیق و ترتیب کے بعد بہت بڑا اہم اور ضروری امر نقل اسناد ہے ہر واقعہ کے شہود و ثبوت

میں اسناد کی اصلی عبارت کو بلفظ لکھ دیا گیا ہے۔متقدمین صرف مصنف اور تصنیف کے نام کے حوالہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن زمانہ حال کے محققین نے اس طریقہ اختصار کو اطمینان واعتبار کیلئے کافی نہ سمجھا۔مزید اطمینان اور خاطر خواہ تشفی کیلئے اسناد کی پوری عبارت ،تصنیف ،صاحب تصنیف کا نام شمار جلد نشان صفحہ وسطر تک کے اندراج کو ضروری سمجھا ہے۔یہ طریقہ چونکہ نہایت مستحسن اور مستحکم تھا اس بنا پر فی زماننا علم تصنیفات وتالیفات میں یہی دستور قائم رکھا گیا ہے۔نہایت احتیاط سے اسناد کی اصلی عبارتیں کتابوں اوران کے صفحات سطور واور مجلدات وغیرہ کے صحیح حوالے قلمبند کئے گئے ہیں عربی اور فارسی ماخذوں کی اصلی عبارت اوران کا ترجمہ درج کر دیا گیا ہے۔ انگریزی حوالہ جات میں چونکہ بغیر ٹائپ کے اصلی عبارت کی نقل دشوار تھی۔اس لئے ان کے صرف ترجمہ پر اکتفا کی گئی لیکن اصلی کتاب کے تمام حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔حوالہ جات بعد ختم واقعات فوراً لکھ دیئے گئے ہیں اور عبارت زیرین حاشیہ وغیرہ کو ملاحظہ کی دوبارہ زحمت نہیں دی گئی ہے۔

المولف الاحقر

خان بہادر

سید اولاد حیدر بلگرامی

کواتھ ضلع آرہ شریف العمارت عیدالفطر 1342ھ

رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا وَّاهْدِنِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۔ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَاٰلِهِ الْكَرِیْمِ

تمت بالخیر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اُسوۃ الرّسول صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم

جلد اوّل

عربوں کی فصاحت و بلاغت اور خاندانی پس منظر

تا

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی عمارتِ کعبہ کی تفصیل

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

❀❀❀❀❀❀
❀❀❀❀❀
❀❀❀

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَخَاتَمِ النَّبِیّٖنَ عَلٰی اٰلِہٖ الۡمَیَامِیۡنَ صَلّٰوۃُ عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَوۡصِیَآئِہٖ الۡمَعۡصُوۡمِیۡنَ۔

تحمیدِ الٰہی فطرت انسانی کا تقاضائے حقیقی اور نعت حضرت رسالت پناہی عقیدت ایمانی اور آداب روحانی کا مدعا ہے اس سے پہلے کہ موجودہ تالیف کے تمہیدی مضامین شروع کئے جائیں۔ ہم ضرورتِ تالیفی اور تناسب مقامی دونوں اعتباروں سے، ملک عرب کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کو، جو کہ ہماری کتاب کے تمام مضامین کیلئے ابتدا سے لے کر آخر تک تواتر اور تسلسل کا ذریعہ ہیں، کامل اور کافی تفصیل سے، لکھ دینا اور بیان کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔

عربوں کی فصاحت و بلاغت اور خاندانی پسِ منظر

ملک عرب اگرچہ تقریباً مکمل طور پر ریگستان پر مشتمل ہے۔ لیکن اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے اور تاریخی مشاہدات سے ملایا جائے تو اقطاع عالم میں یہ ہزاروں کوس کا چٹیل اور غیر آباد، بے آب و گیاہ میدان، قدیم الایام سے تقدیس کا مرکز، روحانیت کا معدن، معرفت کا مخزن، رسالت و نبوت کا گلزار اور فصاحت و بلاغت کا باغِ پُر بہار ثابت ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ

عرب کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں عموماً دو قول مشہور ہیں۔

قول اول یہ ہے کہ عرب اور ''اعراب'' کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں۔ چونکہ عرب اپنی زبان آوری کے سامنے دنیا کی تمام زبانوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو عرب (فصیح اللسان) اور دنیا کی تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ زبان) کہہ کر پکارا ہے۔

قول دوم جو اہل جغرافیہ کا نظریہ اور مؤرخین کا معیار تحقیق ہے وہ یہ ہے کہ عرب کا قدیم اور اول نام عَرَبَۃٌ اور عَزبۃ تھا۔ جو کثرت استعمال سے مُخفف ہو کر عرب بولا جانے لگا۔ اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پا گیا۔ عَربۃ کی جمع عربات ہے۔ اور لغوی معنی ''صحرا کے یعنی نا قابل زراعت'' عرب کے شعراء قدیم عرب کے اصل معنی یہی بتلاتے ہیں۔ ذیل کے اشعارِ عرب سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اسد ابن جاھل کہتا ہے ؎

وعربة ارضٌ جد فی الشراھلھا
کما جد فی شرب النقاخ ظماع

ملک عرب وہ قطعہ زمین ہے جو اپنے باشندوں کی شرارت کے لئے ویسا ہی مشہور ہے۔ جیسا اُس کے باشندوں کو پیاس میں مبتلا

پیاسوں کو ٹھنڈا پانی پلانے کے لئے شہرت کا شرف حاصل ہے۔

حضرت ابو طالبؑ کے مشہور قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

وعربة دار لا یحل حرامها
من الناس الا اللوذعی الحلاحل

ملک عرب وہ قطعہ زمین ہے جس کی حرام (ممنوعات) چیزوں کو سوائے دانشمندان اور بزرگان قوم کے کوئی دوسرا شخص حلال (جائز) نہیں کرسکتا۔

ابوسفیان کلبی جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں کہتا ہے۔

ابونا رسول اللہ وابن خلیلہ بعربۃ بوّانا فنعم المرکب

خدا کا رسول اور اُس کے خلیل کا فرزند ہمارا باپ ہے۔ تمام عرب کو اُس پر فخر ہے۔ کیا اچھا سردار قوم ہے۔

وجہ تسمیہ کے متعلق قول اول اگر صحیح بھی ہو۔ تاہم اس قول کو اہل عرب کی خصوصیت اور ذاتی مفاخرت تک ہی محدود سمجھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اُن کی نکتہ آفرینی اور دقت رسی کا نتیجہ یا مدعا کہلائے گا۔ عام مقبولیت اور واقعیت کے درجوں تک نہیں پہنچتا۔ کیونکہ ہر قوم اپنی زبان کی اُسی طرح جوہری ہے جس طرح عرب۔

جغرافیائی تعلقات سے عرب کی وجہ تسمیہ کی تحقیق

اس قطعہ زمین کا نام عربۃ کیوں رکھا گیا، حقیقت یہ ہے کہ عربۃ اصل میں سامی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں۔ عبرانی میں لفظ ''عربا'' آیا ہے۔ جو کہ عربہ کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ معنی وہی ہیں۔ بیابان اور میدان، ابھی تک عربی میں بھی اس کی قدیم یاد اسی مفہوم میں باقی ہے۔ عرابۃ بدویت کے لئے اور اعراب۔ بادیہ اور صحرانشینوں کے لئے، آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔ چونکہ ملک عرب تمام تر صحرائے بے آب وگیاہ ہے اور ریگستان کا لق ودق میدان، علی الخصوص وہ ملکی حصہ جو علاقہ حجاز کے نام سے مشہور ہے۔ اور ہماری موجودہ تالیف کی تصریحات وتفصیلات کا اصلی مقصود یہ علاقہ بادیہ عرب شام اور سینا تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کا نام عَرَبا قرار پایا۔ پھر رفتہ رفتہ وہاں کے باشندوں کو بھی عرب کہنے لگے۔

تاریخی مشاہدات سے وجہ تسمیہ عرب کی تحقیق

لفظ عرب سب سے پہلے 1000 ق م (قبل مسیحؑ) میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں مسموع ہوتا ہے (کتاب الاستثناء۔ آیت۔ 1-7-22) اور پھر اس کے بعد عام طور سے اُس کا استعمال، عبرانی۔ یونانی اور رومانی تاریخوں میں نظر آتا ہے۔ شام کے کتبات میخی میں 800 ق م میں عرب کا نام عَرَبی لکھا ہے۔ قبل اسلام یہ لفظ پورے ملک کیلئے جو یمن سے شام تک واقع ہے کیلئے بولا جاتا تھا۔

کتب مقدسہ سے تحقیق

توریت میں لفظ عربا ایک خاص قطعہ زمین عرب کے معنی میں متعدد بار آیا ہے لیکن یقیناً اس وسعت کے ساتھ اطلاق نہیں ہوا ہے جس وسعت کے ساتھ اب یہ کہا جاتا ہے۔ لفظ عربا سے صرف وہ قطعہ زمین مراد لیا گیا ہے جو حجاز و شام سے سینا تک پھیلا ہوا ہے۔ عام ملک عرب کے لئے زیادہ تر مشرق اور مشرق کی زمین کا استعمال ہوا ہے اور کبھی جنوب کا۔ کیونکہ عرب فلسطین کے مشرق و جنوب دونوں گوشوں میں واقع ہے۔

قرآن مجید میں لفظ عرب۔ ملک عرب کے لئے کہیں نہیں آیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سکونت کے ذکر میں وادی غیر ذی زرع یعنی ناقابل زراعت اس کو کہا گیا ہے۔ جو تحقیق وجہ تسمیہ میں، جغرافیہ، تاریخ اور توریت مقدس سے اوپر لکھی گئی ہے وہ قرآن مجید کی تصریح سے جب مقابل کی جاتی ہے تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے انھیں الفاظ السنہ قدیمہ کا بعینہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ چونکہ اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا۔ اس لئے خود لفظ "غیر آباد ملک" (عرب) اس کا نام پڑ گیا۔ توریت سے اس سے اس کی تصدیق و تطبیق اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ توریت میں بھی اسمٰعیلؑ کا مسکن مدبار بتلایا گیا ہے۔ جس کے معنی بیابان اور غیر آباد قطعہ زمین کے ہیں اور جو بالکل عرب کا ترجمہ اور وادی غیر ذی زرع کا مفہوم ہے۔

ملک عرب کا جغرافیہ

عرب کا حدود اربعہ اور ملک کا نام واضح ہو گیا۔ اس کے جغرافیائی حالات یہ ہیں۔ اصول جغرافیہ کے مطابق سب سے پہلے حدود کا بیان ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

شمال میں۔ ایشیائی ترکستان

جنوب میں۔ بحر ہند اور خلیج عدن۔

مغرب۔ بحر قلزم جسے بحر احمر (ڑوسی) بھی کہتے ہیں۔

مشرق میں۔ بحر عمان اور خلیج فارس۔

اہل جغرافیہ لکھتے ہیں کہ عرب کی شمالی حدود میں اب تک اختلاف ہے۔ فی الحال یورپ کے محققینِ جغرافیہ نے عرب کے شمالی حدود کی جو تحقیقات کی ہیں وہ تمام اقطاع عالم میں مسلّم ہو چکی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ نقشہ عرب میں 34 درجہ ارض البلد سے اگر ایک خط شہر سوئیز سے خلیج فارس کے سرے تک کھینچا جائے تو یہی خط ملک عرب کی شمالی حد مانا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کی شمالی حد میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔ بعضوں نے علاقہ حلب سے لے کر دریائے فرات تک کے قطعہ زمین کو بھی عرب میں داخل کیا ہے۔ اُن کے اس قول کی بنیاد فتوحات اسلامی پر قائم ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی فتوحاتی وسعت کے ساتھ اپنی ملکی حدود کو بھی بڑھا ہوا خیال کر لیا ہے۔ اسی طرح قدیم تاریخوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کو بھی اکثر عربی اور یوروپین مؤرخین ملک عرب میں شامل کرتے ہیں۔ ان

لوگوں کا نظریہ یونانی اور رومانی کتابوں پر مبنی ہے۔ جنھوں نے عرب کی تقسیم ملکی میں برالطورسینا (جزیرہ نمائے طورسینا) کو بھی عرب کے حصوں میں قرار دیا ہے اور اول نمبر میں شمار کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا یہ قول بھی قول اول کی طرح اس وقت کے عرب کی موجودہ حکومت کے رقبہ کے اعتبار پر قائم کیا گیا ہو۔ اور ممکن ہے کہ شیوع اسلام سے پہلے شاہان عرب نے اپنی حدودِ حکومت کو جزیرہ نمائے سینا تک بڑھا دیا ہو۔ مگر بخلاف ان سب قیاسی اضافات کے اصل تحقیقات وہی ہیں جس پر تمام علمائے جغرافیہ کا اتفاق ہو چکا ہے۔ وہ وہی خط ہے جو شہر سوئیز سے کھینچ کر خلیج فارس کے سرے تک پہنچتا ہے اور یہی عرب کی شمالی حد مسلمہ ہے۔ جبکہ عرب کے ماہرینِ جغرافیہ کا یہ دعویٰ کہ ان کا ملک معمورۂ عالم کے وسط میں واقع ہے۔ گو ایک مدت تک قیاس غلط اور مفاخرت خاص سمجھا گیا۔ مگر موجودہ زمانہ کی تحقیقاتِ جدید سے ثابت ہو گیا کہ ملک عرب درحقیقت دنیائے قدیم کے قلب میں واقع ہے۔

مغرب کی جانب یہ ملک خاکنائے سوئیز کے ذریعہ سے ملک مصر سے ملا ہوا تھا۔ مگر 1869ء میں نہر سویز کے کھد جانے سے جدا ہو گیا۔ یہ نہر 87 میل لمبی اور 50 سے لے کر 100 گز تک چوڑی ہے۔ اور مصر، فرانس اور برطانیہ کی متفقہ تجویزوں اور کوششوں سے بنائی گئی ہے۔

ساحل اور مشہور بندگاہیں

ملک عرب کی جو شمالی حد اوپر لکھی گئی ہے اس کے اعتبار سے یہ جزیرہ نما تقریباً طول میں 1300 میل ہے۔ اور شمالی خط ارض البلد کے 34 درجہ پر۔ جہاں یہ سب سے زیادہ عریض پایا گیا ہے۔ اس کا عرض 1500 میل ہے۔ شمالی حد کے پاس جہاں سب جگہ سے کم اس کا عرض پایا جاتا ہے۔ وہاں اس کی چوڑائی کل 900 میل ہے۔ اس کا مغربی ساحل جو بحر احمر سے ملا ہوا ہے۔ سنگین اجزا سے ملی ہوئی زمین ہے اور بالکل بنجر یعنی ناقابل زراعت ہے۔ اس کے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ جو کہ دو ہزار فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اس ساحل پر کوئی بندرگاہ نہیں۔ مگر وہاں چھوٹے چھوٹے جزیرے واقع ہیں۔ جن میں آتش فشاں مادہ رکھنے والے پہاڑ واقع ہیں۔ آبنائے باب المندب کے ابتدائی حصہ میں جزیرہ پیرم واقع ہے۔ جو فوج کا ایک قابل الذکر مرکزی مقام ہے۔ جنوبی مشرقی ساحل کی بھی زمین کے اعتبار سے یہی حالت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس ساحل پر عدن۔ ظفار اور قیشوم کی مشہور و معروف بندرگاہیں واقع ہیں۔ جبکہ مشرقی ساحل جو بحر میت سے لے کر بحر عمان تک واقع ہے۔ ملک کا گنجان آباد علاقہ ہے۔

ملک کا رقبہ

جزیرہ نمائے عرب طول میں کم سے کم 1300 میل اور زیادہ سے زیادہ 1800 میل جبکہ عرض میں 600 سو مربع میل بتلایا جاتا ہے کل رقبہ بارہ لاکھ تیس ہزار مربع میل ہے۔ باعتبار رقبہ کے ملک عرب جرمن اور فرانس سے چار گونا بڑا اور ہندوستان سے ایک ثلث کم وسیع ہے۔

آبادی

آبادی ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔ جس میں پانچواں حصہ بدوقوموں کا ہے۔ بدو، بادیہ سے ماخذ ہے۔ باقی دوسری قومیں شہر، قصبات اور دیہات میں رہتی ہیں جو کہ عرب الحضر کہلاتی ہیں۔ بدوقومیں یعنی عرب البآدیہ ہمیشہ خانہ بدوش رہتے ہیں۔ یہ دنبوں، بھیڑوں اور

عموماً مویشیوں کو پالتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ خیموں میں رہتے ہیں اور برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتے ہیں۔ جب ایک مقام پر ان کے مویشیوں کا چارہ اور پانی ''پینے کا چشمہ'' خشک ہوجاتا ہے۔تب ان کو دوسرے مقام پر جہاں ان کی ضرورت کی یہ دونوں چیزیں دستیاب ہوتی ہیں، چلے جانے کی مجبوری ہوتی ہے۔ یہ لوگ صحرانوردی اور دشت پیمائی کی آزاد اور سادہ زندگی کو شہر اور قصبات کی مقامی سکونت پر ترجیح دیتے ہیں۔اُن کی اس ترجیح کا دعویٰ کچھ آج سے نہیں ہے۔ بلکہ ہزارہا برس قبل سے وہ ہمیشہ سے اپنی قدامت کے شیدائی ہیں۔اور ایسے شیدائی کہ انھوں نے اپنے وطن کی اصلیت اور خصوصیت کے ساتھ اپنے ملک وقوم کو موسوم کیا۔جیسا کہ وجہ تسمیہ عرب میں ابھی ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے۔قدامت اور اصلیت کے ایسے عاشق کامل کہ باوجود لاتعداد امتداد ایام کے بھی نہ ان کے ملکی رسم ورواج میں ابھی تک کوئی فرق آیا ہے اور نہ قومی وضع ولباس میں جبکہ جنگ وجدال،خون وقتال گویا ان کی فطرت کے خاص عناصر تھے۔مگر جب سے اسلام کی مبارک تعلیم نے ان میں تہذیب اور شائستگی پھیلائی تو قساوت،شجاعت اور بسالت کی صورت میں بدل گئی۔لوٹ مار اور ایذا رسانی،مہمان نوازی اور آرام رسانی کی اخلاقی خوبیوں میں ظاہر ہوئی۔اور بالآخر وہ بدو سلطنت اسلامی کی نگرانی میں تعلیم پا کر قوم ووطن کے بہت بڑے بہادر،شجاع سپاہی اور اپنی مملکت کے فیاض اور بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے۔ ان کی ہمسایہ اور ہم وطن قوموں کے علاوہ تمام دنیا کی غیر قوموں نے بھی ان کی ہمت،شجاعت۔،فیاضی اور مسافر نوازی کو تسلیم کر کے بے حد تعریف کی ہے۔تمدن عرب کا فرانسیسی محقق لکھتا ہے۔خلفائے راشدین کے وقت میں اسلامی فوج کا بہت بڑا حصہ یہی بدوی تھے۔ بدوی فہم وادراک میں حقیقتاً تمام دنیا کی گلہ چرانے والی قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے بارہا گفتگو کی ہے۔کسب معیشت کے متعلق ان کے خیالات یورپین تعلیم یافتہ لوگوں سے بہتر ہیں۔رسوم وعادات میں نیم وحشی ہیں۔مگر خیالات میں وحشی نہیں۔ یہ لوگ اگر وحشی کہے بھی جائیں تاہم فہمیدہ اور ذہین ضرور ہیں۔

علاقہ شام کے سرحدی بدوی

یہ قوم چار مختلف قبائل پر منقسم ہے۔

(1) دروز۔ عام بدویوں سے فطرتاً اور عادتاً بہت قریب ہیں۔ یہ حقیقت میں مسلمانوں کا ایک معزز اور خودمختار فرقہ ہے۔ یہ لوگ بڑے جری ہیں۔ان میں اور لبنان کے موارنہ میں سخت عداوت ہے۔

(2) موارنہ۔ یہ نصرانیوں کا ایک معزز اور لافازن فرقہ ہے۔جس سے اصل موقع پر بہادری کا کوئی کام نہیں ہوتا۔

(3) متاولہ۔کوہستان عرب میں آباد،ان کا مذہب امامیہ ہے سخت متعصب ہیں۔کبھی کسی اجنبی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ بالکل علیحدہ رہتے ہیں۔

(4) نضاریہ۔ یہ ایک بالکل جداگانہ پہاڑی قوم ہے۔ان کا مذہب (بظاہر) اسلام کی ایک شاخ ہے۔مگر نہایت مختلف،تناسخ کے بھی قائل ہیں اور آفتاب وماہتاب کی پرستش بھی کرتے ہیں۔

عرب مستوطن

مستوطن عرب بدوؤں کی طرح نیم وحشی نہیں کہے جاسکتے وہ اپنے کمالات وصفات اور معلومات کے اعتبار سے دنیا کی اور شائستہ قوموں سے پیچھے نہیں ہیں۔ یورپین مشہور سیاح مسٹر پالگریو کے اعترافات سے اہل عرب کے ان اوصاف پر کافی روشنی پڑتی ہے۔عرب ساکنان عمان کے متعلق یہ مشہور ومعروف سیاح رقمطراز ہے کہ علاقہ نجد میں ایسے اشخاص کثرت سے پائے جاتے ہیں جو انگریزوں کی طرح کلیں (مشینیں) بناسکتے ہیں اور آسانی سے ریلوے کی پٹریاں بچھاسکتے ہیں علاقہ یمن میں دو دار العلوم کام کررہے ہیں۔ایک شہر زبید میں اور دوسرا شہر ظفار میں، اگرچہ یہ دار العلوم جامع الاظہر کی طرح مشہور تو نہیں ہیں۔لیکن ملک کے علم دوست اور روشن خیال طبقات میں اشاعت علمی کا بہت بڑا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

کچھ آگے چل کر پھر یہی یورپین فاضل لکھتا ہے کہ میں نے بہت سفر کیا ہے اور مختلف اقوام کے ساتھ میرے روابط وابستہ رہے ہیں۔جن میں افریقی، ایشیائی اور اہل یورپ سب شامل ہیں۔لیکن ان میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے۔ جسے وسط عرب کے عربوں پر ترجیح دی جاسکے۔ان مستوطنین عرب (عرب الحضراء) کی بھی وہی زبان (تقریباً) ہے جو بدوی عرب کی ہے اور ان کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑتا ہے جو اُن کی شریانوں میں، تاہم دونوں میں فرق واضح ہے۔

پھر کچھ آگے چل کر یہی قابل مصنف علاقہ نجد کے وہابی فرقہ کے متعلق لکھتا ہے کہ وہابی عرب بمقابل دوسرے عربوں کے بخیل اور مشکل مہموں میں شریک ہونے پر مکمل آمادہ ہوتے ہیں۔ نہ وہ مثل اور عربوں کے رنگیلے ہیں، نہ صاف دل ہیں، نہ کشادہ پیشانی، مگر اس کے ساتھ ہی وہ زیادہ ثابت قدم اور زیادہ عقلمند ہیں۔ ان کی زبانوں میں ان کا دلی مدعا بہت کم ظاہر ہوتا ہے۔مگر وہ اپنے ارادوں میں نہایت مضبوط ہیں۔دشمنی میں سخت اور دوستی میں اُن لوگوں کے ساتھ جو ان کے ہم قوم نہیں ہیں نہایت مشتبہ۔ وہ جوش میں آکر کوئی غلط کام نہیں کر بیٹھتے، بلکہ پہلے سوچے اور سمجھے ہوئے پروگرام پر عمل کرتے ہیں۔اگرچہ ان کے فہم وادراک خودغرضی سے آلودہ ہیں۔لیکن ان کے عزم قوی ہیں اور ان کی ثابت قدمی نے ان کو اس لائق بنادیا ہے کہ وہ اپنی تمدنی حالت کو نہایت مضبوط کرلیں اور اپنے ہمسایوں پر ظالمانہ حکومت کرسکیں۔ شدید اتحاد باہمی کی وجہ سے، ان کی کامیابی بمقابل ایسے دشمن کے یقینی ہے، جسے آپس کی پھوٹ نے کمزور کررکھا ہو، وہابیوں کے یہ خصائص اُن کے روزمرہ کے حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتے ہیں، اور ان سے گفتگو کرتے وقت انسان کیلئے ضروری ہے۔کہ اپنے الفاظ واشراط کا ویسا ہی خیال رکھے جیسا کہ کسی دشمن سے گفتگو کرتے وقت رکھا جاتا ہے۔

زمین عرب سطحی حالت

سطح زمین کے اعتبار سے جزیرہ نمائے عرب تقریباً مرتفع میدانوں کا تختہ ہے جو خاص طور پر پورب اور دکن کی طرف بہ نسبت دوسری اطراف کے زیادہ اونچا ہے جن میں بعض نشیبی مقامات سرسبز وشاداب وادیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔عموماً سطح زمین کی اونچائی

ایک ہزار سے لے کر تین ہزار فٹ تک ہے۔ جزیرہ نمائے سینا مثلث نما ہے، جس کے پچھم خلیج سوئیز اور پورب خلیج عقبہ واقع ہے۔ اس کی زمین بالکل سنگلاخ ہے۔ اور اِس کے وسط میں کوہِ سینا واقع ہے کوہِ سینا کا سلسلہ مشرقی ساحل سے شروع ہو کر خلیج فارس کے کنارے کنارے ہوتا ہوا جزیرہ نما کے سندان میں داخل ہوتا ہے، اِن کی اونچائی دو ہزار سے لے کر تین ہزار فٹ تک ہے خلیج فارس کے دہانے پر جزیرہ کویت واقع ہے جو کہ ایک اچھی بندرگاہ ہے، اس کی جنوبی مشرقی حد، وہ پتلا زمین کا حصہ ہے جس میں سب سے آگے راس مسندم واقع ہے۔ یہ قطعہ زمین شمال و مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر بحر عمان واقع ہے اور وہ بحر ہند سے جا کر مل جاتا ہے۔ خلیج عُمان کے جنوبی مغربی کنارے پر مسقط کی خوش نُما بندرگاہ واقع ہے۔

عرب کے پہاڑ

پہاڑوں کے دو سلسلہ شمال و مشرق اور جنوب و مغرب کی طرف جبل جا اور لعیل سلم کے ناموں سے مشہور ہیں، جن کی سب سے اونچی چوٹی سمندر کی سطح سے پانچ ہزار فٹ اُونچی ہے، جبل الطّویق جو ملک عرب کی ریڑھ کہلاتا ہے، ٹھیک اُتر سے دکن کی طرف جاتا ہے، اس سے اور خلیج فارس سے کہیں سو میل کہیں دو سو میل کا فاصلہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ علاقہ عقبہ میں جبل املاخضر کی چوٹیاں چھ ہزار فٹ اونچی ہیں۔

عرب کے دریا

اس ملک میں کوئی دریا کشتی چلانے کے قابل نہیں ہے۔ جو بھی چند چشمے ہیں وہ گرمی کے دنوں میں مکمل خشک ہو جاتے ہیں۔ ملک کے اکثر علاقوں میں کئی کئی مہینوں تک پانی کی ایک بوند نہیں برستی، لیکن عجیب قدرت خداوندی یہ ہے کہ یہاں کے پہاڑوں سے ہمیشہ چشمے جاری رہتے ہیں جن سے دامن کوہ اور وادیاں عموماً سرسبز و شاداب رہتی ہیں، کبھی کبھی یہی چشمے پھیل کر تھوڑی دور تک ایک بیضوی دریا بن جاتے ہیں۔ پھر وہ ریگستان میں جذب ہو جاتے ہیں یا سمندر میں مل جاتے ہیں، ملوک عرب نے اِنہیں چشموں کو روکنے کیلئے بند بنائے تھے کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ چشمے اُبل کر بصورت سیلاب پُرخطر ہو جاتے ہیں بند ارم، بند مآرب انہیں کی یادگاریں ہیں۔

عرب کا صحرائے عظیم

اہل عرب اس صحرائے عظیم کو، ارض الدہان کہتے ہیں۔ یہ صحرا ملک کے جنوب میں واقع ہے، ارض الدہان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ زبان عرب میں دہان کے معنی سرخ کے ہیں۔ چونکہ اِس صحرا کی ریت سرخ رنگ کی ہے اس لئے اس کا نام ارض الدہان قرار پایا۔ یہ لق و دق صحرا، رقبہ میں تقریباً پچاس ہزار میل مربع ہے اور تمام رقبہ ملک کا پانچواں حصہ ہے اس صحرا کی وسیع زمین میں سوائے ریت کے بڑے بڑے تودوں اور انباروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ملک کے باشندے اور گرد و نواح کے متوطن قبیلے و قافلے اس صحرائے عظیم کو بہت کم طے کرتے ہیں۔

عرب کی آب وہوا

ملک عرب بھی افریقہ کی طرح تمام اقطاع عالم میں خشک ترین قطعہ زمین ہے جغرافیائی مناسبت اور قربت کے اعتبار سے ایشیا کے تمام ملکوں میں جزیرہ نمائے عرب کو شمالی افریقہ سے بھر پور مماثلث ہے، کوہستانی مقامات میں آب وہوا اعتدال کے درجہ پر رہتی ہے مگر غیر محفوظ اور غیر سایہ دار علاقہ جات میں نا قابل برداشت گرمی پڑتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ مہلک بادسموم، جسے بادِ خمسین بھی کہتے ہیں۔ چلا کرتی ہے یوروپین مشہور ومعروف سیاح اور مؤرخ مسٹر ڈوزی نے بھی عرب کی بادسموم کے متعلق واضح الفاظ میں روشنی ڈالی ہے

بادِ خمسین

بادِ خمسین یا بادسموم کے آثار قافلوں پر آناً فاناً ظاہر ہوجاتے ہیں، پہلے اُفق کی طرف سے آسمان پر ایک ہلکی سی سُرخی نظر آتی ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ سرخی سیاہی میں بدل جاتی ہے، پھر فوراً وہ سیاہی زردی میں بدل جاتی ہے جس کی وجہ سے آفتاب کی کرنین مدھم ہوجاتی ہیں اور وہ گویا خون کا ایک قرص ہوکر رہ جاتا ہے، زمین اور آسمان کا جوف ریت کے وسیع ذرّوں سے بھر جاتا ہے، اور ہوا کی حرکت سے وہ ذرّے تمام زمین کی سطح پر اس طرح پھیل جاتے ہیں جیسے طوفان آنے کے وقت سمندر کا پھین اُڑ کر ساحل کی سطح پر پھیل جاتا ہے، یہی علامات بتلادیتی ہیں کہ میدان سے فوراً کسی طرف بھاگ جانے کا وقت آ گیا ہے کیونکہ چشم زدن میں بادِ خمسین کے مارڈالنے والے جھونکے پہنچتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں صحرا کی بے انتہا ریت کی مقدار اُڑ اُڑ کر سمندر کی لہروں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ غریب اور بدنصیب مسافر کا دم گھٹنے لگتا ہے آنکھیں بالکل سرخ ہوجاتی ہیں ہونٹ خشک ہوکر آگ کی طرح جلنے لگتے ہیں۔ سواری کے اونٹوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ کبھی تو وہ اس آفت سے گھبرا کر میدان میں دوڑنے لگتے ہیں کبھی تھک کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور اپنی لمبی لمبی گردنیں ریت کے تودوں میں چھپا دیتے ہیں اور جوں جوں ہوا کا طوفان بڑھتا جاتا ہے اپنی تھوتھنیوں کو زمین پر دھڑا دھڑ پٹکتے جاتے ہیں۔ اور اپنی جان بچانے کی کوششیں کرتے ہیں، اگر طوفان کے گردو باد میں قافلہ نے راہ گُم نہیں کی تو وہ کسی پہاڑ کے نیچے یا کسی غار کے اندر چھپ جانے کی کوئی محفوظ جگہ ڈھونڈھ لیتے ہیں اور طوفان کے گذر جانے تک کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن اگر بدقسمتی سے اس بادیہ لامتناہی میں قافلہ نے راہ بھُلا دی اور چُھپ رہنے کی کوئی محفوظ جگہ بھی نہیں ملی تو پھر انسان اور بے زبان حیوان کے حواس گم ہوجاتے ہیں۔ جان بچانے کی عقلی وفطرتی جدو جہد جو کہ ہر ذی روح میں موجود ہوتی ہے۔ اس عالم میں بالکل سلب ہوجاتی ہے، اعضاو جوارح ایک ایک کر کے جواب دے جاتے ہیں تمام جسمانی طاقتیں زائل ہوجاتی ہیں۔ بالآخر گرمی کی شدت سے انسان بالکل خستہ اور پریشان ہوکر دردسر کے شدید دوروں میں گرفتار ہوجاتا ہے ہر عضو کی طاقت جواب دے دیتی ہے۔ پورا قافلہ ریت کی سر بفلک موجوں کی نظر ہوجاتا ہے اور ذراسی دیر میں مسلسل ریت کا انبار اُن کو بڑے بڑے تودوں کے نیچے ایسا دبا دیتا ہے کہ اُن کا نام ونشان بھی نہیں رہتا ہے، تا آنکہ عرصہ دراز کے بعد، نظام قدرت نے اگر پھر وہاں کہیں ایسا ہی سامان پیدا کر دیا اور ایسا ہی طوفان آیا اور اُن کی موجوں نے ریت کے انبار کو اُڑا دیا تو انسانوں اور حیوانوں کی سفید سفید ہڈیوں نے نمودار ہوکر اُن کی داستانین ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیں اور بتلا دیا کہ

ان کو عبرت کی نگاہوں سے دیکھ لو کہ یہ بادشمسین کے کارنامے ہیں۔

عرب کے اندرونی حصوں میں عموماً زیادہ گرمی ہوتی ہے۔صحراؤں میں دن کے وقت درجہ حرارت 109 اور رات کے وقت 100 درجہ سے کم نہیں ہوتا، یمن میں جولائی کے آخر تک کبھی پارہ 84 درجہ سے متجاوز نہیں ہوتا، صنعا علاقہ یمن میں تو موسم سرما میں برف پڑتی ہے درج بالا سطور میں جس شدید گرمی اور خشکی کا ذکر ہوا ہے یہ شدت عرب کے ہر حصہ میں نہیں پائی جاتی ،بعض حصے جو رقبہ میں یورپ کے بڑے اور مشہور ممالک سے کم نہیں ہیں اور جن کی زمین بہت اچھا محاصل دیتی ہے۔جیسے علاقہ یمن اور نجد جہاں نہایت اعلیٰ پیداوار ہوتی ہے بالگر یوہین یمن کی آب وہوا کو تمام دُنیا کی آب وہوا پر ترجیح دیتا ہے۔یہاں کے گھوڑے تو ساری دُنیا میں لاجواب مانے گئے ہیں۔علاقہ عقبہ میں جابجا چشمے اور ندیاں (وادی) پائی جاتی ہیں۔جہاں کہیں کھجوریں اور چارہ پیدا ہوتا ہے۔ان صحراؤں میں بدوی قومیں اپنے مویشیوں کے ساتھ رہا کرتی ہیں۔

عرب کے اثمار

ساحلوں کے قریب سرسبز وشاداب علاقوں میں ،انار،خوبانی ،شفتالو،سیب، بیر، انجیر، بادام، پستہ، انگور، لیموں، خربوزہ، سیم، تمباکو، تج، سیاہ مرچ،خوشبو،مہندی، ادرک، جھاؤ گلاب، نرگس، بنفشہ، نیل وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں یہاں کے کاشتکاروں کو بارش کا پانی، کنوؤں اور تالابوں میں جمع رکھنا پڑتا ہے۔ملک کے بعض حصے ایسے بھی ہیں جہاں گھاس تک نہیں اُگتی۔

عرب کے حیوانات

اونٹ، گھوڑے، خچر، گدھے، بیل، بھینس، نیل گائے، بھیڑ، دُنبے، ہرن اور شیر، چیتے، تیندوے، چرغ، بھڑیئے، لومڑی اور گیدڑ وغیر درندے بھی ہوتے ہیں، ٹڈیاں (ملخ) اگرچہ نقصان عظیم پہنچاتی ہے۔مگر اکثر اوقات صحراؤں میں مسافروں اور ان کی سواری کے جانوروں کی غذا میں کام آتی ہیں، تمام جانوروں میں گھوڑے اور اونٹ نہایت اعلیٰ درجہ کے اور مفید ثابت ہوتے ہیں، اونٹ تو خاص الخاص عرب کا جانور، تمام عالم میں مشہور ہے۔عرب اپنے گھوڑوں کو مثل اپنے فرزندوں کے پالتے اور عزیز رکھتے ہیں اور ان کی نسل کو ہرگز ہرگز بگڑنے نہیں دیتے آدمیوں کی طرح ان کے نسب نامے تیار رکھتے ہیں پرندوں میں مرغ، شتر مرغ، بٹیر، باز، شکرا، کبوتر، فاختہ ،کوّا، چیل، ہُدہُد اور آبی جانور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

عرب کے غلے اور دیگر پیداوار

جوار، جو، باجرہ، گیہوں اور مٹر ملک کے شاداب حصوں میں پیدا ہوتے ہیں، کھجور عرب کی خاص پیداوار ہے، یہ ملک کی خاص خوراک ہے، ناریل لوبان، تیزپات، سنائے مکی مختلف اقسام کے گوند، عود، دمُر، اور لسباں بھی اس ملک کے ساتھ مخصوص ہیں۔

معدنیات

تانبے اورلوہے کی کانیں تو جابجا اکثر پائی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین چاندی اورسونا بھی پیدا کرتی ہے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب صفتہ جزیرۃ العرب میں ایک ایک کان کا نشان بتلایا ہے اورانگریزی سیاح مسٹر برٹن نے تومدین کی طلائی معدن پرایک خاص کتاب لکھی ہے جس کا نام گولڈ مائنس آف مدین ہے۔ ملک کا دامن اس کے علاوہ جواہرات سے بھی بھراپڑا نظر آتا ہے۔ یمن میں لعل ہوتا ہے اوربیش بہاعقیق اکثر مقامات میں فیروزہ اورجزع یمانی کے معادن بھی پائے جاتے ہیں بحرین کی زمین توگویا موتی پیدا کرتی ہے اورتمام دُنیا کے دامن سوال موتیوں سے بھردیتی ہے۔

عرب کی ملکی تجارت

عرب قدیم الایام سے تجارت پیشہ ملک ہے۔توریت باب القضاہ 24،26 میں اس کے سونے ،چاندی اوربخُورات کا کثرت سے ذکرمرقوم ہے۔قدیم مؤرخ یوناہیروڈیٹیس کی تاریخ میں عرب کی قدیم تجارت کا خصوصیت کے ساتھ ذکرکیا گیاہے۔موجودہ زمانہ میں اس کی تجارت روم،افریقہ،ایران،ہندوستان اوریورپ کے ساتھ جاری ہے۔1910ء میں صرف موتیوں کی تجارت کی لاگت 12لاکھ پونڈ کے قریب اندازہ کی گئی تھی۔(ارض القرآن)عرب کی تجارت زیادہ تر قافلوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے،عرب میں سڑکیں نہیں ہیں۔کاروانوں کے راستے اکثر وادیوں سے ہوکر نکلتے ہیں،مگرکثرت آمدورفت سے یہ راستے ہمارے ہاں کی سڑکوں سے زیادہ ہموار اوراستوار ہیں۔عرب میں ابھی تک قافلوں کے وہی راستے ہیں جوقدیم الایام سے چلے آتے ہیں یہ ان کی قدامت پسندی کی خاص دلیل ہے۔ان میں زیادہ معروف وہ راستے ہیں جودمشق سے بغداد،ریاض سے مکہ معظّمہ اورمکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ اورمسقط سے بغداداوردمشق کوجاتے ہیں اوراب توحلب سے لے کرمدینہ منورتک ریلوے جاری ہے جوحجازریلوے کے نام سے مشہور ہے اور برابراطراف وجوانب میں ریلوے اورموٹرگاڑیوں کے انتظام خصوصاً عراق وشام کے علاقوں میں ہوتے جاتے ہیں۔

ملک عرب کی تقسیم قدیم

یونان وروم کے قدیم جغرافیہ دان ایراستینوس،استرابواورپلنی نے عرب کودوقدرتی حصوں میں تقسیم کیاہے شمالی اورجنوبی،لیکن اس سے زیادہ مقبول اورپسندیدہ دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس کی تقسیم ہے اوراب تک یورپین جغرافیہ نویس اورسیاح اسی تقسیم کی تقلید کرتے ہیں۔بطلیموس نے تمام ملک کوتین طبعی حصوں میں تقسیم کیاہے،عرب آبادان (العرب المیمونۃ)ARABIA FLEX اورعرب ریگستان (العرب الرمال)Arabia Deserta اورعرب سنگستان (العرب الحجر)Arabia Petereca

عرب آبادان

عرب آبادان یاعرب المیمونہ،بقیہ تمام جزیرہ نمائے عرب کوجومغرب میں بکراحمر،مشرق میں خلیج فارس،جنوب میں بحرہند اورشمال

میں عرب سنگستان اورعرب ریگستان پر مشتمل ہیں،جس میں بحر احمر کے ساحل حجاز اور بحر احمرو ہند کے ساحلوں پر یمن،اور حضر موت اور خلیج فارس کے ساحل پر عُمّان و بحرین اوروسط عرب میں یمامہ اورنجد داخل ہیں۔

عرب سنگستان

عرب سنگستان یاعرب الحجر مغرب میں مصر کی سرحد سے جزیرہ نمائے سینا سے گزر کرمغرب میں بصرہ پرختم ہوتا ہے۔ جوعرب کاایک قدیم شہر ہے۔شمال ومغرب میں تدمرتک اسکی حد ہے اوراس کی پشت پرشمالی ومغربی یہودیہ اورفلسطین کا ملک واقع ہے جنوب میں عرب ریگستان اورعرب آباداں ہے۔

عرب ریگستان

عرب ریگستان کی مشرقی وشمالی حدنہر فرات والجزائر سے شروع ہوکرمغربی وشمالی حد میں عرب سنگستان یاعرب الحجر کی مغربی وشمالی حد پرختم ہوتی ہے،جنوب میں عرب آباداں یاعرب المیمو نہ واقع ہے۔

یونانی اوررومانی فاتحین نے عرب بیریا(عرب سنگستان)اورعرب ڈزرنا(عرب ریگستان)کوفتح کرلیا تھا۔اس لئے وہ اس کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے،عرب آباداں کے صرف ساحلوں سے اُن کو آگاہی تھی اورایک آدھ غلط سلط اندرونی قبائل واقطاع کے نام بھی انہوں نے سن لئے تھے ۔حسب تحقیق ڈاکٹر اسپرنگر،بطلیموس نے اپنے جغرافیائی حالات میں عرب آباداں کے 54 قبائل ،461 مقامات 50 کوہستانی سلسلے اور4 دریاؤں کاذکر کیا ہے،اس کے علاوہ اسطفینوس Stephen اورپلینی Pleny نے بھی بعض نام گنوائے ہیں لیکن اسباب خواہ جو کچھ ہوں،مگر حقیقت یہ ہے کہ دس پانچ ناموں کے سوا،اب وہ سب غیرمعروف ہیں۔عرب سنگستان وریگستان سے یونانیوں اوررومانیوں کو واقفیت تھی ،کیونکہ ان پر انکا قبضہ تھااور انہوں نے عربی آبادیوں (کے ناموں کو) مٹا کر یونانی نام سے یونانی اوررومانی شہرقائم کرلئے تھے تاہم جن ناموں کے اتحادواشتراک کا حال معلوم ہواہے وہ حسب ذیل ہیں۔

تُدّمر

اس علاقے میں سب سے مشہورتر مقام یہی تھا،یہ انتہائے شمال میں فلسطین کے قریب عرب کا آخری شہر ہے۔اسفار یہود میں ہے کہ اِس کوحضرت سلیمان علیہ السلام نے بنوایا تھا(ملوک اول 9-19) بہر حال یہ ایک عرب ریاست کادارالامارت تھا،رومیوں نے جب 30ء میں فتح کیاتو اس کا نام پالمائیرر کھ دیا(جوزوفس جلداول ص438)

ربات مواب

شہر بحرمیت کے قریب عرب سنگستان میں موابی عربوں کادرالحکومت تھا،رومیوں نے اس کا نام اریوپولوس رکھا تھا315ء میں زلزلہ سے تباہ ہوگیا۔(بُواب،ص202)بصریٰ جس کورومیوں نے بگاڑ کر بوسٹرہ بنایا ہے،وہ بھی اسی شہر(بصرہ) کے قریب تھا اوراب بھی اس

کا نشان ہے یہ اودی عربوں کا خاص مقام تھا۔(بوانص 202)

الرقیم

اس کو عبرانی سلاع اور یونانی پٹرا کہتے ہیں یہ شمالی عرب میں پہلے مدیانی حکومت کے ماتحت ایک دارالامارت تھا۔ پھر نبطی عربوں کا دارالحکومت بنا، رومیوں کے عہد میں بھی اس کو خاص اہمیت تھی۔(بوان 202)

رباتِ عموں

ربات عموں، عمونی عربوں کا عرب ریگستان کے شمالی و مشرقی حصہ میں دارالحکومت تھا، اس کو یونانیوں نے فلاڈلفینا کا نام بخشا تھا کیونکہ تیسری صدی ق م میں اس کو شاہ بطلیموس فلاڈلفیوس نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔ (جوزفس جلد اص 192) ان لوگوں کو بعض جزائر اور ساحل عرب سے بھی واقفیت تھی۔

بطلیموس سے سو برس پیشتر ایک یونانی مصری نے جس کا نام معلوم نہیں ہے، نے جہاز رانوں کیلئے بحری جغرافیہ (چارٹ) ترتیب دیا تھا، جس میں اس نے بحر عرب کے جزائر پر جو قریب ہندو اسکندریہ کے سرراہ واقع ہیں، روشنی ڈالی ہے وہ پہلے بحر عرب میں عرب کے ایک جنوبی ساحل یودیموں Eudaenon کا ذکر کرتا ہے جس کو عدن سمجھنا چاہیئے، اس کی نسبت اس کا بیان ہے کہ مصر و ہند کے درمیان یہ ایک تجارتی منڈی ہے جو کہ اب بھی ہے۔

عرب کی تقسیم قدم

جزیرہ نمائے عرب دس علاقوں میں منقسم ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(1) علاقہ سینا

ملکی جغرافیہ میں علاقہ طور کے نام سے مشہور ہے، یہ علاقہ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کے درمیان خدیو مصر کے ماتحت ہے، اسی علاقہ میں وہ جبل مقدس ہے جو تمام آسمانی کتابوں میں کوہ طور کے نام سے مشہور ہے اور اسی کوہِ مقدس پر جناب موسیؑ کو کرشمہ قدرت نظر آیا اور احکام توریت نازل فرمائے گئے ڈاکٹر بک Dr.beck کا بیان ہے کہ اصل جبل سینا (کوہ طور) وہ ہے جو خلیج عقبہ کے عین سرے پر واقع ہے، اس کوہستانی سلسلہ کو جبل موسیٰؑ کہتے ہیں اس کی سب سے اونچی چوٹی کوہ حریب ہے۔

(2) علاقہ حجاز

بحر احمر کے کنارے علاقہ سینا شروع ہو کر، ساحل یمن تک تمام ہو جاتا ہے اس علاقہ کا ایک پورا حصہ نا قابل زراعت ہے اسی علاقہ میں شہر مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ (زادہ اللہ شرفھما) واقع ہیں جہاں کی خوش نصیب زمین سے اسلام نے ابتدائی نشو نما پائی۔

(3) تہامہ

بحرقلزم کے ساحل سے کچھ فاصلہ پرایک پہاڑی سلسلہ شروع ہوا ہے،اس کوہستانی سلسلہ اورساحل بحرقلزم کے درمیانی علاقہ کوجو مکہ معظّمہ سے لے کریمن کے شہر"مُخا" تک چلا گیا ہے۔تہامہ کہتے ہیں اس کو اکثر قدیم جغرافیہ نویسوں نے" الغور" کے نام سے بھی لکھا ہے۔اسی علاقہ میں شہرحدیدہ،نوبہ اورمخا واقع ہیں اور مخا تو کافی (Coffee) کیلئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔

(4) یمن

یمن کے شمال میں حجاز،جنوب میں خلیج عدن،مغرب میں بحرقلزم اورمشرق میں حضرموت واقع ہے عرب کے تمام علاقوں میں یہ علاقہ سب سے زیادہ سرسبزوشاداب ہے۔قدیم زمانہ میں علاقہ حضرموت مع اپنے توابعات مہرہ شجراورعمان کے،سب اسی میں شامل تھے۔لیکن اب شامل نہیں،شہرصنعا اس علاقہ کا درالحکومت ہے اور بہت بڑاخوبصورت شہر ہے یمن کے بلندمقامات جن کوجبل الیمن کہتے ہیں اُن میں بہت سی وسیع اورزرخیز آبادیاں ہیں ،جہاں قہوہ ،وسمہ ،نیل کھجورسب قسم کی ترکاریاں اورپھل پیداہوتے ہیں۔آب وہوا یہاں کی معتدل ہے۔خزاں اور بہار میں دودفعہ پانی برستا ہے۔قدیم زمانہ سے یمن کی تجارت مصر،ہندوستان،شام اورایران وغیرہ کے ساتھ جاری ہے۔یہاں کے اکثر باشندے زیدیہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کچھ توتجارت پیشہ اور کچھ کاشتکار ہیں۔

(5) حضرموت

بہت وسیع علاقہ ہے جوجنوب ومشرق کے ساحلوں سے ہوتا ہوا دورتک ملک کے اندرونی حصہ میں داخل ہوجاتا ہے۔اس علاقہ میں کثیرالتعداد حکومتیں قائم ہیں۔جہاں جداگانہ امیرقبائل حکومت کرتے ہیں،اس میں کوئی قابل الذکر مقام نہیں۔

(6) علاقہ عُمّان

اس کے شمال اورمشرق میں خلیج فارس واقع ہے،مغرب میں حضرموت اورجنوب میں بحرہندواقع ہے،یہاں ایک خارجی فرقہ کا حاکم حکمران ہے۔جونوعی حکومتِ برطانیہ کا زیرفرمان ہے شہرمسقط اس کا دارالحکومت ہے مسقط مشہور بندرگاہ اورتجارت گاہ ہے،مکہ جانبوالے حاجی صاحبان ضرورت کی اشیا یہیں سے فراہم کرتے ہیں۔

(7) علاقہ بحرین

یہ علاقہ پہلے یمامہ کوملاکر العروض کے نام سے مشہور تھا۔اس کا قدیم دارالحکومت شہر یمامہ تھا جسے پہلے جَو کہتے تھے۔مصنف یاقوت جو یمنی اپنی کتاب معجم البلدان میں العروض سے صرف یمامہ ہی کومراد لیتا ہے۔آخر میں یہ علاقہ جزیرہ بحرین کے شامل ہوجانے سے اسی نام سے مشہور ہوگیا۔

(8) علاقہ نجد

اس علاقہ کے شمال میں صحرائے شام جنوب میں الربع الخالی مغرب میں حجاز اور مشرق میں عراق واقع ہے۔ یہ علاقہ ایک وہابی حاکم کے زیر حکومت ہے۔ اس کے شمالی حصہ میں جبل الشمر کے نام سے ایک ریاست مشہور و معروف تھی۔ جو پہلے حکومت عثمانیہ کے زیر فرمان تھی اب خود مختار ہے۔

(9) الربع الخالی

حضرموت کے شمال میں ایک وسیع صحرا ہے۔ جو ربع الخالی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بالکل غیر آباد اور ناقابل زراعت قطعہ زمین ہے۔

(10) دیار اثیر

(آسر) وہ قطعہ زمین ہے جو حجاز اور یمن کے درمیان ایک ریگستان، چٹیل میدان کی صورت میں واقع ہے۔ حجاز کے شمالی حصہ میں کوہستانی سلسلہ ہے وہ قدیم زمانہ میں بنی ادہم اور بنی مدین کے عربی قبائل کا مسکن تھا۔

ملک عرب کے وہ مقامات جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں

فاران

عرب کے قدیم جغرافیہ دان، توریت کے اقتباسات اور بڑے بڑے محققین کی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہوگیا ہے کہ مکہ کے پہاڑوں کا نام فاران ہے۔ حدیدہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کے آٹھویں بیٹے حَدَد کی طرف منسوب ہے اور توریت میں حداد کے نام سے مذکور ہے۔ زبور باب 2 کی ایک آیت میں جس قربان گاہ میں قربانی کرنے کی تمنا کی گئی ہے۔ یہ قربان گاہ مکہ ہی ہے۔ جو الفاظ قرآنی میں اس طرح بیان گیا ہے۔ اَوَّلَ بَيْتٍ وضِعَ الذی ببکۃ مُبارَکۃ سب سے پہلا (خدا کا) گھر جو لوگوں (کی پرستش) کیلئے بنایا گیا۔ وہ (شہر) مقدس مکہ میں ہے۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ موجودہ مکہ معظّمہ ہی وہی مکہ ہے۔

اسی دُعا میں

حضرت داوٗدؑ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مورہ کو برکتوں سے ڈھانک لیتے ہیں جب پورے سلسلہ واقعات اور مناسب مقامات پر غور کیا جاتا ہے تو مکہ سے حقیقتاً مکہ معظّمہ ہی ثابت ہوتا ہے تو یقیناً مورہ سے مروہ کے تسلیم کئے جانے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر مروہ وہی ہے جو زبور میں مورہ کے نام سے مذکور ہے۔ مدیان یا مدین زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک کا علاقہ مدین کہلاتا ہے۔ یہاں کے رہائشی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں جو کہ قطورا کے بطن سے ہیں۔ ضمیمہ بائبل ص 114 کتاب خزقیل

کی 27-19-24۔آیتوں میں قانہ اور فاران وغیرہ کا عدن کے ساتھ نام آیا ہے، یہاں اوفر نامی ایک دوسری بندرگاہ تھی، حضرت سلیمان ؑ عیلاب سے چل کر یہیں اوفر آتے تھے دیلوک اول 9-28۔ اوفر کا توارت میں متعدد بار نام آیا ہے یہ ایک تجارتی منڈی تھی۔ سونا کثرت سے یہاں آتا تھا۔ عدن جو اب تک موجود ہے اس کی تجارت کی اُس وقت بھی دھوم تھی۔

یمن کے شہروں میں سے سبا کا نام بھی توریت میں آیا ہے یہاں کی ملکہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں آئی تھی۔(ملوک دوم۔10-1-12)۔ سبا کے علاوہ یمن کے دوسرے تجارتی مقامات مثلاً اوزال کا نام بھی دولتمندی کے لحاظ سے کافی مشہور ہے۔(کتاب حزقیل 27-19)۔ اوزال وہاں واقع تھا جہاں اب صنعا واقع ہے۔ شمالی عرب میں حجاز کے ایک قطعہ میں حویلا واقع تھا۔ جہاں بنی اسمٰعیل کی آبادی تھی۔(تکوین 25-18)۔عربوں کے ایک اور مسکن کا نام حور لعل بتلایا گیا ہے(تاریخ ثانی 16-7)۔اس کے متعلق معلوم نہیں کہ یہ کہاں واقع تھا۔ چونکہ فلسطین کے ساتھ اس کا ذکر ہے اس لئے گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ علاقہ شاید شمالی عرب میں واقع ہوگا۔

مِلک عرب کی تقسیم جدید

اقطاع عرب

عرب جغرافیہ نویسوں نے ملک کو اس کی حدود طبعی کی بناء پر تقسیم کیا ہے۔ عرب عراق و عرب شام کو حسب ذیل پانچ صوبوں پر تقسیم ہے۔

1۔تہامہ 2۔حجاز 3۔نجد 4۔یمن 5۔عروس

اس تقسیم کا اصل معیار جبل السترا ۃ قرار دیا گیا ہے جو عرب کا سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ ہے۔ یہ سلسلہ انتہائے شمال یعنی بَرُّ الشام سے شروع ہو کر انتہائے عرب یعنی یمن میں اختتام پذیر ہوتا ہے۔ س سلسلہ نے عرب کو مشرقی و مغربی دو طبعی حصوں میں منقسم کر دیا ہے، مغربی حصہ مشرقی حصہ سے چھوٹا ہے۔ وہ عرضاً دامن کوہ سے ساحل بحر احمر تک اور طولاً حدود عرب شام سے مدین تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصہ کا نام حجاز ہے۔ حجاز کا جنوبی حصہ بطرف یمن جونشیب و پست ہے تہامہ اور غور بھی کہلاتا ہے جس کے معنی پستی کے ہیں مشرقی حصہ عموماً بلند اور فراز ہے اور وہ کوہِ سروات سے اُتر کر وسط ملک سے ہوتا ہوا عراق تک چلا گیا ہے۔ اس مشرقی حصہ کا نام نجد ہے جس کے معنی فراز و بلند کے ہیں۔ تہامہ اور نجد کے درمیانی اور کوہستانی حصہ کو بھی حجاز اس لئے کہتے ہیں کہ وہ دونوں ملکوں کے درمیان ایک حاجز(حاجب) اور پردہ ہے۔ عراق اور اس کی جنوبی حدود، نجد سے خلیج فارس تک یمامہ، عمان اور بحرین وغیرہ جو علاقہ ہے اُس کو عروض (ترچھا) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ترچھا اور خم دار ہے۔ حجاز، نجد اور عروض کے بعد جنوبی حصہ میں ساحل بحر احمر سے ساحل عمان تک کا علاقہ جو ساحل بحر عرب پر واقع ہے جو اپنی برکات اور زرخیزی کی بناء پر یمن کے نام سے مشہور ہے۔

فاضل معاصر صاحب "ارض القرآن" کو یمن کی وجہ تسمیہ میں غلط فہمی ہوئی ہے یمن کا یمن سے ماخوذ ہونا ظنی اور قیاسی ہے، اصلاً یمن یمان سے ماخوذ و مستخرج ہے جس کے معنی سیدھی طرف کے ہیں چونکہ خانہ کعبہ سے اور علاقہ حجاز سے ملک یمن سیدھے ہاتھ کی طرف واقع

ہے۔اس لےاسے یمان کہاجا تا تھاجوکہ بعدمیں کثرتِ استعمال سےیمن کہاجانے لگا۔(ملاحظہ ہونقشہ ارض القرآن متعلقہ ص12)

مزید برآں چونکہ اہل جغرافیہ کے نزدیک تہامہ کوئی مستقل صوبہ نہیں بلکہ حجاز کاایک ٹکڑاہےاس لئےعرب کے حسب ذیل صرف چارصوبےقرار دیئے جاسکتے ہیں۔

1۔عروض2۔نجد3۔یمن4۔حجاز

ان چاروں صوبوں میں سے ہرصوبہ متفرق چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر منقسم ہے۔

قدیم اخبار وآثار سے بھی تہامہ اورحجاز کے ایک علاقہ ہونے کا کافی ثبوت ملتاہے اورسب سے واضح اورقوی ثبوت یہ ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موطن ومسکن کے القاب وخطابات مشرفہ کتب سیر وحدیث میں برابر الابطحی التہامی اوربعض مقامات میں المکی التہامی مرقوم ہیں جوان دونوں مقامات کے اتصال واتحاد کوقطعاً ثابت کرتے ہیں۔

علاقہ عروض

عروض جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے،وہ قطعہ ملک ہے جومشرقی نجداورحدودعراق سے ساحل خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔اس صوبہ میں یمامہ بحرین اورعمان تین علاقے واقع ہیں ،بحرین اورعمان ساحل بحرفارس پرواقع ہیں ،اور یمامہ بحرین اورعمان کے پارنجد حجاز اوریمن کے وسط میں واقع ہے۔

1۔یمامہ

یمامہ کا حدود اربعہ یہ ہے۔مشرق میں عمان اور بحرین،مغرب میں حجاز اوربعض حصہ یمن کا،مغرب میں احقاف یاالربع الخالی،شمال میں نجد واقع ہے۔یمامہ کا وہ حصہ جونجد سے متصل ہے،آباداورسرسبز ہے۔یمامہ کی قدیم تاریخ یہ ہے کہ وہ قبائل طسم وجدیس کامسکن تھا۔ان قبائل کے عہد میں حجریاقریہ اور جعدۃ،یمامہ کے مشہور شہر تھے۔یمامہ میں طسم اورجدیس کی بعض عمارات اورقلعوں کے آثار زمانہ اسلام تک باقی تھے جن میں سب سے بڑی عمارتیں قصرشموس،قصرمغنق تھیں۔(معجم البلدان)شہرحجرجس کا نام القربہ ہے ان قبائل کی حکومتوں کا صدرمقام تھا،زرقاجس شہرت یافتہ عورت کی نسبت آجتک مشہور ہے کہ وہ بہت تیز نگاہ تھی۔دشمن کی فوج کوتین روز کی مسافت سے دیکھتی تھی اسی یمامہ کی رہنے والی تھی۔مشہورقبیلہ ربیعہ کی بعض شاخین عہدقدیم سے یہاں آبادتھیں۔ابن خلدون نےلکھا ہے کہ بنوعجل کی آبادی بھی نہیں تھی۔قریب زمانہ اسلام میں اس سرزمین میں عرب کاایک مشہورقبیلہ بنوحنیفہ آبادتھاجوبکرابن وائل کی ایک شاخ تھا۔بنوحنیفہ نے خدمت نبوی میں حاضرہوکر8ہجری میں عقیدت کشی کااظہارکیا۔اسی ملک وقبیلہ کافرزندمسیلمہ(الکذاب)تھاجس نے آخرعہدنبوی میں دعویٰ نبوت کیااورحضرت ابوبکر کے عہد میں ایک جنگ عظیم کے بعدوحشی کے ہاتھ سے ماراگیا۔بنواسدکاایک مشہورقبیلہ اسلام سےتقریباً ایک صدی پیشتریہاں آبادتھاجوحکومت کےلحاظ سےآلِ کندہ کاماتحت تھا۔

2۔ بحرین

جس کا دوسرا نام الاحساء ہے۔ایک ساحلی مقام ہے اس کے اوپر عراق اور اس کے نیچے عمان اور اس کے مغربی پہلو پر یمامہ اور مشرقی جانب خلیج فارس واقع ہے۔بحرین موتیوں کیلئے مشہور ہے۔اس کے جزائر اور ساحل موتیوں کی کان ہیں۔جہاں ہر سال ہزاروں کشتیاں اور ہزاروں غواص موتیوں کے نکالنے میں مشغول رہتے ہیں لیکن اُن کی محنت کا ثمرہ موتیوں کے عرب تاجر اور یورپ کی کمپنیاں زیادہ تر حاصل کرتی ہیں۔

قبیلہ جدیس جو طسم کو مٹا کر یمامہ کا مالک ہوگیا تھا حسان شاہ یمن کے حملوں سے گھبرا کر یہیں پناہ گزیں ہوا تھا بعد میں عدنانی قبائل میں سے قبیلہ عبدالقیس کا یہ مسکن بنا۔بعض قبائل ربیعہ بھی یہاں آباد تھے۔چھٹی صدی عیسوی میں بحرین اہلِ فارس کے قبضہ میں تھا۔اور ایک طرف سے مناذرہ (آل منذر) جو عراق (حرہ) اور اس کے آس پاس والے ملک میں ایرانیوں کے نائب تھے۔بحرین کے حاکم تھے۔طرفہ جو عرب کا ایک مشہور شاعر تھا آل منذر کے اشارے سے یہیں قتل ہوا۔2ہجری میں یہاں کا حاکم منذر بن عادی تھا جو پیغام اسلام پہنچنے پر اپنی تمام عرب رعایا کے ساتھ مسلمان ہوگیا اور یہاں سے بنو عبدالقیس کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔بعد اسلام اس ملک میں سب سے بڑا واقعہ یہ ظاہر ہوا کہ قرامطہ جو نیم مسلمان مجوسی تھے ان کی طاقت کا مرکز، فارس سے قربت کی بناء پر یہی ملک تھا۔

3۔ عُمّان

عُمّان، بحرین کے بعد خلیج فارس سے ہٹ کر بحر عمان کے ساحل پر واقع ہے۔مشرقی جانب بحر عمان، مغرب کی طرف الربع الخالی، جانبِ جنوب بحرین، جانبِ شمال شہر یمن واقع ہے۔ساحلی مقامات نہایت آباد اور سرسبز ہیں۔جبل اخضر یہاں کا سب سے بڑا پہاڑ ہے جس کی بلندی 3000 میٹر ہے۔ملک عمان کے پہاڑ معدنیات سے اور اس کے دریا موتیوں سے اور اس کی وادیاں غلہ اور خوشبودار لکڑیوں سے مالا مال ہیں۔عمان کے گھوڑے، گائیں اور بکریاں بھی مشہور ہیں۔

مؤرخینِ عرب کا بیان ہے کہ عمان، عمان بن قحطان کی طرف منسوب ہے۔لیکن بروایت توریت یہ عمان ابن لوطؑ کی طرف منسوب ہونا چاہیے۔قبیلہ ازد جس کو بنی اسد بھی کہتے ہیں، قبل اسلام اس کی ایک شاخ یہاں آباد تھی آجکل یہ ملک ایک مستقل ریاست ہے جس کا پایہ تخت مسقط ہے۔اہلِ ملک زیادہ تر اباضی طریقہ کے خارجی ہیں، ملک کا رقبہ کم از کم 80 ہزار میل مربع اندازہ کیا جاتا ہے۔

علاقہ نجد

نجد، وسط عرب میں ایک سرسبز و شاداب اور بلند و فراز ملک ہے۔سطح آب سے 1200 میٹر بلند ہے اور تین طرف سے بے آب صحراؤں سے محیط ہے اور اسی لئے وہ اجنبی نفوذ اور بیرونی آمد و رفت سے محفوظ ہے۔اس کے شمال میں صحرائے شام، مغرب میں صحرائے حجاز، مشرق میں صحرائے دہنا (الربع الخالی) اور جنوب میں یمامہ ہے۔

نجد عرب کے مشہور قبیلہ بکر ابن وائل کا مسکن تھا، کلیب جس سے بڑھ کر عرب جاہلیت کے نزدیک کوئی معزز نہیں ہوا۔ بکر بن وائل کا سردار تھا جس کے قتل کے بعد انتقام کیلئے بکر و تغلب میں چالیس سال تک آتشِ جنگ مشتعل رہی۔ یہیں کندہ کے نام سے ایک چھوٹی سی عربی حکومت قائم ہوئی جو مناذرہ ملوک حیرہ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھی۔ قُباد، پدرِ نوشیرواں نے جب مزدک کا مذہب اختیار کیا تو مناذرہ کے مقابلہ میں شہنشاہ فارس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے شاہان کندہ نے بھی اس مذہب کو اختیار کر لیا تھا اور آخر یہی اُن کی تباہی کا باعث ہوا۔

عربی زبان کو نجد کی آب و ہوا سے عجیب و غریب مناسبت ہے۔ مُہلہل، جو عربی شاعری کا آدم کہلاتا ہے۔ اسی نجد کی خاک سے پیدا ہوا تھا اور کلیب مذکور کا حقیقی بھائی تھا۔ امرأ القیس جو عرب کا مُلک الشعرأ تھا اسی نجد کی حکومت کندہ کا آخری شہزادہ تھا۔ اور آج بھی جبکہ امتداد زمانہ اور اختلاط اقوام کے سبب سے فصیح عربی زبان کا نام جزیرۂ عرب میں کہیں موجود نہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں قدیم فصیح عربی زبان بلا اختلاط موجود اور محفوظ ہے۔

نجد عہدِ قدیم سے قبائل عدنانیہ کا مسکن ہے۔ آخر عہد میں کہلانی قبیلہ کی مشہور و معروف شاخ ''طے اجّا ء سلمی کی پہاڑیوں میں آباد ہوگئی تھی جن کو شعرأ طے نے ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد کیا ہے چھٹی صدی عیسوی میں جو ظہورِ اسلام کا زمانہ ہے، نجد میں غطفان قبیلہ بستا تھا جن کی تادیب کیلئے خود آنحضرتؐ مع صحابہ 4 ہجری میں نجد تشریف لائے تھے۔ اس مہم کا نام اہلِ سیرت (والمغازی) کے ہاں غزوۂ ذات الرقاع ہے۔ قبیلہ ہوازن اور سلیم نجد کے مغربی حصہ پر قابض تھا قبیلہ حطیم کی بھی ایک شاخ نجد میں تھی۔

آجکل نجد شمر، قصیم اور عارض تین حصوں پر منقسم ہو کر دو شیوخ کے زیرِ حکومت ہوگیا ہے۔ شمالی حصہ جو صحرائے شام و عراق و حجاز کے ساتھ متصل ہے۔ شمر کہلاتا ہے اور کبھی اپنے دارالامارہ حائل کے نام سے حائل پکارا جاتا ہے۔ جبل الشمر اور جبل سلمٰی اور کچھ وادیاں اس تقسیم میں داخل ہیں۔ شمر کی حکومت آجکل آل رشید کے قبضہ میں ہے۔ آبادی کا تخمینہ تین لاکھ ہے شمر میں قبیلہ طے کی ایک شاخ شمر نامی آباد تھی، جس کے نام سے یہ ملک موسوم ہوگیا۔

عارض جو یمن کے صوبہ احقاف سے متصل ہے۔ نجد الیمن کہلاتا ہے اور آجکل نجد سے عموماً یہی سرزمین مراد لی جاتی ہے۔ امیر نجد آل سعود ہے جس کے دارالامارۃ کا نام مدینۃ الریاض ہے۔ قصیم کا جنوبی حصہ اسی حکومت کے تابع ہے۔ نجد کا یہ حصہ شمر سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے اثر سے عارض کے باشندے زیادہ تر اہلِ حدیث ہیں اور انکی مردم شماری کم و بیش 5 لاکھ ہے۔ نجد کے چھول، گھوڑے اور اونٹ مشہور ہیں۔ ہر قسم کے میوے یہاں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ وادیوں اور پہاڑوں کے دامن میں زراعت بھی ہوتی ہے۔

علاقہ یمن

یمن عرب کا سب سے زیادہ سرسبز سب سے زیادہ آباد اور سب سے زیادہ وسیع اور سب سے زیادہ متمدن ملک ہے۔ (اسی

مناسبت سے اسے اکثرعروس الملک لکھا گیا ہے۔) جو قبل اسلام اور بعد اسلام مرکز علم رہا ہے۔اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔عمارات اورقلعوں کے آثار یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔جو قدیم شاندار تمدن کا پتہ دیتے ہیں،قرب وجوار کی سلطنتوں نے مثل روم وفارس اورحبشہ نے اس پر متواتر حملے کئے ہیں اور کبھی فتح بھی کیا ہے۔یونانی اوررومی مؤرخین کے پاس یمن کے متعلق بعض اہم معلومات ہیں اور کچھ معلومات آثارِقدیمہ کی مدد سے یورپین علمائے آثار(ارکیالوجسٹ) نے حاصل کئے ہیں۔

صوبہ یمن کے حدودطبعی یہ ہیں۔اگرچہ اس کے حدودِحکومت مختلف زمانہ وحکومت میں مختلف رہے ہیں۔جنوب میں بحرعرب، مغرب میں بحراحمر،شمال میں حجازنجداور یمامہ اورمشرق میں عمان اور بحرین ہے۔اس ملک کی ابتدائی تاریخ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے،قدامت کی تاریخ میں مخفی ہے۔جہاں تک معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس سرزمین کے مختلف اقطاع میں وقتاً فوقتاً عمالیق اہلِ معین ،عاد،سباء کی عظیم الشان سلطنتیں یہاں قائم ہوئی ہیں(ان بیانات کی تفصیل قبائل عرب میں آئے گی)جنھوں نے بڑی بڑی عماتیں تعمیر کیں۔جن کی عظمت کے آثاراب تک باقی ہیں۔زراعت کی ترقی کیلئے وادیوں میں بڑے بڑے بندآب ہیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہورسدِ مآرب ہے۔جس کا قرآن مجید میں بھی ذکرہوا ہے۔ہندوستان،فارس،حبش،مصراورعراق کی تجارتیں انہیں کی وساطت سے قائم تھیں پہاڑوں سے معدنیات اور جواہر نکالتے تھے۔سامانِ عطریات ونجورات انہیں کے ملک سے تمام مہذب ممالک میں پہنچتا تھا۔آخرعہد میں تقریباً70 سال کیلئے اہلِ یمن پرغیر قابض ہوگئے تھے جن کوآخر کاراہلِ فارس نے یمن سے نکال دیا اورخود قابض ہوگئے ظہورِاسلام کے وقت اہلِ فارس کی طرف سے باذان یہاں کا گورنر تھا۔جو 7 ہجری میں مسلمان ہوگیا۔بقیہ اہلِ یمن جو یہودی تھے۔10 ہجری میں داعیٔ اسلام حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ہمدان یمن کا ایک مشہور قبیلہ تھا تمام قبیلہ صرف ایک دن میں مشرف بااسلام ہوا۔یہ عظمتِ مرتضویؑ کے کمالِ صداقت کے اعجازنما فیوض تھے۔

یمن کے مشہور مقامات کے نام یہ ہیں۔معین،مآرب،ظفار،شبان،اوزال،براقش،نشق،خولان،قرن،شیوہ۔عمران اورصنعا وغیرہ ان میں اکثر مقامات ویران یا دریائے ریگ میں غرق ہیں۔بعض موجود ہیں لیکن ان کے قدیم نام متروک ہیں۔ملک کی کثرتِ آبادی وسرسبزی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ملک کی تقسیم پہلے جن صوبوں پرتھی اورجن کواہلِ عرب مخلاف کہتے ہیں۔مؤرخ یعقوبی نے ان کی تعداد 84 بتائی ہے۔یمن کی بڑی بڑی آبادیاں یہ ہیں۔حضرموت،احقافِ صنعا،نجران،عسیر جوعلی الترتیب مشرقی جنوبی حدودیعنی حضر موت سے جنوبی مغربی حدود یعنی حجاز تک ساحلِ بحر ہندوبحرِ احمر پرواقع ہیں۔

حضرت موت

ساحل بحر ہند پرواقع ہے۔شمال میں بحر ہند،جنوب میں الربع الخالی اورالاحقاف اورمغرب میں صنعائے یمن یہ ایک نہایت قدیم آبادی ہے۔قحطان یایقطان جویمن کا پدراول تھا۔اُس کے بارہ بیٹوں میں سے توریت نے ایک کا نام حضرماوت بتایا ہے۔اس بنا پراہل تاریخ یقین کرتے ہیں۔کہ یہ قطعہ زمین اپنے باشندۂ اول حضرماوت بن قحطان کے نام پر ہے۔

4۔نجران

بلاد احقاف اور عسیر کے درمیان ایک مختصر سی آبادی تھی۔عہد قدیم میں یہاں بنو اسماعیل میں سے بحیلہ ابن نزار آباد ہوا تھا۔(یعقوبی ج۔1،ص255) عہد اسلام سے کچھ عرصہ قبل روم وحبش کی کوشش سے یہاں عیسائیت پھیل گئی تھی۔یمن کی یہودی حکومت نے ان عیسائیوں کو یہودی بنانا چاہا۔لیکن روم وحبش جو مسیحی ہمسایہ سلطنتیں تھیں وہ برابر ان کی حمایت کرتی تھیں۔نجران میں ایک بہت شان دار کلیسا بھی تعمیر ہوا تھا۔جو عربوں میں کعبہ نجران کے نام سے مشہور تھا۔۹ھ میں اہل نجران کا وفد آنحضرت صلعم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا تھا۔

5۔عسیر

بحر احمر کے ساحل پر حجاز اور صنعائے یمن کے مابین واقع ہے۔ یہاں کے باشندے عموماً اہل حدیث ہیں۔امام عسیر ادریسی خاندان کا ہے۔ان ملکی تقسیمات کے علاوہ یمن میں بہت سے ساحلی مقامات اور جزائر ہیں۔مثلاً شحر،مہرہ۔مکلہ،لج،جزائر کوریا،موریا یا جزیرہ بریم وغیرہ۔ان کی حکومت مختلف شیوخ کے ماتحت ہے۔اور وہ زیادہ تر برٹش گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہے۔

زمانہ ظہور اسلام میں یمن حکومت فارس کے ماتحت تھی۔۹ ہجری میں یہاں کا آخری ایرانی گورنر مسلمان ہوگیا اور ملک بلا جنگ و جدل علم اسلام کے زیر سایہ آ گیا۔

علاقۂ حجاز

حجاز بحرِ احمر کے ساحل پر ایک مستطیل صوبہ ہے جس کا نام توریت میں فاران بتایا گیا ہے۔اور جہاں سے تجلّی ربانی کے ظاہر ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔اس کے مشرقی جانب نجد،مغربی جانب بحرِ احمر،شمال میں عرب شام یا عرب الحجر،جنوب میں عسیر اور شمالاً جنوباً کوہِ سروات کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔جس کی بلند تر چوٹی 8 ہزار فٹ ہے،سلسلہ کوہ میں بہت سے چشمے جاری ہیں۔ جہاں گاؤں آباد ہیں۔باغ لگے ہوئے ہیں۔کھیتیاں ہوتی ہیں،کہیں کہیں جنگل ہیں۔دامن کوہ سرسبز ہے۔اور وہاں بھی آبادی ہے لیکن زیادہ آباد اور سرسبز حصہ وہ ہے جو بحرِ احمر کے ساحل پر واقع ہے۔ان مقامات کے علاوہ تمام حصہ ریگستان ہے۔جہاں کسی قسم کی زراعت نہیں ہوسکتی۔حجاز کا سب سے بڑا ساحلی شہر جدہ ہے جو مکہ کی بندرگاہ ہے اس کے بعد دوسرا ساحلی مقام ینبع ہے جو مدینہ کی بندرگاہ ہے۔اندرون ملک کے بڑے شہر مکہ معظّمہ ،مدینہ منورہ اور طائف ہیں۔

1۔مکّہ یا بکّہ

اس کا نام امّ القریٰ بھی ہے۔حجاز کا دارالحکومت ہے۔یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبرؑ(حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی بناء،ایک نوجوان پیغمبرؑ(حضرت اسماعیل علیہ السلام) کی قربان گاہ اور ایک یتیم پیغمبرؐ(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مولد ہے۔یہ شہر ارض البلد 21 درجہ 93 دقیقہ اور طول البلد 40 درجہ 9 دقیقہ پر واقع ہے۔سطح آب سے تقریباً 330 میٹر بلند ہے اس کے چاروں طرف قدرت نے

پہاڑوں کی دیواریں کھینچ دیں ہیں۔ بالفصل شرقاً غرباً تقریباً 3 کلومیٹر اور جنوباً تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر چوڑا ہے۔ شرقی سلسلہ جبلِ خلیج (فلق) جبلِ قیقعان، جبلِ ہندی، جبلِ لعلع اور جبلِ کدأ سے مرکب ہیں۔ آخرالذکر جبل وہی ہے جس کے راستے سے رسول صلعم بروز فتح مکہ میں داخل ہوئے۔ جنوبی سلسلہ جبلِ ابوحدیدہ، جبلِ کدّی اور جبلِ ابوقبیس کے بعض سلسلہ سے مرکب ہے۔ مشرق میں جبلِ ابی قبیس اور اس کے پیچھے جبلِ خندمہ واقع ہے۔ مغرب میں جبلِ عمر واقع ہے۔

حجاز حضرت مسیحؑ سے ڈھائی ہزار برس پہلے کاروانِ تجارت کی ایک منزل گاہ تھا۔ تقریباً دو ہزار قبل مسیحؑ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو یہاں آباد کیا۔ باپ بیٹے نے خدا کے نام پر یہاں ایک قربان گاہ بنائی جس کا نام کعبہ قرار پایا۔ فرزندانِ اسماعیلؑ کی اولاد ایک مدت تک یہاں دیگر قبائل پر بالادست رہی۔ اسکے بعد قحطائی قبائل (بروایت عام) آئے۔ اور انہوں نے اپنا استیلا ظاہر کیا۔ بنو اسماعیلؑ میں سے قصیٰ نے آخر یہاں کی ریاست حاصل کی۔ قصیٰ قریش کے پدرِ اعلیٰ تھے۔ عہدِ اسلام میں قریش یہاں کے مالک تھے۔ امورِ مملکت ایک ایک شیخ خاندان کے زیرِ نگرانی تھے۔ شہر کے علاوہ اسماعیلی قبائل شہر کے آس پاس بھی آباد تھے مکہ کے جنوب میں جو پہاڑیاں ہیں وہ مشہور قبیلہ ہذیل کا مسکن تھیں۔ جنوب کی طرف وادی القریٰ ہے۔ جو قدیم قبائل کا مسکن تھا۔ اسکے اطراف میں قبائل کنانہ رہتے تھے۔ مکہ کے پاس جبلِ حبشی کے دامن میں قبائل احابیش رہتے تھے۔

2۔ مدینہ منورہ

حضورؐ کی ہجرت سے قبل اس شہر کا نام یثرب تھا، ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبیؐ یعنی رسول صلعم کا شہر ہوا۔ کثرتِ استعمال سے ا۔ل قائم مقام مضاف الیہ ہوکر ''المدینہ'' ہوگیا۔ یہ شہر سمندر کی سطح سے 219 میٹر بلند اور طول بلد 39 درجہ اور عرض بلد 24 درجہ شمال خط استوا پر واقع ہے۔ گرمی میں یہاں حرارت کا درجہ 48 درجہ تک بڑھا رہتا ہے۔ اور جاڑوں میں دن کو صفر سے دس درجہ اوپر اور رات کو صفر سے 5 درجہ نیچے ہوتا ہے۔ اس لئے جاڑوں میں اکثر صبح کو پانی یہاں جم جاتا ہے۔ پہلے یہاں عمالیق رہتے تھے۔ لیکن زمانۂ آمدِ اسلام میں یہاں کے عمائد اور قبائل اوس وخزرج آباد تھے۔ محققین حال کا بیان ہے کہ یثرب مصری لفظ ہے۔ ہمارے یہاں کے مؤرخین (اسلامی محققین) کا بیان ہے کہ سب سے پہلے یہاں عمالیق آباد ہوئے تھے اور اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ عمالیق 2200 قبل مسیحؑ میں وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اس بناء پر تعمیر شہر کا زمانہ 1600 ق م اور 2200 ق م کے درمیان ہے۔ عمالیق کے بعد سب سے اول یہود آکر آباد ہوئے ان کے بعد قبیلہ ازد کی دو شاخیں اوس اور خزرج یہاں آکر آباد ہوئیں۔ یہ اوس اور خزرج وہی قبائل ہیں۔ جن کا لقب اسلام میں انصار ہوا۔ اور جنہوں نے اسلام کی دعوت اولین قبول کی اور مسافرین اسلام کو اپنے گھروں میں اُتارا۔ جس کے مکافات میں خدائے اسلام نے انصار کے نام سے اُن کو زندگی جاوید بخشی اور ان کے شہر کو 35 کروڑ نفوس کا مرکز قرار دیا۔

بنولام جوطےٓ کی ایک شاخ تھے، مدینہ کے کوہستانی مقام میں آباد تھی۔ ہمدانی نے لکھا ہے کہ بعد اسلام یہ شاخ دیارِ ربیعہ کو منتقل ہوگئی بنوظفر بھی حسبِ بیان ہمدانی مدینہ کے مقابل ہی سکونت پذیر تھے۔ بنوکلاب جو مشہور قبیلہ تھا وہ مدینہ کے اطراف میں ربذہ، فدک

اورعوالی میں آباد تھا۔بعد اسلام حسب روایات ہمدانی شام کومنتقل ہوگیا۔ جہاں اس نے اپنی ایک ریاست بھی قائم کرلی۔

3۔طائف

حجاز کی جنت ہے۔بے انتہا سرسبز وشاداب ہے۔امرائے حجاز عموماً گرمی وہیں بسر کرتے ہیں۔ابتداً قبیلہ عدنان کامسکن تھا۔بعد میں وہ مشہور قبیلہ ثقیف کے قبضہ میں آیا۔قبل ہجرت آنحضرت صلعم دعوتِ اسلام کے لئے تشریف لائے۔لیکن اہل طائف نے دعوت قبول نہ کی۔8ہجری میں آنحضرت صلعم نے طائف کا محاصرہ کیا9ہجری میں سردار ثقیف عروہ ابن مسعود نے اسلام قبول کیا۔اورخود اپنی قوم کے ہاتھ سے اسلام کی راہ میں مارا گیالیکن اس کی منادی بے اثر نہ رہی۔اسی سال وفد ثقیف خدمت نبویؐ میں حاضر ہوکرعقیدت کیش ہوا۔

4۔جوف ثمود۔تبوک۔خیبر۔اورمدین

ان شہروں کے علاوہ بعض مقامات بھی قابل ذکر ہیں۔مدینہ سے کچھ آگے بجانب شمال وہ میدان واقع ہے۔جہاں ثمود کا قبیلہ آباد تھا جوعوف اور وادی القریٰ کے نام سے مشہور ہے۔اس کے پایہ تخت کا نام حجر تھا۔جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔یہ شہر زیادہ تر اپنے پیغمبر صالح علیہ السلام کے نام سے مدائن الصالح کہلاتا ہے۔9ہجری میں تبوک کو جاتے ہوئے آنحضرت صلعم کا اس شہر سے گذر ہوا تھا۔اسی سے متصل دوسری آبادی شمار ہے۔حجر اب ریلوے اسٹیشن ہے حجر کے بعد ایک اسٹیشن المعظم چھوڑ کر دوسرا اسٹیشن تبوک ہے جہاں آنحضرت صلعم نے رومیوں کی مدافعت کیلئے اقامت فرمائی تھی (اوراسی منزل کے مابین حضرت علی مرتضیٰؑ کی شان میں حدیث منزلت ارشادفرمائی تھی) مدینہ سے مغرب کی جانب خیبر ہے جو یہود کی جنگی قوت کا مرکز تھا۔اور جہاں یہودیوں کے بڑے بڑے قلعے تھے۔7ہجری میں آنحضرت صلعم یہاں تشریف لائے اس کی تسخیر فرمائی۔(یہی قطعہ زمین جناب علیؑ ابن ابی طالب اسداللہ الغالب کی معرکہ آرائی اورقلعہ کشائی کی جلوہ گاہ ہے۔حجر کے مقابل جانب مغرب بحرِ احمر کے ساحل پرشہر مدین آباد ہے جوحضرت موسیٰ علیہ السلام کا دارالہجرۃ اوران کے خسرو یثرو یا حَو باب (حضرت شعیب علیہ السلام) کا وطن اورمدیانیوں کا پایہ تخت تھا۔عہدِظہوراسلام میں یہ تمام شہر یہودیوں کے قبضہ میں تھے۔اور یہاں ان کے بڑے بڑے قبیلے تھے جن کواسلام نے عہدِنبوت میں یکے بعد دیگرے فتح کیا۔

عرب شام

یعنی وہ قطعہ عرب جس کو یونانی عرب سنگستانی کہتے ہیں۔اور جومابین شام،مصر،بادیہ شام،حجاز اورنجدواقع ہے۔یہ عرب کا بہت قدیم حصہ ہے بلکہ اولین حصہ ہے۔اکتشافات جدیدسے بھی پہلے گواس ملک کی وقعت کم نہ تھی کہ اس کے صحرا میں بنواسرائیل کا مسکن۔اس کے ایک پہاڑ پراسرائیل کا ایک پیغمبر(حضرت موسیٰ علیہ السلام) خدا سے ہمکلام ہوا۔اُس کے متصل ارض موعود واقع ہےجس کوخدائے ابراہیم واسحاق ویعقوب علیہم السلام نے فرزندانِ اسرائیل کووراثتاً بخشا۔لیکن اکتشافات جدیدہ کے بعداس کی اہمیت اورزیادہ بڑھ گئی۔یہاں عمالقہ عرب کی آبادی تھی۔انھیں کھنڈروں میں ان کی عظیم الشان حکومت قائم تھی۔جس کا سلسلہ حجاز تک پھیلا ہوا تھا۔اورجس میں

بلقاء، عمان، بصریٰ، مذمر وغیرہ شہر داخل تھے۔ تدمر ایک مشہور تجارتی منڈی تھی۔ زباء یہاں کی ایک ملکہ کا نام تھا۔ جو ہمیشہ عربوں میں ضرب المثل رہی ہے۔ عہد آخر قبل اسلام میں یہ ملک بنوجفنہ ایک عرب خاندان کے زیر حکومت تھا جو غسانہ (غسان) کے نام سے موسوم ہے اور جس کا پایہ تخت بصریٰ تھا۔ قبیلہ جہنیہ کی متعدد شاخیں یہاں آباد تھیں۔ ہمدانی نے لکھا ہے کہ بعد اسلام عرب شام میں تا حلب بنوعجل آباد تھے۔ ربیعہ شاخ طے کی بھی یہیں آبادی تھی۔ بنوخزیمہ کی اکثر شاخیں غزہ کے پاس سکونت پذیر تھیں۔ ظہور اسلام کے وقت یہ تمام اطراف زیر سایہ روم عرب عیسائی امرا اور یہود کے قبضہ میں تھے۔

عرب عراق

عرب عراق سے وہ سرزمین مراد ہے۔ جس کو یونانی عرب ریگستانی کہتے ہیں اور خلیج فارس، دریائے فرات، بادیہ شام اور نجد کے مابین واقع ہے۔ اب عام طور پر لوگ اس کو عراق عرب کہتے ہیں۔ اس حصہ میں بھی عہد قدیم میں عمالقہ عرب نے ایک شاندار حکومت کی تھی۔ قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ یہاں آباد تھی۔ بعد اسلام عہد فاروقی میں اسی سرزمین میں کوفہ اور بصریٰ آباد ہوا جو خالص عربی تمدن کا مظہر اور علمائے اولین کا مرکز تھا۔ جس کی سرزمین میں متعدد علوم اسلامیہ کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اسی عرب عراق میں سنجار نامی مقام م پر نہر فرات کے پاس قبیلہ عبید کی ایک ریاست تھی (قبل اسلام) جس کا آخری بادشاہ ضیزن بن معاویہ تھا۔ اس خاندان کے آثار و عمارات اب تک میدان سنجار میں باقی ہیں۔ زبید شاخ طے بھی اسی مقام میں آباد ہوئی تھی۔ بنوعجل کی ایک شاخ یمامہ سے عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔

ظہور اسلام کے وقت ایک عرب خاندان (مناذرہ) زیر سایہ حکومت فارس یہاں کا فرماں روا تھا۔ اس کا پایہ تخت شہر حیرہ متصل کوفہ تھا۔ (ارض القرآن ج ا ص102، 88)۔

جغرافیہ حال کے مطابق عرب کے مشہور و معروف مقامات

شہر مکہ معظّمہ

(اس کے حالات اوپر لکھے جا چکے ہیں) مزید اطلاع کے لئے ذیل کا اضافہ کیا جانا ضروری ہے۔

یہ شہر بطحا کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور اس کو بلد بھی کہتے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب کو سید البطحا کہتے تھے (ابن ہشام) حضرت ابوطالب کا بیضۃ البلد خطاب تھا۔ (ابن اثیر)۔ یہ شہر بندرگاہ جدہ سے 65 میل پورب کی طرف واقع ہے۔ اس کی آبادی ساٹھ ہزار ہے۔ یہ مقدس وادی اور اس کا مبارک دامن دور دور تک انبیاء و اصفیاء اللہ کی یادگار اور ان کی قابل التعظیم اخبار و آثار سے بھرا پڑا ہے۔ کوہ صفا و مروا، وادی منیٰ، مزدلفہ، جبل سیر، غار ثور، غار حرا اور شعب ابی طالب حدود مکہ کے داخلی مقامات ہیں۔ اور یہ تمام مقدس اور متبرک مقامات

اپنی عظمت اپنی قدامت کا جدا جدا تیار اور مرتب دفتر رکھتے ہیں۔ جو موجودہ سلسلۂ تالیف میں اپنے اپنے مقامات مناسب پر ان شاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

مکہ سے ایک منزل شمال کی طرف حدیبیہ ہے جہاں بیت الرضوان، تاریخ اسلام کا بہت بڑا واقعہ، جس کو حقیقتاً فتح مکہ کی کلید سمجھنا چاہیے۔ 8ھ میں واقع ہوا۔ حدیدہ چھوٹا سا ساحلی مقام ہے۔ حجاج احرام (حج کرنے کے کپڑے) یہیں سے باندھتے ہیں۔

مدینہ منورہ

(اس کے حالات بھی اوپر لکھے جا چکے ہیں) مزید اطلاعات کا حسب ذیل اضافہ ہے۔

مکہ معظّمہ کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں امن و برکت کے اعتبار سے تنزیہ و تقدیس کا یہ دوسرا مقام ہے۔ جہاں سے دعوت اسلام کی ابتدائی آواز پر سب سے پہلے صدائے لبیک سنائی دی۔ جہاں سب سے پہلے اسلام کے قیام، اسلام کے استحکام کی کوششوں میں جان نثاری، وفا شعاری، جاں بازی اور سرفروشی کے عہد و میثاق مستحکم کئے گئے۔ رفتہ رفتہ بارگاہ نبوت میں ان کی صداقت وحمایت پر اتنا اعتبار کیا گیا کہ ان بیگانوں کو یگانوں پر ترجیح دی گئی۔ اور اپنے موطن کو چھوڑ کر ان کی خوش نصیب زمین کو اپنا مسکن پھر مدفن بنایا گیا۔ یہاں کے باشندے (قبیلہ انصار) بھی اپنے قول کے ایسے پکے اور وعدے کے ایسے سچے نکلے کہ جس خلوص وعقیدت سے اسلام کو اپنے گھر لائے تھے۔ اسی جوش ہمت اور زور استقلال سے اس کی حمایت ونصرت میں مستعد اور تیار رہے۔ یہاں تک کہ اسلام کی اصلی نشو ونما اور حقیقی فروغ اسی قطعۂ زمین سے شروع ہوا۔ نزول اسلام کے وقت سے اس شہر کا نام مدینۃ النبیؐ، طیبہ اور دارالہجرۃ مشہور ہوا۔ خلاصۃ الوفاء میں اس شہر کے 95 نام گنوائے گئے ہیں۔ مگر وہ تمام اسماء مبارکہ توصیفی ہیں۔ جو اسلامی مؤلفین کے خامہائے عقیدت کے رشحات ہیں، یہ نام مشہورِ عام نہیں ہیں۔ مکہ معظّمہ کی طرح یہ شہر بھی اہل اسلام کے نزدیک واجب الاحترام ہے اور تقدیس وتقدیم کے جوہروں سے پر اور مملو ہے۔ جن کا بیان اپنے پنے مقام پر معلوم ہوگا۔ موجودہ زمانہ میں یہ شہر علاقہ حجاز کے تمام جزیرہ نمائے عرب کا پُر رونق اور آبادی کے اعتبار سے سرمایۂ ناز ہے۔ پورے شہر کے چاروں طرف 40 فٹ اونچی شہر پناہ ہے جس میں اونچے اونچے پھاٹک لگے ہیں۔ شہر پناہ کے جنوبی دروازے کو باب المصر کہتے ہیں۔ آب وہوا لطیف اور خوشگوار ہے۔ یہاں کا پانی مکہ کے پانی سے زیادہ شیریں اور خوش ذائقہ ہے۔ اہل شہر نیک طینت خوش مزاج اور مہمان دوست ہیں۔ تمام شہر میں پٹی ہوئی نہر کے ذریعہ سے آب رسانی کا کافی انتظام ہے۔ سڑکوں اور راستوں میں جابجا پانی کی سبیلیں لگی ہیں۔

مدینہ کی بندرگاہ ینبع ہے جو ایک شب وروز کی مسافت پر جنوب کی طرف واقع ہے۔ اس مقام کو جار بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک رات کی مسافت پر چشمہ بدر واقع ہے۔ جو غزوات اسلامی کی پہلی رزمگاہ ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت علی مرتضیٰؑ نے ولید۔ عتبہ اور دیگر صنادید قریش کو قتل کرکے اسلام کی فتح یابی کا علم نصرت بلند کیا تھا۔

بدر کے جنوب ومشرق میں جحفہ واقع ہے۔ جو مکہ سے 4، مدینہ سے 6 اور جار سے 3 منزل ہے۔ اور قافلوں کے اُترنے کا مشہور و معروف مقام ہے۔ جحفہ سے تقریباً 3 منزل پر غدیر خم واقع ہے۔ جہاں حجۃ الوداع سے مراجعت فرماتے وقت 18 ذی الحجہ 10 ہجری میں

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تکمیل ومقبولیت کے متعلق آیہ وافی ہدایہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔ اور جناب علی مرتضی علیہ السلام کی تاکید ولایت ووصایت کی نسبت نزول آیہ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ کے مطابق حدیث من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ کی بشارت ایک لاکھ چوبیس ہزار مسلمانوں کے سامنے پہنچائی تھی۔(ابن اثیر) تفصیلی ذکر اپنے مقام پر مرقوم ہوگا۔

ینبع مشہور بندرگاہ ہے۔ جو مدینہ طیبہ سے مغرب میں بحر قلزم کے کنارے سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔حنین مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ فتح مکہ کے بعد ثقیف اور ہوازن کے قبائل یہیں اسلامی فوج سے لڑے اور پسپا ہوئے۔یلملم چھوٹا سا قصبہ ہے۔یمن سے دو رات کی مسافت پر قنفذہ، بندرگاہ جدہ سے جنوب کی طرف حجاز کی ایک چھوٹی سے بندرگاہ ہے۔جدہ حجاز کی مشہور بندرگاہ ہے۔اس کی آبادی تیس ہزار ہے۔ پہلے سلطان روم کا اور اب سلطان حجاز کا ایک ماتحت افسر اور حکومت برطانیہ کا کونسل رہتا ہے۔طائف سے ایک رات اور مکہ سے تین راتوں کی مسافت پر عکاظ واقع ہے جو قدیم زمانہ میں بہت بڑے سالانہ میلہ کا مقام تھا۔صنعاء جو قدیم میں اوزال کہا جاتا تھا۔جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔مزید یہ ہے کہ تمام عرب میں باعتبار خوبی اور انتظام صفائی وغیرہ کے یہ شہر عمدہ اور نفیس مشہور ہے۔اس کی آبادی پچاس ہزار بتلائی جاتی ہے۔شہر عدن سے 260 میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز وشاداب وادی میں واقع ہے۔تمام عرب میں تمدن ملکی اور سیاسی یہیں سے پھیلا۔اس کے شمال ومغرب میں 125 میل کے فاصلہ پر صعدہ ہے۔ جہاں کا کمایا ہوا چمڑا بہت مشہور ہے اور دور دور ملکوں میں جاتا ہے۔زبیدہ سے دو منزل پر بیت الفقیہ ہے۔ جہاں کثرت سے قہوہ کی تجارت ہوتی ہے۔مخا باب المندب پر واقع ہے کافی یہاں کی مشہور سوغات ہے۔جند صنعا سے 58 فرسخ پر اور ذبار دو منزل جنوب کی طرف واقع ہے۔حصن المواہب صنعا سے 5 فرسخ پر شمال کی جانب واقع ہے۔عدن جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ بہت بڑی تجارت گاہ ہے چھیالیس ہزار آبادی ہے۔اس سے ملے ہوئے علاقہ حضرموت پر حکومت برطانیہ کا قبضہ ہے اور 1839ء گورنر بمبئی کے ماتحت ہے۔یمن کی اور آبادیاں رواعہ۔خمیر۔خیواں۔لحبہ۔توس۔قریٰ۔اور ثوران بھی قابل الذکر ہیں۔منامہ علاقہ بحرین کا مشہور شہر ہے۔ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت ہے۔اس مقام کے موتی تمام اوصاف واصناف کے اعتبار سے بے نظیر ہوتے ہیں اور اقطاع عالم میں مشہور ہیں۔قطیف بھی یہاں کے مشہور بندرگاہوں میں ہے۔دیگر مقامات کویت۔مغویس۔ہجر اور جوف بھی قابل الذکر ہیں۔

مسقط (اوپر ذکر ہو چکا ہے) سلطان مسقط کے زیر حکومت ہے۔ جو 75 تجارتی جہاز کا مالک ہے۔موتی، مچھلی اور میوؤں کی بہت بڑی تجارت گاہ اور عربوں کے کمال صنعت وحرفت کا مرکز ہے۔بحر عمان اور عربی ساحل پر جتنے عمدہ اور خوبصورت جہاز اور کشتیاں دیکھی جاتی ہیں وہ سب قریب قریب مسقط ہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ برکہ، رستاق، سوہار اور مرباط یہاں کے دوسرے قابل الذکر مقامات ہیں۔

علاقہ نجد میں جبل الشمر ایک جداگانہ عربی حکومت ہے۔دارالحکومت شہر حائل ہے۔جس کو بطن الرمطہ بھی کہتے ہیں۔اسی کے قریب جبل السیماء ہے اور یہاں حاتم طائی کی قبر ہے۔اسی کے قریب وادی ساجوف ہے۔ یہ چھوٹی سی حکومت، ریاست جبل الشمر کے ماتحت

ہے۔ پایہ تخت اس کا شہر جوف ہے۔ جوف کی دوسری طرف دومۃ الجندل واقع ہے۔ جو 40 ہجری میں ابوموسیٰ الاشعری کے احمقانہ اور عمرو عاص کے مفسدانہ محاکمہ کی فیصلہ گاہ بن چکا ہے۔ حجر کے شمال میں تیاء ہے۔ جو بہت مشہور مقام شمار ہوتا ہے۔ تیاء کے شمال میں تطبیہ ہے اور تطبیہ کے مشرقی وشمالی جانب فید ہے۔ جو مدینہ منورہ سے دوسو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حضرت موت کے علاقہ میں سقوط، طریم، ساوہ اور نافع وغیرہ مشہور مقامات ہیں۔

اہل عرب کی جسمانی ساخت اور تمدنی حالات

عرب کے باشندے قد وقامت میں معتدل، جسمانی ساخت میں مضبوط اور رنگت میں عموماً گندم گوں ہوتے ہیں۔ ساحلوں اور خصوصاً مصر سے ملے ہوئے علاقوں میں رہنے والے عربوں کے رنگ گندمی ہوتے ہیں۔ وہ قوم وقبیلے جو وسط ملک میں رہتے ہیں۔ ان سے زیادہ صاف چہرے والے ہوتے ہیں۔ بادیہ نشین قبائل اپنے مویشیوں کے گلے لے کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر برابر نقل و حرکت کیا کرتے ہیں۔ ان کے مویشی ان کے گلے ان کے گذاران اوقات کے اصلی ذرائع ہیں۔ ان کے علاوہ اور قوم وقبائل کے اعراب، تجارت، زراعت، فلاحت اور تحصیل علوم وفنون کے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی خاص غذا روٹی اور گوشت ہے۔ گیہوں اور جو کی روٹیاں زیادہ کھاتے ہیں۔ ویسے ہی دنبوں اور اونٹ کا گوشت ان کی پسندیدہ غذا ہے، ان میں قبائل بندی کے دستور اِس وقت تک قائم ہیں ہر قبیلہ کا ایک شیخ ہوتا ہے۔ جو ان کا مستلزم الا طاعت حکمراں ہے۔

عرب کے قدیم اقوام وقبائل اور ان کے مساکن

عرب کی قدیم تاریخ میں اسلامی مؤلفین نے کوئی مکمل، مفصل اور مسلسل کتاب مرتب نہیں کی۔ مگر حتی المقدور وہ اپنی کوششوں سے باز نہیں آئے۔ جتنا کچھ ذخیرہ وہ جمع کر گئے ہیں اور جیسا کچھ سرمایہ بھی وہ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ متلاشین حقیقت کے سر آنکھوں پر رکھے جانے کے قابل ہے۔ اول تو زمانہ ہائے دراز کی گذشتہ واقعات کا زبانی یاد رکھنا اہل عرب کی فطرت کے اصلی جوہر تھے۔ اس فطرتی خصوصیت کے ساتھ حب الوطنی، نسبی اور حسبی مفاخرت اور قومی عظمت کے عناصر بھی داخل تھے۔ پھر سلاطین ملکی فرمانروایان قومی اور سردار شیوخ قبائل کے اثر واقتدار نے بھی بہت کچھ حوصلہ افزائی کی۔ ان ذخائر کے لئے سلاطین حیرہ کا کتب خانہ بہت مشہور ومعروف تھا۔ ابن ہشام کو خوش قسمتی سے اس خزانہ کے چند جواہر پارے ہاتھ لگ گئے۔ اور انھوں نے اس ذخیرہ کو اپنی کتاب ہیجان میں جمع کر دیا۔ اس کے علاوہ عرب کے اشعار جاہلیت یہ ان دونوں ذریعوں سے انکشاف حالات اور حصول اطلاعات کے لئے زیادہ حامی اور مددگار ثابت ہوئے۔ ابن ہشام نے ازمنہ قدیمہ کے نقل حالات میں زیادہ تر انہیں اشعار سے کام لیا ہے۔ ان اشعار میں شاعری کے کمالات۔ نکات اور رعایت کے علاوہ قدیم سلاطین عرب، اقوام، قبائل، عمارات، تمدن، اخلاق اور معاشرت کے متعلق ہر قسم کے اخبار وآثار پائے جاتے ہیں۔

قریب قریب تمام اسلامی مؤرخین ومؤلفین نے اپنی اپنی تالیفات میں قدیم حالات وواقعات کے سلسلے ملانے کی غرض سے انھیں

اشعار کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔ ابن ہشام، ابن قتبہ طبری، ابوالفدا، ابن خلدون، یعقوبی، یاقوت اور سمہودی وغیرہم انھیں حدائق شعراء کے گل چیں ہیں اور اب اسلامی تالیفات اور عربی تاریخوں میں عرب کے ازمنہ سابقہ کی تاریخ کے متعلق جو کچھ جستہ جستہ اور غیر مسلسل حالات منقول ہیں وہ یا تو انھیں اشعار قدیمہ سے مستنبط کئے گئے ہیں یا قدیم عرب کے ان بچے کھچے تالیفات سے ماخوذ ہیں جو ابن ہشام اور کلبی وغیرہ کے ہاتھ آئے ہیں۔ مگر جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ یہ سرمایہ نہ مکمل اور نہ مسلسل کہا جا سکتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اتنی بے شمار مدت کے بعد ان کے تفصیلی حالات معلوم ہونا نہایت دشوار ہے۔ اور اسی باعث سے شبلی نعمانی نے اس وادی میں ہمت کا قدم نہ بڑھایا۔ اور ان کے حالات کو قطعاً مرفوع القلم فرمایا۔ اس کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول تو وہی تحقیق کی دقت، مواد کی قلت اور دوسری سیرۃ النبی صلعم کے متعلق آپ نے ان حالات کو زیداز ضرورت اور باعث طوالت سمجھا۔ ممکن ہے کہ کسی حد تک اُن کا یہ گمان و قیاس صحیح ہو۔ مگر میرے نزدیک رسول عربی، پیغمبر مدنی اور خصوصاً المکی الابطحی التہامی (روحی له الفدا) کے سیرت نگار کو ان خصوصیات و تعلقات پر نگاہ رکھنا ضروری تھا کہ جس مقدس زمین سے قدرت نے رسول ہاشمی صلعم کو مبعوث فرمایا۔ وہ آپ سے پہلے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی جائے ولادت مصلائے عبادت اور مقام زیارت بن چکی ہے۔ اور ان تمام نفوس قدسیہ کو عرب کے انھیں اقوام سابقہ اور قبائل قدیم سے پورا تعلق ہے۔ جن کو آپ نے تحریری جریدہ سے نظری کر دیا ہے۔ میں نے انھیں خصوصیات کے بنا پر ان کے قدیم حالات کو کسی قدر زیادہ تحقیق و تفصیل سے لکھ دیا ہے اور اپنے سلسلہ بیان کو امم قدیمہ اور عرب کے اقوام سابقہ کے حالات و واقعات سے مرتب کر کے بالکل مکمل کر دیا ہے۔

عرب کے اشعار جاہلیت کو یا تنہا عربی مؤلفین و مصنفین کے تالیفات و تصنیفات کو ان معلومات کا کافی ذریعہ سمجھنا یہی ناکافی ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ ساتھ کتب مقدسہ قدیمہ اور دیگر مذاہب و اقوام کے ان جدید تالیفات و تصنیفات اور تازہ انکشافات کا مطالعہ اور موازنہ بھی ضروری ہے۔ جو عرب میں قبل و بعد ظہور اسلام مدون اور مرتب ہوئی ہیں۔ میں نے اس ترتیب اور سلسلہ کے خیال سے چار مختلف اقسام کے ماخذوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ اور ان کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں چن دیا ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان کو عرب کے قبائل و اقوام قدیمہ کی تفصیل آگے بڑھائیں۔ ہمارے لئے اپنے مرقومۂ بالا ماخذوں کی حقیقت کا انکشاف بھی نہایت ضروری ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(1) ادبیاتِ اسلامیہ (2) ادبیات اسرائیلیہ

(3) ادبیات یونانیہ اور رومانیہ (4) اکتشافات اثریہ

ادبیات اسلامیہ

ادبیات اسلامیہ میں قرآن مجید، اشعار عرب قبل اسلام، اسلامی کتب جغرافیہ اور تاریخ و انساب شامل ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں عرب کے مختلف قوم و قبائل کے حالات مختصر و مذکور ہیں۔ ان سے صرف عبرت اور بصیرت فی الاحوال مقصود و منظور ہے۔ اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید میں ملک کے جغرافی، تاریخی اور سیاسی حالات کی تلاش و جستجو بالکل بیکار ہے۔

عہد نبوت میں زیادہ تر خیالات عام تحصیل دینیات اسلام کی طرف متوجہ تھے، نیز اس وجہ خاص سے کہ علوم دینیات کو ان تعلقات ملکی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اور صحابہ جس قدر اپنے ملک کے سیاسی اور تاریخی حالات جانتے تھے۔ وہ ان کے نزدیک بالکل کافی تھے۔ اس لئے عہد نبوت سے لے کر چاروں خلافتوں کے زمانہ تک ان اقسام کے تدوین و ترتیب کی کوئی فکر نہیں کی گئی۔

خلافت رابعہ ہی کے عہد سے استنباط علوم اور اسلامی تالیفات کی تدوین کی ابتدا ہوئی۔ اور سب سے پہلے ابوالاسود دوائلی نے علم النحو کے ابتدائی اصول باب مدینۃ العلم کی خدمت سے حاصل کر کے مستنبط کئے۔ گویا عربی نحو اور ادبیات کی اسی وقت سے بنیاد قائم ہوئی۔ امارت معاویہ کے زمانہ میں سب سے پہلے عبید بن شریہ نے علم تاریخ کی تدوین کی اور کتاب اخبار الملوک الماضین لکھی اس کے بعد اسی زمانہ میں ہشام کلبی اور قاضی ابو البختری نے انساب میں اور ابن ہشام نے مغازی سیرت اور تاریخ کو ترتیب دیا۔ ہر شخص اس امر کو تعجب سے دیکھے گا کہ اسلام میں حدیث و تفسیر کی کتابوں سے پہلے کتب تاریخ و انساب کی تالیف و تصنیف شروع ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ و علم الطب کے موضوع کے لئے عرب کی طبیعت اور فطرت قدرت کی طرف سے خاص کر موزوں پیدا کی گئی تھی۔ اس لئے اصول فطرت کے مطابق سب سے پہلے ان کی طبیعت کا رجحان و میلان اسی شئ کی طرف ہوا جس سے ان کی خاص دلچسپی تھی۔

دوسری اور تیسری صدی میں تو متعدد کتابیں، حدیث، تفسیر، تاریخ اور انساب میں لکھی گئیں۔ چوتھی صدی سے علم جغرافیہ کی ابتداء ہوئی اور سب سے پہلے ابن اسحاک ہمدانی نے عرب کے جغرافیہ میں دو کتابیں۔ صفۃ جزیرۃ العرب اور اکلیل لکھیں۔ صفۃ جزیرۃ العرب۔ جزیرہ عرب کا خاص جغرافیہ ہے۔ اکلیل یمن کی خاص تاریخ ہے۔ دونوں بڑے کام کی چیزیں ہیں۔

اشعار عرب قبل اسلام کے متعلق علقمہ ابن علکم ایک شاعر نے قصیدۂ نوبیہ میں حمیرا قوم تبع کے حالات اور عام عمارات کے ناموں کو نظم کیا ہے۔ 570ھ میں نشوان ابن سعید الحمیر ی نے قصیدۂ حمیریہ کے نام سے خاندان حمیر کی تاریخ نظم کی۔ جس میں سلاطین حمیر کے کثرت سے نام گنوائے گئے ہیں۔ سیرت کا سلسلہ جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسری صدی سے آغاز ہوا۔ عرب قدیم کا سب سے بڑا مؤرخ یا سیرت نگار ابن اسحاق المتوفی 151ھ جو اس وقت ابن ہشام المتوفی 218ھ کی روایت سے موجود اور اس کی تصنیف کتاب السیر ۃ کا جز واعظم ہے۔ اس کے بعد کے مؤرخین اسلام نے بھی عموماً اپنی تاریخ کی تمہید میں تاریخ عرب و بنی اسرائیل کے ضمن میں اشخاص و اقوام عرب کے حالات لکھے ہیں۔

جغرافیہ نگاران کی نسبت یہ بداعتقادی پھیلی ہوئی ہے کہ گویا وہ اس صنف علم سے بالکل کورے تھے۔ انھوں نے بذات خود اپنے ملک یا غیر ممالک کا کوئی جغرافیہ نہیں لکھا۔ بلکہ بطور مستعار دوسروں کے تحقیقی معیار اپنی تالیفات و تصنیفات میں نقل کئے اس غلط خیال کے پھیلانے والے زیادہ تر یورپین مؤلفین اور زمانہ موجود کے خام محققین ہیں جو انھیں کے خوشہ چیں ہیں اور اس عالم فریبی میں ان کے شریک ہیں۔

یورپین مؤلفین اور ان کے معتقدین کو اگر تحقیقی مسائل کا مذاق سلیم حاصل ہے تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اہل اسلام یعنی مسلمانان عرب میں جغرافیہ نویسی کی ابتداء خود عرب سے ہوئی اور ان میں اس شائبہ علم کا سلیقہ اس وقت سے پیدا ہو گیا تھا کہ جب عرب میں کوئی متنفس یونانی لفظ ''جغرافیہ'' کے معنی سے بھی واقف نہ تھا۔ یورپین محققین نے اپنی غلط فہمی اور کوتاہ عقلی سے یہ سمجھا ہے کہ عربوں نے یونانی

اور رومانی جغرافیہ عرب کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ یونانی اور رومانی اور دیگر اقوام وممالک کی کتابیں تو تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے زبان عربی میں ترجمہ ہونی شروع ہوئی ہیں اور عرب کا قدیم جغرافیہ داں 200ھ کے آوائل میں اپنی جغرافیہ کی کتاب۔ ''کتاب النوادر'' کے نام سے مرتب کر چکا تھا۔

عرب دورِ قدیم سے جغرافیہ نویس تھے۔ ان کے متقدمین اور متاخرین مؤلفین نے کثیر التعداد جغرافیہ کی کتابیں لکھی ہیں جو اس علم خاص میں ان کے کمال و جامعیت کا کامل ثبوت ہیں۔ جغرافیہ کے متعلق انہوں نے دو قسم کی کتابیں تیار کیں۔ ایک تو وہ جس میں خاص عرب کا جغرافیہ ہے۔ دوم وہ جس میں دیگر اقالیم عالم کے ساتھ عرب کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ادبیات اسلامیہ کے سلسلہ میں قرآن مجید، اشعار ایام قدیم، تاریخ اور جغرافیہ کی معلومات اور ان کے ماخذوں کا ذکر ہو چکا۔ جبکہ کتب تفسیر کے سلسلہ میں پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تاریخ و انساب کے بعد عرب میں اس کی تدوین ہوئی اور سب سے پہلے مجاہد ابن جبیر صحابی نے عہد بنی امیہ میں اپنی تفسیر تیار کی۔ مجاہد کا سال وفات 104ھ ہے۔ اس لئے یہ اندازہ صحیح ہوسکتا ہے کہ عرب کی پہلی کتاب تاریخ اخبار الملوک ماضیہ سے 59 برس بعد یہ تفسیر مرتب کی گئی۔

عرب کا علم حفظ الانساب

ادبیات اسلامیہ کے ذیل میں کتب الانساب بھی ضروری عناصر میں داخل ہیں۔ خصوصاً موجودہ تفصیل اقوام وقبائل قدیمہ کے لئے ان کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ صنف تالیفی تو عرب کی مسلّمہ جولانگاہ ہے۔ اور قدیم سے اس فن شریف میں ان کو مکمل دسترس حاصل ہے اس لئے اس کی نسبت ہمیں زیادہ تحقیق وتفتیش کی ضرورت نہیں۔ ہم ظہور اسلام سے ان مؤلفین کے سلسلہ کا آغاز کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اہل اسلام میں سب سے پہلے دغفل بکری نے اپنی کتاب لسان الحمرہ تیار کی۔ پھر عبید بن شری نے قرن اولیٰ میں ابن کوآ قرقبی، عوانہ بن حکم ابوالفطان، ہشام کلبی، محمد ابن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، مصعب بن عبداللہ زبیری، زبیر ابن بکار، مصنف انساب قریب، اصمعی، ابو عبیدہ، ابن ہشام، مصنف انساب حمیر وملوک حمیر والمبرد اور ارزنی اور اخیراً بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہم محققین انساب پیدا ہوئے اور تفصیل وتشریح انساب میں ان کی تالیفات جتنی قابل قدر ہیں، وہ دنیا جانتی ہے۔

انساب عرب کی خصوصیت کے متعلق ہمیں ایک جملہ معترضہ کی تنقیح ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ مستشرقین جدید عرب کے ان انساب کی کتب قدیم کو غلط اور بے اصل سمجھتے ہیں۔ اس کی قطعی صحت کا ہم دعویٰ نہیں کرتے مگر اتنا ضرور کہیں گے۔ کہ مسٹر رابرٹن اسمتھ Mr Robertson Smith اور مسٹر نولدیکی Mr Noldeke نے اپنی غلط فہمیوں سے جتنا سمجھا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ صحیح اور حقائق پر مبنی ہے۔ نولدیکی ان الفاظ میں عربی انساب کی کتابوں پر تنقید کرتا ہے۔

اب علماء کے لئے موقع آ گیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈال دیں جو چاہتے ہیں کہ عربوں کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑا ہے مان لیں تا کہ قبائل عرب قدیمہ وجدیدہ کے تعلقات تحقیق ویقین کے ساتھ ظاہر ہوں کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں۔ بنی قیس جو مسیحؑ سے کچھ پہلے تھا۔

اس لئے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں۔جس کی طرف وہ منسوب ہے۔

رابرٹسن اسمتھ کہتا ہے۔

یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ چند قبائل زمانہ ماضی غیر قدیم میں کسی شخص کی طرف منسوب نہ تھے۔

اس اعتراض کے جواب میں سب سے سہل اور آسان جواب تو یہ ہے کہ جب نئی اور پرانی، دونوں کی آبادی، ایک آدم (علیہ السلام) کی اولاد مان لینے پر آج تک عقلاً اور نقلاً کوئی استعجاب و استبعاد نہیں پیش کیا گیا۔تو بھی قیس کی کثرت و وسعت پر نولدیکی کا استعجاب و استبعاد محققین کے نزدیک بالکل قابل مضحکہ سمجھا جائے گا۔

پھر انساب کے لاتعداد زمانہ تک استحفاظ کو بعید از عقل سمجھ کر اس تعریض کو پیش کرنا بھی معترضین کی غلط فہمی ہے۔حقیقتاً وہ عرب کے قومی تمدن سے بالکل ناواقف ہیں۔زمانہ لامعلوم التعداد سے عرب کا ایک ایک قبیلہ کیا، ہر ہر فرد واحد کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے دوستوں کی مداح اور دشمنوں کی ہجو کے لئے انساب محفوظ رکھے۔عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔وہ عام طور سے عرب میں ذلیل و حقیر سمجھا جاتا ہے۔اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا ہے۔شعراے عرب تو کیا قریب قریب عرب کے تمام قبائل و عشائر ان ضرورتوں کے لحاظ سے حفظ انساب کے لئے مجبور تھے۔پھر ان کی انساب کی تفصیل کیسے غیر صحیح یا ناقابل اعتبار سمجھی جا سکتی ہے۔اور غیر قوم، غیر ملک والوں کو ایک لاتعداد و امتداد ایام کے بعد ان کی تردید و تنقید کا کیا حق حاصل ہے۔بنو قیس کی کثرت و وسعت پر یہ اعتراض بھی چلنے کے قابل نہیں۔کیونکہ بنو قیس کی طرح چھ سو برسوں کی مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہو جانا نہ محال عادی ہوسکتا ہے نہ محال فطری۔

مستشرقین یورپ کو کتب انساب عرب کے غلط ہونے کا گمان کیونکر پیدا ہوا؟ اس کی حقیقت سن لیجیے۔نئی روشنی کے زمانہ میں اوہام پرستی کی بنا پر جہاں سینکڑوں کیا ہزاروں ''ایزم'' پیدا ہوگئے۔اور پیدا ہوتے جاتے ہیں۔وہاں توتوزم (طوطمیت جس کی تعریف ہے) بھی ایجاد ہوا۔اس وہمی مجسمہ یا قیاسی مسئلہ کی خاص تسمیہ سے وہ ازمنہ قدیمہ مقصود ہیں۔جن میں انسان کا تمدن اور اس کی تہذیب بالکل طفل مہد تھی۔اس لئے ہر بڑی اور قوی چیز اُس کی ضعیف نگاہوں میں عظیم ترین معلوم ہوتی تھی۔اسی بنا پر اس زمانہ کے لوگ دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف اپنے حسب و نسب کو تعظیماً منسوب کرتے تھے۔اسی کو طوطمیت اور اسی زمانہ کو طوطمیت کا دور خاص کہتے ہیں۔ہندوؤں میں کثرت سے اس کے آثار اب تک موجود ہیں۔جیسے سورج بنسی۔، چندر منبسی اور ناگ منبسی وغیرہ۔یہ قبائل اپنے آپ کو آفتاب و ماہتاب کی نسل خاص سے سمجھتے تھے۔حالانکہ یہ محالات بدیہی ہے۔اب ہر شخص سمجھنے لگا ہے کہ حقیقتاً یہ ان کے مورث اعلیٰ کا نام نہیں۔بلکہ ان کے قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔جس کی طرف وہ تعظیماً منسوب کئے گئے ہیں۔

قبیلہ عرب میں بنو شمس وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں اور حیوانات کے نام بھی ہیں۔مثلاً بنو اسد، بنو کلب، بنو ثعلب وغیرہ وغیرہ ان کی طرف نسبت کی وجہ وہی سمجھنی چاہیے۔جو اوپر لکھی گئی۔جانوروں کی وجہ تسمیہ میں تواضع اور انکسار کا خیال و رعایت بھی شامل ہے۔

افسوس ہے حقیقت ناشناس مستشرقین یورپ نے عرب کے ناموں میں جانوروں کی نسبت و رعایت کو بھی ہندوؤں کے اصول پر سمجھ

لیا۔ حالانکہ ان کا یہ خیال تاریخ عرب سے ان کی قطعی ناواقفیت ثابت کرتا ہے۔ یہ ان کی کھلی وہم پرستی ہے۔ عرب میں کبھی اس قسم کا خیال پیدا ہی نہیں ہوا۔ تاریخ عالم سے مذاق سلیم رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس خیال کا وجود ہندوستان، مصر اور یونان کی حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ تعجب یہ ہے کہ یورپ کے محققین عرب کی متیھا لوجی (علم الاصنام) کو ہندوستان و یونان کے اصول میتھا لوجی سے ملاتے ہیں۔

اول تو اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں۔ اور جو ہیں بھی ان میں کلب (کتا) نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر ہستیاں ہیں۔ جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو۔ اگر اسی کو یورپین محققین کتب انساب کی غلطی کا باعث سمجھتے ہیں تو وہ سمجھ لیں کہ اس روشن خیالی کے زمانہ میں ان کا خاص طبقہ روشن بھی اس قسم کی رعایت ونسبت سے خالی نہیں پایا جاتا۔ یورپ کے اقطاع متفرقہ اور بلاد مختلفہ میں سینکڑوں اور ہزاروں ذی اثر اور مقتدر بزرگوں کے نام۔ فاکس (Fox) (لومڑی) بُل (Bull) (بیل) ثابت ہوتے ہیں۔ کیا ان پر طوطمیت کا الزام نہیں لگایا جائے گا؟

مندرجہ بالا جملہ معترضہ معرض بیان میں خواہ مخواہ حائل ہوگیا۔ اس کی تنقید وتصحیح کر دی گئی، سلسلہ بیان میں ادبیات اسلامیہ میں جو ازمنہ قدیمہ اور امم سابقہ کے اطلاعات کے ذریعہ قائم کیے گئے ہیں۔ کتب انساب کے بعد عرب کی زبانی اور خاندانی مرویات کا نمبر ہے۔ جو نسلاً بعد نسلاً عربوں میں محفوظ رہ کر اسلامی کتاب میں مدون ہو گئے۔ مسلمانوں کے اصول روایت کی رو سے اگر چہ یہ ذریعہ علم زیادہ محفوظ نہیں۔ لیکن خاندانی روایتیں متفقہ طور پر اور بلا انکار وبغیر اشتباہ وشک عرب میں عام طور سے مشہور تھیں اور جن کا فخر ہر موقع پر ظاہر کیا گیا اور کسی نے بھی اُس کے انکار ونفی کی وجہ نہ پائی تو یہ گویا در حقیقت تواتر کی حیثیت رکھتی ہیں جن کی تردید اصول تاریخ کی رو سے مستحیل ہو۔ ادبیات اسلامیہ انھیں عناصر سے مرکب اور ہمارا موضوع تالیف انہیں ذخائر سے مرتب ہے۔

ادبیات اسرائیلیہ

ہماری موجودہ تالیفات میں ادبیات اسرائیلیہ قسم دوم کا ماخذ ہے۔ اس ماخذ میں توریت کی کتب خمسہ کتیم نبیم، ترگوم، مدراش اور تالمود داخل ہیں۔ اور انھیں کے مجموعہ کا نام ادبیات اسرائیلیہ قرار پایا ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تورات

تورات اصل میں لفظ عبری ہے۔ جس کے معنی قانون اور شریعت کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ کے مجموعہ کا نام تورات ہے۔ گویا کلیم اللہؑ کے نظم رسالت کی کلیات یہی ہے۔ اس سلسلہ میں کلیمیہ کی پہلی کتاب کا نام سفر تکوین ہے جس میں ذکر بدر (کائنات) آدمؑ وحواؑ، نوحؑ وابراہیمؑ۔ اسحاقؑ واسمعیلؑ ویعقوبؑ ویوسفؑ قلمبند ہیں۔ دوسری کتاب کا نام سفر خروج ہے، جس میں ذکر حضرت موسیٰؑ و فرعون، بنی اسرائیل کا ذکر اور بعض احکام وقانون شامل ہیں۔ تیسری کتاب کا نام سفر الاحبار ہے۔ جس میں ذکر شریعت وقوانین شریعت اور حرام وحلال اشیاء کی تفصیل مندرج ہے۔ چوتھی کتاب کا نام سفر العدد ہے۔ جس میں بنی اسرائیل کی تعداد کا ذکر، وقت خروج از مصر وغزوات حضرت موسیٰؑ اور بعض احکام شریعت مندرج ہیں۔ پانچویں کتاب کا نام سفر الاستثنا ہے۔ جس میں قوانین اور احکام شریعت داخل ہیں۔

نبیم

نبی کی جمع بقاعدہ عبرانی ہے۔اور ''میم'' سے ہوتی ہے عربی قاعدہ کے مطابق نبیین کہنا چاہیے مثلاً خاتم النبیینؐ یہ دفتر اسرائیلیہ انبیائے بنی اسرائیل کے کلام ومواعظ کا مجموعہ ہے اور خصوصاً سفر حضرت یوشعؑ ،سفر القضاۃ،سفر سموال،سفر الایام،اور سفر الملوک کے ان میں صرف تاریخی حالات وواقعات ہیں۔اکثر تورات کا اطلاق توماہ وبیتم دونوں پر ہوتا ہے۔نبیم کے بعض حصہ کو کتبیم بھی کہتے ہیں جو اقوال انبیائے بنی اسرائیل کے نقول وکتابت سے مراد ہے۔

ترگوم یا ترجوم یعنی ترجمہ و بیان۔ترگوم ارامی زبان میں۔تورات ونبیم کی تفسیر وتوضیح کا نام ہے۔جوربیون (آئمہ یہود) نے انبیاء کی زبانی یادداشت وروایت کی بنا پر کی۔اس کی تصنیف کا زمانہ (600ق م سے 100ء تک ہے)۔

مدراش کا درجہ ہمارے ہاں کی احادیث کا ہے۔لفظ مدارس اور عربی درس ایک چیز ہے۔تلمود وتالمود فقہہ اسرائیلی ہے جس کی بنیاد کتاب سابقہ پر ہے۔اور جس کی ترتیب بترتیب ابواب وفصول مسائل قائم کی گئی ہے۔لفظ تلمود عربی تلمیذ ہے جس کے معنی تعلیم وعلم کے ہیں۔یہ بتلا دینا بھی مناسب ہوگا کہ یہود کے نزدیک تو یہ تمام کتابیں مستند ہیں۔نصاریٰ صرف تورات،نبیم اور کتبیم کو تسلیم کرتے ہیں اور انھیں کے مجموعہ کو عہد عتیق کہتے ہیں۔اسلام میں ان کے اعتبار کی کیا حقیقت ہے؟

اسلام میں وہی اصول عامہ ان کی صداقت وصحت کا بھی معیار قرار دیئے گئے ہیں۔یعنی ان کی مرویات بھی جو معارض قرآن و حدیث صحیحہ ہیں۔وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں۔مصلحات فقہیہ اور الفاظ شرعیہ میں اس کو سقوط کہتے ہیں۔یعنی وہ حالات وواقعات جو تورات میں ہیں اور قرآن میں نہیں۔وہ سقوط کے خاص اصطلاحی نام سے مشہور ہیں۔کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ جزو نہ وحی ربانی ہے اور نہ مقصود قرآنی۔اسی کی طرح مضافاۃ بھی ایک اصطلاحی نام ہے۔اور اس سے وہ حالات مراد ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے مگر تورات میں نہیں۔جہاں ایسے اضافہ ہیں،وہ اصل میں اس واقع کا خاص نکتہ تھا جس کو ان کتابوں نے جن میں تصرفات ومداخلت انسانی معتبر ذرائع سے ثابت ہو چکے ہیں۔بالکل چھوڑ دیا ہے مگر قرآن مجید نے جس کی تنزیل صرف کتب مقدسہ اور الہامات قدیمہ کی تکمیل،تصدیق وتصحیح کی ضرورت ومدعات سے ہوئی تھی،پھر ان فروگذاشتوں کو اصلیت اور حقیقت حال سے پُر کر دیا۔سقوط واضافات کے دونوں صورتوں کے واقعات پر طبقہ مخالفین اسلام میں ڈیڑھ ہزار برسوں سے علما کے مستشرقین اور سینکڑوں محققین کی نگاہیں پڑ چکی ہیں۔مگر ان میں سے کسی کو اس کی صداقت اور اصلیت میں کلام کی آج تک جرأت نہیں ہوئی جیسا کہ ان کی اکثر مثالیں ہمارے موجودہ تالیف کے سلسلہ بیان میں بھی اپنے اپنے مقام پر پائی جائیں گی۔

ہم نے اپنی تالیف کا ماخذ ان کو کیوں بنایا۔صرف اس ضرورت سے کہ امم قدیمہ اور انبیائے ومرسلین سابقین کے وہ حالات و واقعات جو ہمارے مقاصد تالیفی سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور ان کی تفصیل اسلامی ادبیات میں ضرورت سے زائد ہونے کی وجہ سے نہیں کی گئی ہے۔قلمبند کرنا اور بقدر ضرورت ان کی تفصیل لکھنا نہایت ضروری ہے۔اور ظہور اسلام کے مابعد کے واقعات کثیرہ کی توضیح و تشریح اور تسلسل کا قائم رہنا بھی تاوقت یہ کہ ماقبل کے واقعات جو کثرت سے ان اخبار وآثار قدیمہ میں موجود ہیں بیان نہ کئے جائیں

ممکن نہیں تھا، باوجود ضرورت موجودہ کے مولف نے ان تمام واقعات کی نقل واندراج میں نقد واقعات کے متعلق انھیں اصول کا برابر لحاظ قائم رکھا ہے۔ جو محققین و ناقدین اسلام نے اس فن خاص کے لئے مقرر کئے ہیں۔

ادبیات یونانیہ ورومانیہ

یونانی اور رومانی مؤرخوں، سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی جستہ جستہ اور متفرق طور پر ان ممالک وقبائل کا ذکر کیا ہے۔ جن ممالک وقبائل پر عرب قدیم ہونے کا کامل اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے استنباط بھی ہمارے لئے ضروری تھا۔ ہم نے اپنی موجودہ تالیف میں طبقہ کے جن مصنفین اوران کی تصنیفات سے مدد لی ہے ان کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ہیروڈوٹس Herodotious یہ یونانی مؤرخ اور جغرافیہ نویس حضرت مسیحؑ سے 400 برس قبل تھا۔ اس نے یونان وایران کی تاریخ لکھی ہے۔ اوراسی ضمن میں مصر، افریقہ اور عرب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کی تاریخ کا عربی میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر اس مؤرخ کا علم ملک عرب کی نسبت نہایت ناکمل تھا۔ محققین قدیم وجدید نے اس کی غلطیوں کی پوری تنقید وتصحیح کردی ہے۔

ہیروڈوٹس کی ایک صدی بعد سکندر اعظم ایران ومصر پر فاتحانہ قابض ہوا۔ اس تعلق خاص سے ارٹستھنیس Arotosthenes المتوفی 192 ق م۔ جو یونانیوں کے عہد میں کتب خانہ اسکندریہ کا مہتمم تھا اس سے سکندر کی مہمات سفر سے جو نتائج تازہ معلوم ہوئے تھے ان کے ساتھ جغرافیہ عام کی ایک کتاب لکھی اس کی اصل کتاب تو ضائع ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد ایک اور جغرافیہ نویس یونانی اسٹرابو Strabo نے اس کتاب کے چند ابواب اپنی کتاب میں نقل کئے خوش قسمتی سے جن میں ایک عرب کا عرب باب بھی محفوظ ہے۔ ارٹستھنیس نے یمن کے قبائل سباء ومعین اوران کے تمدن کا نیز قبائل حضرموت کا اور عرب کارواں کے ان راستوں کا جو براستہ قریہ (Gerra) خلیج فارس اور براستہ تہامہ اور خلیج عقبہ کو پہنچتے ہیں کا ذکر کیا ہے۔ آرٹستھنیس کے تقریباً سو برس بعد سسلی کا مشہور مؤرخ ڈیوڈوریس Dudoriows المتوفی 80 ق م پیدا ہوئے۔ جس نے عرب کے بعض حالات کا نشان دیا۔ نبط کی حکومت کا ذکر کیا۔ اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ کعبہ مکرمہ کی طرف بھی اس نے اشارہ کیا ہے۔ (گبن ج3 باب40) افسوس ہے کہ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ تلف ہوگیا۔

اب یونان کی جگہ بساط ملک داری پر روم چھا گیا۔ رومی سردار آلیس گالوس AliousGullus کی ماتحتی میں جنوبی عرب پر رومیوں نے حملہ کیا اور ایک حصہ فتح بھی کرلیا۔ لیکن عرب کے بے آب وگیاہ صحرا سے شکست کھا کر خود ان کو پیچھے ہٹ آنا پڑا۔

اسٹرابو (Strabo) المتوفی 24 ق م نے اپنی جغرافی تصنیف میں رومیوں کی اس مہم کا حال لکھا ہے۔ اس مہم میں نبطیوں کے علاوہ عرب کے دوشہروں کے نام آتے ہیں نگرآنا اور ماریبا (Negrana Mariaba) جو صحیح طور سے نجران اور شہر مآرب ہیں۔

اسٹرابو کے بعد پلینی Pliny المتوفی 79ء کا نام لینا چاہیے۔ جو کتاب تاریخ طبعی کا (Natural History) کا مصنف ہے۔ اس نے مشرقی ساحل عرب کا اور خصوصاً اس مہم کا ذکر کیا ہے۔ جو رومیوں نے مشرقی ساحل کے اکتشاف کے لئے روانہ کی تھی۔

پلینی کے سو برس بعد، دوسری صدی عیسوی میں اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں وجغرافیہ نویس بطلیموس Ptotemy پیدا ہوا۔ اس

وقت رومن طاقت اپنے عروج وکمال پر تھی۔ بطلیموس نے تمام دنیائے معمور و معلوم کا ایک نقشہ عرب تیار کیا اور پھر اسی نقشہ کی تشریح و تفصیل کے لئے جغرافیہ میں ایک کتاب لکھی۔

بطلیموس کی نوعیت وندرت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس نے معمورۂ عالم کو طول بلد اور عرض بلد پر منقسم کیا اور پھر ان خطوط کے ذریعہ سے اس نے مقامات کی تعیین کی۔ اس لئے بطلیموس کی یہ تصنیف باعتبار جغرافیہ طبعیہ Natural Geography یا جغرافیہ وصفیہ (Despriptire Geog) کے جغرافیہ فلکی Astrominical Geog سے زیادہ قریب ہے۔

یہ بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ بطلیموس خود سیاح عرب نہ تھا۔ اسکندریہ اس زمانہ میں عرب تاجروں کا مرکز تھا۔ اس نے انہیں تاجروں اور کاروانوں سے دریافت کر کے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا۔ بطلیموس نے عام طور سے عرب کے مشہور قبائل، شہر گاؤں، پہاڑ ساحل، تجارتی منزل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن چند ناموں کے سوا اب منازل وقبائل کے نام بالکل غیر مفہوم ہیں۔

عربی محققین کے علاوہ ایک یورپین مشہور بن بری Bunbury نے بھی اس حصہ تالیف بطلیموس سے بداعتقادی ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ صرف (فرضی اور مصنوعی ناموں کا مجموعہ ہے لیکن جرمن مستشرق اسپرنگر Springer نے قدیم جغرافیہ عرب Amoient Geography of Arabia میں جو 1857ء میں شائع ہوئی ہے۔ نہایت قابلیت سے بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا ہے۔ اور ان کی صحت ثابت کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بہ تکلیف ہو سکتی ہے۔ اور اس کی مثالیں ہماری کتاب میں جابجا ملیں گی۔

بطلیموس کے جغرافیہ کے متعلق آج سے ہزار برس پہلے مسلمان جغرافیہ نویس مسعودی اور پھر اس کے تین سو برس بعد یاقوت حموی خود بھی شکایت کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک مقام پر لکھ بھی آئے ہیں۔ مستشرق ہوگارتھ Hogarths اسی بنا پر لکھتا ہے۔

بطلیموس کا کاروانوں کی زبان سے ان کی (عرب) تحقیق اور یونانی حروف ولہجہ میں اس کی (الفاظ عرب) تغیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر۔ ناسخین (کاتبین) کتاب کی جہالت وناشناسی۔ ان وجوہات سے قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ایک لفظ اپنے مخرج سے کہاں کہاں جا پڑتا ہے۔ The Penctahon of Arabia By Hogarnth P.R.S 240

یونانی اور رومانی مصنفین کے تذکرے میں ایک قابل الذکر یہودی مصنف بھی ہے۔ اس فاضل محقق کا نام یوسیفوس (Eusphious) ہے۔ یونانی، لاطینی اور رومانی زبانوں میں اس کی متعدد تصانیف متعلق تاریخ و مذہب یہود ہیں۔ اس کی سب سے مشہور اور قابل قدر تین کتابیں جو میرا مدعا ہے تالیف کے لئے بھی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں قدامت یہود، محاربات یہود اور فلسفہ یہودیت ہیں۔ اس مصنف کی وسیع النظری اور تصانیف کثیرہ کی تدوین کا باعث حقیقی یہ ہے کہ یہ فاضل پہلی صدی عیسوی میں اسکندریہ میں مقیم تھا اور وہاں کے مشہور اور قدیم کتب خانہ کا خاص مہتمم تھا جس میں بابل اور مصر کی تمام قدیم تاریخیں موجود تھیں۔ یوسیفورس کو خوش قسمتی سے یہ موقع زرین ہاتھ لگا۔ اس نے ان بابلی ومصری تاریخوں سے بابل ومصر کی تاریخ کے اقتباسات نقل کئے۔ جن سے عرب کے قدیم قبائل و اقوام کے واقعہ نگاروں کو بھی بہت کچھ مدد ملی۔

بابل کے جس مؤرخ کا یوسیفوس نے حوالہ دیا ہے وہ بروشوس ہے اور مصر کے مؤرخ کا نام مانیشون بتلایا ہے۔ان دونوں مصنف کے اقتباسات بے حد مفید نکلے ہیں۔

اکتشافات اثریہ

ہماری معلومات کے چہارگانہ ذرائع ہیں۔ چوتھے نمبر کا ذریعہ، اکتشافات اثریہ ہیں۔جن سے الواح کتبات اور عمارات و نیز دیگر آ ثار قدیمہ مراد ہیں اور فی الحال یمن، حضر موت، حوران، تدمر، بطرا، علا، مدائن، صفا، حجر، حجاز، عراق اور مصر میں قدیم عربوں کے بہت سے آ ثار عمارات اور یادگاریں ہیں۔جن میں ہزاروں کتبے اور نقشے کھدے ہیں۔ان کتبات اور نقوش سے علمائے آ ثار قدیمہ نے عجیب وغریب نتائج استنباط کئے ہیں۔ یہ کتبات ونقوش زیادہ ترحمیری (مسند) سبائی۔ارامی اور نبطی خط میں ہیں۔دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانوں میں جب کہ تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا۔ان آ ثار کی تحقیق کی گئی۔اوران میں سے اکثرخطوط اور زبانوں سے اس وقت کے علما واقف تھے۔ذوالنوی مصری جو دوسری صدی میں تھے۔مصر کے خط برابی (ہیروگلفی) پڑھتے تھے۔

حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں تمام مشہور آ ثار کے نام گنوائے ہیں۔قلعہ ناعظ جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر کیا تھا۔اسلام سے تقریباً پندرہ سو برس قبل کی تعمیر ہے۔وہب بن منبہ نے (جنھوں نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا۔جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''یہ ایوان اس وقت تعمیر کیا گیا جبکہ ہمارے لئے مصر سے غلہ آ تا تھا۔'' معجم البلدان ذکر ناعط، یاقوت حموی نے معجم البلدان ذکر ناعط میں اس کا ذکر کیا ہے۔عرب جاہلیت کا ملک الشعراء امراءالقیس اس رفیع الشان ایوان کی نسبت کہتا ہے۔

هرا المنزل الا لآف من جوناعط بنی اسد حزنا من الارض اورغرا

یہ وہ ہے جوناعط کی بلندی سے ہزاروں آدمی زمین پر لاسکتا ہے۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں 40ھ تا 50ھ عبدالرحمن مصر کے گورنر تھے۔انہوں نے حضر موت کے منہدم شدہ قلعہ حصن غراب پر ایک کتبہ پایا تھا۔اس کا عربی ترجمہ یہ ہے

ونصطا ده صيد البر با لخيل و القنا و طور الصيد النون من لحج البحر
لدينا ملوك يبعدون عن الخنا شديد على اهل الخيانة والفدر شديد على اهل
الخيانة والغدر تقيم لنا من دين هودعليه السلام شرايعا و نؤمن بالايات والبعث
والنشر اذا ما عدوحل ارضا يريدنا بريزنا جمعيا بالمستضة اثم

ہم گھوڑوں اور برچھوں سے خشکی کا شکار کرتے ہیں اور کبھی دریا کی تہہ سے مچھلی نکال لاتے ہیں۔ہمارے

حکمران وہ سلاطین ہیں جو بدکاری سے بہت دور ہیں اور غداروں اور خیانت کاروں کے حق میں بہت سخت ہیں وہ ہمارے لئے ہودؑ کے مذہب کے مطابق شریعت قائم کرتے ہیں اور ہم احکام الٰہی اور بعثت ونشر پر ایمان لائے ہیں جب کوئی دشمن ہماری زمین کا قصد کرتا ہے تو ہم گندم گوں نیزے لے کر نکل پڑتے ہیں۔

یہ کتبہ علامہ نوبری نے اپنی تاریخ مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔لیکن تاریخ مذکور کے اکتشافات کے بعد 1834ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن میں بھیجا تھا۔اُس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا۔اصل کتبہ کا ذکر قوم عاد کے تذکرہ میں بہت جلد آئے گا۔ فارسٹر صاحب Forestor کی تحقیق میں یہ کتبہ قوم عاد کا ہے اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں سے ہے۔جس کا زمانہ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس قبل ہے۔فارسٹر صاحب نے اپنے تاریخی جغرافیہ میں (ص 90091) اس کا جو ترجمہ کیا ہے نویری کے ترجمہ سے بہت کم مختلف ہے۔

مؤرخ کلبی کے زمانہ میں قبیلہ ذوی الکلاغ کے ایک شخص نے یمن میں ایک تخت پایا جس پر ایک مردہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔اس کے سامنے ایک زرین سپر تھی۔جس پر سرخ یاقوت جڑے ہوئے تھے۔اس سپر پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔(یہ عبارت حمیری عبارت کا ترجمہ ہوگی)

بسم اللہ رب حمیر انا حسان بن عمر و النفیل

اللہ کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے میں عمر ونفیل کا بیٹا حسان ہوں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیری خدا کے قائل تھے اور ان کا معبود اللہ تھا۔

حماد روایہ کے بھانجے نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر قوم عاد کا ایک تبرکا پایا تھا۔جو پتھر میں پیوست تھا۔اس پر یہ شعر لکھے تھے۔(اصل شعر نہیں بلکہ عربی ترجمہ ہے) معجم البلدان۔لفظ منخ

الا ھل الی ابیات شیخ بذی اللوی لوی الرسل من قبل الممات معاذ بلاد بھا

کنا و کنا نحبھا اذا الأھل أھل والبلاد بلاد

مقام ذو اللوی میں جو مکانات ہیں کیا مرنے سے پہلے پھر وہاں جانا نصیب ہوگا۔یہ وہ شہر ہے جہاں ہم رہا کرتے تھے اور جن سے محبت رکھتے تھے جب کہ لوگ لوگ تھے اور شہر شہر تھے

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یمن میں ایک دفعہ سیلاب سے۔ایک قبر کھل گئی۔تو ایک عورت کی لاش نکلی۔جس کے گلے میں موتیوں کے سات ہار اور انگلیوں میں مرصع انگوٹھیاں تھیں۔اس کے سرہانے ایک لوح تھی۔جس پر یہ کتبہ لکھا ہوا تھا۔

باسمك اللھم الہ حمیر انا ناحبۃ بنت ذی شقر بعثت مایرنا الی یوسف فابطاء الینا

فبعثت لا ذقی بمدمن ورق لتاتینی بمدمن طمین فلم تجدہ فبعثت بمدمن رھب

فلم تجدہ فبعثت بمدمن بحری فلم تجدہ فامرت بہ فطحن فلم انتفع بہ فاقتقلت

فمن سمع بی فلیر حمی و ایہ امرئۃ لیست حلیا من حلیتی فلا ماتت الا میتی

تیرے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔ میں ذوشقر کی بیٹی ناصبہ ہوں میں نے اپنے قاصد کو یوسف علیہ السلام کے پاس بھیجا تھا اس نے جب دیر لگائی تو میں نے چاندی پھر سونا بھیجا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ پھر میں نے حکم دیا کہ میرے جواہرات پیس کر آٹا بنایا جائے۔ لیکن وہ بیکار تھا۔ جو شخص میرا حال سنے اس کو میرے حال پر رحم کرنا چاہیے۔ جو عورت میرے زیور پہنے گی وہ میری ہی موت مرے گی۔

اس کتبہ کو فارسٹر صاحب نے بھی اپنے جغرافیہ صفحہ 103 میں مع انگریزی ترجمہ کے نقل کیا ہے۔

یہ کتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اس قدر زمانۂ قدیم سے تحریر کا رواج تھا اور نیز یہ بھی کہ حمیر اللہ کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔

حمزۂ اصفہانی المتوفی 370ھ نے ایک حمیری کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کی عبارت یہ تھی۔

بنام خدا۔ شمر برعشق (شاہ حمیر) نے آفتاب دیبی کے لئے یہ بنایا۔ تاریخ الملوک الارض ص 180 کلکتہ

ابن حائک ہمدانی حمیری المتوفی 324ھ علامہ مقدسی۔ یاقوت حموی۔ علامہ نویری اور قزوینی نے اپنی اپنی تصنیفات و تالیفات میں اس قسم کے آثار و کتبات کا مفصل ذکر کیا ہے۔

عرب کے متعلق اہل یورپ کے اکتشافات اثریہ

بہر حال یہ ایک ادھوری کوشش تھی۔ حقیقتاً اہل یورپ نے اس شاخ کو بے انتہا ترقی دی ہے اور اس کو بجائے خاص ایک مستقل فن بنا دیا ہے۔ علمائے خطوط قدیم نے ان کتابات و نقوش کو اس طرح حل کیا ہے کہ ان سے عرب کی تاریخ قدیم کے متعلق عجیب و غریب اکتشافات حاصل ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اہل یورپ کو اولاً مقامات مذکورہ تورات کے اکتشافات و تحقیقات کا خیال پیدا ہوا۔ جو علی العموم بعینہٖ عرب کے مقامات و اقوام ہیں۔ اس سلسلہ میں بابل، مصر، فلسطین، حوران اور عرب کے دیگر آثار کی طرف بھی توجہ ہوئی ہے۔ ہمیں صرف آثار عرب سے تعلق ہے۔ اور ہم نے اسی کے متعلق متکاشفین یورپ کے ان اکتشافات سے مدد لی ہے۔

ان میں سب سے پہلا یورپین سیاح اور مکتشف آثار عرب نیوبھر Neubhar ہے۔ یہ محقق 1762ھ میں تنہا یمن کی طرف عازم سفر ہوا۔ اس کے بعد جب محمد علی پاشا خدیو مصر اور وہابی امیر نجد کی جنگ شروع ہوئی اور یورپ نے مصر کا ساتھ دیا تو اس وقت یورپ کی سیاحت عرب کا سب سے پہلا اور سب سے بہتر موقع نصیب ہوا۔ ان سیاحوں کے حالات و اکتشافات و تحقیقات پر انگریزی میں ہوگارتھ D.G. Hogarth نے ایک مستقل کتاب 350 صفحوں پر لکھی ہے۔

نیوبھر ڈنمارک (Denmark) کا رہنے والا تھا۔ سلطنت کی طرف سے تحقیق آثار قدیمہ کے ایک وفد کے ساتھ 1761ء میں روانہ

ہوا۔ یہ جماعت متکاشفین آثار قدیمہ ایک برس تک مصر اور جزیرہ نمائے سینا کی سیر و سیاحت کرتی رہی۔ 1762ء میں عرب میں داخل ہوئی۔ اور ڈیڑھ پونے دو برسوں تک ملک یمن اور اس کے تمام توابعات و مضافات کی سیر و تلاش کر کے ہندوستان کی طرف واپس ہوئی۔ نیوبھر ہندوستان سے دوبارہ پھر عرب میں پہنچا۔ اور اب کی بار اس نے خلیج فارس، بصرہ، شام اور فلسطین کے مقامات قدیم کی سیر کی۔ پھر ڈنمارک لوٹ گیا۔ اس وفد کے نتائج سفر 1773ء میں بنوبھر نے شائع کئے۔ جن کی وجہ سے پہلی بار علمی اور تحقیقی پیرایہ میں یورپ کو نہ صرف یمن سے بلکہ تمام عرب سے اطلاع ہوئی۔

نیوبھر کے بعد ہرنبرگ اور ہمپرچ C.G Ereberg. W.F. Hemprich نے تہامہ اور جزائر ساحل عرب کا سفر کیا۔ پھر ایک فرانسیسی ٹمیز یر (M.O Temisuier) شیفا رڈ Chefau اور ماری Mary نے مصری فوج کے ساتھ عرب کے علاقہ عسیر کی سیر کی۔

پھر تو مغربی محققین اور یورپین متکشفین کا تانتا بندھ گیا۔ ہر سال خیل کے خیل لوگ آنے لگے اور ریگستان عرب کی خاک چھاننے لگے۔ ان میں سے ارنارڈ L. Arnaud پہلا یورپین ہے جس نے جنوبی جوف (عرب) اور مآرب کا سفر کیا۔ یہاں کے کتبات سنگین کو پڑھا اور سندعرم کا نقشہ تیار کیا۔ ارنارڈ کے اس کارنامہ کو دیکھ کر مسٹر ہالوے J. Halway بے چین ہوگئے۔ یہ فاضل علم آثار قدیمہ کا مشہور و معروف یورپین عالم تھا۔ 1869ء میں عازم ملک عرب ہوا۔ سب سے پہلے یہ دارالحکومت یمن شہر صنعا میں پہنچا۔ پھر صنعا سے شمالی مشرقی جانب المدید آیا۔ جو پانچ ہزار عرب باشندوں کا مسکن اور ضلع نخم کا مرکز ہے اسی طرح اس محقق نے سات برس کے مسلسل سفر میں یمن اور اس کے تمام مضافات اور متعلقات کی خاک چھان ڈالی۔ یہاں تک کہ عرب کے صحرائے عظیم کو بھی یہ تحقیق کا سودائی طے کرتا ہوا علاقہ نجران تک پہنچ گیا۔

ہانوے کے بعد آسٹریا کا عالم آثار گلاذر (Glaser) 1855ء تا 1908ء ہے جس نے علم آثار عرب کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ اس نے دولت عثمانیہ کے زیر حفاظت صنعا کے شمالی و مشرقی جوانب کا مشاہدہ کیا۔

حضر موت

جنوبی ساحلِ عرب سے اندرون ملک میں جانے کی کوشش سب سے پہلے 1833ء میں کی گئی۔ جب دو انگریز افسر لفٹنٹ کروٹنڈن C.Crutondon اور ویلسڈ J.R Wellested ساحل عرب کی پیائش کے لئے متعین کئے گئے۔ ان دونوں نے وادی میقات میں نقب الحجر کے کھنڈروں کا معائنہ کیا۔ یہاں اور نیز مکلا کے پاس حصن غراب میں حمیری کتبات کا انکشاف کیا یہ سب سے پہلی دفعہ ہے۔ جب حضر موت میں عربی تمدن کا سراغ ملا۔

ان کے بعد اوڈلف وریڈے Adolph Wonwreda 1843ء میں مُکلا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور حضر موت حضرت ہودؑ پیغمبر کی قبر پر جو حضر موت میں واقع ہے زائر بن کر پہنچا۔ پھر وہاں سے شمال کی طرف مڑا اور وادی ودان کے سطح مرتفع تک پہنچ گیا۔ اور جنوبی صحرائے عظیم تک اس کی سیاحت اور مشاہدے تمام ہوگئے۔

1893ء میں ہریش LHureoch سلطان مُکلا کی زیر حفاظت قصبہ سیون اور تریم سے جو سلطان کے مقبوضات ہیں آگے بڑھا۔

پہلے یہ وادی ودان پہنچا۔ اس نے قریہ نجران کے پاس قدیم عمارات اور کتبات کا کھنڈر پایا۔ یہاں سے وہ واپسی میں وادی ابن علی اور وادی ادیم ہوکر مکلا واپس آیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد ملکی پیمائش کی ضرورت سے گورنمنٹ آف انڈیا نے تھیوڈر نبٹ J. TheodoreBent اور ان کی ہمراہی جماعت کو بھیجا۔ اس سفر میں لیڈی نبٹ بھی ہمراہ تھیں۔ یہ لوگ حضر موت پہنچے اور ان دونوں میاں بی بی نے یہاں بہت سے حمیری یادگاروں اور کتبات کا معائنہ کیا۔

عمان

عمان ایک مدت سے انگریزی حکومت کے زیر اقتدار ہے۔ تعجب ہے کہ یورپین سیاح مسقط سے آگے نہیں بڑھے۔ برٹش دستۂ فوج جو 1810ء میں عمان گیا تھا۔ ساحل سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ جے۔ ولیمسڈ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اور جس نے جنوبی عرب میں حضر موت کی تفتیش کی تھی۔ 1853ء میں دوبارہ شمال عرب کی تحقیق کو نکلا۔ مسقط سے وہ جہاز پر راس الحد تک آیا پھر جنوب کی طرف صحرا کے کناروں تک قبیلۂ بنو علی تک پہنچا۔ پھر وادی بیشہ اور نجد ہوکر حضر موت تک کے شہر شحرا ا اور وہاں سے ہندوستان واپس آیا۔ ایسے ہی عمان سے ہوکر کرنل مائلس Coronel S.B Miles نے بھی ظہیرہ طقطار وغیرہ مقامات کی سیر کی۔

حجاز

حجاز کا پہلا یورپین سیاح ایک اسپینی ہے جس کا نام بیڈے لیلیچ Badiay Leilich ہے۔ یہ شخص علی بے عباسی کے نام سے مسلمان بن کر 1807ء میں جدہ پہنچا۔ اور حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ مکہ معظّمہ پہنچا۔ یہ سب سے پہلا یورپین ہے جس کو شہر مقدس کی زیارت اور اعمال حج کے مشاہدے کا شرف حاصل ہوا۔

حجاز کی سب سے عمدہ تصویر کھارڈ (Burkhardt) نے کھینچی اور یورپ اس کے لئے اس کا شکر گزار ہے۔ یہ جولائی 1814ء میں جدہ آیا۔ جب محمد علی پاشا خدیو مصر وہابیوں سے برسر پیکار تھا۔ برکھارڈ پہلے طائف پہنچا پھر مکہ اور یہاں تین مہینے۔ شہر کے جغرافی اور سیاسی حالات دیکھتا رہا۔ جنوری 1815ء میں مدینہ منورہ گیا۔ اور وہاں کے حالات کا بھی جغرافی اور ریاضی نظر سے معائنہ کرتا رہا۔

اس کے بعد پروفیسر سر رچرڈ برٹن Sir Rechard Burton بھی ایک مسلمان حاجی کے بھیس میں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پہنچا اور یہاں کے جغرافی اور طالوغرانی (ریاضی جغرافی) حالات کی سب سے زیادہ تحقیق کی۔ اس سفر کے پچیس برس بعد حکومت مصر کی طرف سے وہ مدین میں سونے کی کان کی تلاش میں بھیجا گیا۔ سونے کی جو کان وہاں ملی اس میں سونا لگانے کی کوششوں کے قدیم آثار معلوم ہوتے تھے برٹن کو اس وقت سونے کی مقدار بہت کم ملی۔ تاہم سونے سے زیادہ گراں قیمت اکتشافات اثریہ اس کے ہاتھ آئے۔

نجد

کپتان سیڈیلر Capt Sadleer ویلن نے G.E Wallien 1845ء میں اور مسٹر پالگریو نے (W.G Palgrive) 1862ء میں مصر و نجد

کے خاص تعلق سے نجد، ریاض، حائل شمر اور حجاز کا مشاہدہ کیا۔ ان کے معائنات میں بجز عرب کے اجتماعی زراعت اور عام سفر کے حالات سے کوئی علمی دلچسپی نہیں ہے۔ اور عجیب نہیں کہ یورپ کے لئے یہ خبریں بھی بالکل نئی نہ ہوں۔ مگر بایں ہمہ پالگریو جیسے سطحی النظر کو بھی مجلس اکتشافات عرب میں یہاں ایک بلند درجہ دیا جاتا ہے۔

شمالی عرب

جنوبی عرب (یمن و حضرموت) کی طرح شمالی عرب میں بھی قدیم یادگاروں کے بڑے بڑے مخزن ہیں۔ جن میں حوران۔ بطرا، تدمر، مدین، مدائن الصالح، صفا اور العلاء وغیرہ عتیق العمر اور کثیر الآثار ہیں۔ سب سے پہلے ان مقامات کی سیر کرنے والا۔ جس نے بطرا کے کھنڈروں کو دیکھا وہی برکہارٹ 1812ء ہے۔ اس کے بعد چارلس ڈولے (Charles Doughy) ایک انگریز ہے۔ جس نے 1875ء میں ان مقامات کا سفر کیا۔ اور الحجر، مدائن الصالح اور العلاء کا مشاہدہ کر کے مفید معلومات کا ذخیرہ ساتھ لایا۔ اور اپنے تمام سرمایہ کو پیرس میں پروفیسر رینان (Renun) کے پاس بھیج دیا اس نے اور آگے سفر کرنے کی اجازت بھیجی۔ چنانچہ اس نے نجد و حجاز کے تمام درمیانی مقامات کا مشاہدہ کیا شہر تیما میں اس نے بہت سی قدیم یادگاریں دیکھیں وریہاں ایک مشہور یادگاری پتھر جس پر عبارت کندہ تھی اس کو ملا۔ وہ آیندہ موسم گرما میں شہر حائل گیا۔ وہاں سے واپس ہو کر خیبر پہنچا اور یہاں چند مہینوں تک سیر و سیاحت کر کے جدہ واپس آ گیا۔

ڈولے کے تین برس بعد ولفریڈ (Welfrid) اور لیڈی اینوبلنٹ (Annoblunt) نے ایک نوجوان شیخ عرب کی معیت میں جو شہر تدمر کا باشندہ تھا، عرب کا سفر کیا، یہ لوگ پہلے دمشق آئے پھر صحرائے شام اور وادی شمراں ہوتے ہوئے جوف پہنچے جوف سے جبل شمر ہو کر شہر حائل میں آئے۔ یہاں ابن رشید امیر نجد نے ان کا نہایت تپاک سے استقبال کیا۔ پھر ایک مہینہ بعد یہاں سے ایرانی قافلہ کے ساتھ یہ لوگ کربلا و بغداد سے ہوتے ہوئے آگے نکل گئے۔

1883ء میں فرانسیسوں کی سیاحت کا زمانہ آیا۔ مسٹر سی ہیوبر (C.Hubar) کی معیت میں ایک اور یورپین عالم اکتشافات یوٹنگ (J.Eutung) نامی تھا۔ ان دونوں کے اکتشافات نے ڈولے کی ناتمام تحقیقات کامل کر دی۔ ہوبر کی تحقیقات و اکتشافات۔ عام حالات و واقعات سے بلند تر اور زیادہ علمی ہیں۔ ہوبر نے حائل اور تیما کے درمیان بہت سے کتبات کا سراغ لگایا۔ اور ڈولے کے بیان کردہ مشہور منقوش پتھر کو حاصل کیا۔ جو مواب کی یادگار ہے اور جس کے سامی آثار میں نہایت گراں قدر وقعت ہے۔

ہوبر یہاں سے غنیرہ آیا اور دہانے براہ راست نجد، نجد سے مکہ اور مکہ سے جدہ، جدہ پہنچ کر خوش قسمتی سے اس نے اپنی تحقیقات و اکتشافات کا تمام سرمایہ بیان چھوڑ دیا اور خود جولائی 1884ء میں اندرون ملک پہنچا۔ یہاں عربوں کے ہاتھوں مارا گیا اس کی تحقیقات و اکتشافات کا مجموعہ اس کے بعد شائع ہو گیا۔

حدود سفر

یورپین سیاحوں کے مقامات سفر کا نقشہ اگر ہمارے سامنے ہو۔ تو نظر آئے گا کہ نصف شمالی عرب کو حقوف سے مکہ تک انہوں نے

بالکل چھان ڈالا ہے۔نصف جنوبی عرب میں ایک ثلث حصہ صحرائے اعظم (ربع اضحال) کا ہے۔جس میں سفر مترادف موت ہے بقیہ حصص میں استثنائے جوف،نجران ویمن وہ ساحل سے سومیل سے آگے نہیں بڑھے۔

شہر تدمر کا نشان یورپ کو بہت پہلے مل چکا تھا۔ڈاکٹر ولیم ہالیفیکس (W.Halifax)1691ء پہلا یورپین سیاح تدمر ہے۔وہاں کے عمارات کی تحقیق وڈ (Wood) اورڈاکنس (Dawkuns) نے 1751ء میں کی لیکن اپی گرافی کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل قدر خدمات پرنس ابا مالک (Abumelek) نے 1882ء میں اور واڈنگٹن (Wadding ton) اور ویران (D.Vogue) نے 1892ء میں انجام دی اوران پر تصنیفات ورسائل ترتیب دیئے۔

سد مآرب

عرب کا ملک قدرتاً دریا سے محروم ہے۔اس لئے اُس کی زرعی زندگی کا مدار زیادہ تر ان پہاڑی چشموں پر ہے جو بہہ بہہ کر وادیوں میں پھیل جاتے ہیں۔اور پھر وہ یا ریگستانوں میں خشک ہوجاتے ہیں یا سمندر میں گر جاتے ہیں۔نیز وہ پہاڑوں سے اس طرح یکا یک اوبل پڑتے ہیں کہ دور تک آبادیوں کو بے نشان بنادیتے ہیں۔اس وجہ سے عرب وادیوں میں بند آب تعمیر کیا کرتے تھے۔جس کو عربی میں سند کہتے ہیں۔عرب کا مشہور ترین سد سدم آرب ہے۔جس کو سدعرم بھی کہتے ہیں۔جوتقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے منہدم ہے اورجسکی شکستہ دیواریں زائرین عدن کے لئے نشان عبرت ہیں۔

یورپین سیاحوں میں سدمآرب کا مشاہدہ سب سے پہلے آرناؤ نے کیا۔لیکن اس کی اصلی اہمیت گلاذر نے اپنے اکتشافات مطبوعہ 1897ء سے ظاہر کی۔ان کتبات سے اس سد کے متعلق تاریخی حالات بہت روشن ہوگئے ہیں۔یمن میں حران کے پاس ہیرس (W.B Haris) نے ایک اور بند دیکھا جس کا طول 120 گز ہے اور جس کے اوپر تین بڑے بڑے حوض ہیں۔

آثار حجریہ ونحاسیہ

آثار قدیمہ کی یہ صنف سب سے زیادہ کارآمد ہے۔کہ پتھر اور سیسے کی اشیاء پر اکثر کتبات منقوش ہوتے ہیں اوران سے بڑے بڑے تاریخی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔اورحل مطالب کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوسکتے ہیں۔انیسویں صدی سے یورپ کے عام عجائب خانوں میں اس قسم کی چیزیں کافی تعداد میں موجود ہیں۔جن میں اکثر پر معین اور سبا کی زبان اوربعض پر حضر موت اور قتابین کی زبان میں کتبات منقوش ہیں۔

اپنے ماخذ اکتشافات اثریہ کے متعلق ہم نے یہاں تک توارض القرآن کی مدد سے لکھا ہے۔اکثر مقامات پر اس کی پوری عبارت نقل کردی ہے اوربعض مقامات پر تلخیص واختصار سے کام لیا ہے۔افسوس ہے کہ صاحب ارض القرآن نے یورپ کے تمام سیاحوں کا نام بنام تذکرہ کیا ہے۔مگر انگریزی محقق برک ہربوط Burk Horbut کا ذکر کرنا بالکل بھول گیا ہے۔یہ وہ مشہور ومعروف انگریزی محقق ہے۔جس نے یونانی اوررومانی جغرافیہ عرب کو موجودہ جغرافیہ عرب سے تطبیق دے کر اس موضوع پر ایک خاص کتاب مرتب کی ہے۔یہ اسی نے

بتلادیا ہے کہ یونانیوں کامیشیا وبقطانی قوم سبا کا مشہور شہر تھا۔اور موجودہ بندرگاہ موزہ جو خلیج عرب پر ایک موجودہ بندرگاہ ہے ایک ہی مقام ہے۔اور سفار یا ظفار سے یمن کا وہ کوہستانی حصہ جہاں جغرافیہ بطلیموس کے مطابق شہر صفار اور قوم صفار یہ آباد تھی ،مراد ہے۔

عربی محققین اور اسلامی مکتشفین نے اپنے امکان کے مطابق ملکی آثار قدیمہ کے جتنے اکتشافات کئے تھے اور اپنی تالیفات و تصنیفات میں ان کے جس قدر حالات و واقعات لکھے تھے ان کو ہم بالتفصیل اوپر بیان کر آئے ہیں۔ہم نے اپنی موجودہ تالیف کے مقدمہ میں عموماًاور اقوام وقبائل قدیمہ کے متعلق خصوصاًاس قسم کے ماخذ سے اکثر مقامات پر مدد لی ہے۔

ان تمہیدی اور ضروری مضامین اور اپنے تمام ذرائع معلومات کو بیان کر کے اب ہم ملک عرب کے قبائل و اقوام ان کے مختلف مساکن ومواطن اور ان کے تمدنی اور سیاسی حالات وواقعات ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

عرب کے قدیم اقوام وقبائل۔ان کی مساکن ومواطن اوران کے تمدنی اور سیاسی حالات

عرب کی اقوام قدیمہ

پہلے اقوام قدیمہ کے اقسام لکھے جاتے ہیں۔بنی نوع انسان میں قومیت کی بنا حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے معلوم ہوتی ہے۔اوراس کی وجہ یہ ہے کہ تمدن اور سیاست کی صلاحیت معمورۂ عالم میں طوفان حضرت نوحؑ کے بعد پیدا ہوئی۔اسی بنا پر تمام اقطاع و اقوام عالم کی تاریخ حضرت نوحؑ اس کے بعد پیدا ہوئی۔لہذا تمام اقطاع واقوام عالم کی تاریخ حضرت نوحؑ کے وقت سے آغاز کی جاتی ہے اوران کا سلسلہ اسی بزرگ سے ملایا جاتا ہے۔

قوم وقبائل کے اعتبار سے۔اہل عرب کی تین قسمیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۱)عرب البائدہ یا عرب البادیہ(بدوی) یا امم سامیہ۔یا عاد اولیٰ یا موجودہ اکتشافات تحقیق کے اعتبار سے۔ہائیکسوس (شاہان شیان)

(۲)عرب العاربہ،عرب القدیم،عرب المتوطن یا عاد ثانی یا جرہم اولیٰ یا عیلامی بھی کہلاتے ہیں۔

(۳)عرب المستعربہ۔بنو ابراہیمؑ۔یا عرب میں نئے آباد ہونے والے جو سکونت مدت دراز کی وجہ سے قوم عرب میں داخل ہو گئے۔

باعتبار ترتیب اقسام،عرب کی اقوام کا علیحدہ علیحدہ حال لکھا جاتا ہے۔

عرب البائدہ۔یا عرب البادیہ کے اقوام وقبائل سات مختلف طبقات میں منقسم ہیں۔یہ طبقات سبعہ یہ ہیں۔

۱۔ کوش پسر حام پسر حضرت نوحؑ کی اولاد۔

۲۔ عیلام پسر نوحؑ کی اولاد

۳۔ لود پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد

۴۔ حوص پسر ارم پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد

۵۔ حول پسر ارم پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد

۶۔ جدیس پسر گزر پسر ارم پسر نوح کی اولاد

۷۔ ثمود پسر گثر پسر ارم پسر سام پسر نوحؑ کی اولاد

انھیں اقوام سبعہ کا ملک عرب گویا ہفت پیکر ہے۔ یا مندرجۂ بالا طبقات عرب قدیم کا سبعہ معلقات عرب کے اسی ہفت دفتر میں سامی، ارامی، عاد اولیٰ اور جرہم اولیٰ وغیرہم سب داخل ہیں۔ اور ان تمام اقوام وقبائل پر مجموعاً متحد النسل اور متصل الاصل ہونے کے اعتبار سے۔ عرب البائدہ ہونے کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

عالم تاریخ کی سیر سے ان سات مختلف گروہوں کے مقامات سکونت بھی سات اقطاع عرب میں ثابت ہوتے ہیں۔ عربی مؤرخین و محققین نے ان کے حالات ومقامات سکونت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا انتخاب حسب ذیل ہے۔

مؤرخ ابوالفدا لکھتا ہے۔

قال القاضی صاعد ابن احمد الاندلسی صاحب قضاۃ مدینہ طلیطلہ ان العرب البائدہ فکانت امما ضخمہ کعاد و ثمود و طسم و جدیس و لتقادم انقراضھم ذھبت ان حقائق اخبارھم وانقطعت عنا اسباب العلم باٰثارھم

قاضی صاعد ابن احمد اندلسی جو شہر طلیطلہ (TOLEDA) کے قاضی تھے۔ لکھتے ہیں کہ عرب البائدہ کے لوگ بہت قوی الجسم ہوتے تھے۔ ان کی مثال میں اقوام، عاد، ثمود، طسم اور جدیس کے حالات موجود ہیں۔ زمانہ دراز کے باعث ان کے اخبار وآثار کے ذریعہ معلومات مسدود ومنقطع ہیں۔

پھر وہی مؤرخ لکھتا ہے۔

اما جرھم فھم صنعان جرھم الا ولی وکانوا علی عھد عاد قباد و درست اخبارھم وھم من عرب البائدہ (ابو الفدا)

جرہم۔ جنہیں صنعان بھی کہتے ہیں۔ یہی لوگ جرہم اولیٰ تھے۔ اور یہی لوگ زمانہ عاد میں تھے۔ پھر یہ معدوم ہوگئے اور ان کے ساتھ ان کے حالات بھی معدوم ہوگئے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ عرب البائدہ میں داخل تھے۔

جرہم کے بعد بنوطسم کی حقیقت یوں ہے۔بنوطسم۔سکنت بنوطسم الیمامہ الی البحرین،ابوالفدا بنوطسم میامہ (یمامہ) سے لے کر بحرین تک کے علاقوں میں آباد تھے۔

بنوعاد کی نسبت یہ عبارت ہے۔سکنت بنو عاد الرمل الی حضر موت۔بنوعاد ریگستان سے لے کر علاقہ حضرموت تک ساکن تھے۔ان کے مختلف مقامات سکونت کی تفصیل یہ ہے۔

وبلا دعاديقال لها الاحقاف وهي بلادمتصلة باليمن وبلاد عمان. ابو الفدا.

قوم عاد کے شہروں کو احقاف کہتے تھے اور یہ علاقہ یمن اور عمان سے ملے ہوئے تھے۔ابوالفدا۔

معالم التنزیل میں مرقوم ہے

وهو عاد بن عوص بن ارم بن سام وهم عاد الاولىٰ وكانت منازل قوم عاد بالا حقاف وهي رمال بين عمان وحضر موت

وہ عاد بن عوص بن ارم بن سام ہے اور اسی کی اولاد۔عاد اولیٰ کہلائی،ان لوگوں کے مقامات احقاف میں تھے۔احقاف اس ریگستان کا نام ہے جو علاقہ عمان وحضرموت کے درمیان ہے۔

قوم ثمود کے متعلق ابوالفدا اور صاحب معالم التنزیل کی تحقیق متفقہ یہ ہے۔

سكنت ثمود الحجر بين الحجاز و الشام الى وادى القرى.

ثمود کی سکونت علاقہ حجر میں تھی۔اور یہ حجاز وشام کے درمیان وادی القریٰ تک پھیلے ہوئے تھے۔

الحجر کی ماہیت یہ ہے

الحجر بالكسر غم السكون والراء اسم ديار ثمود بوادى القرى بين المدينه والشام و كانت مساكن ثمود و هى بيوت منحوتة فى الجبال مثل الغائر تسمى تلك الجبال الا ثاليب كل جبل منقطع عن الأخر بطاف حوله وقد نفرنيه بيوت و نقر على قدر الجبال التى تنقرفيها وهى بيوت فى غاية الحسن فيها نقوش وطيقان محكمة الصنعة وفى وسطها بيرالتى كانت تردها الناقة. (مراصد الاطلاع للامام سيوطى)

الحجر قوم ثمود کے ان مقامات سکونت کا نام ہے۔جو وادی القریٰ کے علاقے ہیں۔مدینہ اور شام کے درمیان واقع ہے۔یہی مقامات قوم ثمود کے مساکن تھے۔ان لوگوں نے پہاڑوں میں پتھر تراش کر کے

غار کی صورتوں میں اپنے رہنے کے لئے گھر بنائے تھے۔انھیں کو جبال اثالیب کہتے ہیں۔ یہ تمام پہاڑ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔مگر سب کے سب ایک گول دائرہ کی صورت میں گھومے ہوئے ہیں۔انھیں پہاڑوں میں پتھروں کو کاٹ کر گھر بنے ہوئے ہیں۔ان پتھروں کو پہاڑ کی موٹائی کی مقدار کے مطابق کاٹا ہے۔ان میں نہایت خوبصورت گھر بنائے ہیں اوران میں نقش ونگار بھی ہیں اور خوبصورت طاق بھی مستحکم صنعت کے ساتھ بنے ہوئے ہیں۔ان گھروں کے بیچ میں وہ کنواں ہے جہاں ناقہ (صالحؑ) کوان لوگوں نے پانی پینے سے روکا تھا۔

تقویم البلدان میں الحجر کی حقیقت یوں لکھی ہے۔

قال ابن حوقل الحجر بین جبال علی یوم من وادی القریٰ اقول لم یحصل ذلك فان بینھا اکثر من خمسة الا یام قال وکانت دیار ثمود الذین قال الله تعالیٰ عنھم و ثمود الذین جابو الصخر بالواد قال رأیت تلك الجبال و ما تحت منھا کما اخبر الله تعالیٰ و تنحتون من الجبال بیوتا فارھین و تسمی الجبال الا ثالیب اقول و ھی التی ینزلھا حجا ج الشام وھی عن العلی علی نصف مرحله من جھة الشام (تقویم البلدان)

ابن حوقل کا بیان ہے کہ علاقہ حجر پہاڑوں کے درمیان وادی القری سے ایک دن کے راستہ پر واقع ہے۔ مگر میں نے (ابوالفدا) پانچ دنوں کے راستہ سے بھی زیادہ اس کو پایا۔الذین جابوالصخر بالواد۔ابن حوقل کا بیان ہے کہ میں نے ان پہاڑوں اوران چیزوں کو جوان میں واقع ہیں۔(لکھا ہے جیسا کہ ان کے متعلق خداوند عالم فرماتا ہے۔وتنحتون من الجبال فارھین۔ان پہاڑوں کا نام الاثالیب ہے۔یہ وہی مقام ہے جہاں شام سے آنے والے حاجیوں کا قافلہ اترتا ہے۔اور یہ مقام علی سے مابین حکمہ اور شام۔نصف راہ پر واقع ہے۔

اب وادی القریٰ کے متعلق۔تقویم البلدان کی یہ تحقیق ہے۔

وادی القری فھو بأدیة الجزیرة وما کان من یابس الی ابلة ھوجھا بالحجاز معارضا لارض تبوك فھو بأدیة الشام۔ تقویم البلدان۔

وادی القری اوس بادیہ الجزائر کا نام ہے جو یابس سے لے کر ایلہ تک حجاز سے آنے والے راستہ میں تبوک

کے مقابل واقع ہے۔

ہم نے اپنے مندرجۂ بالا بیان میں تمہیداً صرف مؤرخین عرب کے اقوال سے، عرب البائدہ کے جستہ جستہ حالات اور ان کی سکونت کے مقامات لکھ دیئے۔اب ہم حسب الوعدہ، ان کے ساتوں قبائل کے حالات اور ان کی سکونت کے مقامات اور تمدنی وسیاسی واقعات و حالات۔ محققین اور مکتشفین یورپ اور نیز کتب مقدسہ کے حوالے سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

عرب البائدہ کے قبائل هفتگانہ کی تفصیل اوپر لکھی گئی ہے۔ان ساتوں قبائل کے مورث یا موجد خاندان کے نام یہ ہیں۔

(۱) کوش (۲) عیلام (۳) لود (۴) عوص (۵) حول (۶) جدیس (۷) ثمود۔ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) بنی کوش

(کوش ابن حام ابن نوحؑ) عرب کے کسی مؤرخ نے ان کا کوئی حال نہیں لکھا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ اس قوم کے لوگ قربت سکونت کی وجہ سے عرب کے یقطانی قبائل سے مل جل گئے، اور ایسے کہ عرب میں تدوین تاریخ کے زمانہ میں ان میں کوئی باہمی تفریق باقی نہیں۔اس لئے ان کو بھی یقطانی قبائل میں داخل کر لیا۔عربی مؤرخین میں ایک نوبری نے ان کی نسبت یہ فقرہ لکھا ہے۔ **وملك شرحيل بنی قيس و تميم** ۔(شرحیل نے بنی قیس اور تمیم پر حکومت کی) اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں شرحیل عرب کے ان دونوں قبائل، قیس اور تمیم پر حکمران تھا۔اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ شرحیل۔۔جو اپنے نام کی ترکیب سے بنی کوش کی قوم کا شخص ہے۔نوبری کے نزدیک یقطان کے قبائل میں داخل تھا۔اب ثابت ہو گیا کہ حقیقتاً عربی مؤرخین کی خاموشی اسی سبب سے تھی کہ وہ بنی کوش کو جانتے بھی نہ تھے اور اگر جانتے بھی تھے تو بنی یقطان کی ایک شاخ۔

مگر یورپین محققین کی تلاش وفکر کا کیا کہنا۔جنہوں نے بڑی جانفشانی اور دماغ سوزی سے اس مسئلہ کی تاریکی پر تحقیق کی کامل روشنی ڈالی۔اور بنی یقطان سے بنی کوش کے ایک جداگانہ قوم ہونے کے ثبوت اور ان کی آبادیوں کے مقامات کے صحیح نشان قوی دلیلوں کے ساتھ دکھلائے اور بتلائے۔ایک زمانہ تک یورپین محقق بھی عربی مؤرخین کی طرح بنی کوش کے حالات سے ناواقف بنے رہے چنانچہ مسٹر جارج سیل (GEORGE SALE) اور دیگر انگریزی مؤرخین بھی اپنی تالیفات میں ان کا کوئی حال نہ لکھ سکے۔مگر ریورنڈ فارسٹر صاحب (REVD FORESTER) نے سب سے پہلے اس کی تحقیق وتفریق کی طرف اپنی ہمت کا قدم بڑھایا۔اور رفتہ رفتہ بڑی کوشش وتلاش اور کامل صحت وقابلیت سے مسئلہ زیر بحث کا پتہ لگایا۔اور نہایت معتبر ومستند حوالوں سے ثابت کر دیا ہے کہ بنی کوش درحقیقت عرب ہیں خلیج فارس کے کنارے برابر برابر آباد تھے اور اپنے اس دعوے کو مشرقی کناروں کے مختلف شہروں کے ناموں سے مقابلہ کر کے جو بطلیموس نے اپنے جغرافیہ عرب میں لکھے ہیں۔قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے اور اپنے ثبوت کو تاریخی مشاہدے سے مضبوط کر دیا ہے۔اور وہ اس طرح کہ محققین علم قدامت کی یہ رائے مسلم ہو چکی ہے کہ کوش نے پہلے وہ حصہ وادی القریٰ کا آباد کیا جو دریائے سے فرات سے ملحق ہے۔اور یہ رائے بظاہر وجوہات ذیل پر مبنی ہے۔ضلع مذکور کا خورستان یعنی کوش کے اصلی وطن کے قریب واقع ہونا۔شہر سباء اور قوم سباء کا سرحد خالدیہ

پر موجود ہونا۔ کوشی ناموں اور خاندانوں حویلا، ستباہ، راماہ، ودان کا خلیج فارس کے کنارے پر مسلسل سلسلے میں واقع ہونا اور سب سے آخر یہ کہ اشعیاۃ نبیؑ کی کتاب کے دو مقاموں میں کوش اور سبا کا ساتھ ساتھ بیان ہونا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سبا خورستان سے ملحق ہے۔ مروجہ نقشہ عرب میں راس ماسندام کے قریب جس کو بطلیموس نے اپنے نقشہ عرب میں راس اسابی کے نام سے دکھلایا ہے۔ شہر کسکان جو اصل میں کوش کان ہے ثابت کرتے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جو توریت مقدس میں کوشام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح بحر عمان کے اسی کنارے پر عمنان یا عمان اور تامر (تدمر) یا سیب اور سوبار شہروں کے درمیان ہم ایک شہر پاتے ہیں جس کو پلینی نے ساحل حام۔ جو بالفعل ماحام کہلاتا ہے۔ اس خاکنائے کے مقابل کے اطراف پر۔ جو راس مسندم پر منتہی ہوتی ہے۔ اور خلیج فارس کے دہانے کے اندر شہر اور ضلع رعماہ۔ جس کو یونانی ترجمہ توریت میں رعمہ اور بطلیموس نے رعامہ لکھا ہے۔ پایا جاتا ہے خلیج کے باہر شہر اور ضلع ودان یا ودانہ کا پتا ملتا ہے اور توریت میں جو ودان کی چھوٹی سی بستی رعماہ کا ذکر ہے وہ یہی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ ان تمام مقاموں کے نام قبائل کوش کے مندرجہ بالا ناموں سے بالکل مل جاتے ہیں۔ انھیں سے راماہ (رعماہ) اور ودان کا توریت مقدس میں مذکور ہونا پورے طور سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے یہ امر ثابت ہوگیا کہ بنی کوش حقیقت میں ایک جداگانہ قوم تھی اور وہ عرب کے اس حصہ میں آباد تھے جو خلیج فارس کے کنارے دور تک چلا گیا ہے۔

مسٹر ریورنڈ فارسٹر اپنی اس قابلانہ تحقیق و تطبیق میں اکثر حد اعتدال سے بڑھ گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے بعض دلائل کے ثبوت میں ضعف آ گیا ہے۔ اس کی خاص کر یہ وجہ ہوئی ہے کہ بنی کوش کے ناموں یا مقاموں سے جہاں ان کو عرب کے موجودہ ناموں اور مقاموں میں ذرا بھی مشابہت معلوم ہوئی۔ انہوں نے اس نام اور مقام عرب کو بنی کوش کی طرف سے منسوب کر لیا۔ حالانکہ ان کے تنہا قیاسی خیال کے خلاف کثیر التعداد تاریخی مشاہدا اور دلائل موجود ہیں۔

اسی طرح فارسٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہ بنی کوش عرب کے تمام حصوں میں پھیل گئے۔ قابل قبول نہیں ہے۔ ان کے اس دعوے کی بنا اس طرح قائم ہوتی ہے کہ بنی کوش کی قوم کا بادشاہ نمرود جس کا ذکر کتب مقدسہ میں بھی موجود ہے۔ اپنے ہم قوم لوگوں کے ساتھ عرب کے دوسرے حصوں میں سے ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس لئے بنی کوش تمام انطاع عرب میں پھیل گئے۔

اس مقام پر اس یورپین محقق کو بھی وہی دھوکہ ہوا ہے جو مشرقی مؤرخین کو۔ اور یہ دونوں فریق بنی کوش کو خلیج فارس کی آبادی سے بڑھا کر بحر احمر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس لئے نمرود کی سلطنت کو یمن تک وسیع بتلاتے ہیں۔ حالانکہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ نمرود کبھی اپنے بھائیوں کے ساتھ علاقہ یمن میں آباد نہیں ہوا تھا۔ کوش کی اولاد جن کے نام سبا، حویلاہ، سبتاہ، ریماہ اور ستبرگا تھے۔ اور رعماہ کے بیٹے شیبا اور ودان سب کے سب خلیج فارس کے کنارے کنارے آباد ہوئے تھے۔ جیسا کہ ابھی ابھی ہم توریت مقدس کے حوالے سے ودان اور رعماہ کے مقام سکونت خلیج فارس کے ساحل پر ثابت کر چکے ہیں۔ اگر یہ قومیں نمرود کے ساتھ یمن یا تمام اقطاع عرب میں آ کر سکونت پذیر ہوئیں تھیں تو ضروری تھا کہ نمرود کے ساتھ ان لوگوں کا ذکر تمام عرب کے متعلق توریت میں مندرج ہوتا۔

بات اتنی ہے کہ ریورنڈ فارسٹر کا یہ دعویٰ کہ بنی کوش بہمراہ نمرود آ کر تمام اقطاع عرب میں پھیل گئے۔ کسی طرح تاریخ سے ثابت

نہیں ہوسکتا۔مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چند اقطاع عرب میں جن کا نشان اوپر دیا گیا ہے۔ضرور بنی کوش آباد تھے۔مؤرخین عرب کو بھی اس کا اقرار ہے۔مگر وہ بنی کوش سے قطعی ناواقف ہونے کے باعث ان کو یقطانی سمجھے اور سمجھتے آئے ہیں۔

تورات میں ودان اور رعماہ کے متعلق جو حوالہ اوپر دیا گیا ہے وہ ریورنڈ فارسٹر صاحب کے مرقومہ بالا مختار کے بالکل مخالف ہے بنی کوش کا وجود توریت کے ایک دوسرے مقام پر بھی اس جگہ پایا جاتا ہے جہاں جناب موسیٰ علیہ السلام کی دوسری شادی کرنے کا بیان ہے۔ کتاب اعداد باب 112 آیت (۱) میں لکھا ہے کہ مرعام اور ہارون نے حضرت موسیٰؑ سے اس اتھوپین عورت کی وجہ سے جسکے ساتھ انھوں نے شادی کی تھی، گفتگو کی۔''

ریویرنڈ فارسٹر لفظ اتھوپیا کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ توریت وانجیل کے تاریخی جغرافیہ کے انگریزی ترجمہ میں الفاظ اتھوپیا اور باشندگان اتھوپیا اکثر مستعمل ہوئے ہیں اور ان کی جگہ عبرانی توریت میں اسم معرفہ کوش آیا ہے۔اور یہ لفظ کوش جہاں کہیں کتب مقدسہ میں اس طرح مستعمل ہوا ہے تو اس سے ہمیشہ ایشیائی یعنی عرب مراد لیا گیا ہے نہ افریقی اتھوپیا۔

اس سے زیادہ واضح اور مستحکم ثبوت اسی توریت میں موجود ہے۔کتاب خروج باب 2 آیت 15 اور 16 میں لکھتا ہے کہ وہ (حضرت موسیٰؑ کی بی بی) ایک مدیانی عورت تھی۔حضرت ابراہیمؑ کی اولاد بنی قطورہ کے سلسلہ سے۔''اور یہ بھی محقق ہے کہ مدین یا مدیان عرب میں ایک شہر تھا۔چنانچہ بیٹن یونیورسل انفارمیشن میں (BEETONS UNIVERSAL INFORMATION) اتھوپیائے عرب کے ترجمہ میں اتھوپیائے عرب سے ارض مدائن مراد لیا ہے۔جس کو جغرافیہ قدیم کے مطابق عرب فلکس (ابادان) میں شامل کیا ہے۔بیٹنس یونیورسل انفارمیشن مطبوعہ لندن ص 653

اس سے ثابت ہوگیا کہ حضرت موسیٰؑ کی بی بی ایک عربی خاتون تھیں۔مگر حقیقتاً کوش کا ترجمہ اتھوپیا درست نہیں ہوا ہے اور اسی وجہ سے اس کے اصلی مفہوم عرب کو اٹھا کر اتھوپیا سے افریقہ کے ساتھ خلط ملط کردیا ہے۔حالانکہ توریت مقدس کی عبارت میں لفظ مدائن نے داخل ہوکر بالکل صاف کردیا ہے اور نیز قدیم وجدید محققین نے بھی اقرار کرلیا ہے کہ اتھوپیا سے افریقی ہرگز مراد نہیں ہوسکتا۔

مشاہدِ تاریخی قدیمہ سے اس قوم وقبیلہ کے جو کچھ حال معلوم ہوسکے ہیں وہ یہ ہیں۔

بنی کوش کی حکومت

اس حکومت کے صرف تین کاہن بادشاہوں کے نام معلوم ہیں۔''اوکوش'' کاہن غشان''لوغل زاغیسی بن اوکوش۔لوغل اوکسلبسی

(۱) اوکوش کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ وہ غشبان کا کاہن اور سیاسی قوت سے زیادہ مذہبی قوت رکھتا تھا۔

(۲) لوغل زاغیسی نے باپ سے زیادہ سیاسی قوت حاصل کی۔وہ کش (کوشاں) اور غشبان دونوں کا بادشاہ تھا۔تقریباً چار ہزار ق۔م میں اس نے تیسرے شہر اَرخ یا ارک (عجب نہیں کہ لفظ ''عراق'' کی بھی اصل ہو) کی بنیاد ڈالی جس کو اس نے ملک کا دارالحکومت قرار دیا۔

(۳) لوغل اوکیلسی اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔اس کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوعری طاقت نے پھر عود کیا اور اس شہر کو

بیرونی قوموں سے واپس لے لیا۔

محققین جدید کا نظریہ یہ ہے کہ امم سامیہ میں جو طوفان کے بعد ہر اعتبار سے اول الامم ثابت ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ پیچیدہ اور طویل ہے اور ہمارے موضوع سے ایسا ضروری تعلق بھی نہیں رکھتا۔ مگر ہاں اتنا بتلا دینا ضروری ہے جیسا کہ مغربی اور مشرقی محققین دونوں کی تحقیقات سے اوپر بتلا دیا گیا اور ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ یہ قوم کوش قبیلہ یقطان سے بالکل علیحدہ تھی اور ان کے بود و باش کے مقامات بھی ان کے مقامات سکونت سے بالکل جدا تھے۔ وہ مفقود الحال اور معدوم الذکر بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے اخبار و آثار کتب مقدسہ اور اخبار قدیمہ میں ابھی تک محفوظ اور زندہ ہیں۔

(۲) عیلام

انہیں کی طرف جرہم اولیٰ منسوب ہیں۔ چونکہ یہ قوم بنی کوش کے مقابلہ میں کچھ نامور نہیں ہوئی اس لئے ان کے تفصیلی حالات بہت کم ملتے ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بنی کوش کے ساتھ رہتے تھے اور انہیں کے مقامات سکونت کے قریب بستے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہیں ہوتے۔

(۳) لود

لود کے تین بیٹے ہوئے۔ طسم۔ عملیق۔ اور عمیم۔ یہ قبیلہ بھی باستثنائے عملیق جن کا ذکر آگے آئے گا۔ بنو عیلام کے ہاں ایسا کوئی صاحب نام نہیں ہوا۔ اس لئے ان کے بھی تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ مگر ان کے آثار بھی خلیج فارس کے ساحلی مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

(۴) عوص اور (۵) حول

ان دونوں قبائل کے حالات اس لئے یکجا لکھے گئے ہیں کہ تمام تاریخوں اور کتابوں میں ان کے حالات کی ترتیب ایک ساتھ کی گئی ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوئی نوعیت پسند نہیں کرتے۔ ان دونوں قبائل کے مقامات سکونت بھی خلیج فارس کے ساحل اور اس کے قرب و جوار کے میدانوں میں آج تک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مقام حول اور عول (موجودہ) حقیقتاً متحد الذات اور مساوی المعنی ہیں۔

عوص کے بیٹے عاد اولیٰ نے بہت بڑی شہرت حاصل کی اور رفتہ رفتہ اس کی اولاد ایک نامور اور مقتدر قوم ہو گئی اور تمام مشرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی۔ انھوں نے عالیشان مکان اور بڑی بڑی عمارتیں بنائیں اور قرب و جوار کی قوم و قبائل کو بھی محکوم کر لیا۔ یہ قوم اپنی قوت، امارت اور شان و شوکت کے اعتبار سے اس زمانہ کی دوسری قوموں پر سبقت لے گئی تھی۔

عادِ اولیٰ یا سامیہ اولیٰ کے تاریخی حالات

تمام محققین ومؤرخین کا مسئلہ متفقہ ہے کہ قدیم امم سامیہ اور عاد مترادف لفظ ہیں۔ السنہ سامیہ میں زبان کے لحاظ سے عبرانی سب سے قدیم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اس میں محفوظ ہے۔ عاد کے لغوی حیثیت سے عربی میں کوئی معنی نہیں ملتے۔

لفظ عاد

عربی میں ''عاد'' کی اصلیت موجود ہے۔(عاد) کے معنی ''بلند ومشہور'' کے ہیں۔ اور عجیب تر ہے کہ ''ارم'' اور شم (سام) کے بھی یہی معنی ہوں۔ انھیں معنوں کا اثر عربی میں موجود ہے۔ ارم کے معنی پہاڑی اور سنگ نشان راہ کے لغت میں مذکور ہیں۔ اور شم سے ''شمم'' اور ''سمو'' تو اب تک مستعمل ہیں۔

تحقیق توریت

تورات میں ''عاذ'' مذکر کے نام کے لئے اور عادۃ عورتوں کے لئے کئی جگہ آیا ہے۔ تاریخ ایام اول 7-21 از تکوین 26-2 تاریخ اول 7-20

عاد کا زمانہ

نام کے بعد دوسری بحث زمانہ کی ہے۔ عرب میں قبل از اسلام کوئی باقاعدہ تاریخ رائج نہ تھی۔ اس لئے عرب بائدہ کا کوئی زمانہ مروی نہیں۔ لیکن اس بنا پر کہ مؤرخین عرب نے عاد کو عوص بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لئے ان کا زمانہ 3000 (تین ہزار) قبل مسیح قرار دینا چاہیے۔ قرآن مجید نے عاد کا جہاں ذکر کیا ہے۔ ان کو خلفائے نوح بتلایا ہے۔

وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ

ترجمہ: اے عاد کے لوگو۔ خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اپنی خلافت عطا کی (یعنی حکومت دی) الاعراف 69

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرزمین شام کی دوبارہ آبادی، بنوسام کی پہلی ترقی عاد سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے اس آیت سے نہ صرف عاد کے زمانہ کی تعین ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے مسلمہ کی بھی تصدیق کہ امم سامیہ اولیٰ اعلی الاغلب عاد ہی ہیں۔ اور اسی لئے قرآن مجید نے عاد اولیٰ فرمایا ہے۔

وَأَنَّهُۥٓ أَهْلَكَ عَادًا ٱلْأُولَىٰ

اسی خدا نے عاد اولیٰ کو برباد کیا۔ النجم 50

لیکن آج کل عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ بنو سام کی حقیقی ترقی کا زمانہ 2200 قبل مسیح یا 2000 ق م ہے جبکہ مصر و بابل کی بھی یہی تاریخ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عاد ارم کا وجود بھی 2200 ق م سے شروع ہوتا ہے۔ تعین انتہائے مدت کی یہ صورت ہے کہ 1500 سو ق م میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیؑ کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے عاد کی تباہی ہو چکی تھی۔ قرآن مجید نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰ و فرعون سے پہلے کیا ہے۔ بلکہ ایک موسوی مسلم فرعون کے دربار میں کہتا ہے۔

إِنِّيٓ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ مِّثۡلَ يَوۡمِ الۡأَحۡزَابِ مِثۡلَ دَأۡبِ قَوۡمِ نُوحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ (سورہ مومن)

بھائیو! میں ڈرتا ہوں کہ جماعتوں کے دن کی طرح قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد میں ان کی طرح ایک دن تم پر بھی آئے۔ (سورہ مومن)

ان وجوہ سے عاد کے جد سابق اور عہد ترقی و تقدم کا زمانہ 2200 ق م سے 1700 ق م تک ہوسکتا ہے صالحین عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہد مسیحؑ تک باقی رہا ہے اور یونانیوں نے عاد بیٹا (ADEMATEAI) (عاد ارم) عادئیت (ADETIE) کے نام سے حضر موت اور یمن کے باشندوں میں ذکر کیا ہے۔

عاد کی مرکزی آبادی، عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن وحضرموت میں از ساحل خلیج فارس تا حدود عراق تھی۔

دراصل حکومت کا مرکز ملک یمن تھا۔ لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ حکومت عراق تک وسیع تھی۔ جس سے نہایت آسانی سے وہ راہ معلوم ہوسکتی ہے۔ جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق میں اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی اور یہی جدید تحقیقات کے رو سے بھی امم سامیہ کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔

عاد کا دور دراز ممالک میں جانا عربوں میں اس قدر مسلم تھا کہ وہ شعرا کے ہاں تمثیلوں میں آ گیا ہے زمانہ جاہلیت کا ایک شاعر محرز بن مکعبر ضبی کہتا ہے۔

حتی انتھی لمیاہ الجوف ظاھرہ

مالم ترقبلھم عاد و الارم

وہ وسط صحرا کے تالاب پر آ کر رکا یہ وہ رفتار تھی جو اس سے پہلے عاد اور ارم بھی نہیں چلے

عرب کا ملک ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے۔ جہاں بڑے اور حوصلہ مند قوم وقبائل کے لئے ترقی کا کوئی میدان نہیں ہے۔ ناچار پرجوش قومیں باہر نکل پڑتی ہیں۔ عرب کا جزیرہ نما جنوب ومغرب اور کسی قدر مشرق کی جانب پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اس لئے آسان اور قدرتی راستہ اس کے لئے بعض مشرقی اور عموماً شمالی ممالک میں یعنی بابل وشام وسینا، بابل سے ایران کا راستہ ہے۔

شام سے بحر ابیض اور بحر روم سے یورپ اور افریقہ کی طرف بھی رخ کیا جا سکتا ہے۔1875ء سے پہلے جو نہر سویز موجود نہ تھی۔ بحر ابیض اور بحر احمر کے درمیان آج کل کی طرح دریائی راستہ نہ تھا۔ نہ جزیرۂ سینا اور مصر کے درمیان نہر سویز تھی ایک پتلی سی خشک زمین تھی۔ جو شام، عرب اور جزیرہ نمائے سینا کو خشکی کی راہ سے مصر سے ملاتی تھی۔ ہندوستان کی قدیم حملہ آور قوموں کے لئے جس طرح درہ خیبر مشہور راستہ ہے اسی طرح مصر کے قدیم حملہ آوروں کے لئے یہی پتلی گلی ایک پامال راہ تھی۔

قوم عاد کی فتوحات اور مقبوضات بیرون عرب

(از سن 4 ق م تا سن 1900 ق م)

(۱) عرب سامیہ یا عاد۔ بابل میں۔

(۲) عرب سامیہ یا عاد۔ مصر میں۔

(۳) عرب سامیہ یا عاد۔ دیگر ممالک میں۔

کسی مقدمہ کی صحت کے صرف تین جزو ہیں۔ مدعی کا دعوی۔ مدعا علیہ کا اقرار اور گواہوں کی شہادت اگر کسی مقدمہ کے یہ تینوں اجزا بہم پہنچ جائیں تو مقدمہ کی صحت میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے عراق کے شہر بابل پر حکومت کی۔ اہل عراق قدیم اس کا اعتراف کرنے اور تحقیقات جدیدہ کی شہادت اس کی تصدیق کرتی ہے۔ پھر صحت دعوے میں کس کو شک ہوگا؟

اہل عرب کا دعویٰ

علامہ ابن قتیبہ المتوفی 276ھ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

فمنهم العماليق امم تفرقوا فی البلدان فی منهم فراعنه مصر و الجبابره

انھیں (عاد) میں عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قومیں ہیں جو ملک میں منتشر ہوگئی تھیں اور انھیں میں سے مصر اور بابل کے بادشاہ ہیں

مؤرخ ابن خلدون کی تحقیق ہے جس کو اس نے اپنی تاریخ میں کئی جگہ دہرایا ہے۔

ان قوم عاد والعمالقه ملکو العراقيقال انهم انتقلوا الی جزيرة العرب من بابل لما زاجم فيها بنو حام نزلوها (الحجاز) ايام خروجهم من العراق امام النمادة من بنی حام

عاد اور عمالقہ عراق کے بادشاہ ہوگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ بابل سے جزیرۃ العرب میں اس وقت چلے آئے جب بنو حام نے ان کے ساتھ مزاحمت کی۔ یہ لوگ عراق سے نکلنے کے زمانہ میں بنو حام کے

بادشاہ سے بھاگ کرحجاز میں چلے آئے۔

اہل ایران کا بیان

اہل ایران کا دعویٰ ہے کہ عراق و بابل کی حکومت انھیں (عاد) کے ہاتھ میں تھی ان کا اعتراف ہے کہ جمشید کے بعد جو بنوسام بن نوحؑ کا معاصر تھا۔ضحاک تازی (عرب) نے ملک پر قبضہ کرلیا۔عرب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔طبری میں ہے۔

والیمن تدعیه و تزعم انه من انفسها وهو ضحاك بن علوان. طبری ص ۲۰۲ . جرمن

اہل یمن بھی اس کے مدعی ہیں اور وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ انہیں کی قوم کا تھا اور اس کا نام ضحاک ابن علوان تھا۔

وبلغنا ان الضحاك هو نمرود و ان ابراهیم ولد فی زمانه وانه صاحبه الذی اراده احراقه (۲۰۵)

ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ ضحاک ہی نمرود تھا۔حضرت ابراہیمؑ اسی کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔اور یہی تھا جس نے ان کے جلانے کا قصد کیا تھا۔

فردوسی اہل ایران کی تاریخ کا ترجمان۔ضحاک تازی۔(عرب) اور اس کی ہزار سالہ حکومت کا مفصل بیان شاہنامہ میں کرتا ہے۔

تورات کا بیان

بنی اسرائیل کا قدیم خاندان عہد ابرہیمی سے اسی ملک کا باشندہ تھا اور نہایت قدیم زمانہ سے (2500ق م) اس کے تعلقات یہاں سے قدیم ہیں۔اس بنا پر اس باب میں ان کی رائے بھی قابل وقعت ہوگی۔توریت کی روایت ہے۔سب سے پہلے بادشاہ کوش کا بیٹا نمرود تھا، اصل عبارت یہ ہے۔

کوش حام کا بیٹا تھا......کوش کی اولاد سِبا، حویلاہ، سباتا، رعماہ اور سباتیکا اور رعماہ کے بیٹے شبا اور ویدان کوش نے نمرود کو پیدا کیا۔اور اس کی حکومت کی ابتدا بابل اور ایرخ (عراق) میں ہوئی۔(تکوین۔آیت 20-6-7-8-9)

یہ سمجھ لینا بھی نہایت ضروری ہے کہ ابتدائی تقسیم اقوام حسب آرائے موجودہ نسلی نہیں بلکہ جغرافی ہے۔یہ تمام اقوام جن کا نام اولاد کوش سے ذکر ہوا ہے۔وہ سب جنوبی سمت اور ساحل خلیج فارس کے باشندے تھے۔یعنی عرب، یورپ میں اس تاریخ قدیم کا سب سے بڑا مؤرخ جرمن فاضل ڈنکر (DUNKER) ہے۔وہ بابل کی تاریخ میں اس توریت کے فقرہ کی تفسیر یوں کرتا ہے۔

سفر تکوین، مثل متاخرین یہود کے کوش کے نام کے اندر ان اقوام کو داخل کرتا ہے جو جنوبی سمت میں رہتے ہیں۔
نوبی۔ثوبی۔(اتھوپین) اور جنوبی عرب کے قبائل۔ یہاں پر ہم ان فرزندان کوش کو جنھوں نے بابل کی بنیاد
ڈالی۔جنوبی قبائل کے باشندے کہہ سکتے ہیں۔ جو تقریباً خلیج فارس پر مقیم تھے۔

اہل عراق کا بیان

بابل کا ایک کلدانی مؤرخ بردشوس نامی ہے۔ جو اصلاً بابلی اور بعل کے معبد کا ایک کاہن تھا۔ یہ حضرت مسیحؑ سے شاید 400 برس پہلے تھا۔اس نے بابل کی قدیم تاریخ لکھی تھی۔ اصل کتاب تو ضائع ہوگئی۔لیکن یہودی اور یونانی مصنفین نے اس کے حوالے سے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔اور سنداً اس کی بعینہ عبارت بھی لکھی ہے۔انھیں منقول عبارتوں میں ملوک بابل کا ایک نقشہ ہے مؤرخ موصوف کلدانی بادشاہوں کے بعد عرب بادشاہوں کا ذکر کرتا ہے۔اوران کی تعداد 9 اوران کی مدت حکومت 225 برس قرار دیتا ہے۔ یہ نقشہ قابل تنقید ہے لیکن قابل تعلیط نہیں۔ وہ نقشہ یہ ہے۔

نمبر شمار	خاندان ملوک	تعداد	سال
1	بادشاہان قبل طوفان نوحؑ	10	432000
2	بادشاہان بعد طوفان نوحؑ	86	34000
3	میڈیا کے غاصب بادشاہ	8	224
4	بادشاہ	11	248
5	کلدانی بادشاہ	49	458
6	عرب بادشاہ	9	235

تحقیقات جدیدہ

اہل عرب اور اہل بابل کے بیانات سے اس سے زیادہ کوئی اور علم حاصل نہیں ہوتا کہ کسی قدیم زمانہ میں عرب سامیہ کے ایک خاندان نے عراق پر حکومت کی۔اس سے زیادہ حالات قدامت کی تاریکی میں مخفی ہیں۔‘‘
لیکن ارکیالوجی (ARCHALOGY) علم القدامت کی اعانت اور حضریات بابل کی صراحت نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے۔اب نئے سرے سے بابل کا تمدن زندہ ہورہا ہے اور علم الاثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آرہا ہے کہ بابل اور اسیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا ایک صفحہ ہے۔

قدیم بابل (اہل فارس سے پہلے) کے جو کتبات ملے ہیں۔ زبان کی حیثیت سے یہ دو قسم کے ہیں۔ سامی اور غیر سامی۔ ان سے بابل کے قدیم باشندوں کی قومیت کا راز فاش ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر کتبات پر سلاطین کی تاریخیں ہیں اور جن پر سال مرقوم نہیں ہے ان کے زمانہ کی تعیین قرائن سے کی گئی ہے۔ غیر سامی کتبات و آثار عموماً قدیم ترین ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غیر سامی آبادی یہاں سامیوں سے پہلے آباد تھی۔ ان کی زبان سومری اور اکاوی تھی جس سے ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ وہ غیر سامی آبادی اکاوی اور سومری تھی۔ جو ایک جیسے نام و زبان کے لحاظ سے غالباً تورانی النسل ظاہر ہوتی ہے۔

ارض بابل کے اس عہد کے تمام کتبات کو بہ ترتیب رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ 4000 ق م کی ابتدا میں قدیم سومری الفاظ کے بجائے ان میں سامی الفاظ کی آمیزش شروع ہوتی ہے۔ اور یہ آمیزش واختلاط رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ تا آنکہ نام، خط اور خیالات بالکل سامی ہوجاتے ہیں۔ جس کا خاتمہ ایک اور تورانی النسل زبان عیلام پر ہوتا ہے۔ جس کا وطن خلیج فارس کا فارسی ساحل تھا۔ پھر ایک زمانہ کے بعد 2500 ق م میں زبان بالکل سامی ہوجاتی ہے۔ بعد از اں ایک مرکب و متحد زبان کی صورت نظر آتی ہے۔

ان قدیم ترین حکومتہائے بابل کے سلسلہ میں ہم نے دو جگہ عرب سامی خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ 4000 ق م اور ایک 2400 ق م یہ دونوں علیحدہ علیحدہ بیان کے محتاج ہیں۔

چار ہزار ق م

اس خاندان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامی تھا۔ باہر سے آیا تھا۔ اور ابتدا ئاً نہایت وحشی تھا۔ یہ بیرونی، وحشی، سامی کون تھے؟ عرب کی اس خاندان کے حالات کے متعلق جدید ترین تحقیق یہ ہے۔

تقریباً چار ہزار ق م کی ابتدا میں سومری لوگوں نے جو ایک اعلیٰ تمدن حاصل کر رہے تھے۔ اپنے ملک کو ایک بار (اس کے بعد) وسیع التعداد، بربری قبائل سے پُر پایا۔ یہ (بربری) سامی تھے جو نہایت قریبی خونی تعلق عربوں سے رکھتے تھے۔ جو ایک بار (اس کے بعد) اسپین (SPAIN) تک دوڑ چکے تھے اور عبرانیوں سے بھی اسی قسم کی مشابہت رکھتے تھے جو ایک بار نہر ارون (ARON) کو عبور کر کے کنعان پہنچے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ یہ (فاتحان بابل) کردستان سے آئے۔ اور بابل پہنچ کر ارمینیا عرب اور کنعان وغیرہ میں پہنچے۔ لیکن یہ خیال اب متروک ہے۔ دوسری رائے یہ ہے وہ افریقہ سے آئے۔ اور مصر ہو کر ہر طرف پھیل گئے۔ اس تھیوری (THEORY) (خیال) کے ثبوت میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن پھر بھی اس خیال کے لئے بہت بڑی قوت اور اہمیت ہے کہ ان کا اصل مسکن عرب تھا۔ جہاں سے نکل کر ایک سرسبز و وسیع قطعہ کی تلاش میں الجزیرہ، بابل اور دیارِ مغرب میں کنعان تک موجیں لیتے ہوئے نکل آئے یہی آخری خیال روز بروز نئے طرف داروں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ عموماً اب یہی علما کی مقبول رائے ہے۔

سومری حکومت کے اسی عہد کا ایک چھوٹا سا اور ٹوٹا ہوا کتبہ ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس وقت ایک نئی داخل ہونے والی قوم تھی جس نے شمالی بابل کو کھو دیا تھا۔ دوبارہ اس کی واپسی کے لئے کوشاں تھی۔ یہ نئی آنے والی قوم کون تھی۔ سامی جس کا اصلی گھر غالباً

عرب تھا۔لیکن اب وہ کچھ دنوں سے بابل کے شمالی و مغربی حصہ میں (غالباً الجزیرہ میں) آباد تھی۔ سامیوں نے تمام ملک میں ان حصوں پر قبضہ کرلیا جو آباد اور زرخیز تھے اور جو سومری قوموں کے ذریعہ معاش تھے۔

اس زمانہ میں حکومت ایک شہر سے عبارت تھی جس کے آس پاس کچھ گاؤں کچھ خیموں کی آبادی اور کچھ ادھر ادھر کے قبائل پر مشتمل ہوتی تھی۔ شہر میں ایک شاہی قصر ہوتا تھا اور ایک نہروں کا ہیکل۔ ہیکل کا کاہن اور قصر کا بادشاہ ایک شخص ہوتا تھا۔ ہر ہیکل کا ایک خاص دیوتا ہوتا تھا۔جس کے قبضۂ قدرت میں تمام شہروں کی جان ہوتی تھی۔

کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اغاد (شاخ سامیہ) خاندان میں چار بادشاہ گذرے ہیں۔(1) بطی بعل، (ایک دیوتا تھا)، (2) شرغنی شرغلی اور (3) بن شرغلی، (4) کرموام سن کر۔

(1) بطی بعل کے نام کا کوئی کتبہ نہیں ملا۔لیکن اس کے بیٹے شرغنی کا ایک کتبہ ملا ہے۔جس میں وہ اپنے باپ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔''شرغنی شرغلی بن بطی لعل شاہ قادر اغاد......انی ایکور ہیکل بعل درشہر نپور''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ ہونے کے علاوہ بہت سی عمارتوں کا بانی تھا۔

(2) شرغنی شرغلی (3800 قبل مسیح) اس کا پورا نام ہے۔لیکن کبھی صرف شرغنی بھی پایا گیا ہے۔لیکن زیادہ مشہور یہ شرغون اول یا سرجون اول کے نام سے ہے، اور حکومتہائے بابل کے بزرگ ترین بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔اس کے جو کتبات اس وقت تک ملے ہیں وہ متفقہ طور پر اس کی عظمت وجلال کے بیان سے پُر ہیں۔اس نے ایک طرف سومریوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا اور دوسری طرف فارس میں عیلامیوں کو مغلوب کرلیا۔

(3) بن شرغلی خاندان کی تاریخ مجہول الحال ہے۔

(4) کرموام سن کر (3750 ق م) بھی عظمت میں اپنے باپ سے کم نہیں۔اس کا خطاب تھا۔''شاہ چاردانگ عالم'' کرموام سن کر کی خاص مہم مغان کی زمین پر حملہ ہے۔مغاں سے غالباً جزیرہ سینا مغربی وشمالی مراد ہے۔اس کے قریب شہر معان اب تک موجود ہے۔فاتح ہونے کے علاوہ یہ بادشاہ بانی عمارات بھی ہے نپور اور اغاد میں ہیکل تعمیر کرائے اور شہر میں آفتاب دیوتا کا ہیکل تیار کرایا۔

2400ق م

گذشتہ صفحات میں ڈہائی ہزار برس کا مرقع پیش کیا گیا۔جس میں بابل کے اسٹیج پر سومری عیلامی اور سامی قوموں کا کبھی بصلح اور کبھی بجنگ وجدال ظہور ہوتا رہا۔2400ق م میں ایک اور سامی قوم کا ظہور ہوا۔جس نے تمام قوموں کا خاتمہ کر دیا۔اور ایک متحد سامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔اس حکومت کی حقیقت ان الفاظ میں ایک امریکن مؤرخ راجرس ادا کرتا ہے۔

سومری تہذیب اب پیری کو پہنچ گئی تھی۔موت کے جراثیم اب اس میں پیدا ہو چکے تھے۔

دوسری طرف سامی تمدن زندگی اور جوش سے لبریز تھا، سامی ریگستان عرب کی آزاد ہوا سے باہر آئے تھے۔وہ اپنی رگوں میں زندگی رکھتے تھے۔

اس خاندان کا شجرہ ملوک جیسا کہ کتبات سے ظاہر ہوا ہے حسب ذیل ہیں۔

نمبر شمار	نام بادشاہ	سن حکومت	مدت حکومت
۱	شمو۔آبی۔	۲۴۵۴۔۲۴۴۴۰ق م	۱۵برس
۲	شمو۔لاایلی	۲۴۳۹۔۲۳۹۱ق م	۳۵برس
۳	ذابو	۲۴۰۴۔۲۳۹۱ق م	۱۴برس
۴	افل سن	۲۳۹۰۔۲۳۷۳ق م	۱۰برس
۵	سن مبلط	۲۳۷۲۔۲۳۴۳ق م	۳۰برس
۶	حمورآبی	۲۳۴۳۔۲۲۸۸ق م	۵۵برس
۷	شمو۔ایلونا	۲۲۸۷۔۲۲۲۸ق م	۳۵برس
۸	عمی۔شوغ	۲۲۵۲۔۲۲۲۸ق م	۲۵برس
۹	عمی ستانا	۲۲۲۷۔۲۲۰۳ق م	۲۵برس
۱۰	عمی صادقا	۲۲۰۲۔۲۱۸۲ق م	۲۱برس
۱۱	شموسانا	۲۱۱۸۔۲۱۵۱ق م	۳۱برس

اس فہرست میں پہلا نام سموابی کا ہے۔اس کی نسبت کوئی واقعہ معلوم نہیں۔اس کا نام سلاطین کی فہرست میں ملا ہے۔اس کے بعد کے جانشینوں کی نسبت بھی ہم کو کوئی صحیح علم نہیں ہے۔''سمولا ایلی کے متعلق اتنا جانتے ہیں کہ اس نے بابل میں چھ قلعے تعمیر کرائے تھے۔ تیسرا بادشاہ ذابو صرف ایک ہیکل کے بانی کی حیثیت سے معلوم ہوا ہے جو شہر کے دیوتا کے نام سے بنا تھا۔افل سن اور سن مبلط بھی مجہول الحال ہیں۔

اس خاندان کا مشہور و ممتاز بادشاہ حمورابی ہے۔جس کی نسبت ہماری اطلاعات کسی قدر زیادہ وسیع ہیں اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک کو عیلامیوں سے پاک کر دیا۔اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمورابی سے پہلے تک ملک میں عیلامیوں کا زور باقی تھا۔ عجب نہیں کہ حمورابی کے اسلاف کا عدم اہمیت و شہرت اسی علت کا معلول ہو۔اور یہی وجہ ہے کہ حمورابی سے پہلے کے بادشاہوں کے ساتھ شاہی القاب نظر نہیں آتے۔اب تک جو کتبات اس خاندان کے ملے ہیں۔وہ عموماً حورابی ہی کے ہیں جن سے اس بادشاہ کی عجیب و غریب عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

توریت میں سب سے پہلا جو سیاسی واقعہ مذکور ہے۔وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں شمال عرب میں عراق اور شام کے بادشاہوں کی باہمی جنگ ہے۔اس موقع پر شغار (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل یا امورافیل مذکور ہوا ہے۔ الف اور ح کا ب پ اور

ف کا مبادلہ السنہ سامیہ میں بہت ہوا۔ ایل کا اضافہ (بمعنی خدا) صرف عبری ناموں کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ جیسے اسرائیل خرقیل وغیرہ۔ امرافیل اور حمورابی کے اتحاد کی بڑی دلیل دونوں کا تقریباً اتحاد عصر اور اتحاد ملک بھی ہے۔ بہرحال اگر یہ قیاس صحیح ہے تو حمورابی اور حضرت ابراہیم کا باہم ایک ہی زمانہ ہوگا۔

حمورابی کے ایک اور کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید یہ دنیا کا سب سے پہلی قانون دان ہے۔ بابل کے ایک مینار پر اس کے قوانین کا خلاصہ درج ہے جو تورات کے احکام سے بہت مشابہ ہیں۔ اہل ضلال کہتے ہیں کہ توریت کے احکام یہیں سے ماخوذ ہیں۔ ارباب ہدی کہتے ہیں کہ یہ احکام ابراہیمؑ کی شریعت کے ہیں۔ جن کو حمورابی نے سنا اور قبول کیا۔ فاما الذین امنو فیعلمون انه الحق من ربھم ۔ جو اہل ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حقیقتاً ان کے پروردگار کی طرف سے ہے۔

حمورابی کے بعد جو بادشاہ اس خاندان میں ہوئے وہ اسلاف کی عظمت کو قائم نہ رکھ سکے۔

عرب سامیہ یا عرب عاد مصر میں

عراق کی طرح مصر میں بھی اس واقعہ کے تین اجزا ہیں۔ روایت عرب، بیان اہل مصر اور تصدیق تحقیقات جدیدہ۔ بلکہ اس مقدمہ میں ایک چیز اور زیادہ ہے۔ یعنی اشاراتِ تورات۔

روایت عرب

علامہ ابن قتیبہ کی عبارت ہے۔

فمنهم العماليق امم تفرقوا فی البلدان و منهم فراعنة مصر

انہیں میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قومیں ہیں جو ملک میں پھیل گئی ہیں۔ انہیں میں فراعین (شاہان) مصر ہیں

مؤرخ یعقوبی لکھتا ہے۔

فلما ملكوا النساء طمع فيهم انعمالقة ملوك الشام فغزاهم ملك العمالقه وهو يومئذ لوليد بن دومغ ووطئ البلاد فرضوان يمكنوا عليهم واقام دهرا طويلاثم ملك اخر من العمالقه يقال له الريان ابن الوليد وهو فرعون يوسف علیہ السلام

مصریوں نے جب عورتوں کو بادشاہ بنایا۔ شام کے بادشاہ جو عمالیق تھے انہوں نے طمع کیا۔ عمالیق کے بادشاہ نے جس کا نام ولید ابن دومغ تھا۔ ملک کو پامال کیا تھا۔ اہل مصر ان کی بادشاہی پر راضی ہو گئے۔ ایک زمانہ تک یہ بادشاہ زندہ رہا۔ پھر عمالیق کا دوسرا بادشاہ ہوا جس کو لوگ ریان ابن ولید کہتے تھے حضرت

یوسف کا معاصر فرعون بھی ہے۔ تاریخ یعقوبی جلد اول ص ۲۱۱ لندن۔
جزئیات بیان اور نام اگر چہ صحیح نہ ہوں لیکن اصل واقعہ ثابت ہے اور کیا عجیب ہے کہ یہ عربی نام اصلی ناموں کے ترجمہ ہوں۔ اسی قسم کا بیان اور تاریخوں میں بھی ہے۔ معجم یاقوت میں ہے۔

و قیل ان فراعنۃ مصر کانوا من العمالیق و کان منھم فرعون ابراھیم

کہا گیا ہے کہ مصر کے فرعون عمالیق میں سے تھے۔ انہیں میں حضرت ابراہیم......اور حضرت یوسف کے فرعون ہیں۔

مؤرخ طبری کی روایت ہے

وانہ ھلك علی مصر اخاہ سنان بن علوان وھو اول الفراعنہ وانہ کان ملك مصر حمین قدمھا ابراھیم خلیل الرحمان (ج ا ص ۲۰۲ یورپ)

اس نے مصر پر اپنے بھائی علوان بن سنان کو بادشاہ بنایا۔ یہ مصر کا پہلا فرعون تھا۔ حضرت ابراہیمؑ جب مصر گئے تو یہی فرعون تھا۔

اس معاصر کی تائید دیگر ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ بیان آگے آئے گا۔
مؤرخ ابن خلدون کی تحقیق ہے۔

ان بعض ملوك القبط استنصر ملك العمالقہ لعھدہ... فجاء معہ وملك مصر

قبط (قدیم باشندگان مصر) کے بعض سلاطین نے اپنے زمانہ کے شاہ عمالیق سے مدد مانگی وہ آیا اور اس نے مصر پر قبضہ کرلیا۔

اہل مصر کا بیان

مسیحؑ سے دو ہزار برس پہلے ایک اجنبی قوم نے مصر پر قبضہ کیا۔ اس کا نام اہل مصر سوس (چرواہی اور ہیک سوس (چرواہے بادشاہ) بتلاتے ہیں۔ یہ چرواہے بادشاہ کون تھے؟ عرب جو اکثر شتر بانی سے جہانبانی تک پہنچے ہیں۔ اور اس وقت بھی ان کو یہی لقب دیا گیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ چرواہا ہونا نہ صرف عرب کا بلکہ تمام امم سامیہ کا قومی وملکی پیشہ ہے اور اس کی تحریری شہادت آج سے دس ہزار برس پیشتر کی ہمارے پاس موجود ہے تا آنکہ پیشوایان امم سامیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔
بہرحال انھیں چرواہے بادشاہوں یا عرب چرواہوں کی نسبت اہل مصر کا اعتراف ہے کہ مسیحؑ سے دو ہزار برس پہلے مصر پر حکمران تھے۔ مصر کا قدیم مؤرخ اسکندریہ کا مانیشو ہے۔ جس نے مسیحؑ سے 260 برس پیشتر یونانی زبان میں مصر کی تاریخ لکھی تھی۔ اصل کتاب تو مفقود ہے۔ لیکن اس کی جستہ جستہ عبارتیں بعد کے یونانی اللسان مصنفین کے یہاں منقول ہیں۔ جن میں سے ایک یہودی مؤرخ یوسیفوس

بھی ہے۔

یوسیفوس نے ہیک سوس کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس یہ ہے۔

ہمارا ایک بادشاہ طیماؤس نامی تھا۔ اس کے عہد میں کیا ہوا۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ کیونکر ہوا۔ خدا ہم پر خفا تھا؟ ایک عجیب طریقے سے شریر الخلقت لوگ اطراف مشرق سے چلے آئے۔ وہ اس قدر بہادر تھے کہ ہمارے ملک میں گھس آئے۔ نہایت آسانی سے بزور مسخر کرلیا۔ گوان سے ہماری ایک قسمت آزماجنگ ہوئی جب انہوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کرلیا۔ جنہوں نے اپنی طاقت سے ہم پر حکومت کی تھی تو ہمارے شہروں کو جلا دیا۔ ہمارے دیوتاؤں کے ہیکلوں کو برباد کیا۔

آخر وہ حاکم بن بیٹھے۔ اور اپنا ایک بادشاہ بنایا۔ جس کا نام سلاطیس تھا۔ سلاطیس نے مصر بالا اور مصر زیرین دونوں سے خراج وصول کیا۔ اور مناسب مقامات پر دستے متعین کئے۔ خصوصاً مشرقی حصوں کی حفاظت اہل سیریا کے مقابلہ میں پیش بینی کے لئے بہت کرتے تھے۔ جو اس زمانہ میں قوی ترین قوت تھی۔

> سلاطیس نے تیس برس حکومت کی۔ پھر ایک دوسرا بادشاہ ہوا۔ جس کا نام بیون تھا۔ یہ بیالیس برس زندہ رہا۔ بعد ازیں 36 برس سات مہینے کے لئے ابوفیس بادشاہ ہوا۔ پھر جنیاس نے پچاس برس اور ایک مہینہ تک حکومت کی اور ان سب کے آخر میں اسیس بادشاہ ہوا۔ 49 برس دو مہینے اس کی بادشاہی کا زمانہ ہے۔ اس تمام قوم کا نام ہیک سوس رکھا گیا تھا۔ یعنی چرواہے بادشاہ کیونکہ ہائیک کے معنی مقدس زبان (تورات) میں۔ ''بادشاہ'' کے ہیں۔ اور سوس عام زبان میں چرواہے کو کہتے ہیں اور ان لفظوں سے مل کر ہائیک سوس بنا ہے بعض لوگ کہتے یہ عرب تھے، پانچ سو گیارہ برس تک مصر پر قابض رہے (JOSEPHUS BOOK I SECT 12 VOL IV)

ان عرب حملہ آوروں کے نام ونسب کے متعلق ایک بات یہاں قابل ذکر ہے۔ روایات صحیحہ عرب میں فاتح مصر کا نام شداد ظاہر کیا گیا ہے۔ مانیشو نے سلاط لکھا ہے۔ ''ے'' اور ''س'' جو سلاطیس کے آخری اجزا ہیں۔ مذکر نام کے آخر میں یونانی اور لاطینی زبانوں میں عموماً زائد کردیئے جاتے ہیں حقیقت میں شداد اور سلاط۔ معنی کے حوالہ سے ایک ہی لفظ ہیں۔ شداد کے معنی ''قوی'' اور ''جابر'' کے ہیں اور سلاط بھی سامی زبان میں یہی معنی رکھتا ہے۔ جس سے عربی زبان میں ''سلطان'' ''سلطنۃ'' اور ''مسلط'' نکلے ہیں۔

ہیک کو اگر ہم ''شیخ'' کا محرف نہ کہیں۔ جو امیر بدو کا خاص لقب ہے تو اس کو خاص مصری لفظ تسلیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ مانیشو نے بتایا ہے۔ لیکن سوس کا لفظ خاص عربی ہے۔ سوس کے اصل معنی نگرانی اور انتظام کے ہیں اسی مناسبت سے چرواہے کو بھی ابتداً سوس کہتے ہیں۔ جس سے منتقل ہو کر گلہ بانی سے جہانبانی کے لئے عربی میں یہ لفظ مستعمل ہوا۔ اسی ماخذ سے سیاست کا لفظ اب عام طور سے اس معنی میں بولتے ہیں۔ سوس کے معنی اول یعنی چرواہے اور نگہبان کا اثر، اب تک ہمارے ہاں ایک لفظ باقی ہے۔ یعنی سیس ''خادم ومحافظ

اسپ'' عجب نہیں کہ عبری میں یہیں سے لفظ ''صوص'' Dix گھوڑے کے لئے مستعمل ہوا ہو۔ تیسرے بادشاہ کا نام ابوفیس بھی عربی وضع کا ہے۔ کیا عجب ہے کہ ابوقیس ہو یا ابوفیض۔ آخری نام اسیس ہے جس کو ہم عزیز کہتے ہیں۔ اور اب تک امرائے مصر کا لقب جانتے ہیں اور ایک عجیب اور معتبر دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے قصہ میں ''عزیز'' ہی کا لفظ پاتے ہیں۔

توریت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جب پہلی بار ظہور ہوتا ہے تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ عراق سے مصر تک کی زمینوں میں سفر کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی سارہ کو جو رشتے دار تھیں (مصلحت کے تحت) اپنی بہن ظاہر کرتے ہیں۔

فرعون مصر قرابت کی درخواست کرتا ہے۔ پھر جب واقعہ ظاہر ہوتا ہے تو خود اپنی بیٹی کو کنیزگی میں پیش کرتا ہے۔ کیا اس سے نسبی تعلق کی بو نہیں آتی۔

ڈیڑھ سو برس کے بعد اتفاقاً حضرت یوسفؑ مصر تشریف لے جاتے ہیں اور باوجود یہ کہ ان کا عبرانی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے اور اہل مصر عبرانیوں کو ذلیل جانتے ہیں اور ان کے ساتھ کھانا عار سمجھتے ہیں۔ فرعون مصر یوسفؑ کی عزت کرتا ہے۔ ان کو اپنا نائب السلطنت مقرر کرتا ہے۔ یوسفؑ کے پدر بزرگوار حضرت یعقوبؑ اور ان کے خاندان کے مصر آنے پر فرعون اور ارکان سلطنت خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے مرنے سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے خاندان کے افراد کو تاکید کرتے ہیں کہ فرعونی اگر پوچھیں کہ تم کون ہو؟ تو جواب دینا کہ ہم چرواہے ہیں اور چوپانی ہمارا پیشہ ہے۔ اور پھر توریت کا خود یہ عجیب تر بیان کہ مصری ہر چوپان سے نفرت رکھتے تھے۔ اور یہ حقیقتاً سیاسی نفرت تھی۔ ان تمام آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ چرواہے بادشاہوں کا وجود تاریخی ہے۔ اور حضرت یوسفؑ اور بنی اسرائیل کا قیام انھیں عرب سامیہ یا چرواہے بادشاہوں کے عہد میں ہوا۔ جیسا کہ مؤرخین عرب کا بھی بیان ہے اور یہ بھی اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان عبرانی اور مصر کے خاص شاہی خاندان میں ضرور کوئی خاص قوی تعلق تھا۔ جس کا اظہار کنایۃً حضرت یوسفؑ باوجود اس علم کے کہ مصر ہر چوپان سے نفرت رکھتے ہیں۔ ''چوپانی'' کے ذریعہ سے کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اہل مصر اس بدوی حکمراں خاندان کو تحقیراً ''شاشو'' کہتے تھے۔

چند صدیوں کے بعد بنی اسرائیل کا مصر میں مبتلائے مصائب ہونا ہمارے نزدیک اس کی توجیح یہ ہے کہ جب اہل مصر یعنی بنی حام نے سابق حکمران خاندان یعنی بنو سام کو مصر سے نکال دیا۔ اور ان کی حکومت کا مصر میں خاتمہ کر دیا تو بنو اسرائیل جو بنو سام کی ایک شاخ تھے۔ اور سابقہ حکومت کے عہد میں مصر میں طاقتور ہو گئے تھے۔ ان کو سیاسی وجوہ سے کمزور کر دینا چاہا۔ توریت میں اس موقع پر حسب ذیل عبارت ہے۔

> لیکن اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑی اور فراواں ہوئی۔ اور بہت زور پیدا کیا اور زمین ان سے معمور ہوئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ دیکھو بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں اور ہم ان کے ساتھ دانشمندانہ تدبیر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ جب وہ تعداد میں اور زیادہ ہوں اور

جنگ پڑے تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ہمیں نکال دیں۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ مصر میں بنی اسرائیل کا معاملہ بالکل سیاسی تھا۔قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔فرعون حضرت موسیٰؑ اور ہارون کی نسبت کہتا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ

یقیناً یہ دونوں (ہارونؑ وموسیٰؑ) جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں۔

توریت کے اس فقرے کا کہ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا۔ہم یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ تب ایک نئی بادشاہی قائم ہوئی۔جو بنی اسرائیل کو جو سابق سامی حکومت کی ایک شاخ تھی نفرت سے دیکھتے تھے۔

ہمارے خیال کی مزید تائیداس سے بھی ہوتی ہے کہ تاریخ عرب نے سامی حکومت مصر کی جو مدت قرار دی ہے۔یہ تقریباً وہی ہے جو ابراہیم سے (جو ابتدائے حکومت کا زمانہ ہم فرض کرتے ہیں) حضرت موسیٰؑ سے کچھ پہلے تک (جو اختتام کا زمانہ ہے) توریت نے قرار دی ہے۔یعنی تقریباً 525 برس۔کیونکہ بنی اسرائیل کی حکومت مصر کا زمانہ جو حضرت یوسفؑ سے حضرت موسیٰؑ تک ممتد ہے۔تورات نے 430 برس بتایا ہے۔اس پر حضرت ابراہیمؑ سے حضرت یوسفؑ تک کا زمانہ اور اضافہ کیا جائے۔تو ان چار پشتوں کے لئے سو برس فرض کیا جا سکتا ہے۔مجموعہ 530 ہوتا ہے۔اور مانیشوا اس حکومت کا زمانہ 511 بتلاتا ہے چند سال جو تورات میں فاضل ہیں۔یہ وہ ہیں کہ دوسری وطنی حکومت مصر میں قائم ہوئی۔جن کے چند سالہ مظالم سہ کر بنی اسرائیل مصر سے نکل آئے۔

بنی اسرائیل اور عرب سامیہ کے باہمی تعلق مصر کا نہ صرف توریت کے ان فقروں سے ثبوت ملتا ہے بلکہ مصر اور عرب دونوں کی تاریخ سے بھی،توریت کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امم سامیہ میں عربوں کے تعلقات مصر کے ساتھ سب سے زیادہ تھے۔اسماعیلی عربوں کی ماں حضرت ہاجرہؑ مصر کی تھیں،خود حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں کے سوا بیوی بھی مصری تھیں۔عربوں کے قافلے برابر مصر کو آتے جاتے تھے۔خود حضرت یوسفؑ کو دربار مصر تک جس نے پہنچایا وہ عرب ہی تھے۔حضرت یوسفؑ کے عہد میں جب مصر اور اس کے آس پاس کے ملکوں میں قحط پڑا تو یمن سے جو عام روایت کے اعتبار سے عاد و عمالیق کا وطن تھا۔یہاں کی شاہزادی نے مصر سے غلہ طلب کیا تھا۔یہ واقعہ اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس کو مسلمان علمائے آثار نے ابتدائی صدی میں یمن میں پایا۔

اس کتبہ سے نہ صرف تورات کے اس فقرے کی تائید ہوتی ہے کہ تمام زمین میں قحط پڑا۔بلکہ ان عربوں میں جو یمن میں تھے اور ان سامی عربوں میں جو اس وقت چرواہے بادشاہوں کے نام سے مصر میں تھے،سے باہم تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

مصر کے علمائے آثار ثابت کرتے ہیں کہ ہیک سوس،سامی عرب تھے۔بعض اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خود مصری اصلاً شاید سامی عرب ہیں۔ہائیک سوس کے عرب ہونے کی نسبت سب سے پہلے شہادت ایک مستند جرمن مؤرخ ہیرن HEEREN کی پیش کی جاتی ہے۔مؤرخ موصوف لکھتا ہے۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف جہات سے مصر میں یہ قبائل حملہ آور تھے۔لیکن وہ جو

مشرق سے آتے تھے۔ یعنی عرب سب سے زیادہ زبردست تھے۔ یہ مصر تک دوڑ پڑے۔

جارج رالنسن۔ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تاریخ قدیم کا پروفیسر تھا اور مصر کی تاریخ قدیم کا مصنف ہے لکھتا ہے:

مصر جو پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا تھا اس کے ضعف نے شمال مشرق سے باہر کے حملہ آوروں کو طمع دلایا۔ دو ہزار اراسی (2080) ق م میں یا اس کے کسی قدر بعد طاقتور دشمن شمالی مشرق سے مصر زیرین میں داخل ہو گئے۔ یومنط کی حکومت کے برباد کرنے اور ملک کے حصہ زیریں واقع طول البلد 30039 پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ حملہ آور ہائیک سوس یا چرواہے بادشاہ تھے۔ جو شام یا عرب کے صحرا نورد بدوی لوگ تھے۔ یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے۔

مصریوں کے دوسرے دشمن اس جانب میں شاشوش تھے۔ جو شاید ہیک سوس ہیں اور بظاہر عرب معلوم ہوتے ہیں۔

ایک جرمن فاضل بروگش ہنرچ (BURGSCH HEINRICH) نے مصر کی تاریخ میں صرف کتبات و آثار کی بنا پر لکھا ہے۔ تاریخ مذکور میں فاضل موصوف کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہائیک سوس یقیناً سامی تھے۔ مصر کی زبان قدیم میں، ہائیک، بادشاہ اور سوس چوپان اور اہل بادیہ کو کہتے ہیں۔ اہل عرب کی اس روایت کو بھی اس نے تائیداً نقل کر دیا ہے کہ شداد ابن عاد نے مصر پر حملہ کیا تھا۔

برٹش میوزیم

لندن میں جو مجموعات مصر (EGYPTIAN COLLECTION) ہیں۔ 1909ء میں ان کا دلیل نامہ (GUIDE) لکھا گیا ہے۔ جو معلومات تازہ کا خلاصہ ہے۔ ہائی سوس کے متعلق اس میں حسب ذیل تحقیق ہے۔

تیرہویں خاندان حکومت کے زوال کے بعد نسبتاً فوراً ہی مصر زیرین (DELTA) اور شمالی اطراف مصر پر متحدہ سامی بدوی قبائل نے آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا۔ جن کے سرداروں کے نام بروایت یوسیفوس (المتوفی 100ء) ہائیک سوس یا چرواہے بادشاہ تھے۔

لفظ ہائیک سوس، دو مصری لفظوں سے ماخوذ ہے۔ ''ہیکو'' اور شاشو'' یعنی شیخ یا حاکم قبائل بادیہ و صحرائے مشرق و شام وغیرہ۔

ڈبلو کک ٹو آئے (W.COOK TOY) ایک انگریز مؤرخ صاحب جو ایک چھوٹی سی لیکن مستند تاریخ کے مصنف ہیں۔ فاتح عربوں کی شجاعانہ قوت سے برہم ہو کر لکھتے ہیں۔

زمین عرب جہاں کے بادیہ نشین قبائل جو تاریخ کے قدیم ترین عہد سے گلہ بان اور غارتگر ہیں اور اب ہمارے زمانہ تک بھی ویسے ہی ہیں۔ اُن مصر میں داخل ہونے والی قوموں کی ماں تھی، جنہوں نے نہایت سختی سے قدیم مصریوں کو ستایا، ان کا نام ہائیک سوس تھا۔ یا چرواہے بادشاہ۔

اس عصر جدید میں مسلمان مؤرخین میں عمالقہ یا عرب سامیہ اور ہائیک سوس کے ایک ہونے کا خیال سب سے پہلے ایک مصری عالم علامہ رفاعہ بک طہاوی کو پیدا ہوا۔ جس کی ذات مصر کے دور انقلاب علمی کا پہلا نتیجہ اور معلومات مغربی و مشرقی کا پہلا ثمر تھا۔ ان کی تاریخ مصر بنام انوار توفیق الجلیل 1275ھ میں پچاس برس سے زائد ہوئے۔ شائع ہو چکی ہے۔ اس میں اس موقع کی عبارت یہ ہے۔

ودولتهم نسمّى دولة الهقصوص واشتهر وبالتواريخ باسم الملوك الرعاة وفى كتب التواريخ الاسلاميه يقال لهم العمالقه

ان کی سلطنت کا نام ہیک سوس کی سلطنت ہے۔ یہ بادشاہ چرواہے بادشاہوں کے نام سے مشہور ہیں اسلامی تاریخوں میں ان کا نام عمالقہ ہے

جمہور کی اس متفقہ آواز میں کہ ہائیک سوس سامی عرب تھے۔ کبھی کبھی ایک دھیمی آواز یہ بھی سنائی دیتی ہے کہ وہ تو راتی یا منگولین (MONGOLIAN) تھے۔ آج سے 80 برس پیشتر مسٹر روسی لینی (Mr. ROSELINI) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ اس مدعی کے پاس اس دعوے کی صرف یہی دلیل ہے کہ سوآ ئیس جو ہیک سوس کا جزو ہے اور ایک تو راتی قوم کے یونانی نام سیتھنس (SCYTHENIES) میں بعض حروف کی تمسخر انگیز لفظی مشابہت اور مناسبت ہے۔ جرمن عالم ہیرن بے اس کی تردید میں لکھتا ہے۔

ہائیک سوس جو مصر کے ایک بڑے حصہ پر مصر کے سولہ اور سترہ خاندان حکومت میں قابض ہو گئے تھے۔ مسٹر روسی لینی کا اور ہیر کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ بادیہ نشین تھے۔ کیونکہ آثار میں جو اُن کی تصویر دکھائی گئی ہے وہ گلوں اور چوپاؤں کے جھنڈ کے ساتھ ہے۔ اس سے سب نے طبعی طور پر سمجھا ہے کہ وہ حدود مصر کے بدوی قبائل تھے۔
میں یقین کرتا ہوں کہ ان میں عرب قوم کو میں اپنے مخصوص خصوصیات میں لمبی داڑھی، لمبے کپڑے اور کھلے رنگ میں پاتا ہوں اور یہ ایک ایسی رائے ہے۔ جس کی قوت کے ساتھ (خود ناقل روایت) یوسیفوس نے دی ہے۔ مسٹر روسی لینی ان کو سیتھنس فرض کرتے ہیں سیتھنس سے مقصود شاید ایشیائے وسطٰی کے تو راتی بدوی قبائل ہیں۔ لیکن ان کے ذکر کردہ بیان سے...... علاوہ ازیں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو یہ دکھا سکے کہ ان قبائل نے اس قدر بعید زمانہ میں کوئی مہم بغرض فتح اس قدر بعید فاصلہ کے لئے اختیار کی ہو۔ مسٹر روسی لینسی کی دلیل صرف لفظی تشریح پر مبنی ہے۔ جس کی بنا پر ان کو نظر آتا ہے کہ مصری نام (SCIOS) سائس (SYTHES) سائیتھس ہے۔ جس کے معنی برباد کنندہ کے ہیں۔
میں اس مسئلہ کے اندر پڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ لیکن میں اپنے اعتراف و بیان میں بھی ترمیم نہیں کر سکتا۔

پچاس ساٹھ برس کے عرصہ میں اس دھیمی آواز میں اور بھی ضعف آ گیا ہے۔آج سے دس بارہ برس پہلے ایک کتاب لکھی گئی ہے۔ جس میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہیک سوس تنہا توراتی نہیں تھے۔بلکہ سامی عرب بھی اس میں شامل تھے۔اس کتاب کی عبارت یہ ہے۔

> اس میں انتہائی حدتک شک ہے کہ ہائیک سوس کس قومیت سے تعلق رکھتے تھے۔وہ بعض صرف کنعانی عرب اور دوسرے سامی قبائل سمجھے گئے ہیں۔لیکن جینی (ایک توراتی قبیلہ) بھی ان کے ساتھ شریک معلوم ہوتے ہیں اور ان کے لیڈر توراتی معلوم ہوتے ہیں۔اس فیصلہ کی بنا پر کہ آخری سلاطین ہیک سوس کے جو مجسمے ابھی حال میں ملے ہیں وہ بالکل توراتی شکل کے ہیں۔

بعض اشخاص کی مشابہت شکل سے بغیر کسی تاریخی اور اثری دلیل کے قومیت کا فیصلہ عجیب ہے۔اور اسی لئے یہ آواز ہمیشہ غیر مسموع رہی ہے۔تازہ ترین خیال جو برٹش میوزیم اکسیبیشن گائیڈ(M BRITISH MUSEUM EGYPTON GUIDE (دلیل نامہ) آثار مصریہ اور انسائیکلو پیڈیا(ENCYCLOPEDIA) طبع یازدہم مضمون ایجپٹ (EGYPT) کو پڑھ کر متفقہ تسلیم شدہ نظر آتا ہے یہی ہے کہ ہیک سوس متحدہ سامی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہیک سوس کے عرب ہونے پر اس قدر دلائل پیہم موجود ہیں۔جن کا استحقاف مستحکم ہے۔حسب ذیل دلائل قویہ اور قرائن عقلیہ پر نظر ڈالی جائے۔

(1) عربوں کا بیان کہ انھوں نے زمانہ قدیم میں مصر پر حکومت کی۔

(2) قدیم اہل مصر کا اعتراف کہ عرب یہاں حاکمانہ داخل ہوئے۔

(3) ہیک سوس کے بادشاہ اول کے نام کا عرب کے ذکر کردہ فاتح مصر سے معنوی ولفظی مطابقت۔

(4) سلاطین ہیک سوس کے نام کا عربی اللفظ یا سامی الماخذ ہونا۔

(5) آثار میں ان کے مجسمے کا عربی شکل ولباس میں ہونا۔

(6) عرب ومصر کے قدیم تعلقات۔

(7) ہیک سوس کے جو اوصاف بتلائے گئے ہیں ان کا بعینہ عربوں میں موجود ہونا۔

(8) تورات کے قرائن واشارت

(9) علمائے آثار کی تائید۔

(10) مؤرخین یورپ کا علی الاکثر بیانات قدیمہ سے ان کی عربیت کی تصدیق.

ان تمام مباحث وتوجیہات کے بعد ہم سب سے آخری قطعی اور فیصلہ کن شہادت خود اس قوم کی نقل کرتے ہیں جس نے شاشو کو اپنے

ملک سے نکال کر اعتراف کیا ہے کہ وہ خود''شاشو'' کو کیا سمجھتے تھے مصر کا قدیم بادشاہ رعمیس سوم اپنے ایک کتبہ میں اپنی ایک فتح کی نسبت لکھتا ہے۔

''میں نے ساعیر کی قوم کو جو شاشو کے قبائل میں ہیں برباد کر دیا۔''

ساعیر سے مقصود اہل ساعیر ہیں جو شمالی عرب میں ایک کوہستانی مقام ہے اور جہاں اودمی عربوں نے ایک حکومت قائم کی تھی۔ تورات میں کوہ سعیر کا نہایت کثرت سے ذکر ہے۔

عرب سامیہ مختلف مما لک میں

(سیریا،شام) ایران۔فنیقیہ۔قرطاجنہ۔کریٹ۔اور یونان میں)

عرب سامیہ اولی (عاد اولیٰ) کا ان مما لک میں گذرنا یہاں کسی حکومت کی تاسیس،ایک تعجب انگیز واقعہ ہے لیکن غیر معقول نہیں۔1200 ق م میں بابل کی جگہ اسی ملک میں اسیریا کی حکومت قائم ہوئی۔ایران اس وقت تک کوئی مستقل ملک نہیں تھا۔اسیریا اور بابل کا ایک جزو تھا۔فینیقی (فینیشین) شام و فلسطین کے ساحل بحر ابیض پر آباد تھے۔تورات میں ان کو ارامی کہا گیا ہے۔یہ دنیا کی سب سے پہلی تاجر اور یورپ کا سفر کرنے والی قوم ہے اور یہی وہ قوم ہے جس نے قدیم یورپ میں تہذیب کی روشنی پیدا کی۔اس نے ایک طرف افریقہ کی زمین شور میں کارتھیج تمدن کی تخم ریزی کی۔اور دوسری طرف یورپ کی برفستان (یونان) میں تہذیب وتمدن کی آگ روشن کی۔

ان مباحث پر تفصیلی بحث تو طول کلام ہے۔مستند چند کتابوں کے حوالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اسیریا

اسیریا کے متعلق سب سے آخری بحث میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ سامی قوم تھی اور یہ معلوم ہے کہ وہ خلیج فارس کے ساحل عرب سے ٹھیک اسی راستہ سے بابل آئی تھی،جس راستہ سے اس سے پہلے دور میں عاد یاامم سامیہ اولیٰ بابل میں داخل ہوئے تھے۔اس بنا پر حقیقت میں اسیرین،نسلاً عرب تھے،اور اسیریا کی اثری تاریخوں میں اس کے دلائل ہر جگہ ملیں گے۔

ایران

ایران کی قدیم تاریخوں میں مذکور ہے کہ جمشید کے بعد ضحاک تازی ایک عرب نے ہزار برس تک ان پر حکومت کی،ہمارے مؤرخین کہتے ہیں کہ ضحاک یمن کے ایک بادشاہ کا نام تھا،لیکن تاریخی لحاظ سے اس زمانہ قدیم میں یمن کا براہ راست ایران پر حملہ آور ہو کر ایران کو فتح کرنا اور پھر وہاں حکومت قائم کرنا ثابت نہیں ہو سکا اس کی صحیح توجیہہ یہ ہے کہ یمن سے ساحل خلیج عرب سے ہو کر اسیریا میں جو عرب خاندان حکمراں تھا وہ ایران پر حملہ آور ہوا اور ایک مدت تک اس پر حکومت کی۔ایران کا بابل واسیریا کی محکومی میں میڈیا کے

عروج تک (600ق م تک) رہنا اب ایک مسلم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔

اسیریا کا دور وجود 1800 ق م اور زمانہ عروج 1200 ق م سے 600 ق م تک ہے۔

فنیقیہ

فنیقیہ ساحل بحر ابیض پر آباد تھے۔ نائران اس کے دارالحکومت کا نام تھا۔ اور ایشیا سے لے کر یورپ تک تجارت قدیم کے مالک تھے۔ عبرانی نام ان کا ارامی ہے۔ آثار کی رو سے بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ ان کی زبان، مذہب اور رسوم تمام تر سامی تھیں اس بنا پر اہل فنیشیا کے تمام تر کارنامے اہل عرب کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

قرطاجنہ

جہاں اس وقت تونس آباد ہے۔ انھیں فنیشن یا ارامی عربوں کی آبادی تھی جس کو اب عام طور سے کارتھیج (CORTHAGE) کہتے ہیں۔ ان ارامی عربوں نے یہاں ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جس سے رومۃ الکبریٰ کی حکومت بھی لرز گئی۔ ھینبال وغیرہ اسی خاک کے فرزند تھے۔

یونان وکریٹ

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ عربوں کی براہ راست آبادی یورپ کے شہر یونان وکریٹ میں تھی۔ پلینی ایک یونانی جغرافیہ نویس اہل معین واقع یمن کے متعلق لکھتا ہے کہ "معین کے لوگ اپنے کومینوس شاہ کے خاندان سے بتاتے ہیں۔" ایک دوسرا یونانی مصنف اسٹرالو جزیرہ یوبیا (مملکت یونانی کا ایک جزیرہ) کے قدیم باشندوں کی نسبت لکھتا ہے کہ یہاں کی آبادی ایک "عرب" نو آبادی تھی جو قسید موس کے ساتھ یونان میں تھی۔

ہم ان فقروں کا ماحصل اتنا سمجھتے ہیں کہ عرب تاجر قدیم زمانے میں یونان تک پہنچ چکے تھے اور وہاں اپنی کوئی تجارتی نو آبادی بھی قائم کر لی تھی۔

عرب البائدہ۔ امم سامیہ عاد اولٰی کے آخری نتائج

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِھِمۡ۔

مذکورۂ بالا مباحث ومشاہد سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عاد اولٰی، ارم بن سام کی اولاد سے ہیں۔
قرآن مجید بھی ان کے نسبی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ ۪ۙ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۪ۙ﴿۷﴾

تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا۔ جو بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے۔
جن کی نظر دنیا میں نہیں پائی گئی۔

بعض حقیقت سے ناواقف اور تاریخی مشاہد سے ناآشنا مفسرین نے لفظ ''ارم'' کی اصلیت اور واقعیت سے ہٹکر اس سے ایک عجیب وغریب قیاسی باغ مراد لیا ہے۔ شداد ابن عاد کو اس نمونہ باغ رضوانی کا بانی بتلایا ہے۔ اور اپنی طبیعت کے مذاق اور خیال کے انداز پر اس کی زیب وزینت حسن وآرایش کے متعلق خارج از امکان اور بیرون از بیان ساز وسامان ترتیب دیئے ہیں۔ مگر حقیقتاً یہ ان بزرگوں کی عقیدتمندانہ غلط فہمی ہے۔ ابن خلدون نے اس موضوع پر ایک جداگانہ اور محققانہ بحث لکھی ہے۔ اس کی چند توجیہات ثبوت ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ہم نے (ابن خلدون نے) دعویٰ کیا ہے کہ عاد، امم سامیہ کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی ہیں۔ نیز یہ کہ وہ ایک عظیم الشان حکمراں قوم تھی۔ قرآن مجید میں اس کی تائید ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ

عاد کے لوگو، یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے قوم نوحؑ کی تباہی کے بعد تمہیں خلافت (حکومت) دی
یہ مسلم ہے کہ عرب اور اس کے جواز ومضافات میں نوحؑ کے بیٹے سام کی اولاد (امم سامیہ) سکونت پذیر ہوئی تھی۔

(۲) عاد کی عظمت وجلالت اور سیاسی تفوق کے مفصل بیانات گذر چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ''ہم سے بڑا (قوت والا) روئے زمین پر آج کون ہے'' (حم سجدہ) ان کے پیغمبر (حضرت ہودؑ) نے ان سے کہا ''عجب نہیں کہ خدا تم سے لے کر اپنی خلافت کسی دوسری قوم کو عطا کردے۔'' (سورہ ہود)

گذشتہ بیانات سے ان کی ثروت ودولت تو معلوم ہو چکی تھی۔ قرآن مجید کے موجودہ الفاظ سے ان کے مغرورانہ تمول ومقدرت کا اعتراف واضح ہے۔

(۳) عاد بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کی متعدد مقامات پر توثیق کی ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ (فجر)

تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا۔ جو بڑی بڑی عمارتوں والا تھا۔ جس کی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی گئی۔

دوسری جگہ حضرت ہودؑ کی زبانی ارشاد ہے۔

ترجمہ: اے عاد والو۔ تم ہر خوش قطع مقام میں بے فائدہ یادگار اور کاریگری کے مکانات بناتے ہو۔ شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہو گے

پھر ان کی انھیں فنا پذیر تعمیرات کی نسبت فرمایا گیا ہے۔

ترجمہ: اور عاد وثمود کو ہلاک کیا اور ان کے گھروں کے کچھ حصہ تمہارے سامنے ہیں۔ (عنکبوت)

بار دیگر عبرت دلائی جاتی ہے۔

عاد کا یہ حال ہوا کہ صبح ہوتی ان کے مکانوں کے سوا اب کچھ نظر نہیں آتا (احقاف)

روایات میں عموماً قوم عاد اولی کا خاص مقام یمن بتایا گیا ہے۔ لیکن امم سامیہ کے مجموعی سلسلہ بیان میں ان کی سکونت کی تخصیص نہیں پائی جاتی۔ صرف جزیرہ نمائے عرب تک ان کی سکونت محدود کردی گئی ہے۔

عرب کے جغرافیہ حالات میں اس قبل بیان ہو چکا ہے کہ ریگستانی صحرائے احقاف جنوبی اور شمالی عرب میں دونوں طرف واقع ہے۔ یہ غلط ہے کہ حضرت ہودؑ جنوبی صحرا کے رہنے والی قوم عاد کی ہدایت کے لئے مخصوص مبعوث فرمائے گئے تھے۔

حضرت ہود کی بعثت اور قوم عاد کی ہدایت

(افرینش عالم کے 1800 صدی اور حضرت مسیحؑ سے 2200 ق۔م)

اصولِ ہیت کے مطابق ہر اشیائے عالم کے تین زمانے ہوتے ہیں۔ آغاز، کمال اور زوال۔ قوم عاد کے آغاز اور ہر اصناف مکونہ میں ان کے کمال عروج کی کیفیت معلوم ہو چکی۔ گویا ان کی عمر میں تمدن کے دو زمانے گذر گئے۔ اب جو زمانہ آنے والا ہے۔ وہ آخری انحطاط وزوال کا عالم ہے۔ اس کے ابتدائی اسباب بھی ہونے چاہئیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے اخلاق وتمدن نے خود پیدا کر لئے۔ پہلے اخلاق بگڑے طبیعتوں سے بھلی باتیں ایک ایک کر کے جاتی رہیں اور ان کی جگہ سو سو برائیاں داخل ہو گئیں۔ انصاف کی جگہ ظلم، رحم کی جگہ شقاوت۔ خوش اخلاقی اور مہربانی کے عوض بداخلاقی اور ایذا رسانی پیدا ہو گئی۔ ان کی بدکرداریوں کے انتہائی حدود یہاں تک پہنچ گئے کہ ان کا وجود عام نفوس انسانی کے لئے معین ومدد کیا سخت مضر ثابت ہونے لگا۔

تدبر قدرت ایسے وقت میں کیا کرتا ہے؟ ایسے عالم میں عادت الٰہیہ قدیم سے جن عملی صورت میں جلوہ آرائی ہوتی آئی ہے۔ وہ قرآن مجید کے ان الفاظ سے ثابت ہے۔ ''خدا کا قانون گذشتہ قوموں میں بھی یہ تھا، اور خدا کے قانون میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔'' وہ قانون

خداوندی کیا ہے؟ اخلاق الٰہیہ کے اصول کے مطابق ان کی ہدایت اور اصلاح کے لئے مدبر قدرت نے ان کی روحانی درستی و ترمیم کا ارادہ کیا اور انھیں کی قوم و قبیلہ سے ان کا مصلح اعظم پیدا کیا۔ اپنے اس قانون اخلاق کو الفاظ الٰہیہ یوں بیان کرتے ہیں۔ ترجمہ: اور ہم کسی قوم کو اس وقت تک مبتلائے عذاب نہیں کرتے ہیں۔ جب تک ان میں پیغمبر نہ بھیج دیں۔''

حجت الٰہی کی متذکرہ بالا منزل اول تمام ہوجانے کے بعد جب کسی قوم انسانی کی شامت اعمالی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ وہ ان اخلاق الٰہیہ کی توقیر کی جگہ تحقیر کرنے لگی ہے۔ اور اس معلم روحانی کی ایذا دہی پر تیار ہوجاتی ہے جو ان کی تعلیم، تلقین اور تسکین کے لئے خاص کر مبعوث کیا جاتا ہے۔ تو ایسے وقت میں اس کی رحمت غضب سے بدل جاتی ہے۔ اس کی قوت جبروتی فناہ و ہلاکت کی مختلف صورت میں ظاہر ہوکر ان کی بستیوں کو خاک سیاہ اور ان کی ہستیوں کو تباہ کر ڈالتی ہے اس وقت ان کی حالتوں کا یہ عالم خاص ہوتا ہے کہ ان کے لئے دوڑ جانا یا بھاگ جانا ممکن نہیں ہوتا۔

عاد اولیٰ کی بعینہ یہی کیفیت اور یہی عالم اس زمانہ میں ہورہا تھا۔ راحم ازلی اور منعم حقیقی نے ان کفر شعاروں کی اصلاح کی غرض سے حضرت ہودؑ کو منصب رسالت پر مبعوث فرمایا۔ اور کلمہ الٰہی کے اس داعی نے ان الفاظ میں حقیقت کی آواز ان کے کانوں تک پہنچائی۔ ترجمہ: قوم عاد میں ان کے بھائی حضرت ہودؑ مبعوث فرمائے گئے انہوں نے تمام قوم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا: اے میری قوم۔ خدا کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں کیا تم ڈرتے نہیں۔

قوم عاد کا وہ کافر فرقہ، جو شدت کفر و نفاق میں الاعراب اشد کفر و نفاقا۔ (عرب البائدہ کفر و نفاق میں شدید ترین قوم تھے) کا پورا مصداق تھا۔ اپنی لاانتہا نخوت و غرور میں چور ہوکر اسد داعی کلمۃ الحق سے برسرِ مناظرہ ہوا۔ اور اپنے گستاخانہ مکالمہ کی جواباً اس دریدہ دہنی اور شوخ چشمی سے ابتدا کی۔

ترجمہ: اس کی قوم کا وہ بلند طبقہ جو کافر تھا بولا۔ اے ہودؑ (معاذ اللہ) ہم تم کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں۔
اور (نعوذ باللہ) تم کو جھوٹ بولنے والوں میں پاتے ہیں۔

حجت الٰہی نہایت نرمی اور سنجیدگی سے جواب دیتی ہے اور خدا کے احسانات وہ پیغمبر یاد دلاتا ہے۔

ترجمہ: اے میری قوم مجھ میں حماقت نہیں۔ ہاں میں پروردگار عالم کی طرف سے رسول ہوں۔ اپنے پروردگار کی رسالت کو پہنچاتا ہوں۔ اور درحقیقت میں تمہارا خالص خیر خواہ ہوں۔ کیا تم کو تعجب ہوا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت تم میں سے ایک شخص پر اتری تاکہ تم کو تنبیہ کرے، یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے تم کو قوم نوحؑ کے بعد خلافت (حکومت) دی اور تم کو خلق میں وسعت عطا کی، خدا کی نعمتوں کو یاد کرو کہ فلاح پاؤ (سورۂ اعراف)

منکرین نعمت الٰہی احسانات خداوندی کی یاد دہانی کا کیا جواب دے سکتے تھے۔ اس کو تو گول کر گئے، مگر اپنی کافرانہ تقریر کو ایک نئی تعریض کے طریقہ سے شروع کیا۔

ترجمہ: کافروں نے جواب دیا کہ کیا تو اس لئے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم ایک خدا کی عبادت کریں اور جن کو ہمارے بزرگ پوجتے تھے ان کو چھوڑ دیں جس عذاب کا تم دعوی کرتے ہو اگر تم سچے ہو تو لے آؤ۔

خدا کا برحق پیغمبر ان کے مصنوعی معبودوں کی حقیقت دکھلا کر ان پر عذاب الٰہی کے نزول کو یقینی بتلاتا ہے۔

ترجمہ: پیغمبر نے کہا۔ تمہارے پروردگار کا عذاب وغصہ تم پر آ گیا۔ کیا تم مجھ سے ان چند ناموں کے لیے جھگڑتے ہو۔ جن کو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے کو خود رکھ لیا ہے۔ خدا نے تو اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ عذاب کا انتظار و کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (اعراف)

اخلاق الٰہی کا یہ مقتضا ہرگز نہیں تھا کہ ایک سرکش قوم سے ایک بار ان کی کفر شعاری کے ترک کر دینے کی تاکید کر دی گئی۔ وہ مانے تو مانے۔ ورنہ اسی وقت ان پر نزول عذاب ہو، اور چشم زدن میں ان کی ہستیاں فنا کر دی جائیں۔ بلکہ اس ارحم الراحمین اور پیدا کنندہ عالمین کے رحم کا مدعا اور اس کے اشفاق کریمہ کا عین منشا، ایسے مواقع پر علی الاکثر چشم پوشی ہوتی تھی اور طولانی خاموشی، یہ اس لئے کہ معبود کو عوام عباد سے محبت تھی۔ یہ سکوت اور توف علی الاکثر اوقات اتنے طول طویل ہوتے تھے کہ انبیاء و مرسلین کے پائے استقامت اور ارادہ صبر وتحمل، باوجود یکہ ان کے نفوس قدسیہ حدود بشریت کو طے کر کے مراحل روحانیت تک پہنچے ہوئے تھے بالآخر متزلزل ہو جاتے تھے۔ جناب نوحؑ کے واقعہ میں اس کی کافی مثال موجود ہے۔ جب ایک کثیر التعداد مدت تک اس پیغمبر حق کی دعوت وموعظت اس کی کافر کیش قوم نے نہیں سنی اور اس کے اس احسان وخیر خواہی کے عوض اس کو طرح طرح کے آزار روحانی اور جسمانی پہنچائے۔ تو وہ گھبرا کر خدا کی جناب میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی شکایت اور گلے کرنے لگے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا (٥) فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا (نوح)

اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن رات ہدایت کی اور تیری طرف بلایا مگر میرے بلانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے جتنا بلایا وہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے۔

اسی طرح رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی غرض سے حضرت یونسؑ کے وقتی وغیظ وطیش میں آ جانے کا واقعہ ان الفاظ میں یاد دلایا جاتا ہے۔

ترجمہ: اے پیغمبر۔ اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کئے بیٹھا رہ اور مچھلی والے حضرت یونسؑ کی طرح نہ بن کہ انہوں نے مغلوب الغیظ ہو کر ہم کو پکارا۔

یہ دونوں مثالیں صبر وتحمل الٰہی کے کمال کو پورے طور سے بتلاتی ہیں۔ بعینہ یہی مثال ہمارے موجودہ سلسلہ بیان میں کافرین قوم عاد اور حضرت ہود کی داستان وواقعات میں سمجھنا چاہیے۔

متواتر مقامات پر قرآن کا سلسلہ بیان جناب ہودؑ اور ان کی کافر قوم کے مکالمات کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس

حجت الٰہی نے ایک مدت مدید تک ان گمراہوں کے سمجھانے اور راہ پر لانے کی کوششوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ (سورہ ھود)

ترجمہ: عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس (ہود نے کہا میرے بھائیو! خدا کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ دوسرے خداؤں کا نام تمہارا صرف افترا ہے۔ بھائیو! اس وعظ و نصیحت کا کوئی معاوضہ میں تم سے نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو اس کے متعلق ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ کیا تم نہیں سمجھتے ہو۔ بھائیو! خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ اس کی طرف رجوع کرو۔ تو وہ آسمان سے تم پر برستا ہوا ابر بھیجے گا۔ اور تمہاری موجودہ قوت میں اور زور وقوت عطا فرمائے گا۔ گنگار بن کر اس سے منہ نہ چراؤ۔"

اس سنجیدگی کے خطاب کا اس بیہودگی سے جواب دیا جاتا ہے۔

قَالُوْا یٰھُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَۃٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِکِیْٓ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ وَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىکَ بَعْضُ اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

قوم کے لوگوں نے کہا۔ ہودؑ۔ تم ہمارے پاس کوئی دلیل نہ لائے صرف تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے بزرگوں کے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض دیوتاؤں نے تمھیں کچھ کردیا ہے۔

صبر وتحمل کا سراپا پیکر۔ خدا کا سچا پیغمبرؑ ان شوخ چشموں کو نرمی سے خیر خواہانہ جواب دے دیتا ہے۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُشْھِدُ اللّٰہَ وَاشْھَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِہٖ فَکِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِھَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِہٖٓ اِلَیْکُمْ ؕ وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَہٗ شَیْئًا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾

ہودؑ نے کہا۔ میں خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا، جس کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں اس

سے بالکل بری ہوں۔تم سب مل کر میرے لئے سازش کرو۔پھر مجھے مہلت نہ دو میں نے خدا پر بھروسہ کیا ہے۔جو میرا اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے۔کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کی پیشانی (چٹیا) اس کے ہاتھ میں نہیں۔میرا پروردگار صحیح راستہ پر ہے۔تم اگر انکار کردو تو میں جو پیغام لے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا۔خدا تمہارے سوا کسی اور کو حکومت بخشے گا۔تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ اور نگہبان ہے۔

ایک بار نزول عذاب کے متعلق موعظت کی گئی۔اس کی نسبت مکالمہ کی یہ عبارت ہے۔

عاد کے بھائی ہود کو یاد کرو۔ جب اس نے اپنی قوم کو صحرائے ریگستان میں متنبہ کیا۔خدا کی عبرتناک دھمکیاں اس کے سامنے اور اس کے پیچھے تھیں۔اس نے کہا کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرو، میں ڈرتا ہوں کہ تم پر کوئی بڑا عذاب نہ آئے۔(الاحقاف)

کفار مستہزانہ انداز میں جواب دیتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ اے ہود تو اس لئے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اپنے دیوتاؤں سے مرتد کردے جس عذاب کا تم شور مچایا کرتے ہو اگر سچے ہو تو لے آؤ۔(الاعراف)

خدا کا رسول برحق متانت سے جواب دیتا ہے۔

قوم نے کہا کہ عذاب کب آئے گا۔تو پیغمبر نے کہا کہ اس کا علم خدا کے پاس ہے کہ عذاب کب آئے گا جو پیغام لے کر میں بھیجا گیا ہوں وہ صرف تم کو پہنچاتا ہوں لیکن میں تم کو نادان قوم خیال کرتا ہوں۔(الاحقاف)

تغیر نفوس کے متعلق قوم عاد کی طبیعتوں میں مختلف اقسام کے تمرد، تکبر اور انانیت کے خیال پیدا ہو گئے تھے۔وہ اپنی دولت و مال کو لازوال، ثروت و اقتدار کو دائمی اور بالاستمرار اور اپنی عمارت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بالاستقرار یقین کرتے تھے۔پیغمبر حق ان کے اس خیال فاسد کا انکشاف حال فرماتا ہے۔

عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا کہ تم پرہیزگار بنو۔میں تمہارا پیغمبر ہوں اور امین۔پس خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا میرا معاوضہ پروردگار عالم نے دینا ہے۔تم ہر خوش قطعہ زمین میں بے فائدہ اپنی یادگار نشانی اور کاریگری کی عمارتیں بناتے ہو شاید تم ہمیشہ رہو گے۔جب کسی کو پکڑتے ہوئے تو جابر بن کر۔خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔اس خدا سے ڈرو۔جس نے تمہاری ان نعمتوں سے مدد کی جن کو تم خود اچھی طرح جانتے ہو۔

چوپائے۔اولادیں چشمے اور باغ۔مجھ کو ڈر ہے کہ تم پر کوئی عذاب نہ آئے۔(الشعراء)

وہ بے دین ضدی لاپروائی سے کہتے ہیں۔

قوم نے جواب دیا کہ خواہ تم وعظ ونصیحت کرو یا نہ کرو۔ہم ماننے والے نہیں ہیں۔یہ اگلے زمانے کی عداوت ہے۔ہم پر کوئی عذاب نہیں آئے گا۔(الشعراء)

ان کی کافرانہ ضد اور منکرانہ ہٹ دھرمی کا بالآخر نتیجہ کیا ہوا۔ارشاد ہوتا ہے۔

ان لوگوں نے پیغمبر کو جھٹلایا۔تو ہم نے ان کو برباد کر دیا۔اس واقعہ میں عبرت کی نشانی ہے۔یہ لوگ اکثر ایماندار نہیں تھے۔(الشعراء)

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آیات مذکورۂ بالا میں قوم عاد کی بربادی کے تین سبب بتلائے گئے اور وہ ایسے جو عموماً تمام اقوام عالم کی تباہی کے ہمیشہ باعث ہوتے چلے آئے ہیں۔وہ اسباب یہ ہیں۔غرورِ قوت،ظلم وجور اور کفر والحاد۔ذیل کی تفصیل سے معلوم ہوجائے گا کہ ان کی تباہی سے پہلے یہ اسباب ان میں کثرت اور شدت سے موجود تھے پہلے اپنی مفاخرت یعنی غرور قوت کے اظہار میں وہ حضرت ہودؑ سے کہتے ہیں۔ہمیں کس سے ڈراتے ہو۔

مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ترجمہ: جی!قوت وزور میں ہم سے کون بڑا ہے۔

حضرت ہودؑ بڑی متانت وسنجیدگی سے سمجھاتے ہیں کہ تمہاری قوت مسلّم،تمہارا دعویٰ صحیح لیکن اگر خدا کی اطاعت وعقیدت اختیار کرو گے اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلو گے تو اس کے صلہ میں۔

يَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ ترجمہ: خدا تمہاری قوتوں کو اور قوت عطا فرمائے گا۔

لیکن وہ بے سمجھی سے نہ سمجھے خدا ان کی بے سمجھیوں کی حقیقت دکھلاتا ہے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً

کیا وہ نہ سمجھے کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا وہ ان سے بھی زیادہ قوت والا ہے۔

غرورقوت کے شائبہ میں،تعداد افراد،تعداد افواج سے لے کر تعداد دواب (مویشی) پر بھی ان کو پورا غرور اور انانیت حاصل تھی حضرت ہودؑ ان کی اس بے جا مفاخرت اور غرور ونخوت کے مشاہدہ پر ارشاد کرتے ہیں کہ ان دنیاوی نعمتوں کے حصول پر اظہار تشکر کرنا چاہیے۔اظہار تکبر نہیں کرنا چاہیے ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ اس خدا کا خیال کرو۔جس نے تم کو وہ چیزیں عطا کیں جن کو تم خود جانتے ہو،مویشی،اولاد،باغ اور چشمے۔

اور تم کو خلق میں وسعت عطا فرمائی۔

ظلم وجور کے متعلق تمام ملک میں ان کی شکایت پھیلی ہوئی تھی۔اور یہ حکومت وجہانبانی کے لئے اتنا مضر ہے کہ اس کے مقابل میں

کوئی عیب یا زیادتی مملکت کو اتنا جلد نقصان و تباہی نہیں پہنچا سکتی۔اس زمانہ میں ان کے مظالم اور مفاسد کی کوئی حد باقی نہیں رہی تھی۔حق ناحق دیگر اقوام و قبائل کو پریشان کیا کرتے تھے۔اور ان تمام عیوب پر دندناتے پھرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دنیا بھر میں ہم ہی ہم ہیں ان کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

ترجمہ: لیکن عاد نے روئے زمین پر بلا استحقاق غرور کیا۔اور کہا کہ ہم سے کون زور قوت میں بڑا ہے۔

ان تمام قباحتوں اور عیبوں کے علاوہ ان کا کفر والحاد بھی واضح تھا۔جس کے ترک کر دینے کی نسبت ابتدا ہی سے تواتر کے ساتھ اس معلم روحانی نے ان کو موعظت فرمائی۔ان کے چند خطبات و مواعظات حسب ذیل ہیں۔

ترجمہ: بھائیو خدا کی عبادت کرو۔اس کے سوا کوئی خدا نہیں، کیا تم پرہیزگار بننا نہیں چاہتے۔ (اعراف)

ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ: بھائیو۔خدا کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔دوسرے خدا کا نام تمہارا افترا ہے۔

ان تمام فہمائش اور پند و نصائح کا جواب ایک ہی ملتا تھا۔نہیں۔وہ بھی اس جہالت کے انداز و شامت کے الفاظ میں۔

ترجمہ: کافر بولے۔اے ہودؑ تم تو ہمارے پاس کوئی حجت نہیں لائے صرف تمہارے کہنے سے تو ہم اپنے دیوتاؤں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔

اخلاق عظیم الٰہیہ اور الطاف عمیم قدسیہ کے اصول و شان کے مطابق کافرین عاد کے ایسے انکار صاف پر بھی اس منعم حقیقی نے احکام انتقام تو نہ جاری فرمائے بلکہ التواء و مہلت کے ان کو مزید ایام دیئے اور جناب ہودؑ کو ایک بار پھر ان سے حجت تمام کرنے کا حکم ہوا۔اور انہوں نے سمعاً واطاعتاً کہہ کر ان بدبختوں کو آخری بار ان الفاظ میں سمجھایا۔

ترجمہ: اگر تم نے منہ پھیر لیا تو میں تمھیں جو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا پہنچا چکا خدا تمہارے سوا کسی اور کو حکومت دے گا۔میں ڈرتا ہوں کہ تم پر سخت عذاب آئے۔

خدا کی حجت تو تمام ہوگئی مگر ان کی بدبختی کی مدت نہ تمام ہوئی اور وہ اپنی شامت اعمالی سے اب بھی باز نہ آئے تو اس منتقم مطلق نے ان کی جگہ دوسری قوم کو منتخب فرمایا۔اور اس ظالم اور مفسد قوم کو ان کے املاک و مقبوضات کے اندر اور باہر تباہ و برباد کر دیا۔بیرونی علاقہ جات میں تو قوی ترغنیم نے تلواروں سے مار گرایا اور شہر احقاف اور اس کے توابع مضافات میں (ریح عقیم) جھلسا دینے والی ہوا اور جلتی ریگ کے طوفانوں نے مار کر دفن کر دیا۔

بڑا غضب ہوا رحمت جلال میں آئی۔نزول عذاب کی صورت کا مرقعہ الفاظ قرآنی نے یوں کھینچا ہے۔

ترجمہ: جب ان کو بادصرصر کا عذاب ایک بادل کی صورت میں جس کا رخ ان کی وادیوں کی طرف تھا۔نظر آیا تو بولے یہ ہم کو سیراب کرنے والا بادل ہے۔نہیں بلکہ یہ وہ ہے جس کی اے گنہگارو، تم کو جلدی تھی، یہ ہوا ہے جس میں دردناک عذاب (ممزوج) ہے۔جو اپنے خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے۔پھر

وہ ایسے نیست ونابود کردے گئے کہ ان کے گھروں کے سوااور کچھ باقی نہ رہا۔

بادعقیم یاریح صرصر کی حقیقت اوراس کے مہلک اثریوں بیان کئے گئے ہیں۔

ترجمہ:لیکن عاد، وہ تو بادصرصر سے برباد کردیئے گئے۔خدا نے سات رات اورآٹھ دن تک ان پر جڑ کاٹنے والی ہوا کو مسلط کردیا۔تم اس ہوا میں اس قوم کواس طرح افتادہ دیکھتے ہو، جیسے وہ کسی کھلے درخت کی جڑ تھے۔کیا اب ان میں سے کوئی تمھیں زندہ نظرآتا ہے۔

ایک اورمقام پرارشادہوا ہے۔

ترجمہ:اورعاد(کے حالات)میں عبرتیں ہیں۔جب ہم نے بے فائدہ بخش ہوا کو بھیجا جوایسی تھی کہ جس شئ پراس کا گذر ہوجاتا اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح کرکے چھوڑتی۔

احقاف وہ عظیم الشان ریگستان ہے جوسینکڑوں میل تک وسیع ہے۔اوراب اس کوالربع الخالی کہتے ہیں۔یہی عاداولی کا قدیم مسکن تھا اورآخر میں ان کا مدفن بھی قرار پایا۔نزول عذاب کا بھی یہی مقام ہے۔صورت عذاب بھی الفاظ قرآنیہ سے معلوم ہوچکی ہے۔وہ مہلک ہواایک ہفتہ رات دن برابر چل کر ہزاروں کیا، لاکھوں کی شمع حیات کوگل کرگئی اورصبح کوختم عذاب پرسوائے خاک کے ڈھیروں اور خالی گھروں کے تمام علاقہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔یہ ہولناک منظرالفاظ الٰہیہ میں یوں دکھلایا گیا ہے۔

ترجمہ صبح کوسوائے مکانات افتادہ کے اورکچھ نظر نہ آیا۔(احقاف)

ترجمہ:اس ہوا میں یہ قوم اس طرح افتادہ تھی۔جیسے کھوکھلے درخت کی جڑ ہو۔کیا ان میں سے کوئی زندہ نظر آتا ہے۔(الحاقہ)

نزول عذاب کے وقت احقاف کی حدّت ہوا کی جیسی شدت بڑھ گئی ہو۔اس کا اندازہ تواس وقت امکان سے قطعی محال ہے مگر ہاں اس وقت تک بھی جوبادسموم کی کیفیت ہوتی ہے وہ مسٹرپالگریو۔یورپین سیاح ومحققین کے چشم دید بیان سے ذیل میں مندرج ہے۔

دوپہرتھی، جنوب کی طرف سے دفعتاً ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ہوا کی تیزی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔میرے عرب رفیق نے اپنے چہرہ کوکپڑے سے لپیٹ لیا۔اوراونٹوں کو مارمار کرتیز کرنے لگے۔لیکن اونٹ بار بار بیٹھ جانے کی کوشش کرتے تھے۔میں نے رفیقوں سے واقعہ دریافت کیا۔لیکن نہایت گھبراہٹ کے ساتھ صرف یہ جواب ملا کہ اگر سامنے کے خیمہ میں پہنچ گئے تو جان بچ جائے گی۔اس اثنا میں ہوااورزیادہ تندوتیز ہوگئی۔گرمی کی یہ شدت ہوگئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے دوزخ اترآیا ہے۔بالآخرکوشش کرکے ہم خیمہ تک پہنچ گئے۔وہاں ایک عورت منہ لپیٹے اوندھی پڑی تھی۔ہمارے اونٹ ہوا کے رخ سے منہ پھیرکرناک کوریت میں گاڑکرمردے کی طرح پڑ گئے۔ہم بھی خیمہ میں جا

کر منہ لپیٹ کر اوندھے پڑ گئے۔ تاریکی اتنی شدید تھی کہ رات معلوم ہوتی تھی دس منٹ
تک تقریباً یہی حالت رہی۔ پھر ہوا اور گرمی میں تخفیف ہوئی۔ جب ہم اٹھے تو ہمارے
چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

(PALGINE ADVENTURES OF ARABIA)

اس محقق سیاح کے چشم دید واقعات سے عذاب الٰہی کی اس شدت عظیم کا اس وقت تک اثر خفیف باقی رہنا ثابت ہو گیا۔ سب سے پہلے سطح زمین پر اس قوم قدیم کا آباد ہونا اور قومیت کا مجموعی صورت میں قائم ہونا۔ اور مختلف اقطاع عالم پر مسلط ہو کر حکمرانی کرنا غرض ان کے وجود، ان کے عروج واقتدار اور زوال وادبار کے سارے حالات پوری تفصیل وتشریح سے بیان ہو چکے اور اب عاد اولیٰ یا امم سامیہ کے قدیم کے تمام احوال ختم کر کے ہم اپنے سلسلہ بیان میں جناب ہود علیہ السلام کے مختصر حالات درج کرتے ہیں۔

حضرت ہود علیہ السلام کے مختصر حالات

جناب ہود علیہ السلام ساتویں پشت میں سام ابن نوحؑ سے اس طرح ملتے ہیں کہ ہود بن عبداللہ بن خلود بن عاد اولیٰ بن عوض بن ارم بن سام۔ (طبقات ابن سعد) توریت میں آپ کا نام عبر اور بعض جگہ عابر آیا ہے جو تمام عبرانی قوموں کے مورثِ اعلیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔ سفر تکوین باب 11 درس 14۔ آپ کی رسالت کے مختصر حالات یہ ہیں۔

عَوض کے بیٹے عاد اولیٰ نے بہت بڑی شہرت حاصل کی اور رفتہ رفتہ اس کی اولاد ایک نامی قوم ہو گئی۔ اور تمام مشرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی۔ انہوں نے عالیشان مکان اور بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں اور آس پاس کی قوموں کو اپنا محکوم بنالیا۔

خداوند عالم نے اسی قوم کی ہدایت کے لئے حضرت ہودؑ کو مبعوث فرمایا کہ خدائے برحق کی عبادت کی ترویج اور بت پرستی کا استیصال کریں۔ لیکن جب ان لوگوں نے ان کے احکام ہدایت سے سرتابی کی تو خدا تعالیٰ کا قہر جوش میں آیا اور تین برس کا مسلسل قحط ان پر پڑا اور اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ وہ لوگ آگاہ ہو گئے کہ خدا کے پیغمبرؑ کا حکم نہ ماننے کی یہ سزا ہے۔ اس پریشانی کی حالت میں حضرت ہودؑ پھر تشریف لائے اور بت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی از سر نو تاکید فرمائی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خدائے رحیم باراں رحمت نازل کرے گا مگر وہ اپنی گمراہی پر ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت طوفانی آندھی نازل فرمائی جو اس کے غضب وعذاب کی نشانی تھی۔ آندھی کا طوفان سات رات اور آٹھ دن تک اس پورے ملک میں اس زور و شور سے جاری رہا کہ، ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ اور تمام قوم کا سوائے ان چند اشخاص کے جنہوں نے حضرت ہودؑ کا کہنا مان لیا تھا۔ قریب قریب سب کا استیصال ہو گیا اور جو لوگ بچے وہ آخر میں حضرت ہودؑ پر ایمان لائے اور یہی لوگ عاد ثانی کہلائے۔ یہ واقعہ آفرینش عالم کے 1800 صدی میں ولادت عیسیٰ سے 2200 سال قبل واقع ہوا۔

اس واقعہ کے بعد حضر موت کے علاقہ میں حضرت ہودؑ مقیم ہوئے۔ اور وہیں انتقال فرما گئے۔ اور مقام ہسبق میں مدفون ہوئے۔

جہاں ایک چھوٹا سا قریہ قبر ہودؑ کے نام سے آباد ہے اور سالانہ زیارت کا مقام ہے۔
عدن کے پاس عاد ثانیہ کا ایک کتبہ ملا ہے۔ اس میں ہود علیہ السلام کی اتباع شریعت کا ذکر ہے۔ اس کے ایک سامی زبان کے شعر کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

تقیم لنا من دین ھود شرایعا
و نومن بالآیات والبعث والنشر

وہ ہمارے لئے ہودؑ کی شریعت قائم کرتے ہیں۔ اور ہم احکام الٰہی اور بعثت ونشر پر ایمان لائے ہیں۔
اس کتبہ کی مرقومہ بالا عبارت نے جہاں عاد ثانیہ یا عاد صالحین کی اہل ایمان اور ارباب مومنین ہونے کی تصدیق کر دی وہاں یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت اسلامی کے موجودہ اصول جن سے بعض مذاہب عالم کو اس وقت تک انکار ہے وہ حقیقت میں تمام شرائع قدیم کے حقیقی اصول اور اصلی ارکان تھے۔ جدیس، عرب کے قومی دفتر کا یہ قبیلہ گویا مسدس ہے۔ اور امم قدیمہ سامیہ میں اس کا چھٹا نمبر ہے۔ مگر افسوس اس قوم کا حال سوائے اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ بھی صحرا نشین تھے۔ ان کی اولاد امتداد ایام کے بعد اور اقوام صحرا کی مثال بالکل معدوم ہوگئی۔

قوم ثمود یا عاد ثانیہ

حضر موت سے ساحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک، عرب میں حجاز سے حدود سینا تک اس قوم وقبائل کے لوگ آباد تھے۔ اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت ہودؑ نے مع اپنے متبعین وصالحین عاد کے عذاب سے نجات پائی۔ روایات عرب میں ہے کہ وہ عذاب سے پہلے عاد کی آبادی سے نکل کر حجاز میں چلے گئے تھے۔ ان میں حضرت لقمان کے نام کا ایک نیک بادشاہ ہوا۔ اس کی عمر کئی سو برس بیان کی گئی ہے اور یہ کچھ عجب نہیں۔ تمام قدیم قوموں کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے طویل العمر بادشاہوں سے شروع ہوتی ہے۔ اب اس قسم کی روایات مذاق زمانہ کے مطابق یہ معنی سمجھے جاتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان میں حکومت کئی سو برس تک رہی، اور مجازاً بجائے خاندان کے خود اس شخص کا نام قرار دے دیا گیا۔ اس بنا پر حضرت لقمان کی عمر سے خاندان کی عمر مراد لینی چاہیے۔
حضرت لقمان کون بزرگ تھے۔ روایات عرب میں اس نام کا ایک مشہور ومعروف شخص ہے۔ جنھیں اب عموماً حکیم لقمان کہتے ہیں ان کی طرف حکایات وتمثیلات حکیمانہ کثرت سے منسوب ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کے پند ونصائح کا تذکرہ ہے۔ جن میں سے ہم چند اپنے سلسلہ بیان میں آگے تحریر کر دیں گے۔
عربِ قدیم کا مشہور شخص حضرت لقمان اور زمانہ موجودہ کا حکیم لقمان اصلاً ایک ہی ہیں۔ اس اتحاد کا نہایت قدیم ثبوت یہ ہے۔ مشہور مؤرخ ابن اسحاق المتوفی 151ھ جس کی سیرت آج آنحضرت صلعم کے حالات میں قدیم ترین تصنیف ہے اور تصنیفات موجودہ کے اعتبار پر عرب قدیم کا سب سے پہلا مؤرخ ہے، اپنی تصنیف میں جو مخصوص عرب قدیم کی تاریخ میں ہے۔ روایت کرتا ہے۔

وہب (ایک مشہور راوی) نے کہا کہ شداد ابن عاد جب مر گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان ابن عاد کو ملی۔ خدا نے عاد کو وہ سب کچھ دے رکھا تھا۔ جو کسی دوسرے کو اس زمانہ میں نہیں دیا تھا۔ اس کے حواس سو آدمیوں کے برابر دیے گئے تھے۔ اور اپنے معاصر میں سب سے بلند قامت تھا۔ (ارض القرآن ص ۱۸۱ ج اول)

بعض لوگ غلطی سے لقمان عاد اور لقمان حکیم کو دو سمجھتے ہیں۔ بعض علماء یورپ جن کو عرب کی خصوصیات کے نام سے خواہ مخواہ چھینک آتی ہے۔ وہ لقمان حکیم اور ایسے نامی ایک یونانی حکیم کو ایک قرار دیتے ہیں۔ اس اتحاد کی دلیل جو وہ پیش کرتے ہیں کہ ان دونوں کی طرف جو حکایات و تمثیلات منسوب ہیں وہ تقریباً ایک ہی قسم کے ہیں۔ لیکن یہ ایک تعجب انگیز استدلال ہے۔ کسی دو تصنیف کے مطالب کا اتحاد ان کے مصنفین کی اتحاد شخصیت کیلئے اگر مستلزم ہے تو افسوس ہے کہ اس جرم میں ہم کو سینکڑوں تاریخی اشخاص کے مٹ جانے کا افسوس ہوگا۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ قدیم عرب حکمائے یونان سے کب واقف تھے۔ عرب کے ایام جاہلیت کا ایک شاعر اسلمی بن ربیعہ کہتا ہے۔

اهلکن طسما وبعده ،غذی بهم وذاجدون ،واهل جاش و مارب ،وحی لقمان والتقون

ترجمہ: حوادث زمانہ نے طسم کو اور اس کے بعد قبیلہ ذاجدون، شاہ یمن اور اہل جاش اور ارب اور قبیلہ لقمان کو مٹا دیا۔

اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ ایک قبیلہ کا مالک، یمن کا باشندہ اور عظمت وشوکت میں سباء کا مقابل، اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔ عرب میں لقمان نہایت مشہور تھا۔ اس کا صحیفۂ حکمت۔ خود عرب میں موجود تھا، اور لوگ اس کو پڑھتے تھے۔ ابن ہشام ذکر سوید و بیعت عقبہ میں تحریر کرتے ہیں۔

عاد کا ایک کتبہ جو 18ھ میں ملا تھا۔ اس میں چند فقرے حسب ذیل ہیں۔

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے ہیں اور ہودؑ کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوئے تھے اور اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں۔ یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفہ لقمان (لقمان کے اچھے فیصلے) ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ اس نیک دل بادشاہ کا جو حضرت ہودؑ کی شریعت کا متبع تھا۔ قرآن نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس کی نیکی اور دانائی کی شہادت دی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ

فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾ وَ اِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰهِ ؕؔ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾ وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡهِ ۚ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰی وَهۡنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیۡکَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۴﴾ وَ اِنۡ جَاهَدٰکَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّ اتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾ یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ انۡهَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾ وَ لَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ﴿۱۸﴾ وَ اقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ وَ اغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِکَ ؕ اِنَّ اَنۡکَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ ﴿۱۹﴾

یاد کرو، جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ فرزند من (میرے بیٹے) خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ شرک بڑے ظلم کی بات ہے (خدا کہتا ہے) ہم نے انسان کو حکم دیا ہے۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کریں۔ اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا، کمزوری پر کمزوری (اٹھائی)۔ دو برس کے اندر اس کا دودھ چھڑایا۔ اے انسان میرا اور اپنے باپ کا شکر گذار ہو۔ بازگشت میری طرف ہے۔ اگر والدین تجھ کو میرے شرک پر مجبور کریں تو ان کا کہنا نہ ماننا۔ لیکن دنیا میں نیکی کے ساتھ ان کے ساتھ رہنا اور ان لوگوں کا پیرو نہ بننا۔ جو میری طرف رجوع کرتے ہیں پھر میری طرف بازگشت تمہاری ہے۔ تو تم کو بتاؤں گا جو تم کیا کرتے تھے۔ اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کوئی چیز ہوگی اور وہ کسی چٹان کے اندر یا آسمان میں یا زمین میں ہوگی۔ تو وہ بھی خدا لے آئے گا۔ خدا بے شک باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ فرزند من (میرے بیٹے) نماز پابندی سے پڑھا کر اور نیک بات کی لوگوں کو ہدایت کیا کر اور بری بات سے روکا کر اور تجھ پر جب کوئی مصیبت آئے تو اس پر صبر کیا کر۔ یہ بری باتیں ہیں غرور سے لوگوں سے منہ نہ پھیرا کر اور نہ زمین میں اکڑ کر چل۔ یقین رکھ کہ خدا مغرور اور فخر کرنے والے کو پیار نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ اپنی آواز کچھ نرم کرو کہ بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

قوم ثمود کے تمدنی اور سیاسی حالات

نام و نمود کے اعتبار سے قوم ثمود، قوم عاد کی کامل اور لائق جانشین ثابت ہوتی ہے۔ تاریخوں سے ان کا پورا تقابل ثابت ہے۔ تحقیق کے ترازو میں دونوں قوموں کی شہرت کے پلے برابر ہیں۔ اکثر باریک بینوں نے ثمود کی سیاسی لیاقتوں میں کمی بتلائی ہے جو کسی قدر ثابت بھی ہے۔ مگر موازنہ کی دور بین نگاہیں جب باہمی اوصاف و کمال کا موازنہ کرنے بیٹھتی ہیں تو عاد سے ثمود کے تمدنی کمالات کو مضاعف پاتی ہیں اس لئے ثمود کی سیاسی کمی تمدنی اضافہ کمالات سے پوری ہو جاتی ہے۔ عاد کی حقیقی جانشینی ثمود کو حاصل تھی۔ قرآن مجید بھی اس حقیقت کا شاہد ہے۔

ترجمہ: ثمود! یاد کرو کہ خدا نے تمھیں عاد کے بعد جانشین بنایا۔

وجہ تسمیہ ثمود

ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے۔ ثمد عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی خاص مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ عبری میں ایک لفظ تامید ہے جس کے معنی ''دائم'' اور خالد کے ہیں۔ عربی ث اور عبری کی ت ایک چیز ہے۔ عبری میں ث نہیں ہے اس لئے وہ اکثر الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں۔ عبری میں ت سے ہیں۔ اس لئے ثمود کے معنی عام سامی زبان میں ہوں گے جو عربی میں خالد کے معنی ہیں۔ اور بہت سے قبائل عرب کے بھی نام ہیں۔

ثمود کی سکونت

قوم عاد، مشرق و جنوب کے ساحلی مقامات و علاقہ جات میں جو خلیج فارس سے لے کر حدود عراق تک پھیلے ہوئے ہیں، آباد تھی۔ اور ان پر بطور حاکمانہ متصرف بھی تھی۔ قوم ثمود ان کے مقابل مغربی و شمالی علاقوں میں سکونت پذیر تھی۔ ان کے مواطن و مساکن کو عموماً وادی القریٰ بتلایا جاتا ہے۔ اس بنا پر کہ ان کی سکونت کے مقامات اس علاقہ میں مختلف اور متفرق قطعات میں واقع تھے۔ ان کے افتادہ اور مسمار آثار عہد اسلام میں بھی مشاہدہ کئے گئے تھے اور آج تک بھی جا بجا پیش نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید نے وادی القری کو صرف وادی کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

ترجمہ: ثمود جو وادی (قری) میں پتھر تراشا کرتے تھے۔

ثمود کا دار الحکومت

قوم ثمود کا دار الحکومت الحجر تھا اور یہ تمام مغربی اور مشرقی مؤرخین و محققین کا مسلمہ اور مصدقہ ہے۔ یہ شہر حجاز سے شام کو جانے والے راستہ پر واقع ہے۔ اب اس شہر کو عموماً مدائن صالح کہتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قوم ثمود سیاسی قوت کے اعتبار سے عاد کے مقابل نہیں پائی جاتی، اس لئے کہ ان کے سیاسی حالات قابلِ

تحقیق نہیں ہیں۔مگران کوایک زبردست اور مقتدر قوم توسب نے تسلیم کیا ہے۔حقیقت یہ بتلاتی ہے کہ قوم ثمود ایک خاموش،تنہائی پسند اور صلح جولوگ تھے۔حکومت وامارت کے شائق وحریص نہ تھے۔اصول فطرت کی بناء پر ان کا خیال سیاست کے عوض صنعت اور عرب کے خاص مشغلہ تجارت کی طرف زیادہ منعطف ہوا اور دنیا کے کارناموں میں،جن کمالات کی وجہ سے ان کی یاد اور ان کا ذکر آج تک باقی ہے۔وہ ان کی صنعت ودستکاری ہے۔جو ان کے اعلیٰ تمدن کی شاہد ہے۔عمارت کے فن خاص میں یہ قوم عاد سے بہت آگے نظر آتی ہے،پتھروں کو خالی کرنے اور پہاڑوں کو اندر اندر کاٹ کر مکان بنانے اور ان کو مختلف قسم کے نقش ونگار سے سجانے میں ان کو کمال حاصل تھا۔آج بھی بے شمار امتداد ایام کے ان کی یہ باقیماندہ صنعتیں بڑے بڑے صناعان زمانہ کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔اور مشکل سے تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ اتنے قدیم زمانہ کے لوگ بھی ایسے نادر اور کمال صنعت پر قادر ہوتے تھے۔ان کی پتھروں کی عمارتیں،سنگین مقابر اور پہاڑ کی چوٹیوں پر کنوئیں ان کی بے انتہا صنعتوں کے ایسے آئینہ دار ہیں کہ وہ ملتے تو موجودہ زمانے والے ان کے ہاتھ چوم لیتے۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر فن عمارت کے کمال میں ان کا ذکر کیا ہے۔

ترجمہ:(صالح نے کہا) کہ اے لوگو۔خدا نے تم کو زمین میں جگہ دی۔جس کے میدانوں میں تم قصر ومحل اور پہاڑوں کو کاٹ کر بناتے ہو۔(اعراف)۔

سورۂ شعرا میں ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ: پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے ہو۔

ان کے مالدار اور ذی اقتدار ہونے کے متعلق اسی سورۂ شعراء میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

ترجمہ: خدا نے تمہاری مویشی،اولاد،چشمے اور باغوں سے مدد کی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ان کو جانور،باغات،پانی کے چشمے اور آل اولاد سب کچھ افراط سے دے رکھا تھا۔ان کے پاس خدا کے فضل سے وہ تمام چیزیں مہیا اور موجود تھیں۔جو دنیا میں متمول،خوشحال اور دولت مند قوموں کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

قوم ثمود کے مشہور آثاریہ

قوم ثمود کے حالات کا سب سے بڑا قدیم اکتشافی دفتر وہ کتبہ ہے۔جو 1834ء میں برآمد ہوا ہے۔یہ کتبہ قریب عدن،حصن غراب کے مقام میں پایا گیا ہے۔پانے والا ایک انگریزی افسر ولسٹد نامی (WELLSTED) ہے۔یہ پہلا کتبہ ہے جو عرب کی زمین میں یورپ والوں کے ہاتھ آیا ہے۔اس کا ہاتھ آنا تھا کہ یورپ بھر میں آثار قدیمہ عرب کے اکتشافات کی اولیت اور دنیا بھر کی جامعیت وقابلیت کے تعظیمی سہرے ولسٹڈ کے سر بندھنے لگے،اور محققین یورپ عرب کے ملکی اخبار وآثار کی نسبت اپنے کمال وقابلیت کے غل مچانے لگے۔حالانکہ ان سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے محققین عرب خود اس کتبہ کو پڑھ کر ترجمہ کر چکے تھے،اور اس کی کافی اطلاع ملک کی تمام اقطاع میں مشتہر ہو چکی تھی۔اگر زمانہ حال کے مستشرقین کو عرب کی قدیم تاریخ پر پورا علم حاصل ہوتا تو وہ اس کے متعلق اپنی اولیت کا دعویٰ نہ

کرتے۔ہم نے قوم عاد کے اجمالی حالات لکھتے وقت اوپر بتلا دیا ہے کہ یہ کتبہ امارت معاویہ کے زمانہ میں تقریباً 42 یا 43ھ میں پہلے پہلے دریافت ہوا تھا۔اس کے دو مصرعے ترجمہ کے ساتھ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔اصل کتبہ کی زبان اور خط، جنوبی عربی ہے جس کو غلط فہمی سے متاخرین نے حمیری بتلایا ہے۔اور اب عموماً زبان اور خط دونوں حمیری کہے جاتے ہیں۔اصل کتبہ اور اس کا انگریزی ترجمہ۔ پہلے پہلے ایشیائیٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا تھا۔اب ہم ذیل میں اس کا اردو ترجمہ قلمبند کرتے ہیں۔

ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے۔ ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی اُمنڈ آتا تھا۔سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضبناک ہوکر ٹکریں مارتا تھا۔ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغبان خشک چھوہارے ہماری وادیوں کے چھواروں کی زمینوں میں لگاتے تھے۔اور خشک چاول بوتے تھے۔ہم پہاڑی بکریوں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار پنجروں اور جالوں سے کرتے تھے اور مچھلیوں کو بہلا بہلا کر نکال لیتے تھے۔اور ہم خراماں خراماں رنگ برنگ کے ریشمی کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامے پہن کر چلا کرتے تھے۔ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔

ہودؑ (علیہ السلام) کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے قیامت کے راز اور قبر سے اٹھائے جانے پر ایمان رکھتے تھے، دشمن (رہزن) گھس آئے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو بہت دوڑایا اور ہمارے جوان، سخت اور نوکدار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ہمارے خاندان کے بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھی اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے۔ ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخم کر رہی تھیں اور چھدر رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوع انسان میں تھے۔

ہم نے اس کتبہ قوم ثمود کے تمام حالات کا دفتر اسی لئے بتلایا ہے کہ اس کی عبارت اور مضامین سے قوم ثمود کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، قومی، مالی، سیاسی اور فوجی سب ہی حالات تو پورے طور سے معلوم ہوجاتے ہیں اور صرف انھیں مندرجات سے ہر شخص ثمود کی قومیت ان کی قدامت وقوت اور اخلاق و معاشرت کا کافی طریقہ سے اندازہ کرسکتا ہے۔ان مضامین کو پڑھ کر آسانی سے سمجھ لیا جائے گا کہ تمدن و اخلاق، قوت و اقتدار کے اعتبار سے قوم عاد کی لائق اور قابل جانشین اور قائم مقام عرب میں ثمود ہی کی قوم تھی۔

قوم ثمود کی ترقی کا خاتمہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے پہلے ہوجاتا ہے۔اگرچہ کوئی تاریخ اس کا زمانہ متعین نہیں کرتی۔توریت بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔اور اس کا خالی ہونا اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ نزول توریت سے پہلے یہ قوم برباد ہوچکی تھی مگر قرآن مجید نے ان کے زمانہ کو صاف لفظوں میں بتلا دیا ہے۔حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے والا دیندار تابعین فرعون کو مخاطب کرکے تنبیہاً اور ہدایتاً موعظت کرتا ہے۔

بھائیو! مجھ کو ڈر ہے کہ دوسرے کافرانِ قوم نوحؑ قوم عاد اور قوم ثمود کی طرح تم پر بھی عذاب آئے۔

(سورہ مومن)

ان ارشادِ قرآنی اور الفاظ ربانی سے صاف طور پر ظاہر ہوگیا کہ قوم عاد کے بعد قوم ثمود کا زمانہ تھا اور قوم ثمود بعثت کلیم اللہ سے پہلے اپنی بربادی اور تباہی تک پہنچ چکی تھی۔ حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا زمانہ 1900 ق م کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر قوم ثمود کے عروج و زوال کو 1800 اور 1600 ق م کے تقریباً درمیان سمجھنا چاہیے۔

قوم ثمود کی بربادی

اس قوم کی بربادی کا باعث خدا کی ناراضگی تھی اور خدا کی ناراضگی کا سبب عام طور سے انسان کی بدافعالی اور کفر داری ہوا کرتی ہے۔ قوم ثمود دنیا سے باہر تو بستی ہی نہیں تھی کہ ان میں اور دنیا کے امم کے اثار و کردار نہ پیدا ہوتے۔ وہ عیوب و نقائص رفتہ رفتہ ان میں بھی پیدا ہو گئے۔ اور یہ بھی اپنی دنیاوی عروج و اقتدار کے عالم میں خدا اور اس کی عطا کردہ نعمات لامتناہی کو بھول گئے اور اس معبود حقیقی کو چھوڑ کر مختلف الاقسام غیر معبودوں کی پرستش کرنے لگے۔ اجرام فلکی کی عبادت شروع کر دی۔ قدرت الٰہی کے ذرے، آسمان کے ستاروں کو اپنا معبود قرار دینے لگے اور ان کے ناموں پر مختلف ملکی مقامات پر ہیکلیں (معابد) تیار کرنے لگے۔ جن کی عمارات و انتظامات میں ملک قوم کے بڑے بڑے مالی ذخیرے نثار کر دیئے گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی رسالت

اخلاقِ الٰہی نے اپنی قدیم عادت و دستور کے مطابق انھیں کی قوم و قبیلہ سے صالح نامی ایک نفس مقدس کو ان کی ہدایت و موعظت کے لئے منصب رسالت پر مبعوث فرمایا۔ محققین عرب حضرت صالحؑ کا سلسلہ نسب یہ بتلاتے ہیں۔

صالح بن عبید بن اسف ابن کماشج ابن عبید ابن جادر ابن ثمود ابن جاثر ابن ارم ابن سام بن نوح علیہ السلام۔

علماء یہود سے تو خصوصاً عرب کے تمام مشاہیر اور خصائص کو چھپاتے ہیں۔ اس لئے ان کی کتابوں میں نہ ثمود کا کوئی ذکر ہے نہ ان کے پیغمبر حضرت صالحؑ کا۔ ظاہری طور پر ان کی عدم واقفیت کا وہ یہ حیلہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زمانہ سے قبل ثمود کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ان کے تحریر حالات سے مجبور کہے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کا یہ عذر صرف حیلہ ہے۔ وہ توریت باب تکوین کو غور سے پڑھیں تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جب آفرینش عالم کے وقت سے سلسلہ بیان شروع کیا گیا ہے تو حضرت صالحؑ تو ہزار ہا سال پیچھے آئے ہیں پھر کیوں نظر انداز کئے گئے۔ یہ یہودیوں کی فروگذاشت ان کے اس خاص حسد و نفسانیت کو بتلا رہی ہے جو ان کو خصوصیات عرب کے مخفی رکھنے میں حاصل تھیں۔ مگر بایں ہمہ توریت کتاب التکوین۔ آیۃ 24 میں لکھا ہے کہ ارم کے بھائی ارفخشد کے ایک بیٹے کے نام صالح ہے۔ جو تمام اولاد ابراہیم اور عرب یقطانی کا باپ ہے۔

نصرانی پادری جو بزرگان تورات کی تاریخی ہستی کے اثبات کے لئے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے۔ روایات عرب اور قصص القرآن کا نام عام طور سے ان کی زبان میں افسانہ ہے۔ لیکن اگر خود ان کو ضرورت پڑے تو وہ تاریخ کی بلند ترین شہادت ہے۔ کہتے ہیں کہ صالح اور صاح ایک ہی شخص تھے۔ GOLD MINES P.278

بہرحال یہی نفس برگزیدہ قوم ثمود میں حجت الٰہی بن کر نمودار ہوا اور ان کی ہدایت کا ذمہ دار بنا حضرت صالح نے اس کا فرکیش قوم میں خدا کی دعوت شروع کی۔ بعضوں نے لبیک کہی اور اکثر لوگوں نے سختی سے انکار کیا اور اس کو جھٹلایا۔ بالآخر اس معجز نما حجت خدا نے پہاڑ کے عین جوف سے ایک ناقہ کو پیدا کر کے ان کے کفر پرستوں سے کہا کہ یہ اونٹنی آیت الٰہی ہے اور میں حجت الٰہی۔ اس کو فراغت و اطمینان سے زمین پر چرنے دو۔ چشموں کا پانی آزادی سے پینے دو۔ اور کمی آب کی وجہ سے اگر اس کا روزانہ پانی پینا تمہیں گوارا نہیں ہے تو یہ انتظام کر لو کہ ایک دن چشمے سے یہ پانی پئے اور ایک دن تم پیا کرو۔ اس معقول اور مصنفانہ انتظام کے بعد بھی اگر اس اونٹنی کو کوئی آزار پہنچایا گیا تو پھر عذاب الٰہی کو آیا ہی سمجھ لو۔

قوم ثمود میں دو قسم کے لوگ تھے۔ مومن اور غیر مومن۔ مومنین کی جماعت نے جو تعداد میں کافرین سے بہت کم تھی۔ حضرت صالحؑ کے ارشاد کی تصدیق اور تعمیل کی۔ مگر کثیر الافراد گروہ کافرین نے بدبختی سے پھر انکار کیا اور ان میں نو آدمیوں کی شقیق القلب اور بے رحم جماعت نے یہ صلاح ٹھہرائی کہ حضرت صالحؑ اور ان کے متبعین پر شبخون مار کر خدا پرستوں کا خاتمہ کر دیں۔ انھوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر مار ڈالا۔ خدا نے اپنے پیغمبر اور اس کے متبعین کو کافروں کی ایذا رسانیوں سے بال بال بچا لیا۔ اور اس کفر شعار قوم پر اپنے دردناک عذاب کو زلزلہ کی صورت میں اس شدت کے ساتھ نازل فرمایا کہ قوم ثمود میں سوائے متبعین صالحؑ کے اور کسی کا وجود ہی باقی نہیں رہا۔ یہ واقعہ تقریباً 2107 دنیوی اور 1797 ق م کے اس زمانہ میں واقع ہوا۔ جس زمانہ میں شہر سدوم، گمارہ، اوماب اور زمائن آسمانی آگ سے جلا دیئے گئے تھے۔

قرآن مجید کی خاص خصوصیات میں ان امور پر ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کتب سابقہ کا جس طرح مصدق ہے اسی طرح ان کے نظر انداز واقعات کی کمی کا پورا کرنے والا اور متمم بھی ہے۔ اور یہی جناب خاتم الانبیاءؐ کی ختم رسالت ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اس غرض سے قرآن مجید نے قوم ثمود کے حالات اور جناب صالحؑ کے ارشاد و ہدایات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس سے پہلے کی کتب مقدسہ ان کے ذکر سے بالکل خالی تھیں۔

مفصلہ ذیل اقتباسات قرآنی میں مذکورہ بالا حالات ملاحظہ ہوں۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

ثمود کے پاس ہم نے ان کے بھائی (ہم قوم) صالحؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ اس نے کہا کہ بھائیو خدا کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے تمہارے پاس خدا کی دلیل آچکی ہے، یہ اونٹنی تمہارے لئے خدا کی نشانی ہے اس کو خدا کی زمین میں چرنے دو۔ اس کو دق نہ کرو ورنہ ایک دردناک

عذاب تم پر آئے گا۔(الاعراف)

حضرت صالحؑ نعمات الٰہی یاد دلا کر قوم کو موعظت فرماتے ہیں:

وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

اور یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے عاد کے بعد تم کو خلافت وحکومت بخشی اور ملک میں تم کو جگہ عنایت کی جس کے میدانوں میں تم محل تیار کراتے ہو اور پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے ہو۔ خدا کی عنایتوں کو یاد کرو اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو۔الاعراف)

مومنین صالح کے ساتھ کافروں کے مکالمات:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

قوم کے مغرور سرداروں نے ان کمزوروں سے جو ان کی قوم میں مومن تھے پوچھا کہ تم سچ مچ یقین رکھتے ہو کہ صالحؑ اپنے خدا کی طرف سے پیغمبرؑ ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ بے شک صالحؑ جو پیغام لے کر بھیجا گیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔(سورۃ الاعراف)

اس قوم کی سیہ قلبی اور بے رحمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

مغروروں نے کہا کہ تم جس پر ایمان لائے ہو،ہمیں اس سے انکار ہے۔اس کے بعد انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور صالحؑ سے (تعریضاً) کہا کہ اے صالحؑ اگر تم واقعی پیغمبرؑ ہو۔تو جس عذاب آنے کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو وہ لے آؤ۔پس زلزلہ نے آ کر ان کو پکڑ لیا اور وہ اپنی جگہ پر اوندھے رہ گئے۔صالحؑ نے ان کی جانب سے منہ پھیرا اور کہا بھائیو۔میں اپنے خدا کی رسالت یقیناً تم کو پہنچا چکا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کر چکا ہوں۔لیکن تم اپنے خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں

کرتے۔(سورۃ الاعراف)

رسالت صالحؑ اور ان کی نرم موعظت اور صاف ستھرے طریقہ ہدایت، ناشنوا قوم اور جاہل و غافل امت کی شامت اور تباہی و بربادی کی آخری نوبت اجمالی طور پر یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

ثمود نے پیغمبروں کی تکذیب کی، جب ان کے بھائی صالحؑ نے کہا کہ کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے۔ میں تمہارا رسول امین ہوں خدا سے ڈرو میری بات مانو اور میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ پروردگار عالم پر ہے۔ کیا جو نعمت تم کو یہاں حاصل ہے اسی میں تم باطمینان تمام چھوڑ دیئے جاؤ گے۔ ان باغوں، کھیتوں اور چشموں میں اور ان چھوہاروں کے درختوں میں جن کے خوشے ہیں اور پہاڑوں کو کاٹ کر تم بڑی بڑی عمارت بناتے ہو۔ پس خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور سنو اور ان کی نہ سنو جو حد سے گذر چکے ہیں جو ملک میں صلح نہیں بلکہ فساد پھیلاتے ہیں۔ انہوں (کافروں) نے کہا کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے تم تو ہماری ہی طرح ایک آدمی ہو۔ کوئی نشانی لاؤ۔ اگر سچے ہو اس نے کہا یہ اونٹنی ہے، اس کے لئے پینا ہے اور تمہارے لئے ایک مقرر دن کا پینا اس کو چھیڑو نہیں۔ ورنہ ایک بڑا عذاب تم پر آئے گا۔ انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں پھر نادم ہوئے۔ پس عذاب نے ان کو آلیا یقیناً اس میں عبرت کی نشانی ہے اور ان میں سے اکثر مومن نہ تھے اور خدا تو غالب اور رحم والا ہے۔(سورۃ الشعراء)

حضرت صالحؑ اور ان کے متبعین مومنین کے قتل کرنے کی مشورت:

ترجمہ: اور البتہ ہم نے بھیجا ثمود کے پاس ان کے بھائی صالح ؑ کو، کہ خدا کی عبادت کرو۔ نا گہاں وہ دو فریق ہو کر جھگڑنے لگے۔ صالح نے کہا کہ بھائیو! نیکی سے پہلے برائی اور وہ بھی بہت جلد کیوں چاہتے ہو۔ کیوں خدا سے مغفرت نہیں چاہتے۔ شاید تم پر رحم کیا جائے انہوں نے کہا کہ ہم نے تم سے اور تمہارے ساتھیوں سے شگون لیا اس نے (صالح ؑ نے) کہا کہ تمہارا شگون خدا کے پاس ہے۔ بلکہ تم لوگ آزمائش میں ڈالے جاؤ گے۔ شہر میں نو آدمی تھے۔ جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے صلح نہیں۔ انہوں نے کہا آؤ۔ باہم خدا کی قسم کھائیں کہ ہم صالح ؑ اور صالح ؑ کے خاندان پر شبخون ماریں۔ پھر اس کے وارث کہہ دیں گے کہ اس کے خاندان کے قتل میں تو ہم شریک بھی نہ تھے۔ انہوں نے مخفی تدبیر کی، خدا نے بھی مخفی تدبیر کی اور انہیں خبر نہیں پس دیکھو ان کی مخفی تدبیروں کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے ان کو اور ان کی قوم سب کو برباد کر دیا یہ ہیں ان کے گھر اور مسکن جو ان کی گنہگاری کے باعث ویران پڑے ہیں۔ اس میں جاننے والوں کے لئے بڑی عبرت ہے اور ایمان والوں کو ہم نے اجازت دی کیونکہ وہ پرہیز گار تھے۔ (الاعراف)

قوم ثمود کی ضلالت شعاری پر عبرت و تنبیہ فرمائی جاتی ہے اور پیغمبرؐ کے حق میں ان کی دریدہ دہنی دکھلائی جاتی ہے۔

ترجمہ: ثمود نے ہماری تنبیہوں کو جھٹلایا اور بولے کہ ہم میں سے ایک آدمی ہے اس کی ہم پیروی کرنے جائیں! اس وقت ہم گمراہ اور جنوں ہوں گے۔ کیا ہم لوگوں میں سے وحی اسی پر چن کر آئی ہے۔ نہیں وہ جھوٹا اور مغرور ہے۔ ہم اونٹنی کو ان کے لئے امتحان بنا کر بھیجتے ہیں۔ اے پیغمبر تو بھی تاک میں رہ نہ اور انہیں خبردار کر دے کہ پانی ان میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ہر ایک کا پانی الگ موجود ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھی کو بلایا۔ اس نے پکڑا اور کونچ کو کاٹا پھر میرا عذاب اور میری دھمکی کیسی تھی۔ ہم نے ان پر ایک چیخ بھیجی جس کے اثر سے وہ پامال بھس کی طرح ہو کر رہ گئے۔۔ (القمر)

جناب ہودؑ کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے کہ کافروں کی بدبخت قوم اپنے پیغمبرؐ کے بار بار سمجھانے اور دلائل حقہ کے جھٹلانے سے عاجز آ جاتی تھی تو احقاق قرابت ہم قومی اور ہم وطنی پیش کر کے اس حجت الٰہی کو تبلیغ رسالت سے باز رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت ان کی شان ملتجیانہ اور عاجزانہ ہوتی ہے۔ نہ مغرورانہ، نہ سرکشانہ۔ جناب صالح ؑ کے ساتھ بھی ایسے ہی معاملات پیش آئے۔ مفصلہ ذیل الفاظ قرآنی سے ہمارے بیانات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا

لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ۝

ثمود کے پاس ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا اس نے کہا کہ بھائیو! خدا کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین ہی پر تم کو آباد کیا۔ اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگو۔ پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ میرا پروردگار (سب کے) قریب ہے اور (سب کا) قبول کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا۔ صالح، ہم کو اس سے پہلے تمہاری ذات سے بڑی توقع تھی۔ تم ہم کو اس چیز سے روکتے ہو۔ جس کو ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے تم جس طرف ہمیں بلاتے ہو اس میں تو ہم کو بڑا شک ہے۔ سورہ ھود

وہ خدا کا برحق پیغمبر کس متانت واستقلال سے ان کی گمراہانہ تحریص وتعریض کا جواب دیتا ہے۔ اور عذاب الٰہی سے بچنے اور توبہ وانابت کر لینے کی غرض سے صرف ان کو تین دن کی مہلت ملنے کا آخر حکم خداوندی سناتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ۝ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ۝

صالح نے کہا بھائیو! تم سمجھتے ہو، اگر خدا کی طرف سے میں بصیرت پر ہوں اور اس نے اپنی رحمت سے مجھ کو اس میں سے کچھ عنایت کیا ہے تو اگر میں اس کی پیغام رسانی میں اس کی نافرمانی کروں تو خدا سے بچانے میں میری کون مدد کرے گا۔ تم صرف میرا نقصان بڑھاؤ گے۔ اور ہاں اے بھائیو! یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے۔ اس کو زمین پر چرنے دو۔ اور اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ ورنہ خدا کا عذاب بہت جلد تم کو آئے گا۔ انہوں نے (جب) اس کی کونچ کاٹ ڈالی تو صالحؑ نے کہا کہ اب اپنے گھر میں تین دن اور لطف اٹھالو۔ یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے۔ سورہ ھود

قوم ثمود کے بدبخت کفار اس آخری تنبیہ وتہدید پر بھی باز نہ آئے بالآخر قدرت کا فیصلہ آگیا اور کافرین ایک ایک کر کے تباہ کر دیئے گئے۔ جناب صالحؑ اور ان کے مومنین تابعین بال بال بچا لئے گئے۔ ذیل کے اقتباسات قرآنی سے ان حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ۝ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ

جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝
جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے صالح اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے ان کو ذلت وخواری سے نجات بخشی۔ بے شک تیرا پروردگار زبردست اور غالب ہے اور گنہگاروں کو چیخ نے آلیا پس اپنے گھر میں سینہ کے بل پڑے رہ گئے۔ گویا کہ کبھی وہ ان گھروں میں آباد ہی نہ تھے۔ ہاں ثمود نے اپنے پروردگار کو نہ مانا، ہاں ثمود کے لئے ہلاکت ہے۔ سورہ ھود

یہی باقیات الصالحات جو حضرت صالحؑ پر ایمان لائے اور ان کے ساتھ تباہی و بربادی سے بالکل محفوظ رہے وہی معمورۂ عالم میں ثمود ثانیہ کے تخصیصی اور امتیازی لقب سے مشہور ہوئے۔

ثمود ثانیہ کے تاریخی حالات

تاریخ کے کارناموں میں عاد ثانیہ سے ثمود ثانیہ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ اس لئے کہ دیگر اقوام قدیمہ سے وہ قریب تر بستے تھے اور زمانہ تہذیب وتمدن سے بھی ان کے زمانہ کو قربت تھی۔ اسی باعث سے ان کا ذکر اسیریا (شام) اور روم کے اخبار وآثار دونوں میں پایا جاتا ہے۔

روم کی تاریخ میں۔ رومی مسیح سے کچھ یوں ہی پہلے عرب سنگستان پر جو مقام ثمود سے متصل ہے اور اس وقت انباط اور ادوم اُن اطراف کے ممتاز قبائل تھے۔ قابض تھے۔ (Beudn P173)

سرجون یا شرغون ثانی نے فتح عرب کا جو کتبہ اپنی یادگار چھوڑا ہے اور جس کو اس تاجدار شام نے اپنی فتح مندی اور قوت سلطنت کا معیار قائم کیا ہے۔ اس میں محض مفاخرت کے اظہار سے قوم مفتوح کا بھی نام لکھا ہے۔ اسی فہرست اقوام مغلوبہ میں۔ ثمود کا نام بھی مندرج ہے۔ Forester Vol II P 125

روم و یونان کے مؤرخین ہیں ڈائڈورس (DYDORIOUS) (80 ق م) پلینی (PLANY) 97ء اور بطلیموس (Plotmy) 140ء نے ثمود کا ذکر کیا ہے۔ ڈائڈروس نے ثمود کا تلفظ تھموڈینی (THAUMBANI) کیا ہے۔ اور بطلیموس نے تھموڈاٹٹ (Thamudite) کیا ہے۔ اور ابھی تک تمام یورپین زبانوں میں اسی تلفظ کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ان غیر قومی مؤرخین نے جو مساکن اور مواطن ثمود ثانیہ کے اپنی کتابوں میں بتلائے ہیں وہ بالکل وہی ہیں جو عرب کے قدیم مؤرخین نے اپنی ملکی روایات کے اسناد سے لکھے ہیں۔

ایک دوسرا یونانی مؤرخ اوردینوس (Urdnus) ثمود کے ذکر میں لکھتا ہے۔

رومیوں نے جب عرب شمالی پر قبضہ کیا تو ثمود رومیوں کی فوج معاون میں داخل ہو گئے تھے۔ قیصر جسٹینین (Justinian) کے عہد میں 527، 565 ثمود بھی رومی افواج میں شامل تھے ان کے لمبے نیزے اور سواری کے اونٹ مشہور تھے۔ Gibbons Vol I

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمود کے ملک کا اکثر حصہ چونکہ اہل مدین نے پہلے دبا لیا تھا اور باقی حصہ پر بعد کو انباط قابض ہو گئے تھے۔ اور رومی انباط کے خلاف عرب پر فوج کشی کا ارادہ رکھتے تھے اور اس ارادہ کو انہوں نے پورا بھی کیا اس تقریب سے عجب نہیں کہ

انباط کی مخالفت میں ثمود نے رومیوں کا ساتھ دیا ہو۔

تاہم تعجب ہوگا کہ ثمود کا ذکر تورات میں نہیں۔لیکن تورات کی تحریر سنین جاننے کے بعد یہ تعجب رفع ہوجائے گا۔تورات کی تاریخ بدر عالم سے حضرت یعقوبؑ (بنو ابراہیم) تک محدود ہے اس کے بعد ہجرت مصر کا واقع ہے۔جو تقریباً 1600 ق م میں واقع ہوا ہوگا۔اس زمانہ سے تا عہد موسیٰ جو تقریباً 450 برس کا زمانہ ہے۔جو تورات کی کامل خاموشی کا زمانہ ہے اور از روئے تاریخ ثمود کے عروج وزوال کا یہی زمانہ ہے۔اس کے بعد تورات میں صرف ان غیر اقوام کا ذکر ہے۔جن سے بنی اسرائیل کے سیاسی تعلقات تھے۔اور یہ رتبہ ثمود کی جگہ اب مدین کو حاصل تھا۔جو ثمود اولیٰ کے جانشین تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 900 یا 1000 ق م میں اہل مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیۃً برباد ہوگئے۔تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور (اسیریا) نے شمالی عرب پر حملہ کرکے ثمود سے 700 ق م میں خراج وصول کیا تھا۔اس کے بعد ظہور مسیح سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کر لیا۔اس کے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہوگئے۔اور اسی خصوصیت سے تاریخ میں ثمود کا ذکر آیا۔

اسلام جب آیا تو ثمود کا نام ونشان بھی نہ تھا۔یہاں قبائل جہینہ، دئلی اور یہود اس وقت آباد تھے۔عجب کیا کہ انباط نے خیانت وطنی کی سزا میں ان کو برباد کر دیا ہو۔

طسم وجدید۔عرب کے دو مشہور وقدیم قبائل

یہ دونوں قبائل یمامہ میں رہتے تھے یہ کلبی کی روایت ہے اور زیادہ مشہور ہے۔مؤرخ ابن خلدون نے ان کو بحرین میں جگہ دی ہے صحیح یہ ہے کہ خلیج فارس پر یمامہ۔بحرین۔اور عمان کے نام سے جو شہر آباد ہیں طسم وجدیس کی آبادی ان سب پر مشتمل تھی۔حقیقتاً قوم عاد کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔سیاسی قوت اولاً طسم کے ہاتھ میں تھی۔ایک زمانہ کے بعد عملوق نام ایک ظالم بادشاہ تخت نشین ہوا۔جس نے اپنے شرمناک قواعد سے۔قبائل جدید کو برہم کر دیا۔بالآخر جدیس کی ایک خاتون عروس نے قبیلہ کو غیرت دلائی۔یہ غیرت آگ بن کر اٹھی۔طسم نے شاہ یمن سے مدد مانگی۔اس نے جدیس کو شکست دے دی آخر قبائل کی باہمی نااتفاقی نے ملک غیروں کے سپرد کر دیا۔ابوالفداء طبری اور ابن ہشام اور اغانی وغیرہم۔

یونانیوں نے قبائل عرب میں سے ایک کا نام جولسٹی (JOLISTAI) لکھا ہے شاید اس سے جدیس مراد ہو۔طسم کا نام ہلاکت و بربادی کی عبرت کے لئے اس قدر مشہور ہوگیا ہے کہ عربی زبان میں۔طسم کے معنی ''ہلاکت وبربادی'' ہوگئے ہیں۔عرب جاہلیت کا ایک شاعر سلمی ابن ربیعہ کہتا ہے۔

اھلکن طسما و بعدہ، غذی بھم و ذاجدون، واھل جاش و مارب، وحی لقمان و التقون۔

ترجمہ: حوادث زمانہ نے طسم کو۔اور اس کے بعد ذاجدون شاہ یمن کو۔اور اہل جاش اور اہل م آرب کو اور

قبیلہ لقمان کو...... ہلاک کیا۔

اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ طسم کا زمانہ سبا (اہل م آ رب) اور عاد ثانیہ (وحی لقمان) سے متقدم تھا۔ تعجب ہے کہ اس تفصیل مدت اور تعین زمانہ کے بعد بھی مؤرخین عرب نے اس بادشاہ یمن کا زمانہ قائم کرنے میں غلطی کی ہے جو جدیس کے خلاف طسم کی امداد کے لئے آیا تھا۔ مؤرخین عرب نے اس شاہ یمن کا نام تبع حسان یا جشان (باختلاف راویت لکھا ہے۔ اور یہ یقینا غلط ہے۔ ایک طرف یہی ارباب روایت ان قبائل کو اتنا قدیم ٹھہراتے ہیں کہ ان کو ارم کے صرف بدوواسطہ اولاد قرار دیتے ہیں۔ یعنی تین یا چار ہزاروں ق۔م ان کا زمانہ بتلاتے ہیں اور یا اس قدر پیچھے کرتے ہیں کہ تبابعہ یمن کا معاصر قرار دیتے ہیں ہیں۔ جس کا زمانہ 115 ق۔م سے اوپر نہیں جاتا۔ غالباً تبع یمن سے عام شاہ یمن مراد ہے۔

یمامہ کا قدیم نام جوا ہے۔ لیکن زیادہ تر اپنے قصبہٴ حکومت کے نام سے مشہور ہے۔ جس کا نام ''قریہ'' اور ''حجر'' ہے قریہ اور حجر لفظ دو ہیں۔ لیکن معنی ایک ہیں۔ ابن الحائک ہمدانی یمنی۔ جو عرب کی قدیم زبانوں سے واقف تھا۔ کہتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کے معنی آبادی کے ہیں۔ قدیم عربی میں حجر لفظ تھا۔ بعد کی عربی زبان میں اس کے لئے قریہ کا لفظ استعمال ہوا جو حجر کا بعینہ ترجمہ ہے۔

یمامہ میں آثار قدیمہ کے نشان جغرافیہ نویسان اسلام کے عہد تک باقی تھے۔ اور انھوں نے خود ان کو مشاہدہ کیا تھا۔ نجران اور بحرین کے درمیان ایک پہاڑی ہے۔ اس پر مشقر نام ایک قلعہ ہے جو طسم کی طرف منسوب ہے۔ ایک اور عمارت ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ جس کا نام معنق۔ وہ بھی طسم ہی کی یادگار ہے۔ شموس بھی اسی قسم کی ایک عمارت ہے قریہ بنی سدوس۔ یمامہ میں ایک مقام ہے۔ یہاں اوپر سے نیچے تک تراش کر پتھر کی ایک پوری عمارت بنائی گئی ہے۔ ایک اور عمارت شبل حجر کے نام سے ہے۔ اس عمارت کا حصہ زیرین مربع الشکل ہے۔ اور بلندی 80 ہاتھ کے قریب ہے۔ جعدہ نام ایک اور قلعہ یہاں بنا ہوا ہے، قدیم کی یادگار ہے۔ ان تمام عمارات ومقام کے نام معجم البلدان یاقوت میں موجود ہیں۔ خدا جانے ان آثار کا اب کس قدر حصہ باقی ہے۔ تاہم اگر یہ کل یا ان میں سے بعض بھی طسم و جدیدکے مصنوعات ہوں تو ان قبائل کی عظمت وتمدن کے دلائل نہایت واضح ہیں۔

ان مقامات پر یونانیوں یا رومیوں نے کبھی حملہ نہیں کیا۔ سکندر کے بعد جب عراق میں سلونی (سلوکس) خاندان قائم ہوا تو اس نے صرف ایک بار 205 ق م میں اہل قریہ پر تھوڑی سی فوج کے ساتھ حملہ کی جرأت کی تھی۔ قبائل قدیمہ یمامہ و بحرین کی بربادی کے بعد ایک مدت تک یہاں ویرانی رہی۔ تا آنکہ اسماعیلی اور قحطانی عربوں نے ادھر رخ کیا۔ ربیعہ اسماعیلی کی ایک شاخ عنزہ ابن اسد اور کہلان قحطانی کی بعض اولاد نے بحرین پر اور بنوحنیفہ نے یمامہ پر قبضہ کیا۔ اسلام آیا تو بحرین فارس کے قبضہ میں تھا اور ان کی طرف سے ایک عرب خاندان نائب حکومت تھا اور یمامہ بدستور بنوحنیفہ کے قبضہ میں تھا۔

عرب الآربہ (عرب متوطن)

عرب العاربہ یا عرب متوطن۔ یقطان ابن عابر بن سالح بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اس لئے یہ صحیح ہے کہ عرب العاربہ بھی عرب البائدہ سے علیحدہ اور غیر قوم نہیں ہیں۔ بلکہ عرب البائدہ کے اس شجرہ میں جو ابھی ابھی اوپر قلمبند ہوا ہے۔ اس میں سام کے تین بیٹے دکھلائے گئے ہیں۔ عیلام۔ لود اور ارم اور بھی گویا عرب البائدہ کے مورث اعلیٰ ثابت ہوئے ہیں۔ انھیں تینوں بیٹوں کے ساتھ۔ سام کے چوتھے بیٹے۔ ارفخشد بھی قائم ہوتے ہیں۔ جن سے عرب العاربہ کا نسب نامہ ملتا ہے۔ اس بنا پر عرب البائدہ اور عرب العاربہ اگرچہ فرعاً جدا سمجھے بھی جائیں تو اصلاً ایک ہی ہیں۔

یقطان۔ عبرانی لفظ ہے۔ عرب اسی کو قحطان کہتے ہیں۔ توریت مقدس کے کتب خمسہ میں یہ لفظ یقطان مرقوم ہے اور انجیل میں۔ جو یقطان ''جو'' کے قلیل اضافہ کے ساتھ۔ محقق ریونڈ مسٹر فارسٹر (Rev Hr FORCSTOR نے نہایت مستحکم دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ ان تینوں نام۔ قحطان۔ یقطان اور جو یقطان سے ایک ہی شخص مراد ہے جس کو عرب قحطان کہتے ہیں۔ موسائی۔ یقطان اور عیسائی جو یقطان۔

بعض مؤرخین کا یہ قول کہ عرب البائدہ اور عرب العاربہ دونوں قحطان کی نسل سے ہیں۔ اسی طرح صحت سے قطعی ساقط ہے۔ جس طرح سیرت ابن ہشام میں بعض اہل یمن کا یہ دعویٰ کہ بنو قحطان بھی بنی اسماعیل میں داخل ہیں۔ مسٹر فارسٹر کے علاوہ یورپ کا مشہور و معروف برک ہروٹ اور سر ولیم میور بھی اس امر پر متفق ہیں کہ قحطان ہی کی اولاد تمام عرب میں پھیلی۔ اس لئے تمام عرب اس شخص کی اولاد میں داخل ہیں۔ ہمارے نزدیک یقطان کے ساتھ حضرت اسماعیلؑ کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تحقیق میں نقص رہ جاتا ہے۔ ابن ہشام نے اس مقام پر پورے غور سے کام لیا ہے اور لکھ دیا ہے۔ **فالعرب کلھا من قحطان و اسماعیل**علیہ السلام۔ تمام عرب قحطان اور اسماعیلؑ سے ہے۔

قحطان کی جائے سکونت۔ توریت میں میشیا سے لے کر ستفار تک بتلائی گئی ہے سنفار یا ستفار مشرق میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔ مسٹر بروک ہروط کی تحقیق میں میشیا اور موزہ۔ جو یقطانی قوم سبا کا خلیج عرب کے دہانے کے قریب ایک بندرگاہ ہے۔ ایک ہی مقام ہیں۔ اور شفنار سے یمن کا وہ کوہستانی حصہ مراد ہے۔ جہاں جغرافیہ بطلیموسی کے شہر سنفار اور قوم صفارا آباد تھی۔ ان حدود کے اعتبار سے یہ قطعہ زمین رقبہ میں کل ڈیڑھ سو میل ہوتا ہے۔ اس بنا پر فارسٹر صاحب کو تامل ہے کہ ایسے تنگ علاقہ میں قحطان کی کثیر التعداد اولاد کیسے آباد ہوئی ہوگی۔ اس لئے وہ خواہ مخواہ علاقہ نجد میں اور اس کے آس پاس والے اندرونی حصہ میں پھیل گئے ہوں گے۔ یہ حقیقتاً صرف قیاسی استدلال ہے۔ توریت میں ان کے مقام و سکونت کی سمت بتلا دی گئی ہے۔ ان کے موطن و مسکن کی اصلی حد اور خاص رقبہ محدود کر دیا گیا ہے۔ جس میں کسی قیاسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔

قحطان کے تیرہ بیٹے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ الموداد۔ شلف۔ حضرماؤت۔ یرج۔ یدورام۔ اوزال۔ رقلاہ۔ عو یال۔ بایمائیل۔ شبا۔ اوفر۔ ویلاہ اور بو یاب۔ ان میں سے ایک ہر ایک کے حالات اور سکونت کے مقامات علیحدہ علیحدہ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

(1) الموداد

اس شخص کا خاندان یمن میں یا عرب المعمور میں اور اس ضلع میں جو بحرین تک چلا گیا ہے۔آ باد ہوا۔اور اس المودائی سے مطابقت رکھتا ہے۔جس کو بطلیموس نے یمن کی درمیانی قوم لکھا ہے۔

(2) شلف

یہ شخص کوہ ذا اس کے مغربی حصہ میں یا اُس وسیع میدان میں جو درمیان کاظم اور مدینہ کے مابین واقع ہے۔آ باد ہوا۔ یہ قوم بطلیموس کی بیان کی ہوئی سالفنی قوموں سے مطابقت رکھتی ہے عربوں میں یہ قوم بنی سالف مشہور ہے۔جو عبرانی شیلف کی عربی شکل ہے۔

(3) حضر ماُ وت

اس قوم نے اپنی سکونت کے لئے دوز رخیز قطعات زمین کو جو خلیج فارس کے برابر برابر پھیلے ہوئے ہیں اختیار کیا تھا اور وہ آج تک حضر موت ان کے اصلی نام سے یادگار ہیں۔ یہ لوگ رومیوں کے نزدیک اور یونانیوں کی کتابوں میں اپنی وسیع تجارت فن جہاز رانی اور معرکتہ الآرا جرأت و بہادری کے لئے مشہور تھے۔

(4) یرح

(اس شخص کا حال ہم سب سے آخر میں لکھیں گے۔)

(5) پدورام

اس کی اولاد نے مشرقی حصہ ملک میں جگہ لی اور وہیں آباد ہوئے۔قصبہ مدینہ اس قوم کی یادگار ہے۔مؤرخ ابوالفدا کا بیان ہے کہ صوبہ دارقرامطالب کی بنا اسی قوم سے ہوئی ہے۔

(6) اوزال

یہ خاندان اوزال میں آباد ہوا۔ جسے اب صنعا کہتے ہیں۔ جو علاقہ یمن کا سب سے زیادہ سر سبز و شاداب علاقہ ہے۔(کتاب خرقیل باب27 درس19)

(7) وقلاہ

یہ قوم بھی یمن میں آباد ہوئی۔ذوالخلاعہ جو یمن کی قوم ہے اور جس کا ذکر مسٹر پوکاک(Mr. POCOCKE) نے بھی کیا ہے۔اسی کی اولاد میں ہے۔

(8) عوبال

اس کا نشان عرب میں نہیں پایا جاتا۔مگر فارسٹر صاحب بتلاتے ہیں کہ یہ قوم افریقہ کو چلی گئی۔

(9) ابیمائیل

بہت سے مختلف آ ثار جو مختلف اشخاص نے اس قوم کی سکونت کے متعلق بتلائے ہیں۔وہ اس کے شاہد ہیں کہ یہ قوم بنی سالف کے مقام سکونت اور حجاز کے قرب و جوار میں متوطن تھے۔

(10) شِبا

اگرچہ یہ قبیلہ بھی جنوب کی طرف جا بسا اور یمن میں سکونت پذیر ہوا۔مگر یہ شبا وہ شِبا نہیں ہے۔جس نے یمن میں خاندان سبا کی سلطنت قائم کی۔اکثر مؤرخین عرصہ دراز تک اس غلطی میں پڑے رہے۔اور دونوں کو ایک ہی سمجھتے رہے۔وہ دوسرا شبا عرف عبدالشّمس تھا۔جس نے خاندان سبا کی سلطنت قائم کی اور شہرم آرب اور شہر سبا کو بنایا۔جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(11) اوفر

یہ قوم عمان میں جو سبا کے پورب ہے۔آباد ہوئی چنانچہ شہر اوفر میں اُن کے نشانات آج تک پائے جاتے ہیں۔(توریت کتاب الملوک باب 9 درس 25)

(12) حویلاہ۔

یہ شخص ٹھیک شمال میں شہرم آرب میں آباد ہوا۔

(13) یویاب

یہ بھی م آرب کے جانب روانہ ہو کر اسی کے نواح میں آباد ہوا۔قوم چوبانی۔جس کا بطلیموس نے ذکر کیا ہے اور جس کو بنی جو بار کہتے ہیں۔اسی کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

جرھ کے تحقیقی حالات

جرھ۔مرقومہ بالا پسران قحطان کے ذکر غیر اسلامی مؤرخین کی تالیفات سے مستنبط کئے گئے ہیں حقیقت میں عربی مؤرخین قحطان کے اتنے بیٹوں میں سے۔صرف دو بیٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔یعرب اور جرھم کا چند مؤرخین کی رائے ہے کہ یعرب اور یرح سے ایک ہی شخص مراد ہے۔اگر چہ یہ قاعدہ ہے کہ عربی میں۔جیم اور ے کا تبادلہ ہوتا ہے۔مگر تاہم جرھم کے متعلق مؤرخین کی رایوں میں اختلاف ہے۔کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔لیکن بالآخر جمہور کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ یعرب اور جرہم دونوں یرح کے بیٹے تھے۔یورپین مؤرخین۔جان اسٹرابو۔(JHON STRABO) اور مسٹر جارج سیل GEROGESALE مشہور مترجم قرآن بھی اسی کے قائل ہیں۔لیکن مؤرخ ابوالفدا اپنی تاریخ میں ایک مقام پر یعرب اور جرہم کو دو مختلف اشخاص بیان کرتا ہے اور دوسرے مقام پر جہاں وہ مختلف اقوام عرب کے متفرق شعبوں کا ذکر کرتا ہے۔وہاں جرہم کو تنہا تمام عرب کا مورث اعلیٰ بتلاتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بھی یعرب اور جرہم دو متفرق ناموں سے ایک ہی شخص مراد لیتا ہے اور حقیقتاً یعرب کی بہت سی شاخیں بنی جرہم میں آکر ملجاتی ہیں۔

بہر حال مشرقی مؤرخین نے اس مسئلہ کو بالکل غیر مفصل چھوڑ دیا ہے۔مگر فارسٹر صاحب نے بڑی قابلیت سے اس کو ثابت کیا ہے کہ جرہم اور یعرب ایک ہی شخص تھے۔انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں لکھ دیا ہے کہ ستر مترجموں نے اس نام کو جرح لکھا ہے۔سینٹ جروم St JEROUM نے جیرا اور حال کے عربوں نے جرح۔سرح۔شرح۔اور زہران لکھا ہے۔پھر باقاعدہ تہجی ان ناموں کی مطابقت بیان کر کے صاحب موصوف لکھتے ہیں۔

> علی العموم جو شہادت خود عرب بھی اپنے جرہم ہونے کیلئے پسر قحطان کے ساتھ دیتے ہیں۔
> اس کی تصحیح و تصدیق کتاب بطلیموس میں۔غیر مبدل توراتی نام کے درج ہونے سے واقع
> ہوئی ہے اور یہ ایک ایسی مثال ہے۔جس کا ہم کو بارہا حوالہ دینا پڑا۔یعنی بطلیموس کے اس
> فقرے کا انسیولا جزا چیوری۔جس کا ترجمہ ہے۔جزیرہ بنی جرھ۔جو حجاز کے کنارے
> سے دور ایک جزیرہ ہے۔

مرقومہ بالا دلائل کی رو سے جرہ اور جرہم کی مطابقت تسلیم کر لینے میں ہمیں بھی کوئی کلام نہیں۔چنانچہ عرب العاربہ کے شجرہ انساب میں ہم ان دونون کو ایک ہی شخص قرر دے کر یعنی یرج، یا یعرب۔جرھ یا جرہم ان کا شجرہ لکھیں گے حقیقت میں عرب العاربہ کی تاریخ اس شخص کی اولاد اور ان کے اولاد و اعقاب سے پرُ اور مملو ہے کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اسی شخص کی اولاد و ذریّت تھے جنھوں نے مختلف قوم و قبائل میں منقسم ہو کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور زبردست سلطنتیں اپنی اعلیٰ تدبیر اور بیش بہا رنظام ملکی کی کامل لیاقت اور پوری مہارت کے ثبوت میں قائم کیں۔جن کو ہم بڑی تلاش و تحقیق سے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔مگر قبل اس کے کہ ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان کو شروع کریں۔ہم کوی بتلا دینا ضروری ہے کہ ان کی سلطنتوں کا صحیح زمانہ بتلانا مشکل ہے۔اول تو اس وجہ سے کہ ان

حالات کا استنباط اکثر زبانی اور سینہ بستیہ ماخذوں سے کیا جاتا ہے۔ جو غلطیوں سے خالی نہیں کہے جاسکتے۔ دوسرا ماخذ مؤرخین عرب کے اقوال ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایہ توریت کے یونانی ترجمہ پر منحصر ہے۔ یونانی ترجموں کی یہ حالت ہے کہ جب اصل عبرانی عبارت توریت سے ملائے جاتے ہیں۔ تو زمانوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ عیسائی ملکوں میں یونانی ترجموں پر عبرانی ترجموں کو ہمیشہ ترجیح دی جاتی ہے اور عبرانی توریت کے زمانے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ اس کے زمانے بھی شبہوں سے خالی نہیں۔ تیسری دقت یہ آ لگی ہے کہ مؤرخین عرب نے عبرانی اور یونانی دونوں ترجموں کی زبانوں کو ایسا خلط ملط کر دیا ہے اور اس وجہ سے اس زمانہ کے تاریخی سلسلہ میں ایسی گتھی ڈال دی ہے کہ واقعات کا سلجھانا دشوار ہوگیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ایک عجیب وغریب اضافہ یہ کرتے ہیں کہ کسی واقعہ میں تو اپنی زبانی اور یادداشت کے مطابق اس کا زمانہ قائم کرتے ہیں۔ اور کسی میں محض یونانی ترجموں کا دیا ہوا وقت بتلاتے ہیں کیا کوئی تجربہ کار محقق اور واقف کار مؤرخ کہہ سکتا ہے کہ ان تمام دشواریوں پر غالب آ جانا اور ان تمام اولجھاؤں کو سلجھانا کوئی معمولی اور آسان کام ہے۔

ہم نے اپنے سلسلہ بیان میں ان دقتوں کے آسان کرنے کے لئے تین طریقے اختیار کئے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم نے واقعات کی تحقیق میں توریت کے عبرانی ترجمہ کو پیش پیش رکھا ہے۔ کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ جن فنون وعلوم اوران کے تمام اوصاف کے متعلق جب اخبار وآثار قدیمہ سے تعلق مطابقت اور تلاش کی ضرورت آ پڑتی ہے تو پھر تمام ذی لیاقت اور صاحب جامعیت حضرات۔ عام اس سے کہ مغربی مؤلفین ہوں یا مشرقی مصنفین۔ علاوہ اس کے اسی ترجمہ عبرانی کو آگے رکھتے ہیں۔ دوسرا طریقہ ہم نے قوم عرب العاربہ کے ہر واقعہ کو قوم بنی اسرائیل کے حالات سے مقابلہ کرنے کا اختیار کیا ہے اور اس طریقہ سے ہم کو واقعات عرب کا صحیح زمانہ قائم کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ تیسرا طریقہ جو ہم نے آخر میں اختیار کیا ہے وہ اصل میں تو وہی دوسرا طریقہ ہے۔ مگر ہم نے اس کو زیادہ وسیع کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ واقعات عرب کو ہم نے دیگر ممالک اور اقوام کے ان واقعات سے مقابلہ بھی کرلیا ہے جو قریب قریب ایک وقت میں واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ اگر واقعہ عرب کا سال نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس کے ہم وقت واقعہ کا جو کسی غیر ملک اور قوم میں واقع ہوا ہے۔ صحیح زمانہ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے تو اس سے ہم کو عرب کے واقعہ کا صحیح سال وقوع معلوم ہوجاتا ہے۔

بہر حال اتنا تمہیداً لکھ کر ہم اپنے سلسلۂ بیان کو۔ پہلے عربی ماخذوں کی نقل سے آغاز کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی مؤرخین کی تحقیق کا بھی اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

اول من نزل الیمن قحطان بن عامر بن شالخ و قحطان المذکور اول من ملك ارض الیمن ولیس التاج۔ (ابن الفدا)

قحطان پہلا شخص ہے جو یمن میں آباد ہوا۔ اس کا نام قحطان بن عامر بن شالخ ہے۔ اور یہی قحطان ہے جس نے سب سے پہلے یمن میں حکومت کی اور تاج شاہی پہنا۔

تاج شاہی کی ایجاد اسی وقت سے ہوئی۔ محققین کے نزدیک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہی شخص قحطان (یقطان فالغ کا بھائی تھا۔ اس

لئے قحطان کی تاریخ پیدائش سے بہت دور ہوں گی۔اس بنا پر قحطان کی تاریخ ولادت قریب 1757ء دنیوی یا حضرت مسیحؑ سے دو ہزار دوسو برس قرار پاتی ہے۔اس زمانہ میں نمرود پسر کوش ملک بابل (اشوکا) کا بادشاہ تھا۔اور حام ابن مصر ہم ملک مصر کا۔اسی وقت یعنی 1757 دنیوی یا2200 ق م میں قحطان یمن کا بادشاہ ہوا۔

ثم مات قحطان و ملك بعده ابنه يعرب ابن قحطان

قحطان مر گیا تو اس کا بیٹا یعرب ابن قحطان بادشاہ ہوا۔

محققین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ یعرب کے قبضہ میں یمن اور حجاز کے صوبے بھی آ گئے تھے اور یہی یعرب اس وقت بنی جرہم کے نام سے مشہور تھے۔فارسٹر صاحب نے اس امر کی تحقیق میں کہ جرہم پہلے یمن میں آباد تھا۔بہت سی معقول وجہیں پیش کی ہیں اور اس صوبے کے اکثر مقامات کو جرہم کے خاص نام سے موسوم ہونے کا ثبوت پہنچایا ہے۔ان میں سب سے مستند اور معتبر ثبوت یہ ہے کہ جرہم کی کنیت ابوالیمن قرار پائی ہے۔

جرہم کے بعد۔جرہم کا بیٹا۔یشحب تخت پر بیٹھا۔مؤرخ ابوالفداء لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعده ابنه يشحب بن يعرب ثم ملك بعده ابنه عبد الشمس ابن يشحب وسمي سبا وهو الذي بنا السد بارض مآرب

اس کے بعد یشحب ابن یعرب (جرہم) بادشاہ ہوا۔اور اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالشّمس بادشاہ ہوا۔یہی عبدالشّمس سباء اکبر مشہور ہے۔جس نے سد مارب بنوائی۔

سبا۔یہی شخص یمن کے مشہور وقدیم سلطنت سبا۔اور شہر سبا۔اور شہر مآرب اور سد وغیرہ کا بانی ہے۔مؤرخ ابوالفدا آگے لکھتے ہیں۔

ولما مات سبا ملك اليمن بعده ابنه حمير ابن سبا

جب سبا مر گیا تو حمیرا اس کا بیٹا یمن کا بادشاہ ہوا۔

چونکہ حمیر قحطان سے چوتھی پشت میں تھا اور ترح بھی قانع سے چوتھی ہی پشت میں تھا۔اس لئے یہ نتیجہ نکالنے کے ہم مختار ہیں کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے کچھ دور نہیں ہوگی۔یعنی 1858دنیوی یا2126ق م میں تقریباً اس کی ولادت ہوگی۔

اب دیکھو۔ترح کے تین بیٹے تھے۔ابرام (ابراہیمؑ) ناحور اور حاران حمیر کے بھی تین ہی بیٹے تھے۔واثل۔عوف اور مالک۔اس بنا پر ترح اور حمیر کی اولادوں کو باہم ہمعصر خیال کرنا چاہیے۔یعنی یہ 1948دنیوی اور2025ق م میں وہ تھے۔واثل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔اب اول اسی مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً دیکھی گئی ہے لحاظ کر کے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط بن حاران پر غور کر کے۔سکک اور فاران کی تاریخ ولادت قرار دی جائے۔جو1878دنیوی اور2126ق م میں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سے تیس برس قبل قرار پاتی ہے۔واثل اپنے باپ کا جانشین ہوا۔اور عوف کسی جگہ حجاز اور نجد کے درمیان کے آباد ہوا۔

ابوالفدا اءاس سلسلہ بیان میں آگے لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعده (اى حمير) ابنه واثل ابن حمير ثم ملك بعده ابنه السكسك ثم وثب على ملك اليمن ذورياش وهو عامر ابن باران (فاران) باران (پاران) ابن عوف ابن حمير

حمیر کے بعد اس کا بیٹا واثل۔اس کے بعد اسکا بیٹا سکسک تخت نشین ہوا۔پھر ملک یمن پر ذوریاش جس کا نام عامر ابن فاران ابن عوف ابن حمیر تھا۔قابض ہو گیا۔

ہم اوپر بتلا آئے ہیں کہ عوف حجاز اور نجد کے درمیان کسی مقام پر آباد ہوا۔یہ امر اس سے ثابت ہے کہ آج تک جبل عوف جو نجد کے پچھّم واقع ہے۔عوف کے نام سے مشہور ہے۔عوف کے نام سے مشہور ہی نہیں بلکہ ماخوذ ومستخرج بھی سمجھنا چاہیے۔قرینہ صاف صاف بتلا رہا ہے کہ فاران ابن عوف بھی اپنے باپ کے پڑوس میں آباد ہوا۔یعنی اس وادی غیر ذی زرع میں جہاں فی الحال مکہ معظّمہ واقع ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فاران کا اطلاق صرف اسی وسیع شمالی بیابان پر نہیں ہوتا ہے جو قادیش تک چلا گیا ہے بلکہ ان پہاڑوں پر بھی ہوتا ہے جو ان میں واقع ہیں۔بلکہ ان پہاڑوں ہی کی وجہ سے اس وسیع میدان کو فاران کا میدان کہہ سکتے ہیں۔تمام مشرقی مؤرخ اور وہ لوگ جو قدیم روایتوں کے معتقد ہیں۔اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے علاوہ توریت مقدس میں بھی صاف صاف مذکور ہے کہ یہی نواح بنام فاران مشہور ہے۔

چونکہ اس مضمون سے ہماری کتاب کے تمام مدعائے تالیفی کا آغاز ہوتا ہے۔اور گویا یہی مضمون ہمارے بیان کا سرِ عنوان ہے۔اس لئے ہم فاران ابن عوف کا حال کسی قدر تفصیل سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

تاریخ ابوالفدا اء، 1881ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر چھپی ہے۔اس کے صفحہ 14 میں لفظ فاران اس شکل میں (باران) چھپا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض یہودی اپنی زبان میں ف کو پ سے تلفظ کرتے ہیں اور عرب جہاں پ کو دیکھتے ہیں اس کو ب سے تلفظ کرتے ہیں۔فاران کے سر پر یہی مصیبت گزری تھی،اصل میں ف یہودیوں نے پڑھا اور پھر یہودیوں سے جب عربوں نے پڑھا تو اس پ کو ب بنا دیا۔عربی سے لاطینی ترجمہ چھپنے کے وقت غلطی سے ب کا نقطہ چھوٹ گیا۔اور فاران کی (باران) یہ مہم صورت ہو گئی۔

بہر حال مغربی اور مشرقی تمام مؤرخین کے اتفاق سے یہ امر ثابت ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا۔بات یہ ہے کہ حرف نے جس مقام پر سکونت اختیار کی تھی وہاں ندرت اور قدرت کی خصوصیت کا کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جو اس کی شہرت کا باعث ہوتا۔مگر چونکہ اس مقابلہ میں فاران کے کوہستانوں اور اس کے گرد تمام میدانوں کو ظہور قدرت کی تجلی گاہ بننا تھا۔اور یہیں سے تمام اقطاع عالم میں افوار وحدانیت اور اخبار و آثار روحانیت پھیلاتا تھا۔اس لئے فاران کو کوہستان اور اس کے میدان عظمت و حرمت کے عرش الکمال تک ایسا پہنچے کہ اب فاران بن عوف کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔اس تازہ تعلق اور نئی نسبت سے اس کو یہ برکت حاصل ہوئی کہ اب اس کا نام کردوں عقیدتمندوں کی زبانوں کا وظیفہ ہے اور اس کی خاک ان کی دیدہ عقیدت اور چشم حقیقت کا سرمہ۔

اتنا لکھ کر ہم پھر اپنے قدیم سلسلہ پر آ جاتے ہیں۔ مؤرخ ابوالفدا لکھتے ہیں۔

ثم نهض من بنی وائل النعمان ابن يعفر ابن السكسك ابن واثل ابن حمير واجتمع عليه الناس وطرد عامر بن باران عن الملك واستعمل النعمان المذكور بملك اليمن ولقب النعمان المذكور المعافر (ابو الفدا)

بنی وائل سے ایک شخص نعمان ابن یفر ابن سکسک ابن وائل ابن حمیر پیدا ہوا۔ اور اس پر تمام قوم نے اجماع کیا۔ اور عامر بن باراں کو ملک سے نکال کر نعمان کو تخت شاہی پر بٹھلایا اور اس وجہ سے اس کا لقب المعافر قرار پایا۔ (ابوالفدا)

اس شخص کے زمانہ سلطنت میں مغربی اور مشرقی مؤرخین نے بالا تفاق لکھا ہے کہ جب سکسک ابن واثل کے بعد اس کا بیٹا یعفر تخت نشین ہوا۔ تو اس کے چچازاد بھائی عامر الملقب بہ زوریاش ابن فاران ابن عوف نے جو حجاز میں آباد ہوا تھا۔ یعفر کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اور اس کا ملک فتح کر لیا۔ لیکن یعفر کے بیٹے نعمان نے عامر کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ اور اپنی سلطنت واپس لے لی۔ اس کارنمایاں کو جلد و میں اس کو المعافر کا لقب دیا گیا۔ اس قاعدے کے مطابق جس کی رو سے امم سابقہ کی تاریخ ہائے ولادت قائم کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعفر ابن سکسک اور عامر ابن فاران اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ ولادت قریب قریب ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئی۔ اب جو قدرتی قاعدہ پشتوں کے تعداد توالد و تناسل کا ہے اس کے مطابق ہم نعمان کے زمانہ پیدائش کو دریافت کر سکتے ہیں۔ جس کا وقوع 1535 دنیوی یا 1996ء قبل مسیح قرار پاتا ہے۔

اس پچھلے زمانہ کے پینتالیس برس بعد۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام اور اسے جو قوم کالدی (CHILDIA) سے متعلق تھا۔ ہاران کو جو عراق عرب میں واقع ہے۔ بلائے گئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا زمانہ ہے۔ جس کے متعلق جمیع واقعات سے ہم اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کر سکتے ہیں کہ عامر اور نعمان کی جنگ اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی۔ اس لئے یہ مستنبط ہوسکتا ہے کہ یہی وقت تھا جب نعمان نے عامر کو نکال کر اپنے آبائی تخت کو حاصل کیا تھا۔ یعنی 2038 دنیوی 1921 ق م میں۔ اس کے آگے ابوالفدا لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعده ابنه الشمح بن المعافر المذكور ثم ملك بعده شداد ابن عاد ابن الماط ابن سبا و اجتمع له الملك وغزا البلاد ان بلغ اقصى المغرب و بنى المدائن والمصانع وابقى الاثر العظيم

نعمان کے بعد اس کا بیٹا اشمح بن المعافر (نعمان) تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد شداد ابن عاد ابن ماط ابن سبا تمام ملک پر مسلط ہوگیا۔ اس نے اور ملکوں پر بھی چڑھائی کر دی اور انتہائے مغرب تک کے تمام ممالک مفتوح کر لئے۔ شہر مدائن کو بسایا اور اس نے بہت سے آثار عظیم اپنے بعد یادگار چھوڑے۔

مؤرخین نے اس عاد کو بھی غلطی سے عاد اولیٰ سمجھ کر اس کے واقعات کو ان کے حالات سے ایسا خلط ملط کر دیا ہے کہ سطحی اور سرسری دیکھنے والوں کو تمیز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ شداد ابن ماط ابن عبدالشّمس الملقب بہ سبا اکبر کی اولاد میں ہے۔ چونکہ اس سے پہلے اس نام کے دو شخص اور گذر چکے ہیں۔ اس لئے محققین نے اس شداد کو عاد ثالث کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ عربی نسابین نے غلطی سے سبا اکبر اور شداد کے فیما بین صرف دو نام لکھے ہیں۔ ایک عاد اور ماطاط۔ حالانکہ باعتبار امتداد ایام اور فاصلہ انساب کم سے کم پانچ نام اور ہونے چاہئیں ان عربی نسابین کی غلطی اس وجہ سے ہے کہ ان کے تمام مضامین کا اصلی ماخذ عرب کے اشعار قدیم ہیں۔ اور شعرا کا یہ ہمیشہ سے دستور چلا آتا ہے کہ وہ کسی قبیلہ یا قوم کے سلسلہ میں خاص کر انھیں لوگوں کے حالات و اوصاف قلمبند کرتے ہیں جو کسی خاص صفت سے موصوف و مشہور ہوتے ہیں اور باقی لوگوں کو قابل ذکر نہیں سمجھ کر قلم انداز کر دیتے ہیں۔ ان کی فروگذاشت کی وجہ شعرائے قدیم کی یہی کوتہ قلمی سمجھنی چاہیے۔

شداد نے کسی وقت یمن پر حملہ کیا ہو؟ مشکل سے صحیح مانا جا سکتا ہے۔ اتنا البتہ کہا جا سکتا ہے کہ نعمان کی تخت نشینی سے چند سال بعد یا اس کی وفات سے تھوڑے ہی زمانہ میں۔ شام کے پانچ بادشاہوں نے آپس میں جنگ شروع کر دی۔ توریت مقدس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کا اثر عرب پر بھی پڑا تھا۔ چنانچہ توریت کے فارسی ترجمہ کی عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

در سال چہاردہم کدر لاعو۔ مرد ملوکے بھمراہش بودند۔ رفائیاں را وعشر وث قرنیم۔ وز
دزیاں را در ہام وایمیاں را ورشادہ قریا تایم شکست داوند و نیز حوریاں را در کوہ خود
شان سعیر تا اہل پاران کہ درنزدیک صحرا ست۔ و برگشتہ بہ عین شپاط کہ قادیش است
آمدند و تمامی مرز بوم عمالیقیان وہم اموریاتی کہ درحصون تامار۔ ساکن بودند۔ شکست
دادند۔ سفر تکوین باب 14 درس 05۔76

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ حملہ آور لوگ قادیش کے شمال سے آئے ہوں گے۔ کیونکہ سعیر کے پہاڑ اس جگہ سے شمال میں واقع ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قادیش کے جنوب میں دور جا کر فاران میں چلے گئے۔ جس سے آج تک حجاز مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس بیان کے کہ حملہ آور پاران سے قادیش کو لوٹ گئے۔ کچھ بھی معنی نہ ہوتے۔ اگر کہیں کہ یہ لوگ مغرب کے جانب گئے ہوں گے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اس طرف صرف بنی عملیق رہتے تھے۔ جن سے کہ ان حملہ آوروں نے اپنی پہلی مہم سے قادیش کو واپس آنے کے بعد جنگ کی تھی۔

اس وقت اشحع کی حکومت اور عملداری صوبہ یمن تک پھیل گئی تھی۔ چونکہ یہ زمانہ اس کی حکومت کی ابتداء کا تھا۔ اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا حملہ کی وجہ سے اس کی طاقت میں کس قدر ضعف آ گیا ہو۔ جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ یمن کے اس ضعف و شکستگی کی حالت میں۔ شداد نے جو ہمیشہ ایسے موقع کا منتظر رہا کرتا تھا۔ اشحع پر حملہ کیا ہو۔ اور اس کو حکومت سے بے دخل کر دیا ہو۔ ان وجوہ کی بنا پر اس کا یقین ہوتا ہے کہ اشحع 2091 دنیوی یا 1913ء قبل مسیح میں تخت نشیں ہوا تھا اور شداد نے 2092 دنیوی یا 1912 ق م میں اس کی سلطنت کو

چھین لیا تھا۔ اور یہ زمانہ اس عام قاعدے سے جو علم انساب میں پشتوں کے پیدا ہونے کے لئے قرار دیا گیا ہے۔ بالکل مطابق ہوتا ہے۔
اس کے آگے مؤرخ ابوالفداء لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعد اخوه لقمان ابن عاد ثم ملك بعده اخوه ذوشدد ابن عاد ثم ملك بعده ابنه الحرث بن ذوشدد و يقال له الحارث الرايش

اس کے بعد اس کا بھائی لقمان ابن عاد بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بھائی ذوشدد ابن عاد تخت پر بیٹھا تھا۔
اس کے بعد ذوشدد کا بیٹا الحارث ملقب بہ الرائش تھا تخت پر بیٹھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شداد کے بعد اس کے دونوں بھائی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ذوشدد کے بعد اس کا بیٹا الحرث بادشاہ ہوا۔ اس زمانہ تک اور اس کے بعد بھی بہت دنوں تک وہاں دو خود مختار سلطنتیں قائم رہیں۔ ایک یمن میں دوسری حضرموت میں بال آخر ایک دوسرا شخص۔ جس کا نام ہی الحارث اور لقب بھی الرائش تھا۔ تخت پر بیٹھا۔ اس شخص نے ان دونوں سلطنتوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ اس موقع پر بھی مؤرخین نے دونوں حارثوں کو اکٹھا کر دیا اور حارث اوّل کی طرف حارث دوم کے جمع السلطنین والے واقعہ کو منسوب کر دیا۔ اس غلطی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان دونوں حارثوں کے مابین جتنے نام تھے وہ بالکل معدوم اور لامعلوم ہو گئے۔ ان کی اس غلطی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ جو زمانہ ان بادشاہوں کا گذرا ہے اور جو تعداد بادشاہوں کی بتلائی گئی ہے۔ وہ امتداد زمانہ کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے۔ تاریخ حمزہ اصفہانی کی اس عبارت سے کہ بین الرائش والحمیر خمس عشر ابا۔ حمیر اور اور رائش کے درمیان پندرہ پشتوں کا فاصلہ ہے۔'' ہمارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس محقق ''حمزہ اصفہانی) کو بھی ان پندرہ پشتوں میں سے کسی ایک کا بھی نام معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اگر ہم بیان صدر پر اعتبار کریں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا ہوتا ہے کہ الحارث ابن ذوشدو اور الحارث الرائش کے درمیان سات آٹھ بادشاہ گذرے ہیں۔ حمزہ اصفہانی الحارث الرائش کے متعلق لکھتے ہیں۔

الحارث الرائش هو الحارث بن قيس بن صيفي بن سبا الاصغر الحميري و كان الرايش اول غزا منهم و اصاب الغنائم و ادخل الارض اليمن فارتاشت حمير فی ايامه و كان هو الذی راشهم فبذلك سمي الرائش

حارث۔ الرائش کا اصل نام حارث ابن قیس ابن صیفی بن سبا الاصفر حمیری ہے۔ اور یہ رائش اول بار اہل یمن سے لڑا۔ مال غنیمت حاصل کیا۔ اور تمام ارض یمن پر قبضہ کر لیا۔ اور قوم حمیر اس کے زمانہ میں بہت خوشحال ہو گئی۔ اس خصوصیت سے اس کا لقب رائش (پالنے والا) مقرر ہوا۔

اس میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ یہی الرائش، یمن اور حضرموت۔ دونوں سلطنتوں کے ایک کرنے کا موجد ہوا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اسی شخص کو تبع الاول بھی کہتے ہیں۔

سلسلہ بیان میں مؤرخ ابوالفدا آگے بیان کرتے ہیں۔

ثم ملك بعده انبه ذوالقرنين۔ الصعب ابن الرائش ثم ملك بعده ابنه۔ ذوالمنار ابرهه ابن ذوالقرنين ثم ملك افريقش ابرهه ثم ملك بعده ذوالاد غار عمر بن ذوالمنار ثم ملك بعده شرحيل بن عمر بن غالب بن المنتات بن زيد بن يعفر بن سكسك بن وائل بن حمير۔ ثم ملك بعده ابنه الهدها بن شرحيل ثم ملك بعده بنته بلقيس بنت الهداد و بقيت فى ملك اليمن عشرين سنة وتزوجها سليمان ابن داؤد۔ (ابو الفداء)

الرائش کے بعد اس کا بیٹا۔صعب ابن الرائش۔جس کا لقب ذوالقرنین تھا تخت نشین ہوا۔ذوالقرنین کے بعد اس کا بیٹا افریقش تخت نشین ہوا۔اس کے بعد عمر ابن ابرہہ بادشاہ ہوا اس کا لقب ذوالادغار تھا اس کے بعد اس کا بیٹا شرحیل ابن عمر ابن غالب ابن منتات بن زید بن یعفر بن سکسک بن وائل بن حمیر بادشاہ ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا الہدہاد بن شرحیل بادشاہ ہوا۔ہدہاد کے بعد اس کی لڑکی بلقیس بنت ہدہاد ملکہ یمن ہوئی۔اس ملکہ نے یمن میں بیس برس حکومت کر کے حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کے ساتھ شادی کر لی۔

ہم حضرت سلیمان و بلقیس کے تفصیلی واقعات اور ملوک حمیر کے کامل تاریخی حالات۔اپنے موجودہ سلسلہ بیان کے خاتمہ پر پوری تشریح سے درج کریں گے۔ان حالات کی فوری تفصیل موجودہ سلسلۂ بیان کے نظام میں ایک ناگوار بدترتیبی پیدا کردے گی۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ الرائش یا تبع الاوّل کے بعد اس کا بیٹا صعب ملقب ذوالقرنین اس کے بعد ابرہہ ملقب ذوالمنار اس کے بعد افریقش۔اس کے بعد عمر ملقب بہ ذوالاغار۔یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ذوالادغار کے عہد میں شرحیل نے اس پر حملہ کر دیا۔اور بے شمار خونریزیوں کے بعد۔ذوالادعار کو شکست دی اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔شرحبیل کے بعد اس کا بیٹا الہدہاد جانشین ہوا۔اس کے بعد ملکہ بلقین تخت پر بیٹھی اور بیس برس سلطنت کر کے اس ملکہ نے حضرت سلیمان ابن داؤد۔بادشاہ یہود سے شادی کر لی۔اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے 3000 دنیوی یا 10005 ق م میں پایا جاتا ہے۔اس لئے نسلوں کے پیدا ہونے کے قاعدہ متعینہ کے مطابق الحارث الرائش اور صعب ذوالقرنین یا تو اٹھائیسویں صدی ونبوی کے آخر میں یا اونتیسویں صدی دنیوی کے آغاز میں گذرے ہوں گے۔یعنی حضرت مسیح سے تیرہ سو برس قبل ذوالقرنین کی شخصیت اور خصوصیت کے متعلق مؤرخ ابوالفدا کی تحقیق حسب ذیل ہے۔

وقد نقل ابن سعيد المغربى ان ابن عباس يسئل عنه عن ذوالقرنين الذى ذكره الله تعالىٰ فى كتابه العزيز فقال هو من حمير وهو صعب المذكور فيكون

ذوالقرنين المذكور فى الكتب العزيز هو الصعب ابن الرائش المذكور الاسكندر رومى

ابن سعید مغربی کا بیان ہے کہ جب حضرت ابن عباسؓ سے اس ذوالقرنین کی نسبت پوچھا گیا۔جس کی نسبت قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ صعب حمیری تھا۔اس دلیل سے ظاہر ہے کہ جس ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔وہ صعب ابن الرائش ہے۔نہ اسکندر رومی۔ابوالفدا ء تاریخ یمن کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشہور ومعروف سدیمن کی تعمیر کا کام اسی ذوالقرنین کے وقت میں اختتام کو پہنچا۔تاریخ یمن کی عبارت یہ ہے۔

وكان اول من اسس السد سبا الاكبر واسمه عامر و قيل عبد الشمس بن يشحب بن يعرب بن قحطان ثم بناه حمير بن سبا بعد موت ابيه ثم اتمه بعد ذلك ذوالقرنين الحميرى وهو الصعب ابن ابى مرايد وكان السد من جبل المآرب الى الجبل الا بلق و هما جبلان مليقان على الجبال الشافخة المتعد من يمين السد و شماله (العقود اللولويه فى اخبار دولة السولية اليمنى)

اس سد کی بنا سبا اکبر نے شروع کی تھی اس کے بیٹے اور جانشین حمیر نے اس کو جاری رکھا اور ذوالقرنین نے اسے اختتام تک پہنچایا۔یہ سد۔دو پہاڑوں کے درمیان میں تھی۔ایک کا نام مآرب دوسرے کا ابلق۔ اور یہ دونوں پہاڑ دوسرے پہاڑوں کے مقابلہ میں باعتبار رفعت کے زیادہ بلند ہیں اور بہت دور تک۔سد مذکور کے داہنے طرف سے بائیں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

سد مارب کے تفصیلی حالات بھی ہم سلاطین حمیر کے احوال کے ساتھ لکھیں گے۔اس مقام پر ہم کو تاریخی سلسلۂ بیان کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ملکہ بلقیس سے آگے اس شاہی سلسلہ کے ذکر میں مؤرخ ابوالفدا لکھتے ہیں۔

ثم ملك بعدها ابن عمها ناشر النعم بن شرحبيل ثم ملك بعده شمر برعش بن ناشر النعم ثم ملك بعده ابنه ابو مالك ابن شمر ثم ملك بعده عمران ابن عامر الازدى ثم ملك بعده اخره مزبقيا

بلقیس کے بعد۔اس کا چچازاد بھائی ناشر النعم بن شرحبیل تخت نشین ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا شمر برعش بادشاہ ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا ابو مالک ابن شمر بادشاہ ہوا۔اس کی سلطنت میں عمران ابن عمر ازدی

نے حمیر سے سلطنت چھین لی۔عمران کے بعد اس کا بھائی مزبقیا بادشاہ ہوا۔

واقعہ یوں ہے کہ حکومت یمن شمر برعش کے زمانہ ہی سے اندرونی نقائص کی بنا پر ضعیف ہوتی چلی آ رہی تھی۔ابو مالک کے وقت میں اس کا ضعف واضمحلال کا یہ حال پہنچ گیا کہ قبیلہ ازد کے سردار عمران ابن عمر نے ایک خفیف حملہ کے بعد تمام مملکت پر قبضہ کر لیا۔اسی وقت سے حکومت یمن سلسلہ حمیر سے نکل کر بنی کہلان میں منتقل ہوگئی۔عمران ابن عمر کے بعد اس کا بھائی مزبقیا حکمراں ہوا۔یہ بالکل ضعیف اور نا قابل حکومت شخص تھا۔اس کے وقت میں الاقرن ابن ابو مالک نے اپنی سلطنت ابائی کا دعویٰ کیا۔اور مزبقیا سے لڑ کر اس کو شکست پہنچائی اور سلطنت چھین لی۔حکومت یمن۔چندروز کے لئے عارضی طور پر بنی کہلان کے قبضہ میں رہ کر پھر سلسلہ حمیری میں لوٹ آئی اس کے آگے تاریخ ابوالفدا کا سلسلہ بیان یہ ہے۔

ملك الاكرن ابن ابو مالك ثم ملك بعده ذوحبشان بن الافران ثم لملك بعده اخره تبع اكربن الافرن ثم ملك بعده ابنه كليكرب بن تبع ثم ملك بعده ابو كرب سعد وهو تبع اوسط و قتل ثم ملك بعده ابنه حسان بن تبع ثم قتله اخوه عمر وابن تبع وملك نسمى ذوالاعواد ثم ملك بعده تبع بن حسان كلكرب وهو تبع الاصغر ثم ملك بعده ابن اخته الحارث ابن عمر و تهود الحارث المذكور ثم ملك بعده فريد ابن كلال ثم ملك بعده وكبعه ابن مژيد

اقرن بن ابو مالک کے بعد اس کا بیٹا ذوحبشان بن اقرن بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بھائی تبع اکبر تخت نشین ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا کلیکرب۔اس کے بعد اس کا بیٹا ابوکرب سعد۔تبع اوسط اس کے بعد اس کا بیٹا حسان اس کے بعد اس کا بھائی عمر ذوالاعواد اس کے بعد اس کا بیٹا حسان اس کے بعد اس کا بیٹا عبد کلال تخت نشین ہوا۔تبع ابن حسابن ابن کلیکرب ملقب بہ تبع الاصغر نے عمر ذوالاعواد سے سلطنت چھین لی۔تبع الاصغر کے بعد اس کا بھانجہ الحارث تخت نشین ہوا۔حارث نے مذہب یہود اختیار کیا حارث کے بعد مڑید ابن سکلال اور مڑید کے بعد دکیعہ ابن مڑید بادشاہ ہوا۔

تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حارث نے مذہب یہود اختیار کر لیا تھا اور اس کی وجہ سے حارث کے بعد والے بادشاہوں نے بھی مذہب یہود قبول کیا۔یہ واقعہ اس طرح صحیح مانا جاسکتا ہے کہ بخت نصر فلسطین کو فتح کر کے اور بیت المقدس کو مسمار کر کے حضرت دانیالؑ اور ان کے دوستوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا اس وقت تک کچھ یہودی بچ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔اس زمانہ میں حضرت دانیالؑ اور حضرت یرسیاہؑ پیغمبر تھے۔اس لئے یہ بات نہایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان مغرور یہودیوں کی وجہ سے الحارث نے خدائے واحد کا اقرار کیا ہوگا۔اور مذہب یہود کو قبول کر لیا ہوگا۔اور یہ امر واقعی ہے کہ الحارث اور وکیعہ اسی زمانہ میں حکمراں تھے اور یہ زمانہ 3400

دنیوی یا604ق م نسلوں کے پیدا ہونے کے فطرتی طریقہ حساب سے بالکل اعتبار کے قابل اور صحیح ثابت ہوتا ہے۔

اس کے آگے مؤرخ ابوالفدا کا مفصلہ ذیل سلسلہ بیان قائم ہوتا ہے۔

ثم ملك ابرهه ابن الصباح ثم ملك صهبان بن محرث ثم ملك عمر بن تبع ثم ملك بعده ذونواس وكان من لا يهود القاه فى اخدود مضطرم نارا فقيل له صاحب الاخدود ثم ملك بعده ذوجدن واخر ملوك الحمير

اس کے بعد ابرہہ بن الصباح بادشاہ ہوا۔ پھر اس کے بعد صہبان بن محرث بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد عمر ابن تبع۔ اس کے بعد ذونواس بادشاہ ہوا۔ یہ بادشاہ ان لوگوں کو جو مذہب یہود اختیار کرنے سے انکار کرتے تھے۔ مشتعل آگ سے بھری ہوئی خندقوں میں ڈلوا دیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو صاحب اخدود کے نام سے ملقب کیا۔ اس کے بعد ذوجدن بادشاہ ہوا اور یہ آخر شاہان حمیر تھا۔

مؤرخ ابوالفدا نے وکیعہ کے بعد ان مذکورہ بالا چھ بادشاہوں کو بھی سلسلہ حمیری میں شمار کیا ہے۔ مگر تحقیق سے ان بادشاہوں کا خاندانی سلسلہ صاف طور سے معلوم نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کی حکومتوں کا ٹھیک زمانہ دریافت ہوتا ہے۔ مگر اس واقعہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں کہ ذونواس ایک متعصب یہودی تھا۔ اور یہودیوں کے علاوہ۔ ہر غیر مذہب والوں کی آگ میں زندہ جلوا دیا کرتا تھا۔ اسبات کے خیال کرنے کے لئے ایک عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ ارثازکسیز دیں کیخسرو (Artazer Kisious) نے چند یہودیوں کو جو مصر سے قید ہوکر آئے تھے۔ ہر فرمانبردار (مازندران) میں بھیج دیا تھا چونکہ یہ بادشاہ بھی یہودی تھا اس لئے اس کی (ذونواس کی) سلطنت کو بھی کیخسرو کے حملہ سے سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس کے بعد حبشیوں نے ضعیف پاکر حمیری سلسلہ ملوک کو ہمیشہ کے لئے تمام کر دیا۔ یہ زمانہ 3650 دنیوی یا354ق م تھا۔

ہم اصحاب اخدود (ذونواس) کا حال بھی۔ سلاطین حمیر کے تفصیلی حالات کے سلسلہ میں اس کے خاص مقام پر لکھیں گے۔

حکومت سبا اور یمن کی دیگر سلطنتیں

سلاطین یمن میں جو اصلاً قحطانی (عرب العاربہ) تھے اور موطناً یمنی سلسلہ سلاطین سبا سے اہل معین کا ذکر قدیم ہے۔ اہل معین کا ذکر تحریری حیثیت سے اسفار یہود میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے قلمبند ہوا ہے۔ اور پھر چھ سو برس بعد یونانی مصنف اراٹستھینس المتوفی 192ق م نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔

اہل عرب بھی اہل معین سے ناواقف نہیں تھے۔ جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔ لفظ معین کے معنی۔ ''منبع آب'' اور ''چشمہ'' کے ہیں۔ عبری زبان میں یہ معیان ہے۔ جو فی الحال معان سے تبدیل ہوکر شمال عرب میں ایک آبادی کا نام ہے۔ یمن کے جوف میں ایک

آبادی کا نام معین ہے۔ اس کے حدود یہ ہیں مشرق میں حضرموت جنوب و مغرب میں سبا (موجودہ صنعا) واقع تھا۔
ہمدانی اکلیل اور صفۃ جزیرۃ العرب میں لکھتا ہے۔

محافد الیمن براقش و معین وھما باسفل جوف الرھب مقابلتات فمعین بین مدینة نشان و بین درب شرافته

یمن کے اضلاع۔ براقش اور معین ہیں۔ اور یہ دونوں رھب کے صحرائے ریگستانی کے نیچے واقع ہیں۔ معین۔ شہر نشان اور درب شرافہ کے مابین ہے۔
یاقوت حموی نے معجم میں بھی ان دونوں مقامات کا ذکر کیا ہے۔ لفظ معین کے ذکر میں لکھتا ہے۔

معین اسم حصن بالیمن وقال الازھری معین مدینه بالیمن تذکر فی براقش

معین یمن میں ایک قلعہ کا نام ہے۔ ازہری کا بیان ہے کہ معین ایک شہر تھا جس کا براقش میں واقع ہونا کہا جاتا ہے۔
براقش کے ذکر میں لکھتا ہے۔

قال الاصمعی براقش و معین حصنان بالیمن کان بعض التبابعة امرینا، سلحین فبنی فی ثمانین عاماً وبنی براقش و معین بغسالة ایدی صناع سلحین قال ولا تری لسلحین اثراوھا قائمتان

براقش اور معین یمن میں دو قلعے ہیں۔ بعض شاہان یمن نے قصر سلحین کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ وہ 80 برس کے عرصہ میں تیار ہوا۔ اور براقش اور معین کاریگروں کے ہاتھ کے دھوون سے بنی ہیں۔ لیکن دیکھ لیں قصر سلحین کا کہیں نشان نہیں۔ اور یہ دونوں (براقش اور معین) اب تک قائم ہیں۔
عبارت متذکرہ بالا سے معلوم ہوا کہ شاہان یمن کی یہ عمارتیں دوسری صدی ہجری تک موجود تھیں۔ ان میں براقش کا ذکر تو آٹھویں صدی ہجری تک نہایت کثرت سے موجود ہے اور اس وقت تک یہ ایک آباد شہر تھا۔ (تاریخ یمن العقود اللولویۃ)
عرب کے شعرائے قدیم بھی اس کے ذکر کو نہیں بھولے۔ فروہ بن میک کہتا ہے۔

احل بجاجرجدی غطیف
معین الملك من بین ابینا
و ملکنا براقش دون اعلیٰ
والغم اخوتی و بنی ابینا

علقمہ کا شعر ہے۔

و قد اسوا براقش حبن اسوا
ببلقعة ومبنسط انيق
وحلو من معين حين حلوا
لغرهم لدى الفج ا لعميق

مالک ابن حریم الدلانی کا یہ شعر صرف ہمدانی نے لکھا ہے۔

وتحمى الجوف ما دامت معين
باسفله مقابلة عرادا

یاقوت حموی نے یہ دوشعر صرف نقل کئے ہیں۔قال الجعدی۔

ينادى من براقش اومعين
فاسمع فاتلاب بنا مليع
تستن بالضر و من براقش او
هيلان او بالع من العتم

ابوعلکم مرانی حمیری کہتا ہے۔

براقش و معين نحن عامرها
ونحن ارباب صرواح ودود ثانا۔

(معجم ج ۲ ص ۹۸ مصر)

ان اشعار سے اتنا معلوم ہوا کہ معین کی آبادی مقام جوف میں واقع تھی۔دوسری صدی ہجری تک اس کے آثار باقی تھے۔کسی زمانہ میں یہ مستقل دارالحکومت تھا۔براقش اس سے ایک قریب آبادی کا نام تھا۔ان بیانات کے اصل واقعات کے ساتھ یہ مکاشفات البتہ تعجب انگیز معلوم ہوتے ہیں کہ ان محاضرات وعمارات کے بانی سلاطین حمیری کو بتلایا گیا ہے۔حالانکہ اہل معین حمیریوں سے قدیم ہیں اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ مؤرخین عرب معین کی نہ قومیت کو جانتے تھے نہ شخصیت کو۔ان کو جو کچھ علم تھا وہ اسی قدر معین و براقش کو دواعلیٰ اور مستحکم ترین عمارات جانتے تھے اس لئے وہ ان کے بنانے والوں کی حقیقت کو کیا بتلاتے یمن کی اصلی تاریخی واقفیت'' ان کو چونکہ سلاطین حمیریہ کے وقت سے شروع ہوئی اور اہل معین کے خاتمہ کے ساتھ ہی سلسلہ حمیریہ کی ابتدا شروع ہوگئی۔اس بنا پر عرب کے مؤرخین اور شعرائے متقدمین نے شاہان حمیر کو ان عمارات کا بانی خیال کرلیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل عرب اگر چہ اہل معین کی قومیت اور اصلیت سے واقف نہ تھے۔اور ان کے وجود تک کو وہ جانتے تھے۔مگر

یونانی۔ رومی اور یہودی مؤلفین بھی۔ جو ان کے وجود سے واقف تھے۔ اور جنہوں نے ان کے وجود کو بتلایا اور ثابت بھی کیا یہ ان کی اصلیت اور قومیت کو نہ بتلا سکے۔ مگر اس امر خاص کا تحقیق کنندہ ان کے مقامات سکونت کے نشان سے ان کی قومیت کو فوراً معلوم کر لے گا۔ اہل معین کی سکونت کے مقامات جو تحقیقات جدیدہ نے بتلائے ہیں وہ بالکل عاد ثانیہ کے مسکن و موطن پائے جاتے ہیں) اس لئے یہ خیال کر لینا صحت سے قریب ہوگا کہ اہل معین اصلاً عاد ثانیہ اور فرعاً ثمود کی ایک شاخ تھے۔ جو اپنے مرکز الحجر اور وادی القریٰ سے اٹھ کر علاقہ یمن میں چلے آئے تھے۔

جرمن فاضل گلا ذر اور ہالوے نے کئی ہزار کتبات کے مطالعے سے اہل معین کی تمام سیاسی۔ مذہبی اور تجارتی حالتوں کا سراغ لگایا۔ اور علاقجات معین۔ حضر موت۔ قتاب اور مارب و سبا کی حکومتوں کی تاریخ موقع وقوع۔ اسماے، ملوک، رسوم مذہبی، طرز تمدن پر کافی روشنی ڈالی۔ پھر ان تمام بیانات کے بعد یہ ثابت کر دیا ہے کہ یمن کی ان تمام حکومتوں میں قدیم تر "معین" کی حکومت ہے۔

اہل معین کے زمانہ سلطنت قائم کرنے میں اختلاف ہے۔ مگر یہ اختلاف چنداں قابل لحاظ نہیں۔ جو یمن مستشرقین 1400 ق م سے 700 ق م تک ان کا عہد حکومت بتلاتے ہیں۔ محققین فرانس اور انگلینڈ یقینی طور سے 800 ق م سے انکا زمانہ شروع کرتے ہیں۔ (Vo1. P 45HUART TOME)

مگر مولف پرٹینکا طبع یاز دہم نے اس اختلاف کو دور کر کے ان کے زمانہ حکومت کو صحیح طور پر بتلا دیا ہے۔ ذیل میں ان کی انگریزی عبارت کا ترجمہ قلمبند ہے۔

> آخر زمانہ کے کتبات کو چھوڑ کر زمانہ قدیم کے کتبوں میں بھی کوئی سن یا تاریخ مذکور نہ ہونے کی وجہ سے اور نیز اس لئے کہ کتبات کی تعداد کم ہے۔ علماء میں زمانہ تاریخ عرب قدیم۔ قبل از اسلام کی نسبت بہت سے اختلاف پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن تمام علما کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کتبات کی تاریخ 1900 ق م تک پہنچتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ صرف 1600 ق م تک پہنچی ہے۔ اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عرب میں کم از کم چار متمدن حکومتیں (1) معین (2) سبا (3) قتاب (4) حضر موت قائم تھیں۔

مصنفین انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (ENCYCLOPEDIA OF ISLAM) معین کا زمانہ بظاہر اس سے بھی زیادہ قدیم قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

> اس قدر قدیم کہ 3000 (تین ہزار) ق م میں۔ قدیم بابل کے کتبات میں ایک شاہ مغیوم (جس کا پورا نام۔ معنوم اور انوم ہے) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو معان یا مشرقی عرب کا بادشاہ تھا۔ اس نظریہ کی نسبت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کہ معان۔ عربی لفظ معین کا سومری تلفظ ہے اور اسی صدی سے (جس کی تاریخ لا معلوم ہے) جنوبی عربی حکومت معین یا معینا ان کی بنیاد

پڑی جس نے شاید اپنی ابتدا میں تمام جنوبی عرب کو جس میں قتاب اور حضرموت داخل ہے۔ اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔ اور جس میں ایک اور صوبہ بلوغ (یا ملوق) بھی شامل تھا۔ جس کی نسبت بیان ہے کہ وہ عرب وسطی اور عرب شمالی ومغربی کا نام تھا۔

ان معلومات پر دو واقعات کا اور اضافہ کرنا چاہیے۔ ہائیکسوس عرب۔ جب 2000 ق م میں مصر پر قابض تھے تو ان حکمران قبائل میں سے ایک قبیلہ کا نام مین بتلاتے ہیں۔ جو معین کی نہایت صاف شکل ہے۔ نیز معین اور اشور کے کتبات باہم تعلقات واقعات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اشور کے کتبات میں۔ جن کا زمانہ 1900 ق م سے 700 ق م تک ہے۔ معین کا ذکر موجود ہے۔ ان وجوہ سے جیسا کہ فرنچ مؤرخ عرب۔ ہوارٹ (HUART) بتلاتا ہے۔ اس سے زیادہ نیچے نہیں اتر سکتے۔

بہرحال یہ امر ہر طرح سے محقق ہو گیا کہ یمن کے حکمران سلسلہ میں اہل معین سب سے زیادہ قدیم ہیں اور ہر قرینہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اہل معین کا سلسل خاندان حمیر سے پہلے تھا۔ اب ہم ذیل میں یونانی مؤرخین کے اقتباسات سے ان کے سیاسی۔ تمدنی اور تجارتی حالات قلم بند کرتے ہیں۔ یونان کا قدیم مؤرخ ارٹستھینس (ERATOETHENES) جس کی تاریخ وفات 196 ق م میں ہے وہ قبائل یمن کے ذکر میں لکھتا ہے۔

ملک عرب کے انتہائی اختتام پر سمندر کے کنارے پر اہل معین (MINAINIANS) رہتے ہیں جن کا خاص شہر قرن (KARNA) ہے۔ ان کے بعد سبا آتے ہیں۔ جن کا پایۂ تخت مآرب ہے۔ آگے بڑھ کر بجانب مغرب خلیج عرب کے گوشہ پر اہل قتاب آباد ہیں۔ جن کے بادشاہ تمنع میں رہتے ہیں۔ آخراً انتہائے مشرق میں اہل حضرموت ہیں۔ جن کا شہر مباتا ہے۔ ان چاروں ممالک میں سے ہر ایک کی وسعت مصر زیریں (LOWER EGYPT) سے زیادہ ہے۔

ان ممالک میں ایام گرما میں بارش ہوتی ہے اور ندیاں بہتی ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں گم ہو جاتی ہیں اس لئے زمین اس قدر زرخیز ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دوبار ہوتی ہے۔ حضرموت سے ملک سبا تک 40 روز کا راستہ ہے۔ سوداگر معین سے عیلانہ (عقبہ) تک 70 دن میں جاتے ہیں۔ حضرموت۔ اقتاب۔ سبا اور معین کے شہر دولتمند ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔ (Dunkers Ancient Hest Vol II P- 890)

یمن کی قوموں میں معین سب سے زیادہ قدیم اور فروغ یافتہ تاجر معلوم ہوتے ہیں۔ ایک قدیم جغرافیہ نویس ان کے حال میں لکھتا ہے۔

معین سے بطرا اور معین فلسطین تک سڑک جاتی ہے۔ جہاں اہل قریہ اور اہل معین اور آس پاس

کے تمام عرب بالائی ملک سے خوشبودار چیزوں کے بستے اور بخورات لاتے ہیں۔ COLD

MINES OF MEDIAIN P 179

پلینی کے بیان کے مطابق ان کی زمین کی خاص پیداوار چھوہارے اور انگور تھے۔لیکن ان کی دولت کا اصلی سرچشمہ جانوروں کی تجارت تھی۔(FOREOTER P. 224-26)

معین کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ معین کے تمام قلعے اور شہر ایک دائرے کی صورت میں واقع تھے۔معین خود ملک سبا کے قلب میں اس شاہ راہ کے دست راست پر جوم آرب کے شمالی جانب سے واقع تھا۔روایات عرب میں معین کے ساتھ ساتھ براقش کا ذکر ہوتا ہے۔براقش کا محل وقوع معین کے مغربی وجنوبی جانب اور موجودہ صنعاء کے قریب جو کوہستانی سلسلہ ہے۔اس کے مغربی جانب تھا۔براقش کا قدیم نام مثیل تھا۔اہل معین کا تیسرا قلعہ یا شہر جو شاید یونانیوں کا بیان کردہ قرن یا قرناء ہو۔شمالی جوف کے وسط میں معین و براقیش کے شمال میں تھا۔

اہل معین کے شمالی آثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف تجارتی حکومت نہیں تھی۔بلکہ جنگ وفتح میں حصہ لیتی تھی۔شمالی معین کا ایک گورنر اپنے آقا کے بخیر و عافیت میدان جنگ سے واپس آنے پر ایک یادگار لوح پر لکھتا ہے۔

> استار (دیوتا) کے شکرانہ میں اس کی حفاظت پر۔فرمانروائے جنوب اور فرمانروائے شمال کی باہمی جنگ میں اور مدی (میڈیا) اور مصر کی لڑائی میں۔اور ان کا بخیریت اپنے خاص شہر قرن واپس پہنچ جاتے ہیں۔

اس کتبہ کا نویسندہ اپنے کو ابی یدع ثیع شاہ معین کا ماتحت ظاہر کرتا ہے۔اور اپنا لقب قسار اشور۔اور بالائی ساحل بحر کا حاکم بتلاتا ہے۔قسار کا ذکر مصری کتبات میں بھی ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ مصر و عرب کی سرحد پر جہاں اب سوئیز ہے۔قسار کوئی سرحدی قلعہ تھا۔معین کو ایک دوسرے کتبہ سے حکام معین کا شہر غزہ پر بھی حکومت کرنا معلوم ہوتا ہے۔شہر غزہ شام وفلسطین کے پاس اب تک موجود ہے۔ان بیانات سے معلوم ہوا کہ معین کی حکومت یمن سے شروع ہو کر شام و مصر اور اشور (اسیریا) تک ممتد تھی۔

خاندان معین میں کتنے بادشاہ گذرے اور ان کے کیا نام تھے؟ اس کا جواب نہ خود روایات عرب میں ہے اور نہ مؤرخین یونان کے بیانات میں۔اس کے لئے دنیا کو صرف علمائے آثار کا ممنون ہونا چاہیے۔انہوں نے معین کے تقریباً 25 بادشاہوں کے نام دریافت کئے ہیں۔جن میں سے ۲۰ باہم ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ناموں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

ایل صادق	ابی یقع یاثع	ابی یفع یاتوش	عمی یدع نابط	خالی کریب
وقع ایل یاثع	ابی یدع یاثع	ابی یفع وقہ	ابی یفع ریام	حفن یاثع
ابی یفع یاشر	وقہ ایل ریام	وقہ ایل صادق	ہوفاعشت	شع ایل ریام
حفتم ریام	حفتم صادق	ابی کریب یاثع	ابی یدع	تبع کریب

	ابی یدع	خفتم		

بنی لحیان کی حکومت

مخملہ عرب البادیہ کے رواۃ عرب بنی لحیان نام ایک قبیلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ بنی لحیان کی نسبت وہ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ یہ جرہم کی ایک شاخ تھی۔ ابن خلدون نے بھی اسی قدر لکھا ہے۔ آج کل شمال عرب کے شہر العلا میں چند کتبات سبائی اور نبطی قوموں کے پہلو بہ پہلو ملے ہیں۔ جن سے نہ صرف بنی لحیان کا وجود ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شمالی عرب میں حدود شام میں اور خصوصاً العلا کے اطراف میں آباد تھا۔ خط الحیانی جنوبی عرب کے خط معینی اور سبائی سے مشابہ ہے۔ بلکہ انھیں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ا ص ۳۹۲)

علمائے آثار بنولحیان کی قوت سیاسی کا زمانہ شمالی عرب میں معین وسبا کے انحطاط (500ق م) اور انباط کے ارتقاء (200ق م) کے درمیان بتلاتے ہیں۔ بنی لحیان کا مسکن۔ حکومت فارس ومصر کے درمیان واقع تھا۔ ہیروڈٹس بیان کرتا ہے کہ یہ عرب ہر سال ہزاروں وزن بخورات شاہ فارس کو نذر دیتے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ج ا ص 379) لیکن یہ نذر غلامی اور عبودیت کی قیمت نہیں تھی۔ بلکہ دوستانہ ہدیہ تھا۔ کیونکہ مؤرخ مذکور لکھتا ہے کہ ان عربوں کو (بنی لحیان کو) اب تک کوئی فتح نہ کر سکا۔ (ہیروڈاٹس باب 3 فقرہ 8)

525ق م میں قمبیز نامی شاہ فارس نے جب مصر پر حملہ کرنا چاہا تو صحرائے سینا کا بے آب ودشوار گذار میدان بغیر ان عربوں کی امانت کے قطع کرنا محال تھا۔ شاہ فارس نے ان عربوں کے پاس ایک سفارت بھیجی کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس ریگستان میں اس کی فوج کے لئے پانی کا انتظام کریں۔ شاہ عرب نے امداد کا وعدہ کیا اور پتھر انگلی پر مار کر خون نکالا جو مستحکم وعدہ کی عربوں میں خاص نشانی تھی۔ پھر اونٹوں کی کھالوں میں پانی بھر کر اس خشک ریگستان کو چشمۂ پر آب بنا دیا۔

حصار موت یا حضر موت کی حکومت

عبری زبان میں ''ض'' نہیں ہے۔ اس لئے عبری میں اس کا تلفظ حصر موت یا حصار موت۔ بزیادت الف کیا گیا ہے۔ حضر موت ابن قحطان کی اولاد نے جس قطعہ عرب کو اپنا مسکن بنایا وہ حضر موت کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ حضر موت بحر عرب کے ساحل پر یمن کے مشرق میں واقع ہے۔

بنو حضر موت کی ایک مستقل حکومت تھی۔ جس کا ذکر یونانیوں نے جا بجا کیا ہے۔ مسلمان مؤرخین بھی اس دور حکومت سے واقف تھے عرب مؤرخین نے حضر موت کی گو مفصل تاریخ کہیں بیان نہیں کی ہے۔ لیکن اتنا ان کو معلوم تھا کہ شبا کی طرح اس خاندان میں بھی متعدد بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں۔ ان کا لقب عباہل ہوتا تھا۔ مؤرخین عرب کا بیان ہے۔ کان فیھم ملوک تقارب ملوک التبابعۃ فی علو الصیت و بناھۃ الذکر شاہان حضر موت شہرت اور ناموری میں ملوک تبابعہ یمن کے ہم درجہ تھے۔ ابن خلدون نے

تاریخ میں ان کے بعض بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔نشوان بن سعید حمیری نے بھی ان کا نام لیا ہے۔

وعیاھل من حضر موت من،بنی اجماد ذی الا شبا وال صباح ،والفرمن جدن وابنامرۃ،وبنی شبیب والاولی بناح ،وبنی ایھر بل وال فھدمنھم ،من کل حش سالندی مدتاح

فرزندان حضرموت زیادہ تر لڑائیوں میں مارے گئے برباد ہو گئے اور جو بچے انھوں نے اپنے آپ کو قبیلہ کندہ میں منضم کر دیا۔ابن خلدون کی عبارت ہے۔

قدذھب اکثرھم واندرج باقیھم فی کندہ وصار وافی اعدادھم (ابن خلدون)

اکثر لوگ فنا ہو گئے۔جو بچے وہ قبیلہ کندہ میں مخلوط ہو گئے اور ان کا شمار انھیں میں ہو گیا۔

بنی حضرموت چونکہ عرب کے ساحل پر آباد تھے۔جو تقریباً جنوبی ہندوستان کے سامنے ہے۔اس لئے ہندوستان کی بحری تجارت کے یہ عہد قدیم سے مالک تھے۔ہندوستان کا تمام بیوپار انھیں کے توسط سے انجام پایا تھا۔جہاز رانی میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔اسلام کے بعد ان کی یہ قوت اور زیادہ ہو کر چمکی تھی۔جزائر ہند۔جاوا سماطراہ اور تمام ساحل ہند میں ان کی نوآبادیاں قائم ہیں۔دکن کی ریاست حیدر آباد کی فوجی طاقت میں اور مرہٹوں کے زمانہ تک ان کے عنصر کا ایک جزو ثابت ہوتا ہے۔ان ساحل و جزائر میں اشاعت اسلام کی خدمت بھی انہیں حضرموتی عربوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہے۔

حضرموت ان خوش نصیب عربی قبائل میں ہے۔جن کا نام تورات میں مذکور ہے۔لیکن افسوس ہے کہ یہ خوش نصیبی نام کی حیثیت سے صرف ایک ہی بار نصیب ہوئی ہے۔یعنی قحطان کے بیٹوں کے سلسلہ میں حضرموت کا نام بھی تورات میں داخل ہے۔لیکن حضرموت کی بندرگاہ قانہ یا قانع کے نام سے تجارت کی مناسبت سے مذکور ہے۔کتاب خرقیال 27۔22 میں ہے۔حاران۔قانہ اور عدن سبا کے تاجرا سیر یا تیرے بیوپاری تھے۔"

یونان نے بھی اسی بحری تجارت اور ہندوستانی بیوپار کے تعلق سے ان کا ذکر کیا ہے اراتوستھیتس ERATOSTHENES المتوفی 196ق م۔بیان کرتا ہے کہ یمن کے آخر میں مشرق کی طرف حضرموت (CHATRAMITIES) ہے۔اس کے دارالحکومت کا نام سبا تھا SABHATHA ہے۔سبا کا اصلی تلفظ غبوہ۔جو اب تک حضرموت میں ایک آبادی کا نام ہے۔پھر یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے حضرموت زیادہ تر بخورات پیدا کرتا ہے۔لیکن ہر قسم کے میوے بھی وہاں وافر اور جانور بھی بکثرت ہوتے ہیں۔حضرموت سے سبا کا ملک 40روز کی مسافت پر ہے۔حضرموت اور شبا نہایت دولتمند شہر ہیں۔اور ناہی اور شاہی عمارات سے آراستہ ہیں۔

پلینی کہتا ہے۔سبا کے ایک حصہ کا نام حضرموت ہے۔جس کا خاص شہر شبا تھا (شبوہ) ہے۔اس شہر میں 60 ہیکل (معبد) ہیں۔یہاں سے بخورات جمع کر کے سبا تھالائے جاتے ہیں۔اور اس وقت تک یہ خرید نہیں کئے جا سکتے اور نہ کوئی غیر ملکی ان کو لے جا سکتا ہے۔

جھٹک کا ہن۔سبا تھا کے دیوتا کے لئے ایک عشر (دسواں حصہ) ان سے نکال نہیں لیتا (Dunkies Hist of Antiquility Vol 1 PP 310, 311,313)

ایک یونانی مؤرخ لکھتا ہے کہ حضرموت میں بادشاہ وراثتاً نہیں ہوتا۔ بلکہ شرفاے ملک کے گھر میں بادشاہ کے انتخاب کے بعد جو پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے وہی ولی عہد ہوتا ہے۔

حضرموت کے آثار کی تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔1913ء تک جوانسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلداول کے طبع کی تاریخ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرموت کے پایۂ تخت شبوہ ہے میں سیکڑوں کتبات ایسے موجود تھے جو پڑھے نہیں گئے تھے۔تاہم جوآثار دریافت ہو چکے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرموت کا تعلق نہایت قدیم زمانہ سے معین کے ساتھ تھا۔ بلکہ حضرموت کا خاندان معین سے تعلقات نسبتی بھی رکھتا تھا۔اور قانہ کی بندرگاہ اور ملک کا ایک ٹکڑا ایک حد تک اس کے ماتحت تھا۔ایک طویل خاموشی کے بعد حضرموت کا نام سبا کی ماتحتی میں نظر آتا ہے۔(Hist dela Arabu Tome Vol P 49)

سبا کا زمانہ 900ء یا 1000 ق م تک مفروض ہے۔اس دور میں بھی حضرموت کی حکومت کا ذکر جنگ وصلح کے تعلق سے آتا ہے۔ شاہان سبا کے خطاب شاہی کے ساتھ ''شاہ حضرموت'' کا لقب بھی نظر آتا ہے۔ساحل یمن کے دوسری جانب ملک حبش ہے۔اہل حبش بھی اصل میں سامی عرب تھے۔انہوں نے اپنی نوآبادی قدیم زمانہ میں اپنے وطن کے دوسرے مقابل جانب میں قائم کی تھی۔اس زمانہ میں رفتہ رفتہ وہ بھی ساحل حضرموت پر واپس آرہے تھے۔تقریباً 300ء میں وبال آخر حضرموت پر انھوں نے استیلاء حاصل کر لیا۔(Encye Bri Vol II P 264)

حضرموت کے بادشاہوں کے نام جو کتبات ونقوش میں پڑھے گئے ہیں۔ان میں سے ہمیں صرف دو معلوم ہیں۔صدوق ایل اور معدی کرب۔معدی کرب۔صدوق ایل کا پوتا تھا۔اور معین کے بادشاہ ابی یدع یاثع کا چچا اور معاصر۔

10ھ میں حجاز اور نجد کے معاملات سے فارغ ہو کر آنحضرت صلعم نے حضرت علیؑ، معاذ ابن جبل اور ابوموسیٰ الاشعری کو دعوت اسلام کی غرض سے یمن میں بھیجا۔ایک ہی سال کے اندر تمام ملک مسلمان ہو گیا۔اسی سال زیاد ابن ولید خزرجی یہاں عامل مقرر ہو کر آئے۔عہد اسلام میں حضرموت کا آخری بادشاہ ہو۔لا وائل بن حجر تھا۔حضرموت کی زبان حجاز کی زبان سے مختلف تھی۔شاہان عالم کے سلسلہ میں وائل کو عربی میں جو خط لکھا گیا تھا۔وہ حضرموتی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ تھا۔نامہ مقدس یہ تھا۔

من محمدصلعم رسول الله الى الا قيال العياهله والا رواع المشابيب... في التبعة لا مقورة الباط ولا خاك وانطوا الشبيحة وفى السيوب الخمس ومن زناهم.... ولا توا... فى الدين.

سبا کی حکومت

امم قحطانیہ کی سب سے مشہور ترین شاخ سبا ہے۔ایک طرف روایات عرب۔حکایات یونان اور آثار قدیمہ ہیں۔دوسری طرف قرآن مجید۔تورات۔زبور اور انجیل میں اس کی شہرت ورفعت کی داستانیں اور واقعات موجود ہیں۔نام۔تورات میں سبا ایک جد قبیلہ کا علم ہے۔بروایت عرب اس کے جد قبیلہ کا نام۔عمر یا عبدالشمّس اور لقب سبا تھا محققین جدید بھی زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں۔لغوئین عرب کی رائے ہے کہ یہ ''سبی'' سے مشتق ہے۔جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں۔چونکہ عبدالشمّس بہت بڑا فاتح تھا۔اور اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا اس لئے اس کا لقب سبا قرار پایا۔

تحقیق جدید یہ ہے کہ سبی اور سبا۔اس معنی سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم تجارت ہے۔کتبات میں عموماً سبا کا لفظ۔تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔عربی زبان میں یہ اب تک ''شراب کی تجارت اور خرید وفروخت اور اس کے لئے سفر'' کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔سبا چونکہ تاجر قوم تھی۔اس لئے اس لقب سے مشہور ہوئی ہے۔(EncycloBrita Vol23 P.955)

زمانہ حکومت

سبا کا زمانہ عروج کب سے شروع ہوتا ہے؟ روایات عرب میں براہ راست اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔لیکن تمام مؤرخین اور اہل نسب نے عبدالشمّس سبا کو قحطان کا پوتا بتلایا ہے۔یہ ان کی حکومت کا زمانہ 484 برس بتلاتے ہیں۔(مسعودی ج1 ص193)

اس کے بعد اس کا جانشین۔ان کی تصریح کے مطابق حمیر ہوتا ہے۔بقاعدۂ عام۔عبدشمس سے اگر عبدالشمّس کا خاندان مراد لیا جائے تو قحطان کی تیسری پشت سے جو کم از کم 2500 ق م میں ہوگی۔اس کا زمانہ شروع ہو کر 480 برس کے بعد 2000 برس کے پس وپیش میں ختم ہو جاتا ہے۔حالانکہ سبا اور حضرت سلیمان (950ق م) کی معاصرت قرآن مجید,اسفار یہود اور انجیل سے اس کے ایک ہزار برس کے بعد بھی ثابت ہے۔

اسفار یہود میں سبا کا حکومت کی حیثیت سے ذکر سب سے پہلے حضرت داؤد کی زبور (27-10) میں نظر آتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 1000ق م سے پہلے عہد عروج شروع ہو چکا تھا۔اسیریا کے کتبات میں 715ق م میں اس کا (سبا کا) ایک بادشاہ اسیریا کو خراج دیتا ہے۔اور یہ سبا کی ترقی کا آخر زمانہ ہے آخر میں ولادت مسیحؑ کے پس وپیش یونانی تاریخوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔اس سے سبا کا آخری زمانہ ظاہر ہوتا ہے۔کتبات یمن اور حضرت داؤد کی زبور کے اسناد سے۔جس کی تدوین کا زمانہ دسویں صدی کا وسط ہے۔سبا کے عروج کا زمانہ 1100ق م سے کسی حال میں کم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دائرہ یا رقبۂ حکومت

سبا کا اصلی مرکز حکومت۔جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔اس کا دارالحکومت شہر مآرب تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ مغرب

میں ۔حضرموت تک وسیع ہو گیا تھا اور چونکہ یہ ایک تاجر قوم تھی اس لئے بہت سے بحری اور تجارتی (بری) راستوں پر بھی اس کو قبضہ کرنا پڑتا تھا۔اسی سلسلہ میں شمالی عرب پر سبا کی حکومت نظر آتی ہے اور افریقہ میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔حبشہ میں اذینہ کا ضلع سبا کے ماتحت تھا۔اس ضلع پر معافر کے لقب سے ایک گورنر حکومت کرتا تھا۔(Encyclo Brit Vol 23 P.955)

یمن سے براہ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی راستہ تھا۔یہ بھی سبا کے قبضہ میں اس وقت نظر آتا ہے اور اس پر جا بجا ان کی نو آبادیاں قائم معلوم ہوتی ہیں۔غالباً ان مقامات پر سبا کا قبضہ نویں یا آٹھویں صدی میں اہل معین کی مفتوحی کے بعد ہوا ہوگا۔اسیریا کے بادشاہ سرجون کے ایک کتبہ میں جو 715ق م کا ہے شمالی عرب کے چند قبائل کا ذکر ہے۔ان میں ایک نام یثعمر سبائی ہے یہ سرجون کو خراج دیتا ہے (Encyclo Brit) سرجون کا یمن تک جانا اثار سے ثابت نہیں۔اس لئے لامحالہ خود سبا کا گذر وہاں تک ہوا ہوگا۔اس واقعہ سے سبا کی حکومت کا رقبہ شمالی عرب میں عراق تک ثابت ہوتا ہے اور سبا کی حکومت کا ان اطراف میں بھی سراغ ملتا ہے۔(سفر ایوب 1-15 میں ہے کہ سبا نے اور اہل اسیریا نے حضرت ایوب کے نیلام اور جانور لوٹ لئے۔پھر صحیفہ ایوب 6-19 میں ہے کہ سبا کے ساتھی تیما کے سواروں کا انتظار کرتے ہیں) تیما شام کے پاس شمالی عرب میں ایک شہر ہے۔اس آیت سے سبا اور شام کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔دیگر اسفار یہود میں بھی سبا کا بکثرت ذکر موجود ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک شام۔فلسطین اور مدائن کے آس پاس بھی ان کی نو آبادیاں تھیں۔

سبا اور اس کی شاخوں میں امتیاز

تمام عرب مؤرخین نے حمیر کو سبا کا بلا واسطہ جانشین فرض کیا ہے اور ان تمام ملوک یمن کو جو اس سلسلہ میں اول سے آخر تک گذرے ہیں ان کو حمیر بن سبا اور ملوک حمیر بن سبا سمجھتے ہیں۔اس بنا پر مستقلاً خاص سبا کے نام سے کسی زمانہ میں بھی ان کے اصول کے مطابق کوئی حکومت نہ تھی۔لیکن یہ تصریح قرآن کے بالکل مخالف ہے۔اس نے حمیر کے بلاتوسط حکومت کا سبا کا صاف اور صریح نام لیا ہے۔اور تمام عبرانی، یونانی اور اثری شہادات قرآن کے ساتھ ہیں۔عبرانی صحائف جن کا زمانہ آخر 4001ء ق م ہے۔حکومت یمن کا ہمیشہ سبا کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔یونانی مؤرخین نے 20ق م میں سے پہلے حمیر کا نام نہیں لیا ہے۔آثار میں 115ق م کے بعد خاندان حمیر کا وجود نظر آتا ہے۔

مؤرخین عرب نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ حمیری بانیٔ حکومت سے حمیر ابن سبا تک جتنے آبائی نسب تھے ان سب کو بادشاہ قرار دے کر وہیں سے حمیری حکومت قائم کر دی۔حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک فرزند قبیلہ جو اتفاق سے ایک سلطنت کا بانی ہو جائے اس سے لے کر پدر قبیلہ تک اس کی سلطنت مسلسل ہو۔ابو العباس السفاح عباسی حکومت کا بانی تھا۔لیکن اس خاندان کے پدر اول حضرت عباس اس سے پانچ چھ پشت پہلے ہیں۔اس بنا پر نسب عباسی کی ابتدا حضرت عباس سے بے شک کی جائے گی۔لیکن ظاہر ہے کہ حکومت عباسی کی ابتدا حضرت عباس سے نہیں بلکہ السفاح سے کی جائے گی۔اسی طرح نسب حمیری کی ابتدا سبا ابن حمیر سے ہوئی۔لیکن حکومت حمیری اس کے سیکڑوں برس بعد قائم ہوئی۔اور نسب خاندانی کے لحاظ سے صحیح طور پر اس کو حمیری کہا گیا۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حمیر ابن سبا نے خود اس کی بنیاد بھی ڈالی۔معاویہ اور اس کے جانشینوں کی حکومت کا نام امویہ ہے لیکن کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ خود امیہ اس کا بانی تھا۔

سبا کو چھوڑ کر سبا کی متفرق شاخوں میں جو بادشاہ گذرے ہیں ان کے نام وتعداد حالات کسی قدر زیادہ روشن ہیں۔ان کی بنا پر ان کا زمانہ 6 یا 7 سو سے زیادہ نہیں۔جیسا کہ تاریخ حمزہؔ اصفہانی کی تاریخ میں ایام ملوک آل غسان اور ملوک مناذرہ کے ازمنہ کے جمع کرنے اور حمیر کے زمانوں کی تعدیل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔اس زمانہ کی انتہائی حد معلوم ہے یعنی تقریباً 600 عیسوی جو ظہور اسلام کا زمانہ ہے۔ اس حساب سے انکار زمانہ تقریباً 115 ق م یا علی العموم پہلی صدی ق م ہونا چاہیے۔اور یہ وہی زمانہ ہے جس کو گلا ذر وغیرہ نے ابتدائے حمیر اور انتہائے سبا کے لئے از روئے اثار مقرر کیا ہے۔اس لئے اس زمانہ تفرق اور تفرع سے پہلے فرزندان سبا کا جو مشترک زمانہ تھا حکومت سبا سے وہی عہد مراد ہے۔

فرمانروایان سبا

حکوت سبا کا نام تحریری حیثیت سے سب سے پہلے 1000 ق م میں حضرت داوٗدؑ کے عہد میں نظر آتا ہے۔اس زمانہ بعید العہد میں بھی سبا کی دولت وحشمت ہمسایہ بادشاہ کی نگاہ میں قابل رشک تھی۔حضرت داوٗد زبور میں کہتے ہیں۔

”الٰہی اپنے بادشاہ کو اپنا فیصلہ عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو راستی......سبا اور اس کے بادشاہ اس کو نذریں دیں گے اور سبا کا سونا اس کو پیش کیا جائے گا۔“

بادشاہ داوٗدؑ کی دعا قبول ہوئی۔اور بادشاہ کے بیٹے سلیمان کی بارگاہ میں سبا کے بادشاہ نے نذر دی اور سبا کا سونا اسے پیش کیا۔950 ق م میں جو تقریباً حضرت سلیمان کا عہد ہے از روئے قرآن وتورات۔سبا پر ایک عورت حکمران تھی۔روایاتِ عرب اس عورت کا نام بلقیس بتاتے ہیں۔لیکن بلقیس کا جو زمانہ وہ قرار دیتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔مفصل بحث آگے آئے گی۔

سرجون یا شرغون شاہ اسیریا کے عہد میں جسکا زمانہ 721 ق م سے 705 ق م ہے۔ملک سبا پر شمعر نامی بادشاہ تھا۔سرجون نے اپنے ایک یادگاری کتبہ پر لکھا ہے کہ اس کو......ثمود......شمیسہ ملکہ عرب (عربی) اور شمعر سبائی نے خراج دیا (Roger's Hiot of Bible Vol II 164) یہ متفق ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سرجون یمن تک نہیں پہنچا۔اس لئے یہ ظاہر ہے کہ خود سبا حدود اسیریا تک پہنچ گئے تھے۔ اس کی تائید سفر ایوبؑ سے بھی ہوتی ہے۔جس میں کلدان اسیریا اور سبا کو باہم متحداً حدود شمالی عرب میں ظاہر کیا گیا ہے۔

عرب مؤرخین نے چونکہ سبا اور حمیر میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔اس لئے سلسلہ حمیر سے الگ انہوں نے کسی بادشاہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ حمیر کے انھوں نے دو ٹکڑے کئے ہیں۔ملوک حمیر اور تبابعہ حمیر۔ملوک وہ ہیں جو صرف ملک یمن میں حکمران تھے۔تبابعہ وہ ہیں جن کے ماتحت یمن وحضرموت دونوں تھے۔ان کی تحقیق کی مطابقت سے سب سے پہلا تبع۔حارث الرائش ہے۔ملوک حمیر کی تعداد ان کے ہاں بہت کم ہے۔بلکہ بعضوں نے تو اس طبقہ کو بالکل حذف کر دیا ہے۔وہ حمیر بن سبا کے بعد فوراً بلا واسطہ بالچند واسطہ حارث الرائش کا مؤرخین نام لیتے ہیں۔حالانکہ حمیر اور ارایش کے درمیان کم از کم ہزار برس کا فصل ہے۔جس کی رخنہ پری صرف مخصوص مؤرخین نے کی ہے۔لیکن وہ باہم اس قدر مختلف ہیں کہ نتیجتاً ان سب کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے۔اس بے اعتباری کی بڑی دلیل یہ ہے کہ بجز چند ناموں کے ان میں سے کوئی نام سبائی اسما کے طرز کا نہیں ہے۔حالانکہ ناموں کے اسلوب وطرز کو قومیت کی تعین میں بہت بڑا دخل ہے۔

بہر حال مثالاً چند نام مختلف روایات مستندہ سے یہ درمیانی پیش کئے جاتے ہیں۔

نمبر	نشوان ابن سعید حمیری	قلقشندی	ابوالفدا	ابن خلدون	مسعودی
۱	سبا	سبا	سبا	سبا	سبا
۲	حمیر	حمیر	حمیر	حمیر	حمیر
۳	المیسع	المیسع	وائل	وائل	کہلان
۴	ایمن	ایمن	الکسک	الکسک	ابو مالک
۵	زہیر	زہیر	یعفر	یعفر	جبار ابن مالک
۶	عریب	عریب	ذوریاش	نعمان	حارث الرائش
۷	الغوث	قطن	نعمان	ذوریاش	
۸	وائل	الغوث	اشج	اشج	
۹	عبدالشمس	وائل	شداد	الحارث الرائیش	
۱۰	زہیر الصوار	عبدشمس	لقمان		
۱۱	ذویقدم	زرعہ حمیر اصغر	ذوسدہ		
۱۲	ذوانس	شدد	الحارث الرائش		
۱۳	عمر	الحارث الرائش			
۱۴	الملطاط				
۱۵	القلیص				
۱۶	سدد				
۱۷	الحارث الرائش				

غالباً اسی اختلاف کی وجہ سے حمزۂ اصفہانی نے حمیر بن سبا اور حارث الرائش کے درمیان نام چھوڑ دئے اور مجملاً لکھتا ہے کہ حمیر بن سبا انتہائی عمر کو پہنچ کر مر گیا اس کی نسل اس کے بعد وراثتاً حکومت کرتی رہی اور ان کے خاندان سے نکل کر یمن کی مملکت دوسروں کی نہیں ملی یہاں تک کہ صدیاں گزر گئیں اور حکومت حارث الرائش کے ہاتھ میں آئی۔ یہ پہلا تبع ہے۔ حارث سے پہلے حکومت یمن اور حضرموت دو گروہوں پر منقسم تھی۔کل اہل یمن ایک بادشاہ پر متفق نہ تھے۔لیکن حارث الرائش جب بادشاہ ہوا تو سب اس پر متفق ہو گئے۔ اور اس

کے تابع بنے۔اس لئے نام اس کا تبع پڑا۔حارث الرائش اور حمیر ابن سبا کے درمیان پندرہ پشتین ہوئیں۔حمزہ اصفہانی کلکتہ ص188۔
اس عبارت میں آخری فقرے کے علاوہ اور سب فقرے نہایت محتاط اور قابل قبول باتیں ہیں۔ملوک حمیر بن سبا کی ابتدا کم از کم 1000ق م سے یعنی زمانہ داؤد سے ہوتو تبابعہ حمیر کے پہلے ملوک حمیر یا سبا کے لئے 900برس رہتے ہیں۔اگر ایک بادشاہ کا اوسط زمانہ 25برس بھی فرض کیا جائے تو کم از کم اس عرصہ میں 36 چھتیس ہوں گی۔اس لئے حمیر بن سبا کے معنی صرف یہ لینے چاہئیں کہ حمیر جو سبا کی اولادو اور اولاد میں تھا اور جو تقریباً 115ق م میں دولت حمیر یہ کا بانی ہوا۔اس حمیر اور حارث الرائش کے درمیان 15 پشتیں ہونا ممکن ہے۔

بہر حال رواۃ عرب نے تبابعہ حمیر سے پہلے کے جو نام ملوک حمیر کے نام سے بتلائے ہیں وہ بہت کچھ محتاج تصحیح وتنقید ہیں اثار و کتبات نے یونان و رومان کی مدد سے تاریخ یمن کا جو حصہ روشن کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت اشارۂ قرآن کے مطابق حکومت یمن کے دو مستقل دور۔دو مستقل ناموں سے ہیں۔سبا اور حمیر سبا کی انتہا معلوم ومتفق ہیں کہ وہ 115ق م ہے۔(Encylo Brit II P. 254)اور یہی سال حمیر کی ابتدا کا ہے۔سبا کی ابتدا ہم نے بوجوہ سابقۃ الذکر (سبا کا زمانہ) 1200ق م سے شروع کی ہے اس بنا پر حمیر سے پہلے حقیقی سبا کی تاریخ 1085برس پر مشتمل ہوگی۔جس میں کم از کم 50 یا 45بادشاہوں کی پشتیں گذرنی چاہئیں۔

مکارب سبا

باعتبار کتبات دور سبا کے دو طبقے نظر آتے ہیں۔پہلے طبقہ میں شاہان سبا کا لقب مکارب سبا لکھا ہے اس وقت ان کا مرکزی شہر یا قلعہ صرواح تھا۔مکارب دو لفظ سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔''مکا'' اور ''رب'' سے۔مکا کے معنی ''مذہبی'' کے ہیں۔اور ''رب'' کے معنی بڑے اور بادشاہ کے ہیں۔اس لئے مکارب کے معنی ''مذہبی بادشاہ'' یا کاہن بادشاہ کے ہیں۔الغرض مکارب سبا حکومت سبا کے ابتدائی کاہن بادشاہوں کا لقب تھا۔صرواح جوان کاہن بادشاہوں کا دارالحکومت تھا اس کے اثار اب تک م آرب اور صنعا کے درمیان باقی ہیں۔صرواح سے عرب بھی واقف تھے۔عمر بن نعمان بن سعید بن غولان کہتا ہے۔

ابو نا الذی كانت بصر واح داره
وفی جبلی نعمان غر تمكنا

ہمارا باپ تھا جس کا مسکن صرواح اور نعمان کے دو پہاڑوں میں س عزت متمکن ہوئی

علقمہ۔جاہلیت کے زمانہ کا شاعر کہتا ہے۔

من یا من الحدثان بعد
ملوك صرواح ومارب

صرواح اور م آرب کے بادشاہوں کے بعد اب کون سے حوادث سے محفوظ ہوسکتا ہے

ابو علکم مرانی۔قصور یمن کے ذکر میں لکھتا ہے۔

براقش و معین نحن عامرھا
و نحن ارباب صرواح وروثانا

براقش اور معین کے آباد کرنے والے ہم ہیں۔ اور ہم عین مالک (رب) صرواح اوثان کے

مکارب سبا کے نام

مکارب سبا کے جو نام کتبات کے ذریعہ سے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔ سوائے آخر نام کے ہر ایک کو دوسرے سے نسبی تعلق ہے۔ ان کی تعداد 11 سے کہیں زیادہ ہوگی مگر افسوس ہے کہ تاریخ و سیر کے علاوہ کتبات کی پتھر والی لکیریں بھی ان کی یاد قائم نہ رکھ سکیں اور صورتِ دیوار خاموش رہ گئیں۔ ان کا عروج سلطنت 900، 800 ق م میں سمجھنا چاہیے۔ مکارب سبا کے نام یہ ہیں۔ الفاظ کے فصل کے لئے نقطہ اصل سبائی خط مندرجہ کتبات کے مطابق ہیں۔

۱۔ ذمرا علی۔ مکارب۔ سبا
۲۔ کرب ایل۔ وتار۔ بن۔ ذمرعلی
۳۔ سمہی علی۔ نیوف۔ بن ذمرعلی
۴۔ یثع امز بین۔ بن سہی علی۔ نیوف
۵۔ یدع ایل۔ ذرح۔ بن سہی علی نیوف
۶۔ یثع امز۔ وتار۔ بن۔ سہی علی۔ نیوف
۷۔ کرب ایل۔ بین۔ بن یثع امر۔ وتار
۸۔ یدع ایل۔ بین بن۔ یثع امروتار
۹۔ سہی علی۔ نیوف۔ بن یثع امروتار
۱۰۔ ذمرعلی۔ وتار۔ بن کرب ایل۔ بین
۱۱۔ یدع ایل۔ ذبی۔ مکارب۔ سبا　　(یہی ایک جداگانہ نام معلوم ہوتا ہے)

آسانی سے سمجھ لینے کے لئے ہم خاندان مکارب مذکورۂ بالا کا ایک شجرہ مرتب کر کے ذیل میں تحریر کئے دیتے ہیں۔

ملوک سبا

شاہان سبا کا زمانہ 550 ق م تک نظر آتا ہے، اس عہد میں ان کا لقب۔ ملک سبا منقوش ملتا ہے ان کا دارالحکومت شہر مآرب تھا۔ یہ شہر یمن کے مشرق میں واقع تھا اور اس کا دوسرا نام شہر سبا تھا۔ مآرب کے قصر شاہی کا نام سلحین تھا۔ سکون میں۔ دارالضرب۔ ''بیت سلحین وحضر مارب'' منقوش ملتا ہے۔ مآرب تو مشہور مقام ہے مگر سلحین بھی غیر معروف نہیں۔ عرب جاہلیت کا شاعر علقمہ لکھتا ہے۔

و قصر سلحين قد عفاہ
رب الزمان الذی بریب

یہی شاعر دوسری جگہ کہتا ہے۔

اوما ترين و كل شئ للبلی
سلحين خاوية كان لم تعمر

ابوعلکم مرانی کہتا ہے۔

و قصر سلحين علاہ و شيد
كهلان والدنا ع احبب بكهلان

550 ق م سے 15 ق م تک 435 برس ہوتے ہیں۔ جوتقریباً اس عربی روایت کے مطابق ہے کہ سبا نے 484 برس حکومت کی۔ اس زمانہ مدید کے لئے 17 ملوک سبا کے نام ہمیں ملے ہیں۔ جوتقریباً مفروضہ مدت زمانہ کے برابر ہیں۔ اوروہ نام یہ ہیں۔

(1)	سہی علی۔ ذرح۔ ملک سبا	متحد خاندان ہے
(2)	کرب ایل۔ بن سہی علی۔ ذرح ملک سبا	
(3)	کرب ایل۔ بن سہی علی۔ ذرح ملک سبا	
(4)	سہی علی بن الیشر ح۔ بن سہی علی	
(5)	یثع۔ امر۔ ملک سبا۔	متحد خاندان ہے
(6)	کرب ایل۔ وقار۔ بن یثعمر۔ امر	
(7)	یدع ایل۔ بین ویثع۔ امر	
(8)	وہب ایل۔ وتار۔ یونعم۔ بن وہب ایل	متحد خاندان ہے
(9)	وہب ایل۔ یا حوذ۔ ملک سبا	
(10)	کرب ایل۔ وتار۔ یونعم۔ بن وہب ایل	متحد خاندان ہے
(11)	یویمن۔ بن وہب ایل۔ ملک سبا	
(12)	ذمر علی ذرح۔ ملک سبا	متحد خاندان ہے
(13)	تشا کریب۔ یوہمیں۔ ملک سبا	

متفرق نام

(14) تبروم ۔یوہیمین ۔ملک سبا۔(15) یکرب ۔ملک ۔وتار۔ملک سبا۔(16) یارم ۔ایمن ۔ملک سبا (۱۷) تبع شرجیل ۔ملک سبا (18) فرع ینہب ۔ملک سبا

ان ناموں کے علاوہ کتبات میں اور نام بھی پڑھے گئے ہیں۔لیکن ان کے ساتھ کوئی لقب شاہی نہیں ہے ممکن ہے کہ امرآئے سبا ہوں۔فرع ہنیب کا نام سب سے آخر اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ ایک کتبہ میں۔''الیشرح ملک سبا وذوریدان ......بن فرع ینہب ملک سبا۔'' منقوش ہے۔اس سے ثابت ہے کہ فرغ ینہب ۔ملک سبا کے لقب سے آخری شخص تھا اس کا بیٹا۔ملک سبا۔ذُوریدان کے نام ہے تیسرے طبقہ کا بانی ہے۔

سبا کی تقسیم و تنظیم

مملکت سبا کی حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ مملکت یمن کس اصول پر منقسم تھی اور امرا کی ترتیب وتنظیم کیونکر تھی۔ایک قلعہ ہوتا تھا۔قلعہ کے آس پاس گاؤں کی صورت میں میں چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہوتی تھیں۔انھیں کے مجموعہ کو محفد کہتے تھے۔قلعہ دار گاؤں کا حاکم ہوتا تھا۔اس کا لقب اس کے قلعہ کی انتساب واضافت سے ہوتا تھا۔مثلاً ذوغمدان، ذوثعلبان اور ذبنیین ۔ذو یمنی زبان میں کلمہ اضافت ہے جس کے معنی آقا کے ہوتے ہیں۔اس لئے حجازی عربی میں اس کے معنی صاحب اور مالک کے ہیں۔اور بغیر اضافت مستعمل نہیں ہوتا۔اس ''ذو'' کی جمع اذواء ہے۔زبان یمن میں بمعنی قلعدار کے مستعمل ہوتا ہے۔

یہ قلعے مل کر ایک مخلاف کے تابع ہوتے تھے۔جس کو صوبہ کا ہم معنی سمجھنا چاہیے۔حاکم مخلاف کا لقب قیل تھا۔اس کی جمع اقیال ہے۔عام طور سے مشہور ہے کہ اقیال یمن کے بادشاہوں کو کہتے ہیں محفد اور مخلاف کی یہ تقسیم عہد اسلام میں بھی باقی رہ گئی تھی۔دولت عباسیہ کے زمانے میں 84 مخلاف تھے۔یہ تمام اقیال ایک بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔جس کا نام باختلاف عہد مکارب سبا اور ملک سبا تھا۔

ان اذواء واقیال اور ملوک میں امن واطمینان اور نظام زندگی بہت کم قائم رہتا تھا۔قوی ضعیف کے ماتحت ہوجاتے تھے۔جو''ذو'' یا ''قیل'' قوی ہوجاتا تھا وہی بادشاہ بن بیٹھتا تھا۔عموماً بادشاہ کسی قلعہ میں سکونت کرتا تھا اس قلعہ کی طرف بھی سکونت القاب شاہی کا جزو ہوتی تھی۔مثلاً ملک سبا قلعہ ریدان میں رہتا تھا اس کا لقب شاہی۔ملک سبا ذوریدان تھا۔

سبا کے تمدنی اور تجارتی حالات

حکومتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔صلح پسندانہ اور فاتحانہ۔بابل۔اسیریا اور مصر کی حکومتیں فاتحانہ تھیں۔ان کے اثار وکتبات فتوحات کی یادگاروں سے پر ہیں۔لیکن یمن کی حکومت بالکل صلح پسندانہ تھی۔سبا کے جتنے کتبات دیکھے گئے ہیں۔جن کی تعداد 30،40 سے کم نہ ہوگی

وہ تمام ثریا مقابر کی لوحیں ہیں یا عمارتوں کے پتھر ہیں۔ یا دیوتاؤں کے ہیکل ہیں۔ مذبح پر نذر وشکو کے سپاس نامے ہیں۔

ہم نے پہلے بتلا دیا ہے کہ سبا ایک تاجر قوم تھی۔ جس کی صحیح مثال موجودہ تاریخ میں حکومت برطانیہ ہے۔ عرب کے ملک میں کثرت سے سونے اور چاندی کی کانیں تھیں۔ اور اب بھی ہیں۔ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب میں ص 250 مطبوعہ لنڈن میں ان کانوں کا ایک ایک کر کے نام گنوایا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ان تمام بیانات کو اپنے جغرافیہ عرب قدیم میں جمع کیا ہے۔ خدیو مصر کے اشارے سے۔ برٹن نامی ایک انگریز۔ عرب کے شہر مدین میں صرف وہاں کے معدنیات کا پتہ لگانے کو بھیجا گیا تھا۔ حضر موت اور یمن کا ملک خوشبودار چیزوں کی پیداوار کے لئے طبعی طور سے مخصوص ہے۔ اس زمانے میں تمام دنیا میں دیوتاؤں کی عام طور پر پرستش کی جاتی تھی۔ ان کے لئے بڑے بڑے ہیکل بنائے جاتے تھے۔ ان ہیکلوں میں شب و روز خوشبودار لکڑیاں جلائی جاتی تھیں۔ اس لئے قدیم زمانہ میں ہر ملک سے ان کی بڑی مانگ تھی عمان و بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں۔ اور یمن کے ساحل ہندوستان اور حبش کی پیداوار کی منڈی تھے۔ یہ تمام تجارتی اشیاء اس عہد میں سباہی کی وساطت سے بحر احمر کے راستے سے یا حجاز کی راہ سے شام۔ فینشیا اور مصر کو جاتی تھیں۔ اور یہاں سے تمام یورپ میں پھیلتی تھیں۔

تورات سبا کی دولت وعظمت سے پر ہے۔ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کہتے ہیں۔

سبا اور شبا کے بادشاہ اس کو نذر دیں گے...... شبا کا سونا اس کو پیش کیا جائے گا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ملکہ سبا آتی ہے۔

وہ بہت فوج۔ تزک و احتشام کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوئی۔ بہت سے اونٹوں پر خوشبو کی چیزیں۔ بہت سا سونا اور بیش بہا جواہر لدے تھے...... ملکہ نے 130 قنطار سونا اور بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر سلیمانؑ کو دے کر ملکہ نے جیسی خوشبوئیں دیں ویسی پھر نہ ملیں۔ تورات سفر ایام

اشعیاہ نبی کی پیشن گوئی ہے۔

حبش اور سبا والوں کی تجارت جو شریف ہیں۔ تیرے پاس آئے گی۔ (14-145)

خرقیال نبی کہتے ہیں۔

جمہور آدمیوں کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے آئے۔ جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور سروں پر خوبصورت تاج (43-42) سبا اور عماہ تیرے تاجر ہیں وہ عمدہ خوشبو، جواہر اور سونا، تیرے بازاروں میں بیچتے ہیں۔ حرأن۔ قانہ اور عدن (یہ تینوں یمن کے شہر ہیں)

تیرے تاجر ہیں۔ سبا اور اثور اور کلماد تیرے تاجر ہیں۔

اشعیاہ کی نبوت ہے۔

اونٹوں کی قطاریں (اے یروشلم) تجھ پر چھا جائیں گی۔ مدین اور عیفا کی اونٹنیاں تمام
سبا سے سونا اور لوبان لائیں گی (6-60)

یرمیاہ نبی۔ بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہیں کہ خدا کہتا ہے جب تمہارے اعمال صحیح نہیں تو ہیکلوں میں سبا کا لوبان میرے پاس کیوں پیش کرتے ہو۔ ک (6-60)

چوتھی صدی ق م سے پہلی صدی ق م تک یونانی مصر کے حکمران تھے۔ ان کے عہد میں مصر کا دارالحکومت اسکندریہ تمام مشرقی اور مغربی تاجروں کا مرکز تھا۔ سبا اس عہد میں سب سے بڑی قوم تھی۔ اس بنا پر وہ دیگر قبائل عرب کی نسبت سبا سے زیادہ واقف تھے۔ اراٹو سٹھنس (Aratosthenes) (94ء ق م) بیان کرتا ہے۔

عرب کی انتہائی حد پر۔ سمندر۔ (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں...... سبا کے لوگ ہیں۔
جن کا دارالحکومت م آرب (Marbla) ہے۔ یہ قطعہ ملک مصر زیرین سے بڑا ہے۔
گرمیوں میں بارش ہوتی ہے۔ اور دریا جاری ہوتے ہیں۔ جو میدانوں اور تالابوں میں
جا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب سے زمین اس قدر سبز اور شاداب ہے کہ تخم ریزی
وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے۔
حضر موت سے سبا کے ملک تک 40 روز کا راستہ ہے۔ اور معین سے سوداگر 70 دن میں
ایلہ (عقبہ) میں پہنچتا ہے۔ حضر موت معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں۔ اور ہیکلوں
اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

یونانی مؤرخ اگا تھر شیدس (Agarthercbides) (145 ق م) جس کی تصنیف کا زمانہ دوسری صدی ق م ہے۔ بیان کرتا ہے۔

سبا عرب ابادان (Arabia Flix) میں رہتے ہیں۔ جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار
میوے ہوتے ہیں۔ زمین متصل بحر میں بلسان اور نہایت خوبصورت درخت ہوتے
ہیں جو دیکھنے میں نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اندرون ملک میں بخورات۔ دارچینی۔
چھوہارے وغیرہ کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت
شیریں بو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و
وصف مشکل سے جو خوشبو اس میں اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی
تعریف لفظوں میں نہیں ادا نہیں ہو سکتی۔ جو اشخاص اس زمین سے دور ساحل پر سے بھی

گذرتے ہیں وہ بھی جب ساحل سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محفوظ ہوتے ہیں۔ان مسالوں کو وہاں کاٹتے نہیں اور کاٹکر ان کا انبار نہیں لگاتے۔لیکن چونکہ شگفتہ اور تازہ رہتے ہیں۔اس لئے جو شخص اس ساحل سے گذرتا ہے گویا آب حیات کا لطف اٹھاتا ہے۔یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے لحاظ سے ناقص ہے۔

سبا میں حکومت وراثتاً منتقل ہوتی ہے۔ان کا بڑا شہر مآرب ہے۔جو ایک پہاڑ پر واقع ہے۔اس پہاڑ کو جبل ابلق کہتے ہیں۔بادشاہ اسی شہر میں رہتا ہے۔جو لوگوں میں فیصلہ دیتا ہے۔لیکن کبھی اس کو اجازت نہیں کہ وہ اپنا قصر چھوڑ کر نکل سکے۔اگر وہ اس کے خلاف کرتا ہے تو حسب حکم مذہبی سنگسار کر دیا جاتا ہے۔

سبا تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے بُعد ودوری کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا۔اس لئے خصوصاً ان کے دارالحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں۔تخت اور پیشگا ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ایوان اور دروازے زرد جواہر سے منقش ہیں۔اس قسم کی زیب وزینت پر نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

مشہور مؤرخ آرٹی میڈوروس (Artimidous) (100 ق م) باشندۂ شہر افسوس (Ephesus) جو سبا کے عہد آخری میں تھا لکھتا ہے۔

سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے۔جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زمانہ خوشحال (عیش وعشرت ارائش و مسرت) میں واقع ہے۔میووں کی بکثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہو گئے ہیں۔خوشبودار درختوں کی جڑ میں لیٹے پڑے رہتے ہیں۔جلانے کی لکڑی کے بدلے دارچینی اور خوشبو دار لکڑی جلاتے ہیں۔کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے۔اور کچھ ملکی اور غیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں۔یہ مسالے مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں۔جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں (قفہ) میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں۔قرب وجوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمرایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام و جزیرے تک پہنچتے ہیں۔

سبا کی عمارتیں

ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ سبا ایک صلح پسندانہ امن و مسرت کی حکومت تھی۔یہی سبب ہے کہ اس نے اپنی قوت کا زیادہ تر حصہ اسلحہ کے بجائے عمارتوں پر صرف کیا یونانی مؤرخین کے بیان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ان میں سے بعض عمارتیں عہد اسلام تک

باقی تھیں۔مسلمان مؤرخین نے خود دیکھا اور اپنی کتابوں میں ان کے حالات لکھے ہیں۔ ہمدانی نے اکلیل کا ایک باب صرف انہیں عمارتوں کے لئے مخصوص کیا ہے۔سبا کے اب تک جو کتبات ملے ہیں وہ زیادہ تر انہیں عمارات شاہی کی یادگاری لوحیں ہیں۔نشوان ابن سعید حمیری نے قصیدۂ حمیریہ میں تقریباً 25 عمارات شاہی کا ذکر کیا ہے۔یورپین سیاح بھی ان عمارات کے کھنڈروں کے عجیب و غریب حالات بیان کرتے ہیں۔قصر سلحین جو قیام گاہ شاہی تھا اس کے نشان اب تک موجود ہیں۔

سدمآرب یا بندعرم

اسی سلسلہ عبارت میں ایک چیز بند آب ہے۔جس کو عرب حجاز ''سد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں۔عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں۔صرف سلسلہ کوہستان ہے۔پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگستانوں میں خشک ہوجاتا ہے اور ضائع ہوجاتا ہے زراعت کے مصرف میں نہیں آتا۔سبا نے مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھے تھے کہ پانی رک جائے اور قبضہ ضرورت زراعت کے مصرف میں آئے مملکت سبا میں اس قسم کے سینکڑوں بند تھے ان میں سب سے مشہور سدمآرب تھا۔جو خود دارالحکومت کے اندر واقع تھا۔

شہرمآرب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں۔جن کا نام کوہ ابلق ہے۔دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادی اذینہ ہے۔پہاڑوں سے اور ادھر ادھر سے پانی جمع ہوکر وادی اذینہ میں ایک دریا جاری کردیتا ہے۔سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً 800 ق م میں سدمآرب تعمیر کی تھی۔یہ تقریباً 150 فٹ لمبی اور 50 فٹ چوڑی ایک دیوار ہے۔اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے۔لیکن تاہم اس کی ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔ارناؤ (Arnao) ایک یورپین سیاح نے اس کے موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشیائٹ سوسائٹی کے جرنل میں لکھا ہے۔اور اس کا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے تیار کیا ہے۔اس دیوار پر جابجا کتبات ہیں وہ بھی پڑھے گئے ہیں۔

عام مسلمان مؤرخین چونکہ ہر قدم عمارت کو بنائے سلیمانی کہنے کے عادی ہیں۔اس لئے وہ اس سد کا بانی بلقیس ملکہ یمن وحرم سلیمانی کو قرار دیتے ہیں۔لیکن سدمآرب کے بقیہ حصہ پر جو کتبات ہیں انھیں بانیوں کے نام بھی خوش قسمتی سے باقی رہ گئے ہیں۔ان میں سے (1) ثیع امر بین ابن سمہی علی نیوف مکارب سبا۔(2) مکہی علی نیوف بن ذمرعلی مکارب سبا (3) کرب ایل بین بن ثیع امر مکارب سبا (4) ذمرعلی درح ملک سبا (5) یدع ایل وتار کے نام پڑھے گئے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سد ایک زمانہ ممتد مین مختلف سلاطین کے عہد میں تعمیر ہوا ہے۔اس کا پہلا بانی یثع امر تھا جو آٹھویں صدی ق م میں تھا۔اس سد میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں اوپر سے نیچے تک کی کھڑکیاں حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔سد کے دائیں بائیں مشرق ومغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہوکر چپ وَراست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔اس سد کے حالات ہمارے مفسرین نے جو بیان کئے ہیں۔(تفاسیر طبری اور بغوی) بعینہ ارناؤ کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔نقشہ مندرجہ آغاز کتاب کے دیکھنے سے صورت حال اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے گی۔

اس نظام آب رسانی سے چپ وراست دونو جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر 300 میل مربع میں سینکڑوں کوس تک بہشت

زار تیار ہوگئی تھی۔جس میں انواع واقسام کے میوے اور خوشبودار اور درخت تھے ان کی خوشبو دور تک پھیلی رہتی تھی۔

جنت سبا اور قرآن مجید

قرآن مجید اپنی ان آیات میں انھیں باغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ‌ۚ جَنَّتٰنِ عَنۡ يَّمِيۡنٍ وَّشِمَالٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ‌ ؕ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ (سبا۱۵)

سبا کے لوگوں کے لئے خود ان کے گھر میں قدرت خدا کی ایک عجیب نشانی موجود تھی۔وہ باغوں کا سلسلہ۔ داہنے بائیں۔سبا کے لوگو! اپنے پروردگار کی (دی ہوئی) روزی کھاؤ اور شکر کرو۔شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا

ہمارے پاس اس جنت زار کے قصے بروایت عرب واقعہ سے کئی سو سال بعد کے موجود ہیں۔لیکن خود ہمارے دشمنوں کے سفینوں میں اس کی معاصرانہ شہادتیں جو محفوظ ہیں ان کو ایک بار پھر پڑھ لیا جائے۔

اراٹوستھینس (Eratasthenes) جو 194 قبل مسیح میں سبا کا معاصر تھا۔تحریر کرتا ہے۔

> سبا کے لوگ وہ ہیں جن کا دارالحکومت شہر مآرب ہے...... یہ قطعہ ملک مصر زیرین سے بڑا ہے۔یہاں گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں۔جو میدانوں اور تالابوں میں خشک ہوجاتے ہیں۔اس سبب سے زمین اس قدر سرسبز وشاداب ہو کر تخم ریزی وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے۔

آغاز تھارشیدس (Agartharehides) جو 145 ق م میں سبا کے زمانہ وعصر میں تھا بیان کرتا ہے۔

> سبا عرب کے حصہ سرسبز وآباد (Arabia Flix) میں رہتے ہیں۔جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔دریا کے کنارے جو زمین ہے اس میں نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔اندرون ملک میں بخورات۔دارچینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کی گنجان جنگل میں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت وتنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام دوصف مشکل ہے۔جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوسکتی۔جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گذرتے ہیں۔وہ بھی ساحل کی طرف سے جو ہوا چلتی ہے اس سے محظوظ ہوتے

ہیں......وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔

کیا ان بیانات کو دیکھ کر اور خصوصاً او پر والی عبارتوں کو پڑھ کر ان مقامات کو جیسا کہ وحی الٰہی نے اپنے الفاظ امثالیہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ دنیا کی بہشت نہ کہیں گے۔

قرآن مجید ان کا س آخر نتیجہ بتلاتا ہے۔ اور وہ وہی ہیں جو تمام دنیا کے اہل دولت و اقتدار اقوام کو اپنی عظمت شعاری اور جفا کاری کی پاداش میں آخر کار پیش آتے ہیں۔ الفاظ قرآنی یہ ہیں۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ

پھر انہوں نے سرتابی کی تو ہم نے ان پر بند (توڑ کر اس کا) سیلاب بھیجا۔

یہ سیلاب آیا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس عصر تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابل شک و اشتباہ ہے۔ خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز نظام کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا۔ یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا۔ یہ عیسائی فاتح بھی وہی شخص ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر (ابرہہ) کعبہ مکرمہ کو ڈھانے نکلا تھا۔ لیکن آج اسی دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبہ مشرفہ کی کتاب مقدس کی تصدیق کے لئے بلند ہے۔

زمانہ ابرہہ کا ایک نہایت قدیم کتبہ ذیل کی عبارت میں بند عرم کے ٹوٹ جانے کی تصدیق کرتا ہے۔

اسی اثنا میں م آرب کے بند (سد) کی دیوار حوض اور دروازوں کے ٹوٹنے کی خبر ماہ ذوالمدرح 657 یمنی مطابق 543 عیسوی میں آئی۔

اس سلسلہ کی آیندہ الفاظ قرآنی یہ ہیں۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَّأَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿١٦﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجْزِيْٓ إِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿١٧﴾

اور ان اعلیٰ میووں کے باغوں کے بدلے۔ معمولی پھلوں یعنی پیلو جھاؤ اور کچھ بیری کے باغ دے دیئے۔ یہ ان کے کفر کی سزا ہے۔ ہم کفران نعمت کرنے والوں ہی کو سزا دیتے ہیں۔ (سبا)

قرآن مجید جب نازل ہو رہا تھا تو اس سزا کو جوان درختوں کی شکل میں نمودار ہوئی تھی۔ یمن کا ہر باشندہ بچشم خود معائنہ کر رہا تھا۔ لیکن 400 برس کے بعد بھی برائے العین ہر سیاح کو نظر آ رہی تھی ہمدانی المتوفی 330ھ جس کی صداقت بیانی کے نہ صرف سیاحین یورپ بلکہ اثر بین (ارکیالوجسٹ Achrobogests) بھی معترف ہیں۔ وہ چوتھی صدی کے اوائل میں شہادت عینی پیش کرتا ہے کہ ان باغوں کی جگہ

یہاں پیلو کے درخت اتنے ہیں کہ کہیں اور نہیں۔

ہم نے سبا کے دائرہ حکومت کے تحت میں لکھا ہے کہ یمن کے علاوہ حبشہ اور شمالی عرب میں بھی سبا کی نو آبادیاں تھیں تورات و اسفار میں متفرق خاندانوں کے نام بتائے گئے ہیں (1) سبا بن یقطان (قحطان) باشندہ یمن (2) سبا بن...... بن ابراہیم برادرزادہ مدین باشندہ عرب شمال (3) سبا بن کوش بن حام باشندہ حبش (سفر تکوین)۔

نولڈ کی کے اصول کی بنا پر کہ تورات کے قبائل واقوام کا مقسم صرف جغرافی نسب و تعلق ہے۔ان تینوں متفرق النسب سبا کے یہ معنی ہیں کہ سبا کے تین جغرافی مرکز ابادیاں تھیں۔یمن۔حبشہ۔اور شمال عرب میں یمن میں سبا کا وجود قیام تو محتاج بیان نہیں۔روایات عرب۔ تاریخ اقوام اور اثار قدیم میں ان سب کی شہادت قاطعہ موجود ہے دیگر اطراف ملک میں بھی ان کا وجود واثر مخفی نہیں ہے۔شمال عرب میں بطرف شام و عراق تورات کے متعدد فقروں میں ان کا نام و وجود عارضی نہایت قدیم زمانہ سے مذکور ہے۔اور ان کا بار بار ذکر اوپر گذر چکا ہے۔(دیکھو سبا کا دائرہ حکومت اور سبا کی دولت و عظمت) یونانی مؤرخین نے بھی ان اطراف میں ان کا ہونا بیان کیا ہے۔اغا سارسیدوس (145 ق م) کہتا ہے کہ سب سے پہلے نبطی (جن کا مسکن عراق و شام کے درمیان تھا) عرب سعید پر قابض ہوئے ہیں ا۔ایک اور یونانی مؤرخ بیان کرتا ہے۔

> یہاں سے اس شہر تک ایک سڑک جاتی ہے۔جس کا نام پیڑا (رقیم) ہے۔جہاں اہل قریہ۔اہل معین اور وہ تمام اس کے قریب رہتے ہیں۔جو بالائی ملک (عرب) سے بخورات لاتے ہیں۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اسیریا کے آثار میں بھی یثع امر سبائی کا ساتویں صدی ق م میں اسیریا سے مغلوب ہونا مذکور ہے معلوم ہے کہ اہل اسیریا کبھی یمن نہیں آئے۔اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ خود سبا یہاں تک پہنچ گئے تھے جیسا کہ سفر ایوبؑ (1-15) و (6-19) سے بھی ثابت ہے۔

حبشہ میں اہل یمن کا وجود عہد قدیم سے تھا۔حبشہ یمن کے مقابل سوال پر واقع ہے۔یہ ساحل تاریخ کی ابتدا سے اس وقت تک یمنی اور حضر موتی عرب کی جولانگاہ ہیں۔بعض کتبات سے معلوم ہوا ہے کہ سبا کا ایک گورنر معافر کے لقب سے حبشہ میں رہتا تھا ۳۔خود حبش بھی اپنے کو سبا کی اولاد کہتے ہیں ۴۔ایک یونانی مؤرخ کی شہادت بھی۔جو سبا کا معاصر تھا پہلے گذر چکی ہے کہ سبا ساحل حبشہ میں بھی تجارت کا مرکز رکھتے ہیں۔

ملکہ سبا (بلقیس)

تورات (مبہم) انجیل اور قرآن میں سبا کی ایک شاہزادی کا ذکر ہے جو حضرت سلیمانؑ کی بارگاہ میں آئی تھی یہ سبا کی شاہزادی بزبان تورات کس سبا کے خاندان سے تھی؟ یا بزبان تاریخ سبا کس آبادی سے آئی تھی؟ تورات میں صرف سبا کی شہزادی کا لفظ بلا تعین خاندان و جہت ہے۔ترگوم (ترجمہ تورات بزبان عبرانی) میں ہے کہ اس کا مقام فلسطین کے مشرق میں ہے۔انجیل میں ہے کہ وہ

(فلسطین کے جنوب سے آئی تھی۔ یوسیفورس اسرائیل کی تاریخ میں ہے کہ وہ مصر وحبشہ کی شہزادی تھی۔ اہل حبش اس کو حبشی سمجھتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کوشی خاندان کی سبائی خاتون تھی۔ قرآن نے بھی کوئی تعین خاندان وجہت نہیں کی ہے۔ لیکن تمام مفسرین ومؤرخین اس کو عرب قحطانی اور باشندۂ یمن سمجھتے ہیں آج کل کہ اثریات کا زمانہ ہے۔ اس بنا پر کہ یمن کی عورت کا کوئی کتبہ نہیں ملا ہے اور شمال عرب میں متصل عراق تین چار قدیم حکمران عورتوں کے نام ملے ہیں۔ ملکہ سبا کا اس حصہ آبادی سے جانا ممکن خیال کیا جاتا ہے۔

جن قدیم تحریروں میں ملکہ سبا کا ذکر ہے ان میں سے صرف تین جہت میں تعین ہے۔ یوسفیورس۔ ترگوم اور انجیل۔ یوسفیورس کا بیان کہ وہ مصر کی شہزادی تھی مطلقاً غلط ہے۔ بقیہ بیانات میں کہ وہ مشرق وجنوب یا حبشہ کی تھی ہمارے نزدیک کوئی فرق نہیں کہ یہ سب سبا کے مقامات تھے۔ تاہم اصل مرکز کے لحاظ سے وہ یمن ہی کی کہی جائیگی۔ یعنی جنوب عرب کی جیسا کہ انجیل کی شہادت اور روایات عرب کا تواتر ہے۔

اہل حبش جو ملکہ سبا کو حبشہ کی بتاتے ہیں اور اب تک حبشہ کا شاہی خاندان تفاخراً اپنے کو اسی ملکہ سبا کی اولاد یقین کرتا ہے۔ اس کا نام ان کی زبان میں ماکدہ ہے۔ یمن کے عرب یہود میں اس کا نام بلقیس مشہور تھا اور اسرائیلیات کے ذریعہ سے یہی نام مسلمان مؤرخین اور اہل تفسیر میں مقبول ہے۔ لیکن لفظی دلالت کے لحاظ سے یہ عربی نہیں۔ بلکہ یونانی الاصل نام معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات میں بلقیس کو پریزاد کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی ماں (بلقمہ) ایک پری تھی۔ لیکن یہ روائتیں بالکل لغو اور موضوع ہیں۔ بلقمہ کو ممکن ہے کہ یمن کی دیبی المقہ سے کوئی مناسبت ہو۔ اسی طرح اہل تاریخ کا ملکہ سبا بلقیس کو بنت شرجیل لکھنا بھی غلط ہے کیونکہ شرجیل حمیر کے بادشاہ اور حضرت سلیمانؑ سے ڈیڑھ ہزار برس کا فاصلہ پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید اور ملکۂ سبا

سبا کا نام قرآن مجید میں دوبار آیا ہے۔ اول حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ملکہ سبا کے نام سے دوسری بار سیل عرم کے ذکر میں۔ سیل عرم کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ ملکۂ سبا کا قصہ سورۂ نمل میں مذکور ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ﴿٢٠﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٦﴾ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ۝ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۝ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ۝ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ۝ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۝ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ۝ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ؗ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ۝ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ۝ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ۝ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ۝ قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ۝ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ۝ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۝ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ۬ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ (النمل)

سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا۔ پھر کہا۔ کیا مجھے ہے کہ میں نے ہدہد کو نہیں دیکھا یا وہ موجود نہیں۔ میں اس کو سخت سزا دوں گا۔ یا ذبح کر ڈالوں گا۔ یا کوئی صاف دلیل لائے۔ سلیمان تھوڑی دیر ٹھہرے کہ ہدہد آ کر گویا ہوا مجھے وہ معلوم ہوا جو آپ کو نہیں۔ سبا سے ایک سچی خبر لے کر میں آیا ہوں۔ میں نے تو ایک

عورت کو دیکھا جو سبا پر حکومت کرتی ہے۔اس کو ہر شے عنایت کی گئی ہے۔س کا ایک بڑا تخت ہے۔میں نے اس کو اوراس کی رعایا کو۔خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے پایا۔شیطان نے ان کے اعمال ان کی نگاہ میں اچھے کر کے دکھائے ہیں۔صحیح راستہ سے ان کو باز رکھا ہے۔وہ راہ نہیں پاتے کہ خدا کو سجدہ کریں۔جو آسمانوں سے اور زمینوں سے چھپی ہوئی چیزوں کو باہر نکالتا ہے۔اور جو تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو سب جانتا ہے۔خدا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی بڑے تخت کا مالک ہے۔سلیمان نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تو سچ کہتا ہے یا جھوٹا ہے میرا یہ خط لے جا۔ان کے پاس ڈال دے۔پھر ان سے الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ملکہ نے خط پا کر یوں ہی کہا میرے نام نامہ مقدس آیا ہے۔یہ نامہ سلیمانؑ کے پاس سے آیا ہے۔عبارت یہ ہے۔مہربان اور رحم کرنے والے خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں۔مجھ سے سرکشی نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس چلے آؤ ملکہ نے کہا اے سردار۔میں اس معاملہ میں کسی بات کا فیصلہ کرنے والی نہیں ہوں سردارں نے کہا۔ہم زور قوت والے ہیں۔یوں فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔دیکھیں کیا حکم دیتی ہیں۔ملکہ نے کہا بادشاہ جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں اس کو ویران کر ڈالتے ہیں اور وہاں کے معززین باشندوں کو ذلیل کر ڈالتے ہیں۔اور (برابر) اسی طرح کیا کرتے ہیں۔میں ان کے پاس ہدیہ دے کر قاصد بھیجتی ہوں۔پھر دیکھتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتا ہے۔قاصد جب سلیمان کے پاس پہنچا تو سلیمان نے کہا کہ اس حقیر مال و دولت سے تم میری مدد کرتے ہو۔خدا نے مجھ کو جو کچھ دے رکھا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو ان کو اس نے دیا ہے۔تم اپنے اس تحفہ پر شاداں ہو۔سبا کو واپس جا۔ہم اب لشکر لے کے آئیں گے کہ جس کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گی اور ملک سبا سے ذلیل کر کے ان کو نکال باہر کریں گے۔سلیمانؑ نے پھر اپنے سرداروں سے کہا کون اس کا تخت میرے پاس اٹھا لائے گا۔ایک تنومند جن نے کہا میں اس سے پہلے کہ آپ دربار سے اٹھیں۔وہ تخت اٹھا لاتا ہوں۔میں اس تخت کے اٹھالانے کی قوت رکھتا ہوں اور امانت کے ساتھ لاؤں گا۔جس کو خط (کتاب) کا علم تھا اس نے کہا کہ نگاہ پلٹنے سے پہلے میں اٹھا لاتا ہوں۔سلیمانؑ نے جب وہ تخت اپنے سامنے رکھا دیکھا کہ یہ خدا کے فضل سے ہوا تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کر رہا ہوں کہ ناشکری کر رہا ہوں۔اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے کرتا ہے۔اور جو کوئی ناشکری کرے تو خدا بے پروا اور بزرگ ہے۔سلیمانؑ نے حکم دیا کہ تخت کا روپ بدل دو۔وہ راہ پاتی ہے یا نہ راہ پانے والوں میں سے ہوتی ہے جب ملکہ آئی تو اس سے کہا کہ تیرا کیا تخت اسی قسم کا ہے۔جواب دیا کہ گویا وہ ہی ہے اور اس سے پہلے ہم کو علم دیا چکا تھا

اور وہ کافر قوم سے تھی۔ ملکہ (بلقیس) سے کہا گیا کہ محل کے اندر چل۔ جب اس نے محل کو دیکھا تو وہ سمجھی کہ پانی ہی بھرا ہے۔ تو اس نے اپنی دونوں پنڈلیاں کھول دیں۔ سلیمان نے کہا یہ تو شیشہ کا مکان ہے۔ ملکہ نے کہا خدایا! میں اپنی جان پر ظلم کرتی رہی۔ سلیمان کے ساتھ میں بھی خدا کی جو تمام دنیا کا پروردگار ہے۔ اطاعت گذار ہوئی یعنی اسلام لائی۔

بعینہ یہی قصہ اسفار یہود میں بھی مذکور ہے۔ گو تفصیل و اجمال میں کس قدر اختلاف ہے۔ سب سے عمیم کے سفر ایام اور سفر ملوک میں یہ قصہ مذکور ہوا ہے۔ اور یہ دونوں اسفار بیان واقعہ میں حرف حرف متفق ہیں۔

جب سلیمانؑ کا شہرہ سبا کی ملکہ تک پہنچا تو مشکل سوالوں سے وہ اسے آزمانے آئی اور بڑی فوج اور شان و شوکت سے یروشلم (بیت المقدس) میں داخل ہوئی۔ بہت سے اونٹوں پر خوشبو کی چیزیں بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہر لدے تھے۔ وہ سلیمانؑ کے پاس آ کر ٹھہری اور جو کچھ اس کے دل میں تھا اس کی بابت اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا۔ سلیمانؑ سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی جو جواب نہ دیتا۔ سبا کی ملکہ نے جب سلیمانؑ کی دانشمندی اور اس کے گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کے کھانوں اور اس کی نشست و برخاست کے طور کو اور ان کی پوشاک کو ہوا اور اُن ساقیوں کو اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خداوند کے مسکن پر چڑھتا تھا (یہ ملوک کی آیت سے) سفر ایام میں اس کے بجائے یہ ہے۔ اور ان قربانیوں کو جو وہ خداوند کے مسکن پر چڑھایا کرتا تھا۔ دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے تیرے کاموں کی نسبت اپنے ملک میں جو سنا تھا وہ تحقیق تحقیر تھی۔ لیکن جب تک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا باور نہیں آتا تھا لیکن جو دیکھا اس کا آدھا بھی نہیں سنا تھا۔

مبارک ہیں تیرے لوگ اور مبارک ہیں تیرے نوکر۔ جو ہمیشہ تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت کی باتیں سنتے ہیں۔ خداوند تیرا مبارک ہو۔ جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھ کو اسرائیل کے تخت پر بٹھلایا۔ کیونکہ خداوند اسرائیل کو اب تک پیار کرتا ہے اور تجھ کو اس نے بادشاہ بنایا کہ تو عدل و انصاف کرے۔

ملکہ نے 120 قنطار سونا اور بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر سلیمان کو دیئے۔ ملکہ نے جیسی خوشبوئیں پیش کیں ایسی پھر کبھی نہ ملیں۔ سلیمانؑ نے سبا کی ملکہ کو جو کچھ اس نے مانگا اس سے زیادہ تحفہ دیا اور ملکہ اپنے ملازموں سمیت اپنے ملک کو پھر گئی۔ (سفر ایام باب 9، 2

ملوک باب 10، ایس طیب 12: 1-20)

توگوم (دوم براسترا) میں جو تورات اور نبیم کا ارامی ترجمہ بلکہ ارامی زبان میں ان کی تفسیر ہے۔ یہ قصہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ گو بعض نہایت لغو باتوں کی بھی اس میں آمیزش ہے۔ ترگوم کی مندرجہ روایت کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

سلیمان عرق انگور پی کر جب نشاط میں آتے تھے تو تمام بادشاہوں کے سامنے اپنے غلاموں کو بٹھاتے تھے اور اس وقت تمام زندہ مخلوق کو حکم دیتے تھے کہ ان کے سامنے ناچیں۔ ایک دن سلیمانؑ نے دیکھا کہ ہدہد غائب ہے۔ سلیمانؑ نے حکم دیا کہ وہ حاضر کیا جائے۔ جب ہدہد آیا تو اس نے بیان کیا کہ تین مہینوں سے وہ ادھر گھوم رہا تھا اس لئے کہ کوئی ایک ایسا ملک ملے جو اب تک حضور کے ماتحت نہیں ہے۔ آخر مشرق میں ایک ملک ملا۔ جس پر سبا کی ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اس ملک کی خاک سونے سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ وہاں چاندی کوڑے کی طرح گلیوں میں پڑی پھرتی ہے۔ درخت وہاں بدر خلقت سے ایسے ہی ہیں پانی وہاں جنت سے آتا ہے اور وہیں سے بن کر ہار آتے ہیں۔ جن کو لوگ پہنتے ہیں۔ اس ملک کے دارالحکومت کا نام قیطور ہے۔

پھر پرندے نے یہ رائے دی کہ وہ اڑ کر پھر اس ملک کو جائے گا۔ اور وہاں کی ملکہ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ سلیمان نے یہ رائے پسند کی اور خط لکھ کر ہدہد کے بازو میں باندھ دیا گیا۔ ہدہد شام کے وقت جب وہ آفتاب کی عبادت کے لئے جا رہی تھی پہنچا۔ یہ خط ملکہ کے حوالہ کیا۔ ملکہ نے خط پڑھ کر جس میں یہ دھمکی تھی کہ فوراً میری بارگاہ میں حاضر ہو ورنہ اس کی فوج جو جانوروں پرندوں روحوں اور رات کے دیوؤں کی ہے اس سے لڑنے کو آئے گی۔

ملکہ یہ خط پا کر بہت خوف زدہ ہوئی اور اس نے بوڑھوں اور سرداروں کی مجلس میں مشورہ کیا لیکن یہ لوگ سلیمان سے بالکل واقف نہ تھے تاہم ملکہ نے اپنے جہازوں کو بیش قیمت لکڑیوں گراں بہا جواہرات اور موتیوں سے بار کر کے اور چھ ہزار ایک ہی ساعت کے پیدائش۔ ایک ہی قد و قامت۔ ایک ہی شکل و صورت اور ایک ہی حریر سرخ کے لباس میں غلام اور لونڈیاں تحفۃً بھیجیں۔ خط کے جواب میں لکھا کہ:

اگرچہ قیطور اور یروشلم کے درمیان عموماً سات برس کا راستہ ہے تاہم وہ تین برس میں پہنچے گی۔ ملکہ جب یروشلم پہنچی تو ایک شیشہ کے محل میں اس سے سلیمان نے ملاقات کی۔ ملکہ نے یہ سمجھ کر بادشاہ پانی میں بیٹھا ہے پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا۔ سلیمان نے مسکرا دیا

اور یہ دیکھ کر کہ اس کے پاؤں میں بال ہیں۔ بولے کہ شکل تو ایک عورت کی ہے لیکن بال
مردوں کی طرح ہیں۔ پاؤں کے بال مردوں کی زینت ہے۔ لیکن عورتوں کے لئے
عیب۔ ملکہ سبا نے سلیمانؑ سے بہت سی پہیلیاں پوچھیں (تفصیل چھوڑ دی گئی ہے)
سلیمانؑ نے سب کے ٹھیک جواب دیئے۔ (ترگوم۔ ترجمہ تورات وفہیم)

اس عبارت کے جو فقرے گھیر دیئے گئے ہیں وہ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ قرآن جو گذشتہ کتابوں کی تصحیح وتمحیص کے لئے آیا ہے۔ یہ خدمت اس نے کس حد تک انجام دی۔ علاوہ ازیں۔ ترگوم نے اس واقعہ کو جس طرز وعبارت میں ادا کیا ہے۔ وہ بالکل ایک کم پایہ انسان کے معمولی افسانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے قرآن کا طرز ادا ایک شاہانہ پیغمبری۔ ایک تبلیغ دانش و حکمت اور ایک روحانی جبروت واقتدار کے اظہار پر مبنی ہے۔

قرآن کا بیان۔ ترگوم کی واضح غلطیوں سے کہ سبا کا ملک مشرق میں ہے۔ اس کا پایہ تخت قیطور ہے۔ وہاں سونا اور چاندی کوڑے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ دونوں ملکوں میں سات برس کی مسافت ہے۔ پاک وصاف ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قصہ کی غرض و غایت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ترگوم کی بنا پر ملکہ سبا کی طلب صرف شاہانہ ملک گیری کی ہوس پر مبنی ہے۔ لیکن قرآن کے لحاظ سے اس طلب کا مقصد دعوت الی اللہ منع شرک۔ قمع کفر اور اصلاح نفوس انسانی ہے۔

ایک اور بات قابل لحاظ ہے۔ ترگوم کے مطابق حضرت سلیمانؑ سبا سے واقف نہ تھے اور تعجب وحیرت زائی کا سبب سب کی دولت و حشمت کا مبالغہ آمیز بیان تھا۔ لیکن وحی قرآنی نے اس حیرت وتعجب کا سبب اس طرح بیان کیا ہے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍۭ بِنَبَإٍ يَّقِيْنٍ﴿۲۲﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ﴿۲۳﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ﴿۲۴﴾ (نمل)

ہدہد نے کہا میں سب سے ایک تحقیق خبر لایا ہوں۔ میں نے پایا کہ ایک عورت ان پر بادشاہ ہے۔ جس کو ہر
چیز دی گئی ہے۔ اس کا ایک بڑا تخت ہے میں نے اس کو اور اس کی قوم کو آفتاب کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا۔
نہ خدا کو۔ شیطان ان کے کاموں کو ان کی نظر میں اچھا کر کے دکھاتا ہے۔ پھر ان کو راہ سے روک دیتا ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ بالا عبارت سے روشن ہو گیا کہ بخلاف ترگوم کے۔ سبا کی شہزادی کی طلبی اس کے ملک پر فوج کشی یا اس کے تمول اور خوشحالی پر استعجاب جو کچھ تھا۔ وہ صرف ایک اسی غرض ومدعا کی بنا پر کہ کیا دنیا میں ایسے غافل اور بے بصیرت بندگان خدا بھی بستے ہیں جو باوجود اتنی کثیر اور کافی نعمات الٰہی کے بھی اس کا شکر ونعمت نہیں کرتے بلکہ کفر نعمت کرتے ہیں کہ خالق کی جگہ آفتاب، اس کی مخلوق کی پرستش کرتے ہیں۔ اس واقعہ کے متعلق حضرت سلیمانؑ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ قطعی طور سے ارشاد وہدایت اور تبلیغ رسالت کے تنہا اصول پر مبنی تھا۔

اس واقعہ کے متعلق بعض شکوک کا ازالہ

ترگوم اور قرآن مجید دونوں میں قصہ کی ابتدا ہدہد سے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تمام مفسرین نے اس ہدہد سے یہی مرغ معروف مراد لیا ہے۔لیکن اس زمانہ کے بعض فطرت پرست کہتے ہیں کہ مرغ کا بولنا اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے۔ اس لئے ہدہد کسی انسان کا نام ہوگا۔ اور اس زمانہ میں عموماً یہ نام رکھا جاتا تھا۔ ہمیں اس دعوے کی صداقت سے انکار نہیں کہ ہدہد آدمی کے نام ہوتے تھے۔ خود حضرت سلیمانؑ کے عہد میں مدین کے شہزادے کا نام ہدہد تھا۔

(سلاطین) اور روایات عرب میں ملکہ سبا کے باپ یا بھائی کا نام بھی ہدہد مرقوم ہے۔ لیکن قرآن کے لفظ تفقد الطیر (پرندہ کا جائزہ لیا) کا کیا جواب ہوگا۔ میری رائے میں اب جبکہ جانوروں کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے۔ بندروں کی بولیوں کی ابجد طیار کی جارہی ہے۔ تو ہدہد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو۔ طیر کے معنی فوج کے لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے اسی طرح بے ثبوت ہے۔ جس طرح سرسید کا سورۂ فیل کی تفسیر میں طیر سے فال بد مراد لینا۔ اور اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کرلو نامہ برکبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا اور اس کے بولنے سے مقصود اس مضمون کا خط اس کے پاس پہنچانا سمجھ لو۔ جیسا کہ خود اسی موقع پر قرآن مجید میں ہے کہ حضرت سلیمان نے خط دے کر اس کو ملکہ سبا کے پاس بھیجا۔ اسی طرح پہلے بھی خط لے کر آیا ہوگا۔

(1) دوسری چیز قابل انکشاف ملکہ سبا کا تخت ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کو اپنے دربار میں اٹھوا منگوایا اور اس میں کچھ ردوبدل کر کے ملکہ سے پوچھا کہ تم یہ تخت پہچانتی ہو؟ تمہارا ہے؟ روایات تفسیر میں ہے کہ یہ تخت طلائی تھا اور جواہر سے مرصع۔ یہودیوں کے اسفار نبیم میں ملکہ سبا کے تخت کا مطلق ذکر نہیں۔ لیکن یہ مذکور ہے کہ ملکہ سبا حضرت سلیمان کی خدمت میں بہت سے جواہرات، سونا اور دیگر تحائف لائی۔ جس سے حضرت سلیمان نے ایک ہاتھی دانت کا تخت مرصع و جواہر نگار بنوایا۔ 20۔ ایام باب 9)

تاریخی شہادت سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ سبا میں اس قسم کی صنعت کاری کا رواج عام تھا۔ اگاتھر شیدوس ایک یونانی مؤرخ جو اسلام سے 800 برس پیشتر اور سبا کا معاصر تھا شہادت دیتا ہے۔

> سبا تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ چاندی اور سونا بکثرت لایا جاتا ہے بُعد و دوری کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے۔ اس لئے خصوصاً ان کے پایہ تخت میں نقرئی اور طلائی ظروف۔ تخت اور دہلیزیں ہیں۔ جن کے پائے زرنگار اور نقرئی طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں پیش گاہ اور دروازے زر و جواہر سے منقش ہیں اور اس قسم کی زیب و زینت پر وہ نہایت ہنرمندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔

اس بیان تحریری سے ثابت ہوتا ہے کہ مملکت سبا میں اس قسم کی چیزوں کا خاص طور سے اہتمام تھا ممکن ہے کہ اس بیان سے بارہ سو برس پہلے ملکہ سبا کا تخت بھی اسی قسم کا ہو۔

(3) ایک سوال یہ ہے کہ یہ تخت کس غرض سے بنایا تھا اور حضرت سلیمانؑ کے دربار میں کیوں لایا گیا تھا۔ عام جواب یہ ہے کہ ملکہ

کے بیٹھنے کا تخت شاہی تھا۔ جو یمن میں بحفاظت مقفل کمروں میں تھا۔ جہاں سے اظہار معجزہ کے لئے پل کے پل میں حضرت سلیمانؑ نے اپنے ملک یروشلم (بیت المقدس) میں اٹھا منگایا۔ ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ملکہ سبا نے تحفہ کے طور پر حضرت سلیمان کے لئے اپنے ملک کی صنعت کاری کی ایک چیز تیار کرائی تھی اور چونکہ یہ تحفہ تھا۔ ضرور ہے کہ ملکہ اپنے ساتھ شام میں لائی ہو گی تحفہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ قرآن نے سبا کی سفارت اولیٰ میں تحفہ کا ذکر کیا اور نبیم میں بھی سبا کا ذکر ہے۔

(4) قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ایک درباری نے جو کتاب سے واقف تھا عرض کی کہ میں نگاہ پلٹنے سے پہلے ملکہ کا تخت اٹھا لاتا ہوں۔ نگاہ پلٹنے سے پہلے تخت اٹھالانے سے مقصود۔ جیسا کہ ہماری زبان میں سرعت اور جلدی سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی قبل ان یرتد الیک وطرفک سے بھی سمجھنا چاہیے۔ بعض تابعین اور مفسرین کبار نے بھی اس لفظ کے یہی معنی لئے ہیں اور یہ کہنا تو درحقیقت محاورات زبان سے نادانی کا ثبوت ہے کہ واقعاً اس سے نگاہ پلٹنے کے ساتھ کام کیا۔

(5) اس قصہ کے متعلق چوتھی بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں کہ وہ شخص کہ جس کے پاس کتاب کا عالم تھا بولا کہ میں تخت کو نگاہ پلٹنے سے پہلے لاؤں گا۔ کتاب کے علم (عندہ علم من الکتاب) سے کیا مراد ہے۔ عام مفسرین تورات مراد لیتے ہیں یا اسم اعظم۔ لیکن ظاہر ہے کہ تورات کے علم کے تخت کا جلد اور بسرعت لے آنا کیسا مناسبت رکھتا ہے۔ اسم اعظم کا تخیل بھی ایک جاہلانہ اور غیر ثابت الشرع تخیل ہے۔ اسلام کی رو سے یہ کوئی شے نہیں۔ البتہ یہودیوں میں یہ خیال اب تک موجود ہے۔

ایک مدعی علم کلام جدید نے کتاب سے رجسٹر اور دفتر مراد لیا ہے یعنی بعض درباری حضرت سلیمانؑ کے سرکاری دفتر اور رجسٹر سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ تخت کہاں رکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں ابھی اٹھالاتا ہوں لیکن اس عہد میں انیسویں صدی کی طرح باقاعدہ دفتر اور رجسٹر کا دعویٰ ایک مضحکہ خیز امر ہے میری رائے یہ ہے کہ کتاب سے خط مراد ہے۔ لفظ کتاب اسی قصہ میں اس سے پہلے دو بار اسی معنی میں قرآن مجید میں آ چکا ہے۔ اذهب بکتابی هذا (میری یہ کتاب (خط) لے جا۔ انه القی انی کتاب کریم (میرے پاس ایک عظیم الشان کتاب آئی ہے)

اس کے علاوہ لفظ کتاب کا بمعنی خط عربی میں عام طور سے استعمال ہے بلکہ فصحا اس کے سوا خط کے لئے کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ میری تاویل کے مطابق آیت کا مقصود یہ ہے کہ درباریوں میں سے ملکہ سبا کو مضمون خط کا جس کو علم تھا کہ وہ بطور تحفہ اپنے ساتھ ایک تخت لائی ہے اس نے کہا کہ میں ابھی لاتا ہوں۔

(6) قرآن مجید میں ہے کہ ملکہ حضرت سلیمان کے ہاتھ پر ایمان لائی اور پیغمبرانہ جاہ وجلال دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھی **اسلمت مع سلیمن**۔ لیکن بظاہر نبیم سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن نبیم میں ملکہ کے یہ فقرے خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھے بنی اسرائیل کے تخت پر بٹھایا۔ کیونکہ خداوند اسرائیل کو ابد تک پیار کرتا ہے۔ اور تجھ کو بادشاہ بنایا کہ عدل وانصاف کرے۔ کیا اس کے ایمان قلب کو نہیں ظاہر کرتے۔ مسیحی احباب تو قرآن کی تائید پر مجبور ہیں۔ کیونکہ انجیل کا یہ درس ان کو یاد ہے۔

جنوب کی ملکہ فیصلہ کے دن اس نسل کے ساتھ کھڑی ہو گی اور ملامت کریگی کہ وہ زمین

کے انتہائی حصہ سے سلیمانؑ کی حکومت سننے آئی اور دیکھو کہ یہاں سلیمانؑ سے بڑا ہے
(مسیحؑ)(متی 2-22)

سبا کا مذہب

قرآن مجید نے بتلایا ہے کہ سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا۔

وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللهِ

میں نے سبا کی شہزادی کو اور اس کی قوم کو خدا کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے ہوئے پایا۔

بئیم اس ذکر سے خاموش ہے۔لیکن ترگوم سے تصدیق ہوتی ہے۔ترگوم کا فقرہ یہ ہے کہ جب کہ ملکہ آفتاب کی عبادت کو جارہی تھی۔ یونانی مؤرخ تھیوفراستینیس (Theophraslinous) 1312 ق م جو اسلام سے تقریباً 900 برس پیشتر اور سبا کا معاصر تھا۔بخورات کے ذکر میں لکھتا ہے۔یہ ملک سبا سے متعلق ہے۔جو بخورات کی ملکیت کی بڑی حفاظت کرتے ہیں۔ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کی ہیکل میں جو اس قوم میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔لایا جایا ہے Herons Hisloncal Researches Vol P 351

روایات عرب سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔بانی قبیلہ سبا کا لقب عبدالشّمس مشہور ہے۔(تاریخ حمزہ اصفہانی ص 107 کلکتہ) جس کے معنی پرستار آفتاب کے ہیں۔

اکتشافات اثریہ نے اس مسئلہ کو اظہر من الشّمس کر دیا ہے۔جس کی تفصیل ''ادیان'' میں آئے گی۔مجمل یہ ہے کہ سبا کے متعدد دیوتاؤں میں سے ایک شمس بھی تھا۔جس کی تمام جنوب عرب میں پرستش کی جاتی تھی۔Encyclopedia of Islam Vol 1 P 379 مسلمانوں نے ابتدائی صدیوں (دوسری یا تیسری صدی) میں یمن کی ایک عمارت کا کتبہ پڑھا تھا۔جو جنوبی (حمیری) زبان میں تھا۔اس میں عبارت منقوش تھی۔بسم اللہ ھذا ما بناہ شمر برعش لسیدۃ الشمس۔شمر برعش نے سورج دیبی کے لئے یہ بنایا۔تاریخ اصفہانی ص 110 کلکتہ۔

سبا کا تفرق و انتشار اور نتیجہ زوال و ادبار

ہم نے کہیں اوپر بیان کیا ہے کہ سبا کے مقبوضات تین حصوں پر منقسم تھے۔حبش یمن اور شمال عرب 105 ق م میں یہ شیرازے بکھر گئے۔حبش پر اکسومی خاندان (اصحاب الفیل) قبضہ کر بیٹھا۔شمالی عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے خروج کیا۔یمن میں حمیر (شاخ قبیلہ سبا) نے ظہور کیا۔اور بقیہ قبائل تمام تتر بتر ہو گئے۔اصلی باعث یہ ہوا کہ چوتھی صدی ق م میں کے آخر میں یونانیوں نے اور پہلی صدی ق م میں رومیوں نے علی الاتصال شام و مصر پر قبضہ کر لیا۔یہ عربوں کے بار بار حملوں سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے تھے۔عرب اس تجارت کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں میں رکھنا چاہتے تھے۔اس لئے غیر قوموں کو اپنے ملک سے گذرنے نہیں دیتے تھے۔انباط اور حمیر کے واقعات پڑھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ صرف اس کے لئے کتنی خونریزیاں ہوئیں۔اور یونانی اور رومی ان دشوار گذار پہاڑوں اور ریگستانوں کو بآسانی

طے بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس لئے انہوں نے ہندوستان اور افریقہ کی تجارت کو بری راستہ سے بحری راستہ کی طرف منتقل کر دیا اور تمام مال کشتیوں کے ذریعہ سے بحر احمر کی راہ مصر وشام کے ساحل پر اترنے لگے۔اس طریق سفر نے سبا کی تجارت کو بالکل سرد وگرد کر دیا۔اور اس نے یمن سے شام تک خاک اڑا دی اور سبا کی تمام نو آبادیاں بے نشان کر دیں۔کیونکہ ان کے تمول اور خوشحالی تجارت ہی کے سبب سے تھی۔وہ مفقود ہوگئی ادبار موجود ہو گیا۔

روایاتِ عرب ان کے تفریق وتخریب کا باعث بند عرم کے ٹوٹ جانے کو بھی بتلاتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی زراعت کو سخت نقصان پہنچا۔اوران کی اکثر بستیاں بہہ گئیں۔مگر اس سیلاب کا باعث اتنا وسیع نہیں ہوسکتا کہ تمام ملک یمن کو برباد کر دے اس نے جو کچھ نقصان پہنچایا ہوگا وہ شہر مارب اور اس کے آس پاس کے دیہات کو جہاں وہ آیا تھا اور اس کا اثر پہنچا تھا۔قرآن مجید ان دونوں تو جیہہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۝ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ۝ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ (سباء)

بے شبہ سبا کے لئے خود اپنے گھر میں نشانیاں تھیں۔دو باغ داہنے اور بائیں۔اپنے پروردگار کی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔ستھرا شہر ہے اور معاف کرنے والا مالک۔انہوں نے سرتابی کی تو ہم نے ان پر بند توڑ دیا۔اور سیلاب بھیجا اور ان کے باغوں کی بجائے بدمزہ پھلوں۔پیلو اور جھڑ بیری کے درخت پیدا کر دیئے۔یہ ان کی ناشکری کی جزا تھی اور ہم صرف ناشکروں ہی کو سزا دیتے ہیں۔ہم نے ان کے ملک اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں مقرر کر دی تھیں چلو ان آبادیوں کی منزلوں میں دن رات۔بے خوف وخطر انہوں نے کہا کہ خدا نے ہمارا بڑا سفر بنایا یا اے خدا ہمارے سفر کو دور کر دے۔انہوں نے خود اپنی جان پر ظلم کیا۔تو ہم نے ان کو کہانی بنا دیا اور پارہ پارہ کر دیا۔حقیقتاً اس میں عبرت کی نشانیاں ہیں۔شکر گذار اور صابر بندوں کے لئے (السباء)

حمیر یا سبا کا طبقہ ثالثہ ورابعہ۔قوم تبع واصحاب الاخدود۔115ق م-25ء

ملک یمن دو حصوں پر منقسم ہے۔مغربی اور مشرقی۔قطعہ مشرقی جو اندرونی ملک سے ملحق ہے۔مملکت سبا ہے قطعہ مغربی جو ایک طرف بحر عرب اور دوسری طرف بحر احمر کو چھوتا ہے۔حمیر کی مملکت ہے۔

اسی سے سمجھ لیا جائے گا کہ بحری تجارتوں نے سبا کو ہٹا کر حمیر کو کس حد تک چمکا دیا ہوگا۔یہی سبب ہے کہ یمن کی حکومت مشرق سے منتقل ہو کر مغرب کو چلی آئی اور حمیر جو مغربی قبیلہ تھا اس نے قوت مزید حاصل کر لی ناچار مشرقی قبائل رزق معاش کی تلاش میں کچھ مغرب کو اٹھ آئے اور کچھ یمامہ۔بحرین۔حجاز۔عراق اور شام کو چلے گئے۔یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حمیر سبا سے کوئی الگ شے نہیں ہے۔صرف خاندان اور موقع حکومت کا فرق ہے زبان۔مذہب اور طریق تمدن تمام چیزیں ایک ہیں۔اس لئے خود حمیر کے کتبات میں بھی بجائے حمیر کے سبا ہی مذکور ہے۔البتہ مؤرخین یونان 20ق م میں اور اہل حبشہ نے چوتھی صدی عیسوی کے اپنے کتبات میں ان کو حمیر کہا ہے۔

لفظ حمیر

علمائے انساب کہتے ہیں کہ حمیر سبا کے جانشین وفرزند کا نام تھا۔اس لئے سبا کی تمام تاریخ میں وہ بجائے سبا کے ہر جگہ حمیر بولتے ہیں۔لیکن اب تک جو کتبات ملے ہیں اور پڑھے گئے ہیں اس میں لفظ حمیر کہیں دکھائی نہیں دیتا[1]۔خود حمیر سلاطین اپنے آپ کو ملک سبا ذوریدان لکھتے ہیں۔ہاں اہل حبش کے بعض کتبات میں حمیر اور ارض حمیر البتہ کہیں کہیں ملتا ہے۔لفظ حمیر حبشی اور عربی میں حمر سے مشتق ہوگا۔جس کے معنی سرخ کے ہیں اور محاورے میں گورے رنگ کو کہتے ہیں۔اس کا مقابل اسود۔عرب سیاہ وسپید کی جگہ الاسود والاحمر بولتے ہیں۔چونکہ عرب اہل حبش کو اسود اور سودان کہتے ہیں اس کے مقابل میں حبش عربوں کو حمیر یعنی گوری رنگ کے آدمی کہتے ہوں گے۔ابرہہ یمن کا حبشی فاتح اپنے ایک کتبہ میں لکھتا ہے کہ بادشاہ حبشی اور حمیر فوج لے کر آیا۔موجودہ محاورہ ہند میں اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ کالی اور گوری پلٹنیں ہیں۔

مملکت حمیر

تمہید میں معلوم ہو چکا ہے کہ حمیر مغربی یمن میں بحر عرب و بحر احمر سے متصل آباد تھے۔اس وقت اس خاندان پر ''ذو'' (امیر) حکومت کرتے تھے۔قلعۂ ریدان ان کا مسکن تھا اور اس بنا پر خطاب امارت ذوریدان تھا۔یہ قلعہ شہر ظفار کے قریب تھا۔جو شہر صنعا کے قریب واقع ہے اور جدید حکومت کا پایہ تخت تھا۔ابوعلکم مرانی اسی ریدان کے ذکر میں لکھتا ہے۔

وفی ظفار بنت ابائنا غرفا
فی کوکیان و قصی الملك ریدان

ہمارے بزرگوں نے ظفار میں عمارتیں قائم کیں۔نیز کوکیان اور قصر شاہی میں ریدان تھا

سبا کی تباہی کے بعد حمیر نے م آرب تک اپنی حکومت کو وسعت دی اس وقت ان کا لقب شاہی ۔ ملک سبا ذوریدان نظر آتا ہے ایک مدت کے بعد ان کے القاب "شاہ حضر موت کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے ۔ پھر تمام یمن ۔ نجد اور تھامہ کی بادشاہی القاب میں نظر آتی ہے ۔ اسی سے ظاہر ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ ان کی حکومت کا رقبہ وسیع ہوتا جاتا ہے ۔ آخر 535ء میں آخری حمیری بادشاہ ذونسواس اکسومی حبشیوں سے شکست کھاتا ہے اور تقریباً چالیس برس کے لئے ملک ان کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ایرانی آتے ہیں اور ان کے چند برسوں کے بعد تھامہ کی گھاٹیوں سے خورشید اسلام یمن میں طلوع ہوتا ہے اور ایک دن میں تمام یمن اس نور سے منور ہو جاتا ہے ۔

حمیر کا زمانہ

سبا سے حمیر کے پچھلے کتبات میں مبہود ابن ابہد کے نام سے ایک غیر معلوم تاریخ کے سنین کا استعمال کیا گیا ہے ۔ 385 و 573، 582، 640، 657، 65، 669 مختلف کتبات کے سنین ہیں ۔ ان میں سے 640ء کے کتبہ میں حبش کے حملے یمن اور ذونواس کی موت کا ذکر ہے ۔ یہ واقعہ عرب روایات اور رومی بیانات کے مطابق 625ء کا ہے ۔ اس بنا پر یہ بالکل بدیہی ہے کہ 625ء 640ء حمیری کے مطابق ہے اور اس لئے ا حمیری کی ابتدا 115 ق م قرار پائے گی ۔ مگر دوسرے اور کتبات کی عبارت پڑھ کر اور ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سبائے حمیر کی تاریخ پہلی صدی ق م کے اوسط سے شروع ہوتی ہے ۔ اور آخر شاہ حمیر ذونواس کی موت پر 525ء میں حکومت حمیر ختم ہو جاتی ہے ۔ اس حساب سے حمیر کی کل مدت حکومت تقریباً 550 برس قرار پائے گی ۔

حمیر کے طبقات

حکومت حمیری کے 550 برس حمیر کی مسلسل تاریخ نہیں ہے ۔ پہلی صدی ق م سے تیسری صدی کے اواخر تک حمیر کا طبقہ اول ۔ یا سبا کا طبقہ ثالث فرمانروائی کرتا رہا ۔ دوسرا طبقہ تیسری صدی کے اواخر سے شروع ہوتا ہے ۔ اور ابھی چند ہی بادشاہ گذرتے ہیں کہ اکسومی حبشی چوتھی صدی کے اوسط میں گھس آتے ہیں ۔ چند سال کے بعد حمیر ان حبشیوں کو نکال کر پھر وطنی حکومت کی بنیاد ڈالتے ہیں ۔ یہ طبقہ 525 تک جب کہ آخری بار اہل حبش فاتحانہ داخل ہوتے ہیں ۔ قائم رہتا ہے ۔

سبائے حمیر کے ان دونوں طبقات میں فرق و امتیازات ہیں ۔ دور اول کے سلاطین کا لقب ۔ "ملک سبا ذوریدان ہے ۔ دور ثانی میں یہ سلاطین ملک سبا وریدان و حضر موت کا لقب اختیار کرتے ہیں ۔ اور پھر جب کوئی نیا قطعہ ملک فتوحات میں شامل ہوتا ہے ۔ تو لقب شاہی میں اتنا ہی اضافہ اور ہو جاتا ہے ۔ ان القاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دورہ اول میں حمیر کا رقبہ حکومت صرف یمن تک محدود تھا ۔ دور ثانی میں حضر موت تک وسیع ہو جاتا ہے ۔ عرب مؤرخین کے بیان سے بھی ان طبقات کی تصدیق ہوتی ہے ۔

واول من ملك اولاد قحطان حمير ابن سبا نبقي مليكا حتى مات هرما و توارث
ولده الملك بعده فلم بعدهم الملك حتى مضت قرون و صار الملك الى الحارث
وهو تبع الاول فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك بسبا و ملك بحضر موت

فكان لا بجتمع اليمانيون كلهم عليهم الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه وتبعوه فسمى تبتا

فرزندان قحطان میں سے پہلے پہلے جو بادشاہ ہوا حمیر بن سبا ہے۔آخر وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا۔پھر حکومت اسکی نسل میں وراثتاً جاری رہی۔اور ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی تا آنکہ چند صدیاں گذر گئیں۔پھر حارث الرائش پہلا بادشاہ ہوا۔جو تبع کہلایا۔اس سے پہلے دو بادشاہ ہوتے تھے۔ایک سبا میں اور ایک حضر موت میں۔تمام یمنی ایک کی طاقت پر متفق نہیں ہوتے تھے۔لیکن جب یہ بادشاہ ہوا تو اس کی بادشاہی پر سب متفق ہو گئے اور اس کی اطاعت کر لی۔اس لئے اس کا لقب تبع ہوا۔

شاہان حمیر اور ان کے طبقات کی نسبت ہم نے جو کچھ لکھا اس سے معلوم ہوا کہ ان میں اکسومی (سبائی) حبش کی ایک قلیل الزمانہ حکومت کی خلیج بھی حائل ہے۔عرب مؤرخین کو گو اس سے واقفیت نہیں۔لیکن ان کی فہرست سلاطین میں حبشی ترکیبوں کے نام داخل ہیں۔اگرچہ مختلف صورتوں اور ترکیبوں کے نام ضرور ہیں۔مگر تاہم طبقہ ثانی کے بیچ میں یعنی حارث الرائش اور ناشرنجم کے درمیان ناموں کے رنگ و بو پہچاننے والوں کو صاف حبشی یا کم از کم غیر عربی و حمیری رنگ واثر چند ناموں میں ضرور نظر آئے گا۔

نمبر	(الف) نام	کیفیت	نمبر	نام	(ب) کیفیت
۱	حمیر	نام	۱	الہمیسع	مصنوعی نام
۲	ایمن	صحیح۔لیکن نام کا صرف ایک جزو ہے		ج ا ناشرنعم	صحیح نام
۴	زہیر	مصنوعی	۲	شمر یرعش	//
۵	عریب	//	۳	ابو مالک	//
۶	الغوث	//	۴	الاقرن بن ابی مالک	مشکوک
۷	وائل	ایک خاندان شاہی کا بنو اہل نام ملا ہے	۵	ذوحیشان بن الاقرن	//
۸	عبدشمس	صحیح	۶	تبع بن الاقرن	//
۹	زہیر الصّوار	مشکوک	۷	کلیکرب بن تبع	صحیح
۱۰	ذویقدم	//	۸	اسعد ابو کرب	//
۱۱	ذوانس	//	۹	حسان ابن تبع	مشکوک

١٢	عمرو	//	١٠	عمرو بن تبع	//
١٣	الملطاط	مصنوع	١١	عبد کلال	صحیح
١٤	القلیص	//	١٢	تبع ابن حسان	مشکوک
١٥	سدو	مصنوع	١٣	مرثد ابن عبید	صحیح
١٦	الحارث الرائش	صحیح نام	١٤	ولیعہ ابن مرثد	//
(ب)١	ابرہہ ذوالمنار	حبشی نام ابرہہ ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے	١٥	ابرہہ ابن الصباح	حبشی
٢	افریقش ابن ابرہہ	غیر عربی نام۔ افریقش کے معنی شاید افریقی حبش ہوں	١٦	صہبان ابن محرث	مشکوک
٣	العبد ذوالاذعار	مشکوک	١٧	حسان ابن عمرو	//
٤	ہداد بن شراحبیل	ایک حبشی بادشاہ کا نام	١٨	ذوشناتر	صحیح
٥	بلقیس بنت ہداد	غیر عربی۔ شاید یونانی	١٩	ذوجدن	// ٢٠ ذونواس صحیح

اس طویل فہرست میں قائمہ الف طبقہ اول حمیر ہے۔ لیکن اس کے تمام نام صحیح نہیں ہیں۔ قائمہ ب ایک مختصر حبشی دور ہے۔ یہ نام بھی غیر صحیح ہیں۔ لیکن حبشیت کا ان میں شائبہ ضرور ہے۔ قائمہ ج طبقہ دوم حمیر ہے اور قرب زمانہ کے سبب اس کے اکثر نام صحیح اور محفوظ ہیں۔

طبقہ اول کے صحیح نام اور زمانے

شاہان حمیر کے صحیح نام وہ ہیں جو اب تک پتھر اور چاندی کے حرفوں میں یمن کے ویرانوں اور سکّوں میں لکھے ملے ہیں اور جن کو بہتوں نے پڑھا ہے اور ہر شخص جا کر پڑھ سکتا ہے۔ ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ طبقہ ثانی کے بعض کتبوں پر تاریخیں بھی ثبت ہیں۔ جن کا حل بھی ہو چکا ہے۔ بعض سلاطین کے نام رومیوں کی سیاسی و تجارتی تعلق سے یونانی و رومی تاریخوں میں محفوظ ہیں اور قیاصرہ روم کی معاصرت سے ان کی تاریخ معلوم ہے۔

اس رومی تعلق سے طبقہ اول حمیر میں ہے۔ جس کا لقب شاہی۔ ملک سبا ذوریدان ہے۔ دو بادشاہوں کی تاریخ معلوم ہے۔ کرب ایلی (Charibail) اور الیشرح (Elisaros) کتبہ میں الیشر یحضب اور ویتیل بین شاہان سبا وریدان فرزندان فرع ینہب شاہ سبا۔ رومی تاریخ میں ایک حملۂ یمن کا ذکر ہے۔ جو 20ق م الیشرح شاہ م آرب پر (سبا) کیا گیا تھا۔ الیشرح اس عہد میں دو (چچا) اور (بھتیجے) کا نام تھا۔ الیشرح یحضب اور الیشرح مکمل۔

رومیوں میں بھی یہودیوں کی طرح سبا کی دولت وثروت کی اس قدر شہرت ہوگئی تھی کہ رومن لٹریچر میں سبا کی دولت ضرب المثل بن گئی۔ شعرا ان کی دولت کی تمثیل دیتے تھے رفتہ رفتہ طمع حرص نے کام وذہن میں لذت اور دست و پا میں حرکت پیدا کی ۲۰ ق م میں آلیس گیلوس (Aelius Gallus) جو رومیوں کی طرف سے مصر کا گورنر تھا۔ قیصر اوغسطس (Agustus) کے حکم سے یمن پر حملہ کی تیاری کی۔ انباط (بنت بن اسماعیل کی اولاد) جو شمالی عرب میں ان کے زیر اثر تھے اعانت کے لئے امادہ کئے گئے۔ اور بظاہر وہ بھی آمادہ نظر آئے۔ شاہ انباط کا وزیر سلوس یا ثالث۔ عرب کے لئے بے نشان کوہ و بیابان میں رہبر بنا آخر صحرا وکوہستان حجاز طے کر کے یمن میں داخل ہوا۔ الیشر ح جو اس وقت یہاں کا بادشاہ تھا۔ حملہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور قلعہ بند ہوگیا۔ رومی کئی روز تک محاصرہ کئے پڑے رہے۔ لیکن پانی کی کامیابی سے خود حملہ آور فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور نجران وحجاز ہو کر 60 دن کے بعد بحال تباہ وزار مصر واپس آئی۔

یورپین مؤرخین اس مختصر اور عاجلانہ مہم کو بہت جی لگا کر بیان کرتے ہیں۔ کوئی فوج کے راستہ کا نشان بتاتا ہے کوئی محرف ناموں کی تصحیح کرتا ہے۔ کوئی اس کا جغرافیہ تیار کرتا ہے۔ کوئی اس مہم کی ناکامیابی کا سبب انباط کی خیانت ٹھہراتا ہے۔ کوئی راستہ کی دشوار گذاری کا عذر تراشتا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور ریورنڈ فارسٹر اس کہانی کے مشہور قصہ گو ہیں۔ بہرحال رومیوں کی اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر انہوں نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

اکسومی حبش اس بنا پر کہ حمیر تمام تر سبا پر قابض ہوگئے۔ ان سے جلتے تھے۔ حبشی کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی سے انھوں نے یمن پر حملہ شروع کر دیا۔ اور یہ حملہ مسلسل قائم رہا۔ کبھی فاتح ہو کر آگے بڑھے کبھی مفتوح ہو کر پیچھے ہٹے۔ آخر حضرموت پر موقع پا کر جم گئے۔ شمر برعش نے (جس کو عرب حارث الرائش اور شمر برعش دو شخص سمجھتے ہیں) ان سے جنگ کی ہوگی اور ان سے یہ مقامات چھین لئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ یمن اور حضرموت دونوں کا بادشاہ ہوا اور اپنا لقب اس لئے اس نے تبع اختیار کیا جسکے معنی حبشی زبان میں سلطان کے ہیں۔ اور شاید اسی لئے قومی ہیرو کے لحاظ سے عرب اس کو زیادہ وقعت دیتے ہیں۔ شمر برعش کے بعد ایک مدت تک پھر دوبارہ حملہ کیا اور حمیر کو شکست دی۔ تقریباً 340ء سے 378ء تک یہ مدعی فرمانروا ہے۔ گو وطنی رؤسا بھی اپنی جگہ پر ماتحت کی حیثیت سے قائم رہے 378 میں ملک یکرب نے ان کو نکال کر یمن وحضرموت پر دوبارہ حقیقی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت ۵۳۵ء تک قائم رہی۔ اکسومیوں نے دوبارہ حملہ کر کے ان کو برباد کر دیا۔ گویا تیس برس قبل ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم 340ء سے 378 تک جو اکسومی خاندان قائم کیا گیا ہے۔ اس کی صحت کی متعدد دلیلیں ہیں۔ اولاً تو یہ کہ اکسوم کے کتبہ میں اس کی تفصیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاہ اذینہ اور اس کے جانشین جو 340 سے 378 اکسوم میں بادشاہ تھے۔ اپنے کو ملک اکسوم وحمیر وریدان واتھوبیا وسبا وزیلع کہتے ہیں۔ حمیری کتبات میں اس عہد کے نام بلقب شاہی نہیں ملتے۔ عربی تاریخوں میں اس عہد کے سلاطین حمیر کے جو نام مابین شمر برعش اور ملک یکرب مذکور ہیں وہ حبشی التلفظ ہیں۔ خود عرب مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ شمر برعش کے بعد اس بنا پر حمیر طبقہ دوم یعنی ملوک سبا وریدان وحضرموت کی ترتیب یہ ہے کہ اولاً حمیری بادشاہ ہیں پھر چند حبشی میں پھر سلسلہ حمیری ہے۔

طبقۂ ثانیہ یا تبابعہ

طبقۂ ثانیہ یعنی وہ سلاطین جن کا لقب ملک سبا و ریدان وحضرموت ہے۔عرب ان کو تبع کہتے ہیں اور اس کی جمع تبابعہ ہے۔

لفظ تبع کی تحقیق

لفظ تبع لغوئین عرب کے نزدیک یہ تبعیت سے مشتق ہے۔

فصار الملك الى الحارث ارائش وهو تبع الاول ثمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك سبا و ملك الحضر موت فكان لا يجتمع اليماينون عليهم الى ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه وتبعوه فسمي تبعا (حمزہ اصفهانی ص 108)

حمیر کے بعد یمن کی حکومت حارث الرائش (برعش) کو ملی۔یہی تبع اول ہے اس سے پہلے دو بادشاہ یمن میں ہوتے تھے۔ایک سبا میں ایک حضرموت میں تمام یمنی ایک بادشاہ پر متفق نہیں تھے۔جب الرائش بادشاہ ہوا تو سب اس کی بادشاہی پر متفق ہو گئے اور اس کی تبعیت اختیار کی۔اس لئے اس کا لقب تبع ہوا۔

ممکن ہے کہ تبع لفظ عربی بمعنی متبوع ہو۔یعنی جس کی پیروی اور اطاعت کریں۔لیکن جدید تحقیق سے یہ لفظ حبشی زبان کا ہے جس کے معنی قادر۔خیار اور صاحب قوت کے ہیں۔اسلام میں ٹھیک اسی معنی وزور میں لفظ سلطان، قوت وغلبہ رواج پایا ہے۔اس لفظ کے غیر عربی ہونے کی تائید وعلاوہ اس کے حبشی زبان میں یہ لفظ موجود ہے۔یہ ہے کہ عربی میں اس وزن پر کوئی واحد اور بمعنی مفعول نہیں آیا۔ رکع وسجد وغیرالفاظ ہیں تو وہ جمع ہیں۔مبالغہ کا وزن ہے تو وہ معنی مفعول نہیں پیدا کرنا اور سب سے آخر اس کے غیر عربی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ عجمی ناموں کی طرح اس پر الف لام نہیں آتا۔اگر یہ عربی صفت کا صیغہ ہوتو مانع الف لام کیا ہے۔لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ صرف حبشی لفظ ہے۔کتبات ملوک ومعین وسبا کے عہد میں۔یعنی کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں لفظ تبع نظر آتا ہے۔ایک بادشاہ معین کا نام تبع کرب بن تبع ایل مذکور ہے۔ایک سبائی کتبہ میں تبع شرحبیل ملک سبا منقوش دیکھا ہے۔دوسرے کتبہ میں تبع کرب بلا لقب شاہی نظر سے گذرا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ اصلاً سبائی وحمیری ہے۔

قرآن اور تبع

قرآن مجید نے قوم تبع کا دوبارہ ذکر کیا ہے۔دونوں بار قوت وزور اور جبروت وعظمت کی طرف اس سے اشارہ کیا ہے۔پہلی آیت میں صرف جبار قوموں میں ان کا نام ہے۔دوسری آیت میں قریش کی طرف روے خطاب ہے کہ ان کو اپنی کس قوت پر ناز ہے۔تبع اور ان سے پہلے کی قومیں کیا انسے زیادہ توانا اور زورمند نہ تھیں۔ان کا کیا انجام ہوا۔

ترجمہ: اس سے پہلے نوح کی قوم۔ اہل رس۔ ثمود۔ عاد۔ فرعون برادران لوط اور اہل ایکہ اور تبع کی قوم نے جھٹلایا۔ یہ قریش بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو تو میں ان سے پہلے گذریں ہم نے ان کو برباد کیا کہ وہ مجرم تھیں

تبابعہ کی تعداد

عام مؤرخین اور ان کی تبعیت میں عام مفسرین لکھتے ہیں کہ صرف تین تبع گذرے ہیں تبع اکبر۔ تبع اوسط اور تبع اصغر تبع اکبر کا نام الحارث الرائش ہے۔ تبع اوسط اسعد ابوکرب کا لقب تھا اور تبع اصغر تبع بن حسان تھا۔

اس کے مقابلہ میں خود حمیری مصنفین کی روایت ہے کہ تاریخ یمن میں ستر تبع گذرے ہیں۔ شارح قصیدہ حمیریہ اور نشوان ابن سعید الحمیری مصنف شمس العلوم نے روایت کی علاوہ اشعار سے اس کی تائید پیش کی ہے۔ لیکن اس سے مقصود شاید عام سلاطین یمن ہوں گے کیونکہ لفظ تبع جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے کہ معین سبا اور حمیر ہر دور میں نظر آتا ہے۔ ورنہ تنہا اس طبقہ میں تو یہ تعداد کھپنی مشکل ہے۔ جن عام مؤرخین نے صرف تین مخصوص تبابعہ کا ذکر کیا ہے۔ شاید انھوں نے صرف مشہور ترین تبابعہ کے نام پر کفایت کی ہے۔

تبابعہ کے نام اور زمانے

تبابعہ یمن کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ بروایت عرب بھی ان میں سے اکثر کے نام محفوظ ہیں اور کتبات سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے ہم نے (صاحب ارض القرآن) جو زمانہ ترتیب دیا ہے۔ اس میں اکثر سنین کتبات ہیں۔ تفسیر استنباط وقیاس ہے۔ اصل سنین جن سلاطین کے منقوش ملے ہیں اور جو ان کے عہد کے کسی کارنامے کی تاریخ ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

نام	زمانہ	نام	زمانہ
یاسر ینعم	270ء	شمر یہرعش	281ء
ملک یکرب یہیمن	378ء	شرجیل یعفر	451ء
عبدکلیل	455ء	شرجیل	480ء
ینوف	510ء	ذوانوس	525ء

یہ یادرکھنا چاہیے کہ عیسوی اور حمیری سنہ میں 115 برس کا فرق ہے۔ اگر ان سنین پر جو عیسوی ہیں 115 سال کا اضافہ کردیں تو حمیری سن نکل آئے گا مثلاً عبد کلال کا سنہ جدول بالا میں 458ء سے اس بنا پر 573 حمیری ہوگا۔

افسانہائے حمیر

روایاتِ عرب تبابعہ یمن کی نسبت بڑے بڑے عظیم الشان فتوحات اور ملک گیر وکشور کشائی کے عجیب وغریب واقعات بیان

کرتے ہیں۔ایک تبع بر اعظم افریقہ کا فاتح ہے۔شمر برعش کی تیغ کشور کشا عرب سے ترکستان تک بلند ہو کر ایک شہر کو ویران کر دیتی ہے اور اس کا نام ''سمرکند'' پڑتا ہے۔یعنی شمر نے اس کی بیخ و بنیاد کھود ڈالی۔ایک تبع چین تک اپنی تلوار کی کاٹ دکھاتا ہے۔اور تبت میں اپنی بقیہ فوج چھوڑ دیتا ہے۔جہاں اب تک عرب آباد ہیں۔ذوالقرنین جس نے عرب و مشرق کے ڈنڈے ملا دئے تھے اور جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے وہ یہیں کا ایک بادشاہ تھا۔

افریقہ کا بیان ایک حد تک صحیح ہے۔اہل حبشہ سے مسلسل جنگ قائم تھی۔کبھی فاتح تھے۔کبھی مفتوح۔ورنہ ترکستان و چین کی فوج کشی۔جسکی ابن خلدون نے بھی کچھ کم ہنسی نہیں اوڑائی ہے۔صرف لفظ کا کھیل ہے۔(سمرقند) سمرکند کے پہلے جز کو شمر برعش کے پہلے جز سے اتحاد تھا۔اس لئے وہ سمرقند کا بانی یا مخرب قرار پایا۔انہوں نے کند کو فارسی لفظ کندن سے مشتق سمجھا حالانکہ قدیم ترکستانی زبان میں ''کند'' شہر کو کہتے ہیں۔سمرگند و تاشکند۔خوگند۔یہ سب ترکستانی شہروں کے نام ہیں۔ترکستان کی زبان بزمانہ اسلام فارسی ہوگئی تھی۔لیکن شمر برعش کے زمانہ میں تو فارسی نہ تھی۔جو ''کند'' فارسی ''کندن'' سے ماخوذ ہوتا۔چین و تبت کا نگارخانہ بھی صرف لفظوں کا تماشہ ہے۔عرب تبت کو تبت کہتے ہیں۔جو تبع کے بالکل قریب قریب ہے۔ذوالقرنین کو صرف لفظ ذو نے مقدونیہ سے یمن پہنچا دیا کہ ذو یمن میں اکثر امرائے حمیر کے لقب میں آتا ہے۔مثلاً ذونواس،ذوشناتر۔ذوریدان۔

لیکن زمانہ اسلام کے بعض عرب سیاحوں کے عینی مشاہدات کا کیا جواب ہے۔ابن حوقل بغدادی 400ھ کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ ورود سمرقند تک شہر کے دروازے پر شمر برعش کا حمیری کتبہ ایک لوہے کی تختی پر کندہ موجود تھا۔افسوس کہ سیاح موصوف ہی کے زمانہ قیام میں یہ نادر روزگار شہر میں آگ لگ جانے سے جل کر بے نشان ہو گیا۔اصل میں یہ قدیم ترکی خط (الغیوری) ہوگا جو حمیری و مسیحی وغیرہ خطوط کے مشابہ ہے۔شہر عام کی بنا پر اس کو ہمارے سیاح نے حمیری سمجھ لیا۔

اسی طرح مؤرخ مسعودی کا بیان ہے کہ تبت میں تبع رہ گئے تھے۔اور چنانچہ خود اس نے عربی لباس و وضع میں اشخاص پائے۔لیکن چوتھی صدی میں جب مسلمانوں کا تمدن دنیا میں چھا رہا تھا اور عرب تاجر ہر کوہ و بیابان میں گذر رہے تھے۔تبت میں عربی لباس و وضع کے وجود سے تبع کی فتح مثبت پر استدلال مسعودی کے فضل و کمال سے کس قدر فروتر ہے۔اگر اس قسم کے انقلابات سیاسی حقیقتاً ظہور پذیر ہوتے تو اس عہد کی زندہ قومیں ان کے ذکر سے خاموش نہ رہتیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے۔ایران کے کیانی خاندان میں ایک مشہور بادشاہ کیکاوس گذرا ہے اس نے ایران سے ایک دریا کو (شاید خلیج فارس) عبور کر کے کشو ماہا اوران پر فوج کشی کی لیکن شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔آخر رستم نے آ کر کیکاوس کو رہائی دلائی۔کیکاوس نے چھوٹ کر ماہا وران کی شہزادی سودابہ سے شادی کر لی۔یہ وہی سودابہ ہے جن کے مکر و فریب سے گھبرا کر شہزادۂ عجم سیاؤش توران چلا گیا۔اور وہاں مارا گیا اور اسی کے جوش و غضب و انتقام میں صدیوں تک ایران و توران باہم معرکہ آرا رہے۔شاہنامہ میں یہ پوری تفصیل موجود ہے۔ثعالبی نے اپنی تاریخ میں (غرر تاریخ الفرس) میں لکھا ہے کہ کشور ماہا وران اصل میں کشور حمیران۔حمیر کی فارسی جمع ہے۔سودابہ صحیح عربی نام سعدیٰ کی تصحیف ہے۔

ثعالبی کے علاوہ تمام لغات فارسی میں ہاما اور ان کے معنی یمن ہی کے ہیں۔ اس بنا پر ہمیں ان روایات کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ بشرطیکہ یمن کا خاندان حمیر اور ایران کا خاندان کیان تاریخاً معاصر ثابت ہو جائیں۔ اور نیز یہ سمجھنا چاہیے کہ حقیقتاً ایران کا کوئی بادشاہ ہوگا۔ کیکاؤس کی طرف غلطی سے نسبت ہے۔

تبابعہ کے تمدنی۔ سیاسی اور مذہبی حالات

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تبابعہ سے پہلے سبا کے تمام طبقے ستارہ پرست تھے۔ سب سے بڑا دیوتا ان کا شمس تھا۔ اور ''المقہ'' حمیری چاند کو المقہ کہتے تھے (سمجھنے کے لئے ہندوستان کے سورج ہنسی اور چندر ہنسی قبائل کافی ہیں) بہرحال کواکب پرستی ان کا عام مذہب تھا۔ 330ء میں یمن کے مقابل افریقی ساحل پر مصری رومیوں کے اثر سے عیسائیت نے پر و بال نکالے۔ شامی رومیوں کے ذریعہ سے یمن کے اطراف میں شہر نجران نے بپتسمہ (اصطباغ) قبول کیا۔ ان گرد و پیش کے اثرات سے تبابعہ یمن بھی محفوظ نہ رہے۔ (برٹینکا۔ مضمون ''ابی سینا'')

ستارہ پرستی نے تو شکست کھائی گو ستاروں کے ہیکل اب بھی ویران نہ تھے۔ تاہم اب شمس۔ المقہ اور عشتار کے پہلو بہ پہلو۔ رحمان کا نام بھی آنے لگا۔ جو قبل اسلام یہود و نصاریٰ ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔

مؤرخ کلبی کے زمانہ میں قبیلہ ذوالکلاع کے ایک شخص نے یمن میں ایک تخت پایا۔ جس پر ایک مردہ کی لاش پڑی ہوئی تھی اس کے سامنے ایک زرین سپر تھی۔ جس پر سرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ اس پر یہ عبارت لکھی تھی۔ (یہ عبارت حمیری عبارت کا ترجمہ ہے۔) بسم اللہ رب حمیر انا حسان بن عمرو النفیل۔ اللہ کے نام جو پر حمیر کا خدا ہے۔ میں عمرو نفیل کا بیٹا حسان ہوں۔ ابن ہشام نے جس کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی عبارت بھی ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ باسمک اللھم الہ حمیر۔ اس خدا کے نام پر جو حمیر کا خدا ہے۔

یہودیت اور نصرانیت ان اطراف میں دو ہی مذہب اور صاحب الہام مذہب تھے۔ اور باہم میدان میں برابر کے حریف بھی تھے۔ گذشتہ ابواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ رومیوں اور حبشیوں کے ساتھ سبا ے حمیر کو کس قدر سیاسی کشمکش تھی۔ اس بنا پر تبابعہ حمیر۔ عیسائیت سے زیادہ یہودیت کو ترجیح دیتے تھے۔ عبدکلیل کے سوا اور کسی کا عیسائی ہونا ثابت نہیں۔ عبدکلیل بروایت عربی بھی عیسائی تھا (حمزہ اصفہانی ص 12) اور ایک کتبہ سے بھی اس کا عیسائی ہونا ثابت ہے۔ (Hurats Hist of Arab) بقیہ تمام تبابعہ کم تر ستارہ پرست اور اکثر یہودی تھے۔ تاریخ طبری میں ہے کہ سب سے پہلے اسعد ابوکرب نے یہودیت قبول کی۔ مذہب شاہی نے عام رعایا میں بھی فروغ پایا اور اسی طرح عیسائیت اور یہودیت نے یمن میں ٹکر کھائی۔

رومیوں نے بحری راستوں کو پیدا کر کے سبا کے بازار سرد کر دئے تھے۔ اور تنہا اس سے تسکین نہ ہوئی تو 20 ق م میں یمن پر حملہ آور ہوئے۔ اکسومی حبشی جو پہلے رومیانِ مصر کے ہم خاک تھے اور اب ہم مذہب بھی ہو گئے تھے۔ رومیوں کے اشتعال سے بار بار چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ حمیر بھی موقع سے چوکتے نہ تھے۔ جب موقع ملتا رومی تاجروں کو دریا میں لوٹ لیتے ا ۔ شمال عرب میں ایران و روم باہم دست و گریباں تھے۔ اور یہ طبعی تھا کہ حمیر کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی ہوتی۔ رومیوں کو اس سے وحشت ہوتی۔

رومیوں نے اس نزاع کو بصلح و آشتی طے کرنا چاہا۔ چھٹی صدی کے اوائل میں رومی قیصر جسٹینین (Jastinian Shaps Brit Vol II PP

352,353)

تبع نے یمن کے دربار میں سفیر بھیجا۔ تبع نے نہایت تزک و احتشام سے اپنی سطوت کا اظہار کیا۔ خود ایک گاڑی پر سوار تھا۔ جس میں ہاتھی جتے تھے۔ بدن پر ایک چادر تھی۔ جو سونے کی گھنڈیوں سے اٹکی تھی۔ ایک ہاتھ میں ڈھال دوسرے میں دو نیزے تھے۔ بازوؤں میں بیش قیمت بازوبند تھے۔ اردگرد مسلح درباری تھے جو فخریہ رجز کے اشعار پڑھتے تھے۔ اس شان و شوکت کے منظر میں سفیر نے قیصر کا خط اور اس کی طرف سے دیگر تحائف پیش کئے۔ خط کا مفہوم یہ تھا کہ ان اطراف میں ایرانی فروغ نہ پانے پائیں۔ سفیر معمولی وعدہ و ایجاب کے بعد واپس ہوا۔ (SHARPE VOL II P 245)

اصحاب الاخدود

قیصر کا یہ پیغام صلح تعصب کی آگ کو کچھ بھی سرد نہ کر سکا۔ اس وقت ذونواس فرمانروا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے یہودیت کے پرجوش تعصب کا یہ سبق یثرب کے یہودیوں سے سیکھا تھا۔ جس نے اسلام کو بھی کچھ کم دکھ نہیں دیا۔ رومی سوداگر تاجرانہ یمن کے ساحل تک پہنچتے تھے۔ لیکن جہاں جہاں گذرتے تھے اسباب سوداگری کے ساتھ عیسائیت کی سوغات بھی ساتھ ساتھ بانٹتے جاتے تھے۔ عیسائی راہب بھی مخصوص مقاصد کے ساتھ ملک میں دورہ کرتے تھے۔ پہلے اثر نے عدن میں اور دوسری کوشش نے نجران میں جہاں پہلے شجر پرستی ہوتی تھی۔ عیسائیت نے برگ و بار پیدا کئے یورپ کے جواب ہتھکنڈے ہیں وہی پہلے بھی تھے۔ مذہبی اور سیاسی اغراض پر تجارت کا پردہ ہمیشہ ڈالا کرتے ہیں۔ یہی پردہ اس وقت بھی ڈال رہے تھے۔ ان تدابیر سے نجران یمن میں عیسائیت کا مرکز قرار پا گیا تھا۔ یعنی رومیوں اور حبشیوں کی مذہبی و سیاسی امیدوں کا وہ ماویٰ بنگیا تھا۔ حمیری یہودی اس کو دیکھتے تھے اور پورے جوش میں آجاتے تھے۔

اتفاقِ وقت اشتعال طبع کے لئے ایک عجیب حیلہ پیدا ہو گیا۔ جواب بھی نہایت کثیر الوقوع ہے۔ نجران میں ایک راہب عیسائی کا مکان تھا۔ ایک لڑکا اس راہ سے اکثر گذرتا تھا۔ راہب اس کو راستہ میں ٹھہرا کر مذہبی تعلیم کا روز کوئی نہ کوئی سبق دیا کرتا تھا۔ جب عام لوگوں کو معلوم ہوا تو طبعاً برافروختہ ہوئے اور ایک عظیم الشان فتنہ کے مواد فراہم ہو گئے۔

ذونواس سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ نجران پہنچا۔ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جب شہر فتح ہوا تو گڑھوں میں آگ دھکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو کھڑے کھڑے جلوایا۔ جس نے یہودیت کے قبول سے انکار کیا۔ اس کو نذر آتش کیا۔ قرآن میں اصحاب الاخدود کے نام سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِۙ﴿۵﴾ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌۙ﴿۶﴾ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌؕ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِۙ﴿۸﴾

مارے جائیں گڑھوں والے۔ گڑھے بھڑکتی آگ تھے۔ جب وہ ان پر بیٹھے تھے۔ اور (سچے) مومنوں کے ساتھ جو ظلم کر رہے تھے اس پر خود گواہ تھے۔ ان مومنوں میں سوائے اس کے کچھ اور قصور نہ ہوتا کہ وہ

خدائے محبوب ومحمود پر ایمان لائے تھے۔(سورۂ بروج)

قرآن میں یہ مذکور نہیں کہ اس نے کل لوگوں کو جلا دیا اور شہر کو بے نشان کر دیا۔لیکن کتب واخبار وتفسیر کی عام روایات میں مذکور ہے کہ تمام آبادی خاکستر ہوگئی۔لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔آنحضرت صلعم کے زمانہ میں نجران میں عیسائی آبادی موجود تھی۔وہاں دعاۃ اسلام بھیجے گئے۔نجران سے دوراہب آنحضرت صلعم سے مناظرہ کے لئے آئے ہیں۔حضرت عمر کے عہد میں یہاں کے نصاریٰ سے دوگونہ صدقات وصول ہوئے ہیں۔یا ممکن ہے کہ حبشی عیسائیوں کی ہفتاد سالہ عہد میں پھر دوبارہ آباد ہوا ہو۔

اس واقعہ کو عیسائیوں نے بھی یاد رکھا ہے۔اسی عہد میں شام کے عیسائی اس قصہ کو قید تحریر میں لائے ہیں۔ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔جس میں یقینا بعض تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔جاڑے کے سبب سے اہل حبش اپنا نائب یمن میں نہ بھیج سکے۔ذونواس نے حکومت غصب کر لی اور عیسائیوں کو مذہب کی خاطر بہت دکھ دیا۔علاوہ ازیں نجران پر فوج کشی اور خلاف وعدہ شہر پر قبضہ کر لینے کے بعد باایمان عیسائیوں کو آگ اور تلوار سے برباد کر دیا۔(ISLAM (ENCYCLOPEDIA OF

سبائے حبش یا اصحاب الفیل

ذونواس جس کی طرف قرآن کے الہامی الفاظ نے بھی اشارہ کیا ہے اور جس کا مفصل احوال اوپر بیان ہو چکا ہے ایک متعصب یہودی تھا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ ارتارزکسیز اوکس نے (Artoxorocius) چند یہودیوں کو قید کر کے شہر ہرقانیہ(مازندران) میں بھیج دیا تھا۔چونکہ ذونواس یہودی تھا اس لئے اس کے حملات سے ذونواس کی سلطنت کو بھی سخت صدمہ پہنچا۔ایک تو ذونواس کی ظالمانہ حرکت دوسرے اس کے زوال قوت عیسائی حبشی۔ملوک مصر کو اس پر غلبہ پا جانے کا پورا موقع دے دیا۔حبشی چڑھ آئے۔اور اس کو ملک سے نکال دیا۔یہ واقعہ 345ق م میں واقع ہوا۔اس زمانہ سے جناب ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تک نو سو برس ہوتے ہیں اس درمیان میں افریقہ کی قوموں کی جوار باط حبشہ کہلاتے تھے۔اور نیز بعض عرب المستعربہ کی اور ایرانیوں کی سلطنت رہی۔ابوالفدا ابی سعید مغربی کی کتاب تاریخ یمن سے ان سلاطین کے متعلق لکھتا ہے۔

ان الحبشة استو لوا علی الیمن بعد ذی جدن الحمیری المذکور وکان اول من ملك الیمن من الحبشة ارباط ثم ملك بعده ابر الا شرم صاحب الفیل الذی قصد مکة ثم ملك بعده یکسوم ثم ملك بعده مسروق ابن ابرهه وهوا اخر من ملك الیمن الی حمیر و ملکها سیف بن ذی یزن الحمیری۔(ابو الفدا)

ذی جدن حمیری کے بعد قوم حبشہ نے یمن پر قبضہ کر لیا۔جس شخص نے ملک یمن پر سب سے پہلے قبضہ کیا اور وہ ارباط تھا۔اس کے بعد ابرہۃ الاشرم جو صاحب الفیل مشہور ہے اور جس نے کعبہ کے انہدام کا قصد

کیا تھا۔ بادشاہ ہوا۔اس کے بعد یکسوم بادشاہ ہوا۔ یکسوم کے بعد صروق بادشاہ ہوا۔اور یہی مسروق یمن میں حبشیوں کا آخری بادشاہ ہوا۔ پھر اس کے بعد یمن کی سلطنت خاندان حمیری کی طرف عود کر آئی اور سیف بن ذی یزن الحمیر ی یمن کا بادشاہ ہوا۔

مشرقی مؤرخین نے یہاں بھی ارباط اور ابرہہ کو دو جداگانہ شخص خیال کر کے لکھ دیا ہے کہ اتنے زمانے میں صرف دو ہی شخص بادشاہ ہوئے۔ حالانکہ ارباط و ابرہہ ان کے قوم وقبائل کے امتیازی القاب ہیں اور ان کے بادشاہوں کے نام کے ساتھ امتیاز خاندانی کی ضرورت سے ضم کئے جاتے ہیں۔مشرقی اور مغربی محققین کا اتفاق ہے کہ سلاطین ابرہہ میں سے ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا جو زیادہ تر صاحب الفیل کے نام سے لکھا جاتا ہے۔اس نے مکہ معظّمہ پر 580ء میں چڑھائی کی تھی۔ یہ بہت سے ہاتھی اپنے ساتھ لایا تھا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کرادے۔اس کے پوتے مصروق کو سیف بن ذی یزن حمیری نے سلطنت سے بے دخل کر دیا۔اس کے بعد ابرہہ کا خاندان شاہی ختم ہوگیا۔

سیف ابن ذی یزن حمیری کو اپنی آبائی سلطنت کیسے ملی؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے سیف بن ذی یزن کے دل میں اپنی خاندانی سلطنت واپس لینے کی غیر متحمل اور مستقل خواہش وتمنا تھی۔اس ارادے سے وہ بادشاہِ روم کے پاس گیا۔اور اس سے امداد کا طالب ہوا۔ انتظار استمداد میں اس کے دس برس کامل صرف ہو گئے۔اور کچھ کشود کار نہ ہوا۔آخر مایوس ہو کر کسرے نوشیرواں کے دربار میں پہنچا۔اور کمک کی درخواست کی۔کسریٰ نے اس کی استدعا منظور کی۔ایک جرار لشکر تیار کر کے اس کے ہمراہ کر دیا۔اسی لشکر کی قوت سے سیف ابن ذی یزن نے اپنے حریف ابرہہ کو شکست دی۔اور اس سے اپنا آبائی ملک خالی کرالیا۔یمن کے مشہور ومعروف محل سلطانی غمدان میں اپنی سکونت اختیار کی۔اور مشرقی سلاطین کے اصول معاشرت کے مطابق عیش وعشرت میں مصروف ہوگیا۔اس زمانہ کے شعرائے عرب نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ان کے اشعار مدحیہ سے۔چونکہ اکثر تاریخی واقعات کا پتا ملتا ہے۔اس لئے ہم ذیل میں ان کی نقل کو ضروری سمجھتے ہیں۔

لا نقصد الناس الا کابن ذی یزن اذخیم البحر للاعداء حرکا واتی ہرقل (ابو الفدا)وقد سالت نعماتسه قلم تجد عنده النصر الذی سئلا ثم انتهی نحو کسری بعد عاشرة من السنین اجبن النفس والمالا حتی اتی بنی الا حرار بقد مهم تخالهم فوق المنن الارض اجبالا الله درهم من فئة صبر ما ان رأیت لهم فی الناس امثالا بیض مرازته غلب اساورة اسد تربت فی الغیطات اشبالا فاشرب هنیئاً علیك التاج مرتفقا براس غمدان دارا امنك محلالا

کسی شخص نے ابن ذی یزن کو اس قصد وارادے والا نہیں دیکھا جس نے مخالف کے خیموں کا دریا کے

کنارے پر محاصرہ کرلیا۔ ہرقل بادشاہ روم سے اس کی دولت وقوت کی مدد مانگی مگر جو مدد اس سے طلب کی تھی نہ پا سکا۔ اسی طرح دس برسوں کے بعد کسری نے اپنے جان و مال سے اس کی مدد فرمائی۔ یہاں تک کہ تمام آزادی پسند قبائل اس کا خیر مقدم بجالائے اور ان کے لئے تمام زمین اور کوہستانی مقام خالی کر آئے۔ خدا کی قسم۔ ایسے صبر اور متحمل شجاع کی مثال انھوں نے اور لوگوں میں بہت کم پائی۔ تمام وادی اور میدان چمک گئے اور شہروں پر وہ شیر جس نے بچپن سے بچہ شیر کی طرح تربیت پائی تھی تمام شہروں پر غالب آ گیا تیرے سر پر تاج شاہی مبارک ہو اور تجھ کو تیرا محل شاہی جو غمدان میں بنا ہوا ہے۔ خوش آیند ہو اور سزا وار ہو۔

سیف ابن ذی یزن کی نامور زندگی کا خاتمہ اس کے دربار کے ایک حبشی مصاحب کے ہاتھوں ہوگیا۔ جو اس کا ہمدم وہم نشیں تھا۔ مؤرخ ابوالفدا کی تحقیق میں بھی اس کا خاتمہ ایسا ہی ہوا۔ مگر وہ اس کے قتل کو کسی شخص کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اس حبشی جماعت کی مجموعی محسن کشی کے متعلق کرتے ہیں۔ جس کو سیف نے اپنا مقرب اور معتمد بنا رکھا تھا۔ ان کی اصل عبارت یہ ہے۔

وکان سیف بن ذی یزن المذکور قد اصطفیٰ جماعة من الحبشان وجعلهم من خاصة فاغتالوه وقتلوه سیف

بن ذی یزن مذکور نے اپنے ملازمین میں سے ایک حبشی جماعت کو منتخب کر کے اپنا مقرب بنالیا تھا۔ انھیں لوگوں نے اس کے ساتھ بدی کی اور اس کو قتل کرڈالا۔ (ابوالفدا)

سیف ابن ذی یزن کے بعد اس خاندان میں حکمرانی کے قابل کوئی شخص موجود نہ تھا۔ کسریٰ نے اس موقع کو غنیمت جان کر ملک یمن پر قبضہ کرلیا۔ مؤرخ ابوالفدا لکھتے ہیں۔

فارسل کسریٰ عامله الی الیمن واستمرت عمال کسری علی الیمن الی ان کان اخرهم باذان الذی کان علی عهد النبی صلعم اسلم

کسریٰ نے موقع پا کر یمن کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ اپنی جانب سے یمن پر عامل مقرر کر دیا۔ انھیں عاملوں میں سے آخر عامل باذان نامی تھا۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اسلام سے مشرف ہوا۔

ہم سلسلہ عمالانِ کسریٰ کے مفصل حالات وواقعات ان کے مقام پر قلمبند کریں گے۔

عرب العاربہ یا بنی قحطان کے سلسلہ میں معین۔ سبا۔ سبائے حمیر۔ اور سبائے حبش وغیرہم۔ فرعاً فرعاً۔ ہر ایک کے حالات وواقعات ہم پوری تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ یہ سلسلہ یقطان یا قحطان سے شروع ہو کر سیف بن ذی یزن پر بالکلیہ تمام ہوجاتا ہے۔ اسی سلسلہ

خاندان میں عرب کے اس ذرخیز اور سبز و شاداب حصہ ملک کی حکمرانی ہزاروں برس تک قائم رہی۔ جو اس زمانہ میں اپنے تمدن۔ معاشرت اور تجارت کے لئے تمام اقطاع عالم میں خاص طور پر مشہور تھا۔ واقعات مندرجہ بالا بھی بتلا رہے ہیں کہ حمیریوں کی حکمرانی حدود یمن اور مضافات عرب ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ ان کی کشورستانی کے ہاتھ دوسرے ممالک دور دراز تک پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح ان کے تمدن کے اصول۔ تجارت کے تجارب۔ تہذیب و معاشرت کے محاسن۔ صنعت و حرفت کے کمال۔ تدبر ملکی کے شہرے دور دور ملکوں میں مشہور ہو رہے تھے۔ اور ان سے غیر ممالک کے مختلف اقوام مستفید ہو رہی تھیں۔ ان کا اقتدار ان کی نموداری انھیں کے لیے خاص نفع بخش نہیں تھی اور نہ ایسی عارضی اور غیر مستقل تھی۔ جو ان کی جسمانی ہستیوں کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی۔ وہ اپنے لاتعداد زمانہ کے بعد بھی آج تک یادگار ہے۔ اور زمانہ موجودہ کے منتہی الکمال اور ترقی یافتہ قوموں کو اپنی قدامت و عظمت کے کمال دکھلا دکھلا کر حیرت اور تعجب میں ڈالتی ہے۔

جرمنی کا مشہور مستشرق مشہور پروفیسر نولڈکی (Noldeke) سلاطین سبا و حمیر کی اعلیٰ تمدن کے ذکر میں لکھتا ہے۔

> ولادت مسیح سے ہزار سال قبل۔ جنوبی اور غربی عرب۔ یعنی صوبہ یمن۔ جو سبا و حمیر کا ملک تھا اور جو اپنی بارش کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا۔ تمدن کے اس رتبہ تک پہنچا ہوا تھا اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارت کے آثار سے آج تک ہماری مدح و ستائش کے جذبات میں تحریک ہوتی ہے اور اہل روم و یونان نے اس کو دولت مند عرب کا لقب جو دیا تھا وہ ہرگز بے جا نہ تھا توریت مقدس میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان علیہ السلام سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے (سلاطین۔ آیت ۱۰۔ ۱۰۰) قوم ثمود جن کی عمارات سے ڈیوٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے۔ نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انھیں سے حاصل کی ہے۔ کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال کی جانب سے لیا تھا۔ اب اس کو خود انہوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک طرف دمشق۔ دوسری جانب ابی سینا تک اس کو پھیلا دیا۔ (Noldekes Hist of the world P.5)

اسی سلسلہ ملوک سبا میں۔ شمر برعش بڑا فاتح تھا۔ 800 ق م میں اس نے چار لاکھ فوج جمع کر کے عراق و خراسان پر قبضہ کر لیا۔ صُغقہ۔ جو بعد میں سمرقند کہلایا۔ اسی فاتح بادشاہ کے عہد میں مفتوح ہوا۔ افریقس ابن ابرہہ اسی سلسلہ کی حبشی فرع میں گذرا ہے۔ جس نے 1090 ق م میں بہت سی عربی قوموں کو لے جا کر ملک افریقہ میں بہت سی بستیاں بسائیں اور اس اطراف میں یہاں تک اس کا اقتدار بڑھا اور اثر قائم ہوا کہ وہ ملک کا ملک اس کے نام سے (افریقہ) مشہور ہوا۔

محققین یورپ کے ان اعترافات کے علاوہ۔ جو انہوں نے یمن کے قدیم تمدن کے تسلیم کرنے کی نسبت لکھتے ہیں اور جن کے

ثبوت ان کو یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات سے حاصل ہوئے ہیں۔ اسلامی مؤرخین اور عربی محققین کی تصنیفات و تالیفات بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ یاقوت حموی نے معجم میں یمن کے مشہور و معروف شہر صنعا و قلیس کے خاص اثارات عجیبہ کا بالتفصیل ذکر کیا ہے اگرچہ ان کی تفصیل ترکیب مبالغہ سے خالی نہیں ہے۔ تاہم اس کے اجزا میں اصلیت کے عناصر موجود ہیں۔ علامہ ہمدانی نے اکلیل میں تمام اثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔ صفۃ الجزیرۃ العرب میں یہ عبارت لکھی ہے۔

المشھور من محا فدا الیمن و قصورہ القدیمة التی ذکرتھا العرب فی الشعر و المثل... کثیرة التی فیھا من الشعر باب واسع وقد جمع ذلك کله فی الکتاب الثامن الاکلیل

یمن کے مشہور اور قدیم قصر و ایوان جن کا ذکر اہل عرب کے اشعار و امثال میں لکھا ہے کہ کثرت سے ہیں۔ اور ان کے متعلق اشعار عرب کا ایک دفتر تیار و مرتب ہے کتاب اکلیل کے آٹھویں باب میں۔ ہم نے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس عبارت کے بعد مولف نے لکھا ہے کہ اس موقع پر صرف ان کے نام گنوا دیتا ہوں اور وہ یہ ہیں۔ غمدان (۱)۔ بلعم (۲)۔ ناعط (۳)۔ صرواح (۴)۔ سلحین (۵)۔ ظفار (۶)۔ ھکر (۷)۔ ضھر (۸)۔ شبام (۹)۔ غیمان (۱۰)۔ یلبنون (۱۱)۔ ریام (۱۲)۔ یراقش (۱۳)۔ معین (۱۴)۔ روثان (۱۵)۔ ارباب۔ (۱۶)۔ ھند (۱۷)۔ ھنیدہ (۱۸)۔ عمران (۱۹)۔ اور نجیر۔

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں بالتفصیل مذکور ہے اور اس کی رفعت و عظمت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ستر برس میں تعمیر ہوا ہے۔ شبام کے حال میں لکھا ہے لھم فیه حصون عجیبة ھائلة۔ اس میں ان کے متعدد حیرت انگیز قلعے ہیں۔ قلعہ ناعط عرب میں ابن منیہ کے زمانہ تک موجود تھا۔ اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تھا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے۔ آج کل یورپ کے محققین نے ان مقامات پر پہنچ کر جو تحقیقات کی ہے اس سے بھی ان کے حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے۔ تھیا چر صاحب اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں۔

جنوبی عربستان میں (یمن) جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا۔ قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے...... یمن اور حضرموت میں یہ اثار کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اکثروں پر کتبات ابھی تک موجود ہیں۔ صنعا کے قریب ایک قلعہ تھا جس کو قزوینی نے اثار البلاد میں دنیا کے عجائبات میں ایک قرار دیا ہے۔ دیگر قلعوں اور عمارتوں کے لئے دیکھو۔ Journal German Oriental Society Vol 10 P.2

مآرب جو قدیم سبائی دارالحکومت تھا۔ اس کے آثار قدیمہ کو۔ ارنو۔ ہانوے اور گلاذری نے دیکھا ہے۔ مآرب کے مشہور اثار میں

سے ایک بڑی خندق کے آثار پاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر عدن کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی جب گلاذری نے دوطویل الذکر کتبے شائع کئے۔ جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یمن میں بمقام حُران ایک اور خندق ہے۔ جس کا طول تقریباً چارسو پچاس فٹ اونچا ہے۔ سیرۃ النبی شبلی نعمانی

بندعرب یا سدم آرب اس کے اثری حالات ارض القرآن کی عبارت سے بالتفصیل اوپر نقل کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے متعلق تاریخی حالات مناسب مقام اور رفع ابہام کی غرض سے حسب ذیل لکھے جاتے ہیں۔

اس بند کو عبدالشّمس الملقب بہ سبا نے بنانا شروع کیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں حمیر نے اس کی عمارت کو خاتمہ تک پہنچایا۔ وقتاً فوقتاً سلسلہ حمیری کے اور بادشاہ بھی بقدر ضرورت اپنے اپنے وقت میں اس میں اضافہ کرتے گئے۔ حقیقت یہ ہے۔ یہ بند دو پہاڑوں کے درمیان جس کا نام ابوالفدا نے مارب اور ابلق بتلایا ہے۔ اس غرض سے ایک مرتفع دیوار کی شکل میں بنایا گیا تھا جس سے چشموں اور تمام بارش کا پانی سمٹ کر ایک خاص مقام پر رکا رہتا ہے۔ اس بند کے ضروری مقام و موضع پر چھوٹے چھوٹے روزن بنے ہوئے تھے اور انھیں روزنوں سے اہل شہر اپنی روزانہ ضروریات اور سیرابی زراعت کے لئے پانی لیا کرتے تھے۔ اس بند کے بنانے میں اس وقت کے لوگوں نے اپنی طباعی اور صناعی کے کمال دکھلائے تھے۔ یہ بند شہر مآرب کے دونوں پہاڑوں کے درمیان اتنا اونچا بنا ہوا تھا کہ اس کی رفعت اور شوکت اس کے ایک علیحدہ پہاڑ ہونے کا یقین دلاتی تھی۔ عمارت اس کی ایسی استوار اور محکم تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کی دیوار اتنی چوڑی تھی کہ اکثر شہر کے لوگوں نے اس پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ اس کے عمق میں ہمیشہ چالیس گز اونچا پانی رہا کرتا تھا۔ عرب میں پانی تمام دنیا کی نعمت اور دولت سے زیادہ عزیز سمجھا جاتا تھا۔ آج تک بھی اس کی قدر و قیمت کی وہی کیفیت ہے۔ اسی پانی کی قدر و عزت اور اسی کی بدولت ان کی خوشحالی۔ دولتمندی پر ان کے غرور ونخوت نے ان کے سلاطین کو خدا کی راہ سے پھیر دیا۔ اور آخر کار زوال وادبار کی خندق میں گرادیا فاعرضوا فارسلنا علیھم سیل العرم ۔ انہوں نے میرے احکام سے اغراض کیا تو ہم نے انھیں کا بند توڑ کر ان پر سیلاب جاری کر دیا۔ قرآن مجید کے الفاظ الہامی ان کی تباہی و بربادی کی تصدیق کر رہے ہیں۔

سلاطین حمیر پانی کی ایسی کثرت سے نعمت غیر مترقبہ کو اپنے قبضہ اختیار میں پا کر خداوند عالم کی احسان مندی اور سپاس گذاری کو تو بھول گئے۔ جس نے ان کو پانی کے لیے ایسے بیش قیمت دولت دی۔ اور پھر ایسے مستحکم بند بنائے اور اس دولت بیش بہا کو ہمیشہ جمع رکھنے اور اس کے ذریعے سے اپنی زراعت کو بٹانے اور اپنے تمام علاقہ کو سبز و شاداب بنانے کی عقل و حکمت عطا فرمائی۔ انہوں نے پانی کے اس کثیر ذخیرے کو ابدی اور لازوال دولت یقین کر لیا۔ اور اس کی وجہ سے اپنے ذاتی عظمت واقتدار پر اعتبار کر کے ایسا کبر وافتخار کرنے لگے کہ گویا ان کو اپنے غرور ونخوت سے زمین پر پاؤں رکھنا دشوار ہو گیا۔ مدبرین قدرت نے ان مغرورین دنیا کو متواضع بنانے اور سرکشانِ زمانہ کے سر جھکانے کی غرض سے یہ تدبیر نکالی کہ ان کا جمع کردہ ذخیرہ آب میں جو اصل موجبِ فساد تھا۔ ایسا سیلاب پیدا کر دیا کہ ان کی قوم کی قوم۔ قبیلہ کا قبیلہ۔ رات کو سوتا کا سوتا ہی رہ گیا۔ اور وہ بند ٹوٹ کر تمام شہر اور قرب و جوار کے علاقے بہالے گیا۔

مولوی شبلی کی کوتاہ قلمی پر ایک نظر

سلاطین حمیر کے مشہور سلسلہ شاہی اور ان کے اعلیٰ نظام و تمدن عظمت و اقتدار اور اخبار و آثار کی تفصیل میں۔ہم نے مندرجہ حالات و واقعات مغربی اور مشرقی محققین و مؤرخین کے مختلف تصنیفات و تالیفات سے قلم بند کر دیئے۔مگر افسوس ہے کہ شبلی صاحب نے عرب البائدہ کے ایسا عرب العاربہ کے حالات کو بھی مرفوع القلم فرما دیا۔حالانکہ انھیں کے حوالوں سے جو اوپر نقل کئے گئے۔معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور قابل الذکر تھے۔اور ان کا تمدن۔ان کا تدبر۔ان کی صنعت و حرفت اور ان کی عظمت و شوکت سب کچھ قابل بیان تھی۔جستہ جستہ ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے مگر ایسے اختصار کے ساتھ کہ آپ کا بیان صرف انگلیوں کا اشارہ بن کر رہ گیا ہے۔مولوی صاحب نے ان کی تفصیل و بیان حالات کو اپنے مدعا تالیفی کی ضرورت سے زائد سمجھ کر آگے سے ہٹا دیا ہے۔مگر کسی ملک و قوم کی تاریخ کا سلسلہ اس وقت تک مکمل اور مسلسل نہیں کہا جا سکتا۔جب تک کہ اس کے تمام قدیم اخبار و آثار سے اس کے موجودہ حالات و واقعات کا زنجیرہ نہ ملا دیا جائے۔

مولانا شبلی صاحب نے عرب البائدہ اور عرب العاربہ کے حالات و واقعات کو قلمزد فرما کر اپنی کتاب کے ناظرین سے عظیم الشان اور مقدس انبیا و سلاطین عرب کے حالات کو بالکل مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے اور عرب البادیہ کے سلسلہ میں۔قوم عاد کے حالات ان کے عروج و ادبار کے تاریخی واقعات۔حضرت ہود کی بعثت۔ان کی تبلیغ رسالت۔قوم ثمود (عاد ثانیہ) کے واقعات ان کا تمدن اور اعلیٰ صنعت و حرفت۔سنگتراشی کے کمال۔جناب صالح کی رسالت۔اور عرب کے اس قدیم دعوے پر اس کی مقدس سرزمین پر چار پیغمبران الٰہی مبعوث فرمائے گئے۔ایک تاریک پردہ ڈال دیا ہے۔اسی طرح ملکۂ بلقیس اور اس کی شاہی سطوت کے کارناموں کو خارج از بیان قرار دے کر سرزمین عرب کی اس تقدیس و عظمت کو جو فلسطین و بیت المقدس کے ساتھ مراتب جلال و اقتدار میں بحصہ مساوی حاصل تھی۔چھپا دیا اور گھٹا دیا۔

کمال عبرت اور انتہائے حسرت تو یہ ہے کہ شمس العلماء نعمانی ایک اسلامی فاضل اور محقق ہو کر عرب کے ان اخبار تقدیس اور آثار عظمت و تکریم کو دیدہ و دانستہ نظر انداز فرمایا اور اگر کچھ قلمی زحمت اور رقتی مصیبت اٹھا کر لکھا بھی تو ایسا مختصر کہ جس سے کوئی نتیجہ بھی اخذ نہ ہو سکے۔

آپ کے خلاف غیر اسلامی مؤلفین و مؤرخین جن کو عرب اور اہل عرب کے حالات و واقعات کے ساتھ اتنی ہمدردی اور دلچسپی اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔وہ اپنی دولت۔اپنا دماغ اور اپنا وقت صرف کر کے ان کے تمام حالات و واقعات اور اخبار و آثار۔ہزاروں ایکڑ زمینیں کھود کھود کر باہر نکالیں اور ان کے صحیح نشانات۔علامات اور مقامات بتائیں۔اور طرہ یہ ہے کہ آپ بھی انھیں کی تحقیقات سے فائدہ اٹھائیں اور جا بجا اپنی کتاب میں انھیں سے حاشیہ و معنی چڑھائیں۔مگر جب اپنے لئے ان کے لکھنے اور بیان کرنے کا وقت اور مقام آئے تو آپ اپنا قلم روک لیں اور کچھ نہ لکھیں۔

مولف کے لئے اپنے مدعائے تالیفی پر زود رسی کی کوشش بہت سی ضروری فروگذاشتوں کا باعث ہوتی ہے۔مولوی شبلی صاحب بھی اس کے الزام سے نہیں بچے۔بلکہ ایک شرمناک مغالطہ میں پڑ گئے۔عرب کی قدیم حکومتوں کے باب میں آپ لکھتے ہیں کہ سبائی دور جیسا

کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے حضرت عیسیٰ سے سات سو برس قبل ہے۔اسی سلطنت کا پایہ تخت مآرب تھا۔

جب ہم آپ کے اس بیان کو دوسرے محققین ومؤرخین کے بیانات سے ملاتے ہیں تو امتداد وایام کے حساب میں زمین وآسمان کا فرق پاتے ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولف نے صرف مولر (Muller) کی روایت احاد پر اعتبار کرلیا۔حالانکہ مقدمہ کتاب میں تنقید وتحقیق روایات کی نسبت آسمان زمین کے قلابے ایک کردیئے گئے ہیں۔یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے رشحات تحقیق وتوثیق وتصدیق وحی آسمانی کا پہلو نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔مگر بااین ہمہ جب آپ کے ان ظاہری طمطراق کے بعد سیاق تالیف پر نظر کی جاتی ہے تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیان کو عمل سے اور عمل کو بیان سے کوئی سروکار نہیں۔اسی تعین زمانہ کے متعلق مولر کے تنہا نظریہ پر اعتبار کرلیا گیا۔مگر گلاذری کے قول پر جسے مولر کی روایات سے قبل خود لکھ چکے ہیں۔کوئی اعتنا نہ فرمائی۔اوراس کے قول کو اس کا خاص خیال ٹھہرایا۔باوجود یکہ وہ سبائی حکومت کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے پندرہ سو برس قبل بتلا چکا تھا۔مگر آپ کو تو جلد سے جلد عرب المستعربہ (بنو اسماعیلؑ) کے حالات پر پہنچ کر اپنے مدعاے تالیف کو آغاز کرنا منظور تھا اور بنو اسماعیل کے حالات وواقعات کو آپ عرب قدیم اور عرب اوسط تمام قوم و قبائل کے احوال کو قلمز دفرما کر،عرب کی اصلی تاریخ سمجھے ہیں۔اس بنا پر آپ نے گلاذری کے بتلائے ہوئے زمانہ پر بھی اعتبار نہ کیا۔چونکہ وہ آپ کے مدعا کے مطابق نہ تھا۔اس لئے صرف ایک ہی شخص کے قول پر اعتماد کرلیا۔اوراپنی کتاب میں لکھ دیا۔کیا اسی نگاہِ سرسری کا نام تحقیق ہے۔اوریہی زودنویسی تنقید کامل کہی جائے گی؟

ہم مولانا شبلی صاحب کی اس غلط فہمی کی اصلاح وتصحیح ان کے شفیق محسن ڈاکٹر سرسید احمد صاحب کی اس تحریر سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں جو زمانہ ملوک سبا کے متعلق خطبات احمدیہ میں درج ہے۔

اب چونکہ حمیر (ابن سبا جیسا کہ آگے بیان ہوتا ہے) یقطان سے چوتھی پشت میں تھا۔اورترح بھی قانع سے چوتھی پشت میں تھا۔اس لئے ہم اس نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے بہت دور ہوں گی یعنی 2126ق م خطبہ احمدیہ۔لاہور ص70 شبلی صاحب مولر کے قول کی بنا پر سات سو برس کا کل زمانہ حضرت عیسیٰ کے قبل بتلاتے ہیں۔اور سرسید کی تحقیق میں۔جس کو انھوں نے کتب مقدسہ توریت۔یونانی اوررومی تالیفات قدیمہ سے مستنبط ومحقق کیا ہے۔دوہزار برس سے بھی اوپر کا زمانہ ثابت ہوتا ہے اسی طرح اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں۔اس کے دور (حکومت سبائی) کے بعد حمیر کا زمانہ ہے۔حمیر نے مآرب پر قبضہ کرکے اس کو اپنا پائے تخت بنالیا۔پھراس کے نیچے یوں رقمطراز ہیں۔قریباً115ق م کے حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کرلیا۔''یک نہ شد دوشد'' آپ کی تحقیق میں سبا اور حمیر دو جداگانہ حکومتیں تھیں۔اگر صرف ابوالفدا کی عربی یا اردو ترجمہ مطبوعہ انصاری دہلی کو (باوجود یکہ اپنے مقدمۂ کتاب میں تاریخ ابو الفدا عربی اوراس کے حالیہ لاطینی ترجمہ کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ملاحظہ کرلیا گیا ہوتا تو یہ مسئلہ اسی وقت صاف ہوگیا ہوتا۔اور پھراس امر کے مان لینے میں کہ سبا کا بیٹا حمیر تھا۔آپ کو کوئی کلام نہ رہتا۔

ابوالفدا کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

ثم ملك بعده ابنه عبد شمس بن يشحب و سمى سبا وهو الذى بنا السد ارض

مارب و بنی مدینة مارب و عرفت مدینه سبا و خلف سبا المذکور عدة اولاده منهم حمیر و عمر کهلان و اشعر و غیرهم ولما مات سبا ملك الیمن بعده ابنه حمیر ابن سبا بن یشحب

یشحب ابن قحطان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا عبد شمس جس کا لقب سبا تھا۔ بادشاہ ہوا۔ اور یہ وہی بادشاہ ہے۔ جس نے ارض م آرب میں سد تعمیر کرائی اور شہر م آرب بسایا۔ اور شہر م آرب بھی اسی کے نام سے شہر سبا مشہور ہوا۔ سبا مذکور کی متعدد اولادیں ہوئیں۔ جن میں حمیر۔ عمر۔ کہلان اور اشعر وغیرہ شامل ہیں۔ جب سبا مر گیا تو اس کا بیٹا حمیر ابن سبا بادشاہ یمن قرار پایا۔

اب اس عبارت کو پڑھ کر کوئی شخص سبائی اور حمیری سلطنتوں کو کیسے دو جداگانہ حکومتیں قائم کرے گا۔ اور آپ کے اس فقرے، کہ حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کیا معنی رکھتا ہے۔ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے سبا باپ تھا اور حمیر بیٹا۔ یا بقول علمائے اثریات۔ سبا مورث خاندان تھا اور حمیر اس کی اولاد و اعقاب۔ باپ یا مورث مر گیا۔ اولاد یا اس کے ورثاء نے اسی کی وقت یا اس کے بعد حکومت آبائی پائی۔ تو ایسی حالت میں واقعہ کی اصلیت کو یوں تبدیل کر کے بتلانا کہ حکومت سبا پر حمیر نے قبضہ کر لیا۔ تاریخ کے صحیح اور اصلی واقعہ پر صریح غلطی اور سوء فہمی کا حاشیہ چڑھانا ہے۔

اگر ان حوالوں سے اس سلسلہ شاہی میں آپکا مابعد کے واقعات سے مدعا ہے تو وہ بھی آپ کے قرار داد زمانہ اور مدت کے اعتبار سے بھی کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آپ لکھتے ہیں کہ قریباً 115 قبل مسیح جو واقعہ اصحاب الفیل سے بھی پیچھے واقع ہوا ہے تو مراد نہیں لیا ہے مگر وہ تو 554ء میں واقعہ ہوا ہے اور آپ 115 ق م بتلاتے ہیں۔ غالباً آپ کا مطلب اس انتقال سے حکومت اور تبدیلی سلطنت سے ہوگا۔

ثم ملك بعدها (بلقیس) عمها ناشر النعم بن شرحیل ثم ملك بعده شمر برعش بن ناشر النعم ثم ملك بعده ابنه ابو مالك بن شمر ثم ملك بعده عمران ابن عامر الازدی ثم ملك اٰخر مزیقیا ثم ملك الاقرت ابن ابی مالك (ابو الفدا)

ملکہ بلقیس کے بعد اس کے چچا زاد بھائی ناشر النعم ابن شرحیل بادشاہ ہوا اس کے بعد شمر برعش ناشر النعم کا بیٹا حاکم ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو مالک ابن شمر تخت پر بیٹھا۔ اس بادشاہ کی سلطنت میں عمران ابن عامر ازدی نے۔ جو خاندان سلطنت بنی کہلان میں چلی آئی۔ عمران کے بعد اس کا بیٹا مزیقیا تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں قرن ابن ابو مالک نے اپنے باپ کی سلطنت کا دعویٰ کیا۔ مزیقیا سے لڑ کر اس کو شکست دی اور سلطنت چھین لی اور اس طرح حکومت پھر سلسلہ حمیریہ میں چلی آئی۔ خطبات مع ترجمہ ابو الفدا۔ مطبوعہ لاہور ص 80

اگر ان واقعات سے آپ کا انقلاب سلطنت مجوزہ مراد ہے تو بھی ان واقعات و انقلابات کا زمانہ 900 ق م سے کسی حال میں کم ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ تورات کی رو سے ملکہ بلقیس کا زمانہ 1005 ق م ثابت ہو چکا ہے۔ اگر یہ بھی نہیں۔ اگر اس کے قبل الحارث الرائش قیس ابن صیفی ابن سباالاصغر کے واقعات سے جس نے اپنے زمانہ حکومت میں یمن وحضر موت دونوں سلطنتوں کو ملا لیا ہے۔ آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ تاہم آپ کا خیال صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ شخص چھ پشت قبل ملکہ بلقیس سے تھا۔ چنانچہ ابوالفدا میں مرقوم ہے۔

ثم ملك بعده ابنه ذوالقرنين الصعب بن الرائش ثم ملك بعدهٔ ذوالاذعار عمر ابنه ذوالمنار ابرهه ابن ذی القرنين ثم ملك بعده ابنه افريقش ابن ابرهه ثم ملك بعده شرجيل بن عمر بن غالب بن المنتان ابن زيں بن يحفرا السكسك وبن وائل بن حمير

حارث الرائش جو سبا اصغر کے سلسلہ سے تھا اور جو تبع اول کے نام سے ملقب ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا صعب الملقب بہ ذوالقرنین بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا۔ جس کا نام عمر ابن ذوالمنار تھا بادشاہ ہوا۔ عمر ذوالعار کی سلطنت کے زمانہ میں شرجیل ابن عمر ابن غالب ابن منتان ابن زیدان یعفر بن سکسک ابن وائل ابن حمیر نے اس پر حملہ کیا اور بے شمار خونریزیوں کے بعد عمر ذوالاذعار کو شکست دی اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ شرجیل کے بعد اس کا بیٹا الہد ہاد تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کی لڑکی بلقیس حکمراں ہوئی۔ (ابوالفدا مع عبارت مندرجہ خطبات سر سید 12)

اگر آپ نے الحارث والے واقعہ اجتماع الریاستین سے سبائی حکومت اور حمیری قبضہ مراد لیا ہے تو باعتبار امتداد الایام کے یہ واقعہ حضرت بلقیس سے چھ پشت قبل کا ثابت ہوتا ہے۔ جس کا زمانہ وقوع 1200 ق م سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ پھر آپ کا 115 ق م بتلانا کس زائچہ سے مستخرج سمجھا جائے گا۔ اور کون سا واقعہ تاریخی کارنامۂ عرب اور شاہنامہ حمیر میں مراد لیا جائے گا۔

اس کو بھی جانے دیجیے اگر آپ اس ذوالاذغار اور شرجیل والا واقعہ سمجھے ہیں۔ تو ہمارے مندرجہ شجرہ حمیریہ سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقتاً یہ دونوں شاخیں ایک ہی اصل سے پیوستہ ہیں۔ شرجیل کا سلسلہ بھی حمیر تک شمار ہوتا ہے اور ذوالاذغار کا سلسلہ نسب بھی حمیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں خاندانوں کو دو جداگانہ اور علیحدہ خاندان سمجھنا حقیقت سے غفلت ہے۔ اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اصلیت کے اعتبار سے قابل اعتماد ہے اور نہ امتداد زمانہ کے حساب سے لائق اعتبار کیونکہ شرجیل ملکہ بلقیس کا دادا تھا۔ اس لئے یہ واقعہ بھی 1100 ق م میں واقعہ ہوا نہ کہ 115 ق م میں۔

سب سے آخر میں اگر مولوی شبلی صاحب سبائی حکومت پر حمیریوں کا قبضہ ہونے سے، ذونواس صاحب الاخدود کی شکست اور ذی جدن حمیری کی فتح مراد لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ تو یہ بھی نہ واقعات کے اعتبار سے صحیح ہے اور نہ امتداد ایام کے شمار سے۔

کیونکہ عموماً تحقیق سے یہ واقعہ 345ء میں واقعہ ہوا تھا نہ 115ق م میں تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سلسلہ حمیری کا آخر غلبہ سیف بن ذی یزن کے وقت ہوا تھا۔مگر وہ قبائل حبشہ تک محدود تھا اور وہ ظہور اسلام سے قریب تھا۔اس لئے اس پر بھی 115ق م میں وقوع پذیر ہونے کا گمان صحیح نہیں ہوسکتا۔اس بنا پر آپ کا تحریر فرمانا کہ سبائی حکومت پر حمیر کا قبضہ ہوگا۔اور پھر اس کے وقوع کو 115ق م میں بتلانا کسی طریقہ اور قرینہ سے تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے۔اگر آپ اس عبارت تفریقی کے بجاے۔مناسبت تخصیصی کے پیرایہ میں اس طرح تحریر فرماتے کہ پھر سبا کی دوسری شاخ جو حمیر کے نام سے مشہور ہے۔سبا کی جگہ حکومت یمن پر قابض ہوئی۔تو صحیح بھی تھا اور فی الواقع تھی۔مگر تاہم 115ق م کا تعین مدت غلط کا غلط ہی رہتا۔اس کی صحت و مرمت کے لئے تاریخوں سے وہی زمانہ قائم کرنا ہوتا جو اس کے وقوع پذیر ہونے کے لئے صحیح طور پر قلمبند کیا گیا ہے۔

حمیر کی اولاد اور عرب کے مختلف حصوں میں ان کی حکومت

مولوی شبلی صاحب کی تصحیح وترمیم کے بعد ہم پھر اپنے سابق سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں۔عبدالشّمس ملقب بہ سبا رالاکبر کے دس بیٹے تھے ان کے نام یہ ہیں۔مذحج۔کندہ۔ازد۔اشعر۔حمیر۔کہلان۔لخم۔جذام۔عاملہ اور غسان۔ان میں سے مذحج۔کندہ۔ازد۔اشعر۔حمیر اور کہلان،اس کے چھ بیٹوں نے تو علاقہ یمن میں سکونت اختیار کی اور بقیہ چار بیٹے لخم۔جذام۔عاملہ اور غسان ملک شام میں نکل گئے،اور وہیں آباد ہوئے۔غسانی سلسلہ شاہی،اس کے آخری بیٹے غسان ابن حمیر سے منسوب ہے۔جن کا ذکر آئندہ اپنے مقام پر آئے گا۔

تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بند اِرم کے ٹوٹ جانے کے بعد یمن سے آٹھ بڑے قبیلے تباہ ہو کر نکل گئے۔جن میں سے ایک قبیلہ نے دریائے فرات کے کنارہ مقام حیرہ میں سکونت اختیار کی۔کہا جاتا ہے کہ قبیلہ غسان بھی انھیں ایام میں شام جا کر آباد ہوا۔اسی طرح تین قبیلے اور جن کے سردار قبائل کے نام۔بکر۔مضر اور ربیعہ تھے۔ایسے ہی پریشان ہو کر عراق کی طرف نکل گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔اور ان کے نام سے تین علاقے دیار بکر،دیار مضر اور دیار ربیعہ آج تک یادگار ہیں۔(ابوالفدا۔طبری اور ابن ہشام)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ بند اِرم کے ٹوٹ جانے سے خاندان سبا یا حمیر کو متفرق مقامات اور دور دراز علاقہ جات میں جا کر آباد ہونے کی مجبوری پیش آئی۔چنانچہ ایک مقام حیرہ میں دوسرا علاقہ شام میں سکونت پذیر ہوا۔رفتہ رفتہ ان دونوں سبا رالاصل اور حمیری النسل نے اپنے اپنے اطراف سکونت میں اتنی ترقی کی اور ایسی قوت پکڑی کہ ان دونوں علاقوں پر اپنا پورا تسلط حاصل کر لیا۔اور وہاں کی عنان حکومت پر اپنے قبضہ اختیار میں کر لی۔اور مدت مدید تک علاقہ جات حیرہ اور شام میں بڑی نام ونمود سے سلطنت کرتے رہے۔

حمیری ملوک حیرہ

مؤرخ ابوالفدا کے حوالہ عبارت سے ہم ملوک حیرہ کا سلسلہ اور ان کے حالات ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

اول من ملك على العرب بأرض الحيرة مالك ابن فهم ثم ملك بعده اخوه عمر ابن فهم ثم ملك بعده ابن اخيه خذيمه ابن مالك بن فهم و كانت له اخت تسمى رتاش لما قتل خذيمه ملك بعده ابن اخته عمر و ابن عدى ابن نصر ابن ربيعه ثم مات و ملك بعده ابنه امرء القيس و كان يقال له امرء القيس البدء اى الاول ثم بعد امرأالقيس ابنه عمر ابن امرء القيس ثم ملك بعده اوس بن قلام العمليقى ثم ملك اخر من العماليق ثم رجع الملك الى عمرو ابن عدى ابن نصر ابن ربيعة اللخميين المذكور بن وملك منهم امرء القيس من ولد عمر ابن امراء القيس المذكور و يعرف هذا امرء القيس الثانى بالمحرق لانه اول عاقب

النار ثم ملك بعده ابنه النعمان الا عورا بن امرء القيس ثم نزهد و خرج من الملك و ملك بعده ابنه المنذر بن النعمان ثم ملك بعده ابنه الا سود بن المنذر (ابو الفدا)

ثم ملك بعد اخوه المنذر ابن المنذر ابن النعمان الا عور ثم ملك بعد علقمه الذوميلي (ذوميل بطن من لخم) ثم ملك بعده امرء القيس بن النعمان بن امراء القيس المحرق ثم ملك بعده ابنه المنذر ابن امرء القيس ملقب بماء السماء وطرد كسرى القباد المنذر المذكور عن ملك الحيرة وملك مرضعه الحرث ابن عمر حجر الكندى ثم لا تمكن كسرىٰ نو شروان من قباد المذكور فى الملك وطرد الحارث واعاد المنذر بن ماء السماء الى ملك الحيره (ابو الفدا)

ثم ملك بعد المنذر عمر و مفرط الحجارة ثم ملك بعده اخوة قابوس ثم ملك بعده اخوهما المنذر ثم ملك بعده ابنه النعمان بن بأهات الحمداش ثم عاد الملك الى الخمئين فملك بعد زاويه المنذر ابن النعمان بن المنذر بن ماء السماء سمية العرب المغرور واستمر مالكاً الى الحيرة الى ان قدم لها خالد ابن الوليد واستولى على الحيرة

علاقہ حیرہ میں جس شخص نے سب سے پہلے حکمرانی کی وہ مالک ابن فہم تھا اس کے بعد اس کا بھائی عمرا بن فہم اس کے بعد اس کا بھتیجا خذیمہ ابن مالک ابن فہم حکمران ہوا۔ اس کی ایک بہن تھی رتاش نام۔ خذیمہ کے قتل ہو جانے کے بعد اس کا بھانجا عمرا بن عدی ابن نصر ابن ربیعہ حکمران ہوا۔ جب وہ مرگیا تو اس کا بیٹا امرء القیس تخت نشین ہوا۔ اس امراء القیس اول کے بعد اس کا بیٹا عمرا بن امرالقیس بادشاہ ہوا۔ پھر آخر ملوک عمالیق تک ہوتے گئے۔ اس کے بعد سلطنت عمرا بن عدی ابن نصرا بن ربیعہ الخمیئین مذکورین کی طرف عود کر آئی۔ اور ان میں سے امرءالقیس نے جو عمرا بن امرءالقیس ثانی مشہو ہے۔ اور محرق اس کا لقب ہے۔ اور عقوبت بالنار کی ایجاد عرب میں اسی کے وقت سے ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا النعمان اعور بن امرءالقیس تھا جو کہ تخت نشین ہوا۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ تارک الدنیا ہوگیا اور ترک شاہی کر کے ملک سے چلا گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر بن نعمان بادشاہ ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا الاسود بن منذر

حکمران ہوا اس کے بعد اس کا بھائی منذر ابن منذر ابن نعمان الاعور بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد علقمۃ الذمیلی جو دونوں جانب سے بنی لخم تھا، بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد امرء القیس ابن نعمان ابن امرء القیس المحرق بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر بن امرء القیس جس کا لقب مار السماء تھا بادشاہ ہوا۔ لیکن قباد کسری نے منذر کو تخت سلطنت سے اتار کر الحارث ابن عمر ابن حجر الکندی کو اس کی جگہ پر حکمران مقرر کیا۔ لیکن قباد کے بعد کسریٰ ونوشیرواں نے الحارث کو تخت حکومت پر نہ رہنے دیا اور اس کو اٹھا کر ملک المنذر ابن ماء السماء کے حوالہ کر دیا۔ المنذر کے بعد اس کا بیٹا عمر الملقب بہ مفرط الحجارۃ تخت نشین ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بھائی قابوس بادشاہ ہوا۔ قابوس کے بعد اس کا بھائی منذر ابن منذر حکمراں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابن منذر ابن منذر ماء السماء تخت نشین ہوا۔ اس کی کنیت ابو قابوس تھی۔ اور اس نے مذہب نصاری اختیار کیا۔ اس کے بعد سلطنت ایاس ابن قبیصہ الطائی کی طرف منتقل ہوگئی۔ ایاس کے بعد زاویہ ابن ماہان الحمد السنی بادشاہ ہوا۔ اس کے وقت میں سلطنت پھر الخمیین کی طرف منتقل ہوگئی۔ اور زاویہ کے بعد منذر ابن نعمان ابن منذر ابن ماء السماء تخت نشین ہوا۔ اہل عرب نے اس شخص کا نام مغرور رکھا تھا۔ اور یہ شخص اس وقت تک موجود تھا کہ جس وقت کہ خالد ابن ولید نے اسلام کے لئے اس سے ملک خالی کرا لیا۔

اب ہم اپنے سلسلہ شاہی کے اجمالی بیان کی۔ جس کو ہم نے تاریخ ابوالفدا کی عبارت سے اوپر نقل کیا ہے۔ خطبات احمدیہ سے کامل تفصیل حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں۔ جس سے بیان مندرجہ بالا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

عرب العاربہ میں خاندان قحطان نے بڑی طاقت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اور صوبہ حیرہ میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی۔ اسی خاندان کا پہلا بادشاہ مالک ابن فہم تھا۔ اس کے بعد اس کے بھائی عمر کو تخت ملا۔ اس کے بعد خذیمہ بن مالک تخت پر بیٹھا۔ یہ جری مگر طامع بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بہت قوی اور مستحکم کر لیا تھا۔ ایک طرف تو دریائے فرات اس کی مملکت کی حد تھی دوسری جانب وہ شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شام تک سلطنت بڑھانے میں اس کو عمالیق سے لڑنا پڑا۔ اس نے ایک سخت اور خونریز لڑائی کے بعد ان کو شکست دی۔ اس بادشاہ کی بہن نے جس کا نام رتاش تھا ایک شخص مسمی عدی سے جو بنی لخم میں تھا۔ شادی کر لی۔ خذیمہ کے بعد اس کا بھانجا عمر ابن عدی تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا امرء القیس اور اس کے بعد اس کا بیٹا عمر بادشاہ ہا۔ مگر اس کو اوس بن قلام عملیقی نے تخت سے اتار دیا۔ اس کے بعد ایک یا دو بادشاہ اس خاندان کے حکمران ہوئے۔ جن کے نام معلوم نہیں۔ لیکن اس قدر محقق ہے کہ امرء القیس ثانی ابن عمر نے بہت جلد اپنے بھائی کی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لے لیا۔ یہ اول شخص تھا جس نے انسانوں کو زندہ جلا دینے کی وحشیانہ رسم جاری کی۔ جس کے سبب سے اس نے محرق کا لقب حاصل کیا تھا اس کے بعد نعمان جانشین ہوا۔ مگر دنیا کے جھگڑوں سے کبیدہ خاطر ہو کر تیس برس سلطنت ترک کر کے شاہی ترک کر دی۔ اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسود تخت نشین ہوا۔ جس کو ملوک غسان

سے چند لڑائیاں لڑنا پڑیں۔اس کے بعد اس کے بھائی المنذر الثانی کوتخت وتاج ملا۔اس کے بعد علقمہ ذمیلی اور اس کے بعد امرء القیس ثالث ابن نعمان نے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔اس کے بعد المنذر الثالث ملقب بہ ماء السماء جانشین ہوا۔مگر اس کو کسریٰ قباد نے سلطنت سے خارج کر کے الحارث کو جو قبیلہ کندہ سے تھا اور جس نے ایران کے بادشاہ کا مذہب اختیار کر لیا تھا، حاکم مقرر کیا۔جب کسریٰ نوشیرواں تخت پر بیٹھا تو اس نے الحارث کو حکومت سے علیحدہ کر دیا اور المنذر الثالث کو پھر حکومت دے دی۔اس کے بعد اس کا بیٹا قابوس اور اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الرابع اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابو قابوس تخت پر بیٹھا۔اسی نعمان نے مذہب عیسائی اختیار کر لیا تھا۔اور خسرو پرویز کے زمانے میں ایک مشہور لڑائی میں جو ایرانیوں کے ساتھ ہوئی تھی مارا گیا۔اس کے بعد ایاس ابن قبیصہ الطائی اور اس کے بعد زاویہ اور اس کے بعد المنذر الخامس بن نعمان قابوس بادشاہ ہوا۔اسی بادشاہ کو خالد ابن ولید سردار لشکر اسلام نے (خلافت اول کے عہد میں) شکست دے کر سلطنت کو چھین لیا۔

جس زمانہ میں یہ بادشاہ حکمراں ہوئے، اس کا ٹھیک ٹھیک پتا لگانا اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے مگر آخر بادشاہ ہونے میں سے دو بادشاہوں کا زمانہ ٹھیک حد تک معلوم ہے اور اگر نسلوں کے ہونے کے معمولی قاعدے پر غور کیا جائے تو بعض اور بادشاہوں کے عہد سلطنت کے زمانہ بھی کافی طور سے تحقیق ہو سکتے ہیں عمر ابن المنذر ماء السماء کی حکومت کے آٹھویں سال میں جناب رسولخدا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں پیدا ہوئے۔اس لئے یہ بادشاہ 526ء میں تخت نشین ہوا ہوگا۔جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآ؛پ وسلم پر پہلے پہل وحی ایاس کی حکومت کے چھٹے مہینے میں نازل ہوئی تھی اس لئے ایاس 610ء میں تخت نشین ہوا ہوگا۔عمر کی تخت نشینی سے پہلے انیس بادشاہ ہو چکے تھے۔اور ان کی سلطنتوں کے مجموعہ کا بطرز معقول پانچ سو برس خیال کیا جا سکتا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا پہلا بادشاہ مالک ابن فہم ولادت مسیح علیہ السلام کے قریب قریب تخت پر بیٹھا ہوگا خطبات ص87 لاہور۔

حمیری ملوک غسان۔سلاطین شام

آل غسان کے شاہی سلسلہ کی تفصیل میں مؤرخ ابوالفدا تحریر کرتے ہیں۔

اول من ملك غسان جفنه بن عمر بن ثعلبه بن عمر مزيقيا ثم هلك و ملك بعده انه عمر ابن جفنه ثم ملك بعده ابنه تغلبه ابن عمر ثم ملك ابنه بعده الحارث ابن ثعلبه ثم ملك ابنه حبله ابن الحارث ثم ملك ابنه الحرث ثم ملك بعده ابنه المنذر الا كبر ثم هلك المنذر الا كبر المذكور وملك بعده اخوه النعمان ابن الحرث ثم ملك بعده اخوه حبله بن الحارث ثم ملك بعده اخوه عمر ابن الحارث ثم ملك جفنه الا صغر ثم ملك بعده اخوه النعمان الا صغر ثم ملك نعمان بن عمر ابن المنذر ثم ملك بعد النعمان بن الابهم ثم ملك اخوه الحرث

ابن الا بھم ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث ثم ملك بعده ابنه المنذر ابن النعمان ثم ملك اخوه عمرو ابن النعمان ثم ملك اخوھا حجر ابن النعمان ثم ملك ابنه الحارث ابن حجر ثم ملك ابنه جرا ابن الهارث ابن حبله ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث و كنية ابو كرب و لقبه قطام ثم ملك و بعده الا بھم ابن حبلة ثم ملك بعده اخوه المنذر ابن حبله ثم ملك اخوھما سراجیل بن حبلة ثم ملك اخوھم عمر ابن حبلة ثم ملك بعده ابن اخیه حبله ابن الحرث ابن حبلة ثم ملك بعده حبله ابن الا بھم بن حبله وھوا خر الملوك الغسان وھو الذی اسلم فی خلافة عمر ثم عادالی الروم و تنصر (ابو الفدا)

سب سے پہلے جس شخص نے سلسلہ غسان سے حکومت کی وہ جفنہ ابن عمر ابن ثعلبہ ابن عمر ابن مزیقیا تھا۔ اس کے بعد عمر ابن جفنہ بادشاہ ہوا۔ جفنہ کے مرجانے کے بعد اس کا بیٹا عمر ابن جفنہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ثعلبہ ابن عمر، اس کے بعد اس کا بیٹا الحارث ابن ثعلبہ اس کے بعد اس کا بیٹا حبلہ ابن الحارث اس کے بعد اس کا بیٹا الحرث اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الاکبر بادشاہ ہوا۔ المنذر الاکبر کے بعد اس کا بھائی نعمان بن الحرث اس کے بعد اس کا بھائی حبلہ ابن الحارث اس کے بعد اس کا بھائی عمر ابن الحارث اس کے بعد جفنہ الاصغر تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی نعمان الاصغر، اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابن عمر ابن منذر نعمان کے بعد حبلہ ابن نعمان بادشاہ ہوا۔ حبلہ ابن نعمان کے بعد نعمان ابن الابہم تخت نشین ہوا اس کے بعد نعمان ابن الحرث بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا منذر ابن النعمان تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمر ابن نعمان اس کے بعد اس کا بھائی نعمان ابن الحرث جس کی کنیت ابو کرب تھی تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس بادشاہ کا لقب قطام تھا۔ اس کے مرجانے کے بعد اس کا بھائی منذر ابن حبلہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمر ابن حبلہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا حبلہ ابن الحرث ابن حبلہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد حبلہ ابن الابہم ابن حبلہ آخر بادشاہ آل غسان ہوا۔ اور یہ وہی شخص ہے جو خلافت حضرت عمر کے زمانہ میں اسلام لایا۔ پھر ملک روم میں بھاگ گیا۔ اور نصرانی ہوگیا۔ (ابوالفدا)

اس کے آگے مؤرخ ابوالفدا لکھتے ہیں۔

فلما ملك حجر سدد امورهم و ساسهم احسن سياسة وانتزع من الخميبين ما كان بايديهم من ارض بكر ابن وائل وملك بعد الحجر المذ كور ابنه عمر ابن حجر ثم ملك بعده ابنه الحرث ابن عمر

جب حجر بادشاہ ہوا تو اس نے قوم کا نہایت خوب انتظام کیا اور ان میں نہایت خوبی سے حکمرانی کی۔ اور شاہان الخمیبین کے قبضہ میں علاقہ بکر ابن وائل کے جس قدر حصہ چلا گیا تھا۔ وہ سارا علاقہ ان سے خالی کرالیا۔

حجر کے بعد اس کا بیٹا عمرا اور اس کے بعد حرچ ابن عمر یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے۔

ملوک حجاز کا ضمنی تذکرہ (کندہ)

حرث ابن عمر کے بعد شاہی سلسلہ میں مؤرخ ابوالفدا لکھتے ہیں۔

وملك اخوه (اى اخايعرب) جرهم الحجاز ثم ملك بعد جرهم ابنه عبد ياليل بن جرهم ثم ملك ابنه جر ثم ابن عبد ياليل ثم ابنه عبد المدان ابن جرشم ثم ابنه تعلبه ابن عبد المدان ثم ابنه عبد المسيح بن ثعلبه ثم ابنه مضاض ابن عبد السميح ثم ابنه عمر ابن مضاض ثم اخوه الحرث بن مضاض ثم عمر ابن الحارث ثم اخوه بشر ابن الحارث ثم مضاض ابن عمر ابن مضاض (ابو الفدا)

اس کے (حرث ابن عمر) بعد اس کا بھائی (یعنی یعرب) جرہم الحجاز بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبد یالیل حکمران ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا جرشم بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالمدان اس کے بعد اس کا بیٹا ثعلبہ ابن عبدالمدان حکمراں ہوا۔ اس کے بعد عبدالمسیح ابن ثعلبہ اس کے بعد مضاض ابن عبدالمسیح تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد عمر ابن مضاض اس کے بعد اس کا بھائی حرث بن مضاض۔ اس کے بعد عمر ابن الحارث اس کے بعد اس کا بھائی بشر ابن الحارث تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد مضاض ابن عمر ابن مضاض حکمراں ہوا۔ (ابوالفدا)

مؤرخ ابوالفدا کے متعلق یہ یادداشت بھی لکھتے ہیں۔

من ملوك العرب زهير ابن خباب بن حبل و كان زهير المذ كور قد اجتمع بابرهة الاشرم صاحب الفيل۔

ملوک عرب میں سے ایک زہیر ابن خباب بن حبل نامی تھا اور یہ زہیر ابرہہ الاشرم کے ساتھ واقعہ فیل میں

شریک تھا۔

درج بالا آل غسان کی اجمالی فہرست کی تفصیلی حالت ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے۔

عرب العاربہ نے ایک اور سلطنت صوبہ غسان میں قائم کی تھی۔ اس سلطنت کے حکمران عرب الشام کے نام سے مشہور تھے۔ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو یہ حاکم قیصر روم کی طرف سے بطور عمال تھے۔ مگر لقب شاہی کے اختیار کرنے کی وجہ سے سلاطین عرب کے ذیل میں بیان ہوتے ہیں۔ چونکہ بعض امور ان لوگوں سے ایسے متعلق ہیں جن سے ہمیں بعض امور کی تحقیقات اور مباحث میں آسانی ہوگی۔ اس لئے ان کی سلطنتوں کا ایک مختصر حال اس مقام پر لکھ دینا ضروری ہے۔

اس سلطنت کی بنا چار سو برس قبل ظہوا اسلام سے ہوئی اور یہ زمانہ تین سو صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ جفنہ ابن عمر پہلا شخص ہے جس نے اس خاندان میں لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ شخص ازد (یکے از فرع حمیر) کی اولاد میں تھا۔ جو خاندان کہلان سے تھا۔ وہ عرب جوان سے پہلے شام میں رہتے تھے۔ ضجاعمہ کہلاتے تھے۔ ضجاعمہ نے مدت دراز تک مستعدی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا مگر بالآخر شکست اٹھائی اس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اسی طرح ایک عرصہ تک اختیارات شاہی یکے بعد دیگرے۔ الحارث حبلہ، الحرث، المنذر الاکبر کے ہاتھ میں رہے۔ اس آخری بادشاہ کے بعد اس کا بھائی نعمان بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بھائی عمر تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد جفنہ الاصغر ابن المنذر الاکبر کی باری آئی اس کے بعد نعمان الاصغر اور اس کے بعد اس کا بھتیجا نعمان ثالث ابن عمر بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد حبلہ ابن نعمان کے ہاتھ سلطنت لگی۔ یہ بادشاہ خاندان حیرہ کے بادشاہ ماءالسماء کا ہم عصر تھا۔ وہ اس سے چند لڑائیاں بھی لڑ چکا تھا۔ اس کے بعد نعمان رابع ابن الایہم اور اس کے بعد الحرث الثانی اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان الخامس اور اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد عمر برادر المنذر اور حجر برادر عمر یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوئے۔ اس کے بعد حارث ابن حجر اور حبلہ ابن الحارث اور الحارث ابن حبلہ باری باری حکمراں ہوئے۔ پھر نعمان ابوکرب ابن الحارث اور ایہم عم نعمان تخت پر بیٹھے۔ اور ایہم کے بعد اس کے تین بھائی المنذر، سراجیل اور عمر یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عمر کے بعد اس کے بھائی حبلہ ابن الایہم بن حبلہ کو سلطنت ملی۔ یہ بادشاہ حضرت عمر کی خلافت تک زندہ تھا۔ پہلے مسلمان ہوا۔ پھر روم کو بھاگ کر عیسائی ہو گیا۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ تقریباً 640ء میں ہو گیا۔

ملوک کندہ

عرب العاربہ کی ایک اور چھوٹی سی اور چند روزہ سلطنت کی بنیاد آل کندہ نے جو خاندان کہلان سے تھا، قائم کی تھی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ حجر ابن عمر ہوا۔ جس نے ملک حیرہ کے ایک حصہ پر قابض ہو کر ایک نئی سلطنت حاصل کر لی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عمر اس کے بعد اس کا بیٹا الحرث تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے کسری قباد کا مذہب اختیار کر کے اس کی اعانت سے سلطنت حیرہ کو دبالیا تھا۔ مگر جب نوشیرواں نے اس سے المنذر کو سلطنت دلوادی تب الحارث دیار کلیب کو چلا گیا۔ مگر اس کے بعد اس کے بیٹے چند روز تک چند مقامات پر حکومت کرتے رہے۔ جو بنی اسد پر حکمران تھے۔ سراجیل بکر ابن وائل پر، معدی کرب قیس غیلان پر، سلمہ تغلب پر اور نمر پر حاکم تھا۔ حجر کے بعد جو مارا گیا تھا اس کے بیٹے امرءالقیس نے از سر نو بنی اسد کو مطیع بنالیا۔ یہ امرءالقیس وہی بہت بڑا مشہور عرب کا شاعر ہے۔

ملوک حجاز

ایک اور سلطنت حجاز میں قائم ہوئی تھی۔ جس زمانے میں یمن اور حیرہ کی سلطنتیں اندرونی جھگڑوں سے ضعیف ہوگئیں تھی۔ اسی زمانہ میں اولاد یعرب یا جرہم نے ایک نئی اور خودمختار سلطنت حجاز میں قائم کی تھی۔ اسی سلطنت کا اول بادشاہ بقول ابوالفدا جرہم تھا۔ جس کا بھائی یعرب یمن میں حکمرانی کرتا تھا۔ ابوالفدا نے مندرجہ ذیل نام گنوائے ہیں۔ یا لیل، جرہم ابن یا لیل، عبدالمدن ابن جرشم ثعلبہ ابن عبدالمداں، عبدالمسیح ابن ثعلبہ، مضاض ابن عبدالمسیح، عمرابن مضاض، الحرث برادر مضاض، عمرابن الحرث، مضاض ابن عمرابن مضاض۔ اگر ابوالفدا کے نزدیک یہ بادشاہ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام سے پیشتر گذرے ہیں۔ یا ان کے ہم عصر گذرے ہیں۔ کیونکہ عبدالمسیح کے نام سے بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ وہ عیسائی تھا۔ اور اس لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ سے پیشتر گذرے ہوں یا ان کے ہم عصر ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سلطنتیں اس وقت قائم ہوئیں۔ جب یمن، حیرہ اور کندہ کی سلطنتیں زوال کی حالت میں پہنچ گئی تھیں۔ اور اس بنا پر ہمیں یقین ہے کہ ان کا زمانہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں تھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ عمرابن لاحی 421ء کے آخر میں اس سلطنت پر حکمراں تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ اسی شخص نے بت پرستی کو حجاز عرب میں رواج دیا اور کعبہ میں تین بت ہول (ھُبل) کعبہ کی چھت پر اور اساف ونائلہ دو اور مقاموں (صفاومروہ) پر نصب کر دیئے۔ مثل دیگر عرب العاربہ کے جو حجاز میں متوطن ہوئے اور وہیں کے بادشاہ ہوئے۔ زہیر ابن خباب نے بھی لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ بات اس وقت کی ہے۔ جب کہ ابرہۃ الاشرم نے مکہ معظّمہ پر حملہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ زہیر بھی ابرہہ شرم کے ساتھ اس مہم میں شریک تھا۔

اب ہم اپنے تالیفی دستور کے مطابق عرب العاربہ کے تمام حالات وواقعات بیان کر کے ان کے انساب واعقاب کا شجرہ قلمبند کرتے ہیں۔ مگر یہ شجرہ صرف انھیں لوگوں کا ہے۔ جن کا حال ہم نے اس کتاب میں بیان کیا ہے اس شجرہ سے ان مطالب کے سمجھنے میں آسانی ہوگی جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ تمام عرب العاربہ جن کا ہم نے مفصل احوال اوپر بیان کیا ہے۔ بنی جرہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر وقتاً فوقتاً اپنے مورثوں کے متعدد قبیلوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔ ان قبیلوں میں سے جو زیادہ مشہو اور صاحب نام ہیں۔ اور جن کا ذکر اکثر کتابوں میں آیا ہے۔ ہم ذیل میں انھیں کو لکھتے ہیں۔ ان قبیلوں کی تقسیم قائم کرنے میں تاریخ ابوالفدا ا اور معارف ابن قتبہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

قبائل مشہورہ عرب العاربہ

۱۔ یعرب یا جرہم سے۔بنوجرہم
۲۔ عبدالشمس بن یشحب سے۔بنوسبا۔
۳۔ حمیرابن سبا سے بنوحمیر
۴۔ کہلان ابن سبا سے بنوکہلان
۵۔ اشعرابن سبا سے۔اشعری
۶۔ انمارابن سبا سے بنوانمار
۷۔ عاملہ ابن سبا سے عاملی
۸۔ عدی ابن انمار ابن سبا سے بنوعدی
۹۔ لخم۔ابن عدی سے لخمی
۱۰۔ جذام ابن عدی سے بنوجذام
۱۱۔ عدس بن لخم سے بنوعدس
۱۲۔ غنم بن لخم سے بنوغنم
۱۳۔ بن الدارابن ہانی بن لخم سے داری
۱۴۔ غطفان ابن حیرام ابن جذام سے بنوغطفان

قبائل ذیل بنوغطفان کی نسل میں ہیں

(۱۵) بنوفضلہ(۱۶) بنواحف (۱۷) بنوالصبیب (۱۸) بنواہدالہ (۱۹) بنوانفاثہ (۲۰) بنواالضلیع (۲۱) بنواعائرہ (۲۲) بنوشیرہ (۲۳) بنوالخضرہ (۲۴) بنوعبداللہ (۲۵) بنوسلیم (۲۶) بنوبجالہ (۲۷) بنوغنم (۲۸) بنوالقالہ (۲۹) بنوسعد (۳۰) بنووائل۔

قبائل ذیل بنوسعد کی نسل میں ہیں

(۳۱) بنوعوف (۳۲) بن افہیرہ (۳۳) بنواصیحہ (۳۴) بنوالاخنس (۳۵) بنوجی (۳۶) حشمی (۳۷) بنوحطمہ (۳۸)

قبائل ذیل بنوانمار کی نسل میں ہیں

(۳۹) خثمی (۴۰) بجلی (۴۱) قستری (۴۲) بنواحمس (۴۳) دھمانی (۴۴) یحصبی (۴۵) سلفی (۴۶) سلمی (۴۷) آل ذی رعین

قبائل ذیل قضاعہ کی نسل میں ہیں

(۴۸) بنوکلیب (۴۹) عدی ابن خباب سے بنوعدی (۵۰) بنوعلیم (۵۱) بنوالعبید (۵۲) بنورفیدہ (۵۳) بنومصر (۵۴) بنوالقین (۵۵) بنوسلیح (۵۶) بنوتنوخ (۵۷) بنوجرم (۵۸) راسبی (۵۹) بن بہراء (۶۰) بنوامی (۶۱) بنومہرہ (۶۲) بنوعذرہ (۶۳) بنوسعدہ (۶۴) بنوہذیم (۶۵) عبدحبشی (۶۶) خستی (۶۷) سلامانی (۶۸) بنوجہینہ (۶۹) بنوھند (۷۰) التابعہ۔

قبائل ذیل تابعہ کی نسل میں ہیں

(۷۱) ذوقلاع (۷۲) ذونواس (۷۳) ذواصبح (۷۴) ذوجدن (۷۵) ذورائش (۷۶) ذونیرن (۷۷) ذوجرش (۷۸) بنو اشحول بنووائل (۸۰ بنوسکسک (۸۱) بنوعوف (۸۲) بنوفاران (۸۳) طائی (۸۴) غوثی

قبائل ذیل طائی کی نسل میں ہیں

(۸۵) بنوابنہاں (۸۶) بنوثعل (۸۷) بنوالسنبُّس (۸۸) حاتمی (۸۹) بنوتمیم (۹۰) توزی (۹۱) کندی (۹۲) سکونی (۹۳) اوسلی (۹۴) ہمدانی (۹۵) سبیعی (۹۶) دواعہ (۹۷) مذحج (۹۸) مرادی (۹۹) سعدی (۱۰۰) بنواخالد (۱۰۱) عنسی (۱۰۲) جعفی (۱۰۳) جنبی (۱۰۴) حکمی (۱۰۵) عائذی (۱۰۶) حملی (۱۰۷) حریمی (۱۰۸) زبیدی (۱۰۹) جدیلی (۱۱۰) الغمی (۱۱۱) تخعی (۱۱۲) بنو النار (۱۱۳) خولانی (۱۱۴) بنوالحماس (۱۱۵) بنوقتان (۱۱۶) ازدی (۱۱۷) مازنی یا غسانی (۱۱۸) دوسی (۱۱۹) ہنوئی (۱۲۰) جفنی (۱۲۱) آل عنقا (۱۲۲) آل محرق (۱۲۳) جبلی (۱۲۴) سلامانی (۱۲۵) دوس عدنی (۱۲۶) جذیمی (۱۲۷) جہاضمی (۱۲۸) سلیمی (۱۲۹) بنو ابناہ (۱۳۰) معینی (۱۳۱) بنویحمد (۱۳۲)

قبائل ذیل ازد کی نسل میں ہیں

(۱۳۳) الغطریف (۱۳۴) بنویشکر (۱۳۵) بنوالحجد رہ (۱۳۶) بنولہب (۱۳۷) غامدی

قبائل ذیل عبداللہ ازد کی نسل میں ہیں

(۱۳۸) قسامل۔ (۱۳۹) بنوعیک (۱۴۰) بنومارق (۱۴۱) بنوعوف (۱۴۲) بن طاقیہ (۱۴۳) بنوہداد (۱۴۴) خزاعی (۱۴۵) قمیری (۱۴۶) بنوحیل (۱۴۷) بنوالمصطلق (۱۴۸) بنوالکعب (۱۴۹) بنوالملیح (۱۵۰) بنوعدی (۱۵۱) بنوسعد (۱۵۲) اسلمی (۱۵۳) بنو بمایعہ (۱۵۴) حشیمی (۱۵۵) خزرجی

قبائل ذیل خزرج کی نسل میں ہیں

(۱۵۶) حشمی (۱۵۷) بنوتر زید (۱۵۸) اسلمی (۱۵۹) بنوبیامنہ (۱۶۰) بنوسالم (۱۶۱) بنوالحجبیل (۱۶۲) القراظل (۱۶۳) بنوالنجار (۱۶۴) بنومساعدہ (۱۶۵) یہی قبائل انصار ہیں۔

قبائل ذیل اوس کی نسل میں ہیں

(۱۶۶) اشہلی (۱۶۷) بنوظفر (۱۶۸) بنوالحارثہ (۱۶۹) اہل قبا (۱۷۰) جحجبی (۱۷۱) اجوارہ (۱۷۲) بنو واقف (۱۷۳) اسلمی (۱۷۴) بنوحطمہ۔ یہی قبائل انصار مدینہ ہیں۔

عرب المستعر بہ یا عرب مستوطنہ

عرب المستعر بہ کا سلسلہ نسب ترح (تارخ) ابن ناحور ابن ساد خ ابن راعون ابن فانع ابن عبیر ابن شالح ابن ارفخشد ابن سام ابن نوح علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اس لئے یہ خاندان بھی سلسلہ عرب العاربہ سے عبیر ابن شالخ پر پہنچ کر مل جاتا ہے۔ اسی طرح عرب البائدہ کے شجرہ نسب سے ازفخشد اور عیلان۔ ارفخشد سے عرب العاربہ کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور عیلان سے عرب البائدہ کا۔ اس بنا پر ہر شخص صحیح طور پر سمجھ جائے گا کہ سلسلہ نسبت میں عرب المستعر بہ بمقابلہ عرب البائدہ کے عرب العاربہ سے زیادہ قریب ہیں۔

ترح (تارخ) کی اولاد جو عرب میں آباد ہوئی وہ پانچ متفرق شاخوں اور مقاموں میں منقسم ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک تفصیل ذیل میں مندرج ہے۔

(1) اسماعیلی۔ حضرت اسماعیل بن حضرت ابراہیم علیہما السلام بن ترح (تارخ) کی اولاد (توریت۔ سفر تکوین باب 11 درس 28 باب 16 درس 15)

(2) ابراہیمی یا بنی قطورا حضرت ابراہیم علیہ السلام بن ترح کی اولاد۔ جو ان کی تیسری بی بی قطورہ کے بطن سے تھی۔ (سفر تکوین باب 11 درس 28 باب 25 درس 1)

(3) اَدَوَمی 1؎ جسے بنو عیسو بھی کہتے ہیں۔ وہ اَدوم ابن حضرت اسحاق ابن حضرت ابراہیم علیہما السلام ابن ترح کی اولاد سے تھے۔ (سفر تکوین باب 1 درس 28 باب 21 درس 3 و باب 25 درس 25)

(4) ناحوری یا بنی ناحور۔ اولاد ناحور برادر حضرت ابراہیم علیہ السلام ابن تارخ (ترح) سفر تکوین باب 1 درس 28، 29

(5) ہارانی یا بنی ہاران۔ یعنی موآب و عمان بن لود بن ہاران بن ترح کی اولاد۔ اس قوم کے لوگ کبھی موابی کبھی یوابی اور کبھی عمانی کہے جاتے تھے۔ مگر ہارانی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ یہ دونوں متفرق شاخیں اپنے اصل ہاران پر جا کر جو ان دونوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ ایک ہو جاتی ہیں۔ سفر تکوین باب 11 درس 28-29 و باب 19 درس 30و28

اب ہم ان مندرجہ بالا اقوام عرب المستعر بہ میں سے۔ ہر ایک قوم کے تفصیلی حالات و واقعات ذیل میں علیحدہ علیحدہ قلمبند کرتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ہم ان حالات کو آغاز کریں۔ ہمیں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے سلسلہ بیان میں وہ ترتیب جو ہم نے اوپر قائم کی ہے۔ باقی نہیں رہ سکتی۔ اس لئے کہ ہماری تالیفی ضرورت ہم کو اس ترتیب کے قائم رکھنے سے مانع ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے خلاف

ترتیب مصدرۂ بالا۔ ہم سلسلہ اسماعیلی سے پہلے بنی قطورہ کے حالات لکھتے ہیں۔ جو ہمارے سلسلہ ترتیب میں نمبر (2) ہے۔

بنوقطورہ یا اہل مدین

حضرت شعیب علیہ السلام کی امت اوران کی تبلیغ رسالت

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۶﴾

2000ق م تا از 1000ق م

اس اصول کا کئی بار تکرار کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے کہ سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگان نسل کے نام سے موسوم کرتی ہیں۔ مدین جن کے حالات اس فصل میں بیان ہوں گے۔ اپنے بانی و موسس خاندان مدین بن ابراہیم۔ (از بطن قطورہ) علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسماعیل کے پہلو میں قائم کی۔

ارض مدین۔۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ (عیلانہ) کے ساحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر وارض ثمود و حجاز تک جہاں ثمود و جرہم اور عرب اسماعیلی آباد تھے، واقع تھا۔

تاریخ مدین

چونکہ ارض مدین حضرت موسیٰ کا دارالہجرۃ ہے۔ اور اہل مدین و بنی اسرائیل میں ہمیشہ تعلقات جنگ و صلح جاری رہے ہیں۔ اس لئے تورات میں مدین کا ذکر نہایت کثرت سے آیا ہے۔ ہم انھیں کا اقتباس کریں گے اس کا سبب یہ ہے کہ یونان وروم کے عہد میں اس پرنبط قابض تھے جنھوں نے مدین کو چھوڑ کر رقیم اور حجر کو آباد و مشہور کیا تھا۔

ہم مدین کا آغاز 2000ق م سے فرض کرتے ہیں۔ کیونکہ پدر مدین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ 2100 یا 2200ق م ہے۔ ایک خاندان کو قوم کی حیثیت سے پیدا کرنے کی کم از کم سو دو سو برس کی مدت ضرور ہوئی ہوگی اس لئے مدین تورات میں سب سے پہلے عہد یعقوب میں 2000ق م سوداگروں کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کو جو کاروانِ تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا۔ وہ یہی اہل مدین اور اسماعیلی عرب تھے۔ (تکوین 27-28-36-30)

اس لئے قرآن مجید کی اس آیت میں۔

وَجَآءَتْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ ؕ قَالَ یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا

فِیۡهِ مِنَ الزّٰهِدِیۡنَ ۞

اتنے میں ایک کارواں آیا جس نے اپنے پانی والے کو بھیجا اس نے اپنا ڈول نکالا تو چلایا اے خوش نصیبی! یہ ایک لڑکا ہے۔ کارواں والوں نے ایک سرمایہ کی چیز سمجھ کر یوسف کو مخفی رکھا اور خدا ان کے کاموں سے آگاہ تھا (مصر پہنچ کر) ان لوگوں نے معمولی قیمت پر (یوسف کو) چند درھم میں بیچ ڈالا۔ کیونکہ وہ یوسف کی قدر نہیں جانتے تھے۔ (سورہ یوسف)

کارواں سے انھیں اہل مدین کو مراد لینا چاہیے اور مسلمان مفسرین نے بھی ایسا ہی سمجھا ہے۔ (معالم التنزیل تفسیر سورۂ یوسف)

یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ اور اسماعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر میں ان کے تاجرانہ سفر کی منزل اولین نظر آتی ہے۔ مسیحؑ سے دو ہزار برس پہلے قدامت پرست عرب کے اس مدیانی اور اسماعیلی قافلہ کا سامان تجارت وہی تھا جو عربوں کی تجارت کا ہمیشہ سامان رہا ہے۔ خوشبودار چیزیں بلساں، صنوبر اور لبان۔ تکوین 37-26۔

اس واقعہ کے چار سو برس بعد تک مدین کی تاریخ پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ مدین کی سوانح نگار بنی اسرائیل ہیں اور یہ زمانہ بنی اسرائیل کے قیام مصر کا ہے۔ 400 برس کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا، اور دعوت حق اور حب قوم کے جرم میں ان کو مصر سے ہجرت کرنی پڑی۔ تو ان کا ملجا بھی اسی قافلہ کی سرزمین تھی، جو ان کی قوم کو چار سو برس پہلے مصر پہنچا گئی تھی۔ یعنی مدین۔ خروج باب 2۔ آیت 18

مدین کی قوم عموماً اس وقت جس کاروبار میں نظر آتی ہے وہ وہی ہے جو تمام سامی قوموں کا پیشہ تھا اور جو حضرت موسیٰؑ کو مصر کی تمدن زندگی میں میسر نہ آتا۔ بنو سام کے عظیم الشان پیغمبر کے لئے ضروری تھا کہ وہ جہانبانی سے پہلے گلہ بانی کا سبق لے۔ اس لئے قضائے الٰہی نے موسیٰؑ کو مصر کے تمدن زار سے عرب کے بے تکلف اور سادہ ملک میں بھیج دیا۔ جہاں شرفاء سام نے اب تک اپنے آبائی عادات و اخلاق کو متروک نہیں کیا تھا۔ راعویل یا یثرو یا حوباب یا شعیبؑ۔ تاہم مدین کے قبائل ایک منتظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین و محافظت کے لئے کاہن (مذہبی عہدہ دار) ہوتے تھے۔ اور اکثر حالات میں یہی کاہن شہر کے قانونی حاکم بھی قرار پاتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں جو کاہن تھا۔ اس کا نام تورات میں کہیں راعویل کہیں یثرو کہیں حوباب مذکور ہے۔ لیکن اکثر مسلمان مفسرین کے نزدیک یہ شعیبؑ تھے۔ جو لفظاً حوباب سے بہت قریب ہے۔ حضرت موسیٰؑ جب مصر سے ہجرت کر کے شہر مدین میں آئے تو اِنھیں حوباب یا شعیبؑ کے ہاں مہمان ہوئے اور ان کے ہاں بکریاں چرانے کی خدمت قبول کی اور اس کے معاوضہ میں حضرت شعیبؑ نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰؑ کی زوجیت میں دی۔ خروج ۱، ۱۶، ۲۲

قرآن مجید میں مدین کا ذکر دو سبب سے آیا ہے۔ اول حضرت شعیبؑ اور دوسرا حضرت موسیٰؑ کے تعلق سے حضرت موسیٰؑ کے تعلق کی قرآن میں حسب ذیل وضاحت ہے۔

اہل مدین میں چند سال رہا۔ پھر اے موسیٰ تو ایک اعزاز پر آیا۔ (سورہ طہ)

جب موسیٰؑ (مصر سے) مدین کی طرف چلا۔اس نے کہا شاید میرا پروردگار مجھے راستہ دکھائے اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا تو وہاں چند لوگوں کو پانی پلاتے ہوئے پایا۔(القصص)

(اے محمدؐ) تو اہل مدین میں مقیم نہ تھا۔ان پر خدا کی آیتوں کو پڑھتے ہوئے لیکن ہم بھیجنے والے تھے (القصص)

حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر جب مصر سے حدود عرب میں آئے تو مدین کے کاہن نے ان کا استقبال کیا۔بنی اسرائیل غلامی کے عہد سے ابھی نکلے تھے۔نظام وترتیب سے آگاہ نہ تھے۔بھیڑ کی طرح شب روز پیغمبر کو گھیرے رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات کے لیے پیغمبر کے پاس دوڑے آتے تھے۔مدین کے کاہن (شعیبؑ) نے بتلایا کہ ایک قوم پر کیسے حکومت کرنی چاہیے۔اور اس کی ترتیب و تنظیم کے کیا اصول ہیں۔اول ہزار ہزار پر افسر ہوں۔پھر ہر سو پر اور پھر ہر دس پر۔صرف افسروں کے اختلاف رائے کے موقع پر امیر (حضرت موسیٰؑ) کی عدالت کی طرف رجوع کی جائے۔خروج 18

سولہ سو یا سترہ سو ق م جو حضرت موسیٰؑ کا عہد ہے۔مدین پانچ شیوخ قبائل یا تورات کی اصطلاح کے مطابق پانچ بادشاہوں کے ماتحت تھا۔ان کے نام یہ تھے۔عوی، رقیم، ضور، حور اور ربع۔یوسیفوس یہودی جو پہلی صدی عیسوی میں تھا اس کا بیان ہے کہ شہر رقیم اسی مدیانی بادشاہ رقم کے نام سے آباد ہے۔عرب اب تک اس کو رقیم اور یونانی بیٹرا کہتے ہیں۔اس بنا پر بیسویں صدی کے ایک مشہور مصری عیسائی مؤرخ کی یہ تحقیق کہ الرقیم اس شہر کے یونانی غیر مشہور نام ارا کی تعریب ہے کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔یوسفیورس خود اس عہد کا شخص ہے جب یہ رقیم یا بیڑا آباد تھا۔اس لئے اس سے زیادہ موثق ذریعہ تحقیق اور کیا ہوسکتا ہے؟

ان واقعات کے ذکر سے ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ اس وقت مدین کا تمدن کس حد تک ترقی کر چکا تھا۔اور نیز یہ بھی کہ اس عہد قدیم میں مدین کی شمالی حد کہاں تک وسیع تھی۔بیٹرا یا رقیم ملک شام کے قریب بحر میت اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے۔اس لئے مدین کے حدود شمالی کو یہاں تک وسیع سمجھنا چاہیے۔

اس زمانے کے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد شہر مدین کے چار اور بادشاہ ہونے کا تورات میں ذکر آیا ہے۔زاماج، صلمناع، عوریب اور زیب۔ایک وقت میں چند بادشاہوں کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ ملک متفرق قبائل یا ریاستوں پر منقسم تھا۔

اہل مدین کی اخلاقی اور مذہبی حالت اور بربادی

مدین کے قریب موآب آباد تھا۔مذہب کے اعتبار سے اہل مدین اور اہل موآب دونوں قوموں کی بدترین حالت تھی۔تمدن کے جراثیم جن امراض کو پیدا کرتے ہیں وہ ایک ایک کر کے پیدا ہو چکے تھے۔بتوں کی پرستش اور ان کے لئے قربانی چڑھانا۔ان کا مذہب تھا۔تمام بتوں کا سردار بعل فعور نامی دیوتا تھا۔اخلاقی حالت اس درجہ پست تھی کہ شرفائے خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں، مردوں کا یہ حال تھا کہ ظلم وستمگری ان کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا۔

بنی اسرائیل مصر سے آ کر موآب میں خیمہ زن تھے۔ان بدکاروں نے بنی اسرائیل کے لئے سازشوں کا دام پھیلانا شروع کیا عورتوں نے جوانان بنی اسرائیل کو جو اصل میں اس فوج کے سپاہی تھے اپنے قابو میں کرلیا۔سردار سے باغی بنادیا۔بتوں کے سامنے ان کا سر جھکوایا۔بعل فعور کے لئے ان سے قربانیاں کروائیں۔مردوں نے وہاں کی قوموں سے سازباز کی کہ بنی اسرائیل کونیست و نابود کردیں۔ بنی عمان کے ملک سے بلعام (بلعم باعور) کو بلوایا کہ وہ اسرائیل کے لئے بددعا کرے اس وقت ’’خدا نے موسیٰؑ سے کلام کیا اور فرمایا کہ بنی اسرائیل کے لئے اہل مدین سے انتقام لے اور اس وقت تو اپنی قوم میں مجتمع ہوگا۔‘‘ (سفر العدد 31۔1)

ان حالات کی بنا پر بنی اسرائیل کو پھر اپنے قابو میں لانے کے لئے اور مدین کی گنہگار آبادی کی سزادہی کے ضروری تھا کہ حسب حکم الٰہی مدین اور معاونین مدین سے جہاد کیا جائے۔موآب۔حشبوں اور مدین کی متفقہ قوت کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ نے دو ہزار آدمی بھیجے۔دشمن اپنی کثرت اور سامان کے باوجود کامیاب نہ ہوئے مدین کے پانچ سردار،عوی، رقیم،صور،خور اور ربع مارے گئے۔تمام مرد، بچے اور عورتیں قتل ہوئیں۔لڑکیاں قید ہوئیں اور ان کا سامان غنیمت میں ہاتھ آیا۔

قوم مدین کی اس تباہی کے بعد شہر مدین ہم اسماعیلی عربوں کے ہاتھ میں پاتے ہیں۔اور اب اس کے بعد جن اہل مدین کا تورات میں ذکر ہے وہ یہی اسماعیلی ہیں۔قوم مدین کی تباہی کے تقریباً 150 برس بعد عمالیق اور دیگر عرب قبائل اسماعیلی مدین کی سرکردگی میں بنی اسرائیل پر حملہ آور ہوئے۔ہر سال جب غلہ پکنے کے قریب ہوتا آندھی کی طرح بنی اسرائیل کے ملک میں آتے اور غلہ،گائے بیل اور گدھے جو کچھ پاتے سب لوٹ لیتے فرزندانِ اسماعیل آبادی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں روپوش ہوجاتے۔

آخر جدعون نامی ایک سرداران میں پیدا ہوا جس نے بنی اسرائیل کی قوت کو مجتمع کیا اور صرف تین سو منتخب آدمیوں کو لے کر اس نے اہل مدین پر شبخون مارا۔رات کی تاریکی میں دوست دشمن کی تمیز نہ ہوئی۔ایک لاکھ بیس ہزار اہل مدین خود اپنوں اور دشمنوں کے ہاتھ مارے گئے۔عوریب اور ذیب۔مدین کے دو بادشاہ قید ہوئے۔جن کو نہایت ذلت سے قتل کیا گیا۔اور دو بادشاہ زاباح اور صلمناح پندرہ ہزار آدمیوں کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہوگئے مگر ان کو پناہ نہ مل سکی۔

حوباب یا شعیبؑ

اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے خسر کا نام تورات میں یثرو اور حوباب مذکور ہے۔تورات کے شروع میں عبرانی میں لکھا ہے کہ یثرو کے دس نام تھے۔’’دس نام ہوں یا نہ ہوں۔دو نام تو خود تورات میں ہیں۔ایک جرمن فاضل (HEINRION EWAI) کہتا ہے۔

اصلی نام حوباب تھا اور یثرو ایک اعزازی لقب تھا۔جس کے لغوی معنی کامل‘‘ کے ہیں۔
جس طرح یہودیوں کے ہاں کاہن اور مسلمانوں کے ہاں امام کا لفظ۔تاریخ بنی اسرائیل۔ترجمہ انگریزی ج ا ص 25۔حاشیہ مصنفہ ابواللہ۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

حوباب کا نام قرآن میں اور عموماً مسلمانوں میں شعیبؑ ہے۔یہ نام حوباب کی تصحیف ہے.

حضرت شعیب اور قرآن مجید

مدین اور حضرت شعیبؑ کا باہمی ذکر قرآن مجید کے تین سوروں میں آیا ہے۔ اعراف، ہود اور عنکبوت اور وہ حسب ذیل ہیں۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِىْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِىْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور مدین کے پاس ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ شعیبؑ نے کہا کہ اے بھائیو۔ خدا کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ خدا کی جانب سے گواہی آ چکی۔ پیمانہ اور ترازو پورا کرو اور لوگوں کو ان کا حق کم نہ کرو۔ اور اصلاح کے بعد ملک میں فساد نہ ڈالو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ اور ہر راستہ پر دھمکانے کو نہ بیٹھا کرو اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو مت روکو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھی نہ کرو، یاد کرو، جب تم تھوڑے تھے تو خدا نے تم کو بڑھایا اور بغور دیکھو کہ مفسدین کا انجام کیا ہوا۔ تم میں کچھ لوگ تو

جو پیغام دے کر میں بھیجا گیا ہوں، اس پر ایمان لا چکے ہیں اور بعض نہیں لائے تو اس وقت تک صبر کرو خدا ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

سرداران قوم میں جو مغرور تھے۔ بولے کہ شعیبؑ ہم تجھے اور جو تیرے ساتھ ایمان لائے۔ ان کو اپنی آبادی سے باہر نکال دیں گے۔ یا ہمارے آبائی مذہب کو پھر قبول کرلیں گے شعیبؑ نے کہا۔ کیا ہم نہ چاہیں تب بھی۔ اگر تمہارے مذہب کہ جس سے ہم کو خدا نے نجات دی۔ ہم پھر قبول کرلیں تو ہم خدا پر افترا باندھتے ہیں۔ خدا کی مشیت کے بغیر ہم کو پھر تمہارے مذہب میں جانا سزاوار نہیں۔ ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر شے پر محیط ہے۔ ہم نے اسی پر بھروسہ کیا۔ ہمارا پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے لوگوں کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کردے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

کفر پیشہ سرداروں نے لوگوں سے خطاب کر کے کہا کہ اگر شعیبؑ کی تم نے پیروی کی تو تم گھاٹے میں رہو گے۔ پس کپکپاہٹ نے آ کر ان کو پکڑ لیا۔ پھر تو وہ اپنی پر پڑے کہ پڑے رہ گئے۔ شعیبؑ کے جھٹلانے والے گویا کہ ان گھروں میں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے۔ اور وہی گھاٹے میں رہے۔

شعیبؑ ان کو اسی حال میں چھوڑ کر ہٹا اور بولا اے میرے بھائیو! میں تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا چکا۔ اور اپنی خیر خواہی کا فرض بھی ادا کر چکا۔ اب کیونکر کفر پیشہ قوم کی تباہی کا غم کھاؤں۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ ہود میں ہے:

ترجمہ: مدین کی سمت ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے کہا بھائیو خدا کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ پیمانہ اور ترازو کم نہ کرو میں تم کو بھلائی کے ساتھ دیکھتا ہوں اور ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے تم کو ڈراتا ہوں۔ بھائیو! پیمانہ اور ترازو انصاف کے ساتھ پورا رکھو۔ لوگوں کا حق کم نہ کرو۔ اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھیرو۔ اگر ایمان والے ہو تو خدا نے جو باقی چھوڑا ہے۔ وہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور تم پر کوئی نگراں نہیں مقرر ہوا۔ (سورہ ھود)

اس مصلح اور خیر خواہ قوم کو مغرور اور ناشنوا قوم کے لوگ جواب دیتے ہیں۔

ترجمہ: لوگوں نے جواب دیا۔ شعیبؑ کیا تمہاری یہ نماز تمھیں کہتی ہے کہ ہمارے اسلاف جس کو ہم پوجتے تھے اس کو چھوڑ دیں۔ یا ہم اپنے مال میں جو چاہیں وہ نہ کریں۔ تم بھی بڑے عقلمند اور نیک ہو۔

نبیؑ برحق گمراہانِ قوم کو پھر باتکرار سمجھاتا ہے۔

ترجمہ: شعیبؑ نے کہا کہ بھائیو! اگر میں اپنے پروردگار کی بتائی ہوئی دلیل پر قائم رہوں اور جو کچھ اس نے حلال روزی دے رکھی ہے۔ اس پر قانع رہوں تو تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت

کر کے وہ کروں۔جس سے تمھیں روکتا ہوں میں تو اپنی طاقت بھر تمہاری اصلاح چاہتا ہوں مجھ کو توفیق خدا ہی کے زور سے ہے اسی پر بھروسہ ہے اور اسی کی جانب رجوع ہوتا ہوں۔ بھائیو۔صرف میری دشمنی اس کا باعث نہ ہو کہ جس طرح نوحؑ اور ہودؑ کی قوموں پر عذاب پہنچا۔تم پر بھی پہنچے۔لوطؑ کی قوم تم سے دور نہیں۔اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو۔اس کے سامنے توبہ کرو۔خدا رحمت اور محبت والا ہے۔

کافران قوم اس دلسوزانہ موعظت کا یوں مغرورانہ جواب دیتے ہیں۔

ترجمہ: وہ بولے۔شعیبؑ ہم تمہاری بہت سی باتیں نہیں سمجھتے اور ہم اپنے میں تم کو کمزور پاتے ہیں۔اگر تمہارے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تمھیں سنگسار کر چکے ہوتے اور کچھ تم ہم پر غالب بھی نہیں ہے۔

زبانِ رسالت نہایت متانت سے انکشاف معرفت کرتی ہے۔

ترجمہ: شعیبؑ نے جواب دیا۔ بھائیو! کیا میرا خاندان۔خدا سے زیادہ تمہارے نزدیک لحاظ کے قابل ہے۔جو تم نے اس کو پس پشت ڈال دیا۔میرا پروردگار تمہارے ہر کام سے واقف ہے۔بھائیو۔تم اپنے مقام پر کام کئے جاؤ۔ میں بھی اپنا کام کرتا ہوں۔عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کن عذاب کس پر آئے گا۔اور کون جھوٹا ہے۔انتظار کرو میں بھی منتظر ہوں۔

آخران کا بدکاروں کا نتیجہ یہ ہوا۔

ترجمہ: جب ہمارا حکم آ گیا ہم نے شعیبؑ کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی اور جو ظالم تھے اور ان کو چیخ نے آ گھیرا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے گویا کہ وہ کبھی ان میں رہے نہیں۔ثمود کی طرح ان کے لئے بھی ہلاکت ہوئی۔(ہود)

ترجمہ: مدین کے پاس ہم نے شعیبؑ کو بھیجا۔اس نے کہا کہ بھائیو۔خدا کی عبادت کرو اور روز آخرت کی توقع رکھو۔اور زمین میں فساد کرتے نہ پھیرو۔انہوں نے جھٹلایا تو کپکپاہٹ نے آلیا۔اور وہ اپنے اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔

ان آیتوں میں مدین کے جن حالات کی طرف تلمیح واشارات ہے۔چونکہ مدین کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیش نظر نہ تھی اس لئے ان میں بہت سے عقدے رہ گئے۔سب سے اول یہ کہ وہ اہل مدین و بنی اسرائیل کے باہمی واقعات سے سوائے واقعہ قرابت حضرت موسیٰ و شعیبؑ علیہما السلام سے ناواقف ہیں اس بنا پر ان آیات کی تفسیر میں ان واقعات کا کوئی تعلق وہ ظاہر نہیں کرتے۔حالانکہ ہماری رائے میں یہ آیتیں تمام تر انھیں واقعات سے متعلق ہیں۔پہلی آیت یہ ہے۔ والی مدین اخاھم شعیبا (مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا) اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔اول یہ کہ یہاں مدین سے قوم مدین مراد ہے ثانیاً یہ کہ شعیبؑ مدین

کے خاندان سے تھے۔

مخاطبت شعیبؑ و مدین کا پہلا فقرہ یہ ہے۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ

اے قوم خدا کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔

ترجمہ: ناپ اور تول پوری پوری رکھو۔ اور لوگوں کو ان کی چیز کم نہ دو (اعراف)

ترجمہ: پیمانہ اور ترازو کم نہ کرو۔ میں تمھیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ گھیر لینے والے دن کا عذاب تم پر نہ آئے۔ لوگو! پیمانہ اور ترازو انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ (سورہ ہود)

آغازِ فصل میں معلوم ہو چکا ہے کہ مدین ایک تاجر قوم تھی۔ اور غالباً دنیا کی تاریخ میں اس پیشہ کی سب سے پہلی قوم ظاہر ہوتی ہے اس بنا پر اس میں یہ مذموم صفت ہوگی، جو حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔ بنی اسرائیل جب مصر سے حدودِ عرب میں آئے تو ان کے پاس رسد کا سامان نہ تھا۔ قرب و جوار کی قوموں سے باقیمت خریدتے تھے۔ یا زبردستی چھین لیتے تھے۔ شاید مدین کے اس وصف تجارت کا بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے بھی تعلق ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے مراد صرف خرید و فروخت کی کمی و بیشی بلکہ سود۔ بٹہ اور دیگر اصناف تجارت ممنوعہ مراد ہیں۔ جن کے ذریعہ سے تاجر لوگوں کو ان کے حق جائز سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں اسی بنا پر حضرت شعیبؑ کی قوم کا جواب یہ ہے۔

اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ھود)

کیا اس سے بھی کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں کریں تمھاری نماز روکتی ہے۔

اس رائے کی تاکید و تائید مفسرین کی بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ شعیبؑ نے ان کو درہم و دینار میں بٹہ لینے سے منع کیا تھا اور کہا کہ یہ حرام ہے انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے موافق کام نہ کریں۔ (تفسیر معالم التنزیل بغوی۔ ہود)

محدث طبری (ابن جریر) تاریخ میں لکھتے ہیں:

عن زید بن اسلم فی قوله عزوجل اصلواتك تأمرك ان نترك ما يعبد آباؤنا او ان تفعل فی اموالنا ما نشاء قال كان عما ينهاهم عنه حذف الدراهم او قال قطع الدراهم

زید ابن اسلم سے اس آیۃ اصلوا تا الیٰ آخر کے ذیل میں مروی ہے کہ شعیبؑ ان کو بٹہ سے منع کرتے تھے۔

عن محمد بن کعب القرظی قال بمعنی ان قوم شعیب عذابوا فی قطع الدارھم ثم وجدت ذلك فی القرآن اصلاتك تامرك ما یعبد ابائنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء

محمدؐ ابن کعب القرظی سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ قوم شعیبؑ کو بٹہ لینے کے باعث عذاب دیا گیا۔ یہ پھر مجھے قرآن مجید میں یہ آیت ملی۔

(تاریخ طبری جلداول ص ۳۷۰۔ یورپ)

اس کے بعد ارشاد باری ہے۔

ترجمہ: اصلاح کے بعد ملک میں فتنہ نہ برپا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر ایمان دار ہو۔ (اعراف)

ملک میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ۔ (ھود)

عموماً مفسرین حتیٰ کہ امام رازی بھی ''فتنہ وفساد سے'' ''کفر'' اوراصلاح'' سے بعثت شعیبؑ مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ اس سے مقصود بعد صلح وامان بنی اسرائیل کے ساتھ مخالفت ومنازعت اور سازش وخونریزی ہے۔ اس لئے اس کے بعد یہ الفاظ ہیں۔

ترجمہ: ملک میں فتنہ وفساد نہ پھیلاؤ۔ خدا نے جو باقی رکھا ہے۔ وہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ اگر تم ایماندار ہو۔ (ھود)

بقیہ کا مطلب ہمارے مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حرام کے بعد جو حلال چیزیں باقی رہ گئی ہیں۔ وہی تمہارے لئے کافی ہیں حرام کی کیوں طلب کرتے ہو۔ لیکن اس حالت میں اول آیت کو آخر آیت سے کیا تعلق رہے گا۔ ملک میں فساد نہ کرو کہ باقی حلال چیزیں کافی ہیں۔ ملک میں فساد اور حلال چیزوں پر قناعت۔ دونوں بے ربط باتیں ہوجاتی ہیں۔

ہمارے نزدیک مدین کی تاریخ کو پیش نظر رکھنے سے مطلب نہایت واضح ہوجاتا ہے۔ اہلِ مدین چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر جو ملک کا حصہ لے لیا ہے واپس لے لیں۔ حضرت شعیبؑ فرماتے ہیں کہ فتنہ وفساد سے فائدہ نہیں۔ خدا نے جو کچھ باقی رکھا ہے اسی پر قناعت کرو۔ اہل مدین اس کے جواب میں کہتے ہیں۔

ترجمہ: کیا اے شعیبؑ تمہاری یہ نماز کہتی ہے کہ اسلاف کے طریقہ پرستش کو ہم چھوڑ دیں۔ یا ہم اپنے مال میں جو چاہیں وہ کرنا چھوڑ دیں۔ تم بھی بڑے عقلمند (یا بردبار) اور نیک ہو۔ (ھود)

اس جنگ کی صرف دو اغراض تھیں ایک یہ کہ اپنے دیوتا بعل فور کی اہانت کا انتقام لینا تھا۔ اسرائیل کے خدا کا مقابلہ کرنا اور دوسرے یہ کہ جن طریقہ ممنوعہ کے ذریعہ سے بھی ہو۔ بنی اسرائیل سے ملک ودولت کی واپسی کر لی جائے۔ اہل مدین کہتے ہیں کہ کیا ہم ان دونوں چیزوں سے باز آجائیں۔ اور طعناً کہتے ہیں کہ تم بھی بڑے نیک اور عقلمند ہو یا یہ کہ بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ملک وقوم کی مذہبی ومالی بربادی

پر تمھیں غصہ اور ملال نہیں آتا۔تم حقیقت میں بڑے بردبار اور نیک آدمی ہو۔حضرت شعیبؑ جواب میں فرماتے ہیں۔

ترجمہ: بھائیو! بتاؤ تو اگر میں اپنے رب کی دی ہوئی رشنی پر رہوں اور جو حلال روزی اس نے دے رکھی ہے اسی پر قانع رہوں۔میں نہیں چاہتا کہ تم سے مخالفت کر کے میں وہ کروں جس سے تم کو روکتا ہوں۔میں تو تا حدِ امکان صرف اصلاح چاہتا ہوں اور اس کی توفیق خدا کا وسیلہ ہے۔

اصلاح سے مقصود اصلاح روحانی بھی ہو۔لیکن مدین و بنی اسرائیل کے مابین اصلاح کی کوشش کی طرف زیادہ مناسبت ہے۔

لیکن اس ارشاد و ہدایت کے باوجود مفسدین اپنے فساد و تباہ کاری سے باز نہ آئے۔حضرت موسیٰؑ کے حکم کے مطابق قوم مدین کے تمام مرد بچے اور منکوحہ عورتیں قتل کی گئیں اور ۳۲ ہزار کنواری لڑکیاں لونڈی بنائی گئیں۔(سفر اعداد 15221-16-17-35-40-46)

قوم مدین کی زندگی کی یہ آخری تاریخ تھی۔

اس واقعہ میں قرآن اور تورات کی مطابقت

سابق صفحات پر موجود آیات سے واضح ہوتا کہ حضرت شعیبؑ اور ان کا خاندان اہل مدین سے جدا ہو گیا۔انہوں نے نجات پائی۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کی پہلی جنگ کے بعد جب کنعان کی طرف کوچ کا ارادہ کیا تو حضرت شعیبؑ کے ساتھ اس موقع کی گفتگو ہے۔

> موسیٰ نے حوباب بن راعویل مدیانی اپنے خسر سے کہا کہ ہم یہاں سے اس مقام کو کوچ کرنے والے ہیں۔ہمارے ساتھ آ ؤ کہ ہم تمہارے ساتھ بھلائی کریں۔کیونکہ خداوند نے اسرائیل سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔حوباب نے جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا بلکہ اپنے ملک و مولد کو واپس جاؤں گا۔موسیٰؑ نے کہا کہ ہم کو نہ چھوڑ جاؤ۔تم سے التجا کرتا ہوں کیونکہ جیسا تم جانتے ہو کس ویرانہ میں ہم خیمہ زن ہیں۔تم ہمارے لئے بجائے آنکھ کے ہو۔(اعداد 10-30)

دوسری جگہ ہے۔

> موسیٰؑ کے سسر قین کے بیٹے بنی یہودا کے ساتھ قریہ نخل سے چلے اور یہودا کے ساتھ جو تیمن کا تھا اس کے حصہ کے ساتھ میدان میں سکونت کی۔(قضاۃ 1-61)

مدین کی جنگ سے ایک باب پہلے مذکور ہے۔

> جابر قینی اپنے دوسرے قینی بھائیوں کے ساتھ جو موسیٰؑ کے سسر حوباب کے بیٹے تھے۔پہلے علیحدہ ہو گیا تھا۔اس نے اپنا خیمہ اس وادی میں کھڑا کیا جس کا نام ضعنیم ہے۔قادس کے پاس (قضاۃ 4-11)

تالمود بابل میں ہے۔

یثرو (شعیبؑ) نے اس کی مخالفت کی اور جب اس کی نصیحت رد کر دی گئی تو اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور چل دیا۔ اس لئے اس کی اولاد سنہڈرم کی رکن مقرر ہوئی۔

یوسیفوس یہودی جس نے پہلی صدی عیسوی میں تاریخ یہود لکھی ہے۔ لکھتا ہے۔

انہوں نے موسیٰؑ کے خسر یثرو مدیانی کے خاندان کو بھی زمین دی۔ جس نے اپنا ملک چھوڑ دیا تھا اور صحرا میں ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ (قدامت الیہود کتاب 5 باب 2)

قوم مدین کی تباہی عام جس کی قرآن نے خبر دی ہے تورات سے اس کا ثبوت متعدد طور پر بہم پہنچ سکتا ہے اولاً یہ کہ قوم مدین کی تباہی کے موقع پر تورات میں حسب ذیل الفاظ ہیں۔

بنی اسرائیل نے مدین سے جنگ کی اور ان پر غالب آئے اور تمام مردوں کو، بچوں کو اور عورتوں کو قتل کیا۔ (اعداد 31-7-18)

ثانیاً یہ کہ اس کے بعد مدین کی تباہی عبرانی صحیفوں میں ہمیشہ ضرب المثل رہی ہے: زبور داوٗدؑ میں ہے۔

باشندگان (شہر) اسماعیلی، اہل مواب، ہاجری، عمون اور عمالیق .... خدایا ان کو (قوم) مدین کی طرح کردے۔ (زبور۔83۔6)۔ اشعیاہ نبیؑ کہتے ہیں:

شہر مدین کی پچھلی تاریخ

لیکن بااین ہمہ شہر مدین کا وجود باقی تھا۔ جس کا نشانِ تاریخی زمانہ اسلام تک ملتا ہے حضرت داوٗدؑ جن کا زمانہ تقریباً 2000 ق م ہے۔ زبور 83۔6 میں باشندگان مدین کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ایک ادومی شہزادہ ہداد بھاگ کر مدین سے آیا تھا (سلاطین اول 1-81) شعیاہ نبیؑ جو تقریباً 8000 ق م میں تھے۔ مدین کی اونٹنیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو یروشلم میں تجارت کا مال لائیں گی (60-6) حبقوق نبیؑ ایک پرجلال پیغمبرؐ کی آمد آمد کی خبر سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمین مدین کی کھال میں رعشہ پڑ جائے گا۔ (3-7) یونانی اور رومی مصنفین نے مدین کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس مقام کا نام وہ نباطیا (NABATIA) بتاتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ اس عہد میں اس ملک میں نبط آباد تھے (FORESERS GEOG P 323) اور یہ امر بالکل ہماری تھیوری (تجویز) کے مطابق ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی ایک اولاد کا نام نبط تھا۔ اور تورات کے حوالہ سے ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قوم مدین کی تباہی کے بعد اسماعیلی عرب مدین کے مالک تھے۔ بطلیموس نے البتہ عرب کے ایک مقام کا نام موڈیانہ (MODAYANA) لکھا ہے۔ جسے بعض لوگ مدین سمجھتے ہیں۔ (BORTONS GOLD MINES 179)

مسلمان جغرافیہ نویسوں نے عموماً مدین کا ذکر کیا ہے۔ ابوالفدا نے جغرافیہ میں لکھا ہے کہ یہاں قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔ حاجی خلیفہ نے اپنے ترکی جغرافیہ۔ جہاں نما میں بیان کیا ہے کہ یہاں جو آثار و عمارات ہیں ان پر کتبات ہیں۔ جن پر بادشاہوں کے نام مرقوم ہیں۔

مکتشفین یورپ میں سے متعدد اشخاص نے خاص مدین کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے جن میں ایک شخص (BURTON) برٹن خاص طور پر قابل ذکر ہے جس نے ایک بار مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ تک سفر کیا اور دوسری بار خدیو مصر اسماعیل پاشا کے حکم سے 1887ء میں سونے کی کان کی تلاش میں مدین تک گیا۔ یہاں بہت سے کتبات بھی ملے۔ جن پر نبطی خط منقوش ہے۔ رومیوں کے عہد میں یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ مسلمان شعراء کے اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کثیر کہتا ہے۔

رھبان مدین والذین عھدتم یبکون من حذرا العذاب قعودا

رھبان مدین لورائوک تنزلوا والعصم فی شعف الجبال لقادر

''ودان'' یا ''اصحاب الایکہ''

قرآن مجید میں عرب کی ایک قوم کا اصحاب الایکہ کے نام سے ذکر ہے۔ ایکہ کے معنی جنگل کے ہیں۔ اس قوم کے پیغمبر بھی حضرت شعیبؑ ہی تھے۔ جن کا ذکر مدین میں گذر چکا ہے۔ اس اتحاد سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی چیز ہیں۔ ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس جنگل تھا۔ جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی اس لئے ان کو اصحاب الایکہ یعنی جنگل والوں کے نام سے خطاب کیا گیا (معالم التنزیل بغوی سورۂ حجر۔ شعراء ق۔ ص)

مسلمان جغرافیہ نویس ان اطراف میں کسی جنگل کے ذکر سے خاموش ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ شہر تبوک جو مدین کے مقابل مدین سے 6 مرحلہ پر واقع ہے اسی کا نام ایکہ تھا اور خود اہل تبوک کو بھی اعتراف ہے کہ اس کا پہلا نام ہے۔ (معجم البلدان۔ ایکہ)

قرآن کی رو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیبؑ سے سوال و جواب، طرز خطاب اور پھر آخرأبربادی اور طریقہ بربادی بالکل مختلف ہے۔ اس بنا پر کون دعویٰ کرسکتا ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ سب سے بڑی اشتباہ کی صورت یہ ہے کہ عام معلومات کے لحاظ سے ان اطراف میں جنگل کا نشان نہیں۔ ورنہ اہل تفسیر و روایت و اہل جغرافیہ اس کا ذکر کرتے۔ اس دشوار گذار راہ کے طے کرنے ایکہ کے یہ طریقے ہیں۔

اتنا تو ظاہر ہے کہ مدین اور ایکہ میں کوئی شدید تعلق تھا۔ اور ان کا زمانہ بھی باہم ایک تھا۔ جس کی بنا پر دونوں آبادیوں کے لئے ایک ہی پیغمبر کی بعثت ہوئی۔ نیز قرآن نے دونوں کے اخلاق کا نقشہ بھی ایک ہی کھینچا ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مدین جو حضرت ابراہیم کی بی بی قطورہ کے بطن سے تھا۔ اس کے کئی بھائی اور بھی تھے۔ اور ان بھائیوں کی اولادیں تھیں۔ توراۃ میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

> ابراہیمؑ نے قطورہ نام ایک دوسری بیوی کی۔ جو ززمران۔ یقشان۔ مدان۔ مدیان۔
> یشبوق اور شوح کو جنی۔ یقشان نے شبا اور ودان کو پیدا کیا اور بنو ددان۔ اشوریم۔ لطوشیم
> اور لادیم؛ تھے۔ مدیان کے بیٹے عافا۔ عوفیر۔ حنوخ۔ ابی داع اور دعا تھے۔ یہی لوگ
> بنی قطورہ ہیں۔ ابراہیمؑ نے جو کچھ تھا وہ اسحاق کو دیا۔ اور ان کنیز زادوں کو بھی کچھ دیا اور

ان کو اپنے بیٹے اسحاق سے الگ کر دیا۔ اور ابراہیمؑ اس وقت پورب کی طرف پورب کے ملک میں تھا۔ (یعنی عرب) سفرِ خروج باب ۲۵)

تورات نے قطورا کی متعدد اولاد در اولاد میں سے صرف دو کی تفصیل کی ہے۔ بنو مدین اور بنو دوان۔ بنو مدین کے متعلق بہ تحقیق معلوم ہے کہ بحر احمر پر خلیج عقبہ کے سامنے شہر مدین میں آباد تھے۔ اس لئے تسلیم کرنا چاہیے کہ بنو دوان بھی انھی سواحل پر مدین کے قریب آباد ہوں گے۔ تورات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ انہیں اطراف میں آباد تھے۔ تیما۔ دوان۔ بوض۔ جو سر کے بال منڈاتے ہیں۔ اور تمام عرب کے بادشاہ۔ (ارسیاہ۔25۔23)

تیما شمالی عرب میں حجاز سے شام کے راستہ پر واقع ہے۔ اسی کے قریب دوان کو ہونا چاہیے۔ یمن سے سواحل بحر احمر کے کنارہ کنارہ حجاز و مدین سے گذر کر خلیج عقبہ کے کنارہ تیاء وغیرہ کو قطع کرتی ہوئی۔ ایک نہایت قدیم و مشہور تجارتی سڑک واقع ہے جو قدیم زمانہ میں ہندوستان میں اور مصر و شام کے کاروانوں کا تنہا راستہ تھا اس راستہ کا ذکر تمام قدیم جغرافیوں میں موجود ہے۔ وادی القریٰ ثمود کا مسکن۔ مدین قوم شعیبؑ کی آبادی سدوم قوم لوط کا مقام اور نیز تبوک تیما اور رقیم (یونانی بیڑا) اسی سڑک پر مابین حجاز و شام واقع ہے۔ تورات کے اعتبار سے دوان بھی یہیں تھا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ اصحاب الا یکہ بھی اسی سڑک پر ہیں۔ قوم لوط جو سدوم میں آباد تھی اور اسی کے ذکر کے بعد ارشاد ہے۔

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾

اور جنگل والے یقینا حد سے گذر جانے والے تھے۔ ہم نے ان سے انتقام لیا اور یہ (سدوم وا یکہ والے) دونوں کھلے راستے پر ہیں۔

یہ وہی راستہ ہے جس کا ذکر ہم نے کیا۔ اور جس کو تاریخ قدیم میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ اس بیان سے قرآن مجید اور تورات مقدس دونوں کی رو سے دوان یا اصحاب الا یکہ کا مسکن متعین ہو گیا۔

اصحاب الا یکہ جنگل والے تھے

قرآن نے ان کو اصحاب الا یکہ جنگل والے کیوں کہا۔ کیا ان کا وطن جنگل میں تھا؟ ہاں جنگل میں تھا۔ اور آٹھ سو برس کے بعد بھی جنگل میں تھا۔ اشعیاہ نبیؑ بنوخذ نصر (بخت نصر) کے خروج سے تمام اقوام کو متنبہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عرب کی طرف خطاب ہے۔

عرب پر باد (مصیبت) ہے۔ جبکہ جنگل میں دوان والوں کی راہ میں تم شام بسر کرو۔
اے تیمن کے باشندوں! پانی لے کر پیاسوں سے ملو۔ اور کھانا لے کر بھوکوں سے ملو
(13۔21)

مسیحؑ سے سو برس اور اسلام سے سات سو برس پہلے بھی یہاں جنگل موجود تھا۔ ایک یونانی جغرافیہ نویس مدین اور خلیج عقبہ کے آس

پاس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اس جگہ سے متصل وہ جگہ ہے جس کو لوگ نسّا کہتے ہیں یا نافتہ البحر۔ کہ یہ جانور وہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ نسا قریب ایک راس (راس محمدؐ۔ خلیج عقبہ) کے واقع ہے۔ جو بغایت پراز اشجار ہے۔ یہیں سے ایک سیدھی سڑک (شاید شمال کو) اس شہر کو جاتی ہے۔ جس کا نام بیڑا (رقیم) ہے۔ اور فلسطین کو جاتی (شام) سے جہاں اہل قریہ (یمامہ و بحرین) معین اور تمام عرب قریب میں رہتے ہیں اور بالائی ملک سے بخورات اور کہا گیا ہے کہ خوشبودار چیزوں کے بندل لاتے ہیں۔ برٹن گولڈ مائینس آف مدین ص179-180

اٹھاسی باب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:

خلیج عیلانہ (عقبہ) کے پیچھے چاروں طرف نبطی عرب رہتے ہیں۔ (ارض مدین یہ ہے) بوتھیما نوس (بنوتیمن) کا ملک ہے۔ جو وسیع اور مسطح ہے اور سیراب اور عمیق ہے۔ وہاں نباتات و اشجار کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ جو تابقدِ آدم ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے جنگلی اونٹ۔ ہرنوں کے گلے۔ بارہ سنگھے رہتے ہیں اور نیز مویشی اور بھیڑ کے گلے۔ لیکن ان مواہب قسمت کے ساتھ شیر اور بھیڑیوں کا وجود بھی ہے۔ جن سے یہاں کے باشندوں کی خوش قسمتی بد قسمتی میں بدل گئی ہے۔

جس تیمن کا اس جنگل کے پاس ذکر ہے بعینہ اسی کا جغرافیہ یونانی میں بھی ہے۔ اس سے بڑھ کر توثیق یہ ہے کہ اصحاب الایکہ (جنگل والوں) کے ملک کا ایک مشہور واضح شاہراہ (امام مبین) پر ہونا قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔ بعینہ یہی بیان ایک جغرافیہ میں بھی ہے۔

اس جگہ سے متصل وہ جگہ ہے۔ جس کو لوگ نسّا کہتے ہیں .... یہ ایک راس کے قریب ہے۔ جو نہایت پراز اشجار ہے۔ یہیں سے ایک سیدھی سڑک رقیم اور فلسطین کو جاتی ہے۔

یہ جغرافیہ نزول قرآن سے سات سو برس پہلے لکھا گیا ہے۔ کیا اس سے بھی زیادہ قرآن کی صداقت کی کوئی دلیل مطلوب ہے۔ قرآن مجید میں اصحاب الایکہ کا ذکر چار سوروں میں ہے۔ حجر۔ شعراء۔ ص۔ ق سب سے مفصل ذکر شعراء میں ہے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْــَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَاۤ اَسْــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۸۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ (شعراء)

جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ جبکہ ان سے شعیب نے کہا کہ کیا تم نہیں ڈرتے؟ میں تمہارا پیغمبر امین ہوں۔ خدا سے ڈرو اور میری بات مانو اور میں تم سے اس کی اجرت نہیں مانگتا۔ میری اجرت صرف خدائے پروردگار عالم پر ہے ناپ اور تول پوری کرو۔ اور ٹوٹا دینے والوں مین سے نہ ہو۔ اور ٹھیک ترازو سے تولو لوگوں کے حق کو کم نہ کیا کرو۔ اور نہ زمین (ملک) میں فساد پیدا کرو اور اس سے ڈرو جس نے اور پہلی قوموں کو پیدا کیا۔ انھوں نے (اصحاب الایکہ) نے کہا کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو۔ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر سچے ہو تو آسمان سے ہم پر بادل کا ایک ٹکڑا تو گرادو۔ شعیبؑ نے کہا کہ میرا پروردگار تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے لوگوں نے اس کو جھٹلایا۔ پس سایہ کے دن عذاب نے ان کو آ لیا۔ بے شک وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا۔ اس میں عبرت کی نشانی ہے۔ ان لوگوں میں سے اکثر مومن نہ تھے۔ (شعراء)

ودان بھی مدین کی طرح ایک تاجر قوم تھی۔ خرقیال نبیؑ یروشلم کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔ صحیفہ خرقیال (27-20-21)

ودان تیرے تاجر ہیں۔ بیٹھنے کے فرش لاتے ہیں۔ اور عرب اور تمام رؤسائے قیداء تیرے تاجر ہیں۔ بھیڑ۔ بکری......

مدین کے موقع پر خدا نے فرمایا و الی مدین اخاهم شعیبا (ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا) اور یہاں فرمایا اذ قال لهم شعیب (ان سے شعیبؑ نے کہا) اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت شعیبؑ مدین کے خاندان سے تھے۔ دوسرے بھائی ودان کے خاندان سے نہ تھے۔ ہمارے لائق محقق صاحب ارض القرآن نے ودان (اصحاب الایکہ) کے متعلق وہ تمام باتیں ثبوت تحقیق تک پہنچا دیں جو قرآن مجید میں ان کی نسبت مرقوم ہیں۔ مگر آغاز واقعہ میں جو آیت سر عبارت ہے اسی کی کوئی تشریح نہیں فرمائی۔ کذب اصحاب الایکۃ المرسلین (جنگل والوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی) ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شعیبؑ سے پہلے بھی چند انبیاء و مرسلینؑ نے اس قوم پر تبلیغ رسالت کی تھی۔ مگر یہ شنوانہ ہوئے۔ بخلاف مدین کے کہ ان کی نسبت تکذیب انبیاء کی تصریح نہیں فرمائی گئی ہے۔ اس بنا پر مدین سے ودان زیادہ گنہگار قوم ثابت ہوتی ہے۔

بنوسارہ یا بنوادوم

ادوم جس قطعہ ملک میں آباد ہوئے تھے۔ یونانی اب تک اس کو ایدومیا(ADOMIA) کہتے ہیں۔ بحرمیت (بحر ملح) اور خلیج عقبہ (عیلانہ) کے بیچ میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحرمیت اور فلسطین جنوب میں۔ شمالی خلیج عقبہ و مدین۔ مغرب جزیرہ نمائے سینا۔ مشرق میں ارض مواب۔ اور جوف عرب شمال ہے۔ ملک میں کوہ سعیر یا کوہ سراۃ طولاً شمال سے جنوب تک وسیع ہے۔ اسی لئے تورات میں ادوم کا مقام سعیر بتلایا گیا ہے۔

بنوادوم یا بنوعیسو

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ حضرت یعقوب اور ادوم یا عیسو دونوں سگے بھائی تھے۔ حضرت اسحٰق کے بیٹے ربقہ کے بطن سے۔ یہ دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ عیسو یعقوب سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے یہی اولاد اکبر قرار دئے گئے۔ ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے ہم پہلے حاشیہ میں لکھ چکے ہیں۔ اور مناسبت مقام کے اعتبار سے بار دیگر حسب ضرورت تورات کی عبارت سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

> اور جب اُس کے (ربقہ) جنّے کے دن پورے ہوئے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں توام ہیں اور پہلا لال رنگ گویا بالکل پشم کا لباس ہونکلا اور انھوں نے اس کا نام عیسو رکھا اس کے بعد اس کا بھائی نکلا اور اس کا ہاتھ عیسو کی ایڑی سے لگا ہوا تھا۔ اور اس کا نام یعقوب رکھا گیا۔ جب ربقہ سے یہ پیدا ہوئے تو اس وقت اسحاق ساٹھ برس کا تھا۔ یہ لڑکے بڑھے۔ اور عیسو شکار میں ماہر اور جنگل کا رہنے والا تھا اور یعقوب نیک مرد خیموں کا رہنے والا تھا۔ اور اسحاق عیسو کو پیار کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اسے شکار کا گوشت کھلاتا تھا۔ اور ربقہ یعقوب کو چاہتی تھی۔ (تکوین باب25 آیت24-28)

پھر باب26 آیت34و35 میں لکھا ہے۔

> عیسو نے چالیس برس کے سن میں۔ بیری حتی کی بیٹی یہودس اور یلون حتی کی بیٹی بشامس سے بیاہ کیا اور وہ اسحاق اور ربقہ کے لئے جان کی تلخی کے باعث ہوئیں۔

متذکرہ بالا والدین کی ناراضی اس پر یعقوب اور ربقہ کی خلاف تدبیریں ادوم یا عیسو کے ترک وطن کے باعث ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ تورات۔ تکوین باب28۔ آیت5 تا9 میں مرقوم ہے۔

> پس جب عیسو نے دیکھا کہ اسحاق نے یعقوب کو برکت دی اور اسے وفدان ارم میں بھیجا تا کہ وہاں سے اپنے لئے جورو کرلائے اور کہ اس نے اسے برکت دیتے ہی تاکید کردی

تھی کہ تم کنعانیوں کی بیٹیوں میں سے جورومت کیجیو۔ اور کہ یعقوب اپنے باپ کی فرماں برداری کر کے وفدان ارم کو چلا گیا اور عیسو نے یہ بھی دیکھا کہ کنعاں کی لڑکیاں میرے باپ اسحاق کی نظر میں منظور نہیں۔ تب عیسو اسماعیل کے پاس گیا اور محلات کو جو اسماعیل ابن ابراہیم کی بیٹی اور نبیست (نبط) کی بہن تھی لی اور اسے اپنی اور بیبیوں میں شامل کیا۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسو نے غیر قبیلہ میں اپنی شادی کر لینے کی غلطی کو۔ جو ان مفاسد کا اصلی باعث ہوئی تھی۔ اب قطعی طور سے سمجھ لیا اور حضرت اسماعیلؑ کی صاحبزادی سے شادی کر کے اس کی تلافی کر لی۔ مگر جیسا کہ توریت باب 27 آیت 41-46 میں مرقوم ہے۔ عیسو نے اپنی ماں ربقہ اور بھائی یعقوب سے سوء مزاجی واقع ہو جانے کے سبب کنعان میں رہنا پسند نہیں کیا۔ اس لئے حضرت اسماعیلؑ کے مقام سکونت کے قریب۔ جیسا کہ تورات اور تمام تاریخوں سے ظاہر ہے کہ وہ سعیر یا سراۃ میں اپنے بال بچوں سمیت قیام کیا۔

بیس برسوں کے بعد بھائی بھائی ملتے ہیں

عیسو یہاں رہ گئے۔ ربقہ نے عیسو کی مخالفت سے ڈر کر اور نیز اس خیال سے کہ شاید یعقوب بھی کسی کنعانی عورت سے بیاہ کر لے اور وہ عورت بھی غیر قبیلہ اور جنس دیگر ہونے کے باعث میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہو۔ یعقوب کو یہ صلاح دی کہ تو اپنے ماموں لابن کے پاس فدان ارم میں چلا جا اور وہیں اس وقت تک مقیم رہ جب تک عیسو کا غم وغصہ کم ہو جائے اور اسی درمیان میں تو اپنے ماموں لابن کی بیٹیوں میں سے کسی کے ساتھ بیاہ کر لے۔ ربقہ نے اسحاق سے یہ صلاح کہہ دی اور اس سے بھی یعقوب کو اجازت دلوادی۔ یعقوب اپنی ماں کی صلاح کے مطابق ماموں کے پاس چلے گئے۔ اور بیس برس تک انھیں کے ساتھ اور ان کی لڑکی سے شادی کر لی۔ بیس برس کے بعد خدا نے یعقوب کو پھر کنعان واپس آنے کا حکم فرمایا۔ اس نے وہاں سے چلتے وقت سوچا کہ راستہ میں کوہ سعیر پڑتا ہے اور وہ بھائی کا مسکن ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہم سے ناراض ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ سابق مخالفت کا مجھ سے معاوضہ لیں۔ اور میرے تمام قافلہ اور مال ومتاع کو لوٹ لیں۔ یہ سوچ کر یعقوب نے راستہ سے کچھ قاصد بطور سفارت بھائی کا استمزاج لینے کے لئے ان کی خدمت میں بھیجے۔ اب یہ پورا واقعہ تورات کی اصلی عبارت میں حسب مفصلہ ذیل ملاحظہ ہو۔

اور یعقوب نے کہا کہ اے میرے باپ ابراہیمؑ کے خدا اور میرے باپ اسحاق کے خدا۔ اے خداوند۔ تو نے مجھے فرمایا کہ تو اپنی سرزمین اور اپنی زاد بوم میں پھر جا۔ اور میں تیرا بھلا کروں گا۔ اور میں تو ان سب ہمتوں اور اس ساری وفاداری کے ساتھ جو تو نے اپنے بندے سے کی ہے۔ کسی کے لایق نہیں کہ میں اپنی لاٹھی لئے۔ اس پروں (جماعت) کے پار گیا۔ اور اب دوغول بنا ہوں۔ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے میرے بھائی عیسو کے ہاتھ سے بچالے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آ گے

مجھے اور میرے لڑکوں کو ان کی ماؤں کے سمیت ہلاک کرے۔ تو نے تو کہا کہ میں تجھ سے اچھا سلوک کروں گا اور تیری نسل کو دریا کی ریت کے مانند کروں گا۔ جو کثرت سے ہرگز گننے کے قابل نہیں ہے۔ تکوین باب 36 از آیت 9۔12

اور وہ اس رات وہیں رہا۔ اور جو اس کے ہاتھ لگا۔ اپنے بھائی عیسو کے ہدیہ کے واسطے لیا۔ دو سو بکریاں بیس بکرے۔ دو سو بھیڑیاں بیس مینڈھے۔ اور تیس اونٹنیاں دودھ والی بچوں سمیت۔ چالیس گائیں۔ دس بیل۔ بیس گدھیاں اور دس گدھے۔ اور اس نے انھیں اپنے نوکروں کے ہاتھ میں ہر غول کو جدا جدا سونپا۔ اور اپنے نوکروں سے کہا کہ میرے آگے (پہاڑ سے) پار اترو اور غول کو غول سے جدا رکھو۔ اور پہلے سے اس نے یوں کہا کہ جب میرا بھائی عیسو تجھ سے ملے اور تجھ سے پوچھے کہ تو کس کا ہے اور کہاں جاتا ہے اور یہ جو تیرے آگے ہیں کس کے ہیں۔ کہہ دینا، تیرے نوکر یعقوب کے ہیں۔ اس نے یہ اپنے خداوند یعقوب کے لئے ہدیہ بھیجا ہے۔ اور دیکھو وہ آپ بھی ہمارے پیچھے ہے۔ اور اس نے دوسرے اور تیسرے کو اور ان سب کو جو غول کے پیچھے ہو جاتے تھے۔ یہ کہہ کر حکم کیا کہ جب تم عیسو کو پاؤ اسی طور سے کہیو۔ اور علاوہ اس کے یہ کہیو کہ دیکھ تیرا جاکر یعقوب ہمارے پیچھے آتا ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس ہدیہ سے جو آگے جاتا ہے اس سے صلح کروں گا۔ تب میں اس کا منہ دیکھوں گا۔ شاید کہ وہ مجھے قبول کرے چنانچہ وہ ہدیئے اس کے آگے پار ہو گئے۔ پر وہ آپ اس رات لشکر میں رہا۔ اور وہ اسی رات کو اٹھا اور اپنی دو جوروں اور دو سہیلیوں اور گیارہ بیٹیوں کو لیکے یبوق کے گھاٹ سے پار اترا۔ اور ان کو لیکے سر پار کرایا۔ اور اپنا سب کچھ پار بھیجا۔ (از آیت 13 تا 19)

یعقوب نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے کہ عیسو اور اس کے ساتھ چار سو آدمی آتے ہیں۔ تب اس نے لیاہ اور راعل کو اور دو سہیلیوں کو اور ان کے لڑکوں کو سب سے آگے رکھا اور لیاہ اور اس کے لڑکوں کو پیچھے۔ اور راعل اور اس کے بیٹے یوسف کو سب سے پیچھے۔ اور وہ آپ ان کے آگے چلا اور اپنے بھائی کے پاس پہنچتے پہنچتے سات بار زمین پر جھکا اور عیسو اس کے ملنے کو دوڑا اور اسے گلے لگایا۔ اور اس کی گردن سے لپٹا اور اس کو چوما۔ اور وہ دونوں روئے پھر اس نے (عیسو نے) آنکھیں اٹھائیں اور عورتوں اور لڑکوں کو دیکھا اور کہا کہ یہ تیرے ساتھ کون ہیں وہ (یعقوب) بولا لڑکے جو خدا نے

اپنی عنایت سے تیرے نوکر کر دیئے ہیں۔ تب سہیلیاں اور ان کے لڑکے نزدیک آئے اور اپنے کو جھکایا۔ پھر لیاہ اپنے لڑکوں سمیت سامنے آئی اور جھکی۔ آخر کو یوسفؑ اور راعل سامنے آئے اور انہوں نے آپ کو جھکایا اور اس نے کہا کہ اس بڑے غول سے جو تجھے ملا تیرا کیا ارادہ ہے۔ وہ بولا کہ اپنے خداوند کی نظر سے مورد لطف ہونا۔ تب عیسو بولا میرے پاس بہت ہے۔ بھائی میرے۔ جو تیرا ہے اپنے ہی لئے رکھیں۔ یعقوب نے کہا سو نہیں۔ اگر میں تیری نظر میں منظور ہوں۔ تو میرا ہدیہ میرے ہاتھ سے قبول فرمایئے۔ کیونکہ میں نے تو تیرا منہ دیکھا جیسا کہ خدا کا منہ دیکھتے ہیں۔ اور تو مجھ سے راضی ہوا۔ میری برکت کو جو تیرے حضور لائی گئی قبول کیجیے کہ خدا نے مجھ پر شفقت کی ہے اور میرے پاس سب کچھ ہے۔ غرض اس نے اسے یہاں تک تنگ کیا کہ اس نے لے لیا۔ اور اس نے کہا کہ آؤ کوچ کریں اور چلیں اور میں تیرے آگے چلوں گا۔ اس (یعقوبؑ) نے کہا کہ میرا خداوند جانتا ہے کہ لڑکے نازک ہیں اور بھیڑ بکریاں اور گائیں دودھ پلانے والیاں میرے پاس ہیں اور اگر دن بھر وہ ہانکے جائیں تو سارے گلے مر جائیں گے۔ سو میرے خداوند اپنے نوکر سے پیشتر روانہ ہو جایئے۔ اور میں آہستہ آہستہ جیسا کہ مویشی آگے چلیں گی اور لڑکے سہہ سکیں گے، چلوں گا۔ یہاں تک کہ سعیر میں اپنے خداوند کے پاس آ پہنچوں۔ تب عیسو نے کہا کہ مرضی ہو تو میں کئی ایک ان لوگوں میں سے جو اب میرے ساتھ ہیں، تیرے ساتھ چھوڑ دوں وہ بولا کہ کیا ضرور ہے؟ کاش کہ میں اپنے خداوند کی نظر میں صرف تنہا منظور ہوتا۔ تب عیسو اسی دن اپنی راہ لے کر سعیر کو پھر گیا۔ (سفر تکوین باب 33۔ از آیت 1۔16)

اس عبارت تورات سے حضرت یعقوبؑ کے اس خوف و دہشت کا پورا حال معلوم ہو گیا۔ جو عیسو اپنے بڑے بھائی کی طرف سے۔ ان کے دل میں گذشتہ سوء مزاجی کی بنا پر جاگزیں تھا۔ مگر خلاف امید یعقوب کی یہ سوء خیالی ان کا حسن ظن ہی ثابت ہوا۔ اور عیسو ان کے ساتھ ویسا ہی پیش آیا۔ جو ایک سگے بھائی کے خلوص و محبت کا مقتضی تھا۔ اور اس میں بھی کلام نہیں کہ یعقوب نے بھی اس خاص موقع پر عیسو کے ساتھ اسی آداب و تکریم کے محاسن کے اظہار کئے جو ایک چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کے ساتھ لازم اور مناسب ہوتے ہیں۔ اور حقیقت تو یوں ہے کہ باوجود یکہ آپس میں ایک کو دوسرے کے ساتھ شکایت ضرور تھی۔ مگر جب اصلیت اور قلبی تعلقات کے عالم فیما بین پیش نظر آ گئے۔ تو پھر کچھ بھی تھا۔ آناً فاناً ایک دوسری حالت ہی بدل گئی۔ عیسو جس کے خوف سے یعقوب تھر تھر کانپتے تھے۔ یعقوب کے گلے سے لپٹا ہوا زار و زار رو رہا ہے۔ اور یعقوب اس کے قدم پر اپنا فرق ادب جھکائے ہوئے شدت گریہ سے ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس

نیرنگ حال کا کیا باعث بتلایا جائے سوائے اس کے اس مقلب القلوب والاحوال کی قدرت کا کمال ۔واللہ قادر علی کل حال

عیسواور یعقوب کے باہمی حالات وواقعات اس تفصیل سے لکھ کر میرا خاص مدعا یہ تھا کہ ان کوتہ بین اور فاقد البصر علمائے یہود و نصاریٰ کی اس مغویانہ عالم فریبی کی پوری قلعی کھل جائے۔ جو بنی اسماعیل و بنی اسحاق کے مابین افتراق نسبی کے باعث سے دائمی مفارقت اور قطعی بے تعلقی بتلاتے ہیں۔ یہودی اور عیسائی متعصبین اپنے عہد نامہ قدیم میں ان واقعات الہامی کو پڑھ کر عبرت اور غیرت کا سبق لیں۔اور آیندہ سے ان مغویانہ اور عالم فریب کوششوں پر جرأت نہ کریں۔

ادوم کی حکومت

چندصدیوں کے بعد یہ خاندان بطور خاص ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔جس نے 1700 ق م میں سے پہلے ایک عظیم الشان حکومت قائم کی۔ اسی عہد میں بنی اسرائیل جب مصر سے آئے تو ادوم کی حکومت سعیر میں قائم تھی (سفر عدد 20۔14) ساول (طالوت) جو بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تھے اور جن کا زمانہ 1000 ق م ہے۔ان سے پہلے ادوم میں متعدد بادشاہ یا شیخ گذر چکے تھے۔(تکوین 36۔31)

توریت میں ادوم کی حسب ذیل مختلف آبادیوں کے نام مذکور ہیں۔ دنہابہ بصریٰ۔ تیمان۔عویث۔شریقا۔رحبوت اور فاعو(تکوین 36۔31)ادوم کے دارالحکومت کا نام بعد کو عبری میں سلاغ ہے۔اس کو یونانی پیڑا کہتے ہیں(ان دونوں کے معنی پتھر کے ہیں)لیکن عرب اس کو رقیم کہتے ہیں۔اصل میں یہ مدیانی شہر تھا۔مدین کے بعد ادوم نے اس پر قبضہ کرلیا۔سلاطین ادوم کے نام یہ ہیں۔ جو شاید پچھلے زمانہ کے ہیں اور غیر مرتب ہیں۔لیکن تورات نے ان کو بہ ترتیب و تسلسل ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو بادشاہ ظاہر کیا ہے۔(تکوین 36۔31)

تعداد	نام	مقام
۱	بالع ابن باعور	دنہابہ
۲	یوباب بن زارح	بصری
۳	حوشام	تیمان
۴	ہدادین ہداد	عویث
۵	کلا	مشریقا
۶	شاؤل	رحبوت
۷	بعل حنان بن عکبور	
۸	ہدار	فاع

ادوم کی تاریخ

ادوم کی سب سے پہلی تاریخ یہ ہے کہ ہدادشاہ ادوم نے۔ باشندگان مدین سے جنگ کی اوران کوشکست دی۔ تیرہویں صدی ق م میں۔منیفیط اورعمیس سوم۔فراعنہ مصر نے روم پرحملہ کیا مصری کتبہ میں اس ملک کا نام ادومہ بتایا گیا ہے اور ادوم کو شاسو کا ہم قبیلہ کہا گیا ہے۔(برٹینکا ج8 ص949وج14 ص291)

ساؤل شاہ اوّل اسرائیل نے جن کو قرآن مجید نے برعایت جالوت۔طالوت کہا ہے۔سب سے پہلے ادوم پرحملہ کیا۔(سموال 14-47) حضرت داؤدشاہ ثانی اسرائیل نے ادوم کو فتح کر کے مملکت اسرائیل میں شامل کرلیا(2 سموال8-14) ہدادادوم کا شاہزادہ بھاگ کر مدین آیا اور یہاں سے مصر چلا گیا(سلاطین 11-16) حضرت داؤدؑ کے مرنے کے بعد وہ اپنے ملک کو واپس آیا(سلاطین 11-22) اس کے بعد مختلف سلاطین بنی اسرائیل کے عہد میں بنوادوم نے پرزور بغاوتیں کیں۔(سلاطین 8-20-22) اموصیاہ شاہ یہودیہ نے بحرمیت کے ساحلی میدان میں ادوم پرایک زبردست حملہ کیا۔دس ہزار آدمی مارے گئے۔ادومیوں کے پایہ تخت سلاع (پٹر) پرشاہ یہودیہ نے قبضہ کرلیا۔ اوراس کا نام بدل کریقتا ئیل رکھا۔(2سلاطین 14-7)

اس کے بعد اسیریا کا دورشروع ہوتا ہے۔تغلات پلاسر رابع شاہ اسیریا کے عہد(701 ق م میں اسیریا کے کتبات میں ادومی حکومت کا بحیثیت خراج گذار ریاست کے ذکر ہے۔اس وقت اس کے بادشاہ کا نام کوز ملک تھا۔ساتویں صدی میں جو بادشاہ تھا اس کا نام کوزگیری تھا ساتویں صدی ق م کے وسط میں مواب اور ادوم دونوں قبائل بادیہ کے نشانہ تھے۔آخری تاریخ یہ ہے کہ بنوحذربصر (بخت نصر) شاہ اسیریا کے مقابلہ میں بغاوت کی (یرسیاہ27-3) اورنا کام رہے۔بخت نصر نے دیگر اقوام کے ساتھ ان کو بھی پامال کرڈالا۔

چھٹی صدی ق م میں اسیریا (شام) میڈیا (فارس) کے ہاتھ سے تباہ ہوا۔اسی عہد میں موقع پا کر بدوی اسماعیلی عربوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔جن کا نام تاریخ میں نبط ہے۔اورادومی مجبور ہو کر بحرمیت کے پار چلے گئے۔یہی سبب ہے کہ یوسفیوس اور بطلیموس اور نیز تالمود میں ادومیا اسی قطعہ کا نام بتایا گیا ہے۔

یوباب یا ایوب علیہ السلام

ہم اوپر بیان کرآئے ہیں کہ ادوم کی ایک نسل کا نام عوض تھا۔حضرت ایوب علیہ السلام جن کا قرآن مجید اوراسفار یہود دونوں میں ذکر ہے اور جن کے نام سے۔سفرایوب۔مجموعہ تورات کا ایک جزو ہے اسی عوض ادوم کی نسل سے تھے۔(سفرایوب) سفرایوب عبری میں ان کا نام ادب ہے۔لیکن عرب ان کو ایوب کہتے ہیں ادوم کے شیوخ یا سلاطین کی جو فہرست اس سے پہلے نقل کی گئی ہے۔اس کا تیسرا نام یوباب بن زارح ہے۔قدیم وجدید۔مسلم وغیرمسلم دونوں کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ یوباب۔ادب اور ایوب ایک ہی نام ہیں اور یہ اختلاف محض تغیرلہجہ کا نتیجہ ہے۔

ایک قدیم مذہبی کتاب۔جس کی اصل زبان عبری عربی ہے۔جوادوم کی زبانی ہونی چاہیے(کیونکہ ادوم عبری تھے اور وسط ملک میں

آباد تھے) اس کتاب کا ایک جرمن فاضل میخائیل (M I E H A I L I) نے لاطینی میں ترجمہ کیا ہے اس کا عنوان یہ ہے (COLLOQUIA) حواشی برتاریخ گبن شائع کردہ ایوری مینس لائبریری ج 5 ص 240) لیکن اس کتاب کا ایک قدیم عربی ترجمہ بھی ہے جس میں حسب ذیل عبارت ہے۔قواعد عربی کی رو سے جا بجا غلط ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی غیر عرب نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

وکان ایوب ساکنا فی ارض عوض فی اتخم ادوم و عربیا و من قبل اسمه یوباب وایوب کان ابن زارا ابن بنی عیسو و هو کان السادس من ابراهیم والملوك الذی ملکوا فی ادوم الذی کان ملك علیٰ تلك الارض من قبل بالق بن باعور واسم مدینته دنابا ومن بعده یوباب هذا الذی یسمی ایوب۔

ایوب۔عوض کی سرزمین میں،ادوم کی سرحد پر رہتے تھے قوماً عرب تھے۔اور پہلے یوباب نام تھا۔ایوب زار کے بیٹے اور خاندان عیسو سے تھے اور حضرت ابراہیمؑ سے چھٹی پشت میں تھے۔اور جو سلاطین پہلے ادوم پر حکمران ہوئے تھے وہ بالق بن باعور تھے۔اوران کے پایہ تخت کا نام دنابہ تھا۔ان کے بعد یوباب بادشاہ ہوئے۔جو ایوب ہیں۔

ریونڈ فارسٹر نے اس بحث پر کئی صفحے سیاہ کئے ہیں کہ ایوب عرب تھے۔اور نسل ادوم سے تھے۔یہاں تک تو صحیح ہے۔آگے وہ ثابت کرتے ہیں کہ ایوب کا شہر دنابا تھا۔اور یہ غلطی اس لئے ہوئی کہ عربی عبارت مذکورہ میں واسم مدینۃ دنابا۔میں مدینتہ کی ضمیر یوباب کی طرف راجع ہے۔حالانکہ اولاً تو یہ صریح غلط ہے جس کو ہر عربی داں سمجھ سکتا ہے ثانیاً یہ خود تورات کے مخالف ہے۔(تکوین 36-22)

ایک دوسرے یورپین فاضل (CALMET) نے ثابت کیا ہے کہ یوباب اور ایوب ایک ہی شخص ہیں۔

مسٹر گبن (GIBBON) عرب و اسلام کی فصل میں۔جو ان کی تاریخ کا چالیسواں باب ہے۔قرآن مجید پر ایک غیر واقفانہ نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اس عرب مبشر (قرآن یا محمد صلعم) کے خیالات خدا کے متعلق گو اعلیٰ ولطیف ہیں۔تاہم اس کا بلند سے بلند خیال سفر ایوب کی پر جلال سادگی کے مقابلہ میں کم ہے جو عہد قدیم میں اسی ملک اور اسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

ہمارے ہاں تفسیروں میں جو روایات اسرائیلیہ ہیں وہ بھی اسی کی تصدیق کرتی ہیں کہ یوباب اور ایوب ایک شخص ہیں۔

کان ایوب رجل من الروم (ادوم) وهو ایوب بن اموص (خطاء) بن زارح بن دوم (ادوم) بن عیص (عیسو) بن اسحاق بن ابراهیم علیه السلام وکانت له انبیة من ارض الشام کلها سهلها رجبلها و کان له فیها من اصناف المال کله من البقروا لا بل والغنم والخیل

والحمر

ایوب روم کا آدمی تھا۔ایوب بن اموص (خطاء) بن زارح بن عیص (عیسو) بن روم (ادوم) بن اسحاق ابن ابراہیمؑ اس کے قبضہ میں شام کے تمام میدان اور کوہستان تھے۔اوران میں ہر قسم کی دولت تھی۔یعنی گائے۔بیل۔اونٹ۔بھیڑ۔بکری۔گھوڑے اور گدے وغیرہ۔

ان تمام روایات میں ایک عجیب تصحیف لفظی ہے۔ادوم کی جگہ روم بیان کیا گیا ہے۔ادم چونکہ غیر معروف اور روم مشہور لفظ تھا اور تشابہ خط ولفظ بھی ہے اس سبب سے راوی یا ناسخ (نویندہ) نے ادوم کی جگہ روم لکھ دیا۔دوسری غلطی یہ ہے کہ سلسلہ نسب میں ایوب اور زارح کے درمیان اموص کے نام کی زیادت ہے۔مؤرخ ابن واضح یعقوبی۔المتوفی 280ھ کا بیان زیادہ صحیح ہے۔ملوک شام کے ذکر میں لکھا ہے۔یو باب ھو ایوب بن زارح الصدیق۔یوباب ہی ایوب بن زارح الصدیق ہیں۔باقی رہا یہ مسئلہ کہ حضرت ایوبؑ ایک ادومی عرب تھے۔خود سفر ایوب سے ثابت ہے۔عوض کی زمین ایک مرد صالح۔راستگو خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا۔

عوض تورات میں دو آدمیوں کا نام ہے۔ایک تو نہایت قدیم عوض بن ارم بن سام بن نوحؑ (تکوین 10۔24) دوسرا عوض بن ولیان بن عیسو بن اسحاق بن ابراہیمؑ (تکوین 26۔29) باتفاق اہل کتاب اس سے عوض عمانی مراد ہے۔عوض کی بنی ادومی عرب ہونے پر ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفر ایوب میں جو مسکن رفقاے ایوبؑ کے بتائے ہیں وہ تیمن۔نعمتان اور شوحان میں (3۔11) اول کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا۔(تکوین 36۔35) اس سے پہلے حضرت ایوبؑ کی تعریف میں ہے اس لئے وہ تمام فرزندان مشرق میں سب سے زیادہ بڑا تھا۔(ایوب 1۔۳) یہ امر اس کتاب میں بتواتر ثابت ہو چکا ہے کہ یہودیوں کی اصطلاح میں مشرق سے ہمیشہ ارض عرب مراد ہے۔

حضرت ایوبؑ امیر یا شیخ قوم تھے

حضرت ایوبؑ، بادشاہ یا شیخ قبیلہ تھے۔خود سفر ایوب سے ثابت ہے۔

اے وہ جیسا کہ میں گذشتہ مہینوں میں تھا۔ان دنوں میں جبکہ خدا میری حفاظت کرتا تھا جبکہ اس کا چراغ میرے سر پر تھا اور میں تاریکی میں اس کی روشنی پر چلتا تھا۔میں اپنی نوجوانی کے دنوں میں جبکہ اس وقت تک خدا کا راز میرے مسکن میں تھا۔جبکہ قادر مطلق خدا میرے ساتھ تھا اور میرے بچے میرے قریب تھے۔

جب میں اپنے پاؤں کہن سے دھوتا تھا اور جب چٹان میرے لئے تیل کے چشمے بہاتی تھی۔جب میں شہر کے دروازے پر جاتا تھا۔جب بازار میں اپنی نشست تیار کرتا۔نوجوان مجھے دیکھ کر ٹل جاتے۔اور بوڑھے میرے لئے کھڑے ہو جاتے بڑے بڑے

لوگ مجھ سے بات کرنے سے جھجکتے اور ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لیتے۔ اور زبان تالو میں لگا لیتے۔

کیونکہ جس کے کان نے مجھ کو سنا۔ میری تعریف کی اور جس آنکھ نے مجھے دیکھا میری گواہی دی کیونکہ جس مسکین نے بھی فریاد کی اور جو بھی بے یارومددگار و یتیم تھا۔ میں نے ان کی مدد کی۔ اور ہر قریب مرگ کی دعا مجھ کو ملی اور ہر بیوہ کے دل کو خوشی کا گانا مجھ سے نصیب ہوا۔

راستی میری پوشاک تھی۔ جو مجھ کو پہنائی گئی۔ میرا فیصلہ خلعت اور تاج ہوتا تھا۔ میں اندھوں کی آنکھ تھا۔ لنگڑوں کا پاؤں۔ اور غریبوں کا باپ تھا۔ اور وہ دلیل جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں جن کی تلاش میں تھا۔ میں نے بیان کی اور شریروں کے دانت توڑ دیئے۔ اور ان کے دانتوں کے بیچ سے غضب کی چیز چھینی۔

میری عظمت مجھ میں تازہ تھی اور میری کمان میرے ہاتھ میں نئی کی گئی تھی۔ میری بات کو لوگوں نے سنا اور خاموشی سے میری نصیحت کا انتظار کرنے لگے۔ میری گفتگو کے بعد پھر وہ کچھ نہ بولے میرے الفاظ کے قطرے ان پر ٹپکتے تھے اور وہ ان کا ایسا انتظار کرتے تھے جیسا بارش کا۔ اور وہ ان کے لئے اس طرح منہ کھولتے تھے جیسے مچھلی منہ کے لئے۔

میں ان پر ہنسا لیکن انھوں نے یقین نہ کیا۔ اور نہ میرے چہرے کی چمک زمین پر گری۔ میں نے ان کے لئے راستہ چن دیا اور میں سردار بن کر بیٹھا۔ اور اس طرح رہا جس طرح بادشاہ اپنی فوج میں اور اس آدمی کی طرح جو غمزدوں کو تسلی دیتا ہے۔ (ماخوذ از سفر ایوب باب 29)

حضرت ایوبؑ کا زمانہ اور وطن

جب ہم ثابت کر چکے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخص ہیں تو ہم کو حضرت ایوبؑ کے مکان و مسکن کے متعلق زیادہ کاوش کی حاجت نہیں رہی۔ یوباب کا مسکن تورات میں مذکور ہے کہ وہ بصری تھا۔ جو اب تک شمال عرب میں فلسطین کے قریب ایک مشہور شہر ہے۔ آنحضرت صلعم نے بھی سفر شام میں وہاں قیام کیا تھا۔ وہی شہر حضرت ایوبؑ کی قیام گاہ تھا۔ بصریٰ قدیم زمانہ میں ایک تجارتی شہر تھا۔ تورات میں اس کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے اشعیاہ نبی بوخذ نصر (بخت نصر) کی خبر دیتے ہیں۔ خداوند کی تلوار خون آلود ہے۔ خداوند نے بصرے میں قربانی کی اور ادوم کے ملک میں قتل عام (34-6) پھر کہتے ہیں۔ وہ رنگے کپڑے کے ساتھ بصرے سے اور ادوم سے آ رہا ہے (24-6) اس آیت میں بصرے سے کسی آنے والی کی بشارت ہے مسکن ایوبؑ ظاہر ہو چکا ہے۔ زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لئے آسان ہے کہ کلدان (ایوب 1-17) اور سبا (ایوب 10-15) کا اس میں ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا عروج 1000 ق م میں ہوا ہے اور

کلدانیوں کا اختتام 700 ق م میں ۔ ان دونوں کا مشترک عہد 1000 ق م سے 700 ق م تک ہے۔ اس لئے ان دونوں زمانوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب کا عہد قرار دینا چاہیے۔

ہمارے فاضل معاصر صاحبِ ارض القرآن اگر تعین زمانہ ایوب میں تھوڑی اور تحقیق فرماتے تو قیاسی تعین زمانہ کی جگہ ان کو زمانہ اصلی کا پورا پتہ چل جاتا۔ وہ اس طرح سے کہ حضرت ایوب کی بی بی۔ جن کے ذکر کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہے۔ وہ باتفاق مؤرخین و نسابین عرب یوسف ابن یعقوب کی پوتی تھیں اور ان کا نام رحمہ تھا۔ (حیات القلوب مجلسی جلد اول) تورات سے حضرت یعقوب کا زمانہ تقریباً 2000 ق م ہے تو قاعدہ امتداد نسل کی رو سے یہ خاتون رحمہ نامی حضرت یعقوب سے سو برس بعد ہوں گی جو 1900 ق م ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے یہی زمانہ حضرت ایوب کی رسالت کا اصلی قرار دیا جائے گا۔

حضرت ایوبؑ کا قصہ

قرآن مجید میں حضرت ایوب کا ذکر ہے۔ لیکن چند مجمل اشارات کے سوا کوئی تفصیل نہیں ہے۔ مفسرین نے جو تفصیل نقل کی ہے وہ وہب ابن منبہ اور دیگر اسرائیلی مسلمانوں سے جو قرن اول میں موجود تھے منقول ہے اور یہ اسرائیلی روایت بہ تغیر و اضافہ قلیل تمام تر سفر ایوب سے ماخوذ ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

حضرت ایوب ایک مالدار کثیر لاولاد صاحب عزت اور تندرست آدمی تھے۔ خدا کی رضا کے ہمیشہ طالب اور ہر مصیبت کے وقت صابر تھے۔ مساکین وفقرا کی اعانت یتیموں اور بیواؤں کی امداد اور مظلوموں کی فریادرسی آپ کی عادت تھی۔ آخر خدا نے آپ کو ابتلا میں ڈالا۔ اور براویت سفر ایوب (تورات) شیطان کو ان کی جان و مال پر استیلا دیا گیا۔ دولت جوان دنوں اونٹ بھیڑ بکری اور گدھوں سے عبارت تھی کلدانی لوٹ کر لے گئے۔ غلامون کے دستہ پر سبائی قابض ہو گئے۔ اولادیں ایک چھت کے نیچے دب کر رہ گئیں لیکن ان مصائب میں بھی کلمہ شکر و رضا کے سوا زبان مبارک سے کچھ نہ نکلا۔ آخر تندرستی بھی زائل ہوگئی۔ اور تمام بدن فاسد ہو گیا عزیز و اقارب نے کنارہ کشی۔ ایک بیوی رفیق حال تھی۔ اس نے بھی بال آخر صلاح دی کہ غیر خدا کے سامنے جھکو اور خدا کو برا کہو۔ اس حالت کی خبر حضرت کے تین دوستوں کو ہوئی اور یہ تینوں حضرات حضرت ایوب کی تعزیت ا_ کو آئے۔ پورا صحیفہ حضرت ایوب اور ان تینوں مومنین صادقین کے باہم مناظرے و مکالے پر شامل ہے۔ یہ تمام مناظرہ لطیف تمثیلات میں نہایت اعلیٰ فلسفیانہ اور شاعرانہ جذبات روحانی سے پر ہے جن کا ماحصل یہ ہے کہ ان مومنین ثلاثہ کا دعویٰ ہے کہ انسان پر کوئی مصیبت بغیر گناہ کے نہیں آتی۔ اس لئے جو مبتلائے مصیبت ہے وہ گنہگار ہے اور اس کو اعتراف وتوبہ کرنا چاہیے۔ حضرت ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی معصیت نہیں کی ہے جس کی خدا کی طرف سے یہ جزا ہے بلکہ یہ عالم قضا وقدر ہے۔ جس کے لئے کوئی سبب درکار نہیں۔ خدا کے اسرار و مصالح لامحدود ہیں اور ان کی معرفت سے انسان عاجز ہے۔ آخر وحی الٰہی نے فیصلہ کیا کہ ایوب گو توحق پر ہے۔ تاہم بندہ کو کسی حال میں اعتراف وندامت میں قصور نہ کرنا چاہیے۔'' یہ سنتے ہی حضرت ایوبؑ نے قربانی کی اور تندرست ہو گئے۔ تمام اعزا و اقارب بھی جمع ہو گئے۔ خدا نے از سرِ نو دوسری دو چند دولت اور اولاد عطا کی۔

قرآن مجید اور حضرت ایوبؑ

قرآن مجید میں حضرت ایوبؑ کا نام چار سورتوں میں آیا ہے۔ نساء، انعام، انبیا اور ص۔ نساء اور انعام میں صرف نام ہے۔ وعیسیٰ و ایوب (نساء) وایوب و یوسف (انعام) سورۂ انبیا اور سورۂ ص میں کسی قدر تفصیل سے ذکر ہے۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿٤١﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٤٣﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿٤٤﴾ (ص)

ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو۔ جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے شیطان نے تکلیف اور عذاب کے ساتھ چھوا ہے۔ (اے ایوب) اپنا پاؤں مار۔ یہ غسل کرنے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور پینے کا پانی ہے اور ہم نے اس کو اس کے اہل وعیال دیئے اور انھیں کے برابر اور پنی رحمت سے اور عقلمندوں کی یادگاری کے لئے۔ (ایوبؑ) اپنے ہاتھ میں تنکے کا مٹھا لو۔ اور اس سے مارو اور اپنی قسم نہ توڑو۔ ہم نے ایوب کو صابر فرمایا۔ اچھا بندہ توبہ کرنے والا ہے۔ (ص)

اس موقع پر شیطان سے کیا مراد ہے۔ یہ صاف ہونا چاہیے۔ سورۂ انبیاء کی آیت کریمہ نے اس کی تفصیل کے ساتھ صفائی کر دی ہے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٨٣﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿٨٤﴾

اور ایوبؑ، جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھ کو بیماری نے چھوا۔ اور تو مہربانوں میں سے سب سے بڑا مہربان ہے۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اس کی بیماری دور کی اور اس کو اس کے اہل وعیال دئے اور ان کے برابر ان کے ساتھ۔ اور اپنی رحمت سے عبادت گذاروں کی یادگاری کے لئے۔ (انبیاء)

ان آیات مبارکہ کے متعلق تین امور قابل ذکر و بحث ہے۔ اول۔ اپنے ہاتھ میں جھاڑ ولو اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو۔'' اس آیت میں اس کا ذکر نہیں کس کو مارو؟ اہل تفسیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ایوب کی بیوی نے جب خدا کی شان میں گستاخی کی تو انھوں نے غضبناک ہو کر قسم کھائی تھی کہ اگر اچھا ہو گیا تو تمھیں سو لکڑی ماروں گا صادق الایمان تھی اور یہ لغزش ایک وسوسہ شیطانی تھا۔ اس لئے معاف کیا گیا۔

سفر ایوب میں اس گستاخی اور کلمۂ کفر کا ذکر ہے (سفر ایوب 2۔9) لیکن اس سزا کی نوعیت کا بیان رہ گیا ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے

کہ خدا کے نیک وصالح بندے اپنے اعزا سے کلمات کفر سن کر بے تاب کیوں نہ ہوجائیں اور کیونکر سزا نہ دیں؟ نقص کی تکمیل قرآن نے کردی جو دنیا میں صرف تکمیل ہی کے لئے آیا ہے۔

دوم۔ اپنے پاؤں سے مارو۔ یہ نہانے کی ٹھنڈی جگہ ہے اور پینے کا پانی ہے۔'' سفر ایوب میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ایوب کس طرح اور کس علاج سے صحت یاب ہوئے۔ قرآن بتاتا ہے کہ خدا نے ان کو ایک چشمہ کا نشان بتایا۔ جس میں نہانے اور اس کے پانی پینے سے (ان کی) بیماری جاتی رہی۔ یہ طریقہ علاج بالکل مطابق فطرت ہے۔ طبعی اے چشمے جو طبقات ارضی یا پہاڑوں سے بعض اجزاے کیمیاوی کے مخزن سے گذر کر ابلتے ہیں۔ مخصوص خواص رکھتے ہیں اور دنیا کے اکثر ممالک وا کناف میں اب بھی خدا نے اپنا یہ چشمۂ فیض جاری کر رکھا ہے۔ جس سے اس کی ہزاروں مخلوق ہر موسم میں مستفید ہوتی ہے۔

حضرت ایوب کے حالات میں ہمارے فاضل محقق صاحب ارض القرآن نے جس تفصیلی تحقیق سے کام لیا ہے وہ بہت ہی قابل قدر ہے مگر با ایں ہمہ زوجہ حضرت ایوب اور نوعیت صحت کے متعلق کسی قدر انکشاف کی ضرورت باقی رہ گئی۔ جو حسب ذیل ہے۔

فاضل معاصر نے زوجہ حضرت ایوبؑ کی نسبت زیادہ غور وخوص سے کام نہیں لیا۔ بلکہ سفر ایوب اور شارحین یہود کے مرویات واقوال پر اعتبار فرمالیا ہے۔ ہمارے معتقدات شکل سے پیغمبر کی ایسی زوجہ کو جو بالنفس النفیس خاندان رسالت اور دودمان نبوت سے علی الصحت ثابت ہوچکی ہے۔ کافرہ یا مشرکہ تسلیم کریں گے حالانکہ آگے چل کر آپ نے بھی اس کے صادق الایمان بیوی ہونے کا اقرار کرلیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی کفر وشرک کی تعلیم وتحریص کے اعتراف کے بعد۔ آپ کے موجودہ اعتراف واختلاف نے اس مسئلہ کو جمع بین المتضاد کے مشکالات ومحالات میں ڈال دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات اور نبر شارحین تورات کے اقوال ومختار کے مقابلہ میں اسلامی مفسرین کے بیانات کی طرف توجہ والتفات نہیں فرمائی گئی۔ مجموعہ تورات توان اقسام کے لغویات وحشویات کثیرہ کی کلیات ہے اور حقیقت میں قرآن مجید۔ جیسا کہ آپ خود اکثر مقامات پر ظاہر وثابت کرتے آئے ہیں۔ انھیں قصص باطلہ کی تصحیح وتوضیح کے لئے ضرورتاً نازل فرمایا گیا ہے۔ قرآن نے ضمناً وکنایتاً بھی جیسا آپ لکھ چکے ہیں ذکر نہ فرمایا۔ پھر قرآن کے موجودہ سکوت کے مقابلہ میں مرویات تورات پر اعتبار کرلینا۔ اسلامی اصول عقائد کے صریح منافی ہے۔ بہرحال جس طرح ہمارے فاضل معاصر نے حضرت ایوبؑ کے حالات وواقعات کو اسلامی مفسرین کے بیانات سے مل کر لکھا ہے اسی طرح مسئلہ زیر بحث کی صورت حال کو بھی اور ان کے اقوال ومختار کے ساتھ ملاحظہ فرمالینا ضروری تھا۔ حقیقت حال اور اصلی واقعہ کا مشاہدہ ہوجاتا۔ اسلامی مفسرین نے اس کے متعلق جو لکھا ہے وہ یہ ہے

حضرت رحمہ زوجہ جناب ایوبؑ

ایام ابتلا میں حضرت ایوب کے تمام اہل وعیال کے تباہ وبرباد ہوجانے کے بعد خدائے سبحانہ تعالیٰ نے آپ کی صرف ایک بی بی کو۔ جس کا نام رحمہ تھا۔ اور جو بقول نسا بین حضرت یوسفؑ کی پوتی تھیں۔ بچا رکھا تھا۔ جو آخر وقت ابتلا تک اپنے شوہر کی رفیق حال اور شریک مصیبت تھی۔ امتحان وابتلا میں جوں جوں ترقی ہوتی رہی ویسے ویسے ان کی وفا

اور حسن رفاقت میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ مشلول الاعضا ہو گئے۔ جسم مبارک سے حس وحرکت کی قوت بھی زائل کر دی گئی۔ تمام قوم نے ان کے تفقد احوال سے روگردانی اختیار کی۔ یہ قوت کا دستیاب ہونا بھی دشوار ہو گیا۔ فاقے پر فاقے ہونے لگے۔ ایک بار اسی حالت میں اس برگزیدہ الٰہی کو بے آب و دانہ تین شبانہ روز کٹ گئے۔ جناب رحمہ نے ہر چند تجسس وتلاش کی ایک دانہ نہ ملا۔ وہ خاتون معظّمہ اس پر بھی اپنی کوشش وسعی سے باز نہ آئی۔ چوتھے دن کسی دوسرے قریہ میں قوت کی تلاش کو نکلی۔ اس دن کسی کے ہاں عروسی تھی۔ مہمانوں کے لئے ضیافت کے کثیر سامان تھے۔ انواع و اقسام کے طعام تیار تھے۔ یہ غریب حسرت آلود نگاہوں سے الوان نعمت کے خوانوں کی طرف دیکھنے لگی۔ صاحب خانہ کی بی بی کی نظر ان کی ضرورت کو پہچان گئی وہ رحم دل تھی اور نیک مزاج۔ انھیں اندر بلا لیا۔ استفسار حال کیا۔ غریب نے اپنی تمام مصیبت کہہ سنائی۔ باتوں باتوں میں اس عورت نے ان کے سر کے بالوں کو حد سے زیادہ باریک لطیف اور طویل پایا۔ اتفاق سے اس کی لڑکی کے جس کی شادی کی جا رہی تھی۔ نہایت کم اور چھوٹے بال تھے اور بیحد بدنما معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بالوں کی لطافت کو دیکھ کر اس نے یہ سوچا کہ کسی طرح ان کے بال مجھے مل جائیں تو میں ان بالوں کو اپنی لڑکی کے بالوں سے ملا کر گوندھ دوں کہ اس کا عیب چھپ جائے۔ یہ سوچ کر اس نے اس خاتون مقدسہ سے کہا کہ بہن۔ میں ایک شرط پر تمھیں اور تمھاری بہو کے شوہر کو کھانا دینے کے لئے راضی ہوں۔ اگر تم مان لو۔ یہ غربت زدہ بولی۔ جو تم کہو مجھے منظور ہے۔ کسی طرح میرے گسنہ شکم شوہر و مریض کو جو اپنے آزر و کلفت کی وجہ سے موت کے قریب ہو رہا ہے۔ قوت پہنچے اور مجھے اس کے زندہ رہ جانے کی امید تو بندھ جائے۔ وہ عورت بولی کہ تم مجھے اپنے سر کے بال کاٹ لینے دو کہ مجھے اپنی نوعروس لڑکی کے لئے درکار ہیں۔ کیونکہ اس کے سر میں بہت چھوٹے اور کم بال ہیں۔ میں ابھی ابھی تمہیں اور تمہارے شوہر کے لئے نفیس اور اعلیٰ کھانے دیتی ہوں۔ یہ مصیبت زدہ بی بی پہلے تو کچھ خاموش رہی مگر پھر یقین کر کے حسن و عصمت اور اس کے تمام لوازم و مراتب اس شوہر کی خدمت و راحت اور صحت پر ہزار بال نثار ہیں۔ جس کی مسرت و آرام کے لئے یہ تمام اسباب فراہم کئے گئے ہیں۔ جس کی بقا کے ساتھ میری بقا وابستہ ہے۔ اور جس کی فنا کے ساتھ میری فنا۔ یہ سوچ اس آفت

رسیدہ نے فوراً اپنا سر جھکا دیا اس عورت نے مقراض سے ان کے گیسو ہائے مبارک تراش لئے۔ اور ان طعام لذیذ سے دو حصے اٹھا کر انھیں دیدیئے، یہ نہایت خوش ہو کر اپنے مقام کو واپس آئیں اور اپنے مقدس، ناتواں اور نیم جاں شوہر کے آگے دسترخوان بچھا کر وہ کھانے چن دیئے۔ چونکہ بے حسی اور زوال قوت کا پورا عالم تھا۔ یہاں تک کہ خود ہاتھ سے کھانے کی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ اس لئے کھانا چن دینے کے بعد وہ وفادار بی بی کھانا کھلانے بیٹھی۔ حضرت ایوب کبھی حصول رزق پر اور کبھی ایسی رفیق حال اور شریک مصیبت زوجہ کے ملنے پر پروردگار عالم کا شکر کر رہے تھے کہ یکا یک سر کے ہوئے گوشہ چادر سے اس عفیفہ کے کترے ہوئے بال دکھائی دیئے ایسے کامل اور عدیم المثال صابر کو ہتک حرمتِ ناموس کی ایسی غیرت آئی کہ کھانا زہر ہو گیا۔ سبب پوچھا تو مطیع و فرمانبردار بی بی نے صورت واقعہ بیان کر دی اگر چہ اس واقعہ سے اس پارسا بی بی کی مجبوری ظاہر ہوتی تھی مگر جناب ایوبؑ کی غیرت و ناموس اس روح فرسا صدمہ کی متحمل نہ ہوئی۔ بی بی پر خفا ہوئے اور اعتاب انگیز لہجہ میں فرمایا کہ اس وقت تو بیماری سے مجبور ہوں مگر صحت پانے پر سو تازیانے کی سزا تمھیں صرف اس تقصیر کے لئے دوں گا۔ کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ایک غیر جنس عورت کے سامنے اپنا سر عریاں کیا۔ یہ تو بی بی سے خطاب ہوا۔ اس کے بعد پھر یہ سوچ کر یہ تمام آفتیں اس موذی بیماری کے باعث ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں ان مضطربانہ الفاظ کے ساتھ مستدعی ہوئے۔ رب انی مسنی الضر و انت ارحم الرحمین۔ (حیات القلوب جلد اول)

واقعہ حقیقی تو یہ ہے جو مرویات اسلامی سے ماخوذ ہے اور قریب قریب تمامی کتب تفسیر میں مذکور اس کی صورت وقوع سے خاندان رسالت کے انداز و برگزیدہ گان الٰہی کے محاسن و اوصاف پورے طور سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل سے نہ اس خاتون معظّمہ کی کفر شعاری معلوم ہوتی ہے اور نہ بت پرستی بلکہ اس میں تو اس پاکدامن خاتون کی شوہر کے ساتھ کمال خلوص و محبت اور عقیدت و اطاعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے کسی لفظ یا کسی حرف سے یہ نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ توارات کا بیان ہے کہ اس عفیفہ نے نعوذ باللہ اپنے شوہر عالی مقدار کو جس کی رسالت کی یہ تصدیق کر چکی تھیں اور ایک معتدبہ مدت تک خدمت میں رہ کر ان کی تبلیغ رسالت اور تلقین و تعلیم ہدایت کے اصلی مدعا کو کما حقہ سمجھ چکی تھیں۔ کفر و شرک کے طریقے باطل اختیار کرنے کی ترغیب و تحریص کی تھی۔ یہ وہی لغویات و حشویات ہیں جو ذاتیات انسانی اور اغراض نفسانی کی بدولت کتب قدیمہ سماویہ کے الہامات ربانی اور ارشادات روحانی میں مخلوط ہو کر اس کی صحت و صداقت پر بدنما دھبہ لگاتے ہیں اور ان کے منزل من اللہ ہونے میں شک و شبہ پیدا کرتے ہیں۔ اور حقیقت میں قرآن مجید انھیں کی

صحت وترمیم کے لئے بارگاہ الٰہی سے خذما صفا ودع ماکدر کا عام اعلان فرماتا ہوا نازل کیا گیا ہے۔تورات میں شان رسالت کی عظمت نہ کوئی چیز قرار دی گئی ہے اور نہ خاندان نبوت کی حرمت قابل لحاظ و پاس۔یعقوب کی دونوں بیبیاں۔لابن کی بیٹیاں۔رخصت ہونے کے وقت اپنے گھر سے سونے کے بت چرالاتی ہیں۔اوران کی پرستش کیا کرتی ہیں۔اس پر بھی پیمبر زبان کی بی بی اور آیندہ انبیاو مرسلین کی ماں بھی بلا عذر و تامل بنی رہتی ہیں۔تورات کے یہی ارحام مطہرہ ہیں اور یہی اصلاب شامخہ۔(سفرتکوین۔باب31۔ آیت39۔35) لطف تو یہ ہے کہ ان بت چرانے والیوں میں خاص کر راحیل زوجہ یعقوبؑ کا نام لکھا ہوا ہے اور یہ راحیل حضرت یوسف الصدیق کی ماں تسلیم کی جاتی ہیں۔**نعوذباللہ من ھذہ الھفوات**

بہرحال اصل واقعہ یہ ہے جولکھا گیا۔اس سے نہ اس پیغمبر برحق پر کوئی الزام آتا ہے اور نہ اس کی صادق الایمان بی بی پر۔چونکہ بمقتضاے بشریت اس محترمہ سے ترک اولیٰ کا صدور واقع ہوگیا تھا کہ بلا اذن شوہر انھوں نے اپنا سر عریان کر دیا تھا۔حضرت ایوبؑ کو ہتک وناموس کی بڑی غیرت آئی اور اضطراب کے اسی عالم میں آپ نے قسم کھائی کہ صحت یابی کے بعد میں تم پر حدِ شرع جاری کروں گا۔ چونکہ اس مخدرہ عظمٰی کا مدعا خلوص حقیقی پر مبنی تھا۔اس لئے عادل حقیقی نے ان کے اجرائے سزا وتنبیہ میں وہ طریقہ معتدلہ اختیار کرنے کا حکم فرمایا کہ اس پیغمبر برحق کی قسم بھی پوری ہوگئی اوران کی زوجہ محترمہ کوکوئی تکلیف بھی نہ پہنچی۔سبحانہ اعظم شانہ

دوم۔نوعیت صحت کے متعلق فاضل معاصر نے بڑی کاوش سے حسب تصریح قرآن ترکیب غسل کواصول فطرت کے مطابق ثابت کیا ہے۔اور طبی مشاہدات عملیہ اور خواص واثرات کیماویہ سے اس کی تصدیق وتوثیق بہم پہنچائی ہے۔اس میں شک نہیں کہ آپ کی یہ تحقیق قابل تعریف ضرور ہے مگر حقیقت میں نگاہوں کے سامنے قدرت کے بدیہات ایسے یقینی ثابت ہوچکے ہیں کہ اب ان کے اثبات واظہر میں زیادہ تحقیق وتفتیش کی ضرورت نہیں۔ہمارے قابل محقق کا طریقہ اثبات بالکلیہ خواصِ عرض سے تعلق رکھتا ہے نہ مفاد جوہر سے حالانکہ حقیقت شناس پہلے جوہر کو پرکھتا ہے پھر اس کے فضاوعرض کو۔جوہر قدرت ہے۔اور فضاء وعرض اس کے عطا کئے ہوئے خواص اور اثر۔ اس مسلمہ سے کسی کوانکارنہیں۔اس بنا پر اس چشمہ اوراس کے پانی کو باعتبار خواص کے حضرت ایوب کی صحت کا جزو اعظم اور سبب اول قرار دینا اور مان لینا تو قدرت کے اصلی فیوض سے صریح چشم پوشی کرنا ہے۔اس احتیاط کو قائم رکھنے کی غرض سے جوایک قوی الایمان مسلمان کا فرض ہے۔تنہا اس طریقہ علاج کو سبب صحت قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔بلکہ یوں کہنا ہوگا کہ ایوب نے جس ارحم الرحمین سے دعائے صحت کی تھی اس کی حکمت کاملہ اوررحمت عامہ نے ظاہر طور پر ان کی صحت کے سامان اس چشمہ کے پانی میں نہا لینے سے فراہم کر دئے جس کو حقیقی طور سے اس حکیم مطلق نے شفا کے تمام اجزوخواص کے ساتھ ان کے لئے پیدا فرمایا تھا۔

بنو ہاجرہؑ، حضرت اسماعیل علیہ السلام

اصحاب الرس۔ اصحاب الحجر۔ اصحاب الایکہ۔ انصار اور قریش

ہاجرہؑ۔ اصل میں عبرانی لفظ۔ ہاغار ہے جس کے معنی بیگانے اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر تھا حضرت ابراہیم اور سارہ جب مصر گئے تو فرعون نے دیگر انعام واکرام کے ساتھ یہ لڑکی (ہاجرہؑ) بھی ان کے ساتھ کر دی۔ انھیں ہاجرہؑ سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اور حضرت اسماعیل کی نسل سے۔ اصحاب الرس۔ اصحاب الحجر۔ اصحاب الایکہ۔ انصار اور قریش۔ عرب کے ممتاز اور سرمایہ ناز قوم وقبائل پیدا ہوئے۔ سارہ کے بطن سے اصحاب پیدا ہوئے۔ جن سے بنی اسرائیل کی نسل قائم ہوئی۔

شمس العلماء نعمانی نے سیرۃ النبی میں اور ان کے شاگرد رشید مولانا سلیمان صاحب ندوی نے ارض القرآن میں بنو ہاجرہؑ کے حالات کا آغاز حضرت اسماعیل کی تفصیل واقعات سے کیا ہے اور جناب ابراہیمؑ کے تصریح احوال کی طرف غالباً اس وجہ سے توجہ نہیں فرمائی ہے کہ عرب میں ان کا قیام ثابت نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے تعلقات مذہبی ہوں یا قومی۔ ملک عرب سے اتنے وابستہ اور پیوستہ ہیں کہ ان کی تفصیل وتشریح کے بغیر جناب ہاجرہؑ حضرت اسماعیل اور ان کے مابعد کی اولاد کے حالات وواقعات مبہم اور مجمل رہ جاتے ہیں۔ لائق مصنفین کو جناب ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے واقعات ہجرت۔ تعمیر کعبہ اور دیگر واقعات کی تحریر کے وقت حضرت ابراہیم کے جستہ جستہ حالات بیان کرنے کی بال آخر ضرورت واقع ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ آیہ کریمہ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ "تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے پہل تمہارا نام مسلمین رکھا۔" کے رو سے جس کو سیرۃ النبیؐ کے صفحہ 94 میں بذیل ذکر سلسلہ اسماعیل بڑی خصوصیت کے ساتھ زیب عنوان کیا گیا ہے۔ دین ابراہیم اور اسلام (دین محمد صلعم) متحدہ بالذات والحقیقت ہیں جیسا کہ خود تحریر فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر (سلسلہ اسماعیلی) سے وابستہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابراہیمؑ واسماعیل ہی کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت صلعم کو عنایت ہوئی ہے وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی۔ سیرۃ النبی جلد اول صفحہ 94۔

جب آپ کے اقرار واعتراف سے اس قدر اتصال واتحاد خود ثابت ہوتا ہے تو اصل شرع کے بانی اور حامل کے حالات کو مرفوع القلم کر دینا تو گویا اپنی شریعت کے ثبوت فرعینہ ہونے کو ناقص اور مشتبہ چھوڑ دینا ہے۔ دعوی اتحاد کے ساتھ یہ ضرور تھا کہ حضرت ابراہیم کی تعلیم وارشاد کے ساتھ آنحضرت صلعم کی تبلیغ رسالت کے احکام واغراض کو بالکل متحد اور متصل ثابت کر دیتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور یہ نقص حالات جناب ابراہیمؑ کی فروگذاشت کے باعث باقی اور قائم رہ گیا۔ صاحب ارض القرآن تو اس کے لئے یہ معذرت پیش کر بھی سکتے ہیں کہ ان کے موضوع تالیف کو اس کی تفصیل سے اس قدر تعلق نہیں تھا۔ مگر شبلی صاحب اپنی کوتہ قلمی کی کوئی تلافی نہیں کر سکتے۔

اس ضرورت خاص کو مدنظر رکھ کر ہم نے اپنی کتاب میں جناب ابراہیم علیہ السلام کے تمام وکمال حالات پوری تفصیل سے قلمبند

کئے ہیں اور ہم اس مقام پر اپنے معاصر مؤلفین کی ترتیب تالیف سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص طریقۂ تدوین سے کام لیتے ہیں۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ و آلہ سلام اللہ

خلیل خدا۔ ابوالانبیا۔ حضرت ابراہیم علیہ التحیہ والثنا۔ تارخ ابن ناحور کے صاحبزادے تھے۔ یہ تارخ وہی ہیں جن کو تورات میں ترح لکھا ہے۔ تارخ غالباً ترح کا معرب ہے۔ ماں کا نام نوناتب کر بیناہ ابن کوش ہے۔ (ابن سعد ج ا ص 21) سلسلہ نسب گیارہویں پشت میں اس تفصیل سے حضرت نوح تک پہنچتا ہے کہ حضرت ابراہیم بن تارخ ابن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عبیر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔

مقام ولادت علاقہ بابل میں قریہ کوش بتلایا جاتا ہے۔ حاکم وقت نمرود ابن کنعان ابن کوش تھا۔ عرب کے علاقہ میں عوف ابن فاران حکمران تھا۔ نمرود اور اس کی ماتحتی رعایا کے حالات جہاں تک تاریخوں سے بقدر امکان دریافت کئے گئے ہیں۔ بتلا رہے ہیں کہ اس زمانہ میں علاقہ بابل کے تمام اقوام وقبائل انواع واقسام کے اصنام واوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ خدا پرستی اور اس کی ذات واحد کی وجود کا کوئی خیال ان میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے نفوس کو اپنے تمام مال ومتاع کے ساتھ بتوں کا مطیع ومنقاد سمجھتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کو رب العباد۔ بت پرستی کے ساتھ ستارہ پرستی اور شخص پرستی بھی ان کے اجزائے ایمان میں داخل تھی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی ولادت بھی خاص طور پر کرشمہ قدرت ثابت ہوتی ہے۔ ولادت باسعادت کے متعلق اس زمانہ کے کاہنوں اور نجومیوں کا نمرود کو خبر کرنا۔ اور نمرود کا امتناع ولادت کے متعلق تمام انسانی اور امکانی کوششیں صرف کرنا اور ناکامیاب رہنا عرب کی تمام چھوٹی بڑی تاریخوں میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ ہم ان کو باعث طوالت اور زاید از ضرورت سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں اور آپ کے حالات کو ایام طفولیت کے واقعات وحالات سے آغاز کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خداشناسی اور معرفت کے ابتدائی حالات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جس فکر۔ جس تلاش اور جس تحقیق سے اس خاصۂ خدا نے۔ خدا کا وجود۔ اس کی معرفت اور اس کی ذات کی خالص وحدت حاصل فرمائی۔ وہ افرنیش عالم کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک اپنی آپ مثال ثابت ہوتی ہے۔ اخبار واسفار قدیمہ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ حقیقتاً حضرت ابراہیمؑ کو اپنے زمانہ میں اس کی بڑی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ کیونکہ حضرت نوحؑ کی رسالت کے بعد۔ انبیائے اولی العزم کی مقدس فہرست میں کاتبین قدرت نے آپ ہی کا اسم گرامی لکھا تھا۔ حضرت نوحؑ کی رسالت باوجود اتنی طوالت کے وجود خدا اور اس کی وحدانیت کی تعلیم میں مشکل سے کامیاب ہوئی۔ ہزار سالہ تعلیم ومواعظ کے بعد مومنین اور خدا کے معتقدین کی تعداد 80 نفوس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ حضرت نوحؑ کے بعد ان مومنین خالصین کی جماعت قوم کافرین پر اپنی تعلیم کا کوئی اثر نہ پہنچا سکی اور کیونکر پہنچا سکتی تھی۔ جب حضرت نوح کے ذاتی پند ونصائح خود اپنے اہل وعیال پر اپنی تعلیم کا اثر نہ ڈال سکے تو ان غربائے مومنین کے ارشاد وہدایت کو کون سنتا ہے۔ جو حقیقتاً خدا کی

طرف سے درجہ نبوت یا منصب رسالت پر فائز بھی نہیں تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت نوحؑ کی وفات سے جناب ابراہیمؑ کی ولادت تک کے درمیانی زمانہ میں دنیا پر کفر وفسق کی گھٹاٹوپ تیرگی چھا گئی۔خدا کی وحدانیت کیسی۔اس کے وجود اس کی معرفت کا خیال ہی نسیاًمنسیاً ہو گیا تھا۔ایسی عام تاریکی اور عالمگیر ظلمت کے زمانہ میں نظام مشیت نے سواد عالم کے مختلف حصوں میں اپنی وحدانیت کا نور اور اپنی معرفت کی عالم تاب شعاعیں اپنے ایک خالص اور کامل بندے کے ذریعہ سے پھیلائیں اودور دور تک پہنچائیں۔جو اپنی ذاتی تلاش اپنی تنہا فکر اور اپنے خاص قلبی خلوص سے اس کی کامل معرفت حاصل کر چکا تھایقال لہ ابر اھیم اس کو ابراہیم (علیہ السلام) کہتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی تحقیق معرفت اور تحصیل علوم الٰہیات کے حالات پر اطلاع رکھنے والے حضرات آپ کے استغراق فی المعرفۃ اور اس ریاضت ومشقت کے واقعات کو پورے طور سے اجتنے ہیں۔جو اس راہِ عرفان کے مجاہد اور کامل موحد کو اپنے معبود حقیقی اور اس کے وجود وحدت کی تلاش میں برسوں پیش آیا کئے ہیں۔اوران کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت انبیاء کے اصول معارف کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی مقدس طبیعت طفولیت کے وقت سے خاموش،خلوت پسند،تارک العلائق اور غور وفکر میں ہمیشہ ڈوبے رہتے تھے حضرت ابراہیمؑ کا خاندان ہمیشہ سے معزز تھا اور مقرب شاہی۔باپ (تارخ) خزانہ شاہی کے کلید بردار تھے۔اور نمرود کے دربار شاہی میں بڑے صاحب اقتدار (مواہب۔لدنیہ۔حیات القلوب) آذر چچا تھے۔بہت بڑے دستکار اور شاہی بت تراش۔بدقسمتی سے ان کی صنعت ودستکاری بت تراشی اور صنم سازی ہی تک محدود تھی۔آذر نے اپنے اس کام کے لئے اپنے مکان کا ایک حصہ خاص طور پر علیحدہ کرلیا تھا۔جس میں بیٹھ کر وہ انواع واقسام کی مورتیں اور مصنوعی خداؤں کی مختلف الاوضاع صورتیں بنایا کرتے تھے۔

قدرت کے عجیب وغریب نظام نے اپنے خالص موحد اور کامل مصدق کو اسی گھر میں پیدا کیا۔جہاں دن رات ان کے عقاید وفاسد کے اصول عقاید پر نشوونما پاتی۔مگر نہیں۔یہاں تو نظام مشیت کو۔یعرف الاشیاء باضدادھا (اشیاء عالم کی معرفت علی الاکثر ان کی ضد سے حاصل ہوتی ہے) کے اصول مسلمہ کے مطابق۔بت تراشی کی اس صنعت گاہ کو اپنی یکتائی اور وحدانیت کی جلوہ گاہ بنانا تھا اور دنیا کو اپنی جبروت قدرت کا ثبوت دکھلانا تھا۔اس لئے اس نے اپنے اس موحد اور بت شکن پیغمبر کو خاص کر اسی گھر میں پیدا کیا جہاں بت اور بت پرستی کے اوزار بنا کرتے تھے۔

تمہیداً اتنا لکھ کر ہم اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہیں۔اوپر بتلایا گیا ہے کہ آغاز طفولیت سے خاموشی استغراق اور محویت کی حضرت ابراہیمؑ کو عادت تھی۔اسی طرح آغاز عمر سے ان پتھروں کے ٹکڑوں سے نفرت جس کی وجہ سوائے تصرف قدرت اور ودیعت مشیت کے کچھ اور نہیں بتلائی جاسکتی۔اور اسی کی بنا پر جیسا کہ عرب کی تمام قدیم وجدید اخبار وآثار بتلاتے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ اپنے چچا کی اس صنعت ودستکاری کو ذلت وخواری کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے اور جب کبھی موقع اور وقت پاتے تھے۔تو اپنے چچا کے اس ریاض۔مشقت اور صنعت کو خراب کردیا کرتے تھے۔اور مورتوں کی بنی بنائی صورتوں کو کسی کی آنکھ۔کسی کی ناک۔کسی کے کان توڑ کر بگاڑ دیا کرتے تھے۔

حقیقت شناس حضرات عام وخاص طبیعتوں کی تفریق وتخصیص کے مسئلہ کو یہیں سے سمجھ جائیں۔معمول کے مطابق عام بچے اوران

کی طبیعتیں۔فطرتاً جس قدر کھلونوں اور مورتوں کی شائق اور گرویدہ ہوتی ہیں۔اس سے ہر شخص بخوبی واقف ہے مگر بخلاف اس کے یہ بچہ سہواً اور اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً اور مستعداً۔ان کھلونوں اور مورتوں کو توڑ دیتا ہے۔گویا اس کی طبیعت کو عام بچوں کی فطرت کے بالکل برعکس ان اشیاء سے کوئی دلچسپی اور شغف نہیں ہے۔بلکہ ان کی جگہ خاص نفرت ہے اور کراہت۔اس سے ہر ممیز اور محقق شخص نتیجہ نکال لے گا کہ خاصان الٰہی کی طبیعتیں بھی خاص ہوتی ہیں اور عام کی عام۔

آ ذر نے پہلے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔مگر دو ایک دن کے بعد انھیں حقیقت حال معلوم ہوگئی کہ یہ ابراہیمؑ کے ہاتھوں کی صفائی ہے محبت کے تقاضہ نے زیادہ زجر وتوبیخ کی اجازت نہیں دی۔مگر ہاں اتنی احتیاط اختیار کرنے کی مجبوری البتہ ہوگئی کہ باہر جانے کے وقت دروازہ بند کر دیتے تھے۔مگر اس پر بھی جب کبھی عجلت میں باہر جاتے وقت دروازہ بند کرنا بھول جاتے تھے تو یہ بچہ جس کی گھٹی میں دایہ فطرت نے بت شکنی کے اجزا ودیعت فرمائے تھے۔ان تمام بتوں کو مسمار اور بیکار کر دیتا تھا۔آ ذر دیکھتے تھے کچھ اپنی محبت، کچھ بھائی کی مروت اور کچھ اس بچہ کی رعایت کی وجہ سے خاموش رہ جایا کرتے تھے۔اور بچہ کی ان حرکتوں کو اس کی طفولیت کا تقاضا سمجھا کرتے تھے۔

تھوڑے دنوں کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ سن رشد وتمیز تک پہنچے تو آ ذر نے۔خدا کی شان۔اس حقیقی بت شکن سے بت فروشی کی خدمت لینی چاہی۔آ ذر اپنی شامت اعمالی سے اس کاروبار کا مدت سے بیوپار کرتے تھے۔نفیس صنعتوں اور تحفہ دستکاریوں والے بت تو آپ بیچنے کے لئے جایا کرتے تھے۔اور معمولی بتوں کی فروخت کے لئے انھیں بے حد بیچ دیا کرتے تھے۔عرب کی قدیم تاریخوں میں اس وقت کے بعض واقعات حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں آج تک محفوظ پائے جاتے ہیں۔اور وہ اس طرح مذکور ومشہور ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ان بتوں کے پاؤں میں رسیاں باندھ کر ان کو زمین پر گھسیٹتے لے جایا کرتے تھے اور فرماتے جاتے تھے ایشترون شیأ لا ینفع ولا یضر۔کیا کوئی ایسی چیزوں کو مول لے گا جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ ضرر کبھی ان سنگین مجسموں کو گھسیٹ کر دریا یا چشمہ کے قریب لاتے تھے اور زمین پر رکھ کر ان سے کہتے تھے اشرب لو کان یقدر اگر تم میں قدرت ہوتو پانی پی لو۔روضہ الاحباب باساومواہب وروضۃ الصفاج 2 بانباو حافظ و دنیوری اور حیات القلوب مجلسی ج اول۔

ان واقعات پر اکثر بزرگوار معمولی اخبار۔مقامی روایت اور اکثر افسانہ وداستان کا حکم لگا کر ان باتوں کو توجہ اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھتے۔حالانکہ وہ اگر ذرا سی غور وخوص سے کام لیں تو ان کی اصلیت کا ان کے قلوب پر پورا انکشاف ہوجائے۔قدرت نے اس موحد الٰہی کی طبیعت میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔بت پرستی سے نفرت۔معرفت وخدا شناسی سے خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔فطرت انسانی کے اصول ارتقا کے مطابق جیسے جیسے ان کے سن وسال میں ترقی ہوتی گئی۔یہ جو ہر بھی ویسے ویسے قوت پکڑتے گئے اور بڑھتے گئے۔ان کی طفولیت کا زمانہ رشد وتمیز کے حدود تک آ پہنچا تھا۔اور اس خاصہ خدا کی محقق اور متلاشی طبیعت اپنے مدعائے تحقیق کو ہر پہلو اور ہر طریقہ سے اپنی خاص فکر وتلاش کے ساتھ آپ سمجھنا چاہتی تھی۔اس ضرورت وامتحان کی بنا پر کبھی ان پتھروں کے لاوجود او بے مقدار ٹکڑوں کو۔جن میں ہر قسم کی قوت وقدرت مشہور کی جاتی تھی۔اس ذلت وحقارت سے زمین پر گھسیٹ گھسیٹ کر آزمایا جاتا تھا کہ اگر واقعہ وہ پتھر کے مجسمے کسی قوت یا قدرت کے پیکر ہیں تو اپنی اہانت کرنے والوں سے اٹھ کر دست وگریباں ہوں گے۔یا بدلہ لیں گے یا کم

سے کم انھیں کوئی جسمانی یا روحانی آزار پہنچا ئیں گے۔ اور کبھی ان کے قوائے روحانی کی جگہ ان کے مصنوعی اعضائے جسمانی کے احساس اوران کے وجود اور عملی قوت وامکان کا امتحان لیا جا تا تھا کہ پانی کے کنارہ لا کر رکھے جاتے تھے اور آزمایا جاتا تھا کہ ان کے ظاہری لب و دہاں میں اگر اتنی قوت وامکان ہے تو وہ پانی پی کے دکھلا دیں۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے یہ تمام افعال واحوال آپ کے اسی امتحان اور قلبی اطمینان کی غرض خاص پر مبنی تھے۔ جو آپ کی تحصیل معرفت کا دیباچہ ثابت ہوتے ہیں۔ اور جن کا ذکر قرآن مجید کے متواتر مقامات میں مذکور ہے اور جو آپ کی حیات ستودہ آیات میں آپ کی تحصیل معرفت۔ تحقیق توحید کے اصلی اور حقیقی معیار قائم ہوتے ہیں۔ ہم ان کو علیٰحدہ علیٰحدہ اپنے اپنے مقام پر اپنے سلسلہ بیان میں پوری تفصیل کے ساتھ بہت جلد بیان کریں گے۔ جب آپ کے ان ابتدائی حالات واقعات کا پورا تعلق آپ کے ان اصلی اور حقیقی معیار سے ملحق ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں داخل ہے۔ تو باوجود اس کے کہ ان کے محالات عقلی یا عادی ہونے پر بھی کوئی وجہ یا دلیل قائم نہیں کی جا سکتی تو پھر ان کو معمولی اخبار۔ مقامی روایات اور افسانہ وداستان ٹھہرانا۔ بے عقلی کا انکار اور ناحق کا اصرار ہے۔

اپنے گھر کی گلہ بانی

قوم کے خداؤں کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے یہ اہانت خیز حرکات عام شکایت کے باعث ہوئے تو لوگوں نے آذر کو حضرت ابراہیمؑ کی تنبیہ وتادیب کی طرف توجہ دلائی۔ آذر نے ابراہیم سے یہ خدمت لینی موقوف کر دی اور اس ترکیب سے عام شکایت کا دروازہ بند کر دیا۔ مگر آذر نے یہ تو کر دیا اور گو یا باہر کی توہینِ اصنام سے ابراہیم کو روک دیا۔ مگر اس سے گھر کے اندر جوان بتوں کی ذلت وخرابی ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے آئے گئے دن ہوا کرتی تھی اس کی اصلاح کیسے ہوسکتی تھی۔ آذر نے بال آخر یہ تجویز ٹھہرائی کہ ان کو گھر کی دنبیاں چرانے کی خدمت سپرد کر دی اور تارح نے بھی یہ دیکھ کر ابراہیمؑ کا سن ان اقسام کے خانگی کاموں کے قابل ہو گیا ہے۔ اس تجویز سے اتفاق کر لیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو گھر کی دنبیاں سپرد کر دیں۔ اسوقت سے گویا اس ساعی میدانِ عرفاں اور داعی قوم انسان نے تحصیل معرفت الٰہیہ اور تحقیق وجود لامتناہیہ میں اپنی عملی کوششوں کا پورا موقع پایا۔

چونکہ یہ خدمت خاص انبیا ومرسلین کی سیرت کا جز وقدیم ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کو ایسے پیغمبر اولی العزم کی رسالت کا بھی اس کو دیباچہ تسلیم کرنا ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نہایت مسرت سے اس خدمت کو قبول کر لیا۔ گھر کی دنبیوں کے گلہ کو لے کر آبادی سے دور پہاڑ کے دامن اور صحرا کے کھلے میدانوں میں لے گے۔ یہ مقامات گھر سے زیادہ آپ کی دلچسپی۔ دل بستگی اور روحانی فرحت کے باعث ہوئی۔ کیونکہ آپ کی خلوت پسند طبیعت کو خدائے سبحانہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدت وقدرت کے متعلق پورے اطمینان وفراغت سے غور وخوض کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا مقام اور موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ان حالات وواقعات پر غور کرنے سے ان مشغلہ خاص میں آپ کا یہ روزانہ دستور العمل معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سویرے سے دنبیوں کو دمن کوہ یا بطن وادی میں لا کر چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ اور خود کسی غار میں بیٹھ کر یا کسی پتھر کی چٹان سے لگ کر یا اس صحرائے ناپید کنارے کے کسی گوشہ میں جا کر معبود حقیقی کے وجود اور اس کی وحدت کے مسئلہ میں دن بھر سوچتے، سمجھتے اور غور کرتے رہتے وہ میدان ہوتا تھا اور یہ متلاشی عرفان۔

اکثر اوقات پہاڑوں اوران کی گھاٹیوں میں اس معرفت الٰہی کے شیدائی کو اپنی فکر و تلاش میں پورے پورے دن گذر جاتے تھے۔ اور محویت کے اسی وجدانی عالم میں اس سرگشتۂ عرفاں کو اپنے سرو پا کی مطلق خبر نہیں رہتی تھی۔ سرمبارک زانوے فکر پر جھکا رہتا تھا۔ حق میں آنکھیں تصور اور اغراق کے عالم خاص میں کبھی کھلی کبھی چھپی تھیں۔ تحقیق وجود اور تصدیق توحید کے مسئلہ پر پیش نظر تھے فطرت انسانی اور جذبات روحانی کے معارضے اور مجادلے سامنے تھے۔ یہ تنہا اور سنسان میدان۔ دشت وصحرا کا وسیع ریگستان پہاڑوں کے دامن۔ گھاٹیوں کے گوشہ عافیت۔ غاروں کی خلوت کے قدرتی منظر اس مجاہد فی سبیل اللہ کی دلچسپیوں کے لئے کافی تھے۔ یہ وہی سامان تھے اور اسباب۔ جس کو رب الارباب ازلی نے ان کی تعلیم وہدایت۔ تسکین واطمینان اور تحقیق وامتحان کی غرض سے خاص طور پر فراہم فرمادیئے تھے۔ دنبیوں کو اپنے اذوقہ اور چارے کی تلاش تھی اور ابراہیم کو نور معرفت کے نظارے کی۔

دن بھر اسی عالم وکیفیت میں اس شیفتہ حقیقت کو گذرتا تھا۔ رات ہوتی تھی تو دنبیوں کو گھر لاتے تھے۔ مگر گھر آنے پر بھی دن بھر کی محویت۔ اس کی کیفیت اور اس کے جذبات آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے نہیں تھے۔ خوابگاہ استراحت بھی اسی تلاش وسعی کی جولانگاہ بن جاتی تھی اور تمام رات شاہد حقیقی کی جستجو اور خیال میں کٹ جاتی تھی۔

جناب ابراہیمؑ کے ایام طفولیت اسی مشق وریاضت میں تمام ہوگئے۔ اور اب شباب کا زمانہ شروع ہوگیا جیسے جیسے سن میں ترقی ہوتی تھی اور قوائے جسمانی بڑھتے تھے۔ ویسے ویسے احساس وادراک عرفانی قوی اور مستحکم ہوتے جاتے تھے اور اصول نمو کے مطابق ان کی کیفیت اور اہمیت میں یوماً فیوماً بڑھتی جاتی تھی۔ منتظمان قدرت اور مدبران مشیت نے ان قدرتی مناظر اور ان کے سامانوں کو ان کی تعلیم و ہدایت۔ تحقیق وتصدیق میں پوری کامیابی کے لئے از حد مفید اور ضروری قرار دے لیا تھا اور یہ پراثر دلچسپیاں بھی آپ کی فطرت صالح اور طبع مقدسہ کے مطابق اور بالکل موافق ثابت ہوئی تھیں۔ اس لئے اس خدا کے شیدائی اور اس کی یکتائی کے عاشق صادق کو ان ویران مقامات اور سنسان خرابات کے مقابلہ میں نہ گھر کی راحت پسند تھی اور نہ گھر والوں کی معاشرت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے سن تمیز پر پہنچ کر۔ شب کو گھر میں واپس آنے کا معمول بھی ترک کردیا گیا۔ اور گھر میں کئی کئی دن تک آپ کی صورت پر کسی کی نظر بھی نہیں پڑتی تھی۔ جوان ہوہی چکے تھے۔ ہر قسم کی تمیز ہر قسم کی سمجھ آہی چکی تھی۔ اس لئے گھر والوں کو آپ کے آنے یا نہ آنے پر کسی خاص اضطراب واندیشہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب تک سنِ کم تھا۔ تلاش وتحقیق کی مشق وریاضت بھی کم تھی اور معلمان قدرت بھی سن کے اعتبار سے اس متعلم الٰہی پر تحصیل معرفت کا زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ جوں جوں سن بڑھتا گیا۔ مشق وریاضت بھی بڑھتی گئی۔ سن شباب پر پہنچ گئے تو تحصیل معرفت بھی حدود تکمیل تک پہنچ گئی۔ خدا کی یکتائی اور اس کی شناسائی کے پیچیدہ اور اہم ترین مسائل پر غور وخوض کی ضرورت ہوئی۔ ان کے رموز وغموض ایسے نہیں تھے۔ جو گھنٹہ دو گھنٹے یا ایک شبانہ روز کی تلاش وتحقیق میں حل ہوجاتے ان کے لئے بہت زیادہ اور وسیع وقت درکار تھا اور بڑے غور کی ضرورت تھی اور گہری فکر وخوض کی حاجت چونکہ اس جوان صالح کے تمام قوائے مدرکہ ان معلومات ومحسوسات کے لئے کامل طور سے موزوں اور تیار ہوچکے تھے۔ اور تعلیم یزدانی جذبات روحانی کے ذریعوں سے تحریک وتائید پہنچانے کے لئے ہمہ دم معین ومددگار تھی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے گھر کا رہنا ترک کرکے زیادہ تر پہاڑوں اور صحراؤں میں رہنا اختیار کیا۔ دنبیوں کا چرانا اور گلہ بانی ان کے

لئے نظام قدرت کا ایک ظاہری حیلہ تھا۔ جو آخر میں تحصیل معرفت اور تفویض رسالت کا اصلی وسیلہ ثابت ہوا۔

شاہد معرفت کی پہلی جلوہ آرائی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سنِ مبارک پچیس برس کا ہو چکا ہے۔ ایک بار اسی محویت اور وجدانی کیفیت کے خاص عالم میں مسائل معرفت میں غور فرما رہے ہیں۔ کئی دن ہو چکے ہیں کہ گھر کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ خور دونوش بالکل فراموش۔ نہ سونے کا خیال نہ آرام لینے کا ہوش بقائے روح کی ضرورت سے جنگل کے پھلوں اور چشموں کے پانی پر بسر ہوتی ہے۔ جس جگہ بیٹھے ہیں وہیں بیٹھے ہیں۔ جس مقام پر محوفکر ہیں وہیں کے ہو رہے ہیں۔ ایسا عدیم المثال استقلال ہے اور استحکام۔ ایسی قوی محویت ہے اور استغراق کہ دنیا کی کوئی خواہش کوئی تعلق اسے جنبش اور لغزش میں نہیں لاسکتا۔ محویت کے اسی عالم میں کئی دن گذر چکے ہیں اور آج کا دن بھی بلا تصفیہ تمام ہو رہا ہے آفتاب غروب ہو رہا ہے آسمان کے بے شمار ستارے اس کھلے میدان اور صاف وشفاف ریگستان میں اپنی روشنی پھیلاتے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر معرفت الٰہی کے اس شیدائی کو اپنی محویت میں کسی کی بھی خبر نہیں۔ وہ زانوے فکر پر سر غور جھکائے جہاں بیٹھا ہے وہاں بیٹھا ہے۔ یہاں تک کہ رات کا حصہ زیادہ آ گیا۔ مگر اس کی محویت میں کمی نہ آئی۔ خدا خدا کر کے اس متلاشی نور معرفت کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے ادھر اوپر اٹھیں ادھر معلمان قدرت اور منتظمان مشیت کو اس سرگشتہ معرفت کی ہدایت کا نہایت آسان اور سہل ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ نظر اٹھاتے ہی خدا کے اس عاشق صادق نے ایک اختر تاباں اور کوکب درخشاں کو نہایت آب وتاب سے آسمان پر چمکتا دیکھا اور شاہد معرفت کی جلوہ نمائیوں کی محویت اور کمال اشتیاق میں اس کی ضیا نمائی کو انوار حقیقت کی جلوہ آرائی سمجھا اور بیساختگی کے غیر متحمل عالم میں ھذا ربی پکار اٹھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی چمک دمک مدہم پڑ گئی۔ اور اس متلاشی حقیقت کو اپنی اس بے ساختگی کی مبادرت کا فوراً خیال آ گیا۔ اور زوال وانقلاب کو وجود ازلی اور نور ابدی کے منافی ومناقص پا کر اسی وقت اپنی مبادرت بے جا یاد آئی اور فوراً انی لا احب الافلین کہہ کر اس جرم فلکی کی بے حقیقتی کا اظہار اور وجود حقیقت کے غیر متغیر ازلیت اور ابدیت کا اقرار فرمایا۔

اس تدبیر سے ممتحانِ قدرت نے اول بار اپنے وجود معرفت کے اس متجسس کی اس حیرت انگیز طریقہ سے آزمائش کی اور اس کو کامل پایا۔ ان سامانوں کو دیکھ کر اصول عرفاں اور وجود یزداں کا یہ متلاشی اور محقق اپنے اس کلیہ کے زوال پذیر وجود ازلی اور ابدی نہیں ہوسکتا اپنا قلبی اطمینان فرما کر پھر اپنی اسی حالت محویت میں محو ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر نظر اٹھاتا ہے تو ماہتاب کو اپنے پورے کمال کے ساتھ چاروں طرف روشنی پھیلاتا ہوا پاتا ہے اور اس کی صاف وشفاف روشنی کے مقابلہ میں چھوٹے چھوٹے تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی بالکل مدہم نظر آتی ہے یہ سماں اور اس کے سامان دیکھ کر اس مبتلائے شوق معرفت کے دل پر پھر وہی کیفیت طاری اور لب وزبان پر ھذا ربی کی پھر وہی عبارت جاری ہوتی ہے۔ چشم زدن میں ماہتاب بھی اپنے شرف کی منزلیں طے کر کے آہستہ آہستہ اپنی روشنی میں کمی پیدا کرنے لگا۔ یہ تغیر پذیر حالت دیکھ کر پھر ان کے دل میں معبود حقیقی کی معرفت جوش زن ہوئی اور اب کی بار اس محقق عرفان نے اصول حجت کی جگہ درگاہ رب العزت میں اپنی ہدایت کی مسئلت ان الفاظ میں فرمائی لم یھدنی ربی لا اکونن من القوم الضالین اگر میرا پروردگار مجھ کو راہ ہدایت نہ دکھلائے گا تو (کہیں میں بھی تو) نہ گمراہوں کی قوم میں ہو جاؤں۔ بارگاہ الٰہی میں یہ استغاثہ پیش فرما کر آپ نے پھر اطمینان

قلب فرمالیا اسی واقعہ سے انسان اپنے تمام کمالات عقلی کی بساط وحیثیت کا اندازہ کرلے۔ عام اس سے کہ اس کی عقل کے جوہر اس کی فکرو تلاش کے کمال۔ ترقی کے انتہائی درجہ تک نہ پہنچے ہوں مگر تاہم وہ قادر مطلق کی غیر مرئی تائید وتوفیق کا ہر حال میں محتاج بنا رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سالہا سال کی تحقیق اور شبانہ روز کی فکر وتلاش۔ قدرت کے امتحان کے وقت لغزشہائے بشری سے آمیز ہوجاتی تھی۔ مگر آپ کی فطرت صالحہ خدا کی توفیق وتائید ان کی فوراً اصلاح کردیتی تھی جس کا اعتراف واقرار اس پیغمبر برحق کی زبانی ابھی ابھی اوپر لکھا جاچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بشریت کو اپنی تلاش حقیقت میں خبط کرتے ہوئے دیکھ کر آخر میں ضلالت وگمراہی سے محفوظ رہنے کے لئے خدائے یکتا سے دعا کی اور سوائے اس کے اپنی ہدایت اور تحصیل معرفت کا کوئی دوسرا وسیلہ اور ذریعہ نہیں پایا۔ یہ بھی اس خاصۂ ربانی کی کامل الایمانی ہے اور کمال خدا وانی۔

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس امتحان ثانی کے وقت بھی پوری کامرانی حاصل ہوئی۔ ماہتاب پروجود رب الارباب کا کچھ یونہی سادھوکا ہوگیا تھا۔ وہ بھی آپ کے اس قلبی اضطراب اور فوری جذبات کے باعث سے تھا جو حصول معرفت کے لاانتہا اشتیاق وتمنا کی شدت میں آپ کے قلب نورانی پر مستولی ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ ماہتاب بھی غروب ہوگیا اور یہ عالم بھی آپ کے دل سے زائل ہوگیا۔ فضائے عالم میں ماہتاب کے ڈوب جانے کے بعد چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ ستاروں کی دھیمی روشنی اس کی کوئی اصلاح نہ کرسکی۔ خدا کا وہ سچا متلاشی اور اس کے وجود کا حقیقی جویا انقلابات وتغیرات کے یہ منظر۔ یخرج الظلمت من النور و یخرج النور الی الظلمت کے گونا گوں عالم دیکھتا رہا۔ سمجھتا اور ان پر نہایت تحقیق سے غور کرتا رہا اس محویت۔ خاموشی اور خود فراموشی کے عالم میں اتنا عرصہ ہوگیا کہ رات کا باقی حصہ تمام ہوکر صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ تاروں کی رہی سہی روشنی اور بھی دھیمی پڑنے لگی۔ نسیم سحر کی سبک خیز مروجہ جنباتی شروع ہوگئی۔ درختوں پر جانور بولنے لگے۔ صبح کا سپیدا پھیل چلا اور رفتہ رفتہ تمام دنیا روشن ہوگئی۔ اسی عالم میں معرفت الٰہی کا یہ شب زندہ دار بھی اپنی محویت سے بیدار رہا۔ سر اٹھایا تو آفتاب عالمتاب کو سامنے پایا بشریت کا قیاس۔ فطرت انسانی کا وسواس آگے آیا۔ اور اس حد سے زیادہ روشن اور سب سے بڑے اور عظیم الشان جرم فلکی کی اہمیت وعظمت پر قیاس کرکے اس کی زبان سے ھذا ربی ھذا ا کبر کا فقرہ نکلا۔ مگر دوپہر ہوتے ہی اس کی تیزی بھی مدہم پڑگئی۔ وہ حرارت۔ تمازت اور وہ آب وتاب بالکل جاتی رہی۔ اس محقق ربانی کو پھر اپنی تحقیق کی خامی اور حصول معرفت میں اپنی ناکامی کا پورا یقین ہوگیا۔ اور ایسا یقین کامل کہ دل سے وسواس وقیاس کے تمام خطور جاتے رہے۔ آنکھوں کے سامنے سے مجاز کے حجاب اٹھ گئے۔ شاہد حقیقت کے نور نے اپنا جلوہ دکھلایا۔ معرفت کی تحقیق کامل ہوگئی۔ اور خدا کے وجود وحدت کی تصدیق حاصل۔ چونکہ اس شیفتۂ حقیقت کو اجرام فلکی کے عارضی اور مجازی انوار بار بار دھوکے میں ڈالتے تھے۔ اور پتھروں کے اصنام کے ساتھ ہی ساتھ ملک وقوم میں اجرام فلکی کی پرستش بھی بڑے زوروں سے جاری تھی۔ اس لئے خدا واحد کے اس اصلی مصدق نے اپنی تصدیق وتحقیق کے کامل ہوجانے کے بعد اپنے بے جا قیاس کی تردید وتنسیخ میں جو پہلا کلمہ اپنی زبان سے نکالا۔ وہ حقیقت میں گمراہان قوم ہی کی طرف خطاب اصلی تھا جو ان اوہام وقیاسات کے اعتبار پر ان اجرام کو اپنا معبود سمجھ کر پوج رہے تھے۔ جو کلمہ تمام قوم کی تعریض میں ارشاد ہوا تھا وہ یہ ہے۔ یقوم انی بری مما تشرکون۔ اے قوم کے لوگ! تم لوگ جو

شرک کے کام کرر ہے ہو۔ میں اس سے بالکل بری الذمہ ہوں۔اگر چہ حضرت ابراہیمؑ کی فطرت صالحہ قوم کے ان ناپاک اعمال وافعال سے ہمیشہ سے متنفر تھی۔مگر جیسا کہ ابھی ابھی مذکورۂ بالاصورت واقعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ قوم وملک کے اس گمراہانہ اور مشرکانہ رسم ورواج نے آپ کے عین تحقیق معرفت کے موقع پر بار بار حائل ہو کر اشتباہ وشکوک پیدا کرنا چاہا تھا۔مگر آپ کی فطرت نے کوئی معمولی فطرت تھی اور نہ آپ کی طبیعت کوئی عامیانہ طبیعت۔صانع عالم نے عالم وجود ہی سے آپ کی طبع مقدسہ کو فطرت صالحہ کے اصول واجزا سے مصنوع و مرتب فرمایا تھا اور آپ کی طبیعت میں تقدیس۔نیز یہ اتقا اور اصطفا کے تمام بیش بہا جو ہر بدر خلقت کے وقت ہی سے ودیعت فرمائے تھے۔اس بنا پر بشریت کے اس ناگزیر اور عارضی اشتباہ اور قاصر عن الانفصال احوال ومواقع پر تائید ربانی اور توفیق یزدانی نے۔مختصر سے امتحان اور تھوڑی سی آزمائش کے بعد اپنے اس برگزیدۂ بارگاہ کی پوری رہنمائی کر دی۔اور پھر چشم زدن میں اس کے کمال تحقیق اور غایت تصدیق میں ایسا ابدی استقلال واستحکام عنایت فرمایا کہ اس کامل المعرفت نے بارگاہ رب العزت میں اس کی عظمت و جلال کا اعتراف اور اپنی عبودیت کا اقرار ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ

ترجمہ۔میں نے تو ایک ہی کا ہو کر اپنا رخ اس ذات پاک کی طرف کر لیا ہے۔جس نے آسمان وزمین کو بنایا ہے۔اور میں تو مشرکوں میں سے (کبھی) نہیں ہوں۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت اور خداشناسی کے واقعات دنیا کے کارنامے میں اپنی آپ مثال ہیں۔ یہی وہ واقعات ہیں جن سے ہمارے مذکورۂ بالا دعویٰ کا ثبوت کامل ملتا ہے۔اس خدارسیدہ بزرگ نے اپنے پروردگار کی یکتائی اور اس کی بارگاہ تک اپنی رسائی پانے میں بار بار امتحان وآزمائش کی مصیبتیں اٹھائیں۔بشریت وروحانیت کے تمام دشوار گذار مراحل ومسالک طے فرمائے۔عقل سلیم اور نفس غیر مستقیم کے روزانہ مجادلات ومطالبات فیصل فرمائے قلب کے نورانی اقتباسات اور روحانی جذبات کو نانی وساوس وقیاسات سے کبھی مغلوب نہ ہونے دیا۔اشتباہ واوہام کی تیرگی کو اپنے دل میں انوار حقیقت کے پاس آنے کی اجازت نہیں دی۔ طبیعت کے معمولانہ انداز کو برابر روکا فطرت صالحہ کی ہدایت وارشاد کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنایا۔وجود الٰہی کی تصدیق کی اور اس کی وحدت کی تحقیق معبود حقیقی کی تلاش وجستجو اپنی حیات ووجود کا اصلی مدعا سمجھا۔آغاز طفولیت سے لے کر شباب کا پورا زمانہ آ گیا۔مگر اتنی مدت میں ایک لحظہ کے لئے بھی یہ تلاش وخیال کبھی اپنے قلب نورانی سے نہیں نکالا۔بال آخر سبیل معارف کے اس مجاہد کی روزانہ کوشش اور کدوکاش نے اس کو ایسا کامل عارف باللہ اور حقیقت آگاہ بنایا جس نے تمام اقطاع میں اپنے فیضان ہدایت اور انوار ارشاد سے معرفت الٰہی کی روشنی پہنچائی۔ایسا قدسی نفس حقانیت کا متلاشی۔وحدانیت کا جویا۔جو ابتلا وامتحان کے ہر موقع پر کامیاب وکامراں رہ کر اپنی صادق الایمانی اور کامل الاعتقادی ثابت کر چکا ہو۔کیونکر اپنی آپ مثال اور اپنی آپ نظیر نہیں تسلیم کیا جائے گا۔جناب ابراہیم علیہ السلام کے واقعات حیات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ کی عمر کا تمام زمانہ ارض بابل سے ہجرت فرمانے اور شام ومصر وکنعان میں قیام رکھنے کی مدت تک خصوصاً تحقیق عرفان اور تصدیق ایمان کے معارض امتحان میں صرف ہو گیا ہے۔جس کو ہم اپنے سلسلہ بیاں میں آگے

اپنے اپنے مقام پر پوری تفصیل سے بیان کریں گے۔

مرقومہ بالا حالات وواقعات معرفت ابراہیمی کے وہ مکاشفات ومشاہدات ہیں جوقرآن مجید میں داخل ہیں۔اسلامی مفسرین نے اسی ضمن میں آپ کے کمال معرفت کی ایک دوسری مثال قلمبند فرمائی ہے جس کو ہم ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

انوارحقیقت کی دوسری جلوہ نمائی

جناب ابراہیم علیہ السلام باری تعالیٰ کی تلاش معرفت میں محو تھے۔اور تحقیق وجود وحدانیت میں سراپا غرق۔اسی محویت و اور استغراق کے عالم میں دن بھر گذر گیا۔رات ہوگئی اور وہ بھی اسی غوروخوض کی کیفیت میں تمام ہونے کی قریب پہنچ گئی۔متلاشی عرفان کو اس میدان میں نہ دن کی خبر تھی نہ رات کی۔اسی عالم میں صبح ہوگئی۔سپیدا پھیل چلا۔مرغان سحر کی خوش آیند آوازیں آنے لگیں۔دفعتاً کسی خوش آہنگ طیر صحرائی نے عجیب پر اثر اور دلکش آواز میں یوں نغمہ سرائی شروع کی سبوح قدوس رب الملئکة والروح۔''تسبیح و تقدیس کے قابل وہی پروردگار ہے جو ملائکہ اور تمام ذی روح اشیا کا پیدا کرنے والا ہے۔''معرفت الٰہی کے اس گوش بر آواز متلاشی نے جوں ہی اس نغمہ سرائی کو اپنے کانوں سے سنا فوراً اپنے مقام سے اٹھا اور اس آواز کے پیچھے ہولیا۔مگر وہ ایسے ناآشنا کی آواز نکلی جو صرف اپنی خوش نما آواز سناتا تھا۔اور اپنے حسن و جمال کا جلوہ نہ دکھاتا تھا۔جو اس مشتاق جمال کا اصلی مدعا تھا اور حقیقی تمنا۔بظاہر وہ طائر بھی ایسا شاطر نکلا کہ قدم قدم پر اپنی آواز تو سنا دیتا تھا مگر صورت نہ دکھلاتا تھا۔ابھی تھوڑے فاصلہ پر اس کی آواز سنائی دی اور یہ اس کی آواز پر وہیں جا پہنچا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔غرض اسی طرح جدھر جدھر وہ آواز آتی گئی۔یہ ادھر ادھر پہنچتے گئے۔یہاں تک کہ اپنی اس سعی وتلاش میں اپنے مقام سے بہت دور نکل آئے۔اب اچھی خاصی صبح ہوگئی اور تمام روشنی پھیل گئی تو وہ معجز نما نغمہ سرا میدان سے نکل کر ایک قریب کے پہاڑ پر بولتا ہوا معلوم ہوا۔یہ متلاشی حقیقت اتنی زحمت اٹھا کر بھی تحقیق حال کی کوشش سے نہ تھکا اور فوراً اس پہاڑ کی چوٹی پر آیا۔ادھر یہ پہاڑ پر پہنچے ادھر اس نغمہ آرائے قدرت نے پہاڑ کی دوسرے طرف والے دامن میں اپنے خوش آہنگ نغمے سبوح قدوس یارب الملائکة والروح سنائے۔آواز سنتے ہی یہ متلاشی حقیقت وہاں آیا۔قدرت کی آزمائش۔مشیت کا امتحان ختم ہوگیا۔ممتحان الٰہی نے اس کی حقیقت کوشش کے کمال وانتہا کا اندازہ کر کے اپنا اطمینان کلی کرلیا۔تو نظام ہدایت کے اسرار کا اس کی حقیقت میں آنکھوں کے سامنے پورے طور سے انکشاف کر دیا۔اور حقیقت کے اس متلاشی نے دیکھ لیا کہ وہ ہوش ربا اور معجز نما آواز دینے والا نہ کوئی ایسا عجیب و غریب جانور ہے۔جو اپنی قدرت میں عنقا ہو۔یا قدر و قیمت میں ہُما۔بلکہ جنگل کا ایک معمولی سیاہ تیتر ہے۔جو اس خوش آوازی سی سے خدا کی تسبیح وتقدیس کرتا ہے۔

یہ دیکھ کر جناب ابراہیمؑ نے اس کی لاوجودی اور بے مقداری کا یقین تو کرلیا تاہم اس کی خوش آوازی دل سے نہ بھولی چاہا کہ اس کو پکڑ لیں۔مگر ان کے اس ارادے سے پہلے ہی وہ کہتا ہوا اڑ گیا کہ اے حقیقت کے متلاشی۔اس سے زیادہ میرے پیچھے نہ پڑ۔میں خدا کا فرشتہ اس کی مشیت کا فرستادہ تھا۔جو تیری ہدایت اور امتحان واطمینان کی خاص ضرورت سے بھیجا گیا۔(حیات القلوب جلداول)

سیرت انبیاء علیہم السلام کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایسے ہی آسان اور معمولی طریقوں اور ذریعوں سے انبیا و مرسلین سلام

اللہ علیہم اجمعین کو معرفت ربانی کی تعلیم و ہدایت کی جاتی ہے اور انھیں ترکیبوں اور تدبیروں سے اُن پر اثبات وجود۔ مصداق توحید اور اذ کار تسبیح وتحمید باری تعالیٰ کے اسرار کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ یہ واقعات بتلار ہے ہیں کہ تعلیم معرفت کے ساتھ ہی ساتھ خدائے سبحانہ تعالیٰ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کو اپنی عبادت کے آداب اور طریقے بھی بتلا دیئے تھے۔ جو حقیقت میں حصول معرفت کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

ان واقعات میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تحصیل معرفت اور تحقیق وحدانیت کی حقیقت پوری تفصیل سے بیان کر چکے۔ یہ مقدس پیغمبر قدرت کے امتحانوں اور مشیت کی آزمائشوں میں ایسا کامل اترا کہ ممتحنان قدرت نے اس عارف اور کامل المعارف بزرگ کو اذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن ''خدا نے ابراہیمؑ کو اپنی چند نشانیوں میں آزمایا اور اس نے اس کو پورا کیا'' کے ایسے صاف اور روشن الفاظ میں تکمیل کی سند۔ اور انی جاعلک للناس اماما (اور میں نے تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنایا) کی زرین عبارت میں قابلیت کا تمغہ عنایت فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رسالت

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان مشاہدات حقیقت اور تکملہ معرفت کے بعد منصب رسالت پر فائز فرمائے گئے اور منعم حقیقی کی ان لازوال نعمتوں سے مالا مال ہو کر گھر واپس آئے۔ اس وقت آپ کا سن تیس اور چالیس برس کے درمیان تھا۔ تبلیغ رسالت کیلئے اصول الٰہیہ کے مطابق آپ نے اپنی دعوت کا اعلان اور تعلیم و ہدایت کا اظہار اپنے ہی خاندان اور گھر والوں سے شروع کیا۔ اسلامی مؤرخین و محققین کی تحقیق میں آپ نے اپنی ماں کی ہدایت سے اپنی دعوت کی ابتداء فرمائی۔

آذر کی بی بی سے احتجاج

صحرا سے واپس آ کر اور بارگاہ رب العزت سے رسالت کا منصب پا کر حضرت ابراہیمؑ نے دو تین دن محض خاموشی اور سکوت میں کاٹے یہ اس جلیل القدر منصب کی جبروتی تاثیر ہے جو خالص خشیۃ اللہ سے تعبیر کی جاتی ہے سیرت انبیاء و مرسلین پر نظر رکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ آپ کا یہ سکوت یہ خاموشی۔ آپ کی تنہا ذات تک محدود و موقوف نہیں تھی بلکہ آپ سے ماقبل اور مابعد جتنے خاصانِ الٰہی اس عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے ہیں۔ تفویض رسالت کے وقت ان کی ایسی ہی حالت ہوئی ہے۔ آپ کی یہ خاموشی طبیعت کی کسی کدورت یا ناسازی کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس سے ترک تعلق۔ گھر والوں کی صحبت اور ان کے اطوار و کردار سے قطعی ناراضی اور بے سروکاری ثابت ہوتی ہے۔ قلبی تعلقات کی وجہ سے آپ کے اس سکوت اور ہمہ دم کی خاموشی سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ۔ آپ کی (مجازی) ماں (جو حقیقتاً آپ کے چچا آذر کی بی بی تھیں) متاثر ہوئیں۔ آپ کے پاس آئیں اور پوچھنے لگیں چپ کیوں ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے اور وجہ خاموشی بتلانے سے پہلے استفسار فرمایا کہ آپ پہلے تو یہ بتلا دیں کہ میرا پروردگار کون ہے۔ جواب ملا تمہارا باپ (یعنی آذر) پوچھا گیا کہ باپ کا پروردگار کون ہے۔ جواب دیا گیا نمرود۔ استفسار کیا گیا کہ نمرود کا پروردگار کون

ہے۔اب تو آذر کی بی بی کی تحقیق انتہا تک پہنچ چکی تھی ۔کیونکہ اس کے علم عقیدت میں نمرود کے بعد پھر نہ کسی کی یہ عظمت تھی اور نہ قدرت جو پروردگار ہونے کی حیثیت رکھتا ہو۔ابراہیم سے قوم کے مسلمہ معبود نمرود کی نسبت یہ معترضانہ اور گستاخانہ استفسار سن کر آذر کی بی بی چلا اٹھی،اوراس سے صرف یہ کہہ کر کہ چپ رہو،کیا بکتے ہو کہہ کر چلی آئی۔

آذر جو اس وقت تمام خاندان کے افسر تھے اور ابراہیمؑ کے مربی۔اور تمام گھر بار کے مالک ومختار۔اتفاق سے وہ بھی چلے آئے۔اپنی بی بی سے ابراہیمؑ کے استبدادی خیالات معلوم کر کے نہایت طیش میں آئے اور اسی وقت ابراہیمؑ سے مستفسر حالات ہوئے ابراہیم نے ان کے ساتھ بھی وہی مستفسرے شروع کئے۔وہ بھی اپنے گمراہانہ عقیدے کے جوابات کو آخری سلسلہ تک پہنچا کر اسی طرح عاجز آ گئے۔اور سخت ناراض ہو کر ان کے پاس سے اٹھ گئے۔روضۃ الاحباب جلد اول باسناد مواہب لدنیہ وغیرہا۔

ان مستفسرات کا حال قرآن مجید میں داخل نہیں ہے۔مگر اسلام کے قدیم وجدید مفسرین ومحدثین ان کا ذکر اپنی کتابوں میں لکھتے آئے ہیں۔اس لئے زمانہ جدید کے محققین کی اصطلاح خاص میں یہ مرویات عرب مقامی روایات کہی جائیں گی۔مگر بااین ہمہ ان کے وقوع میں مشکلات یا محالات کا کوئی سبب اور قرینہ نہیں پایا جائے گا۔ہم نے اسی کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کے اس ابتدائی احتجاج سے اپنے سلسلہ کلام کا آغاز کیا ہے اور مناسبت مقام اور سلسلہ کلام میں باہمی ربط وتسلسل قائم رکھنے کی ضرورت سے ان کی نقل کو ضروری سمجھا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ؐ اور جناب ابراہیمؑ کے ابتدائی تبلیغ رسالت میں مساوات

تبلیغ رسالت کا پہلا فرض منصبی معرفت الٰہی کی دعوت اس کے وجود اور وحدت کی تصدیق کرنا ہے اور اس کا آغاز قربت اور خصوصیت کی وجہ سے اپنے گھر والوں سے کیا جاتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے تبلیغ رسالت میں بھی یہی اصول وطریقہ قائم رکھا اور اپنے گھر اور خاندان والوں کی تعلیم وہدایت شروع کردی۔گھر کے بزرگوں اور سرپرستوں سے جس طرح اس کی ابتدا کی گئی اس کی صورت اوپر بتلا دی گئی ہے۔حضرت ابراہیم کی تبلیغ رسالت کی یہ تمہیدی مماثلت اور مطابقت غور ولحاظ کے قابل ہے۔سلسلہ ابراہیمی کے اشرف المسلمین اور خاتم النبیینؐ نے۔اسی تقلید وتاسی میں نزول آیہ وانذر عشیر تک الاقربین کے موقع پر۔اسی طرح اپنے چچا ابولہب کی زجر وتوبیخ اور گمراہانہ طعن وتشنیع سنی تھی جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے آغاز تبلیغ میں اپنے چچا آذر کے کلمات حقارت آمیز سنے۔آذر بھی ابولہب کی طرح مخالف رسالت اور منکر نبوت بنا رہا۔اور اس کے گمراہانہ انکار کا سلسلہ برابر قائم رہا۔آذر کے ساتھ جس احتجاج کا ذکر ہم نے اوپر قلمبند کیا ہے۔وہ محض ابتدائی تھا۔اس احتجاج پر آذر نے اس وقت صرف اتنا خیال کر کے ٹال دیا کہ کسی خاص وجہ سے ابراہیم کے جوانانہ خیالات میں ایک قسم کی غیر متوقع تحریک اور جوش پیدا ہو گیا ہے۔جو رفتہ رفتہ سن کی طوالت اور قومی اور خاندانی معاشرت کے اثر سے زائل ہو جائے گا۔حضرت ابراہیم نے بھی اس پر زیادہ اصرار کو ضروری نہ سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

حضرت ابراہیم ؑ کا یہ سکوت عارضی تھا۔آپ کو بت پرستی سے فطرتاً جتنی نفرت تھی اتنی ہی آذر کو عقیدت اور محبت تھی۔اس بنا پر جب کبھی باہم گفتگو کا موقع آجاتا تھا تو یہ سکوت جاتا رہتا تھا اور احتجاج کا وہی سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تھا۔حضرت ابراہیم آذر کو بت پرستی سے روکتے اور ناپاک عقیدے اور طریقہ سے منع فرماتے تھے آذر اپنی جہالت اور ضلالت کی جھلاہٹ میں آپ کے مدعائے اصلی کو

تفصیل سے کان لگا کر نہ سنتا تھا اور آذر نہ سمجھتا تھا۔ ابولہب کی طرح ہمیشہ جھٹلاتا ہوا اور اَول فَول بکتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اس لئے نہ حضرت ابراہیم کو اطمینان سے آذر کو اپنے اصول ہدایت کے بتلانے کا کافی موقع ملتا تھا۔ اور نہ وہ کبھی ٹھنڈے دل سے آپ کے ارشاد کو سنتا تھا اور نہ سمجھتا تھا۔

آذر سے احتجاج وانکشاف معرفت

اتفاق سے آذر ایک دن ابراہیمؑ کے پاس آیا۔ اس وقت اس کا مزاج کسی قدر اعتدال پر تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے رخ سے اعتدال واطمینان کے آثار ہویدا وآشکار پا کر گفتگو شروع کی۔ یہ مکالمہ پوری تفصیل سے قرآن مجید میں مرقوم ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝

(اور اے پیغمبرؐ) قرآن میں ابراہیمؑ کا مذکور بھی (لوگوں سے) بیان کرو کہ وہ بھی بڑے ہی سچے (بندے) اور نبی تھے۔ جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان آپ کیوں ان (بتوں) کو پوجا کرتے ہیں۔ جو نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ کچھ دیکھتے ہیں۔ اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ ابا جان مجھے (خدا کی طرف سے) ایسی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو آپ کو حاصل نہیں ہوئیں تو اب آپ میرے پیچھے ہو لیجیے۔ تو میں آپ کو سیدھا راستہ بتلا دوں گا ابا جان۔ شیطان (کے کہے میں آکر بتوں) کو نہ پوجئے کیونکہ شیطان (خدائے رحمان سے باغی ہے۔ ابا جان مجھ کو اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو (خدائے) رحمان کی طرف سے آپ پر کوئی عذاب آئے اور آپ شیطان کے ساتھی بنیں۔ (مریم)

آذر اپنی شامت اعمالی سے حضرت ابراہیمؑ کے اس خیرخواہانہ مواعظ کا ان کافرانہ انداز میں جواب دیتا ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝

ابراہیم کے باپ نے کہا کہ ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آئے گا تو میں ضرور تجھے سنگسار کر دوں گا اور اپنی خیر چاہتا ہے تو میری سامنے سے دور ہو جا۔ (مریم)

جناب ابراہیم کمال معرفت کے اثر سے پر جلال ہو کر جواب دیتے ہیں۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ

مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۫ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾

ابراہیمؑ نے کہا (اچھا تو) میرا اسلام ہے۔ (اس پر بھی) میں اپنے پروردگار سے آپ کی مغفرت کی دعا کروں گا۔ (کیونکہ) وہ مجھ پر حد درجہ مہربان ہے اور میں نے تم (بت پرستوں) کو اور تمہارے ان بتوں کو جن کو تم خدا کے سوا (حاجت پڑے پر) پکارتے ہو۔ (سب کو) چھوڑا اور اپنے پروردگار کو پکاروں گا امید ہے کہ میں اپنے پروردگار سے دعا مانگنے میں بےنصیب نہ ہوں گا۔ (مریم)

مندرجہ بالا عبارت قرآنی سے احتجاج ابراہیمی کی پوری کیفیت معلوم ہوئی۔ اور یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہوگئی کہ اس داعی توحید نے آذر سے اب کی بار معرفت اور خداشناسی کے دلائل۔ کفر۔ شرک اور بت پرستی کے نقائص زائد تفصیل سے بیان کئے تھے اور امید کی تھی کہ آذر ان کے سمجھنے میں غصہ و جہالت کی جگہ عقل و فراست سے کام لے گا۔ اور دونوں طریقوں کے نیک و بد پر غور کرے گا۔ مگر آذر تھا سخت کافر۔ خدا کا منکر اور بتوں کا عاشق۔ اب کی بار بھی پیغمبر برحق کی دعوت اور موعظت سے اثر پذیر نہ ہوا۔ اور اپنی ضلالت و جہالت کے طیش میں آ کر اٹھ گیا۔ اور جناب ابراہیم کے ان اخلاق کریمانہ کی بھی کوئی قدر نہ کی جو باوجود اتنی عصبیت کے آپ نے اس کی مغفرت کے لئے وعدوں کی صورت میں ظاہر فرمائے تھے۔ اور جن سے اس کے حقوق پرورش کی صرف ادا کاری مقصود تھی۔ مگر بتوں کی محبت اور بت پرستی کے ساتھ عقیدت رکھنے کے مقابلہ میں آذر کو نہ جناب ابراہیم کا کوئی درد تھا اور نہ کوئی قدر و منزلت۔ اس پیغمبر برحق اور موحد مطلق نے آذر کی شامت اعمالی کی صورت حال ملاحظہ فرما کر صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر تو مجھ سے اور میری تعلیم و ہدایت سے ایسی نفرت ظاہر کرتا ہے تو میں بھی تجھ سے اپنے تمام تعلقات موقوف و متروک کرتا ہوں۔

قوم مشرکین وکافرین سے احتجاج

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے کمال معرفت پر اصرار و استقلال آپ کے ساتھ آذر کی آزردگی۔ ناراضی اور نفرت کو برابر بڑھاتا رہا۔ قرآن مجید میں ان احتجاج و مکالمات کا متواتر مقامات پر ذکر آیا ہے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے آذر کے ساتھ اس کی ہدایت کے لئے ایسے احتجاج متواتر قائم فرمائے۔ پہلے تبلیغ رسالت کے اصول کے مطابق اس کو پھر اس کے بعد ساری قوم کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اور قرینہ بھی یہ بتلا رہا ہے کہ آذر نے اپنی غایت درجہ کی ضلالت کی وجہ سے پہلے آپ پھر ساری قوم کے عمائد و اکابر کے ذریعہ سے اس داعی کلمۃ اللہ کی تعلیم و ہدایت کے امتناع میں گمراہانہ کوششیں ضرور کی ہوں گی اکابران قوم حقیقت میں سخت سے سخت کافران قوم تھے۔ ان سے احتجاج کے وقت جس اعلیٰ پیمانہ پر عقلی۔ اخلاقی اور تمدنی دلائل سے ان کی تعلیم و ہدایت فرمائی گئی اور خداپرستی کی سیدھی اور سچی راہ بتلائی گئی۔ وہ قرآن مجید کی سورۂ انعام رکوع ۵ میں درج ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوۡمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوۡٓنِّیۡ فِی اللّٰہِ وَقَدۡ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِکُوۡنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ شَیۡـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیۡ کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۰﴾ وَکَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ

اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٨٢﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾

(اے پیغمبرؐ) ابراہیم کی قوم کے لوگ ان سے (اس بات پر) جھگڑے۔ تو ابراہیمؑ نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کی (وحدانیت کے) بارے میں جھگڑتے ہو۔ حالانکہ وہ تو مجھے (اپنی توحید کا) سیدھا راستہ دکھلا چکا ہے۔ جن (بتوں) کو تم اس کا شریک مانتے ہو میں ذرا بھی ان سے ڈرتا نہیں (نہ مجھے وہ کچھ نقصان پہنچا ئیں گے) مگر ہاں میرا پروردگار ہی (مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہے) تو اس کی مرضی۔ میرا پروردگار تو اپنے علم کی رو سے سب چیزوں پر حاوی ہے۔ کا ی تم (اس بات کا) خیال نہیں کرتے اور جن چیزوں کو تم شریک خدائی بتلاتے ہو۔ میں اس سے کیوں ڈرنے لگا۔ جبکہ تم اس بات سے (متعلق) نہیں ڈرتے۔ کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک خدائی بنایا جن کے (معبود ہونے کی) سند خدا نے تمہارے لئے نہیں اتاری تو ہم دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق امن کا (واطمینان سے رہنے کا) حق دار ہے۔ اگر تم لوگ عقل رکھتے ہو (تو تم ہی آپ سمجھ لو) جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں ناانصافی (شرک) کی آمیزش نہیں کی۔ یہی لوگ ہیں جو امن واطمینان خاطر کے مستحق ہیں اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔ یہ ہماری سلجھی ہوئی دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کے قائل معقول کرنے کے لئے بتلائی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں رتبے بلند کرتے ہیں۔ اے پیغمبر۔ تمہارا خدا بے شک بڑا حکمت والا سب کچھ جانتا ہے۔

یہ تھے جناب ابراہیمؑ کے کمال معرفت۔ یہ تھی آپ کی خدا شناسی۔ یہ تھے آپ کے اقرار عبودیت اور اس کی معبودیت کے اعتراف اس کے اظہار واقرار میں کسی فانی ہستی۔ مٹ جانے والے وجود کے ظاہری تعلق کا جزواً یا کلاً کوئی لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ نہ کسی کی دولت وثروت۔ قوت وسلطنت کا خوف وخیال کیا جاتا ہے۔ اور نہ کسی قرابت منداور خاص اہل وعیال سے ترک تعلق کئے جانے پر کوئی رنج وملال فرمایا جاتا ہے۔ صاف صاف الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تعلقات گو بطور ظاہر کیسے ہی گہرے اور ضروری ہوں مگر خدائے واحد کی معرفت اور اس کے تقرب وتوسل کے آگے ان کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ ہستی۔ دنیا کے فنا ہوجانے والے وجود چاہے کتنے صاحب ثروت وقوت نہ ہوجائیں۔ مگر قادر مطلق کی وحدانیت پر سچے ایمان والے۔ گو کیسے ہی نحیف الجثہ اور ضعیف الاعضا ہوں۔ ان سے ایک لحظہ کے لئے بھی خوف زدہ اور مرعوب نہیں ہوتے۔ صرف اس لئے کہ خدائے قادر کی قوت کے مقابلہ میں وہ ان کی قوت وطاقت کو خس بھر

بھی نہیں سمجھتے ۔ خدا کو ایک جاننے والا تنہا اس کا مطیع رہ کر نہایت اطمینان وآزادی سے رہتا ہے اور صرف ایک اسی کی رضا وخوشنودی کی فکر رکھتا ہے ۔ سیکڑوں اور ہزاروں خدا ماننے والے ۔ ہمیشہ ردوبدل ۔ ترجیح وتفصیل کی غیر مطمئن اور غیر مستقل حالتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور رات دن اپنے کثیر التعداد معبودوں کے راضی وخوشنود رکھنے میں گرفتار رہتے ہیں ۔ اس لئے ان کی زندگی کے ایام نہ امن وآرام کے ایام ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا زمانہ اطمینان وآزادی کا زمانہ ۔ گمراہان قوم آپ کے اس احتجاج وارشاد کا کوئی جواب نہ دے سکے اور حقیقت میں عاجز اور قائل ہو کر ۔ دل ہی دل میں حضرت ابراہیمؑ کی عقل سلیم اور آپ کے خداداد ذہن وذکا کی تعریفیں کرتے ہوئے آپ کی خدمت سے واپس آئے ۔

اب ملک وقوم میں حضرت ابراہیمؑ کے عقائد اور ارشادات ہدایت کے چرچے ہونے لگے ۔ اور ہر شخص آذر کے سلسلے سے جو قوم کے مذہب قدیم کا سب سے بڑا حامی ۔ اور اس کے خاص گھر سے ۔ جہاں ملک وقوم کے دن رات خدا بنا کرتے تھے ۔ ایسے مخالفِ مذہب شخص کا پیدا ہونا بہت بڑی تعجب کی بات سمجھتا تھا اور سخت نفرت سے دیکھتا تھا ۔ انھیں حالات کے ساتھ یہ بات بھی تمام قوم کے لوگوں کیلئے قابل یقین ہوگئی کہ حضرت ابراہیم باوجود اپنے بزرگان قوم کی فہمائش کے بھی اپنے عقائد کو نہ چھوڑیں گے ۔ جیسا ان لوگوں کے منہ پر بڑے استقلال واستحکام سے وہ کہہ چکے ہیں ۔ ان تمام واقعات کی بنا پر جناب ابراہیمؑ کی دعوت اور تبلیغ رسالت کی نسبت قوم کا فرین کا استعجاب ہی نہیں بڑھتا تھا ۔ بلکہ اضطراب بھی اور ہر شخص ان امور کے نتیجہ کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا ۔

خلیل اللہ کے وعظ وارشاد اور کافرین قوم سے بار دیگر احتجاج

پیغمبر برحق ۔ کوئی حالت ہو ۔ خدمت رسالت کی انجام دہی سے باز نہیں رہ سکتا ۔ کس بشنود یا نشنود او گفتگوے میکند کا عالم ہوتا ہے ۔ حقیقت میں کافرین قوم وملک کے پاس آپ کی دعوت کی تصدیق وتسلیم کے سوا تکذیب وتردید کا کوئی معقول طریقہ نہیں تھا ۔ صرف نفسانیت ۔ خوف سلطنت اور جہالت ان کو حصول ایمان کی سعادت سے روکتی تھی ۔ حضرت ابراہیم کسی وقت ان کی دعوت سے نہ رکے اور ہمیشہ نہایت آزادانہ اور دلیرانہ طور پر ان کے عقائد فاسدہ کی تکذیب وتردید اور اصول توحید کی ترویج وتاکید فرماتے رہے ۔ ان واقعات کے متعلق آپ کے احتجاج وارشاد ۔ مواعظ وخطبات ۔ زیادہ مطول ۔ مفصل اور مدلل ہوتے تھے ۔ قرآن مجید کی سورۂ شعر کی مفصلہ ذیل عبارت سے اس کی پوری حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ﴿٦٩﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ﴿٧١﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ﴿٧٢﴾ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ﴿٧٣﴾ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿٧٤﴾ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿٧٧﴾ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ﴿٧٩﴾ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ

يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا
وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا
يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ
يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ
اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ
بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ
حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٠٦﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٠٨﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٩﴾
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٢﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٤﴾
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٥﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿١١٦﴾ قَالَ
رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿١١٧﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٨﴾
فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿١١٩﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ (الشعراء)

اے پیغمبر۔ ان لوگوں کو ابراہیمؑ کا حال پڑھ کر سناؤ کہ جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ (تم لوگ) کس چیز کو پوجتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور انھیں کی سیوا کرتے ہیں (ابراہیم) نے پوچھا کہ (بھلا) جب تم ان کو پکارتے ہو تو یہ تمہاری سنتے ہیں۔ یا تم کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ نہیں مگر ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا (ابراہیم) بولے کہ کچھ خبر بھی ہے جن چیزوں کو تم اور تمہارے اگلے باپ پوجتے آئے۔ یہ تو میرے دشمن ہیں۔ ہاں

(میرا سچا دوست تو) پروردگار عالم ہے۔ جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی (دنیا و دین کی مشکلات میں) میری رہنمائی کرتا ہے۔ اور جو مجھ کو کھلاتا اور جو مجھ کو (پانی) پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ اور جو مجھ کو مارے گا اور مرنے کے بعد پھر (وہی) مجھ کو جلائے گا اور (بخشنے والا مہربان ہے اور اس سے) مجھ کو توقع ہے کہ (روزِ جزا) وہ میرے قصور معاف کرے گا۔ اے میرے پروردگار مجھ کو (دین کی) سمجھ عنایت فرما اور مجھ کو (اپنے) نیک بندوں میں لے جا شامل کر اور آنے والی نسلوں میں ذکر خیر جاری کر اور آرامگاہ جنت کے وارثوں میں سے مجھے بھی (ایک وارث) بنا اور مجھے اور میرے باپ کو بخشدے کہ وہ گمراہوں میں سے ہیں اور جب لوگ (دوبارہ جلا کر) اٹھا کر کھڑے کئے جائیں اور اس دن رسوانہ کیجیو کہ اس دن نہ مال ہی کام آئیں گے نہ بیٹا بیٹی (کام آئیں گے) مگر (ہاں اسی کی نجات ہوگی) جو پاک دل لے کر خدا کے حضور میں حاضر ہوگا۔ اور جنت پرہیز گاروں سے قریب کی جائے گی۔ اور دوزخ نکال کر گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا کہ تم خدا کے سوا جن چیزوں کو پوجتے تھے (اب) وہ کہاں ہیں کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں یا (تمہاری طرف سے) کچھ انتقام لے سکتے ہیں۔ پھر وہ (معبود) اور گمراہ لوگ (جو ان کی پرستش کرتے تھے) اور شیطان کے لشکر سب کے سب اوندھے منہ دوزخ میں دھکیل دیئے جائیں گے۔ اور گمراہ اور ان کے معبود وہاں (آپس میں) جھگڑنے لگیں گے اور (جھگڑنے کے وقت) کہیں گے ہم کو تو بس (ان دوسرے) گنہگاروں نے گمراہ کیا۔ تو (اب) نہ ہماری کوئی سفارش کرنے والا ہے۔ اور نہ کوئی دلسوز دوست ہے۔ کاش تم کو (دنیا میں) پھر لوٹ کر جانا ہو کہ ایمان والوں میں (شامل ہو کر) رہیں۔ بے شک ابراہیمؑ کے اس قصہ میں (بھی) ایک بہت بڑی عبرت ہے۔ اور ابراہیمؑ کی امت میں اکثر ایمان لانے والے بھی نہیں تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اس مکمل اور مفصل ارشاد سے جہاں تک عالم ایجاد میں احکام وفرمان الٰہی کی تعلیم و ہدایت فرمائی گئی اسی قدر عالم معاد میں بھی جو کچھ معتقدین شریعت خداوندی کو نیک اعمالی کی جزا اور مشرکین ومنکرین کو ان کی بداعمالی کی جیسی کچھ سزا وعقوبیت اٹھانی ہوگی۔ اور پھر اس وقت ان کی ندامت وانفعال ان کی زبان حال سے جو کچھ کہلوائی گی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام حالتوں اور کیفیتوں کے ساتھ معلوم ہوگیا۔ تبلیغ رسالت کے اس طریقہ سے پیغمبر برحق نے مسائل معرفت، وحدانیت اور جبروت وقدرت الٰہیہ اور نیز سزا و عقوبت۔ رحمت ورافت لامتناہیہ کے تمام فضا وعالم دکھلا دیئے ہیں۔ اور انھیں مواعظ کے ساتھ ہی ساتھ اپنی رسالت کی زبان سے اپنے اخلاق کریمانہ کی شان دکھلا کر۔ خدائے قادر وتوانا کے سامنے۔ منصب رسالت پر فایز ہونے کے بعد بھی اپنی لاوجودی، بے سابطی، بے مقداری اور عجز وانکسار کے نہایت سنجیدگی ومتانت سے اعتراف واظہار فرما دئے ہیں اور پھر حقوق پرورش اور صلہ رحم کے اظہار میں۔

اپنے چچا آذر کے لئے۔جن کے کفر وشک کا ذاتی علم تھا۔مغفرت بارگاہ رحمت سے طلب فرمائی گئی۔

سیرت انبیاء علیہم السلام پر کافی نظر رکھنے والے حضرات ان تمام ارشادات کو اشرف الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفٰی علیہ والہ التحیۃ والثنا کے مواعظ وخطبات سے آیندہ چل کر ملائیں گے تو دونوں کے مقاصد ومطالب کا ایک ہی مرکز اور مرجع پائیں گے۔

اسی مضمون کے مواعظ وارشاد ابراہیمی سورۂ عنکبوت میں بھی مذکور ہیں۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ۚ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ۧ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَاۗىِٕهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ يَىِٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

(اے پیغمبر) ابراہیم کے حالات (ان لوگوں سے) بیان کرو جب انھوں نے اپنی قوم (کے لوگوں سے) کہا کہ خدا کی عبادت کرو۔اگر تم عقل رکھتے ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (مگر) تم تو خدا کے سوا بس بتوں کی پرستش کرتے ہو۔اور جھوٹی جھوٹی باتیں (دل سے) بناتے ہو۔خدا کے سوا تم جن (معبودوں) کی پرستش کرتے ہو۔تمہیں روزی دینے کا ذرا اختیار نہیں رکھتے تو روزی خدا ہی سے مانگو اور اسی کی عبادت (بھی) کرو۔اور اس کی نعمتوں کا شکر بھی بجالاؤ۔(کیونکہ) تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا بھی ہے اگر تم مجھے جھوٹا سمجھو تو تم سے پہلے بھی امتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکی ہیں اور رسول کے ذمے تو (حکم خدا کا صاف) پہنچا دینا ہے اور بس۔کیا لوگوں نے (اس بات پر) نظر نہیں کی کہ خدا کس طرح مخلوقات کو اول بار پیدا کر کے پھر اسی طرح کی مخلوقات کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے۔جو اللہ کے نزدیک سہل سی بات ہے۔(اور ہم نے ابراہیمؑ سے یہ بھی) ارشاد کیا کہ ان لوگوں کو سمجھاؤ کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو

اور دیکھو خدا نے کس طرح پہلی بار (مخلوق کو) پیدا کیا پھر (اسی طرح وہی) اللہ (لوگوں کو قیامت کے دن) آخری اٹھانا بھی اٹھائے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے عذاب دے۔ اور جس پر چاہے رحم کرے اور تم سب اسی کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے۔ اور تم تو نہ زمین (چھپ کر) خدا کو ہرا سکتے ہو اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔ اور جو لوگ خدا کی آیتوں کو اور (قیامت کے دن) اس کے حضور میں حاضر ہونے کو نہیں مانتے۔ یہی لوگ ہماری رحمت سے مایوس ہو بیٹھے ہیں اور یہی لوگ ہیں جن کو (آخرت میں) عذاب دردناک (ہونا) ہے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کا یہ خطبہ یا قوم سے احتجاج

خدا کی وحدانیت۔ اس کی معرفت۔ اس کی معبودیت اور اس کے کمال قدرت کا تفصیلی دفتر ہے۔ آپ نے ان مسائل الٰہیہ کے متعلق ایسے قوی اور مستحکم دلائل ان کے سامنے پیش کئے کہ وہ آپ کی عقل سلیم اور دلائل و براہین مستقیم کو سن کر حیران ہو گئے۔ اس احتجاج کے ابتدائی حصہ میں تو ان کو ان کے زمانہ حیات میں حصول عرفان اور قبول ایمان کی نسبت دعوت فرمائی گئی تھی۔ اس کے منافع اور مصالح ان کو دکھلائے اور بتلائے گئے تھے۔ مگر اس کے آخری حصہ میں عالم معاد اور آخرت کے متعلق خدا پرستی۔ خدا شناسی اور دنیا سے باایمان اٹھنے کے تمام راحت و آرام کو بیان فرمایا گیا اور سمجھایا گیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ منکرین ذات الٰہی اور منکرین قدرت لامتناہی کی آخرت میں سزا و عقوبت اور ہلاکت و تباہی بھی ثابت کر دی گئی۔ مگر حقیقت میں پتھر پوجنے والوں کے دل پتھر ہو گئے تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ قلب سیاہ اور عقل زائل اور اسی طرح تمام قوائے مدرکہ غائب ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں ان کی ضلالت، جہالت اور شقاوت کے پاس سوائے اس کے اور جواب ہی کیا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیندہ عبارت سے ظاہر ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ

قوم کے پاس۔ ان کی باتوں کا اس کے سوا (اور کوئی) جواب ہی نہیں تھا کہ (آپس میں) لگے کہنے کہ اس کو مار ڈالو یا جلا ڈالو۔

قوم مشرکین کی اعظم ترین عید کے دن خلیل اللہ کی بت شکنی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس معجز نما احتجاج نے قوم مشرکین کے تمام افراد کو غیر متحمل اضطراب میں ڈال رکھا تھا دعوت ابراہیمی کا تذکرہ زبان زد خاص و عام ہو ہی رہا تھا رفتہ رفتہ نمرود کے دربار سلطانی میں بھی جا پہنچا۔ اس نے آذر سے کئی بار اس کے متعلق استفسار بھی کیا تھا۔ مگر جہاں تک اس کے متعلق اس کو اطلاع پہنچی تھی وہ ایسی دہشت ناک اور خوف کا باعث نہیں تھی۔ اسی اثنا میں ان کی ایک بہت بڑی سالانہ عید کا دن قریب آ گیا آنے والی عید کے تذکرہ میں دعوت ابراہیمی کا بھی ذکر آ گیا۔ یہ تجویز ہوئی کہ اسی عید میں ابراہیم کے تمام مخالف عقائد کا امتحان و انکشاف ہو جائے گا۔ قدیم دستور کے مطابق قوم کے ہر فرد کو عید کے دن حاضر صحبت ہونے اور مراسم عید

بجالانے کی عام نوید دی گئی اور حضرت ابراہیمؑ کو بھی خاص طور پر مدعو کیا گیا۔

عید کا دن ہوا۔ ہر خاص و عام۔ چھوٹے بڑے اپنے دستور اور رواج کے مطابق اپنی قومی عید منانے کے لئے جمع ہوئے۔ آذر اور اس کے احباب وخواص۔ اکابر وعمائد قوم نے حضرت ابراہیمؑ سے تشریف لے چلنے کے لئے عرض کی۔ آپ نے پہلے اخلاقاً اور ان کی ستارہ پرستی پر تعریضاً۔ آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھ کر انی سقیم میں کچھ ناساز ہوں۔ کہہ کر اپنی مجبوری ظاہر کی اور ان لوگوں کو ٹال دینا چاہا۔ مگر وہ آپ کے انکار پر جہالت کے خواہ مخواہ اصرار کرنے لگے۔ تو آپ سے نہ رہا گیا۔ اس تمام مجمع کو مخاطب کر کے جس میں چچا آذر بھی تھے احتجاج واسترشاد کا وہی سلسلہ اٹھایا گیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

اے پیغمبر ہم نے ابراہیمؑ کو شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی اور ہم (ان کی صلاحیت سے) (خوب) واقف تھے۔ جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم (کے لوگوں) سے کہا کہ صورتیں جن کی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو۔ یہ ہیں کیا چیز؟ وہ بولے ہم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے (ابراہیم نے) کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادا صریح گمراہی میں پڑے رہے وہ بولے، کیا تو ہمارے پاس سچی بات لے کر آیا ہے یا دل کرتا ہے (ابراہیم نے) کہا (دل لگی کی بات نہیں) بلکہ آسمان وزمین کا پروردگار جس نے ان کو پیدا کیا۔ وہی تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں اس کا گواہ ہوں (اور آہستہ سے یہ بھی کہا) کہ خدا کی قسم تمہارے پیٹھ پھیرے اور گئے پیچھے۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ایک چال کروں گا۔

اس مکالمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی بے وجودی اور بت پرستی کی جہالت۔ اسلاف قدیم کی گمراہانہ اور کورانہ تقلید۔ خدا واحد کی ربوبیت۔ عظمت وتقدیس۔ ان پر پورے طور سے ظاہر کر دی مگر ان سنگ دلوں کو اپنے کفر والحاد پر ویسا ہی مصر پا کر سکوت فرمایا۔

اتنی گفتگو کے بعد وہ عید منانے کے مقام مقررہ پر چلے گئے۔ زیادہ رات گئے تک تمام لوگ عیدگاہ کی سیر وتماشہ میں مصروف رہے۔ حضرت ابراہیم وقت کے منتظر تھے۔ موقع پا کر۔ اپنی اس عملی تدبیر کی تعمیل کے لئے اٹھے۔ جس کا اشارہ عبارت قرآنی میں موجود ہے۔ اور ہم نے جس پر خطوط کھینچ دیئے ہیں۔ اٹھے۔ شہر تو آدمیوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا اور رات گئے کا سناٹا تھا اور سیدھے قوم کے اس بڑے

مندر پر جا پہنچے جس میں ان کے قابل التعظیم اور عظیم الشان بت نصب تھے۔ وہ مقام بھی سنسان اور بالکل ہو کا میدان ہو رہا تھا۔ نہ کوئی محافظ تھا نہ دربار۔ ابراہیمؑ نے مندر کے اندر جا کر چھوٹے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا اور سب سے بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ اور چپکے سے اپنے گھر چلے آئے۔ عید کی صبح کو جب لوگ پوجا کرنے آئے تو حقیقت معلوم ہوئی ابراہیم تو سب کی نظروں میں چڑھے ہی تھے تمام لوگوں نے بالاتفاق انھیں کو بت شکن ٹھہرایا۔ کیونکہ اس مجاہد راہ خدا کے سوا۔ اس صفائی کے ساتھ اور کون یہ خدمت کرسکتا تھا۔ سورۂ انبیاء میں یہ واقعہ ان الفاظ الہامی کے ساتھ مذکور ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ۝ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ۝ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ۝ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ۝ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ۝ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ۝ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝

ابراہیم نے بتوں کو (توڑ پھوڑ) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر ان کے بڑے بت کو اس غرض سے (رہنے دیا) کہ اس کی طرف رجوع کریں (جب لوگوں کو بتوں کے توڑے جانے کا حال معلوم ہوا) تو انھوں نے کہا (ارے) ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ گستاخی کس نے کی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے بڑا ظلم کیا۔ (بعض) بولے کہ وہ نوجوان (آدمی) جس کو ابراہیم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کو ہم نے برائی کے ساتھ (ان بتوں کا) تذکرہ کرتے سنا ہے (لوگوں نے) کہا تو اس کو (سب) آدمیوں کے سامنے لاؤ۔ تاکہ (جو کچھ وہ جواب دے) لوگ اس پر گواہ رہیں (غرض ابراہیم بلائے گئے) لوگوں نے (ان سے) پوچھا کہ ابراہیم کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ (حرکت) تو نے کی ہے۔ (ابراہیم نے) کہا (نہیں) بلکہ (بت) جوان (سب میں) بڑا ہے۔ اسی نے یہ حرکت کی ہوگی) اور اگر یہ بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔ اس پر یہ لوگ اپنے جی ہی جی میں سوچنے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ بلاشبہ ہم ہی برسرِ ناحق ہیں پھر اپنے سروں کے بل اوندھے (اسی گمراہی میں) دھکیل دیئے گئے (اور ابراہیمؑ سے بولے تو یہ بولے) کہ تمہیں تو یہ معلوم ہی نہیں کہ یہ بت بولا نہیں کرتے (ابراہیم نے) کہا، کیا تم خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پوجتے ہو کہ جو نہ تم کو کوئی فائدہ پہنچائیں اور نہ (کسی قسم کا) نقصان ہی پہنچائیں۔ تُف

ہے تم پر اور اُن چیزوں پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو۔ تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔]

مشرکین کے اتنے بڑے اور بھرے مجمع میں حضرت ابراہیم کی بت شکنی کی اہم ترین واقعات پر ایسا دلیرانہ احتجاج اور مستقلانہ مجاہدہ۔ آپ کے اس دعوے کا کامل ثبوت ہے جو ان سے پہلے آپ نے اپنی قوم کے آگے کیا تھا کہ خدائے واحد کی راہ میں۔ نہ میں تم سے ڈرنے والا ہوں اور نہ تمہارے ان بتوں کو خیال میں لانے والا حقیقتاً آپ کا یہ ارشاد و احتجاج ایسا قوی اور کامل تھا کہ مشرکین کے تمام لوگ آپ کے مستفسرہ کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور فرطِ ندامت سے معقول اور لاجواب ہو کر سر بزانو ہو گئے۔ مگر حب الشی اعمی و ابصر۔ (کسی شے کی محبت اندھا کر دیتی ہے) اتنے سمجھنے اور شرم اٹھانے کے بعد بھی بتوں کی محبت اور بت پرستی کی عقیدت ان کے دلوں سے نہ گئی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو کر حضرت ابراہیمؑ کی سزا و عقوبت کرنے پر ان کو تاکید کرنے لگی اور آپس کی مشورت سے یہ امر وہیں طے پا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مرقوم ہے۔ قالو احرقوہ کہ ابراہیمؑ کو جلا ڈالو۔

نمرود کے دربار شاہی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طلبی

اس کے بعد نمرود کے دربار شاہی میں حضرت ابراہیمؑ کے ان معاملات و حرکات کی اطلاع ہوئی اور ان کی بت شکنی کی خاص شکایتوں کے ساتھ یہ استغاثہ بھی پیش کیا گیا کہ ابراہیمؑ ایک ایسے خدا کی دعوت کی طرف تمام قوم کے لوگوں کو بلاتے ہیں۔ جس کو وہ اپنا اور ساری مخلوق اور نمرود کا بھی خالق و معبود بتلاتے ہیں۔ نمرود بتوں کی توہین کا واقعہ سن کر جھٹلا یا تو تھا ہی۔ اب اپنی خدائی میں بھی بٹا لگانے کا حال سن کر اور چمک اٹھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو بلا بھیجا۔ یہاں کیا عذر تھا۔ بلاخوف و ہراس فوراً چلے آئے۔

نمرود سے احتجاج

نمرود نے سب سے پہلے خدا کی صفات دریافت کئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ

میرا خدا مارتا بھی ہے اور جلاتا بھی ہے۔

نمرود بولا یہ تو میں روز کیا کرتا ہوں تم ابھی ابھی دیکھ لو۔ یہ کہہ کر اس نے شاہی قید خانہ سے دو قیدی بلوائے ایک کو تیغ بیداد کے حوالے کر دیا اور ایک کو آزاد۔ ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔ لو دیکھ لو ایک مار ڈالا گیا اور ایک زندہ کر دیا گیا۔ ابراہیم نے فوراً تردید میں ارشاد کیا انك احییت الحی ولم تحی المیت۔ ارے تو نے زندہ کو زندہ چھوڑا۔ مردہ کو تھوڑا ہی زندہ کیا۔ علاوہ بریں۔ میرے پروردگار کی یہ قدرت ہے کہ وہ ہمیشہ آفتاب کو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ اگر تجھ میں کوئی قوت ہے تو اس کو مغرب سے نکال کے دکھلا۔

آتش نمرودی اور خلیل معبودی

نمرود کو یہ دلائل سن کر کاٹھ لگ گیا۔ وہ مجسم بت بن گیا۔ خدائے قادر و توانا اس کے عاجزانہ اور مجبورانہ سکوت کے عالم کو صرف تین

لفظوں میں دکھلا تا ہے فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۔اسی غصہ۔ جھلاہٹ اوراپنی ندامت وخجالت کی بوکھلاہٹ میں۔خدا کے اس خاص معرف اور مقدس محود کی سزاوعقوبت کی نسبت حاضرین دربار سے مشورہ کرنے لگا۔سب نے یک زبان ہوکران الفاظ میں صلاح دی۔ حرقوہ و انصرو الھتکم ان کنتم فعلین اگرتم نے کچھ کرنا ہے تو ابراہیم کوآگ میں جلادواوراپنے معبودوں کی مدد کرو۔نمرود نے بھی اسی تجویز کو پسند کیا۔اسلامی مؤرخوں نے اس خدارسیدہ اور برگزیدہ پیغمبر کے زندہ آگ میں جلا دیئے جانے کے بڑے بڑے سامان لکھے ہیں۔جن کا بیان خواہ مخواہ کی طوالت ہے۔ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کوآگ کے بہت بڑے الاؤ میں زندہ ڈال دیئے گئے۔مگراس حافظِ حقیقی کے کرم وافضال نے آپ کوان شعلہ ہائے سوزندہ سے بال بال بچالیا۔اوراس آتشکدۂ نمرودی کوگلزار ابراہیمی بنادیا۔اس کی نسبت قرآن مجید میں یہ اشارت وتلمیح ہے۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾

ہم نے (آگ کو) حکم دیا کہ اے آگ ابراہیم کے حق میں ٹھنڈک اور سلامتی (کا موجب) بن جا ان کو کسی طرح کی ایذا نہ پہنچے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اور جن لوگوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کرنی چاہی تھی۔تو ہم نے انھیں کونا کام کیا۔

پھراس واقعہ کوسورۂ عنکبوت میں ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

(ابراہیم کی) قوم کے پاس اس کے سواان کی باتوں کا جواب ہی نہیں تھا کہ یا تو اس کو مارڈالو یا (آگ میں) جلا ڈالو (چنانچہ لوگوں نے ان کو آگ میں ڈال دیا) مگر خدا نے ان کو آگ سے نجات دی۔بے شک اس (واقعہ) میں بھی ان لوگوں کے لئے جوایمان رکھتے ہیں (قدرت خدا کی بہترین) نشانیاں ہیں۔

معرفت الٰہی میں حضرت ابراہیمؑ کا کمال استقلال

حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام ابتلاوامتحان کے اس منتہائی درجہ پر بھی کامل اترے۔آپ کے اس امتحان کے متعلق اسلام کے معتبر مفسرین اور مستند محدثین نے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔جن کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے آپ کے کمال عرفان۔ثبات ایمان۔قلبی استقلال اور روحانی اطمینان کا پورا ثبوت ملتا ہے۔یہ روایات بتلاتی ہیں کہ آگ میں ڈال دیئے جانے کے بعد حضرت جبرئیل بغرض امتحان ان کے پاس آئے اور دریافت کیا۔ھل لک من حاجۃ۔آپ کو میری کوئی ضرورت ہے۔کمال استقلال وآزادی سے جواب ملا۔اما الیک فلا۔خاص تم سے توکوئی حاجت وضرورت نہیں۔جبرئیل نے عرض کی اگر مجھ سے آپ کی کوئی غرض وحاجت نہیں ہے۔تو جس سے ہے اسی سے ایسے مشکل کے وقت میں طلب حاجت فرمائی جاوے۔نہایت متانت سے ارشاد ہوا۔حسبی من سوائی

علمہ بحالی۔ مجھے اس سے عرض کی بھی ضرورت نہیں وہ میرے حال سے خود واقف ہے۔

عرب کے بہت بڑے معقول مفسر ابو منصور تباع نے اتنے اور اضافہ کے ساتھ اس واقعہ کو لکھا ہے کہ جبرئیل کے اس مستفسرہ کا کہ آپ اسی سے طلب حاجت کیوں نہیں کرتے جس کو آپ اپنی ضرورتوں کا پورا کرنے والا سمجھتے ہیں۔ اس موحد حقیقی نے یوں جواب دیا کہ وفاو رضا کے خلاف ہوگا۔ شاید اس کو میرا جلا ہی دینا منظور ہو۔ پھر حضرت جبرئیل کے تمام مکالمہ کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

لما قال جبرئیل هل لك من حاجة ۔ قال ابراهیم لیس من النفس دعویٰ ولا من نمرود شکوے ولا من النار بلوی ولا اطلب سوے المولیٰ۔

جبرئیل نے جب جناب ابراہیمؑ سے پوچھا آپ کوئی حاجت ہے تو فرمایا نہ مجھ کو نفس سے کوئی حاجت ہے۔ نہ نمرود سے شکایت اور نہ آگ کی حرارت سوزندہ سے ملال۔ سوائے خدا کے میرا کسی سے کوئی سوال نہیں۔

خطاب خلیل اللہ سے سرفراز ہوئے۔

جناب ابراہیمؑ علیہ السلام آتشِ نمرود کے ایسے قیامت ناک وقت میں بھی خدائے واحد کی معرفت اور اس کی شرط محبت واخلاص پر ایسے مستقل ثابت ہوئے کہ ممتحنانِ قدرت بھی ان کے انداز استقلال پر ناز کرنے لگے۔ ان کی صداقت مقبولیت کے درجہ پر اور ان کا ایمان اجابت الٰہی کے مراتب اعلیٰ پر فائز فرمایا گیا اور فاتخذناہ ابراهیم خلیلا۔ ہم نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل (سچا دوست) بنایا۔ کا گرانمایہ خطاب دربار ایزدی سے عنایت فرمایا گیا۔ رسالت کے منصب کے ساتھ خلت (ہم نشین خلوت) کے مراتب کا بھی اضافہ ہوا۔

سیرۃ النبی۔ خطاب احمدیہ۔ ارض القرآن۔ عصر جدید کے محققین نے اپنی اپنی تالیفات میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق آگ میں جلائے جانے کے واقعات کا کوئی ذکر و مذکور نہیں کیا ہے۔ اور عموماً آپ کے واقعات کو ہجرت کے وقت سے آغاز کرتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ خاص حضرت ابراہیمؑ کے ابتدائی حالات کو مرفوع القلم فرما دیا ہے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تورات میں واقعہ احراق کا چونکہ ذکر موجود نہیں ہے۔ اس لئے صرف اسلامی مرویات پر۔ جن کو یہ حضرات مقامی روایات کا خطاب دیتے ہیں۔ اعتبار نہیں کیا گیا۔ تورات سفر تکوین میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کی ابتدا ہجرت ہی کے زمانہ سے تقریباً ابتدا کی گئی ہے۔ اس سے قبل کے حالات کچھ بھی نہیں بتلائے گئے۔ (ملاحظہ ہو۔ تورات۔ تکوین۔ حالات ابراہام) قرآن مجید کا یہ اتنا بڑا احسان ہے جس کی منت گذاری سے دنیا اور اہل دنیا سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ حقیقتاً اگر قرآن اس عظیم الشان پیغمبر کے تحصیل عرفاں۔ تکمیل الایمان اور عدیم المثال استحکام و استقلال کو اس تفصیل و تشریح سے بیان نہ کرتا۔ تو حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے یہ اوصاف و محامد صفحہ روزگار سے کب کے مٹ گئے ہوتے۔ قرآن چونکہ تمام کتب قدیمہ کا متمم اور مصحح ہے۔ اس بنا پر اس نے جہاں کتب قدیمہ میں انسانی حشویات ولغویات کے اسقاط سے کام لیا ہے۔ وہاں فروگذاشت و ذہولات کے موقعوں پر۔ صحیح اور اصلی حالات کی اطلاع و اعلان کے اضافات بھی کر دیئے ہیں۔ اور مصحح اور متمم ہونے کے اعتبار سے اس کے فرائض مخصوصہ میں یہ امور داخل تھے۔

واقعہ احراق سے بعد کے حالات اور حضرت لوطؑ کا ایمان لانا

ان تمام مصائب کو برداشت کر کے یہ مجاہد فی سبیل اللہ ارشاد و ہدایت کی ان خدمات کو پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ادا فرمانے لگا۔ اور آپ کے دلائل و براہین کو مشرکین ایک بار نہیں کئی بار آپ کی زبان صداقت ترجمان سے سن چکے تھے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی کفر شعاری اور بت پرستی سے باز نہ آئے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ بھی ان کی تعلیم و ہدایت سے نہ رکے۔ اور اب تو پہلے سے بھی زیادہ آزادانہ اور دلیرانہ طریقہ سے ان کے عقائد فاسد کی تکذیب و تردید فرماتے رہے اور اصول توحید کی تعلیم و ترویج کرتے رہے قرآن مجید میں مرقوم ہے۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

(ابراہیمؑ نے قوم سے) کہا کہ تم جو خدا کے سوا بتوں کو مانتے ہو۔ (تو) صرف دنیا کی باہم دوستی و محبت کی وجہ سے (مانتے ہو) پھر قیامت کے دن تمہارا یہ حال ہونا ہے کہ تم میں سے ایک دوسرے کو ٹکڑے کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا۔ اور دوزخ آخر میں تم سب کا ٹھکانا ہوگا (اور ان بتوں میں سے) کوئی بھی تمھارا مددگار نہیں ہوگا۔ اس پر صرف ایک (حضرت) لوطؑ ایمان لائے۔ (ابراہیمؑ نے) کہا کہ میں تو دیس چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف (جہاں کہیں اس کو منظور ہو) نکل جاؤں گا۔ بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔

قرآن مجید کے الفاظ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ حضرت لوطؑ کے ایمان لانے کی خبر دے رہے ہیں۔ مگر عرب کے مؤرخین و محققین کے نزدیک حضرت سارہ جو رشتہ میں جناب ابراہیمؑ کی چچازاد بہن ہوتی تھیں آپ پر ایمان لائیں۔ ہم سابق الایمانی کے اختلاف پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ سلسلہ واقعات کے بیان و تفصیل کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ عربی مؤرخین اور اسلامی مفسرین نے جناب سارہ کے ایمان لانے اور عقد نکاح میں آنے کے واقعات یوں بیان کئے ہیں۔

حضرت سارہ کا شرفِ زوجیت اور قبول ایمان کی نعمت سے مشرف ہونا

جب حضرت ابراہیمؑ آتش نمرودی سے صحیح و سلامت بچ کر گھر میں تشریف لائے تو سب سے پہلے آپ کی عظمت اور صداقت کا اثر حضرت سارہ کے قلب پر جاگزیں ہوا۔ اور پھر اس استحکام و استقلال کے ساتھ کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے اسی وقت اس کا اظہار و اقرار بھی کر دیا۔ اسی وقت حاضر خدمت ہوئیں اور کہنے لگیں۔ اے ابن عم میں اسی وقت سے آپ کے خدا پر ایمان لاتی ہوں۔ جس نے

ایسی آتش کے نقصان وہلاکت سے آپ کو بال بال بچا لیا۔حضرت ابراہیمؑ نے بطریق امتحان ومزید اطمینان جواب دیا کہ سارہ! تم ایسا کہتے ہوئے ذرا نہیں ڈرتی۔اگر گھر والے سن لیں گے۔تو تمہیں مار ڈالیں گے۔سارہ نے فوراً جواب دیا کہ جس خدا نے تمھیں بچایا وہ میری جان بھی بچا لے گا۔پھر مجھے کس کا خوف ہوگا۔

جناب سارا کی یہی صداقت اور حسن عقیدت حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی زوجیت ودائمی رفاقت کا باعث ہوئی جناب سارہؑ حضرت ابراہیمؑ کی چچا زاد اور بنا بر بعض روایات عمہ زاد بہن تھیں۔اور سن رشد تک پہنچ چکی تھی۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سن بھی تیس برس سے زیادہ ہو چکا تھا۔اس لئے باہمی سن کی مساوات اور حقوق قرابت کے اعتبار سے بھی باہمی مزاوجت ومناکحت کا پورا وقت وموقع حاصل تھا اس بنا پر جناب ابراہیمؑ نے ان سے عقد کر لیا۔

حضرت لوطؑ اور سارہؑ کے ایمان لانے سے حضرت ابراہیمؑ کے امور میں قدرے اطمینان اور قوت مل چکی۔مگر مشرکین کی نفسانیت اور عداوت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔اگر چہ تبلیغ رسالت کے ابتدائی اصول کے مطابق حضرت لوطؑ وسارہؑ کے ایمان لانے کی حقیقت بالکل مخفی رکھی گئی۔اور ایسی کہ باہر والے تو کیا گھر والے بھی مشکل سے اس پر علم واطلاع پا سکے۔مگر تاہم ابراہیمؑ کی دعوت ایمان اور رسالت کے اعلان کا امتناعی سامان مہیا کرنا۔جیسا گھر والوں نے اپنا فرض قرار دے لیا تھا۔ویسا ہی باہر والوں نے۔سب نے مل کر بڑی بڑی کوششیں کیں اور اس کی امتناعی تدبیروں میں اپنے عملی طریقوں سے کوئی طریقہ بھی کسر اٹھا نہیں رکھا۔مگر کچھ بھی مفید کار نہ ہوا۔جناب ابراہیمؑ تبلیغ رسالت میں ویسے ہی مستعد وسرگرم رہے۔

ارض بابل سے ہجرت

تمام قوم کافرین نے اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر اس نبی معصومؑ کے خون ناحق کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔حضرت ابراہیمؑ کو حضرت لوطؑ کے ذریعہ سے مخالفین کے ان ظالمانہ ارادوں کی خبر لگ گئی۔اور حقیقتاً مشرکین کی مخالفانہ کاروائیوں کے معلوم ہونے اور اپنی جان کو محفوظ رکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ اس وقت آپ کے لئے سخت دشوار تھا۔مگر نظام قدرت کا مدعائے مشیت ہی ہے اور اس کے احکام تدبیر کی قدرت انھیں امور مستور سے ظاہر ہوتی ہے۔کسی کو لوطؑ پر افشائے راز کا گمان بھی نہیں تھا۔اور وہی اس کے اصلی ذریعہ اطلاع ثابت ہوئے۔نظام قدرت نے حضرت لوطؑ کو ربقہ ایمان میں لا کر اس داعی ایمان کی رفاقت وحفاظت کے پورے سامان اور کافی اطمینان فراہم کر دیئے۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ خبر پا کر اس کے ہر پہلو پر غور فرمایا۔مگر سوائے ہجرت اور ترک وطن کے حفاظت جان کا کوئی دوسرا طریقہ نظر نہیں آیا۔تو حضرت لوط کو مخاطب کر کے اپنے اس ارادہ کا جو حقیقت میں حکم الٰہی کا عین اشارہ تھا۔ان الفاظ میں اظہار فرمایا: انی مھاجر الی ربی انه ھو العزیز الحکم۔ میں تو اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔اور وہ سب سے زبردست اور حکمت والا ہے۔

ہجرت ابراہیمی کو آنحضرت صلعم کی ہجرت سے خاص مماثلت تھی

دعوت ابراہیمی کے ان ابتدائی واقعات کو حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین کی تبلیغ رسالت کے آغاز حالات سے جس وقت تقابل کیا جاتا ہے تو ان دونوں داعیان شریعت الٰہی کے واقعات میں ایک خاص مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔تھوڑے سا غور کرنے کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ جناب ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی دعوت اور تبلیغ رسالت کا آغاز اپنے گھر والوں سے شروع کیا۔ پہلے حضرت سارہؑ (آپ کی زوجہ) پھر حضرت لوطؑ (آپ پر ایمان لائے بالکل اسی طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تبلیغ رسالت کو بھی اپنے اہل بیت کی تعلیم و ہدایت سے آغاز کیا۔سب سے پہلے حضرت جناب خدیجہ صدیقہ کبریٰ سلام اللہ علیہا آپ کی رسالت پر ایمان لائیں اور آپ کے بعد آپ کے ابن عم حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسا کہ ہمارے سلسلہ بیان میں آئندہ پوری تفصیل وتحقیق سے معلوم ہوجائے گا۔

بابل سے شہر حاران کی طرف ہجرت اور قیام

ان واقعات سے ظاہر ہوا۔کہ عادت الٰہی ہمیشہ ایسی ہی جاری ہوئی ہے کہ انبیاو مرسلینؑ کی تعلیم و ہدایت پہلے ان کے اعزہ واقارب سے آغاز ہوتی ہے اس لئے کہ قرابت ویکجہتی کی بنا پران کی تصدیق زیادہ اعتبار واعتماد کے قابل سمجھی جاتی ہے۔حضرت ابراہیمؑ کو مشرکین قوم کے ہاتھوں سے اپنی جان کی جب کوئی امید نہیں دیکھی تو ایک دن حضرت لوطؑ سے جیسا کہ قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے اپنی ہجرت فرمانے کا قصد ظاہر فرمایا۔اور جیسا کہ معتبر تاریخوں سے ثابت ہے۔کچھ رات گئے حضرت لوط اور سارہ کو ہمراہ لے کر شہر حاران کی طرف تشریف لے گئے۔یہاں پہنچ کر حضرت ابراہیمؑ نے ایک معتد بہ زمانہ تک دل جمعی سے اپنی تبلیغ رسالت اور ترتیب معیشت کی ضرورتیں انجام دیں۔اور اس میں بھی کلام نہیں جیسا کہ واقعات بتلارہے ہیں آپ کو آپ کے تمام امور میں بہت کچھ کامیابی ہوئی۔

کعنان میں قیام

تھوڑے زمانہ کے بعد یہاں کی حالت پہلے سے دگرگوں اور اہل زمانہ کی طبیعت بھی ناموزوں دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر حاران کی اقامت ترک فرمائی اور وہاں سے اٹھ کر کنعان میں سکونت پذیر ہوئے۔یہاں بھی نہایت دلجمعی اور پوری کامیابی کے ساتھ آپ کی رسالت کے امور انجام پاتے رہے۔مگر ایک سال کنعان اور اس کے قرب وجوار میں ایسا قحط عظیم پڑا کہ آپ کو بالآخر مجبور ہوکر کنعان سے اپنے اہل وعیال کے ہمراہ ملک مصر کی طرف چلا جانا پڑا۔

مصر کی طرف روانگی اور فرعون کے ساتھ معاملات

جناب ابراہیمؑ نے دیگر یار وانصار کی اقامت اختیار کرنے کی جگہ مصر کو خاص طور پر کیوں اختیار فرمایا۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ فرعون مصر جو اس وقت مصر پر حکمران تھا وہ آپ کا ہم قبیلہ اور ایک وقت میں ہم وطن تھا۔اس لئے قحط سالی میں اس کی استمداد واعانت کی زیادہ امید

تھی۔اس قرابت و یکجہتی کے مفصل حالات حضرت ہاجرہ کے احوال میں بہت جلد معلوم ہوں گے۔

مصر پہنچ کر حضرت ابراہیمؑ کو اس مسافرت اور غربت کے عالم میں ایک سخت مصیبت کا سامنا ہوا۔فرعون مصر کو حضرت ابراہیمؑ کی آمد کے ساتھ حضرت سارا کی خوش جمالی کی بھی پوری کیفیت معلوم ہوئی۔اس نے مشتاق ہو کر حضرت ابراہیمؑ کو بلا بھیجا۔جب یہ فرعون کے دربار شاہی میں۔معہ حضرت سارہ کے پہنچے تو اس نے سارہ کے حسن و جمال کو اس سے بھی زیادہ تعریف کے قابل پایا۔جیسا کہ وہ سن چکا تھا۔بادشاہ مصر نے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا کہ یہ عفیفہ تمہاری کون ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حفاظت جان اور سارہ کے حفظان آبرو کی مصلحتوں پر غور فرما کر ارشاد کیا کہ یہ میری بہن ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ عقد ازدواج سے پہلے وہ آپ کی عمہ زاد بہن تھیں۔کیونکہ آپ کے باپ تارخ (ترح) کی ایک بہن اپنے قبیلہ میں جس سے بیاہی گئی تھیں ان کا نام بھی ہاران تھا۔اور حضرت لوطؑ کے باپ جو حضرت ابراہیم کے رشتے میں بھائی ہوتے ہیں۔ان کا نام بھی ہاران تھا۔اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی حفاظت جان اور سارہ کی حفظان آبرو کے خیال سے ان کی زوجیت کی موجودہ حیثیت کا کتمان اور اس کی جگہ اپنی سابق قرابت کا اظہار و اعلان فرمایا۔جو ایسی ناگزیر حالتوں میں خدا کی طرف سے تمام شریعتوں میں مجوز اور مباح ہوتا چلا آیا ہے۔چنانچہ توریت میں اس واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

> جب (ابراہیم) مصر کے نزدیک پہنچا تو اس نے اپنی جورو سرئی (سارہ) سے کہا کہ دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں بڑی خوب صورت ہے۔اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی جورو ہے۔سو مجھ کو مار ڈالیں گے اور تجھے جیتا رکھیں گے۔تو کہیو کہ میں اس کی بہن ہوں۔تا کہ تیرے سبب سے میری خیر ہو۔اور میری جان تیرے وسیلہ سے سلامت رہے۔(تکوین باب 12۔آیت 10-13)

حضرت ابراہیمؑ کے خیال کے مطابق فرعون مصر کے دل میں سارا کی طرف سے نفسانیت و فساد کے آثار پیدا ہوئے۔مگر کرشمۂ قدرت نے ہر بار اس کے ارادۂ بد کے موقع پر اس کی کافی تنبیہ فرمائی۔اور بالآخر وہ اپنے ناہنجار کردار سے سخت پشیمان و نادم ہوا۔اور پھر ان دونوں کی ذاتی عظمت و تقدیس کا قائل ہو کر ان کو اپنے ملک سے بڑے اکرام و انعام کے ساتھ رخصت کر دیا۔خصوصاً جناب سارہ کے ساتھ اپنی عقیدتمندی کے اظہار میں اپنی لڑکی ہاجرہ نامی کو ان کی خدمت کی غرض سے ہمراہ کر دیا۔توراۃ میں ان واقعات کے متعلق یہ عبارت مرقوم ہے۔

> جب ابراہیمؑ مصر میں پہنچا مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اس کو دیکھا اور فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور اس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے اور اس نے اس کے سبب ابراہیم پر احسان کیا کہ اس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھوں غلام اور لونڈی اور گدھیاں اور اونٹ ملے۔پر

خداوند نے فرعون اور اس کے خاندان کو ابراہیمؑ کی جورو سارہ کے سبب بڑی مار ماری۔تب فرعون نے ابراہیمؑ کو بلا کر کہا کہ تو نے مجھ سے کیا کہا۔کیوں نہ کہہ دیا کہ میری بیوی ہے۔تو نے کیوں کہا کہ یہ میری بہن ہے۔یہاں تک کہ میں نے اس کو اپنی بیوی بنانے کے لئے لیا۔دیکھ یہ تیری بیوی حاضر ہے۔اس کو لے اور چلا جا۔

(تکوین باب 12 آیت از 14 تا 20)

تورات اور اسلامی تفاسیر قرآن فرعون کے ارادۂ بد کرنے اور اس کے بدلہ میں بار بار عقوبت اٹھانے پر متفق اللفظ ہیں اور حقیقتاً قدرت الٰہی کے یہی تصرفات ہیں اور اس کی جبروت قدرت کے یہی واقعات، حضرت سارہ کے ساتھ فرعون کے کیا قصد تھے اور کیا ارادے اور چشم زدن میں ان بدارادوں کی جگہ کیسی عقیدت ہوگئی اور کتنی ارادت۔اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مطیع اور فرمانبردار مخلص کے متعلق ایسے ارادوں کا وہم وگمان بھی سخت افترا ہے۔اور صریح بہتان۔جس عقیدت مند نے اس خاتون مقدس کے ساتھ اتنی بڑی عقیدت مندانہ فیاضیوں کے سلوک کئے ہوں۔کثیر التعداد مال وجنس۔اسباب واثاثہ کے علاوہ اپنی پیاری لڑکی تک خدمت کی غرض سے ہمراہ کردی ہو۔وہ کبھی ایسی بے جا جرأت اور نازیبا حرکت کے اقدام کا مرتکب تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک تو حضرت ابراہیم کی قرابت۔دوسرے حضرت سارہ کی عظمت اور تیسرے جناب ہاجرہ کی قلبی محبت کے سبب سے فرعون مصر نے اس غربت زدہ نبی اللہ کے تمام اسباب معاشرت کیا؟ اس چھوٹے سے قبیلہ وخاندان کے تمام آئندہ سامان معیشت کافی طور پر درست وفراہم کردیئے۔عربی توریت کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

وصعد ابرام من مصر هو وزوجته وكل ماله و لوط معه الى القيبلة وابرام عظيم جدًّا بالشيه والفضة والذهب۔

حضرت ابراہیمؑ آپ اور اپنی بی بی اور تمام اموال کے ساتھ معہ حضرت لوطؑ کے اپنے قبیلہ (شمال) کی طرف روانہ ہوئے۔اس وقت ابراہیمؑ کے ساتھ بہت سا اسباب اور سیم وطلا تھا۔(تکوین باب 13۔آیت 2و3)

قیامِ حبرون

جناب ابراہیمؑ نے قحط کی شدت کی وجہ سے جب اپنے اہل وعیال کی گذران کی صورت بہتر نہیں دیکھی تو مصر کا سفر اختیار فرمایا تھا۔مگر خدائے مسبب الاسباب نے ان کی خوش حالی اور معیشت کے خاطر خواہ اسباب بلکہ اس سے المضاعف فراہم فرمادیئے اور آپ کامیاب ہو کر پھر کنعان کے علاقہ میں واپس آئے۔اور مقام حبرون میں بودوباش اختیار کی۔اور پھر اپنی تمام مقدس حیات کا زمانہ میں صرف فرمادیا۔چنانچہ آج تک یہ مقام خلیل مشہور ہے۔مقام حبرون کی سکونت کے وقت سے آپ کی حالت بہت کچھ قابلِ اطمینان ہوگئی تھی۔

آپ نے سیرۃ انبیاء ومرسلین کے مطابق اپنی دولت کو تبلیغ رسالت۔ رفاہ عام۔ اکرام ضیف اور عام عطا و ایثار کے نیک کاموں میں صرف فرمانا شروع کیا۔ قرب وجوار کے ریگستان میں متعدد کنوئیں کھدوائے جن میں سے بیر شبع بہت مشہور ہے اور قادیش اور اشور کے بیابان میں مسافروں کے آرام کرنے اور پھل کھانے کی غرض سے ایک باغ بھی لگا دیا۔ (سفر تکوین باب 21 در 514 او 30 ایضاً باب 21 درس 33)

علاقہ حارآن میں حضرت لوطؑ کی رسالت

رفاہ عام کے اعلیٰ خدمات کے علاوہ آپ کی مہمان نوازی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ باوجود اتنے کثیر امتداد ایام کے بھی۔ دسترخوان خلیل کا نام آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔ تبلیغ رسالت کے خدمات بھی خاطر خواہ کامیابی اور ترقی کے ساتھ جاری تھے۔ گرد ونواح کے لوگ آپ کی تشریف آوری کو حصول سعادت اور نزول برکت کا باعث سمجھنے لگے۔ اور آپ کے ارشاد وہدایت سے مستفیض ہوکر خدائے واحد کی ربوبیت اور اس کی وحدانیت کے قائل ہوکر دین حنیف ابراہیمی میں داخل ہونے لگے۔ تبلیغ رسالت کا شہرہ اور عام اخلاق وایثار کے اثار واخبار چاروں طرف پھیل گئے۔ علاقہ حارآن کے لوگ بھی مدت سے متلاشی ایمان تھے۔ اور وہ یہاں سے کسی قدر مسافت پر واقع تھا۔ اس لئے حضرت لوط کو آپ نے وہاں کے لوگوں کی تعلیم وہدایت کی غرض سے بھیجا۔ اور وہ ایک نبی متبع کی صورت وشان میں وہاں تشریف لے گئے۔ حضرت لوط کی کوئی علیحدہ یا خاص شریعت نہیں سمجھنی چاہیے بلکہ وہی شریعت ابراہیمی تھی جس کی تعلیم وتلقین کی ضرورت سے آپ اس علاقہ میں بھیجے گئے تھے۔

مزاوجت حضرت ہاجرہ اور ولادت حضرت اسماعیلؑ

حضرت ابراہیمؑ کا سن اس وقت ستر برس کا ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ خدا کے فضل وکرم سے گھر میں سب کچھ تھا۔ ہر طرح کی مقدرت ہر طرح کی آسودگی اور فارغ البالی حاصل تھی۔ ایک اولاد نہ ہونے سے سارا گھر بے چراغ تھا۔ اور آنکھوں میں دنیا تاریک تھی۔ فطرت انسانی کے اصول پر بے اولادی کا اثر حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ جناب سارہ کے دل پر طاری تھا۔ اور یہ دونوں بزرگوار معبود حقیقی کی بارگاہ میں اس حصول نعمت کے لئے ہمیشہ دست بدعا کرتے تھے۔ اور شب وروز اس مدعا کے لئے متمنی۔

حقیقت میں مشیت الٰہی کو آپ کی دعا کی اجابت تو ضرور منظور تھی۔ مگر اس کے حصول کے ذریعہ کی نسبت جناب سارہ کے مقابلہ میں حضرت ہاجرہ کو اولیت اور سبقت کا امتیاز واعزاز عنایت فرمانا منظور تھا۔ اس کی تفصیل کیفیت یہ ہے سن کے اعتبار سے حضرت ابراہیم بھی ضعیف ہو چکے تھے اور جناب سارہ بھی سن رسیدہ۔ اس بنا پر دونوں حضرات کو حصول اولاد کی طرف سے گویا مایوسی ہو چلی تھی۔ اصول فطرت کے مطابق حضرت سارہ کی مایوسی ابراہیمؑ کی ناامیدی سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس لئے سارہ نے اپنی طرف سے بالکل قطع امید فرما کر اپنے شوہر عالی مقدار کے بے نام ونشان رہ جانے پر کمال حسرت وافسوس کا اظہار فرمایا۔ اور ایسے برگزیدہ اور خدا رسیدہ بزرگ کی قطع نسل ہونے کے حسرت ناک واقعہ کو ناقابل برداشت خیال کر کے اس کے مقدس نام ونشان کی بقا وقیام کے سامان اپنے امکان

کے مطابق فراہم کرنا ضروری سمجھا۔ حالانکہ اصول فطرت کے مطابق نسوانی طبائع میں ایسے خیال اور اعتدال کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ بخلاف اس کے ہم حضرت سارہ کے دل میں اس کی ابتدااور وجود کو خدا کے الہام اور نظام قدرت کے القاء و مکاشفات یقین کرتے ہیں۔ کیونکہ بغیر ان خیالات وجذبات کے نسل ابراہیمی کے اس سرمایۂ ناز اور صاحب اعزاز سلسلہ کی نہ ابتدا قائم ہوسکتی تھی۔ اور نہ بقا جس سلسلۂ مقدسہ اور شجرۂ مبارک سے مشیت الٰہی کو جریدۂ نبوت کا خاتم اور سلسلۂ رسالت کا متمم پیدا کرنا تھا۔

چاہے کتب قدیمہ میں اس کی خبر نہ ہو۔ چاہے اہل تاریخ وسیر کی اس پر نظر نہ ہو۔ چاہے دوراز قیاس ہو اور خارج از عقل چاہے یہ جنبہ داری کہی جائے۔ یا مولف کی عقیدتمندان قلمکاری۔ مگر ہم پوچھیں گے اور لکھ کر پوچھیں گے کہ جناب سارہ کو بمقابلہ حضرت ہاجرہ عطائے اولاد میں شرف اولیت اور اعزاز وسبقت نہ تفویض فرمانا۔ مشیت کی کس خاص مصلحت اور علت پر مبنی تھا۔ باطن کا ہم کو علم نہیں۔ مگر ظاہر حقیقت اس کی بھی ہے اور ضرور بھی ہے کہ حضرت ہاجرہ کے سلسلۂ مقدس سے مشیت الٰہی کو۔ سید الانبیاء ختم المرسلین اور خاتم النبیین سلام اللہ علیہ وآلہ المعصومین کا وجود عالم موجود میں لانا مقصود تھا۔ جس کا مقابل اور مماثل حضرت سارہ کے اتنے بڑے کثیر التعداد سلسلہ انبیاء میں ایک بھی نہیں تھا۔ اس فضیلت اور شرف مراتب کے اعتبار سے حضرت واہب العطایا نے اولیت اور سبقت کا شرف مخصوصہ جناب ہاجرہ کو عنایت فرمایا ھذا فضل اللہ یوتیہ من یشاء

مشیت نے یہ سامان اور قدرت نے یہ اسباب پہلے سے مرتب کر لئے تو جناب سارہؑ نے اپنے کمال مایوسی کے عالم میں ایک دن حضرت ابراہیمؑ سے آپ کی بے اولادی کے متعلق کمال افسوس ظاہر کیا۔ اپنی ظاہری اور نسوانی ناقابلیتوں کے موجودہ عذر پیش کر کے اپنی ذات خاص کو حصول اولاد کا ذریعہ ہونا دشوار کیا قریب المحال ٹھہرایا جناب ابراہیم کو پہلے تو ان کی خاص مجبوریوں کے اظہار پر اور پھر اپنے آئندہ لاوارثی پر بہت ہی افسوس آیا۔ مگر سارہ نے یہ کہہ کر ان کے حزن وملال کو رفع کر دیا کہ آپ میرے بے نام ونشان رہنے کا کوئی افسوس نہ فرمائیں صرف اپنی بقائے نسل کی فکر کریں۔ اور وہ بالکل آپ کے امکان میں ہے اور نہایت آسان۔ ہاجرہ موجود ہیں ان کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ افضال ایزدی کے منتظر رہیں۔ شاید وہ آپ کے لئے ہاجرہ ہی کو حصول اولاد کا ذریعہ قرار دے۔

اب اس واقعہ کو تورات کی مفصلہ ذیل عبارت سے مقابلہ کر لینا بھی نہایت ضروری ہے۔

> سارا ابراہیم کی بیوی کوئی لڑکا نہ جنی اور اس کی ایک مصری لونڈی تھی۔ جس کا نام ہاجرہ تھا۔
> اور سارا نے ابراہیم سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے جننے سے باز رکھا۔ اب میری لونڈی
> کے پاس جائے۔ شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابراہیم نے سارا کی بات مان لی۔
> (تکوین باب 16 آیت 1-2)

حضرت ابراہیمؑ نے سارا کی تجویز پسند کی اور ہاجرہ کو شرف زوجیت عطا فرمایا۔ مشیت الٰہی کے اسباب درست ہو چکے تھے اور قدرت لامتناہی کے سامان مرتب اور تیار تھے۔ جناب ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ خدا کی قدرت اور رحمت نے۔ ابوالعرب عراق الشریٰ۔ ذبیح اللہ اول۔ حضرت اسماعیل ابن خلیل اللہ کا وجود ذی جود قائم کر دیا۔

ولادت اسماعیل کے متعلق آسمانی بشارتیں

یوں تو جناب ابراہیمؑ ہمیشہ نعمت اولاد سے اپنی محرومی اور ناکامیابی کا خیال کر کے خدائے سبحانہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عطائے اولاد اور بقائے نسل ونام کی دعائیں مانگا کرتے تھے اور خداوند عالم بھی آپ سے عطائے اولاد کے وعدے فرما کر آپ کی خاطر خواہ تسکین وتشفی فرمایا کرتا تھا۔جس کو ہم بہت جلد حضرت اسمٰعیلؑ کے خاص حالات میں تفصیل سے بیان کریں گے۔اس مقام پر ہم صرف انھیں بشارتوں کو ذیل میں لکھتے ہیں جو خدائے سبحانہٗ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اسمٰعیلؑ اوران کی اولاد کے متعلق پہنچائی تھیں۔

فطرت انسانی کا خاص تقاضہ ہے کہ حصول شئی کی امید ہوجانے پر۔انسان پھراس شئی مطلوبہ کی بہتری۔سلامتی اور بقا کا متمنی ہوتا ہے۔

براین امید ہائے شاخ در شاخ
کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

انہیں موقعوں کے لئے کہا گیا ہے۔اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ کو حاملہ پاکر پروردگار عالم سے صاحبِ حمل کی سلامتی اور طول عمری کی دعا تو ضرور مانگی۔اب چاہے اسے فطرت انسانی کا نتیجہ کہا جائے یا درد فرزندی کا تقاضہ۔خدائے مستجاب الدعوات نے حضرت اسمٰعیل کی ولادت کی نوید دی جن الفاظ میں ابراہیمؑ کے ان مستفسرات کا جواب آیا۔وہ عربی تورات میں اس طرح مرقوم ہیں۔

قد سمعت دعاك لا سمعيل وهانا باركته واثمرته وفضلته
كثيرا يولد اثنى عشر خليفة واجعله جيلا كبيرا۔

میں نے تیری دعا اسمٰعیل کے حق میں قبول کی۔ہاں میں نے اسے برکت دی۔اور اسے بارآور کیا اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔اس سے بارہ خلیفہ(امامؑ) پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم کروں گا۔

(پیدائش کتاب اول باب 17 آیت 20)

اسی طرح حضرت ہاجرہؑ کو بھی بشارت عطا فرمائی گئی۔توریت کتاب پیدائش میں مرقوم ہے:

خدا کے فرشتہ نے اسے(ہاجرہ کو) میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس جو صور کی راہ پر ہے۔پایا اور اس نے کہا اے ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سارا کے سامنے بھاگ آئی ہوں۔پھر خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس چلی جا اور اس کی تابع رہ پھر خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی اور خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی۔اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا

دکھ سن لیا۔(تکوین باب 21 آیت 1107)

ان بشارتہائے خداوندی اور نوید ہائے ایزدی سے حضرت اسمٰعیلؑ کی ذاتی عظمت اور نیز آپ کی اولاد طاہرین کی قدرومنزلت پورے طور سے ظاہر ہوگئی۔اور اس امر میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا کہ اس بشارت سے حضرت ہاجرہ کی تقدیس وتحریم پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ نظام مشیت کے انتظام اپنے وقت مقررہ پر کامل ہوئے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام رونق افروز چمنستان عالم ہوئے۔ ایسی دعاؤں اور تمناؤں والے فرزند کی تولید سے حضرت ابراہیمؑ کو کیسی روحی مسرت اور قلبی فرحت حاصل ہوئی ہوگی۔اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہوگا کہ خانہ ابراہیمی میں مدت مدید کی تاریکی کے بعد یہ پہلا چراغ تھا۔جو خدا کے انوار رحمت سے روشن ہوااور اتنے زمانہ دراز کی ویرانی کے بعد۔اس گوہر یکتا کے وجود سے خانہ خلیل الٰہی کی آبادی اور رونق قائم ہوئی۔

سارہ اور ہاجرہ میں مشاجرت

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ حضرت سارہ کی جناب ہاجرہ کی طرف توجہ اور شفقت اصول فطرت نسوانی کے بالکل خلاف تھی۔مگر قدرت کو اپنا کام نکالنا تھا اور مشیت کو اپنی ضرورت پوری کرنی تھی۔اس نے ایک خاص وقت تک سارہ کے دل میں ہاجرہ کی طرف سے خیال مخالفت نہ پیدا ہونے دیا۔یہاں تک کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ سے سفارش وفرمائش کرکے خود ہاجرہ کو ان کی زوجیت کا شرف دلوایا۔جب اس شرف خاص سے مشرف ہوکر حاملہ ہوچکیں تو سارہ کے دل میں فطرت نسوانی کے اثر خطور کرنے لگے اور ہاجرہ کی طرف سے چیں بجیں رہنے لگیں۔یہاں تک ایک بار غصہ میں آکر ہاجرہ کو گھر سے باہر نکالدیا۔توریت کی مفصلہ ذیل عبارت میں اس واقعہ کی حقیقت کھل جاتی ہے۔

> جب اس نے (ہاجرہ نے) جانا کہ میں حاملہ ہوئی تو اپنی بی بی (سارہ) کو حقیر جانا۔تب سارہ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ ناانصافی جو مجھ پر ہوئی تیرے ذمہ ہے۔ میں نے اپنی لونڈی تجھے دی۔اور اب جو اس نے اپنے آپ کو حاملہ پایا تو میں اس کی نظروں میں حقیر ہوگئی۔میرا اور تیرا انصاف خدا کرے۔ابراہیمؑ نے سارہ سے کہا کہ تیری لونڈی تیرے ہاتھ میں ہے جو تیری نگاہ میں اچھا ہو۔سو اس کے ساتھ کر۔تب سارا نے ہاجرہ پر سختی کی اور وہ اس کے سامنے سے بھاگ گئی (اس کے آگے ہاجرہ پر فرشتہ رحمت کا نازل ہونا۔اور ولادت اسمٰعیل کی بشارت۔جیسا کہ اوپر بیان ہوئی۔پہنچائی جانا مذکور ہے۔) تکوین باب 16 آیت 4-6

توریت کی مرقومہ بالا عبارت نے پوری حقیقت کھول دی۔ایسے موقعوں پر فطرت نسوانی کے ایسے ہی اثر اور توہمات پیدا ہوتے ہیں۔بات میں بات اور شاخ میں شاخ نکالی جاتی ہے۔ہاجرہ کے حقیر جاننے کا مسئلہ بھی انہیں توہمات کا اثر خاص سمجھا جائے گا۔غرض قصور ڈھونڈ کے پیدا کئے جفا کے لئے۔حضرت ابراہیمؑ اس مشاجرت کا کوئی تصفیہ نہ کرسکے۔اور حقیقتاً ایسے اوقات میں مرد فیصلہ کن رائے

ظاہر کرنے اور ایک طرفہ حکم لگانے سے بالکل مجبور رہ جاتا ہے۔ اصول معاشرت اور تاہل کے یہ روزانہ کے مشاہدات ہیں۔

حضرت سارہ کے اختلاف کی بنیاد تو اسی وقت سے پڑی۔ فرشتہ رحمت کی بشارت اور حکم خداوندی کی ہدایت کے مطابق جناب ہاجرہ پھر گھر میں واپس آئیں۔ حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ بڑے ناز ونعم سے پرورش پاتے رہے۔ تکوین باب 17 آیت 23۔ یہاں تک کہ اسماعیل سولہ برس کے ہوگئے۔ قدرت الٰہی نے اسی سال اپنی معجز نمائی کی قدرت دکھلا کر حضرت سارہ کے بطن سے جناب اسحاق کو پیدا کیا۔ اسحاق کی ولادت ہی سے سارہ کے دل میں ہاجرہ کی مخالفت قوت پکڑنے لگی۔ اور روز بروز اس میں نمایاں ترقی ہونے لگی۔ اور آخر کار ہاجرہ کے ساتھ سخت نفرت اور حقارت قائم کر دینے کی باعث ہوئی۔ اس مشاجرت اور مخالفت کا اصلی سبب وہی ہے جو توراۃ کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

> سارہ نے دیکھا کہ ہاجرۂ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیمؑ سے جنی تھی۔ ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے۔ کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہیں ہوگا۔ پر اپنے بیٹے (اسمٰعیلؑ) کی خاطر یہ بات ابراہیمؑ کی نظر میں نہایت بری معلوم ہوئی۔ (تکوین باب 21 آیت 9-11)

مرقومۂ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ سارا کو ابراہیمؑ و اسحاقؑ کی باہمی مساوات نہایت ناگوار گذری۔ اس خیال مساوات کے بعد ان کو آگے چل کر اسمٰعیل کے حقوق وراثت کے اندیشے بھی پیدا ہوئے۔ اور غایت مال اندیشی سے انہوں نے اسمٰعیل کا گھر میں رہنا اپنے لڑکے اسحاقؑ کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے سخت مضر اور نقصان دہ ٹھہرایا اور اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جناب ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے اخراج کا فوراً حکم دے دیا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ خاندان نبوت کا ہر شخص معصوم ہو۔ اور نفسانیت۔ حسد۔ رشک اور دیگر جزئیات طبع انسانی سے پاک وصاف ہو۔ اسی اصول کی بنا پر سارہ کی فہمائش کو سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے بیٹے اور ہاجرہ کے بیٹے کے درمیان عدالت اور مساوات کے سلوک قائم نہ رکھ سکیں۔ ایسے سخت اور تکلیف دہ حکم صادر فرمانے کے وقت اگر سارا کے دل میں اسمٰعیلؑ کا درد نہیں آیا تھا تو ان کی ماں ہاجرہ کی رفاقت خدمت اور ہر قسم کی راحت رسانیوں پر تو ضرور لحاظ کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو چکا تھا۔ مزاج بدل گیا تھا۔ حالت دگرگوں ہوگئی تھی۔ جس طرح ہاجرہ پر پہلے شفقت و مہربانی کی نظر تھی۔ اسی طرح اب ان سے عداوت ہے اور تنفر۔ پہلے سارہ نے بقائے نسل ابراہمی کی تمنا میں پڑ کر خود ہاجرہ کو شرف زوجیت دلوایا اور ان کو اپنے برابر کی بیوی بنوایا تھا اور اب اسحاق کی پیدائش کے بعد تغیر مزاج اور تلون طبع نے وہ رنگ دکھلایا کہ اب ایک دم کے لئے بھی ان ماں بیٹوں کی صورتیں گھر میں دیکھنا نہیں چاہتیں۔

حضرت سارہ کی ایک وقت میں اتنی توجہ اور مہربانی اور پھر دوسرے وقت ایسی ناتوجہی اور نامہربانی کو کس سبب ظاہری پر مبنی بتلائی جائے مگر سبب حقیقی کے متلاشی تو ان امور کو تصرفات قدرت کے مخفی راز یقین کریں گے۔ ضرورت کے اعتبار سے مشیت نے ان مخالف انداز طبیعت سے اپنے مدعا کو پورا کرنے کے لئے نظام درست کر لئے۔ توجہ اور مہربانی سے سلسلہ اسماعیلی کا وجود قائم کر دیا۔ اور پھر

ناتوجھی اور بے مروتی سے بنو اسماعیل کی اقطاع عالم میں وسیع آبادی پھیلانے کی ترکیب نکال کر اس سلسلہ عالی کو امت عظیم قرار دینے کی بشارت پوری کردی۔

حضرت ابراہیمؑ کو سارہ کی یہ بے جا فرمائش نہایت ناگوار گذری۔ مگر ان کے حزن و ملال کی تسکین و تشفی فوراً بارگاہ قدرت سے کردی گئی۔ اور باتفاق جمہور دارالنظام مشیت سے حضرت ابراہیمؑ کو سارہ کے کہنے پر عمل کرنے کا حکم ہوا۔ ہم اس کو توریت کی عبارت سے ذیل میں لکھتے ہیں۔

> خدا نے ابراہیمؑ سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بری معلوم نہ ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں۔ جو سارہ نے تجھ سے کہی اس کی آواز پر کان رکھ۔ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے دکھلائے گی اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس لئے کہ وہ بھی تیری نسل ہے۔ (تکوین باب 21 آیت 12۔13)

اب اس حکم الٰہی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ مجبور ہو گئے اور سارہ کی فرمائش پوری کرنے پر مامور۔ اس فرمان ایزدی کی تعمیل فرمائی۔ ہم اس کی کیفیت بھی توریت ہی کی عبارت سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ اور ہاجرہ کی مقام جبرون سے علاقہ فاران (حجاز) کی طرف ہجرت

> حضرت ابراہیمؑ صبح سویرے اٹھے۔ روٹی اور پانی کا مشکیزہ لے کر ہاجرہ کو دیا اور ان کے کاندھے پر رکھ دیا اور لڑکے کو بھی انہیں دے کر روانہ کیا۔ وہ رخصت ہو کر بیرسبع میں حیران و سرگرداں رہے۔ یہاں تک کہ لوٹے یا مشکیزہ میں جتنا پانی تھا سب ختم ہو گیا۔ ہاجرہ نے لڑکے کو ایک درخت کی جڑ کے نیچے لٹا دیا اور خود ایک تیر کے فاصلہ پر اس کے سامنے جا بیٹھیں۔ اس غرض سے کہ اپنے بیٹا کا (پیاس کی شدت سے) مرنا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ اس کے سامنے بیٹھ کر ہاجرہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ خدا نے ان کے بیٹے کی آواز سن لی اور خدا کے فرشتہ نے ہاجرہ کو آواز دی اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ۔ تجھ پر کیا واقعہ گذرا ہے۔ تو خوف نہ کر کہ خدا تعالیٰ نے تیرے بچہ کی وہیں آواز سن لی ہے جہاں وہ پڑا ہوا ہے۔ تو اٹھ اور اپنے لڑکے کو اٹھا لے۔ اور اپنی گود میں لے لو کیونکہ ہم اس کو ایک امت عظیم کرنے والے ہیں۔ اور خدا نے ہاجرہ کی آنکھوں کو کھول دیا اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور اس کی طرف چلی۔ وہاں پہنچ کر اپنا مشکیزہ بھر لیا اور اپنے بیٹے کو پلایا اور خدا اس کے لڑکے کے ساتھ (ہمیشہ) رہا۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اور بیابان میں ساکن ہوا اور بہت بڑا تیرانداز ہوا۔ اور بیابان فارس

میں آباد ہوا۔ اور اس کی ماں نے ایک مصری لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ (تکوین باب19 آیت9۔21)

توریت کی عبارت کو ہم نقل کر چکے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی زبانی صرف یہ فقرہ مذکور ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ

پروردگارا میں نے اپنی اولاد کو تیرے خانۂ مقدس کے پاس ایک ناقابل زراعت بیابان میں ساکن کیا ہے۔

قرآن کی مرقومہ بالا عبارت سے صرف ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کی جائے سکونت معلوم ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل کا انکشاف نہیں ہوتا۔ لیکن مفسرین ومحدثین نے اس کی پوری تصریح کر دی اور عربی کی قدیم وجدید تاریخوں نے کامل شرح وبسط کے ساتھ ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ ہم ذیل میں ابن اثیر، مواہب لدنیہ، روضۃ الاحباب۔ اور تفسیر کشاف کے خلاصہ ترجمہ سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھے۔ ہاجرہ اور اسماعیلؑ کو ساتھ لیا۔ اور اس زمین پر آئے جہاں اب حرم مکہ ہے۔ اس وقت اس قطعہ زمین پر نہ عمارت نہ زراعت نہ پانی اور نہ کسی قسم کی آبادی تھی۔ کیونکہ حضرت سارہ کی ایک فرمائش بے جا یہ بھی تھی کہ ان ماں بیٹے کو ایسی جگہ لے جانا چاہیے اور تنہا چھوڑ دینا چاہیے کہ جہاں نہ پانی ہو نہ آبادی۔ اور چونکہ خدا کی طرف سے سارہ کی مطابقت اور دلجوئی کے لئے آپ مامور ہو چکے تھے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ ان کو اس مرتفع مقام پر لے گئے جہاں خانہ کعبہ کی موجودہ عمارت قائم ہے اور وہاں لے جا کر ان کو چھوڑ دیا۔ اور ایک تھیلی میں خرما اور ایک مشک میں پانی ہاجرہ اور اسماعیل کی ضرورت کے لئے چھوڑ دیا اور خود وہاں سے چلے آئے اور پھر ان کی طرف کوئی التفات نہ فرمائی۔ ہاجرہ یہ دیکھ کر ابراہیم کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں کہ تم مجھ کو اور میرے بچے کو اس بیابان میں جہاں نہ کوئی رفیق نظر آتا ہے اور نہ ضرورت کی کوئی چیز چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہو۔ مگر ابراہیمؑ ان کے معروضہ اور استغاثہ کا کوئی جواب نہیں دیتے اور نہ پیٹھ پھیر کر ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کلمات مایوسانہ کو ہاجرہ نے کئی بار کہا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ نے ایک بار بھی نہ اس کا جواب دیا اور نہ ان کی طرف پھر کر دیکھا۔ آخر کار ہاجرہ نے پوچھا کہ خدا نے تم کو ایسا ہی حکم دیا۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا۔ ہاں۔ اب حضرت ہاجرہ سمجھ گئیں کہ ابراہیمؑ مجبور ہیں۔ خدا کا حکم ایسا ہی ہے۔ یہ معلوم کر کے ہاجرہ نے رضائے الٰہی پر صبر کر لیا۔ اور یقین کر لیا کہ خدا ہمیں کسی طرح تباہ وبرباد نہ کرے گا۔ یہ یقین کر کے حضرت ابراہیمؑ کے تعاقب سے واپس آئیں اور اس خرمے اور پانی کو اپنی اور اپنے صاحبزادے کی ضرورتوں میں صرف فرماتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ خرمے اور پانی بالکل تمام ہو گیا۔ اور اب دونوں حضرات پر بھوک اور پیاس کا سخت غلبہ ہوا۔ حضرت اسماعیلؑ بے تاب ہو کر زمین پر تڑپنے لگے۔ ماں سے یہ عالم نہ دیکھا گیا۔ وہاں سے اٹھیں اور کوہ صفا کی طرف روانہ ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی رہیں۔ پہاڑ سے اس وادی کے چاروں طرف دیکھتی رہیں کہ شاید کوئی فریادرس دکھلائی دے۔ مگر کسی کو نہ پایا۔ پھر کوہ صفا سے اتریں۔ چادر زمین پر کھینچتی ہوئی جلدی جلدی دامنِ وادی کو طے کرتی ہوئی کوہ مروہ پر تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر تک ٹھہری۔ کسی کو نہ پایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اسی طرح سات بار آپ نے سعی کی۔ یہ دستور اس وقت سے لے کر اس وقت تک حاجیوں میں قائم ہے۔ حضرت ہاجرہ ہر بار حضرت اسماعیلؑ کے پاس آ کر ان کا حال دیکھ جاتی تھیں۔ آخری بار

جب بیٹے کے پاس آئیں تو اس کو قریب ہلاکت پایا۔ مایوس ہو کر گریاں و نالاں پھر کوہ مروہ پر چڑھ گئیں تو ایک آواز اب کی بار اُن کے کان میں آئی۔ اس آواز سے ہاجرہ نے خطاب کر کے کہا کہ میں نے تیری آواز تو سن لی۔ اگر تو حقیقت میں میرا فریاد رس ہے تو میری فریاد کو بھی پہنچ اور میری خبر بھی لے۔ حالانکہ وہ آواز خدا کے فرشتہ جبرئیل کی آواز تھی۔ اور وہ اس وقت حضرت اسماعیلؑ کے پاس کھڑے تھے۔ ہاجرہ کی ندا سن کر خدا کے فرشتہ نے پوچھا کہ تو کون ہے جو مجھے پکارتی ہے ہاجرہ نے جواب دیا۔ میں ہوں ہاجرہ۔ ابراہیمؑ کی بی بی اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کی ماں۔ فرشتہ (جبرئیل) نے پوچھا کہ ابراہیمؑ نے اس بیابان میں تم لوگوں کو کس پر چھوڑا ہے۔ ہاجرہ نے کہا کہ خدائے سبحانہٗ تعالیٰ پر۔ جبرئیلؑ نے کہا بس وہی تمہارے لئے کافی ہے۔ جس پر تمھیں چھوڑا ہے۔ یہ کہہ کر جبرئیل نے اپنے پاؤں سے یا پروں سے اس زمین پر ضرب لگائی۔ وہاں سے پانی کا چشمہ جاری ہوا۔ اتنے میں ہاجرہ اسماعیلؑ کے پاس چلی آئیں تو پانی کا ایک ابلتا ہوا چشمہ نظر آیا۔ ہاجرہ خود بھی سیراب ہوئیں اور اسمٰعیلؑ کو بھی سیراب کیا۔ پھر یہ خیال کر کے یہ پانی بھی ختم نہ ہو جائے اس وجہ سے کے کناروں کو باندھ کر اس کو ایک حوض کی شکل میں بنا دینا چاہا۔ کہ پانی اس میں جمع رہا کرے اور پانی کی مشک آسانی سے بھر لی جایا کرے۔ جبریل نے ہاجرہ کی تسکین کی۔ اور کہا کہ پانی کی کمی کا ذرا خیال نہ کر و اور نہ ڈرو کہ اس وادی کے رہنے والے پیاسے رہیں گے۔ کیونکہ وہ چشمہ ہے جس سے خدائے سبحانہٗ تعالیٰ اپنے مہمانوں کو ہمیشہ سیراب فرمایا کرے گا۔ (ابن اثیر۔ مطبوعہ مصر جلد اول۔ روضۃ الاحباب باسناد مواہب لدنیہ ابن حجر عسقلانی جلد اول ص 57 لکھنؤ۔ حیات القلوب مجلسی جلد اول۔

حقیقت کی تلاش کرنے والے اصلیت کے ڈھونڈنے والے مرقومہ بالا عبارتوں پر غور کر کے خود نتیجہ نکال لیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ اس واقعہ کے متعلق تورات میں جو کچھ تحریر ہے۔ تھوڑے ہی اختلاف کے ساتھ وہی عربی تاریخ و حدیث کے کتابوں میں بھی مرقوم ہے۔ ہاجرہ اور اسماعیلؑ کی ہجرت پر سارہ کا اصرار۔ حضرت ابراہیمؑ کا بے حد حزن و ملال۔ سارہ کی فرمائش پوری کر دیے جانے کے لیے خدا کا مصلحتانہ حکم۔ حضرت اسماعیلؑ کی ازدیاد اولاد۔ اور امت عظیم ہونے کی بشارت اور ان کے بابرکت ہونے کی نوید۔ جلا وطنی میں ماں بیٹے پر تشنگی کی سخت مصیبت۔ بیٹے پر قریب المرگ ہو جانے کی حالت۔ ماں کا لا انتہا اضطرار و اضطراب ماں کی جستجوئے آب۔ خدا کے فرشتہ کی ندائے غیب۔ ہاجرہ کے اضطراب میں اس کے تشفی بخش خطاب و کلمات۔ خدا کا ہمیشہ اسماعیل کی امداد پر تیار رہنے کی بشارت۔ پھر ہاجرہ کو چشمہ آب دکھلانا۔ ہاجرہ کا اس پانی سے بیٹے کو سیراب کرنا۔ اور پھر خدا کا اس کے بیٹے کے ساتھ ہمیشہ رہنا وغیرہ وغیرہ بالاتفاق درج ہے۔

اختلاف ہے تو دو امور میں۔ اول یہ کہ تورات کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے صرف ان ماں بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ نہ ان کے ساتھ گئے اور نہ پھر ان کی کوئی فکر و تلاش کی۔ وہ مصیبت کے مارے پھرتے پھراتے بیر سبع سے دشتِ فاران میں خود پہنچ گئے۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیمؑ کا مع ہاجرہ و اسماعیلؑ بیک بار چلا آنا معلوم ہوتا ہے۔ توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ماں بیٹے بیر سبع میں آئے وہاں سے فاران میں۔ اور فاران کی اصلیت و ماہیت میں بہت اختلاف ہے۔

اول اختلاف کی نسبت ہم پوری تفصیل سے انکشاف حقیقت کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کو اپنے ہمراہ لا کر بیابان فاران (حجاز) میں پہنچا گئے۔

سر سید مرحوم خطبات احمدیہ میں بھی تورات کی عبارت واقعہ پر اعتبار کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ ایسے صاف لفظوں میں اس واقعہ کو تحریر فرماتے ہیں جس کو کوئی مسلمان پسند نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ اور اسمعیلؑ کو اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس اندازِ تحریر اور الفاظ بیان سے۔ جو متعصبین یہود کی خاص الخاص تقلید اور حاسدین نصاریٰ کی صاف صاف تائید ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایسے عظیم الشان عمیم الاخلاق والاحسان پیغمبر اور ابوالانبیاء و والمرسلین کے مکارم اخلاق اور محاسن عدل و انصاف کے پاک وصاف دامن پر۔ ناانصافی بے مروتی اور بد خلقی کے بدنما اور ناز یبا دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اور نیز ان واقعات سے حضرت ہاجرہ اور جناب اسماعیل کی کسر شان۔ استخفاف حقوق اور اقتصار عظمت اور تقدیس ثابت ہوتی ہے۔ جن کی قدر منزلت کو سید صاحب اپنے اکثر مباحث میں قوی دلائل سے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں انھیں کے اخبار و اسفار سے ایک بار نہیں کئی بار ثابت کر آئے ہیں۔

تورات کا یہ بیان اور سید صاحب کا اس پر حیرت انگیز اعتبار و اقرار کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بی بی ہاجرہ اور اپنے نوجوان بیٹے اسماعیلؑ کو محض یکہ و تنہا گھر سے نکال دیا۔ قولاً اور فعلاً۔ خلاف عقل۔ خلاف قیاس اور خلاف واقع معلوم ہوتا ہے۔ ایک معمولی درجے والے آدمی سے ایسے بداخلاقانہ افعال کا سرزد ہونا جب اس کی حد درجہ کی شکایت و ملامت کا باعث ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو ایک ایسے برگزیدہ بزرگوار سے جو منجانب اللہ صاحب شریعت ہو اور بندگان خدا کو تہذیب و اخلاق۔ تمدن و معاشرت کی تربیت و تعلیم کے لئے مبعوث کیا گیا ہو۔ ایسے افعال ذمیمہ اور اطوار قبیحہ کا عمل میں لایا جانا ہرگز صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ کیا جناب ابراہیمؑ کی عدالت۔ آپ کی شریعت۔ آپ کا اخلاق۔ آپ کی مروت اور عام انسانی ہمدردی۔ جو عموماً ہر فرد بشر کی طبیعت میں قدرت کی طرف سے ودیعت فرمائی گئی ہے۔ اسی کی مقتضی تھی کہ اپنے واجب النفقہ اہل و عیال کو بلا وجہ۔ بے سبب۔ صرف ایک دوسری بی بی کے کہنے سے۔ اس ذلت اور حقارت۔ اس بلا اور مصیبت کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا جائے۔ پھر بی بی وہ عفیفہ۔ جس کی اطاعت۔ حسن خدمت اور رفاقت۔ بیس برس کے زمانہ دراز تک ہر قسم کا آرام ہر طرح کی راحت پہنچا چکی ہو۔ اور سفر و حضر کے تمام مصائب و نوائب میں شریک و رفیق رہ چکی ہو۔ فرزند بھی وہ فرزند صالح جس کی عظمت اور بزرگی توریت مقدس کی بشارت سے ایک جگہ ثابت ہو چکی ہو۔ خود جناب ابراہیمؑ کو وہ فرزند صالح ایک عظیم امت کا مورث اور حضرت ہاجرہ کو بارہ خلفائے ارض کا باپ اور جد اعلیٰ بتلایا گیا ہو۔ کیا کوئی محض محدود اور ادنی عقل رکھنے والا شخص بھی ایک ساعت کے لئے اس کو مان سکتا ہے کہ یہ دونوں بزرگوار (حضرت ہاجرہ اور جناب اسماعیلؑ) حقیقتاً دنیا میں ایسے لاوجود۔ بے کار اور محض بے سود ہستیاں سمجھ کر گھر سے نکال باہر کر دئے گئے۔ سید صاحب کے اس بے جا اقرار و اعتراف پر جو اسلامی اخبار و آثار کے بالکل خلاف ہے۔ وقت تحریر سے لے کر آج تک برابر تعریض و تنقید ہوتی چلی آئی ہے۔ صاحب ارض القرآن نے بھی (اگرچہ یہ بحث ان کے موضوع تالیف سے بالکل علیحدہ تھی) جناب ہاجرہ و اسماعیلؑ کے ضمنی تذکرے میں اپنی غیرت اسلامی اور حمیت دینی سے اس کی تنقید و تردید فرما دی ہے ذیل میں ان کی عبارت ملاحظہ ہو۔

تورات میں یہ مذکور نہیں کہ ابراہیمؑ بھی ساتھ آئے تھے۔ لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے عزیز بچہ کو جس کی پیدائش کی اس نے خود دعا کی

ہو۔جس کی زندگی کے لئے اس نے خداسے دعامانگی ہو۔اس کوتنہابے آب وگیاہ مقام پر ہمیشہ کے لئے جانے دے۔

صحیح بخاری میں۔ جو روایات اسلام میں صحیح تر ہے۔حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ ابراہیمؑ اور ان کی بیوی (سارہ) کے درمیان جو واقع ہوا۔ اس کے بعد ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ اور اسماعیلؑ کی ماں کو لے کر نکلے ساتھ پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ام اسماعیلؑ پانی مشکیزہ سے پیتی تھیں۔اور اس سے دودھ بچہ کے لئے ہوتا تھا یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام مکہ پہنچے۔اور ایک جھاڑی کے نیچے اس کو رکھ دیا۔ پھر ابراہیم اپنے گھر واپس آنے لگے ام اسماعیل نے پیچھے کداء(مکہ کا ایک مقام) تک آئیں۔ام اسماعیل علیہ السلام نے پکارا کر کہا۔ابراہیم علیہ السلام تم مجھے اس وادی میں جہاں نہ کوئی آدمی ہے اور نہ کوئی چیز ہے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو؟ (اختلاف روایات) کیا تم خدا کے حکم سے مجھے یہاں چھوڑتے ہو۔ ابراہیم نے کہا ہاں۔ ام اسماعیلؑ نے کہا۔تو پھر خدا ہم کو ضائع نہ کرے گا۔ (ارض القرآن ج1 ص51)

ہم نہیں سمجھتے کہ عربی تفسیر۔حدیث اور تاریخ کی کتابیں اور ان کی مقامی اور آبائی روایتیں۔ جو عہد ابراہیمی اور دور اسمعیلی سے اہل عرب میں سلسلہ بسلسلہ اور سینہ بسینہ چلی آتی ہیں اور جن کے لئے وہ تمام قوموں میں خاص طور پر ممتاز سمجھے گئے ہیں اور خود سید صاحب۔ مرحوم جن کی حقیقت اور صداقت پر اپنے خطبات کے اکثر مقامات پر تائید فرما چکے ہیں۔صرف تورات کے مخالف ہونے کے تنہا جرم میں کیسے ساقط الاعتبار سمجھی جائیں گی اور پھر اس شدت کے ساتھ کہ اس کی رو سے اگر چہ مقدس رسول کی تقدیس وتنزیہ مکارم ومسالک میں تعریض وتنقیص صریح لازم بھی آتی ہو۔مگر تاہم انھیں کی صحت کو ترجیح دی جائے گی۔ حالانکہ واقعہ۔واقعہ کی صورت اور واقعہ کی عبارت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ ایسی سنگدلی۔ بیدردی۔اور شقاوت نہ کبھی اخلاق الٰہی کی شان کہی جاسکتی ہے اور نہ محاسن خلیل الٰہی کے شایان ہوسکتی ہے۔ بلکہ تمام اسباب وقرائن صاف صاف بتلا رہے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ماں کی حقارت اور ذلت ثابت کرنے کے لئے۔ابراہیم کے ساتھ جانے یا پہنچانے والی عبارت اور اس کے تمام مضامین۔ جیسا کہ اسلامی اور عربی اخبار وآثار میں اس وقت تک محفوظ ومرقوم ہیں۔نفسانیت کے بندوں نے خدا کی اس کتاب سے نکال دیئے۔

اب رہا تورات کا فی نفسھا۔صحیح الاسناد ہونا۔اس کا یہودی اور عیسائی تو دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔کم معلومات مسلمان کہاں تک اس کو ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔اس مسئلہ میں ایک مثال اطمینان کے لئے کافی ہے تورات کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل اس وقت بچے تھے۔اور دودھ پیتے تھے۔اور اسی تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت اسحاق کے وقت ان کا دودھ چھوٹ چکا تھا۔ باپ عقیقہ بھی کر چکا تھا اور تورات میں عقیقہ کئے جانے کے وقت اسماعیل کا سنِ تیرہ برس کا قطعی طور پر بتلایا گیا ہے۔اور یہ تمام واقعات اخراج ہاجرہ اور ولادت اسحاق کے قبل کے ہیں۔ ولادت اسحاق کے تین برس بعد واقعہ اخراج ہاجرہ پیش آنا لکھا گیا ہے تو اس

بناء پر اسماعیلؑ کا سن ترک وطن کے وقت سولہ اور سترہ برس کے درمیان میں ثابت ہوتا ہے۔ اسی سے تورات کے اختلاف بیانات کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوجاتا ہے کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی مسئلہ کی نسبت اس میں دو متضاد و مختلف مضامین پے در پے مندرج ہیں۔ ایک سے صاحب واقعہ کی شیر خوارگی اور عالم گہوارگی معلوم ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کے نوجوان اور صاحب ریش و بروت ہونے کا ثبوت پایا جاتا ہے۔ بندوں کی کتاب جب ایسے مخالف اور مناقص کے باعث قابل اعتبار نہیں سمجھی جاتی۔ تو پھر خدا کی کتاب ایسے اختلاف و تضاد کو پہلو میں لے کر کیسے صحیح الاسنا اور واجب الاعتقاد تسلیم کی جائے گی۔

ایسے بین ثبوت اور صحیح مثالوں کے علاوہ۔ حضرت ہاجرہ اور اسماعیلؑ کی ذلت و حقارت کے متعلق جیسے جیسے نازیبا اور بے جا الفاظ عبارات تورات میں مستعمل اور مرقوم ہیں۔ وہ علی الاعلان بتلا رہے ہیں کہ یہ اس سچے۔ عادل اور غیر متبدل خدائے برحق کے الفاظ و کلمات ہرگز نہیں ہوسکتے۔ جو اس بی بی کے اوپر اپنا فرشتۂ رحمت نازل فرما کر اس کی تسکین و تشفی۔ اس کے بچہ کی نوید ولادت۔ اس کے مورث امت عظمیٰ ہونے کی بشارت۔ اس کے اور اس کے بچے کے ساتھ ہمیشہ رہنے کا وعدہ فرما چکا ہو۔ اور جو مرقومہ بالا عبارات بشارت میں متواتر طور پر اس بی بی اور اس کے لڑکے کی عظمت و تقدیس کا مقر ہو چکا ہو۔ تو اس بنا پر ہم کو پورا یقین ہے اور تنہا یقین ہی نہیں ہمارا مسلم اعتقاد ہے کہ تورات کے یہ تمام الفاظ مخالف اور مضامین مناقص جن سے اخلاق خلیل الٰہی کی کسیر عصمت و منزلت ہاجرہ کی توہین اور عظمت و اقتدار اسماعیلی کی تنقیص ظاہر ہوتی ہے ہرگز ملفوظات ربانی نہیں ہیں۔ بلکہ بالکل موضوعات انسانی۔ جب تورات میں اتنے اختلاف و تضاد کے مواد کا ذخیرہ موجود ہو۔ اور جس کو خود یہودی اور عیسائی اعترافاً للواقع صحیح مانتے ہوں تو پھر ان موضوعات و مصنوعات پر اک مسلمان محقق کا اعتبار کر لینا اور اس کو اپنا مختار قرار دے لینا کس قدر شرمناک اور عبرت خیز ہے۔

ہمیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سن مبارک کی نسبت علیحدہ بحث کرنی مقصود ہے۔ اس لئے کہ مرویات اسلامی اور خصوصاً بخاری شریف میں شیر خوارگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس پر حفظ ما تقدم کے خیال سے ہم اوپر نوٹ (نظریہ) دے آئے ہیں۔ ہم مسئلہ زیر بحث کو تمام کر کے اپنے آئندہ سلسلہ بیان میں اس مسئلہ کو بار دیگر بہت جلد صاف کرتے ہیں۔

دشت فاران سے ارض حجاز اور حوالی مکہ مراد ہے۔

اب ہمیں دوسرے امر کی طرف رجوع علی التحقیق کرنا ہے اور وہ دشت فاران کی اصلیت۔ حقیقت اور اس کے موقع و مقام کا انکشاف ہے۔

اہل عرب کے تمام مرویات قدیم اور اسلام کے تمام تالیفات و تصنیفات میں اس مسئلہ کے متعلق بالاتفاق الجمہور مرقوم و مذکور ہے کہ جناب ابراہیم علی نبینا و آلہ و علیہ السلام اپنی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ اور اپنے فرزند ارجمند جناب اسماعیلؑ کو حکم الٰہی کے مطابق۔ مکہ معظّمہ سے ملے ہوئے اس بیابان میں۔ جو دشت فاران کے نام سے آج تک تمام کتب قدیم میں مرقوم ہے پہنچا گئے۔

قرآن مجید میں نہ فاران ہے نہ پاران۔ اس میں مقام سکونت کی نسبت صرف) بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ (اپنے خانہ محترمہ کے پاس۔ نہ قابل زراعت صحرا میں) لکھا ہے جس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے ان لوگوں کو اس

نا قابل زراعت صحرا میں پہنچا دیا تھا جو مکہ سے ملا ہوا تھا۔ اس لئے تاوقتیکہ۔ یہ نا قابل زراعت صحرا حقیقت میں دشت فاران نہ ثابت کر لیا جائے۔ قرآن مجید کی عبارت تورات کی بشارت سے مطابق نہیں ہوتی۔ (سفر تکوین باب 21 آیت 14)

سفر تکوین باب 21 درس 6 میں فاران کی جگہ ایل فاران لکھا ہے۔ ان دونوں سے لیکن ایک ہی مقام مراد ہے۔ اور جغرافیہ قدیم و حال کے مطابق اس سے وہی کوہستانی سلسلہ مراد ہے۔ جو صفا۔ مروہ۔ ابوقبیس وغیرہ مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ اور مکہ کے ارد گرد واقع ہیں۔ توریت کے باب 21 آیت 6 میں۔ فاران کے پہلے لفظ ایل آیا ہے جس کے معنی عبرانی زبان میں خدا کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہور قدرت کا کوئی واقعہ اس سے متعلق ہے یا متعلق ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے یہ پہاڑ خدائی پہاڑ کے نام سے خاص طور پر موسوم ہوئے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس عبرانی لفظ ایل کا عربی تالیفات میں بھی کہیں نشان بنتا ہے یا نہیں جب ہم اس کی نسبت تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظّمہ کے گرد و نواح میں جتنے پہاڑ ہیں وہ آج تک آلال مشہور ہیں۔ اور الال صاف صاف لفظ ایل کی جمع ہے۔ جو اہل عرب نے اپنی زبان کے قاعدے کے مطابق بنالی ہے۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث بالکل صاف ہو گیا کہ ایل فاران۔ مصرحہ تورات۔ حقیقتاً اسی کوہستانی سلسلہ کا نام ہے جو مکہ کے آس پاس واقع ہے۔ اور جن میں صفا۔ مروہ۔ ابوقبیس۔ ثور۔ حرا وغیرہ۔ قدیم شعائر اللہ۔ داخل ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی برگزیدہ بارگاہ الٰہی کے حالات و واقعات سے خاص طور پر تعلق رکھتا ہے۔

برا ہو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعصب اور نفسانیت کا۔ جو ایسے واضح اور روشن ثبوتوں کے مقابلہ اور موجودگی میں بھی محض اسلام کی مخالفت کی بنا پر۔ وادی فاران وادی مکہ کی مطابقت میں خوانخواہ غلط تاویلیں کرتے ہیں اور سراپا مہمل اور بے اصل دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے ان متعصّبانہ اور گمراہانہ قیاسات اور غلط تاویلات کی تردید و تنقید بھی انھیں کے معتبر اسناد و اشہاد سے پیش کر کے ان کا اور ساری دنیا کا اطمینان کر دیں۔

اس میں شک نہیں کہ دشت فاران کو حجاز اور قریب مکہ نہ ثابت ہونے دینے کی ابتدائی کوششیں یہودیوں کے حسد و تعصب کا ضمیمہ ہیں۔ عیسائی ان سے بھی تیز اور شرارت انگیز نکلے۔ انہوں نے سرزمین حجاز اور حوالی مکہ میں دشت فاران کے واقع نہ ہونے کے متعلق اپنی مسلسل کوششوں سے آسمان و زمین کے قلابے ایک کر دیئے ہیں۔ اور اس قدر دور از قیاس۔ گمراہانہ اور خود غرضانہ تاویلوں سے۔ اس کے اصلی موقع قائم کرنے میں۔ کثرت اقوال اور تعدد آرا کے انبار لگا دئے ہیں۔ جن سے دشت فاران۔ جغرافیہ عالم میں۔ عنقائے عرب بن گیا ہے۔ کہیں صحیح نشان ہی نہیں ملتا۔ مگر ہم ان تمام مراحل و منازل کو مفصلہ ذیل بحث میں طے کر دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ عبرانی لفظ مدبر۔ عربی لفظ وادی۔ اور قرآنی لفظ۔ غیر ذی ذرع متحد المعنی اور مساوی المفہوم ہیں۔ یہاں تک کہ یہود، عیسائی اور مسلم سب متفق ہیں اور ان تینوں مختلف الفاظ سے ایک ہی معنی مراد لیتے ہیں۔ مگر خاص کر یہودیوں اور عیسائیوں کو جو اعتراض ہے وہ یہ کہ اس وادی مبشرہ کا اصلی وقوع قربِ مکہ نہیں ہے۔ بلکہ جبل سینا اور اس کے قریب و جوار سے لے کر ارض بابل اور فلسطین تک۔ جو جناب ابراہیمؑ اور ان کی قوم و قبیلہ کا قدیم اور اصلی موطن و مسکن ثابت ہوتا ہے۔ دشت فاران میں شامل ہے۔ ان کے اس اعتراض کی بنا پر تین امور کی مفصلہ ذیل تنقیح و تحقیق نہایت ضروری ہے۔

اوّل۔ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے ہاجرہ اور اسمعیلؑ کو کہاں چھوڑا۔
دوم۔ یہ کہ حضرت ہاجرہ اور اسماعیلؑ نے اس صحرائے غیر آباد کے کس مخصوص مقام پر سکونت اختیار کی۔
سوم۔ یہ کہ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل نے جہاں پہلے ٹھہرے تھے وہیں سکونت اختیار کی یا وہاں سے اٹھ کر کسی اور جگہ آباد ہو گئے۔
تنقیح اول کے متعلق ہم اسلام سے قبل یا بعد عرب کی مشہور و معروف روایتوں کو جو اس امر کو ثابت کرتی ہیں اس باعث سے عمداً مرفوع القلم کرتے ہیں کہ مخالف قوم و مذہب کے مقابل ایک متنازع فیہ مسئلہ میں اپنے بیان سے اپنے دعوے کی تصدیق اتنی قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔ جتنی طرف مقابل کی تردید اس کے اقوال و تحریر سے۔ چونکہ اس مسئلہ خاص میں یہودیوں اور عیسائیوں نے ابتدا ہی سے محض اسلام کی مخالفت اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خاص کسر شان و منزلت کی بنا پر یہ بے جا تاویلیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لئے انھیں کتابوں سے صحرائے فاران کا حقیقت میں مکہ کے آس پاس واقع ہونا ثابت کرنا چاہیے۔ توریت میں ہے۔
اسماعیل علیہ السلام بڑا ہوا۔ اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا۔ (سفر تکوین باب 21 آیت 25) پھر دوسری جگہ تحریر ہے کہ اس نے یعنی اسماعیل نے دشت فاران میں سکونت اختیار کی۔ (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۲۱)
اب یہ تحقیق طلب ہے کہ بیابان فاران۔ جہاں جناب اسماعیل سکونت پذیر ہوئے کون سا مقام ہے مشرقی جغرافیہ والوں نے تین مقامات کو بنام فاران تحریر کی ہے۔ اول وہ مقام اور اس کے گردونواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ مقام صحرائے بے گیا تھا۔ دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو مشرقی حصہ مصر یا عرب الحجر میں واقع ہے۔ سوم ایک ضلع ہے۔ جو سمرقند کے نواح میں واقع ہے۔ مشرقی جغرافیہ نویسوں کی تحقیق حسب ذیل ہے۔

فاران المذکور فی التورات فی قوله جاء الله من سيناء و اشرف من ساعير و استعلن من فاران فساعير جبال فلسطين وهو انزاله الانجيل على عيسى و فاران مكة اوجبالها على ما تشهد به التورات و استعلاءه به منها انزاله القرآن على رسوله محمد صلعم و فاران قرية من نواحی اسفد من عمال سمر قند و قبل فاران والطور كور تان من كور مصر قبلية(مراصد الاطلاع على الاسماء الامكنة والبقاع و مجعم البلدان ياقوت حموی)

فاران جیسا کہ تورات کی اس آیت میں آیا ہے کہ خدا سیناء سے آیا ہے اور ساعیر سے مشرف ہوا۔ اور فاران سے بلند ہوا۔ ساعیر۔ فلسطین کے پہاڑ میں۔ اور اس مقام میں جہاں حضرت عیسیٰ پر نزول انجیل ہوا اور فاران۔ مکہ اور اس سے ملے ہوئے پہاڑوں کا نام ہے۔ جس پر توریت کی شہادتیں موجود ہیں۔ اور اس کے بلند کئے جانے سے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن مراد ہے اور فاران ایک قریہ کا

نام ہے۔ جوسمرقند کے علاقہ سفد میں واقع ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ فاران مصر مغربی کے دوشہر فاران و طور کے نام سے معروف ہیں۔ (مراصد الاطلاع علی الاسماء الاکمنۃ والبقاع ومعجم البلدان یاقوت عموی)
پھر یاقوت عموی اپنی دوسری کتاب مشترک میں لکھتا ہے۔

فاران ثلثة موضع۔ فاران اسم جبال مكة و قبل لها اسم جبال الحجاز والها ذكر في التورات تجيئ في اعلام نبوة النبي صلعم قال الاميرا بو نصر ابن ما كولا ابو بكر نصر ابن القاسم ابن القضاعة القضاعي الفاراني الاسكندري سمعت ان ذالك نسبة الى جبال فاران وهي الحجاز و فاران قال ابن عبد الله القضاعي في كتاب خطط مصر فاران والطور كورتان من كور المصر القبلية و فاران من قراى سمرقند (کتاب المشترک)

فاران تین مقامات کا نام ہیں۔ مکہ کے پہاڑوں کا (فاران) نام ہے اور بعض کہتے ہیں علاقہ حجاز کے تمام پہاڑوں کا نام فاران ہے ان کا ذکر توریت میں موجود ہے اور ان سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اعلان ہوتا ہے۔ امیر ابونصر ابن ماکولا کا بیان ہے کہ ابوبکر نصر ابن القاسم ابن القضاعۃ القضاعی الفارانی الاسکندری کی نسبت اسی جبال فاران سے ہے۔ جس سے حجاز مراد ہے اور ابوعبداللہ القضاعی اپنی کتاب خطط مصری میں لکھتے ہیں کہ فاران اور طور۔ مصر مغربی کے دو مشہور شہر ہیں۔ اور فاران سمرقند کے ایک قریہ کا بھی نام ہے۔

ہم نے عربی جغرافیہ نویسوں کے اقوال صرف اس غرض سے یہاں لکھ دیئے ہیں کہ محققین کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی مؤرخین و مؤلفین نے بمقابلہ یہودی اور عیسائی مصنفین کے پوری صفائی اور خوش نیتی سے۔ جہاں مکہ وحجاز کے علاوہ۔ ان تمام مقامات کو بھی لکھ دیا ہے اور بتلا دیا ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہیں۔ اگر ان کی تحقیق اور تحریر بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح خودغرضی اور تعصب پر مبنی ہوتی تو وہ فاران کی تصدیق و تطبیق میں صرف جبال مکہ وحجاز کو بتلاتے اور دوسرے مقامات کی تصریح و تفصیل سے سکوت اختیار کرتے۔ مگر نفسانیت اور خودغرضی سے بالکل علیحدہ ہو کر انہوں نے اپنی تالیفات میں تمام مقامات کا ذکر کر دیا۔ کیونکہ ان کے ذکر کر دینے سے ان کے مدعا میں کسی طرح کا خلل نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ فاران کے اسی ایک مقام اور اسی ایک خاص نام میں خدائے سبحانہ تعالیٰ کی عظمت و تقدیس ودیعت ہے۔ جس کی نسبت تورات میں بشارت آئی ہے۔ اور اس تقدیس و برکت کا اصلی مرکز وہی مقام اور وہی نام قرار پائے گا۔ جہاں سے نور ہدایت جلوہ آرائے عالم ہوا۔

چونکہ تمام شہود و ثبوت اس پر جمع ہو چکے ہیں کہ اس موعودہ ظہور قدرت کی جلوہ گاہ جبال مکہ اور حجاز ہیں نہ دیگر مقامات اس لئے یہودیوں کی کوشش ہے۔ اور عیسائیوں کی کاوش ہے کہ کسی نہ کسی طرح اصلی مقام کی حقیقت چھپا دی جائے۔ مگر انھیں کے اعتراف واقرار

متواتر و متکاثر کے مقابلہ میں ان کی یہ عالم فریبی کارگر نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ان کی ان گمراہانہ مغالطہ دہی سے ہمارے دعوؤں میں کسی طرح نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ وہ اقطاع عالم میں ایک نہیں ہزار مقام فاران کے نام سے بتلایا کریں تو اس سے کیا۔ اصلی فاران کی عظمت و تقدیس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی فاران پر منحصر نہیں طور کے ایک نام سے دنیا میں سات مختلف مقامات مشہور ہیں۔ یاقوت حمودی مشترک میں لکھتے ہیں۔

الطور سابعة مواضع والطور ايضا علم بجبل بعينه عند كورة تشتمل على عدة قرى بارض مصر من جهة القبلية بينها وبين جبل فاران۔ (مشترك)

طور سات مقامات کو کہتے ہیں۔ یعنی طور کے نام کا اطلاق۔ ان پہاڑوں چشموں اور شہروں پر ہوتا ہے۔ اور وہ شہر ان تمام چھوٹے چھوٹے قصبوں پر بھی حاوی ہیں جو مغربی مصر میں واقع ہیں اور جو ان کی جبل فاران کے درمیان حد فاصل ہیں۔ (مشترک)

اب ان سات مختلف مقامات کی تفصیل۔ علامہ شریف الادریس کی کتاب نزہتہ المشتاق کی عبارت سے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

(۱) طریق اخر علی ساحل البحر القلزم۔

(۲) من مصر الی عین شمس

(۳) ثم الی بطن مغیرۃ

(۴) ثم الی حرن فاران

(۵) و بالقرب فاران موضع صعب ذاسلك والزنج ايضا مغربا والربور شرقا

(۶،۷) ویسمی جبلان من جبلان الی جبل الطور الی ایلة

(۱) وہ وادی یا راستہ جو بحر قلزم کے کنارے کنارے جاتا ہے۔

(۲) جو مصر سے عین شمس کو جاتا ہے۔

(۳) جو بطن مغیرہ کو جاتا ہے۔

(۴) جو بیابان فاران کو جاتا ہے۔

(۵) جو فارن کے اس سنگلاخ مقامات سے قریب ہے جس کے مغرب میں زنج اور مشرق میں دیور واقع ہے۔

(۶، ۷) ان دو پہاڑوں کے نام ہیں جو جبل الطور کے سلسلہ میں ایلہ کی طرف واقع ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے سات مقامات طور کے تنہا نام سے مشہو ہونا ثابت ہو گیا۔ مگر اصلی طور وہی طور ہے جہاں سے انوار قدرت کا ظہور ہوا۔ اور وہی ایک آج تک مشہور ہے۔ اور اس کے آگے دوسرے مقامات کی شہرت کوئی عظمت اور وقعت نہیں رکھتی۔ بالکل ایسے ہی فاران کی بھی حقیقت سمجھ لینی چاہیے۔

اب ہم یہودیوں اور عیسائیوں کے اقوال و اسناد سے بیابان فاران کا صحرائے مکہ اور علاقہ حجاز ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اسلام کی

مخالفت ہو یا بنو اسحاق کے مقابلہ میں بنی اسماعیلؑ کی اظہار ذلت کی ضرورت ہو۔ انہیں دو مفسدانہ اور خود غرضانہ ضرورتوں کی وجہ سے یہودیوں سے زیادہ عیسائیوں نے فاران کے اصلی موقع اور موضع کی تحقیق وتعین میں جو عالم فریب اور گمراہ کن اقوال لکھے ہیں اور ان کے ثبوت وتصدیق میں جو وہمی اور قیاسی دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ عموماً تین جداگانہ صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

اول صورت یہ ہے کہ عیسائی مؤرخین ومحققین صحرائے فاران اس قطعہ زمین کو ٹھہراتے ہیں۔ جو بئر سبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے۔ ان کی حدود یوں قائم کرتے ہیں۔ شمال میں کنعان۔ جنوب میں کوہ سینا مغرب میں مصر۔ اور مشرق میں کوہ سعیر۔

اس کے متعلق جدید تحقیق اور مزید اطلاع یہ ہے کہ اس قطعہ زمین میں۔ صحرائے اشور۔ دشت بئر سبع۔ بادیہ ایتام۔ بیابان سین۔ ارض زبن اور ریگستان عیدام۔ (گویا سارے جہان) کو بھی داخل کرتے ہیں۔ ان تمام طومار سے مطلب صرف اتنا ہے کہ کسی طرح فاران جزیرہ نمائے عرب کے اس حصہ کی طرف نہ جانے پائے جو حجاز۔ بطحا۔ اور مکہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ جہاں سے شیوع اسلام اور ظہور بانئ اسلام علیہ السلام کی بشارتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قادش۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں موسوم بہ بئر سبع کھودا تھا۔ وہ اور فاران ایک ہی مقام ہے۔

تیسری صورت یہ نکالی گئی ہے اور فاران اس مقام کا نام رکھا گیا ہے۔ جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ کی طرف واقع ہے یہی تین صورتیں جن کی آڑ میں فاران کی تجلی حقیقت کو یہودیوں سے زیادہ عیسائیوں نے چھپانا چاہا ہے۔ اول صورت کو مٹانے کی نسبت جس میں موضع فاران کا غلط نقشہ یوں دکھلایا گیا ہے کہ اس میں دشت اشور اور سینا وغیرہ وغیرہ کو داخل کر دیا گیا ہے۔ تورات ہی کی چند آیتیں ذیل میں لکھ دی جاتی ہیں۔ جن سے ان غلط بیانیوں کی ساری قلعی اڑ جاتی ہے۔

تورات۔ سفر الاعداد باب 10 آیت 12 میں مرقوم ہے۔

(۱) بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں قیام کیا۔ اس عبارت تورات سے تو بیابان سینا اور بیابان فاران دو جدا جدا بیابان ثابت ہوتے ہیں۔ پھر بیابان سینا میں بیابان فاران کا داخل کرنا یا بیابان فاران میں بیابان سینا کا شامل ہونا کیسے تسلیم کیا جائے گا۔ یا بیابان سینا اور فاران کیسے ایک شئی سمجھا جائے گا۔

توریت کی دوسری آیت۔ سفر تکوین باب 14 آیت 5و6 میں مرقوم ہے۔

(۲) کدرلاعمر مر گیا اور وہ بادشاہ جو اسکے ساتھ آئے تھے۔ (ان کو) اور رفائیوں کو۔ عسارات قرنیم میں۔ اور روزیوں کو ہاہم میں اور ایمیوں کو سوی قرنیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں۔ ایل فاران تک جو بیابان کے کنارے پر ہے مارا۔ اور وہ پھر کر (واپس آ کر) عین مصفات یعنی قادس میں آئے۔

اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ جب تک بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے گا۔ اس آیت کے معنی بالکل مہمل رہ

جائیں گے۔اسی عبارت سے یہ بھی صاف ہوگیا کہ قادس اور فاران ایک مقام نہیں ہوسکتے کیونکہ اس آیت کا یہ فقرہ کہ دشمنوں کو ایل فاران تک مارا۔اور واپس ہوکر قادس میں آئے صاف ثابت کررہا ہے فاران جدا مقام ہے اور قادس علیحدہ۔پھر اس کے ایک مقام ہونے کا دعویٰ بالکل لغو اور مہمل ہے۔اس عبارتِ تورات سے عیسائیوں کی دوسری صورت بھی بگڑ گئی۔

تورات کی تیسری آیت۔سفر اعداد باب 13۔آیت 1۔2۔3 میں ہے۔

(۳) پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے کہا کہ تو لوگوں کو بھیج تا کہ کنعان زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔جاسوسی کریں۔ایک مرد اس کے آبائی فرقہ میں سے۔جو اس میں سردار ہے۔بھیج دے چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران سے ان کو بھیجا۔

اس آیت سے بھی وہی مطلب نکلتا ہے اور تاوقتیکہ دشت فاران ایک مقام جداگانہ نہ تسلیم کرلیا جائے۔اس آیت کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔

تورات کی چوتھی آیت۔سفر اعداد باب 13 آیت 26 میں درج ہے۔

(۴) اور پھر موسیٰ اور ہارونؑ اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران سے قاوس میں آئے اور انہیں اور ساری جماعت کو آکر خبر دی اور اس سرزمین کا میوہ انہیں دکھایا۔

اس آیت سے بھی فاران اور قاوس دو علیحدہ مقامات ثابت ہوئے۔

تورات کی پانچویں آیت۔سفر استثنا باب 33 آیت 2 میں مرقوم ہے۔

(۵) اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا۔اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ہزار ہزار فرشتوں کے ساتھ وہ وارد ہوا۔اور اس کے دست راست پر ایک آتشیں شریعت تھی۔

اس سے بھی سینا۔سعیر اور فاران۔تینوں علیحدہ علیحدہ مقامات ثابت ہوئے۔

تورات کی آیت۔کتاب حقوق نبی باب 3 آیت ۲ میں ہے۔

(۶) خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے۔کوہ فاران سے آیا۔اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا۔اس کی حمد سے زمین معمور ہوگئی۔

اس آیت سے بھی فاران ایک علیٰحدہ اور خاص مقام ثابت ہوا۔

تورات کی ساتویں آیت کتاب اول ملوک باب 11 آیت 18 میں مذکور ہے۔

(۷) پھر وہ مدیان سے نکل کے فاران میں آئے۔اور فاران سے لوگوں کو ساتھ لے کے شاہ مصر۔فرعون

کے پاس گئے۔

اس سے بھی فاران ایک علیٰحدہ مقام ثابت ہوا۔ اور خاص طور پر وہ مقام جہاں سے مصر جانے کا راستہ ملتا ہے اور یہ سوائے حجاز کے اور عرب کے کسی قطعہ زمین کو خصوصیت حاصل نہیں ہے جو مصر کے عین محاذ میں واقع ہے۔

تورات کی مرقومہ بالا آیتیں صاف صاف بتلا رہی ہیں کہ بیابان فاران ایک علیحدہ قطعہ زمین کا نام ہے جس کا شمول کسی دوسرے قطعہ زمین سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر اس میں نفسانیت وخودغرضی کے علاوہ۔ اصلیت اور حقیقت کا ذرا بھی اثر ہوتا تو۔ تورات کے مقدس ابواب وآیات میں فاران کی تفریق وتخصیص کی جگہ اس کی تعمیم کا ضرور ذکر ہوتا۔ نہیں معلوم کہ یہودی اور عیسائی اپنی ان تاویلات کی بنا میں کون سی سند پیش کرتے ہیں اور اپنی کس کتاب کو اصلی ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس لئے یہ امر قطعی طور پر ثابت کر دیا گیا کہ صحرائے فاران کی تفریق وتخصیص دوسرے مقامات کے ساتھ صرف اس غرض و مدعا سے خلط ملط کر دی گئی ہے کہ اصلی موقع اور رسالت محمدیہ کا حقیقی مطلع۔ اشتمال واشتراک کی ناپاک خاک سے غبار آلود ہوجائے اور بشارت ربانی کے انوار ہدایت دنیا کی ظاہری آنکھوں سے پوشیدہ ہوجائیں۔

عیسائیوں کے اعتراض کی پہلی صورت تو یوں ظاہر ہوئی کہ ان کی اس قیاسی اور وہمی تحقیق کی تکذیب ان کے عہد عتیق کے مندرجہ بالا متواتر عبارتوں نے پورے طور سے کر دی۔ اب دوسری صورت کے متعلق عرض کیا جاتا ہے کہ قادش اور فاران ایک مقام ہے۔ اس کی تردید اگرچہ مرقومہ بالا ایک آیت سے کر دی گئی ہے مگر بار دیگر مزید اطمینان کے خیال سے پھر تورات کی دوسری آیت مندرج کی جاتی ہے۔

سفر تکوین باب 14 آیت 6 و 7 میں مرقوم ہے۔

حوریان کو بھی شکست دی جو کوہ سعیر میں ایل فاران تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہاں سے لوٹ کر چشمہ بشاط پر جو قادش سے آئے۔

اس عبارت نے ثابت کر دیا کہ فاران اور قادش ایک مقام نہیں ہوسکتے۔ بلکہ صحیح طور پر بساط اور قادش ایک مقام ہیں۔

یہ صورت بھی بگڑ گئی۔ اب تیسری صورت کا یہ نقشہ ہے اور اس میں یہ رنگ بھرا گیا ہے کہ فاران کوہ سینا کے اس نشیب کا نام ہے جو اس کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اس رنگ آمیزی میں ریویرنڈ مسٹر فارسٹر Rev. Mr. Forester بہت ڈوبے ہوئے ہیں۔

خودغرضی ایک سخت بلا ہے۔ اور تعصب قہر خدا۔ ایسا فاضل محقق اور کامل مورخ صرف مذہبی تائید وتقلید کی خودغرضی سے ایسی بے جا اور نازیبا تاویلیں کرے۔ سخت تعجب اور حیرت کا مقام ہے۔ اس کی اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ کوہ سینا کے مغربی نشیب میں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آیا یہ فاران وہی بیابان ہے۔ جہاں تورات مقدس کی بشارت کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ اپنی ماں کے ساتھ مقیم ہوئے۔ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ وہ مقام نہیں ہے۔ تب تو تسلیم کر لینا ہوگا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جو تورات کے مطابق حضرت اسمٰعیلؑ کا دار الاقامت تھا۔

مسٹر فارسٹر کو خواہ مخواہ کا اصرار ہے کہ یہی مقام فاران حضرت اسماعیلؑ کی فرودگاہ ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ توریت کی

یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ جو سفر تکوین باب 25 آیت 18 میں مندرج ہے۔

وہ لوگ (ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام) (اے ابراہیم علیہ السلام) حویلاہ سے شور تک کہ مصر کے آمنے سامنے ہے۔ مقیم ہوئے اور اس کا مسکن اپنے بھائیوں کے مساکن کے پاس واقع ہوا۔

ریویرنڈ صاحب اس کے یہ معنی نکالتے ہیں کہ خدا کے وعدہ کی اسی آیت بشارت میں ایفا ہوگئی جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں ہے۔ یعنی سرحد مصر سے لے کر دہانہ فرات تک پھیل گئی۔ فارسٹر صاحب کی ساری کوشش تو یہ ہے کہ بنواسماعیل چاہے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ثابت ہوجائیں۔ کوئی اعتراض نہیں۔ مگر علاقہ حجاز اور حوالی مکہ میں۔ جو اصل فاران ہے۔ وہاں تک نہ پہنچنے پائیں۔ اور کسی طرح یہ امر نہ ثابت ہونے پائے کہ بنواسماعیل کا اصلی موطن ومسکن بیابان فاران واقع حجاز تھا۔ کیونکہ اس امر کے ثابت ہوتے ہی جناب ختمی مرتبت علیہ وآلہ الثنا والتحیۃ کے ظہور رسالت کی مندرجہ بالا بشارت ثابت ہوجائے گی۔

مگر افسوس فارسٹر صاحب کی یہ کوشش بھی بیکار گئی۔ فارسٹر صاحب سب کچھ کر لیں گے۔ مگر عرب کے جغرافیہ کو اور اس کے نقشہ کو کیسے مٹادیں گے۔ صاحب موصوف نے حویلاہ کو دہانہ فرات پر قرار دیا ہے۔ یہ صریح غلطی ہے۔ حویلاہ۔ جو اس شہر کا خاص بانی ہے۔ اور جس کا ذکر تورات۔ سفر تکوین باب 10 آیت 29 میں مذکور ہے۔ نواح یمن میں واقع ہے۔ اور اس کا موقع نقشہ عرب میں۔ شمالی عرض بلد 17 درجہ اور 30 دقیقہ ہے۔ مشرقی طول بلد ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ ہے۔ اس کی تصدیق عرب کے اس نقشہ سے ہوتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کے مطابق بنایا گیا ہے اور واکر صاحب (Walker) کے نقشۂ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے۔

اس کو بھی جانے دیجئے۔ فارسٹر صاحب نے جو دوسری غلطی کی ہے۔ (غلطی کیوں کی بلکہ مغالطہ دہی کی ہے) وہ یہ ہے کہ شور کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے یک نہ شُد دو شد۔ اصل عبرانی تورات میں صرف دو نام آئے ہیں۔ شور اور اشور (بزیادۃ الف) ان دونوں ناموں میں۔ شور سے شام اور اشور سے اسیریا۔ باتفاق جمہور مراد ہے۔

اب اس تصریح موقع مندرجہ تورات سے صاف طور پر واضح ہوگیا کہ بنی اسماعیل نے اسی وسیع قطعۂ زمین پر سکونت اختیار کی جو شمالی حدود یمن سے لے کر جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے۔ یہی جگہ اب حجاز کے نام سے مشہور ومعروف ہے اور یہی مقام فاران مبشرہ سے پوری اور صحیح مطابقت رکھتا ہے۔ اور یہی خطۂ زمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی طرف جائے تو معلوم کرلے گا کہ مصر کے سامنے جو قطعہ زمین ہے۔ وہی علاقہ حجاز ہے اور اگر کرۂ عالم کے نقشہ میں مصر سے اسیریا تک ایک خط کھینچ دیا جائے تو وہ ٹھیک علاقہ حجاز کے سامنے پڑے گا۔

اب ہمارے اس بیان وثبوت کو فارسٹر صاحب تورات کی مندرجہ بالا عبارت سے جس کو وہ اپنے استدلال کے ثبوت میں پیش کر چکے ہیں۔ کہ تیرے جانے کے بعد وہ اشور میں۔ جو مصر کے مقابل میں ہے۔ ساکن ہوئے۔ ملالیں تو ان کیلئے قطعی طور پر ثابت ہوجائے گا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک مصر کے محاذ میں سوائے حجاز کے اور کوئی زمین کا دوسرا ٹکڑا نہیں پایا جاتا ہے اور تورات میں بنو اسماعیل کا بھی اصلی مرکز ومسکن بتلایا گیا ہے اور عبارت تورات کے مطابق مصر کے برابر یعنی آمنے سامنے واقع ہے۔

فارسٹر صاحب خوانخواہ اس کو اصل موقع سے اٹھا کر دہانہ فرات پر لئے جاتے ہیں اور ساری دنیا کو ایک کھلی اور صاف بات کے سمجھنے میں اینچ پنچ کے مغالطے دیتے ہیں۔انھوں نے اپنے غلط استعمال کے ثبوت میں ایک دوسرا حوالہ بھی دیا ہے۔مگر افسوس کہ وہ بھی ان کے لئے مفید مطلب نہیں۔وہ کتاب اول تاریخ ایام باب 5 آیت کی یہ عبارت پیش کرتے ہیں۔

پورب کی طرف۔اس بیابان کے مدخل تک کہ کنارہ نہر فرات پر سے (بنو اسماعیل)
ساکن ہوئے۔کیونکہ زمین گلعاد میں ان کے گلوں کی فراوانی ہوتی تھی۔اور شادل کے
زمانہ میں ان لوگوں نے اہگریوں پر دعویٰ کیا کہ وہ لوگ ان کے قبضہ میں آ گئے۔اور ان
قرب ونواح کے چاروں طرف کی زمین میں۔جو گلعاد سے متعلق ہے۔وہ آباد ہو گئے۔

فارسٹر صاحب اس کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ گلعاد جو نواح دریائے فرات اور خلیج فارس میں واقع ہے۔حضرت اسماعیل کی ابتدائی سکونت سے مطابق ہوتی ہے۔ایک عرصہ کے بعد یہیں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تمام اقطاع عرب میں پھیل گئی۔مگر حقیقتاً تورات کی ان آیتوں سے بھی فارسٹر صاحب کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔کیونکہ اس عبارت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے۔وہ یہ ہے کہ بنو اسماعیل یا بنو ہاجرہ نے خلیج فارس پر شکست کھائی۔یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔یہ شکست حضرت اسماعیل علیہ السلام سے آٹھ سو برس بعد ہوئی۔تو ان آیتوں سے وہ بات۔جیسا کہ فارسٹر صاحب نے دعویٰ کی تھا۔کہاں ثابت ہوئی کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں پہلے پہلے خود اسماعیل اور ان کی ماں تشریف لا کر سکونت پذیر ہوئی تھیں۔واقعہ تو آٹھ سو برس قبل کا ہے اور ثبوت دیا جاتا ہے آٹھ سو برس بعد کا۔فارسٹر صاحب کا یہ طریقہ استدلال اعجوبہ روزگار ہے۔حضرت اسماعیل کے بعد البتہ ہم کو بھی اقرار ہے کہ بنو اسماعیلؑ دریائے فرات اور خلیج فارس سمیت تمام عرب میں دور دور تک پھیل گئے تھے۔چنانچہ اسلامی اور عربی محققین اس پر متفق اور اس کے معترف ہیں۔معارف ابن قتیبہ کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ولما اکثر ولد اسماعیل ضاقت علیهم مکه فانتشروا فی البلاد ولا یدخلون بلد الا اظهرهم الله علی اهله وهم نفوا العمالیق۔ (معارق ابن قیتبه)

جب حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بہت کثرت سے ہوگئی۔اور مکہ میں ان کے رہنے کے لیے گنجائش باقی نہیں رہی۔تو وہ مختلف شہروں میں جا کر بس گئے۔اور جس شہر میں وہ گئے خداوند عالم نے ان کو وہاں کے باشندوں پر غلبہ عنایت فرمایا اور انہوں نے قوم عمالیق کو نکال دیا۔(معارف ابن قتیبہ)

علامہ ارزقی بھی۔تاریخ مکہ میں ایسے ہی لکھتے ہیں۔

ان بنی اسماعیل من ساکنی مکة ضاقت مکة فتفسحوا البلاد والتمسوا المعاش

بنو اسمعیل۔ساکنان مکہ۔مکہ کی تنگی کی وجہ سے مجبور ہو کر مختلف شہروں میں بتلاش معاش۔نکل کر آباد ہو گئے۔

عرب کے تمام مورخین و محققین برابر تسلیم کرتے آئے ہیں کہ بنو اسماعیل امتداد ایام کے بعد۔شہر مکہ میں اپنی رہائش کی گنجائش نہ پا کر تمام اقطاع عرب میں اپنی سکونت اور کسب معیشت کی ضرورت سے نکل نکل کر آباد ہو گئے۔مگر فارسٹر صاحب کا ایسا کوئی مشرقی یا مغربی مورخ و محقق نہیں لکھتا کہ یہ خاص حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے۔اوران کی ماں۔جنھوں نے ابتدا ہی سے حجاز اور حوالی مکہ کے علاوہ کسی دوسرے قطعۂ زمین میں اپنی سکونت اختیار کی۔مسٹر فارسٹر کا ایسا لکھنا اور لکھ کر بتلانا ان کی اسی خودغرضی۔نفسانیت اور تعصب پر مبنی ہے۔جس کو ہم مسئلہ زیر بحث کی ابتدا میں لکھ آئے ہیں۔

اتنا لکھ کر ہمیں اس بحث کے متعلق ابھی کچھ اور اضافہ کرنا منظور ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ فارسٹر صاحب کے اس غلط دعویٰ کی تردید انھیں کے ہم طریق اور ہم مذہب مؤلفین و محققین کی تحریر و اقوال سے کر دی جائے۔ان شہادتوں کے علاوہ جو بیابان فاران کے حوالی مکہ اور علاقہ حجاز میں واقع ہونے کے ثبوت میں۔ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ہم کوارٹرلی ریویو 1896ء کا ایک آرٹکل (An Article on Quarterly Review of 1869) جو حقیقت میں اسلام پر لکھا گیا ہے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔جس سے مسئلہ زیر بحث پر کافی روشنی پڑتی ہے۔واضح رہے کہ ایڈیٹر کوارٹرلی ریویو ایک زبردست عیسائی عالم ہے۔اور زبان یہود کا کامل ماہر۔وہ کوارٹرلی ریویو حقیقت اسلام کے صفحہ 299 میں رقمطراز ہے۔

> سائیفر (CYPHUR) نے ان خاص آیتوں کی جن میں سینا۔سعیر اور فاران کی بشارت مذکور ہے۔اس طرح پر تشریح کی ہے۔کہ خدا سینا سے نکلا۔(یعنی عبرانی زبان میں شرع دی گئی۔جس سے توریت مراد ہے۔)اور سعیر سے چمکا (یعنی یونانی زبان میں بھی شرع دی گئی جس سے انجیل مراد ہے۔)اور فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا۔(یعنی عربی میں بھی شرع دی گئی جس سے قرآن مجید مراد ہے۔)

اس عیسائی عالم کے قول سے ثابت ہو گیا ہے کہ قرآن کی منزل اور فاران کی ایک جگہ ہے۔ساری دنیا جانتی ہے کہ قرآن مکہ میں نازل ہوا۔پھر فاران مکہ سے یا مکہ فاران سے کیسے جدا ہو سکتا ہے۔چند سطروں کے بعد پھر ایڈیٹر موصوف لکھتے ہیں۔

> اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور عیسیٰ مستعمل ہوتے ہیں۔اور فاران تو صاف صاف عرب کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ان اسناد و اشہاد کو دیکھ کر ہر انصاف پسند عیسائی بھی کہہ دے گا کہ ریویرنڈ فارسٹر صاحب ایسی صاف صاف اور کھلی کھلی تطبیق و توثیق کو حق ناحق۔تعصب کی خاک۔نفسانیت کی گرد ڈال کر چھپانا چاہتے ہیں۔اور خواہ مخواہ فاران کو اینچ تان کر کبھی مصر لے جاتے ہیں اور کبھی ارض بابل اور فلسطین تک پہنچاتے ہیں۔

اس سے صاف اور روشن تصدیق تورات سامری کے ترجمہ سے ملتی ہے۔تورات سامری کا عربی ترجمہ آرکیونن صاحب نے 1851ء میں بمقام گلاونی نیاورم چھپوایا ہے۔جس میں بذیل ذکر بنی اسماعیل یہ عبارت مرقوم ہے۔

ومسکن (اسماعیل) بریۃ فاران (الحجاز) و اخذت له امه امرۃ من ارض مصر
حضرت اسماعیل صحرائے فاران (الحجاز) میں ساکن ہوئے اور ان کی ماں نے ایک مصری خاتون سے ان کی شادی کر دی۔
ہم اس بحث کے خاتمہ میں ناظرین کتاب کے مزید اطمینان کے لئے اتنا اور لکھے دیتے ہیں۔ کہ اس بحث کے آغاز سے پہلے ہر شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ عرب۔ حجاز۔ مکہ۔ کعبہ۔ یہ جتنے الفاظ و اسماء ہیں۔ اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ لفظ عرب دسویں صدی ق۔م میں پیدا ہوا۔ حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ بعد کا موضوع ہے۔ مکہ کا نام دوسری صدی عیسوی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے مکاربا کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس لئے تورات نے اس مقام کا نام اولاً صرف مدبار۔ یعنی ''بادیہ'' بتایا ہے اور قرآن نے اسی کو غیر ذی ذرع (بن کھیتی کے زمین) کہا۔ کیونکہ اس کے سوا اور اس کا اس وقت کوئی دوسرا نام نہ تھا۔ اور مدت کے بعد لفظ بادیہ۔ صحرا اور وادی غیر ذی زرع اس ملک کا نام پڑ گیا۔ لفظ عرب کے معنی بھی بادیہ اور صحرا کے ہیں۔ اس لئے مدبار۔ بادیہ اور وادی غیر ذی زرع اور عرب۔ ہم معنی لفظ ہیں۔ اس لئے تورات کا یہ کہنا کہ اسماعیلؑ نے بادیہ میں سکونت کی۔ اس کے بالکل یہ معنی ہیں کہ اس نے عرب میں سکونت اختیار کی۔

حضرت اسماعیل ترک وطن کرنے کے وقت سترہ برس کے ہو چکے تھے

اکثر احباب معاصر فرمائیں گے کہ اس مضمون کو حضرت اسماعیلؑ کے خاص حالات میں لکھنا مناسب تھا۔ ایک حد تک یہ تجویز صحیح ہے مگر مشرقی و مغربی مولفین و محققین کی جتنی تالیفات و تصنیفات ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان میں حضرت اسمٰعیل کی بحث عمر کو بھی عموماً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم نے بھی سلسلہ بیان کی علیحدگی کے خوف سے انھیں کے طریقہ کو اختیار کیا۔ تمہیداً اتنا لکھ کر ہم اپنے قدیم سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ خدا کی تاکید اور اس کے وعدے کی تائید کے مطابق حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو مکہ میں چھوڑ کر واپس گئے۔ خدائے مسبب الاسباب نے ان کی رہائش و آسائش کے سامان فراہم کر دئے۔ اس واقعہ سے حضرت ابراہیمؑ کے توکل۔ رضا اور مطیع خدا رہنے کے کامل ثبوت ملتے ہیں۔ ورنہ اہل و عیال کی جدائی۔ اور خصوصاً ایسے ویران اور بے آب و گیاہ ریگستان اور خوفناک کوہستان کی تنہائی۔ جہاں وہ خود بھی ان بزرگواروں کو پہنچائے گئے تھے اور ان کی مصیبت و غربت خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ مگر اُف تک نہ کرتے تھے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ خدا کا حکم تھا۔ اس کی رضا تھی۔ آپ کے یہ محاسن اعمال معارف کے کمال کے مینار ثبوت ہیں۔ اور طبقہ انسان میں عام و خاص کا امتیاز قائم کرتے ہیں۔
جناب اسماعیل کا اس وقت کیا سن تھا۔ مغربی و مشرقی مورخین و محققین نے اس امر میں بھی اختلاف کیا ہے۔ مگر تحقیق اور تلاش نے اس کو بھی صاف کر دیا۔ اور حد و ثبوت تک پہنچا کر بتا دیا ہے کہ حقیقتاً حضرت اسمٰعیلؑ کا سنِ مبارک اس وقت سترہ برس کا ہو چکا تھا۔ کیونکہ تورات کی عبارتوں سے بظاہر نہایت کمسنی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر پھر اسی توریت کی عبارتوں کے حقیقی معنوں سے حضرت اسماعیلؑ سترہ سالہ جوان ثابت ہوتے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔
تورات کا بیان ہے کہ سارہ نے ہاجرہ اسمٰعیل علیہ السلام کو علیحدہ کر دینے کا اس وقت حکم دیا تھا۔ جب اسحاق علیہ السلام کا دودھ چھٹ چکا تھا۔

(تکوین باب 21 آیت 7 و 10) اور پھر اسی توریت میں یہ بھی لکھا ہے کہ اسماعیلؑ سے بارہ تیرہ برس بعد اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے (تکوین پیدائش اسحاق علیہ السلام) پھر اسی تورات میں لکھا ہے کہ اسماعیلؑ کا عقیقہ تیرہ برس کے سن میں کیا گیا ہے۔ اس وقت تک اسحاق علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ (تکوین باب 17 آیت 25) ان تمام مرقومات تورات کو جمع کر کے صحیح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ترک وطن کرنے کے وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سن پندرہ سے کم اور سترہ برس سے زیادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ایک تو یوں ہی رضاعت کے ختم ہو جانے کے بعد بتلایا جاتا ہے۔ تو کم سے کم دو برس یہ بھی لکھ لئے جاویں تو اس حساب سے حضرت اسماعیل پندرہ سالہ جوان پائے جاتے ہیں۔ اس بنا پر تورات کی کم سنی اور شیر خوارگی کسی طرح ایک محقق کے لئے قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو قدم قدم پر حضرت اسماعیلؑ کے حالات و واقعات میں دشواری پیدا کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ان کی صغر سنی اور نہایت صغر سنی ثابت کرنے پر مٹے جاتے ہیں۔ بفرض محال اگر ان کی صغر سنی ثابت بھی ہو جائے تب بھی ان کی عظمت و تقدیس میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ تیرہ برس کے نہیں۔ تیرہ مہینے ہی کے ہوتے تو کیا۔ تاہم وہ برحق نبی خدا تھے۔ اور ابن نبی اللہ۔ تیرہ مہینہ کا بچہ تو اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں تو گھڑی بھر پہلے کا پیدا ہوا بچہ۔ جو خدا کی طرف سے رسول بن کر آیا تھا۔ اپنے گہوارہ سے تمام قوم و قبیلہ کے عمائد و اکابر کے آگے معرفت الٰہی اور قدرت لا متناہی کے دریا بہا رہا تھا۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ۛ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ۡ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝

(اس پر بچہ) بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب (انجیل) عنایت کی۔ اور مجھ کو پیغمبر بنایا۔ اور کہیں بھی رہوں مجھ کو بابرکت کیا اور مجھ کو حکم دیا کہ میں جب تک زندہ ہوں نماز پڑھوں اور زکٰوۃ دوں۔ اور نیز مجھ کو میری ماں کا خدمت گذار بنایا اور مجھے سخت گیر اور بدراہ نہیں بنایا۔

پھر مسلمانوں کے مقابلہ میں ایسی نص صریح کی موجودگی پر کسی نبی اللہ کی صغر سنی کو اس کی بے مقداری اور نا قابلیتی کی دلیل بتلانا محض بیکار اور غیر مفید ہے۔ مخالفین پہلے اسلام کے اس مسئلہ کو اپنی کتابوں میں دیکھ لیں اور سمجھ لیں اور ثابت کر لیں تب اسلامی کتب میں اس کی فکر و تلاش کریں۔

تورات کے اس فقرے سے کہ "بچہ کو اُسے (ماں کو) دے کر۔" یہ اتنا طور مار اُٹھایا گیا ہے۔ جس سے بظاہر سمجھا گیا ہے کہ اگر اسماعیلؑ اس وقت بچہ نہیں تھے۔ تو ہاجرہ کی گود میں کیوں دیئے گئے۔ سترہ برس کے بچہ کو ماں کی گود میں دئے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم واقعات سے تو بعد میں بحث کریں گے۔ ابھی ہم ظاہری اور قیاسی پیرایہ سے ان کی تردید و تنقید استدلال کرتے ہیں۔

پہلے ہم یہ پوچھتے ہیں کہ سترہ برس یا اس سے کم و بیش سن و سال کے بچہ کا ماں کی گود میں دیا جانا تو خلاف قیاس بتلایا جاتا ہے۔ مگر آگے چل کر۔ اسی سلسلہ کی تیسری پشت میں۔ پندرہ برس کا بچہ۔ حضرت یوسفؑ ابن یعقوبؑ ابن اسحاق علیہ السلام جب دنبیاں چرانے کے

لئے جنگل میں بھیجے جاتے ہیں تو ان کی محافظت کے لئے۔ان کی کم سنی کے خیال سے۔گیارہ بھائیوں کی پوری جمعیت ساتھ کر دی جاتی ہے۔اور پھر وہ پندرہ برس کے بعد۔جب تیس برس کا ہوتا ہے۔تو دشوار سے دشوار اور اہم سے اہم رویا کی صحیح اور سچی تعبیریں بتلاتا ہے اور خدا کی طرف سے یایوسف ایها الصدیق کا خطاب پاتا ہے پھر تھوڑے ہی عرصہ کے عد بعد عزیز مصر ہوجاتا ہے۔سبحان ما اعظم شانه

حضرت اسماعیلؑ کی کمسنی تو توراۃ کے اس فقرے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔مگر اس کتاب مقدسہ کے مندرجات پر ذرا بھی توجہ نہ فرمائی گئی۔ریویرنڈ فارسٹر ایسا مخالف اسلام محقق بھی اس مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہم کلام اور ہم زبان ہے وہ اس مسئلہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

> کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی ٹھیک ٹھیک عمر یوں با آسانی معلوم ہوسکتی ہے کہ تیرہ برس کے سن میں ان کا عقیقہ ہوا تھا۔اسحاق علیہ السلام اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں اور ہاجرہ اور ان کے بیٹے بیابان بھیجے جانے سے پیشتر۔ اسحاق علیہ السلام کا دودھ چھوٹ چکا تھا۔فارسٹر جغرافیہ عرب ص176)

اس حساب سے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں حضرت اسماعیلؑ کچھ کم سترہ برس کی عمر ثابت ہوگئی۔فارسٹر صاحب کے علاوہ توراۃ و انجیل کے بہت بڑے مشہور و معروف عالم جے۔پی کوک J. Pecoke اور ریویرنڈ ملر Reu Muller صاف صاف لکھتے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی۔اس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ ہاجرہ نے انھیں کاندھے پر لیا ہو۔

ان دونوں یورپین محققین کے نظریہ سے توتوراۃ کی یہ عبارت ہی ساقط از اعتبار ثابت ہوتی ہے۔جو یہ بتلاتی ہے کہ ہاجرہ نے ان کو اپنے کاندھے پر لے لیا۔اور جس پر یہودیوں اور عیسائیوں نے ہوائی قلع باندھے ہیں۔انہیں دونوں سابق الذکر محققین کے جیسا ایک دوسرا یورپین مصنف و محقق۔اس عبارت کو داخل توراۃ ہی نہ سمجھ کر اپنی رائے کا یوں اظہار کرتا ہے۔

> کہ اس جملہ کو (کندھے پر رکھ دیا) خطوط ہلالی کے اندر رکھ دینا چاہیے۔جیسا کہ بشپ کڈیر اور اشک ہاوس (BISHO KIDDER, STEAK HOUSE) اور بابل نے کہا ہے (جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ یہ الفاظ توریت میں نہیں ہیں۔) تو یہ آیت مشتبہ نہ ہوتی (خطبات احمدیہ)

کیا اب بھی یہودیوں اور عیسائیوں کو اس فقرہ توراۃ کے تدلیس خلط ملط کا یقین نہ آئے گا۔کیا اب تک وہ اس جملہ کو موضوعات انسانی کی جگہ ملفوظات ربانی سمجھیں گے۔ایک اور منصف مزاج مصنف۔یورپ کے کامل محقق۔اس مسئلہ کی تحقیق میں لکھتے ہیں۔

> حضرت اسمٰعیل گو اس وقت بچہ تھے۔مگر سولہ یا سترہ برس سے کم کے نہ ہوں گے اور اس لئے وہ اپنی ماں کی مدد کے قابل ہوں گے۔جس طرح کہ انھوں نے بعد میں توجہ کی۔

(خطبات)

مندرجہ بالا شہود و ثبوت لکھ کر ہم نے کافی طور پر۔عیسائیوں کے غلط معنی لگانے اور غلط واقعہ دکھلانے کی کامل تردید و تکذیب انہیں کے مختار و اقرار سے تحریر کردی اور ثابت کردیا کہ باپ کے مکہ میں پہنچانے کے وقت حضرت اسماعیلؑ کا سن سترہ برس کا ہو چکا تھا۔اسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کو ہاجرہ کی طرف سے ایک گونہ یہ اطمینان تو ضرور ہو گیا تھا کہ ضرورت اور تکلیف کے وقت ماں کے ساتھ جوان اور سنِ تمیز کو پہنچا ہوا لڑکا۔اس کی خدمت اور اعانت کو موجود ہے۔میری اس رائے کی تائید یورپین محقق کے اس نظریہ سے کامل طور پر ہو جاتی ہے۔جس کو ہم نے ابھی ابھی اوپر نقل کیا ہے اور جو اس امر کا معترف ہے کہ گو حضرت اسماعیلؑ بچہ تھے مگر وہ سولہ یا ستر برس کے ہوں گے۔اس لئے اپنی ماں کی مدد کرنے کے قابل ہوں گے۔

اسی کے ضمن میں ہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے۔۔ یہ بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی مورخین و محدثین نے بھی حضرت اسماعیل کی طفولیت کا اظہار کیا۔اور صحیح بخاری تک میں ان کی کمسنی کی حدیثیں مختلف طریقوں سے آئی ہیں۔ان اسلامی تاریخوں میں طفولیت کا اظہار پا کر عیسائیوں کو اپنے دعوے میں تازہ قوت مل گئی ہے۔مگر ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی مولفین و مصنفین نے۔خصوصاً اخبار قدیمہ اور حالات قبل از اسلام کے بیان و نقل میں زیادہ تر یہود و نصاریٰ کے مرویات و منقولات سے کام لیا ہے۔اس لئے اسلامی مورخین کے بیانات کے ماخذ اصلی پھر وہی یہود و نصاریٰ کی تالیفات ثابت ہوں گیں اور صورت واقعہ پر ؎

اے صبا ایں ہمہ آوردۂ تست کا مضمون صادق آئے گا۔

اب رہی یہ بات کہ صحیح بخاری میں ایسا ہی مذکور ہے تو یہ کوئی استدلال کا طریقہ نہیں ہے۔اوّل تو یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور امام بخاری صاحب کا جو تاریخ میں پایہ ہے وہ اس قابل نہیں ہے جو ان کو مورخین کی سب سے آخر والی صف میں بھی کھڑے ہونے کے قابل بنائے۔اس لئے تمام مورخین و محققین کے آگے بخاری صاحب کا لکھنا کوئی اعتبار نہیں رکھتا۔سر سید مرحوم نے خطبات احمدیہ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے۔صحیح بخاری کی ان تمام حدیثوں کو ان کے مختلف طریقوں کے ساتھ جمع کیا ہے اور جمع کرنے کے بعد ان پر جو تنقیدانہ رائے قائم کی ہے وہ لفظ بالفظ ذیل میں نقل جاتی ہے۔

> مذکورۂ بالا روایتوں سے ظاہر ہے کہ وہ مستند نہیں ہے یعنی حضرت ابن عباس نے اس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں سنا۔نہیں معلوم کہ ابن عباس نے کس سے سنا اور کس بنیاد پر انہوں نے اس کو بیان کیا۔بخاری کا ادب اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم تسلیم کر لیں کہ ابن عباس نے اس کو سعید ابن جبیر سے سنا۔اور سعید ابن جبیر نے اور لوگوں سے۔جن سے بخاری تک یہ روایات پہنچی۔مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ابن عباس نے اس روایت کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا۔(خطبات احمدیہ 99-103) مطبوعہ لاہور۔

ہم نے اس بحث میں سرسید ہی کی تحقیق پر بس نہیں کی ہے۔ بلکہ عربی کے قدیم ماخذوں میں بھی اس کی تلاش کی ہے تو ثابت ہوا ہے کہ عربی مورخین نے صغرسنی والی روایتوں کو لکھ کر۔ ان روایتوں کو بھی لکھ دیا ہے جس سے حضرت اسماعیلؑ کا سنِ بلوغیت کے قریب پہنچا ہوا ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد جلد اول ص 24 مطبوعہ جرمن ہے۔ ہم اس مقصد میں دو روایتیں حسب ذیل لکھتے ہیں۔ جن سے ہمارے بیان کا پورا ثبوت ہو جائے گا۔

اخبرنا اسماعیل بن عبد اللہ ابن ابی اویس المدنی حدثنی ابی عن ابی الجار ود الربیع بن فریع عن عقبہ ابن بشر انہ سئالہ محمد بن علی من اول تکلم بالعربیہ قال اسماعیل ابن ابراھیم وھو ثلاث عشرۃ

اسمعیل بن عبد اللہ بن ابی اویس المدنی نے اپنے باپ سے اس نے ابی الجار ود الربیع ابن فریع سے اس نے عقبہ ابن بشر سے روایت کی ہے کہ بشر نے کہا کہ میں نے محمدؑ ابن علی (امام محمد باقرؑ) سے پوچھا کہ سب سے پہلے کس شخص نے زبان عربی میں کلام کیا۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ اسماعیل بن ابراہیمؑ اور وہ تیرہ برس کے تھے۔

اس روایت سے ترک وطن اور عزم مکہ کے وقت حضرت اسماعیل کا سن تیرہ برس کا ثابت ہوتا ہے۔ طبقات ابن سعد کی دوسری روایت۔

اخبرنا موسی بن داؤد اخبرنا عبد اللہ بن الھیعۃ عن حی ابن عبد اللہ قال بلغتی ان اسماعیل النبی صلعم اختتن ھو ابن ثلاث عشرہ سنۃ

موسیٰ ابن داؤد عبد اللہ ابن الھیعہ سے اور وہ حی ابن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حی کا یہ قول بیان کرتے ہیں کہ میری تحقیق یہ ہے کہ حضرت اسماعیل نبی علیہ السلام کا عقیقہ تیرہ برس کے سن میں کیا گیا تھا۔

یہ روایت بالکل توریت والی روایت کے مطابق ہے۔ جب عقیقہ کے وقت ان کی عمر تیرہ برس کی باتفاق جمہور ثابت اور اسحاق علیہ السلام کے ولادت سے ایک سال بعد کا واقعہ ہے۔ اور ہجرت وطن۔ ولادت اسحاق علیہ السلام سے دو یا تین برس بعد واقع ہوئی تو پھر اب ورود مکہ کے وقت سترہ برس کے سن کو تسلیم کرنے میں کس کو اعتراض ہو سکتا ہے، طفولیت کمسنی اور شیرخوارگی کا عالم یہاں کیسا لغو اور کتنا مہمل ثابت ہوتا ہے۔

> فاضل معاصر صاحب ارض القرآن حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شیرخوارگی کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ بخاری کی کتاب الرویا اور کتاب الانبیاء میں جو حدیث اسماعیل علیہ السلام کی شیرخوارگی کے متعلق ہے۔ وہ مرفوع نہیں ہے۔ یعنی اس کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچتا۔ سوائے چند خاص ضمنی فقروں کے اس لئے وہ حضرت ابن

عباس کے اسرائیلیات میں سے ہے۔ارض القرآن ج2 ص49

مکہ میں قریب زمزم آباد ہونا اور قبیلہ جرہم کو بھی سکونت کی اجازت

اس بحث کو تمام کر کے ہم اپنے قدیم سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں۔جناب ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ اور جناب اسماعیلؑ کو راضی برضائے الٰہی چھوڑ کر مراجعت فرمائے وطن آئے اور کرشمۂ قدرت سے ان دونوں نفوس مقدسہ کے آرام و آسائش کے سامان اسی نے اپنی خاص رحمت سے مہیا فرمائے جیسا کہ سابق سلسلہ بیان سے ثابت ہو چکا۔صاحب ارض القرآن بخاری۔کتاب الانبیاء اس کے آگے لکھتے ہیں۔

> اتفاقاً جرہم کے کچھ آدمیوں کا ادھر گذر ہوا۔پرندوں کو منڈلاتے دیکھ کر بولے کہ پانی یہاں ہے۔ایک آدمی کو تحقیق کے لئے بھیجا۔تو پانی پایا۔آ کر خبر کی۔وہ لوگ بھی آئے۔اور ام اسماعیلؑ سے یہاں رہنے کی اجازت چاہی۔ام اسمٰعیل نے کہا رہو۔لیکن پانی میں تمہارا کوئی حق نہیں۔ابن عباس نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ام اسماعیلؑ کو یہ بات پسند آئی۔اس لئے وہ آبادی اور معیت چاہتی تھی وہ لوگ بھی رہنے لگے۔لڑکا جب جوان ہوا۔اور ان سے عربی سیکھی۔جب جوان ہوا تو ان لوگوں (جرہم) کو بہت پسند آیا۔بالغ ہونے پر اپنی ایک لڑکی اس سے بیاہ دی۔

ہم بخاری کے مجمل اور مختصر بیان واقعہ کو مواہب لدنیہ اور ابن اثیر کے مفصل روایات سے حسب ذیل قلمبند کرتے ہیں۔

بنی جرہم کا قبیلہ۔جو عرب العاربہ کے سلسلہ میں بہت مشہور و معروف ہے۔اس طرف آ گیا۔ان لوگوں کے لئے پانی سے بڑھ کر نہ کوئی دولت عزیز تھی۔اور نہ دنیا کی کوئی نعمت۔ان لوگوں نے چشمہ زمزم کے صاف اور ستھرے پانی کو خصوصاً ایک حوض کی صورت میں جمع کیا ہوا دیکھا تو اپنی بے حد مسرت میں فوراً اس کی طرف دوڑ پڑے۔یہاں آ کر ان کی نظر ایک عفیفہ مقدسہ (حضرت ہاجرہ پر پڑی۔وہ اس حوض کے پاس ایک چھوٹے سے خیمہ کے در پر صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں وہ خیمہ بالکل اس حوض پر آب سے متصل کھڑا ہوا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس چشمہ کو چاروں طرف سے حضرت ہاجرہ نے گھیر دیا تھا۔جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔اس کے متعلق صحیح بخاری میں عبداللہ ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اگر ام اسماعیلؑ اس کو چاروں طرف سے گھیر نہ دیتیں تو وہ چشمہ ہمیشہ کھلا ہوا بہتا رہتا حضرت ہاجرہؑ اس وقت در خیمہ پر بیٹھی ہوئی حضرت اسماعیلؑ کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ شکار کے لئے باہر گئے ہوئے تھے بنی جرہم تھے تو جاہل اور جرہم پر کیا منحصر ہے عموماً تمام عرب کا عرب اس وقت تک جاہل تھا مگر پانی کے لئے اس کی ندرت۔کمیابی اور قدر و عزت کی وجہ سے۔ان میں زمانہ دراز سے یہ مہذبانہ دستور چلا آتا تھا کہ بغیر اس کے مالک یا متصرف بالاختیار کے پوچھے یا بغیر اجازت حاصل کئے وہ کسی غیر کے پانی کو صرف نہیں کر سکتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی پانی پر بے اذن و اجازت کے متصرف ہو جانے سے اکثر قوم و قبیلوں میں ایسی ایسی خونریزیاں واقع ہو چکی تھیں۔جن سے قوم کی قوم۔قبیلے کے قبیلے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔اسی احتیاط اور حفظ ماتقدم کی بنا پر آج تک عرب میں۔کسی چشمہ۔حوض تالاب یا کنوئیں کو۔جو کسی شخص کی ملکیت خاص ہو۔کوئی غیر شخص۔قوم یا

قبیلہ۔بغیر اس کے اذن واجازت کے استعمال نہیں کرسکتا۔

اسی لئے بنی جرہم نے حضرت ہاجرہؑ سے اس حوض کے پانی لینے کی اجازت مانگی۔ خلیل الرحمن کی مہمان نواز بی بی نے بغیر کسی اعتراض واغماض کے اھلاً و سھلاً کہہ کر پہلے ان کو بلایا اور پھر ھنیاً لکم فرما کر ان کو اس چشمۂ قدرت ورحمت کا پانی پلایا۔

ریگستان عرب کے پیاسوں کو جہاں پانی مل گیا۔ وہیں کے ہو رہے۔ یہ لوگ پانی پی کر اپنے مقام ومسکن کو لوٹے تو اس چشمہ کی کیفیت اپنی قوم وقبیلے کے لوگوں سے کہی۔ چونکہ ان کے موطن ومسکن میں پانی کا ہمیشہ قحط شدید رہا کرتا تھا۔ اس لئے وہ تمام لوگ اپنے مقام سکونت کو چھوڑ کر۔ حضرت ہاجرہ اور اسماعیلؑ کے اذن واجازت سے یہیں آباد ہو گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں برابر آکر اہل وعیال کو دیکھ جاتے تھے

جناب ابراہیمؑ نے اپنے اہل وعیال کو مکہ پہنچ کر خدا کے حوالہ تو کر دیا تھا۔ مگر ان کے ساتھ دائمی مفارقت نہیں اختیار کی تھی۔ جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے سمجھا ہے۔ اور محض گمراہانہ اور مغویانہ طریقہ سے ساری دنیا کو سمجھانا چاہا ہے وہ کون بے درد ہوگا۔ جو اس شقاوت اور بے رحمی کے طریقہ کو ایک برحق نبی خدا کا جزو اخلاق سمجھے گا۔ یہودیوں کو اور ان کی تقلید میں عیسائیوں کو تو ہاجرہ اور اسماعیلؑ سے قلبی عداوت ہے۔ اور ان کی شان وفضیلت میں کمی کرنا وہ اپنا نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ عرب کے تمام اخبار وآثار قدیمہ ثابت کر رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ایک بار نہیں۔ تین بار مکہ معظمہ میں تشریف لائے۔ بال بچوں کو دیکھا بھالا۔ پوچھا بتلایا اور چلے گئے۔ اوّل بار آپ اس وقت تشریف لائے۔ جب اسمٰعیلؑ کی شادی ہو چکی تھی۔ مگر آپ نے اس توصل وپیوند کو ناپسند فرمایا اور اس کے قطع فرمانے کا حکم دے گئے۔ دوسری بار آئے تو حضرت اسماعیلؑ کی نئی شادی اور توصل کو مستحسن اور مبارک بتلایا۔ تیسری بار آئے تو خانہ کعبہ کی تعمیر۔ مناسکاتِ حج کی تعلیم وتشہیر اور دیگر ارکان ارشاد وہدایات کی تلقین فرمائی۔ ابن سعد کی روایت میں اس کا اجمالاً یوں ذکر ہے۔

اخرج ابراھیم صلعم الی مکة ثلاث مرات و دعا الناس الی الحج فی اٰخرھن (طبقات)

حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ میں تین بار تشریف لائے اور آخر نوبت میں آپ نے لوگوں کو ادائے حج کے لئے دعوت کی۔ (طبقات)

اس روایت سے کوئی تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔ سوائے اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ تین بار مکہ میں آئے اور آخر بار آپ نے حج کے لئے لوگوں کو بلایا۔ اگرچہ تیسری بار تشریف لانے کی یک گونہ وجہ وکیفیت معلوم بھی ہوئی تو اس سے قبل دو بار تشریف لانے کی حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی۔ اس کو ہمارے لئے اوّل ودوبارہ کی تصریح وتشریح ضروری ہے۔ ہم اول اور دوم بار آپ کے تشریف لانے کی کیفیت صحیح بخاری اور تاریخ طبری جلد اول سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

فنکح (اسمعیل) امرۃ فیھم قال ثم یر الابراھیم فقال لا ھلہ انی مطلع ترکتنی

قال فجاء فسلم فقال این اسمعیل فقالت امراته ذهب بصید قال قولی له اذ جاء غیر عتبة بیتك فلما جاء اخیرة فقال انت ذلك فاذهبی الی اهلك قال ثم انه یر الابراهیم فقال لاهله انی مطلع ترکسی فجاء فقال این اسماعیل فقالت امراته ذهب بصید فقالت الا تنزل فتطعم وتشرب فقال وما طعامکم وما شرابکم فقالت اللحم طعامنا و شرابنا الماء قال اللهم بارك لهم فی طعامهم و شرابهم قال فقال ابو القاسم برکة بدعوة ابراهیم

پھر انہیں کے قبیلہ میں اسماعیلؑ کی شادی کر دی۔ ابن عباس کا بیان ہے جب جناب ابراہیمؑ آئے تو پوچھا کہ اسماعیلؑ کہاں ہیں ان کی بی بی نے جواب دیا کہ وہ شکار کو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ جب وہ آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کے کیواڑ بدل ڈالیں۔ جب اسماعیلؑ آئے تو ان کی بی بی نے ان سے یہ واقعہ دہرایا۔ حضرت اسماعیلؑ نے کہا کہ وہ (کیواڑ) تمہیں ہو۔ تم اسی وقت میرے گھر سے اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ۔ پھر جناب ابراہیمؑ (دوسری بار) تشریف لائے تو پھر اسماعیلؑ کو پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کی (موجودہ) بی بی نے جواب دیا شکار کو گئے ہیں۔ اتنا کہہ کر اس خاتون نے عرض کی کہ آپ گھر میں تشرف لایئے تو ہم آپ کو کھلائیں پلائیں۔ ابراہیمؑ نے پوچھا تمہارے پاس کھانے پینے کو کیا ہے۔ اسماعیلؑ کی بی بی نے کہا کہ کھانے کو گوشت ہے اور پینے کو پانی یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ خدا تمہارے کھانے پینے میں برکت عطا فرمائے ابن عباس کا قول ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے عام دعا مانگی تھی۔

حضرت اسمعیلؑ کی جرہمی اور مصری بی بی ہونے کی تحقیق

مندرجہ بالا عبارت سے حضرت ابراہیمؑ کا دوبارہ کنعان سے مکہ معظّمہ اپنے اہل وعیال کے تفحص احوال پرسی کی غرض سے تشریف لانا۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا اپنے پدر بزرگوار کی ہدایت کے مطابق پہلی بی بی کو طلاق دینا اور ایک دوسری بی بی سے نکاح کرنا ثابت ہوتا ہے۔ اور وہ دونوں بیبیاں جرہم کی لڑکیاں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ تورات کی روایت کے خلاف ہے۔ اس میں ان کی بی بی کا مصری ہونا صاف صاف لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ عربی مورخین نے اپنے مدعا سے زائد سمجھ کر اس مسئلہ میں زیادہ تحقیق وتفتیش نہ کی ہو۔ اور سر سید مرحوم نے تورات والی روایت کی تائید میں جو اپنا نظریہ قائم کیا اور جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ صحیح ہو۔

ہمیں اس بات کے یقین کر لینے کی پوری وجہ ہے کہ مذکورۂ بالا روایت میں۔ جو پہلی بی بی

کا جرہم سے ہونا بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ پہلی بی بی ایک مصری عورت تھی۔ اور
یہی وجہ ہوگی کہ اس عورت سے نکاح کرنا حضرت ابراہیمؑ نے ناپسند کیا ہوگا۔ یہ بھی قرین
قیاس ہے کہ ابتدا میں جرہم نے اپنی قوم کی لڑکی حضرت اسماعیلؑ کے نکاح میں دینے
سے انکار کیا ہو۔ کیونکہ وہ اسمٰعیلؑ کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے۔ مگر پھر ایک
معتدبہ زمانہ تک باہم سکونت پذیر ہونے سے یہ خیال جاتا رہا ہو۔ اس لئے یقین ہوتا
ہے کہ ان کی دوسری بی بی جرہم کی قوم سے ضرور تھیں۔

ہمیں اس بحث کے متعلق زیادہ تحقیق وتفتیش کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے مدعائے تالیف کو۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی اسی بی بی کے حالات سے تعلق ہے۔ جس سے سلسلہ بنواسماعیلؑ کی ابتدا ہوئی اور وہ بالا اتفاق انھیں بی بی سے شروع ہوا جو قبیلہ جرہم سے تھیں۔ اور جن کا نام محمد ابن اسحاق نے سیرت ابن ہشام میں۔ رعلہ بنت مضاض بن عمر الجرہمی بتلایا ہے۔ اور کلبی نے رعلہ بنت یشحب ابن یعرب لکھا ہے۔ ان دونوں روایتوں میں اس خاتون معظّمہ کا نام ایک ہے۔ فرق ہے تو سلسلہ نسبی میں اور وہ بھی عندالتحقیق متحد الاصل ثابت ہوتا ہے۔ اسی تحقیق کی تفصیل میں یہ بھی دریافت کر لینا ضروری ہے کہ غیر جرہم بھی کوئی عورت اسماعیلؑ کے عقد میں۔ جس کو تورات نے مصری لکھا ہے۔ آئی تھی یا نہیں۔ اگر آئی تھی تو عرب کی قدیم روایتوں میں اس کا کہیں ذکر ہے یا نہیں۔ ہم اس کے متعلق طبقات ابن سعد کی مرقومہ ذیل روایت میں پیش کرتے ہیں۔

قال الکلبی و کانت لاسمعیل امراۃ من العمالیق ابنۃ صیدی قبل الجرھمیہ وھی
التی کان جآءھا ابراھیم فجفنه فی القول ففارقھا اسمعیل ولم تلد له شیئا

کلبی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل کی ایک بی بی قوم عمالیق سے تھیں۔ صیدی کی لڑکی۔ اور یہ وہی تھیں جن
کے جدا کرنے کا ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو حکم دیا تھا اور اسمٰعیلؑ نے جدا کر دیا تھا۔ اس عورت سے اسماعیل کی
کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اس روایت سے اسماعیلؑ کی ایک بی بی کا غیر جرہمیہ ہونا ضرور ثابت ہوتا ہے مگر وہ عمالیق سے تھیں نہ تورات کی تصریح کے مطابق زن مصریہ تھیں۔ تورات کے مفسرین و مترجمین کو غالباً عمالیق کے لفظ و نام نے شبہ میں ڈالا ہے۔ اور وہ عمالیق سے قوم عمالیق ساکن مصر سمجھے ہیں اور اس بنا پر اس عورت کو مصری لکھتے ہیں۔ مگر یہ صریح غلط فہمی ہے۔ یہ عمالقہ مصری قوم سے نہیں بلکہ عمالیق مکہ کے قبیلہ کی لڑکی تھی۔ کلبی نے اس کا سلسلہ اپنی پہلی روایت میں اس طرح لکھا ہے۔ دعلہ بنت یشحب ابن یعرب۔ یہ شخص یشحب ملک یمن کا بادشاہ تھا۔ اور وہاں کے مشہور و معروف بادشاہ سباء اکبر کا۔ مورث اعلیٰ۔ اسی کے سلسلہ میں ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے مشہور تھا۔ جو جرہم کے بعد مکہ میں آباد ہوا۔ (ابن ہشام و ابوالفدا اور ابن اثیر)

یشحب کی ماہیت معلوم ہوئی اب یعرب کی اصلیت یہ ہے کہ یعرب وہی شخص ہے جس کا دوسرا نام جرہم ہے۔ امور بالا کو اکثر مقامات پر سرسید مرحوم نے خطبات میں تحریر کیا ہے۔ ان کی مندرجات تصدیقی حسب ذیل ہیں۔

مغربی اور مشرقی مورخین کی تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ یعرب اور جرہم سے ایک ہی شخص مراد ہے اور اولاد یعرب کی بہت سی شاخیں بنی جرہم میں داخل ہیں۔ خطبات احمدیہ ص67 مطبوح لاہور۔

دوسرے مقام پر تحریر ہے۔

عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں۔ جن کی نسل یقطان اور قحطان سے چلی ہے اور تمام قبائل عرب اسی نسل میں داخل ہیں۔ حمیر بھی انہیں کا ایک قبیلہ ہے۔ اور بنی حمیر ہی میں ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے مشہور تھا۔ جو مکہ میں بستا تھا۔ خطبات ص521 مطبوعہ لاہور

ان اسناد و اشہاد سے۔ عرب کی قدیم تاریخوں کا یہ لکھنا ان کی دونوں بیبیاں جرہمیہ تھیں۔ معنی بے اصل اور دعویٰ بے دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کلبی نے زوجہ اولیٰ اسماعیلؑ کو عمالیقی بتلایا ہے۔ وہ بھی تو اصلاً جرہمیہ ثابت ہوتی ہے تورات کا مصری عورت ہونے پر اگر زیادہ اصرار کیا جاوے گا تو ہم اس کو بھی عربی الاصل ثابت کرنے پر تیار ہیں۔ صاحب ارض اس مسئلہ کے تحقیق میں عبارت ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی بی بی کا جرہمی یا مصری ہونا کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ اس عہد میں بھی یہی عرب مصر کے حکمران قبائل تھے۔ اس بنا پر وہ عورت جرہمی بھی ہو سکتی ہے اور مصری بھی۔ ارض القرآن ج2 ص52۔

ہم کو صاحب ارض القرآن کی رائے سے پورا اتفاق ہے اور سرسید مرحوم کے نظریہ سے بالکل اختلاف جنھوں نے زوجہ اوّل حضرت اسماعیلؑ کو کسی نوع سے جرہمیہ ہونے کو غلط مانا ہے۔ حالانکہ ہم انھیں کے اقرار و اعتراف سے ثابت کر آئے ہیں کہ وہ عورت عام اس سے کہ مصری ہو یا عمالیقی۔ عربی الاصل اور جرہمی النسل ضرور مانی جائے گی۔ یہ صرف سید صاحب کا ضرورت سے زیادہ مرویات تورات پر اعتماد و اعتقاد رکھنے کا نتیجہ ہے۔ جو ان کی تالیفات و تصنیفات کے اکثر مقامات سے ہویدا و اشکار ہے۔

تعمیر خانہ کعبہ مشرفہ

دو بار جناب ابراہیم علیہ السلام کے مکہ میں تشریف لانے کے متعلق ہم تفصیل سے حالات و واقعات لکھ چکے ہیں۔ تیسری بار تشریف فرما ہونے کی ضرورت یہ ہے۔

اب کی بار آپ کی تشریف آوری کے واقعات بتلا رہے ہیں کہ پہلے دو بار تو آپ اپنے روحی تعلقات اور قلبی جذبات کے زیر اثر ہو کر اپنے اہل و عیال کے تفقد احوال کی غرض و ضرورت سے تشریف لائے تھے مگر اب کی بار مکہ معظّمہ میں آپ کا نزول اجلال خدائے لا

یز ال کے ایک واجب التعمیل حکم کی بجا آوری کے باعث تھا۔ اور اس حکم الٰہی کی تعمیل سے۔ عبادت واطاعت خداوندی کی تعلیم وترویج تمام اقطاع عالم میں قائم کرنی تھی اور حقیقت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل آپ کی حیات ستودہ آیات کا وہ واقعہ ہے۔ جس سے آپ کا کمال معرفت۔ خلوص اللہ اور متابعت خداوندی کے بے مثال جوہر ثابت ہوتے ہیں۔ ہم اس واقعہ کی تفصیل میں۔ صحیح بخاری کی مندرجہ بالا روایت کے ما بقی حصہ کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ثم انه یر الابراهیم فقال لا هله انی مطلع تر کتی فجاء فوافق اسماعیل من وراء زمزم یصلح بناء له فقال یا اسماعیل ان ربك امرنی ان ابنی له بیتاً قال اطع ربك قال امرنی ان تعیننی علیه قال اذا فعل او کما قال فقاما فجعل ابراهیم یبنی و اسماعیل ینا وله الحجارة ویقولان ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم قال حتی ارتفع البناء وضعف الشیخ عن نقل الحجارة فقام علی حجرالمقام فجاء یناو له الحجارة و یقولان ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔ (بخاری کتاب الانبیاء)

خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ جب پھر حضرت ابراہیمؑ آئے اور اسماعیلؑ کو تلاش کیا۔ تو جناب اسماعیلؑ کو پشت زمزم پر جہاں آب زمزم ہے۔ بنائے زمزم کی مرمت کرتے ہوئے پایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے کہا کہ میرے خدا نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں اس کے لئے گھر بناؤں حضرت اسماعیلؑ نے کہا کہ آپ حکم خدا کی تعمیل واطاعت کیجیے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کام میں تم میری مدد کرو۔ ابن عباس کا قول ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نے ایسا ہی کیا جیسا ان کے پدر بزرگوار نے ارشاد کیا۔ اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ دونوں باپ بیٹے اسی وقت اٹھ کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ گھر بناتے تھے اور جناب اسماعیلؑ پتھر ڈھو ڈھو کر دیتے جاتے تھے اور دونوں بزرگوار فرماتے جاتے تھے۔ پروردگار تو ہم دونوں کی ان خدمات کو قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔

یہاں تک کہ بنیادیں اتنی اونچی ہو گئیں کہ ابراہیمؑ کھڑے ہو کر پتھر نہ رکھ سکے۔ تو ایک پتھر پر کھڑے ہو کر جس کو آج تک مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ دیوار پر پتھر رکھنے لگے اور اسماعیلؑ ان کو اٹھا اٹھا کر پتھر دینے لگے۔ دونوں بزرگوار (کام کرتے جاتے تھے) اور کہتے جاتے تھے۔ پروردگار تو ہم دونوں کی ان خدمات کو قبول فرما۔ کیونکہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسلامی مورخین نے انواع واقسام کے طریقوں سے بنائے کعبہ کے متعلق روایات لکھ کر اپنے خلوص وعقیدت کا اظہار کیا ہے مگر ہم

ان کو اپنے مدعائے تالیفی سے زائد اور غیر ضروری سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں۔ اور ذیل میں خانہ کعبہ کی اس ساری اور بلا تکلف عمارت کو۔ جوان دونوں برگزیدگان الٰہی نے اپنے مقدس اور مبارک ہاتھوں سے بنائی تھی اور اس کو جس شکل وحیثیت میں اس وقت قائم کیا تھا علامہ ارزقی کی اصلی عبارت سے نقل کرتے ہیں۔

بنا البیت و جعل طوله فی السماء تسعة اذرع و عرضه فی الارض اثنین و ثلاثین ذراعاً من الرکن الا سود الی الرکن الشامی الذی عند الحجر من وجهه و جعل عرض ما بین الرکن الشامی الی رکن الیمانی الذی فیه الحجر اثنین و عشرین ذراعا و جعل طول ظهر ها من الرکن الغربی الی رکن الیمانی احدود و ثلاثین ذراعاً و جعل عرض شقها الیمانی من الرکن الاسود الی الرکن العیانی عشرین ذراعاً۔ (کتاب اخبار مکه ازرقی ص 31)

خانہ کعبہ بننا شروع ہو گیا۔ اونچائی اس کی 9 گز تھی۔ اور چوڑائی (ایک طرف کی) 32 گز کی۔ رکن اسود سے لے کر رکن شامی تک اور یہ مقام حجر سے ملا ہوا ہے۔ اور چوڑائی دوسری طرف کی رکن شامی سے رکن غربی تک 22 گز ہے اور اس سے بھی حجر ملا ہے اور چوڑائی پشت کی رکن غربی سے رکن عیانی تک 31 گز اور دوسری طرف رکن یمانی سے لے کر رکن الاسود تک 20 گز تھی۔ (کتاب اخبار مکہ علامہ ازرقی ص 31)

حرم محترم کی عمارت اتنی ہی تھی جس کی نہ چھت پائی گئی تھی۔ اور نہ اس میں چوکھٹ بازو۔ کواڑ اور کنڈی وغیرہ کی شرکت ضروری سمجھی گئی۔ خدائے واحد کا یہ پاک وصاف گھر انتہا درجہ کی سادگی کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ جس کا معمار خلیل اللہ تھا۔ اور مزدور ذبیح اللہ۔ خانہ کعبہ کے اندر ایک مدّ ور گڑھا کھود دیا گیا تھا جس میں نذر و نیاز اور دوسرے چڑھاوے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ اسی کو بیر کعبہ کہتے تھے۔ چونکہ یہ عمارت باوجود اس کے کہ چوگوشہ ضرور تھی۔ مگر مساحت کے اصول سے اس کے چاروں ضلع برابر نہیں تھے۔ اس لئے مربع نہیں کہلا سکتی تھی۔ مربع کی جگہ مکعب کہی گئی اور کعبہ کی وجہ تسمیہ یہی ہوئی۔

ارکان حج کی تعلیم واعلان

جب یہ عمارت قریب تیاری کے پہنچی تو جیسا کہ تاریخ ارزقی میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے فرمایا۔

ائتنی بحجر صنعه حتی اکون علما للناس یبتدون منه الطواف۔

اے اسماعیلؑ ایک ایسا پتھر لا کر مجھے دو کہ میں اس کو اس غرض سے نصب کر دوں کہ وہیں سے لوگ کعبہ کا طواف شروع کریں۔ (اخبار مکہ ص 29)

مقدس حجر الاسود کی یہی تاریخ حیثیت قائم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی روایتیں حجر الاسود کے متعلق اسلامی کتب و تفاسیر میں منقول ہیں۔ وہ اعتقاداً کتنی ہی صحیح اور قوی ہوں مگر تاریخی حیثیت کے اعتبار سے قابل الذکر نہیں ہوسکتیں۔

جب خانہ خدا کی یہ عمارت بن چکی تو مصدر قدرت سے خلیل اللہ کو یہ حکم صادر ہوا۔

وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ۝٢٦ وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ۝٢٧ (الحج)

میرا گھر طواف کرنے والوں۔ قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک کرو۔ اور تمام لوگوں کو حکم کرو کہ میرے گھر کا طواف کرنے آئیں۔ پیدل بھی اور لاغر اونٹ پر بھی۔ وہ ہر دور دراز گوشہ ملک سے آئیں گے۔

یہ حکم پاتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے لبیک کہی اور اسی وقت سے آج تک عرب میں لبیک کہنے کا۔ جب وہ خانہ کعبہ کے سامنے یا قریب پہنچ جائیں۔ دستور قائم ہوگیا۔ اسی کو تلبیہ کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اعلان حج کا یوں انتظام کیا کہ مقام ابراہیمؑ پر (اور بنا پر بعض روایات کوہ عرفات پر چڑھ کر) کھڑے ہوکر تمام لوگوں کو خانہ کعبہ کے طواف کے لئے بلایا۔ سب سے پہلے جس قوم و قبیلہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول فرمایا۔ وہ بنی جرہم تھے۔ طبقات ابن سعد میں ہے۔

فاول من اجابہ جرھم۔

ان کی قبول دعوت کے بعد قوم عمالیق ایمان لائی۔

قبل العمالیق ثم اسلموا

ان کے بعد قوم عمالیق اسلام لائی۔

ان کے اسلام لانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ان تمام قوم و قبیلہ کے لوگوں کو جو حوالی مکہ میں آباد تھے۔ دین ابراہیمی کی تلقین اور مناسکات حج اور طواف بیت الحرام وغیرہ کی کامل تعلیم فرمائی۔

یہ دین حنیف کی ابتدائی تعلیم تھی اور اس کی تعلیم کے حالات و واقعات جو اوپر قلمبند کئے گئے۔ اسی ضمن میں ہمیں یہ لکھ دینا بہت ضروری ہے کہ یہ عبادت گاہ الٰہی بہت جلد قربان گاہ قرار پا گئی۔ پھر اس استقرار اور استمرار کے ساتھ کہ اس وقت سے لے کر آج تک اور آج سے ابدال آباد تک۔ نسل ابراہیمی کے ایثار و انداز اور دین حنیف کا سچا معیار قائم ہوگئی۔

اپنے پہلوٹے اور سب سے بڑے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی راہ خدا میں قربانی

قرآن مجید میں اس واقعہ کی کیفیت یوں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ۝٩٩ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ۝١٠٠ فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ۝١٠١ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡىَ قَالَ يٰبُنَىَّ اِنِّىۡۤ اَرٰى فِى الۡمَنَامِ اَنِّىۡۤ اَذۡبَحُكَ فَانۡظُرۡ مَاذَا

تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَ تَلَّہٗ لِلۡجَبِیۡنِ ﴿۱۰۳﴾ۚ وَ نَادَیۡنٰہُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾ۙ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا ۚ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡبَلٰٓـؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۷﴾

(ابراہیمؑ) نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ چلوں گا کہ وہ مجھ کو ہدایت فرمائے پروردگار مجھ کو ایک نیکوکار فرزند عطا فرما تو ہم نے اس کو ایک سمجھدار لڑکے کی بشارت دی۔ پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے پھرنے (کام کرنے) لگا۔ تو ابراہیمؑ نے اس سے کہا۔ اے میرے بیٹے میں نے اس خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرر ہا ہوں۔ تیری اس معاملہ میں کیا رائے ہے۔ اس لڑکے نے جواب دیا۔ ابا جان جو آپ کو حکم ہوا ہے (بے تامل) آپ اس کی تعمیل کیجئے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صابر ہی پائیں گے۔ پھر جب دونوں (باپ بیٹے) تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور باپ نے (حلال کرنے کے لئے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ہم کو ان کی فرمانبرداری نہایت ہی پسند آئی) ہم نے ابراہیمؑ سے پکار کر کہا اے ابراہیمؑ تم نے اپنے خواب کو خوب سچ کر دکھلایا۔ اب ہم تم کو بڑے بڑے مرتبہ دینگے اور ہم نیک بندوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے تھے ہیں۔ بے شک یہ کھلی آزمائش تھی اور ہم نے عظیم قربانی کو اسماعیلؑ کا فدیہ بنایا۔

تفسیر بیضاوی اور ربیع الابرار زمخشری سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ رویاء صادقہ جس دن حضرت ابراہیمؑ کو دکھلایا گیا وہ ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تھی۔ اسی لئے آٹھویں ذالحجہ کو مصطلحاتِ فقہیہ علمیہ میں یوم الترویہ کہتے ہیں۔ جو رویۃ سے مشتق ہے۔ نویں ذی الحجہ کی رات کو مقام عرفات میں پھر ایسا ہی خواب دکھلایا گیا۔ اور اسی دن آپ نے حضرت اسماعیلؑ سے اپنے خواب کو دہرایا۔ اکثر علماء کی رائے میں نویں تاریخ کو احکام عملیات میں یوم العرفہ کہے جانے کی یہی وجہ تسمیہ ہوئی۔ اس رات کو بھی جناب ابراہیمؑ غالباً مناسکات عرفات بجالانے اور قوم وقبائل کے تمام لوگوں کو خدائے واحد کی معرفت۔ اس کی عبادت کے طریقہ۔ اس خانہ مقدس کے آداب اور مناسکات کے تمام لوگوں کو خدائے واحد کی معرفت۔ اس کی عبادت کے طریقہ۔ اس خانہ مقدس کے آداب اور مناسکات حج بجالانے کی مشغولیت کے سبب سے اس امر جلیل کی تعمیل نہ فرما سکے۔ دسویں کی رات کو سوئے تو پھر وہی خواب دیکھا۔ اب تو خدا کے اس خالص شیدائی کی عقیدت اس جوش میں آئی کہ اپنے پہلوٹے اور بڑی منت والے بیٹے کو قربان گاہ منیٰ میں لے جا کر چھری کے نیچے رکھ ہی دیا۔ اور آفرینش عالم کے وقت سے لے کر اس وقت تک خدا کے نام پر۔ خدا کی راہ میں ایک ایسی نذر۔ ایسی قربانی اور ایسے ایثار نفسی کی تعمیل کا پورا قصد کر لیا۔ جس کی مثال پھر دنیا کے کارنامہ میں نہ قائم ہو سکی۔ حضرت ابراہیمؑ کے صبر و رضا کے کمال اور راہ رضائے الٰہی میں آپ کی استقامت اور استقلال کا اس سے پہلے کئی بار امتحان ہو چکا تھا اور ہر موقع پر آماجگاہ مصیبت میں یہ خاصہ الٰہی کامل اور کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اس کی معرفت اور حسن اطاعت کا یہ آخری امتحان تھا اور آزمائش وابتلاء کا سخت ترین معرکہ۔ اور حقیقتاً ایسا قیامت خیز عالم اور عبرتناک عالم تھا کہ

آخر ممتحان قدرت بھی اس کے مشاہدے اورنظارے کی تاب نہ لا سکے۔اور قربانگاہ منیٰ سے چلا اٹھے

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾

اے ابراہیمؑ بے شک تو نے اپنے خواب کوسچا کر دکھایا۔اور ہم نیک بندوں کو ایسا ہی بدلا دیا کرتے ہیں۔
بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے بڑی قربانی کو اسماعیلؑ کا فدیہ بنایا۔

تبلیغ رسالت کے متعلق ایسے پر اثر۔مقتدر اور مافوق البشر خدمات انجام دے کر حضرت ابراہیمؑ نے نظام مشیت اوراحکام قدرت کے تمام مقاصد پورے کر دیئے۔

مکہ معظّمہ سے مراجعت اور جناب ابراہیم علیہ السلام کی رحلت۔

تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سن مبارک سو برس سے متجاوز ہو چکا تھا۔حضرت اسماعیلؑ کا سن اس وقت انیس برس کا بتلایا جاتا ہے۔تعمیر کعبہ تعلیم شریعت۔اعلان وتلقین مراسم حج اور دیگر امور تبلیغ رسالت کو انجام تک پہنچا کر حضرت ابراہیمؑ نے مکہ سے شام کی طرف مراجعت فرمائی۔اور وہاں پہنچ کر تھوڑے دنوں کے بعد داعی اجل کو لبیک کہی اور انتقال فرمایا۔آپ کی وفات کے متعلق اکابرین محدثین اسلامی یہ تفصیلی واقعہ بیان کرتے ہیں۔

ایک بار حسب العادت حضرت ابراہیمؑ نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی جب مہمانوں کی کثیر التعداد جماعت خوان خلیل الٰہی پر جمع ہوگئی اور حلقہ باندھ کر کھانا کھانے لگی تو حضرت ابراہیمؑ کی نظر ان مہمانوں میں ایک نہایت کبیر السن شخص پر پڑی اور آپ نے اس کو ایسی بیدست وپائی کی حالت خاص میں مشاہدہ فرمایا کہ اس کے تمام بدن میں رعشہ ہے اور وہ اپنے رعشہ دار ہاتھ سے لقمہ اٹھا کر کھانا چاہتا ہے۔تو خلاف عادت حرکتِ رعشہ کی وجہ سے لقمہ اس کے منہ تک نہیں پہنچتا بلکہ کبھی اس کی پیشانی اور کبھی رخسار اور چہرے کے دوسرے مقاموں پر جالگتا ہے۔اس کے ساتھ ایک اور آدمی بیٹھا ہوا ہے اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی ضرورت اور خدمت کے لئے ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔بالآخر اس کے رفیق نے اپنے ہاتھ سے اس کو کھلانا شروع کر دیا۔تب وہ غریب کبیر السن شخص کھانا کھا سکا۔

اس مشاہدہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں طول عمری کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہوئی۔اور آپ نے فوراً بارگاہ مجیب الدعواۃ میں ان گئی گذری حالتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے جانے کی دعا مانگی۔چونکہ وہی وقت آپ کی اجل موعود کا تھا۔اس لئے ادھر آپ کی دعا کے لئے حکم اجابت آیا۔ادھر فرمان قضا ورحلت **كل شي هالك الا وجهه**

ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات وستودہ آیات کے متعلق جستہ جستہ تمام واقعات وحالات بیان کر دیئے۔پڑھنے والے اوران پر غور کرنے والے آسانی کے ساتھ نتیجہ نکال لیں گے کہ اس اصلی اور حقیقی موحد اور دین حنیف کے موجد نے جس خلوص اور عقیدت کا وعدہ اپنے معبود حقیقی کے ساتھ ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۖ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶۳﴾

میری نماز میرے تمام مناسکات۔ اور میرا دنیا سے انتقال۔ (سب کچھ) خالص خدا کے واسطے ہے۔ جو دو عالم کا پروردگار ہے۔ اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ان امور کے لئے مجھے حکم دے چکا ہے اور میں (بے شک ان امور کے) تسلیم کرنے والوں میں ہوں۔

لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً پورا فرما دیا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا واقعات سے ثابت ہو چکا۔ اور قدر وشناسان قدرت نے بھی **وابراھیم الذی وفی** کے الفاظ مصدقانہ نازل فرما کر آپ کے محاسن خدمات کے ایجاب واعتراف کا اظہار کر دیا۔

سب سے پہلے دین ابراہیم علیہ السلام اسلام کے نام سے موسوم ہوا ہے۔

اسلام کی قدامت اور اصلیت قرآن مجید کی اس عبارت سے ظاہر ہوتی ہے۔

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ (الحج)

تمہارے باپ ابراہیمؑ کا مذہب۔ اسی نے تمہارا نام پہلے سے مسلمان رکھا ہے۔

یہ آیہ بتلا رہی ہے کہ اسلام پر منحصر تمام مذاہب جو رسالت ابراہیمی کے بعد دیگر کتب سماویہ کے ذرائع سے نازل فرمائے گئے۔ وہ سب ملتِ ابراہیمی کے متبع سمجھے جائیں اور دائرہ اسلام میں آنے اور مسلمان کہلانے کے مستحق کہلائیں گے۔ پھر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کی خصوصیت کیسی؟

اصلیت کے اعتبار سے تو یہود۔ نصاریٰ اور مسلم سب کے سب ملت ابراہیمی کی شاخیں اور متبع قومیں کہی جائیں گی مگر اتباع و عقیدت اور عملی اطاعت ومطابقت کے اصول پر جب ان امم مختلفہ کے مراسم عبادات اور اخلاق۔ تمدنی اور قومی مرسومات ودستورات پر نظر ڈالی جائے گی اور تحقیق سے کام لیا جائے گا۔ تو ان تمام مختلف فرقوں میں سوائے ایک اسلام کے پھر کوئی دوسرا فرقہ نہیں پایا جائے گا۔ جس کے مذہبی قومی۔ تمدنی اور اخلاقی طریقوں میں شریعت ابراہیمی کا کوئی جز و یا شعبہ پایا جاتا ہو۔

اسلام کو ملت ابراہیمی کے ساتھ جو خصوصیت ہے وہ اس بنا پر ہے کہ شریعت اسلامی میں اس وقت تک۔ شریعت ابراہیمی کے احکام ان کے عملیات واجبات ومستحبات میں داخل ہیں اور ان کو آج تک ہر مسلمان اسی عظمت وتقدیس اور احترام واکرام کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ جس طرح خلیل اللہ نے تعلیم فرمائے تھے۔ جیسے تحریم کعبہ۔ مناسکات حج۔ ختنہ۔ وضوء حجامت۔ غسل۔ جنابت۔ عقد نکاح وغیرہ وغیرہ۔ شریعت ابراہیمیؑ اور دین حنیف خلیل الٰہی کے متلاشی دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی کو اور تنہا اسلام ہی کو ایک ایسا مذہب پائیں گے جس میں شریعت ابراہیمی کے آثار واحکام اب تک قائم ہیں اور وہی اس کی اتباع کا تنہا دعویٰ کر سکتا ہے۔

شمس العلماء مولوی شبلی صاحب کے غلط تسمیہ اسلام کی تصحیح وترمیم

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب۔ اس کی توجیہہ میں کہ شریعت محمدی کا نام اسلام اور اس کے متبعین کا نام مسلمان کیوں مشہور ہوا۔ رقمطراز ہیں۔

> حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم ورضا ہے۔ یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بلا عذر گردنیں جھکا دیں۔ یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم رکھا۔ (سیرۃ النبی ج1 ص106)

یہ آپ کی ذہانت کا ایک نکتہ ہے اور جودت طبع کا نمونہ ہے۔ مولوی شبلی نے بہت مابعد کے واقعہ سے اس کی وجہ تسمیہ قائم کی ہے اور یہ آیہ ذبح میں الفاظ فلما اسلما کو اس کا اصل ماخذ ومرجع بتلایا ہے۔ جو حیات ابراہیمی کا آخر واقعہ ہے۔ یہ شمس العلماء صاحب کی کوتاہ نظری ہے۔ اگر قرآن مجید میں اس مسئلہ کی تحقیق میں دیگر آیات واقعات پر محققانہ طریقہ سے غور فرمایا گیا ہوتا تو شمس العلماء صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ اس واقعہ سے بہت پہلے۔ حضرت ابراہیمؑ کے صبر ورضا کا کارنامہ دارالنظام قدرت میں پیش ہو کر قبولیت واجابت الٰہی کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ قرآن مجید کے سورۂ بقرہ کی مفصلہ ذیل آیت سے اس کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ (البقرۃ)

جب اس (ابراہیم) سے خدا نے کہا کہ ہماری فرمانبرداری کرو تو اس نے کہا کہ میں پروردگار دو عالم کا فرمانبردار ہوا۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ معرفت اور تصدیق الٰہی جس طریقہ اور جن الفاظ سے حضرت ابراہیمؑ نے کی اسی کا نام اسی وقت سے اسلام رکھا گیا۔ خدائے سبحانہ تعالیٰ نے اپنی معرفت وتصدیق کا حکم بھی ابراہیمؑ کو اسی لفظ کے ساتھ دیا اور ابراہیمؑ نے اس کی تعمیل بھی انہیں الفاظ میں کی۔ پھر ایسی نص صریح کی موجودگی میں اسلام کا مبتدا اسی آیہ کو ضرور قرار دیں گے۔ اور سورۂ حج کے یہ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ (الحج) (تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا) کو اس مبتدا کی خبر ٹھہرائیں گے۔ جس سے مدعا حقیقت پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے کہ اول میں اسلام کی اولیت قدامت اور ابتدا۔ اس کی وجہ وسبب کے ساتھ بتلائی گئی ہے۔۔ پھر آیہ دوم میں مسلمانوں کو کہ بمقابلہ دیگر مذاہب کے۔ چونکہ پیروان شریعت محمدیہ کو طریقہ ابراہیمی کی صحیح اور حقیقی اتباع کا شرف حاصل ہے۔ اس بنا پر ان کی شریعت اور ان کا نام بھی وہی رکھا گیا جو پہلے سے ان کے مورثِ اعلیٰ کے طریقہ کا نام رکھا گیا تھا۔

اسلام کی حقیقت تو اتنی قدیم ثابت ہوتی ہے مگر شمس العلما صاحب اسلام ابراہیمی میں تاخیر کا نقص پیدا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ

آپ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی تجویز سے اپنی شریعت کا نام اسلام رکھا اور اپنے پیروانِ ملت کا نام مسلم مگر قرآن مجید کی بشارت خبر دیتی ہے کہ خداے سبحانہٗ تعالیٰ نے اس مبارک نام سے آپ کو اور آپ کے پیروانِ ومتبعان ملت کو یاد ومخاطب فرمایا ہے ذیل کی آیہ اس کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ (آل عمران۔67)

ابراہیم (حقیقتاً) نہ یہود تھے اور نہ نصاریٰ۔ بلکہ وہ تو خالص مسلمان تھے۔

مندرجہ بالا نصوص قرآنیہ کی رو سے مولانا شبلی صاحب کے یہ دونوں قیاس اور تجاویز:

(۱) کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے الفاظ اسلمنا کہنے کے باعث سے۔

اور پھر (۲) شعار تسلیم ورضا پر قائم و مستقل رہنے کی وجہ سے۔ ابراہیمؑ کے پیرو اور متبع مسلم کہلائے۔

بے اصل ثابت ہوئے۔ اور ثابت ہو گیا کہ حقیقت میں خداوند عالم نے سب سے پہلے آپ کو مسلم اور آپ کے متعبین کو مسلمین کے مبارک نام سے موسوم کیا۔

شریعت اسلامی میں ملت ابراہیمی علیہ السلام کے مراسم اس وقت تک محفوظ وموجود ہیں۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو باوجود اس کے کہ سب سے آخر میں آیا۔ لیکن اس کے تمام مذہبی، اخلاقی، قومی اور تمدنی احکام میں ابھی تک شریعت خلیل اللہ ہی کی اتباع اسی خلوص عقیدت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اس کے انجام دہی اور تعمیل کے اصول تعلیم فرما گئے اور اس کے نصاب بتلا گئے تھے علاوہ وہ واجبات حج اور ادائے قربانی کو جواب صرف اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ومحدود رہ گئی ہے۔ ہم ذیل میں آپ کے احکام اور اسلام کے فرمان نقل کرتے ہیں۔ جو شریعت اسلامی میں اس وقت تک اگر واجبات کا حکم نہیں رکھتے تو استحباب کی اہمیت تو ضرور رکھتے ہیں۔

حجامت بنوانا (۲) مونچھوں کے لب کٹوانا (۳) منہ دھونے کے وقت مسواک کرنا (۴) کھانے کے بعد دانتوں میں خلال کرنا۔ (۵) زیر بغل اور زیر ناف کے بالوں کو مونڈنا۔ (۶) ختنہ کرنا۔ (۷) ناخن ترشوانا اور (۸) غسل جنابت کرنا۔ آج تک اسلام کے مستحبات اور عملیات یومیہ میں داخل ہیں۔ اور آخر طہارت کا حکم (غسل جنابت) تو وجوب کی اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ جس کے بغیر کوئی مسلمان نماز ہی نہیں پڑھ سکتا۔

ان مرقومہ بالا احکام ابراہیمی میں باستثنائے چند۔ ایسے احکام ہیں کہ صرف اہل اسلام ہی ان پر عمل پیرا نہیں ہیں بلکہ دنیا کی تمام قوم وملت کے لوگ۔ اگر اہل اسلام کی طرح مذہبی نقطۂ خیال سے نہیں تو اخلاق۔ تہذیب اور حفظان صحت کے لحاظ سے ان کو ضروری سمجھ کر ان پر عامل ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ تمدن اخلاق اور تہذیب انسانی کے اوّل موجد اور معلم تھے

حضرت ابراہیم علیہ السلام دین حنیف اور شریعت اسلامی ہی کے صرف موجد اور معلم نہیں ثابت ہوتے ہیں۔ بلکہ تاریخوں سے طبقہ انسانی میں تمدن اخلاق اور تہذیب کے ابتدائی اصول قائم کرنے والے اور ان کے طریقے بتلانے والے بھی آپ ہی پائے جاتے ہیں۔ مراسم اخلاق اور آئین معاشرت سب سے پہلے آپ ہی نے جاری فرمائے۔ اور تمام دنیا کی قوموں میں۔ مہمانی۔ ضیافت اور آئین معاشرت سب سے پہلے آپ ہی نے جاری فرمائے۔ اور تمام دنیا کی قوموں میں مہمانی۔ ضیافت ذوی القربی ہمسایہ اور دیگر مستحقین کی دعوت کے نیکوترین اور فیاضانہ مراسم کی آپ سے ہی ایجاد ہوئی اکرام ضیف اور ضیافت کے احکام وآداب آپ ہی نے بتلائے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے۔ اپنے مال سے زکوۃ کی رقم نکالی۔ اور خدا، خدا کے رسول اور رسول کے ذوی القربی کے حقوق۔ ہمسایہ۔ فقرا اور مساکین کے استحقاق اور ان کے مراتب نصاب قائم فرمائے۔

سب سے پہلے راہ خدا میں ہجرت اختیار فرمائی۔ قوم عملیق مصر سے جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ اور ترتیب فوج وتعین منصب لِوَا (لوا عربی کا لفظ ہے، فوج یا کسی بھی ادارے کے سربراہ کو کہتے ہیں برگیڈیئر بھی آپ ہی کے اولیات میں داخل ہے)۔ لباس میں پیراہن اور تہ بند کی ایجاد بھی آپ ہی سے ہوئی اور عبادت الٰہی کی حالت میں ستر پوشی کے آداب نہایت شدت سے واجب قرار ہوئے۔ توحید خالص کی تعلیم آپ ہی سے شروع ہوئی اور اخیر میں انسانی بدعنوانیوں سے ایسی خراب وبرباد ہوگئی کہ آخر اسلام اسی نام اور انھیں احکام کے ساتھ توحید خالص کی تجدید واحیا کے لئے نازل فرمایا گیا۔ جس سے ملت ابراہیمی کی تصدیق وتوثیق قرآن مجید کی اس آیہ سے کامل طور پر ہوتی ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ (البقرۃ)

اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقہ سے انحراف کرے مگر وہی جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اور بے شک ہم نے ان کو دنیا میں بھی انتخاب کرلیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکار بندوں کے زمرے میں ہوں گے۔

عہد ابراہیمی علیہ السّلام میں عرب کا بے نظیر تمدن

ان تمام احکام پر غور وفکر کی نظر ڈالنے سے ہر شخص کو با آسانی معلوم ہوجائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وقت میں تنہا دین الٰہی ہی کی تعلیم نہیں فرمائی بلکہ اقطاع عالم کے مختلف قوم وقبائل میں اخلاق۔ تہذیب اور معاشرت کے اصول قائم کیے اور آداب و طریقے بتلائے۔ عہد ابراہیمی کے تاریخی حالات اخبار وآثار عرب سے جہاں تک معلوم ہوئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت اہل عرب تمدن کے اعتبار سے دوسری قوموں سے کہیں آگے بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ عرب کی تاریخ میں ان کی ترقی اور فروغ تمدن کا زمانہ خاندان سبا اور سلاطین حمیر کے عہد میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور تاریخ عالم کے مطالعہ سے سلسلۂ آل سبا اور بنوحمیر کا زمانہ عہد ابراہیم سے قریب اور متصل پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مرحوم سرسید نے ان دونوں سلسلوں کے معاصرین کی مطابقت اور اس کی تفصیل پوری وضاحت کے ساتھ خطبات احمدیہ میں کی ہے۔ جس کی نقل ذیل میں مندرج کی جاتی ہے۔

> جرہم کے بعد اس کا بیٹا یشحب ابن یعرب تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالشّمس ملقب بہ سباء اکبر تخت نشین ہوا۔ یہی شہزادہ سلطنت سباء کا بانی ہوا۔ اور اسی نے شہر سبا اور مآرب بسائے اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔
> اب چونکہ حمیر یقطان سے چوتھی پشت میں تھا۔ اور ترح (تارخ۔ پدرابراہیم) بھی قانع سے چوتھی پشت میں تھے۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ حمیر کی اولاد ترح کی پیدائش سے زیادہ دور نہیں ہوگی۔ یعنی 1888 دنیوی یا 2126 ق م میں اس کی ولادت ہوئی ہوگی۔ ترح کے تین بیٹے تھے۔ (ناحور، لور اور ہاران (پدرلوط) اور حمیر کے بھی تین بیٹے تھے۔ وائل۔ عوف اور مالک اس لئے ترح اور حمیر کی اولاد کو ہم عصر ماننا چاہیے۔ یعنی کہ وہ 1918 دنیوی یا 2056 ق م میں تھے۔ وائل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔ اب اول اس مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً قرار دی گئی ہے، لحاظ کرکے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط پسر ہاران پر غور کرکے سکسک اور فاران کی ولادت کی تاریخ قرار دینی چاہیے جو 1878 دنیوی یا 2126 ق م یا تیس برس قبل ولادت حضرت ابراہیمؑ قرار پائی ہے۔ خطبات مطبوعہ لاہور ص 71

اس مقام پر یہ بتلا دینا بھی نہایت ضروری ہے کہ یہی فاران ابن عوف وہ شخص ہے جو یمن سے علاقہ حجاز میں آیا اور اس کے گردونواح میں آباد ہوکر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور جبل فاران اور بیابان فاران جو قدیم آسمانی کتابوں میں مرقوم ہیں اور جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ الطاہرین کی بشارت نبوت اور تبلیغ رسالت کے خاص مقامات بتلائے گئے ہیں۔ وہ اسی شخص خاص کی طرف منسوب ہیں اور اسی کے نام سے موسوم ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوگیا کہ بنی حمیر کی سلطنت اور جناب ابراہیمؑ کی تبلیغ رسالت کا زمانہ بالکل قریب تھا بلکہ دونوں کو ایک ہی

کہنا چاہیے۔ بنی حمیر عہد سلطنت میں عرب کی تمدنی حالت دنیا کے اور ملکوں سے بڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا مسلمہ ہے جس کا کسی تاریخ کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر عرب میں رسالت ابراہیمی کی تبلیغ کے وقت عموماً اور عرب کے علاقہ یمن میں اس وقت خصوصاً۔ ملک کی تمدنی حالت پوری ترقی پر تھی۔ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل نقل کی جاتی ہے۔

تہذیب وتمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ مانسو مرنساوی نے اصول عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوجِ کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ کیونکہ اصول ارتقا کی رو سے کوئی قوم۔ محض و حشت کی حالت سے دفعتاً اعلیٰ درجہ کی تہذیب وتمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے۔ تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے۔ مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے۔ یورپ کے محققین آثار قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثا قدیمہ کی تحقیقات کی ہے اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے وہ یمن کی قدیم تہذیب وتمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔ (یمن کے شہر۔ قلعوں اور دیگر آثار تمدن و امارت کا ذکر ہے۔ جن کو ہم تفصیل سے اس کتاب میں اوپر لکھ آئے ہیں)۔

ان تفاصیل کے بعد تحریر ہے۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب وتمدن کی یہ حالت نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے۔ ان کے لئے عربی زبان میں خاص الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں۔ سکہ کے لئے ایک لفظ بھی نہیں درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہوگیا۔ چراغ ایک معمولی چیز ہے۔ تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا۔ چراغ کو سراج کرلیا۔ پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا۔ مصباح۔ یعنی ایک آلہ جس سے صبح بنالی جاتی ہے۔ کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ کوزہ کو کوز کرلیا۔ لوٹے کو ابریق کہتے ہیں۔ جو آبریز کا معرب ہے۔ تست فارسی لفظ تھا۔ اسی کو عربی میں طست کرلیا ہے۔ پیالہ کو کاس کہتے ہیں۔ یہ وہی کاسہ فارسی لفظ ہے کرُتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں۔ یہ بھی فارسی ہے۔ پاجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جب ایسی چھوٹی چھوٹی اشیاء کے لئے لفظ نہ

تھے۔ تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی۔ آس پاس کے ممالک کے تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی۔ اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے۔ ان ہی اصلی حالت پر تھے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ تک عیش وعشرت کے سامان بہت کم تھے۔ مسئلہ حجاب کی شان نزول میں بخاری وغیرہ میں منقول ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرورت نہ تھی مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس تک چھلنیاں نہ تھیں۔ بھوسی کو پھونک کر اڑاتے تھے۔ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہ جلتے تھے۔ ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلعم کی صحبت میں تھا۔ لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض کا حرام ہونا نہیں سنا۔ اگر چہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ نہیں لازم آتا کہ واقع میں آنحضرت صلعم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں ہے کہ عرب کھنکھجورا۔ گوئے۔ گرگٹ۔ سیہی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔ سیرۃ النبی جلد اول از ص85 تا ص86۔

ملکی زبان میں الفاظ خاص کی کمی ملک وقوم میں عدم تمدن کی دلیل نہیں ہوسکتی۔

مولانا شبلی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت سے ثابت ہو گیا کہ یمن اور دیگر اقطاع عرب جو حدود شام وایران سے قریب واقع ہیں۔ تہذیب وتمدن میں پورا کمال حاصل کر چکے تھے۔ اور باعتبار زمانہ کے ان کی تہذیب وکمال کے ایام۔ عہد ابراہیمی سے بالکل ملے ہوئے تھے۔ جیسا کہ تاریخی اسناد سے اوپر لکھ آئے ہیں۔ مولانا شبلی صاحب کی اس معترفانہ تحریر سے کہ ”عرب کے وہ مقامات بھی جو ایران وشام سے متصل تھے تہذیب و تمدن سے خالی نہیں تھے۔“ میرے مدعا کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جناب ابراہیمؑ کی سکونت کا صدر مقام زیادہ تر ملک شام اور علاقہ فلسطین پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر ہمارا یہ دعویٰ کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں۔ کم سے کم عرب کے ان حصوں

میں جو علاقہ شام سے قریب تھے۔ تمدن اور تہذیب ترقی پر تھی۔ جو ملک وقوم کے اخبار و آثار کے علاوہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے احکام وارشاد سے بھی ہویدا وآشکار ہے۔

باقی رہا شبلی صاحب کا عرب کے قدیم تمدن وتہذیب کو خاص مقامات تک محدود کر دینا۔ اور چند الفاظ خاص نہ ہونے کی وجہ سے عربی زبان کی تنگی اور کوتاہی کو تمام عرب کے غیر متمدن قوم ہونے کا باعث بتلانا۔ جیسا کہ وہ اپنی اس بحث کے نتیجہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے۔ ہمارے نزدیک ذرا بھی قابل توجہ نہیں۔

شبلی صاحب کا یہ قیاس ان کی تاریخی واقفیت کی کمی پر مبنی ہے۔ دنیا کے تمدن۔ تہذیب اور ترقی کی تاریخیں بتلا رہی ہیں کہ اقطاع عالم میں تہذیب وتمدن کی ابتدا پہلے ایک خاص مقام سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ملک وقوم کے ہر حصہ اور طبقہ میں پھیل جاتی ہے۔ اس بنا پر یہ صحیح ہوسکتا ہے کہ شام وایران سے ملے ہوئے عرب کے حصہ۔ یا یمن اور اس کے حوالی ومضافات جس طرح اس زمانہ میں اپنی تہذیب وتمدن میں مشہور تھے۔ ویسے عرب کے اور حصے نہیں۔ مگر یہ حصے بھی مسلم ہے کہ انھیں متمدن اور مہذب علاقوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔ جس کا باعث آمدورفت اور کاروبار کے باہمانہ تعلقات ثابت ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ایک حد تک ان میں بھی تہذیب وتمدن ضرور موجود تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بھی۔ فرزندان اسماعیلؑ کے وقت میں فتوحات و ملک داری کے ابواب کھل گئے۔ اور مضاض وقیدار ابنائے اسمٰعیلؑ کی نموداریوں نے تمام عرب میں سلسلہ ابراہیمی اور نسل اسماعیل کی تہذیب وتمدن کے کمال کا ڈنکا بجادیا۔ جیسا کہ بہت جلد ہمارے آیندہ سلسلہ بیان سے ظاہر ہوگا۔ اس بنا پر شبلی صاحب کی اس تجویز وقیاس سے کہ عرب میں چند مقامات کے علاوہ کہیں اور تمدن وتہذیب کا نام ہی نہیں تھا۔ تاریخی ملکی وقومی سے ان کی بے خبری اور عدم واقفیت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کا قیاس کہ زبان عرب میں چند الفاظ خاص نہیں اس لئے ان کے ملک میں نہ تمدن تھا نہ تہذیب۔ دوراز قیاس سمجھا جائے گا۔

اگر تھوڑی دیر تک شبلی صاحب کے اس قیاس اور حسن ظن کو ہم مان بھی لیں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ الفاظ عرب کے ان مقامات میں بھی تو مستعمل نہیں تھے۔ جہاں آپ کے اقرار واعتراف کے مطابق تہذیب وتمدن پورے کمال تک پہنچا ہوا تھا۔ یعنی قریب شام وایران رہنے والے عرب بھی تو چراغ کو سراج وغیرہ بولتے تھے۔ تو اس بنا پر آپ کو ان کے تمدن وتہذیب سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس عبارت تصدیقی نے کہ ''جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے۔ تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے۔'' آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا کہ الفاظ تمدن رکھنے پر کسی ملک وقوم کے حصول تمدن کے اصول قائم ہوتے ہیں۔ اور جب یہی اصول آپ کے لئے مسلمہ ہیں۔ تو دور دور والے عربوں کو تو ابھی دور رکھئے۔ آپ کے تسلیم کردہ متمدن عرب شام ویمن بھی اس اصول سے بالکل غیر مہذب اور غیر متمدن ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی چراغ کو سراج۔ کاسہ کو کاسہ۔ شلوار کو سروال وغیرامثالہا کہتے تھے۔ اور اگر آپ کی تحقیق میں ان کی زبان میں ان کے لئے دوسرے الفاظ تھے تو تاریخ ولغت کی کتابوں سے حوالہ دیجئے۔

علامہ فیروز آبادی کی قاموس اللغات۔ عربی کی تمام کتب لغت میں نہایت مشہور ومعروف ہے۔ اس کے صفحہ 339 (مطبوعہ کلکتہ)

میں لکھا ہے۔ السراج آ (معروف) والشّمس وعلم۔ اس کے لغوی معنی آفتاب کے ہوئے۔ لفظ معروف ہے۔ اور اسم علم ہے۔ شمس العلماء صاحب اب خود بتلائیں کہ آپ کا یہ قیاس کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔ عربی لغت سے تو اس کے اصل زبان کا لفظ معروف ہے (جس کو ہر شخص بلا تامل وتکلف جانتا ہے) اور اصول قواعد کے رو سے اسم علم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر آپ خوامخواہ اسے فارسی کے لفظ چراغ کا معرب بتلاتے ہیں۔ شاید قاموس میں لفظ سراج کے آگے م لکھا ہوا کہ دیکھ کر تو اس کے معرب ہونے کا وہم آپ کو پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے قاموس کا مقدمہ پڑھا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ حرف (م) معروف کی علامت قرار دی گئی ہے یا لفظ معرب کی۔ فاضل فیروز آبادی مقدمہ قاموس صفحہ 4 میں (مطبوعہ کلکتہ) ان علامات حرفیہ کی تفصیل وتوضیح کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

وما سوی ذلك فاقیدہ بصرلح الکلام غیر مقتنع بنو شیح القلام مکنفیا بکتابه ع دۃ ج م عن قولی موضع وبلدۃ وقریة والجمع ومعروف فتلخض

اس کے ماسوائے میں نے تصریح کلام کو پیش نظر رکھ کر قلمی تحریر کی ضرورت پر قناعت کر کے اپنے اقوال میں حروف ع۔ د۔ ۃ۔ ج اور میم کی صرف اشارہ وکتابت پر کفایت کی ہے (اس لئے ع سے) موضع (د سے) بلدہ (ۃ سے) قریہ (ج سے) جمع اور (میم سے) معروف میرے اقوال میں مراد ملخصہ ہے''

افسوس ہے کہ شمس العلماء جیسا مشہور عالم اور محقق ایسے لفظ معروف کی حقیقت سے بھی واقف نہ ہو۔ اور ادب ولغت کی کتابوں کے خلاف اپنے وہم وقیاس سے کام لے۔

ہم کہتے ہیں کہ الفاظ کی کمی وزیادتی کو کسی ملک وقوم میں تمدن وتہذیب کے ہونے یا نہ ہونے سے واسطہ نہیں ہے۔ لٹریچر اور کمال زباندانی کی تاریخ اور تمام اخبار وآثار ادبیات بتلا رہے ہیں کہ زبان کی ترقی۔ درستی وسعت اور ترکیب کے مختلف ذریعے ہوتے ہیں۔ انہیں ذریعوں میں سے کسی زبان خاص کا غلبہ واستیلاء پا جانا بھی ایک بہت بڑا قوی سبب ہوتا ہے اور یہی وجہ اس غالب زبان کو۔ مغلوب زبانوں میں داخل ہوجانے کی بھی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ۔ دو مختلف ملک وقوم کے ساتھ تعلقات۔ کاروبار اور سلسلہ آمدورفت بھی اس کا باعث ہوتا ہے۔ ان تمام ذریعوں کو تاریخی واقعات کے علاوہ روزمرہ کے مشاہدات بھی ثابت کر رہے ہیں۔ مثال کے لئے دیکھا جائے ممالک مشرقیہ میں زبان سنسکرت تمام زبانوں پر غالب تھی۔ اس کے بولنے والے (ایرین) دور دراز ملکوں میں اپنی فتوحات۔ کاروبار اور آمدورفت کے مختلف ذرائع رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ زبان قریب قریب تمام اقطاع عالم کی زبانوں میں مل جل گئی تھی۔ یہاں تک یورپین زبانوں میں بھی خلط ملط ہوگئی۔ اور ایسی کہ آج تک لاٹن۔ گریک اور جرمن زبانوں میں اس کے صدہا الفاظ زبان زد خاص وعام ہیں اور اپنی مادی۔ غیر مادی۔ اصلی اور مصنوعی ترکیبوں اور تلفظ کی مختلف صورتوں میں بولے جاتے ہیں اور جن کے لئے آج تک علمائے یورپ نے اپنی زبان میں مترادف الفاظ موضوع نہیں کئے ہیں۔ تو کیا اس باعث سے ان کی مشہور ومعروف تہذیب وتمدن سے بھی انکار کر دیا جائے گا۔

اسی طرح آج کل یورپین زبانیں تمام دنیا کی زبانوں میں داخل ہیں اور قریب قریب دنیا کے تمام ملکوں میں بولی جاتی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ اول تو یورپ والوں کو فی زمانناً بمقابلہ دیگر ممالک و اقوام کے ملک داری میں غلبہ حاصل ہے دوم ان کو دنیا کی تمام قوم و ملک کے ساتھ کاروبار اور آمدورفت کے ذریعہ سے پورا تعلق حاصل ہے۔ یہی دو اصلی اور قوی ذریعہ ہیں۔ جن کے سبب سے یورپین زبانیں دوسری زبانوں میں مل جل گئی ہیں۔ اس وجہ سے دوسری زبانوں کی تنگی اور نا قابلیت کے معنی لگانا بالکل مہمل ہے۔

پھر زبان عربی پر خاص کر مولانا شبلی کا یہ الزام لگانا تو اور بھی لغو ہے۔ جو اپنی کتاب کے آغاز میں تسمیہ عرب کے متعلق زان عرب کی خوبیوں کو تسلیم فرما چکے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے۔ مولوی صاحب کے کمی الفاظ والے استدلال قیاسی کو مان بھی لیں تو پھر ہم عرض کریں گے کہ زمانہ موجود میں تو فی الحال عرب اور اہل عرب کی تہذیب۔ ان کا تمدن۔ قدیم زمانہ سے کہیں زیادہ ہے اور فروغ یافتہ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ٹیلی گراف۔ پوستہ اور کالسکہ وغیرہ وغیرہ۔ غیر زبانوں کے الفاظ کے لئے آج تک اپنی زبان کے خاص الفاظ نہ پیدا کئے گئے۔ بلکہ بتلیغراف۔ البوسیۃ۔ اور الکاسکہ۔ محض تھوڑے سے تغیر کے ساتھ۔ ویسے ہی الفاظ قائم رکھے گئے۔ دو ہزار برس پہلے عرب میں تہذیب و تمدن نہیں تھا۔ الفاظ کی بھی کمی تھی۔ اب تو خدا کے فضل سے کسی کی بھی کمی نہیں۔ پھر الفاظ کی کمی کیوں ہے۔ کیا مولوی صاحب سلطان حسین کے شاہ حجاز تسلیم کر لئے جانے کے واقعات کے بعد بھی عرب اور اہل عرب کو غیر مہذب اور غیر متدین قوم کہنے کی جرأت کریں گے۔

عرب سے قطع نظر فرما کر ترکی کی طرف جو فی الحال اسلامی دار المعارف قیاس کیا جاتا ہے۔ توجہ کی جائے۔ تو عرب سے زیادہ یہاں کی ملکی زبان میں یورپ کی مختلف زبانیں۔ جرمنی۔ فرنچ۔ انگریزی۔ یونانی بلقانی اور رومانی مخلوط پائی جائیں گی۔ اس کے ثبوت کے لئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ شبلی صاحب نے اپنی کتاب کے آخر میں جو ملک عرب کا نقشہ لکھ کر لگایا ہے۔ وہ حکومت عثمانیہ کے دفتر نظامیہ سے۔ غالباً سفر قسطنطنیہ کے دوران میں مولف کو ملا ہے۔ اس میں تمام مقامات کے ناموں کے وہی تلفظ ہیں۔ جو یورپین زبانوں سے ان کے لئے نکلے ہیں۔ بلکہ اکثر مقامات کے قدیم نام جو سابق میں مشہور تھے۔ ان کی جگہ بھی اب وہی نام جو یورپ والوں نے رکھ لئے ہیں مندرج کیے گئے ہیں۔

ترکی سے ایران میں آیئے۔ تو ہماں آتش درکاس۔ اللہ اللہ کبھی اس کے عروج و اقتدار کا وہ زمانہ تھا کہ عراق۔ ماوراء النہر۔ اور وسط ایشیا سے لے کر کابل و ہندوستان تک اور پھر ہندوستان سے لے کر جزائر بحر ہند۔ جاوا اور بخارا تک فارسی ہی فارسی تھی اور آج اس کے زوال و ادبار کی یہ عبرتناک صورت ہو رہی ہے کہ دیگر ممالک کا کیا ذکر۔ خاص ایران اور تمام علاقہ فارس کی زبان میں۔ نصف سے زائد۔ ترکی اور روسی الفاظ داخل ہو گئے ہیں۔ کیا شبلی صاحب۔ ترکی اور ایران میں غیر زبانوں کے مخلوط ہو جانے کو اب بھی ان کے تمدن اور تہذیب کی کمی پر محول فرمائیں گے۔ شبلی صاحب۔ یہ ان زبانوں کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی کوتہ فہمی۔

کعبہ معظّمہ بالتحقیق بیت العتیق ہے

اسلام کی کوئی ادا نہ یہودیوں کو پسند ہے نہ عیسائیوں کو یہودیوں کو تو ان کی کمزوری اور زمانہ کی پامالی گلوگیر ہو رہی ہے۔ مگر عیسائیوں کا عروج ہے لہذا وہ کیوں چپ رہیں۔ قرآن مجید نے کعبہ کو بیت العتیق بتلایا ہے۔ دونوں اعتبار سے کہ اس میں جس نے پناہ لی وہ مامون و

محفوظ ہوگیا اور نیز اس وجہ سے کہ خدا کا سب سے پہلا گھر دنیا میں یہی بنایا گیا۔ اول بیت وضع للناس ببکۃ مبارکۃ۔ پہلا گھر جو بندوں کی عبادات خدا کرنے کے لئے مکہ مبارکہ میں بنایا گیا۔

حالانکہ نزول قرآن سے پہلے کی رومی اور یونانی تالیفات وتصنیفات اس کی قدامت کی تصدیق کر چکی ہیں اور ان کی تصدیقی عبارتوں کو ایک بار نہیں ہزار بار یہ حضرات براۃ العین مشاہدہ بھی فرما چکے ہیں۔ مگر تاہم اس مغویانہ اور متعصّبانہ کوششوں میں کہ اس کی قدامت کسی طرح بیت المقدس سے زیادہ قدیم نہ ثابت ہونے پائے۔ دو دو طرح کی بے اصل تاویلیں اور لغو دلیلیں پیش کیا کرتے ہیں۔ (صاحب ارض القرآن)۔

مسٹر ڈوزی۔ (MRDOZE) کے ایسے فاضل مستشرق اور محقق جو جرمن پروفیسرز میں جامع علوم وفنون مانا جاتا ہے۔ ایک عجیب و غریب اور مضحکہ انگیز رائے۔ جو اس نے کعبہ کے متعلق تحریر کی ہے۔ نقل فرما کر نہایت متانت اور سنجیدگی سے اس کی غلطی فہمی کی ترمیم وتصحیح فرماتے ہیں۔ اور ان کی عبارت حسب ذیل ہے۔

> مسٹر ڈوزی جو عربی کا بہت بڑا عالم جرمنی میں گذرا ہے۔ اس نے مکہ میں بنی اسرائیل کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ بنی اسرائیل شام سے بھاگ کر حجاز کے شہر میں آ کر آباد ہوگئے تھے اور کعبہ انھیں کا بنایا ہوا معبد ہے۔ جس کو انھوں نے ہبعل (بعل) دیوتا کے نام سے جس کو وہ اکثر گمراہی کے زمانہ میں پوجا کرتے تھے۔ تعمیر کیا تھا۔ عربوں میں اسی دیوتا کا نام ہبل مشہور تھا۔ اور جو محمدؐ کے زمانہ تک خانہ کعبہ میں نصب تھا۔
> (پروفیسر ڈوزی کی تاریخ مسلمانان اسپین کا مقدمہ۔ ترجمہ انگریزی)

صاحب ارض القرآن کی رائے۔

> پروفیسر موصوف کے اس نظریہ سے گو جرمنی کے اکثر یہودی علما میں برافروختگی پیدا ہوگئی ہے لیکن ہم مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس رائے میں صرف جزئی ترمیم چاہتے ہیں۔ مکہ میں بنی اسرائیل نہیں۔ بلکہ اسرائیل کے عم زاد بھائی بنی اسماعیلؑ آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس گھر کو اسرائیل نے نہیں بلکہ ان کے دادا ابراہیم نے تعمیر کیا تھا۔ وہ ہبل کے نام سے نہیں بلکہ خدائے عزوجل کے نام سے بنایا گیا تھا۔ ارض القرآن جلد دوم ص200

افسوس ہے کہ پروفیسر ڈوزی کے تبحر علمی کی یہ شہرت اور ان کی تاریخی واقفیت کی یہ حقیقت کہ آج تک پروفیسر صاحب کو مکہ اور مدینہ کا فرق وامتیاز بھی معلوم نہیں۔ عدم واقفیت کی یہ صورت ہے کہ پروفیسر صاحب اتنا نہیں جانتے کہ گریختگان بیت المقدس حملات بخت نصر سے عاجز آ کر یثرب (مدینہ میں) پناہ گزیں ہوئے تھے یا مکہ میں اقامت گزیں۔ نہیں معلوم کہ پروفیسر صاحب کی دنیا سے یہ نرالی ترکیب کی تحقیق کہ کعبہ انھیں کا بنایا ہوا معبد ہے۔ کس تاریخ سے ماخوذ ہے اگر سچے ہوتے تو پروفیسر صاحب اپنی تحقیق کی سند پیش

کرتے ۔مگر انھوں نے کوئی سند پیش نہیں کی اس لئے یہ ان کی ایک متعصّبانہ اور محض گمراہانہ تحریر ہے۔جس پر نہ کوئی توجہ کی جاسکتی ہے اور نہ اس کا کوئی اثر ہوسکتا ہے۔مسلمان تو بحمد اللہ اس سے کسی طرح متبنہ ہو ہی نہیں سکتے ۔ پروفیسر صاحب کے خلاف امید۔ یہودان جرمن بھی جیسا کہ صاحب ارض القرآن کا بیان ہے ان کی اس انوکھی تحقیق سے بے حد خفا ہوکر ان کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی دانست میں کی ان کی خیر خواہی۔مگر افسوس۔ وہ اُلٹ کر بدخواہی ثابت ہوگئی۔ پروفیسر صاحب سمجھ لیں کہ یہ جھوٹ بولنے کا نتیجہ ہے۔

ایسی ہی سر ولیم میور صاحب کو بھی الٹی سوجھی تھی۔ سر سید مرحوم نے ان کی بھی اصلاح کر دی۔خطبات احمدیہ کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مورخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔مسٹر گبن (Mr. Gibbon) جیسا کہ وہ نہایت مشہور مورخ ہے ویسا ہی نہایت بڑا عالم اور فلسفی ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے۔کعبہ کی صحیح قدامت سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے۔ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈروس (D I E D R A U I S) یونانی مورخ نے تھیمو بت (ثمود) اور سبین (ضیامین) کے بیان میں ایک مشہور و معروف معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام اہل عرب تعظیم کرتے تھے۔'' (قدامۃ الیہود)

اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں (یہ یونانی مورخ بہت قدیم ہے) کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے۔تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت ہی قدیم زمانہ (ابراہیم کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔

سر ولیم میور صاحب (SIRW. MUIR) اس پر ایک معترضانہ تقریر لکھتے ہیں کہ جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے۔اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی ابتدا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے ہے۔ کیونکر قیاس ہوسکتا ہے۔عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی۔ بلکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ سے بہت پہلے مکہ کی عام رائے تھی۔ ورنہ قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اس کا ذکر نہ ہوتا اور نہ بعض مقامات کے نام جو تمام کعبہ کے گردونواح میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے متعلق کئے جاتے جیسا کہ وہ متعلق کئے گئے ہیں۔ (میورس لائف آف محمدؐ)

مگر ہم (مولف خطبات احمدیہ) سمجھتے ہیں کہ سرولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے۔ جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے اس بات سے کہ مذہب اسلام سے بیشتر اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ کو اور ان تمام مراسم کو جو کعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیمؑ سے تعلق ہے۔ اس کی صحت اور اصلیت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنی جرہم اور عرب کی تمام مختلف قوموں نے اس کو ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے منسوب کیا تھا۔ عرب ایک بت پرست قوم تھی۔ اور ابراہیمؑ بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیمؑ یا اسماعیلؑ سے منسوب نہ کرتیں۔ باوجود اس مضائرت اور منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کر لینا کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کو ابراہیمؑ واسماعیلؑ سے تعلق ہے۔ علانیہ اس کی صحت واصلیت کی دلیل ہے نہ اس کے برخلاف۔ جیسا کہ سرولیم میور نے تصور کیا ہے۔ اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے بیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا۔ ہمارے لئے دلیل ہے نہ ہمارے مخالف کے لئے۔ خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور ص (807)

حضرت اسماعیلؑ ذبیح اللہؑ ابن حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ

جناب اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹھے صاحبزادے اور اولاد اکبر تھے۔ بڑی دعاؤں اور تمناؤں والے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ

ؑ کے ذکر میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ کہ ایک مدت مدید تک حضرت سارہ کے بطن سے آپ کی کوئی اولا نہیں ہوئی۔ اس محرومی سے دونوں بزرگوار از حد ملول رہتے تھے۔ اور اس نعمت کے حصول کے لئے ہمیشہ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا رہتے تھے چونکہ ظہور حکم قدرت اور صدور امور مشیت کے لئے خاص وقت مقرر ہوتے ہیں اس لئے ان حضرات کی اجابت دعا اور حصول تمنا میں تاخیر تھی۔ اسی عالم میں سارا کو حصول اولاد کی طرف سے ایسی مایوسی ہوگئی کہ آخر کار انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے کمال محبت والفات کے تقاضہ سے۔ جناب ہاجرہؑ کے ساتھ مزاوجت فرمانے کی اجازت دے دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارہ کی یہ اجازت۔ خلاف فطرت نسوانی۔ بہت بڑا ایثار تھی۔ اجازت دینے کے وقت سارہ کا ابراہیمؑ سے یہ کہنا شاید مجھ سے نہیں۔ انہیں (ہاجرہؑ) سے خدائے سبحانہ تعالیٰ تمہاری نسل کو جاری اور قائم فرمائے۔ اپنی طرف سے کمال مایوسی اور حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے ان کے مفرط درجہ کے اخلاص و محبت ثابت کرتا ہے۔

حضرت ہاجرہ شرف مزاوجت پر فائز ہوئیں اور حضرت اسماعیلؑ ان کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اسماعیلؑ کی وجہ تسمیہ

اسماعیلؑ کی وجہ تسمیہ کے متعلق عربی مورخین اور عموماً تمام مستشرقین یورپ متفق ہیں کہ اسماعیلؑ ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ تورات۔ سفر تکوین۔ آیت 17و18 میں ہے۔

> اسحاق علیہ السلام خدا کے وعدے اور عہد کا مظہر ہے اور اسماعیلؑ ابراہیمؑ کی دعا کا۔ یعنی باپ کی دعا سے پیدا ہوئے۔

اس بنا پر اسماعیلؑ نام ہوا۔ جو دو لفظوں سے مرکب ہے۔ سمع اور ایل سے۔ سمع کے معنی سننے کے ہیں۔ اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی ابراہیمؑ کی دعا خدا نے سن لی۔

اسمٰعیلؑ کے متعلق تورات کی متواتر بشارتیں

تورات کتاب اول از آیت 20 تا 25 میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظمت وتقدیس کی نسبت مفصلہ ذیل میں بشارتیں مندرج ہیں۔

> خدا نے ابراہیمؑ سے اسماعیلؑ کے بارے میں فرمایا میں نے تیری دعا سن لی۔ ہاں میں نے اسے برکت دی اور اسے بارآور کیا اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اس سے بارہ سردار (امام) پیدا ہوں گے اور میں اس کو ایک بڑی قوم کروں گا۔

مندرجہ بالا تورات کی عبارت والفاظ الہامی سے جناب اسماعیلؑ کی ولادت بشارت الٰہی کے متعلق ہونا۔ پورے طور سے ثابت ہو گیا۔ اور آپ کا پاکیزہ وجود۔ پاکیزہ خلقت کی عظمت اور قدر ومنزلت کما حقہ ظاہر ہو گئی۔ اور پھر ایسے صحیح اسناد اور قوی شہادت کے طریقے سے کہ عرب کے مورخین کا کوئی قول یا ان کی کوئی قومی روایت اس کے متعلق نہیں لکھی گئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ تورات کے مقدس

الفاظ وعبارت سے۔ ہم اسی سلسلہ میں تورات سے ایک دوسری بشارت بھی نقل کرتے ہیں۔ کتاب اول (تکوین) آیت 12۔ 13 و 20 میں ہے۔

ابراہیمؑ سے خدا نے کہا کہ تیری نظروں میں برا نہ معلوم ہو۔ اس لڑکے اور اس لونڈی کی وجہ سے۔ جو کچھ تجھے سارہ کہتی ہے۔ اس کی بات مان لے۔ کیونکہ اسحاق علیہ السلام سے تیری نسل کہلائے گی۔ اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی میں ایک قوم کروں گا کیونکہ وہ بھی تیری نسل ہے۔

اسحٰق علیہ السلام کی اسمٰعیلؑ پر ترجیح کا غلط مسئلہ

یہود تو یہود۔ عیسائی بھی ان کی دیکھا دیکھی اور کچھ اپنی حسد ونفسانیت اور مخالفت اسلام کے باعث سے بھی۔ ایسی صاف اور روشن بشارتوں کی موجودگی میں بھی کہتے ہیں کہ خدا نے اسماعیلؑ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد میں بارہ سردار ہوں گے چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا بارہ سرداروں کے تھے۔ پیدا ہوئے۔ اور جس برکت دینے کا وعدہ اسماعیلؑ سے کیا گیا تھا وہ دنیاوی برکت تھی۔ روحانی برکت مراد نہیں تھی۔ مگر یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں۔

ہر ایک منصف مزاج ان آیتوں کو پڑھ کر معلوم کرلے گا کہ ان میں جدا جدا تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اوّل یہ کہ میں نے اس کو برکت دی دوم یہ کہ میں نے اسے بارآور کیا اور بہت کچھ فضیلت دی۔ سوم یہ کہ میں اس کو بڑی قوم کروں گا۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ان آیتوں میں جدا جدا تین لفظوں اور فقروں کے ایک ہی معنی ہیں؟ یعنی اولاد کا زیادہ ہونا۔ اب مساوات کی حقیقت ملاحظہ ہو۔

حضرت اسحاق علیہ السلام جب بیر شبع پر پہنچتے ہیں تو خواب میں خدا ان سے فرماتا ہے۔

اے اسحاق علیہ السلام۔ میں تیرے باپ کا خدا ہوں۔ تو مت ڈر۔ میں تیرے ساتھ ہوں میں تجھے برکت دوں گا اور اپنے بندے ابراہیمؑ کے سبب سے تیری نسل کو بہت کروں گا۔
تورات۔ تکوین۔20۔24۔

جس مضمون کا وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا گیا اور جو لفظ برکت کا اسمٰعیلؑ کے وعدے میں استعمال کیا گیا۔ اسی مضمون کا وعدہ اسحاق علیہ السلام سے بھی کیا گیا اور وہی لفظ برکت کا اسحاق علیہ السلام کے وعدے میں بھی کہا گیا۔ پھر یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اسمٰعیلؑ سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ دنیاوی تھا اور اسحاق سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ روحانی تھا۔

اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ تورات میں ہے۔

جب ابراہیمؑ کنعان میں پہنچے تو خدا نے ان سے کہا کہ یہ زمین جو تو دیکھتا ہے میں تیری اولاد کو دوں گا (تکوین باب 12 آیت 7)

پھر جب حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ سے جدا ہوئے تو پھر خدا نے ابراہیمؑ سے کہا کہ:

اے ابراہیمؑ آنکھیں کھول اور چاروں طرف دیکھ کہ یہ زمین جو تو دیکھتا ہے تیری اولاد کو دوں گا اور تیری اولاد کو زمین کی ریت کی مانند کروں گا۔ جو کوئی ریت کو گن سکے تو تیری اولاد کو بھی گن سکے گا۔ (تکوین باب 15 آیت 5)

پھر خدا نے ایک بار ابراہیمؑ سے کہا:

خدا نے ابراہیمؑ سے پختہ وعدہ کیا کہ تیری اولاد اتنی ہوگی جتنے آسمان کے تارے۔ جن کو کوئی گن نہیں سکتا۔ (تکوین باب 13-14-15-20)

پھر خدا نے ابراہیمؑ سے ارشاد کیا:

خدا نے ابراہیمؑ سے وعدہ کیا کہ یہ زمین مصر کے دریا سے فرات کے دریا تک تیری اولاد کو دوں گا۔ (تکوین باب 15 ص 18)

جب ابراہیمؑ ننانوے برس کے ہوگئے۔ تو خدا نے ان سے کہا:

مجھ میں اور تجھ میں وعدہ ہوتا ہے کہ میں تجھ کو زیادہ سے زیادہ کروں گا۔ تو بہت سی قوموں کا باپ ہوگا تجھ سے قومیں پیدا ہوں گی۔ تجھ سے بادشاہ نکلیں گے۔ اور تیری اولاد سے بھی یہ ہمیشہ کا عہد ہوگا۔ اور کنعان کی زمین تو تجھے وراثت دائمی میں دوں گا۔ (تکوین باب 17 ایت 1-2-3-4-5-6-7-8)

یہ تو وہ وعدے تھے۔ جو خدا نے ابراہیمؑ سے کئے تھے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا نے اسحاقؑ علیہ السلام و یعقوبؑ سے کیا کیا وعدے کئے تھے۔

معراج یعقوبؑ کے ذکر میں تورات کا بیان ہے۔

جب یعقوبؑ بیرشبع سے حاران کی طرف روانہ ہوئے تو ایک مقام پر پتھر سرہانے رکھ کر سو گئے۔ خواب میں دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی آسمان تک لگی ہوئی ہے، اور خدا کے فرشتے اس پر چڑھتے اترتے ہیں۔ اس سیڑھی پر خدا نے کھڑے ہو کر کہا میں تیرے باپ ابراہیمؑ و اسحاق علیہ السلام کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو سوتا ہے تجھ کو اور تیری اولاد کو دیتا ہوں۔ تیری اولاد زمین کی ریت کے برابر ہوگی۔ اور چاروں طرف پھیلے گی۔ (تکوین باب 28۔ آیت 12-13-14)

زبور داؤدی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ سے جو وعدہ اور عہد کیا تھا وہی بعد میں بھی قائم رہا اور وہ صرف کنعان کی زمین دینے کا وعدہ تھا۔ چنانچہ زبور میں خدا کا کلام اس طرح لکھا ہے۔

جو عہد میں نے ابراہیم علیہ السلام سے کیا اور اسحاق علیہ السلام سے اس کی قسم کھائی اور یعقوبؑ کے ساتھ بمنزلہ قانون مقرر کیا اور اسرائیل سے عہد دائمی کیا اور کہا کہ زمین کنعان تجھے دیتا ہوں۔تا کہ تیری میراث کا حصہ ہو(زبور آیات 1۔5۔9۔10۔11)

اب دیکھنا چاہیے کہ اسی وعہد کا پورا کرنا خدا نے بتلایا تھا۔اس کی نسبت تورات میں لکھا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام موآب کے جنگل میں۔بنو پہاڑ پر چڑھے۔جو برجو کے سامنے ہے۔تو خدا نے موسیٰ علیہ السلام کہا کہ یہ وہ زمین ہے جس کی نسبت میں نے بقسیمہ ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری اولاد کو دوں گا پس یہ زمین میں تجھے آنکھوں سے دکھلا دیتا ہوں۔مگر تو وہاں نہیں جائے گا۔(کتاب پنجم باب 34۔4)

الغرض یہ تمام وعدے جو خدا نے ابراہیمؑ۔اسحاق علیہ السلام اور یعقوبؑ سے کئے تھے۔ہم نے منتخب کر کے ہر مصنف مزاج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دئے ہیں۔اب اس کے بعد ہم دو سوال کرتے ہیں۔

اول یہ کہ جو وعدے خدا نے ابراہیمؑ کی اولاد کے لئے کیے ہیں۔وہ وعدے اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کے حق میں کیوں نہیں سمجھے جائیں گے۔حالانکہ خود خدا نے بھی کہا ہے کہ اسماعیلؑ بھی ابراہیمؑ کی اولاد سے ہے۔جیسا کہ تکوین باب 11 ص 12 میں مذکور ہے۔اور بہت بڑی دلیل مشترک ہونے کی یہ ہے کہ بشارت کے تمام الفاظ عموماً اولاد کا لفظ خاص بتلاتے ہیں۔جس سے اسحاقؑ و اسماعیلؑ بدرجہ اولیٰ اور تمام اولاد ابراہیمی بمرتبہ اُخریٰ مشترک اور مشتمل سمجھی جائے گی۔ان بشارتوں سے خاص اولاد اسحاق بتلانے والوں کو لازم ہے کہ اپنی اس تخصیص کے لئے وہ مرقومہ بالا عبارات تورات میں پہلے خاص اسحاق یا آل اسحاق کا نام لکھا ہوا ثابت کریں۔بغیر اس کے وہ ہرگز تخصیص ثابت نہیں کر سکیں گے ہمیشہ اس سے تعمیم ہی مراد ہوگی جو عین مدعائے الہام ہے۔

دوم یہ کہ جو وعدہ خدا نے اسحاقؑ و یعقوبؑ سے کیا تھا۔یعنی ملک کنعان کا دینا اور اولاد کا زیادہ کرنا۔ان میں وہ کیا ایسی چیز ہے جس سے یہ روحانی قسم کا وعدہ سمجھا جاتا ہے۔اور جو وعدہ اسماعیلؑ کی نسبت کیا گیا ہے۔اس میں کس چیز کی کمی ہے۔جس سے وہ دنیاوی سمجھا جائے۔

جو لوگ انصاف سے ان باتوں پر نظر کرتے ہیں وہ یہ یقین جانتے ہیں کہ خدا نے اسحاق سے بھی برکت کا وعدہ کیا۔ان کی اولاد میں انبیا پیدا ہوئے۔ملک فتح کئے۔کنعان بھی فتح کیا۔اسی طرح اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بھی جیسا کہ خدا نے ان سے بھی برکت کا وعدہ کیا تھا۔پہلے شعیبؑ پھر ایوبؑ اور سب سے آخر پیغمبر آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیدا ہوئے تمام دنیا اس کی برکت سے بھر گئی۔اسماعیلؑ کی اولاد نے بھی ملک فتح کئے کنعان کو جو غیر خدا پرستوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔پھر فتح کیا اور پھر ابراہیمؑ ہی کی نسل میں اس ورثہ کو لے آئے۔اور جب تک خدا کی مرضی ہے وہ ابراہیمؑ کا ورثہ ان کے حصہ میں رہے گا۔اگرچہ بقائے اصلی صرف خدا ہی کی ذات کو ہے۔الا کل شی حلاہ اللہ زائل۔

یہ بحث ہم نے مرحوم ڈاکٹر سرسید کی خطبات احمدیہ سے نقل کی ہے۔سرسید کے اس نظریہ سے مجھے وہیں تک اتفاق ہے جہاں تک لائق مصنف نے حضرت اسحاق علیہ السلام واسماعیلؑ کی روحانی عظمت واقتدار اور ذاتی شرف وافتخار میں باہمی مساوات ثابت کی ہے اور مخالفین اسلام کی ان تاویلات مہملہ اور توہمات باطلہ کی تردید فرمائی ہے۔جو اپنے تعصب مذہبی اور نفسانیت ذاتی کی بنا پر خواہ مخواہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو جناب اسماعیلؑ پر ترجیح دیئے جانے کے لئے مٹے جاتے ہیں۔ہاں مجھے سید صاحب کے موجودہ نظریہ میں ان مطالب ومقاصد سے ہرگز اتفاق نہیں ہوسکتا۔جن کو انھوں نے اپنی تحقیق کی کمی۔محققین یورپ کی بے جا تقلید اور بےضرورت عقیدت کی وجہ سے تحریر فرماتے ہیں۔جن کی تنقید وتصحیح بہت جلد ہمارے سلسلہ بیان سے ظاہر ہوگی۔

مرحوم سید صاحب مخالفین اسلام کو اتنا بتلانا ضرور سہو فرما گئے ہیں کہ شواہد مرقومہ بالا کچھ احکام ربانی اور الہام یزدانی ہونے کا تنہا شرف نہیں رکھتے۔بلکہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک تاریخی واقعات میں داخل ہوگئے ہیں۔اور وہ اس طرح کہ فی الحال اولاد اسحاق علیہ السلام واسماعیلؑ سے کرہ زمین کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ خالی نہیں بتلایا جاسکتا۔اوران کی لاتعداد کثرت اولاد میں شمار کرکے کوئی یہ نہیں بتلاسکتا کہ اسحاق کی اولاد زیادہ ہے یا اسماعیلؑ کی۔تو پھر اسماعیلؑ کی اولاد اسحاق علیہ السلام کی اولاد کے مقابلہ میں کیسے کم سمجھی جائے گی۔اور پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسحاق علیہ السلام کے ساتھ جو وعدہ برکت تھا وہ روحانی تھا اور جو اسماعیلؑ کے ساتھ تھا وہ دنیاوی تھا۔

تورات کی مذکورہ بالا بشارتیں۔جو حضرت ابراہیمؑ اوران کے صاحبزادوں کے متعلق ابواب واسفار کے آیات میں متواتر مرقوم ہیں۔صاف صاف بتلا رہی ہیں کہ باعتبار ذاتی اقتدار وعظمت اور افتخار ومنزلت۔اسحاق علیہ السلام واسماعیلؑ دونوں حضرت مساوی فی الدرجات ہیں۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پرورش

یہاں تک ہم اوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ جناب ابراہیمؑ کی خاص دعا سے پیدا ہوئے۔اور یہ ظاہر ہے کہ اور بالکل اصول فطرت کے مطابق ہے کہ جس ماں باپ کے ہاں ایسا ارمانوں والا بچہ ہوگا وہ ان کو کتنا عزیز ہوگا۔اور پھر وہ بچہ بھی کیسا۔جس کی عظمت اور فضیلت کی خبر بشارت خداوندی پہلے سے دے چکی ہو جس کی مقدس نسل سے بارہ سردار (امام) پیدا ہونے والے ہوں۔جس کی مبارک صلب سے عظیم ترین قوم وجود میں آنے والی ہو۔جس کی نمود واولاد ارض اللہ کی وارث ہونے والی ہو۔اوراقوام وممالک مختلفہ پر حکمرانی کرنے والی ہو اور جہانبانی۔جس کے اعقاب واخلاف سے مشاہیر اوراکابر۔علماوفضلا۔صلحا اور عقلا وجود پذیر ہونے والے ہوں اوران سب کے علاوہ۔اسی کی مقدس نسل اسی کی مطہر صلب سے۔رسالت کا خضر آخر۔نبوت کا متمم۔اوردعوت الٰہی کا خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہور پذیر ہونے والا ہو۔

حضرت ابراہیمؑ خدا کے برحق رسول تھے اور سچے پیغمبر وہ اسماعیلؑ اوران کے اعقاب واخلاف کے متعلق منجانب اللہ بشارت پاچکے تھے۔ان تمام امور سے واقف ہوکر حضرت ابراہیمؑ کے دل میں ایسے ذیقدر اور عالی منزلت صاحبزادے کی کیسی اور کتنی محبت ہوگی اس کے بیان واندازہ کی ضرورت نہیں۔حضرت اسماعیلؑ سترہ برس تک اپنے والد بزرگوار کے دامن عاطفت میں پرورش پاتے رہے

۔اور اپنی والدہ گرامی قدر کے آغوش مبارک میں آرام وآسائش ان کی خاطرداری اور ناز برداری کچھ ابراہیمؑ وہاجرہ ہی تک موقوف نہیں تھی بلکہ ولادت اسحاق علیہ السلام کے پہلے حضرت سارہ کے اشفاق وتوجہ بھی ایسی ہی تھی ۔مگر مشیت کو اسماعیلؑ سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اوراس کے نامحدود نظام کوان کے ذریعے اس قطعہ زمین کی آبادی منظور تھی ۔ جہاں انسانی بود وباش کا تصور بھی گویا اس وقت محالات وناممکنات سے تھا اس ضرورت سے ۔خدائے مقلب القلوب نے حضرت سارہ کے دل میں ولادت اسحاق علیہ السلام کے بعد ہی اسماعیلؑ کی طرف سے محبت کی جگہ نفرت پیدا کردی ۔اوران کے خصائص ذاتی کواس وقت بالکل معمولی طبیعت کے اندازہ وپیمانہ پر معطوف فرمادیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے حالات میں اوپر قلمبند ہوچکا ہے کہ بالآخر حضرت ابراہیمؑ نے سارہ کے اصرار پر اصرار اور خدا کے ارشاد واسترضا کے مطابق اسماعیلؑ اوران کی ماں کو بادل گراں اور باچشم گریاں شہر کنعان سے مکہ معظّمہ پہنچا دیا۔مگر کس حال میں؟ حزن وملال کے ایسے نامحدود اور غیر متحمل عالم میں کہ کسی طرح اپنی محترم بی بی اور مغتنم فرزند کی مفارقت کا صدمہ برداشت کے قابل نہیں تھا مگر رضا بقضائہٖ وتسلیما لامرہ کے اصول مسلمہ پر قائم رہ کران کی جانگزا مفارقت پر صبر کرلینا تھا چنانچہ آپ کے اس صبر وشکیبائی کی تصدیق تورات نے ان الفاظ میں فرمائی:

سارہ کی یہ فرمائش، بی بی اور بچہ کی خاطر سے ابراہیمؑ کوسخت ناگوار معلوم ہوئی اور خدا نے اس وقت یہ کہہ کر ابراہیمؑ کو تسکین وتسلی فرمائی کہ سارہ کا کہنا تم کو بی بی اور بچہ کی خاطر سے ناگوار نہ ہونا چاہیے۔

ذبح اسمٰعیلؑ کا واقعہ

مکہ میں سکونت فرما ہونے کے وقت سے لیکر واقعہ قربانی تک کے سارے واقعات پوری تفصیل سے جناب ابراہیمؑ کے حالات میں اوپر درج ہوچکے ہیں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔قربانی کا واقعہ جناب ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے زمانہ کا عظیم الشان واقعہ ہے اوران دونوں حضرات کے کمال معارف اور انتہائے صبر ورضا کا عدیم النظیر کارنامہ جس کی تفصیل بھی تمہیداً عہد ابراہیمؑ میں اوپر بیان ہوچکی ہے مگر اس کے متعلق ایک تحقیق تنقیح طلب ہے اور وہ میرے لئے نہایت ضروری ہے۔قربانی کا مسئلہ قدیم سے اسلام اور غیر اسلامی مذاہب میں مختلف فیہ چلا آتا ہے ۔ یہود اوران کی کورانہ تقلید اور مغویانہ تائید میں عیسائی اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں اور اسلامی مورخین علی الاکثر اسماعیلؑ کو مخالفین اسلام تو واقعہ ذبح کے متعلق اسماعیلؑ کا شمتاً وکنایتاً نام بھی نہیں لیتے مگر اسلامی مورخین ومحدثین میں اس کی نسبت دو فرق ہوگئے ہیں۔ایک اسحاق کو ذبیح اللہ بتلاتا ہے دوسرا اسماعیل کو۔ان باہمانہ اختلاف سے غیر اسلامی مورخین کے غلط استدلال میں قوت آگئی ہے۔

اسی وجہ سے ڈاکٹر سرسید احمد خاں حضرت اسحاق کو ذبیح اللہ لکھتے ہی نہیں بلکہ ضرورت سے زائد مصر ہیں سید صاحب کے اس نظریہ پر جہاں تک نظر ڈالی گئی ہے اور غور کیا گیا ہے۔جس کوانہوں نے اپنے غلط اصرار کے تقاضہ سے۔خطبات احمدیہ کے متواتر مقامات پر زیب قلم فرمایا ہے۔یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کی اس رائے کی بنا اسلامی مورخین ومحدثین کے مختلف مرویات پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام تر تورات کی عبارات اور یہود ونصاریٰ کی تحقیقات اور یکطرفہ فیصلہ جات پر قائم ہے۔اور چونکہ سید صاحب کا استدلال ہمیشہ سے کتب

قدیمہ اور غیر اسلامی مورخین و محققین کو اخبار و اثار سے مستنبط و مستخرج ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ سے انھیں کے اقوال و اسناد کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں۔اس لئے انھوں نے واقعہ قربانی میں بھی حضرت اسحاق ہی کو ذبیح اللہ تسلیم کر لیا۔

سید صاحب کی اس غلط فہمی کی ہم بعد میں اصلاح و ترمیم کریں گے۔ابھی ہم غیر اسلامی اقوام کے اس دعوی کی کہ اسحاق ہی ذبیح اللہ حقیقی تھے۔تردید و تنقید پیش کرتے ہیں۔اس بحث پر مولانا شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ میں جو محققانہ رائے قائم کی ہے۔اس سے ہم کو پورا اتفاق ہے اور اسی کے نقل کو اپنے ادائے مدعا کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور ان کی عبارت منقول عنہ یہ ہے۔

ذبیح کون ہے

تورات اگر چہ یہودیوں کی عدم واحتیاط۔اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتا پا مسخ ہوگئی ہے اور خصوصاً حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق اس میں جو تصریحات و تلمیحات تھیں یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے۔تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں تورات میں گو تصریحاً حضرت اسحاق کا ذبیح ہونا لکھا ہے۔لیکن مطاوے کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں۔ کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

(۱) شریعت سابقہ کی رو سے قربانی صرف اسی جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی جو پہلوٹا بچہ ہو۔اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈ ہوں کی قربانی کی تھی وہ سب پہلوٹے بچے تھے۔خدا نے حضرت موسیٰ سے۔جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے ہیں۔وہاں فرما دیا ہے۔

لان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس والبھائم

کیونکہ بنی اسرائیل میں۔آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ۔میرے لئے ہے۔(تورات کتاب الاعداد آیت 7و8)

(۲) پہلوٹے بچہ کی فضیلت کسی حالت میں زائل نہیں ہوسکتی۔تورات میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں ایک مرغوبہ ہو اور ایک غیر مرغوبہ۔تو فضیلت اسی اولاد کو ہوگی جو پہلوٹی ہو۔گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔فانہ اول قدرتہ ولہ حق البکوریۃ (سفر تثنیہ اصحاح باب 21۔آیت 15۔17)

فی ذالك الوقت افرز الرب سبط لاوی لیحملوا تأبوت عھد الرب ولکی یقفوا اما الرب لیخدموہ و یبارکوا باسمه الی ھذا الیوم لا جل ذلك لم یکن للاوی قسم ولا نصب مع اخوته الرب ھو نصیبه

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے۔اور خدا کے آگے کھڑا ہوتا کہ وہ خدا کی خدمت کریں۔اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں۔یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے

بھائیوں کے ساتھ اور ترکہ نہیں ملا کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے (تورات تثنیہ اصحاح باب ا ص 8 و 9)

(۴) جو شخص خدا کی نذر کیا جاتا تھا وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا۔ جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں۔ تورات میں ہے۔

فھا انك تحملین وتلدین ابنا ولا یعل موسی راسه لان الصبی یکون نذیر الله

(تورات قضاۃ۔ اصحاح باب 13۔ 14)

اب تو حاملہ ہوگی۔ اور بچہ جنے گی۔ اور اس کے سر پر استرانہ پھیرا جائے۔ کیونکہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

(۵) جو شخص خدا کا خادم بنایا جاتا تھا۔ اس کے لئے خدا کے سامنے کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ تورات سفر عدد 6۔ 16 و 20 وسفر تکوین 17 اوسفر تثنیہ۔ 10۔ 8)

(۶) حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربانی کیا جائے۔ جو اکلوتا ہو اور محبوب ہو۔ (تورات تکوین۔ 1 صحاح 22 آیت 3)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو۔ لیکن پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا اور خدا پر چڑھانا۔ ایک بات تھی۔ یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھادو تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاور کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل میں سے بنی لاویوں کو لو اور ان کو خدا کے سامنے پیش کرو کہ خدا کے لئے خاص کر دئے جائیں اور یہ لوگ دوگایوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو قربانی کی جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی جو قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھادیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے اس کی بعینہ تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا۔ اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانہ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیان مذکورۂ بالا ذہن نشین کرنے کے بعد۔ دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت حضرت اسماعیلؑ کے بعد ہے اس بنا پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے نہیں۔ اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے۔ اس لئے حضرت اسحاق کی قربانی کا حکم نہیں ہوسکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحاق کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا بخلاف اس کے حضرت اسماعیل کو اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک

مشک دے کر رخصت کیا۔ یہ اس بات کی دلیل کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحاقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا۔

(۳) حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے حج میں احرام کے زمانہ تک سر نہیں منڈاتے۔ یہ اسی سنت اسمٰعیلی کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملت ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے لئے استعمال کئے نہ حضرت اسحاقؑ کے لئے۔ تورات میں ہے کہ جب خدا نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔

لیت اسمعیل یعیش امامك

کاش اسماعیلؑ تیرے سامنے زندہ رہتا۔

تورات میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) اسی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے۔ تورات جو تمام تر حضرت اسحاقؑ کی یکطرفہ داستان ہے اس میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں۔ یہ ہیں کہ حضرت اسحاقؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں۔ اور حضرت اسماعیلؑ دعوت ابراہیمؑ ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے۔ اس بنا پر خدا نے ان کا نام اسماعیلؑ رکھا۔ کیونکہ اسماعیلؑ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ سمع اور ایل سے سمع کے معنی سننے کے اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی خدا نے ابراہیمؑ کی دعا سن لی۔ تورات میں ہے کہ خدا نے ابراہیمؑ سے کہا کہ اسماعیلؑ کے بارے میں میں نے تیری سن لی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری دی تو اس موقع پر بھی حضرت اسماعیلؑ کو یاد کیا۔ غرض چونکہ ابراہیمؑ کو قربانی کا حکم ہوا تھا۔ اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو اس لئے اسماعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ حضرت اسحاقؑ۔

(۶) حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی عہد باندھوں گا۔ تورات میں ہے۔

> پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور تو اس کا نام اسحاقؑ رکھے گا، اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا۔ (تورات۔ تکوین۔ باب 17۔ آیت 18)

اس اجمال کی تفسیر یہ ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا اور فرشتے نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو۔ تو فرشتے نے یہ الفاظ کہے۔

> خدا کہتا ہے چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا۔ میں تجھ کو برکت

دوں گا۔ اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔
(تکوین باب 22۔25)

اب غور کرو۔ کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا۔ تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ان کی قربانی کا حکم ہوتا۔ لیکن حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتی ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ اکبر اولاد تھے۔ محبوب تر تھے۔ قربانی کے وقت بالغ یا قریب بلوغ تھے۔ قربانی سے بیٹے کو قربان کرنا چاہا۔ اس لئے اس بیٹے کے کثرت نسل کا وعدہ کیا گیا۔ یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی۔ اس لئے ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ حضرت اسحاقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا۔ جو کسی انعام وصلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

(۷) مقام قربانی مکہ معظّمہ تھا۔ جب قربانی اسماعیلؑ کے واقعہ ہی سے انکار ہے تو پھر اس کے موقع اور موضع سے بھی انکار مخالفین اسماعیلؑ کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے تورات میں قربانی گاہ کا جو موقع بتلایا گیا ہے وہ مریا ہے۔ یہودی کہتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا۔ عیسائی کہتے ہیں۔ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔

لیکن یورپ ہی کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے۔ سر اسٹانلی (SIR STANLEY) لکھتے ہیں:

> حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں خدا نے ان کو حکم دیا تھا۔ لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے۔ نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق۔ قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے۔ یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ ابعد۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبل عرفاۃ ہے۔ غالباً یہ مقام۔ جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربان گاہ ہے۔ مشابہ مقام ہے۔

اول تو یہ غلط ہے۔ مسلمان عرفاۃ کو نہیں بلکہ منیٰ کو قربانی سمجھتے ہیں۔ خیر مرقومہ بالا عبارت سے اتنا نو ثابت ہوتا ہے کہ موریا کے یقیین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا۔ یعنی یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے۔ یا وصفی معنی رکھتا ہے۔ بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا ہے اور اس لئے اس کا ترجمہ تورات کے بعض نسخوں میں بلوطات عالیہ اور بعض میں زمین بلند اور بعض میں مقام الرویا کیا ہے۔ لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اسی لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ بحال خود رہنے دیا۔ لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہیئت بدل گئی یعنی مریا کا مورہ ہو گیا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت تورات میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے۔ تورات میں ہے:

وکان جیس المدیانین شمائلھم عند تل مورۃ فی الوادی۔ (قضاۃ۔ باب 7 آیت 2)

اور مدیانیوں کی فوج۔ شمال کی جانب۔ مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی۔ (مدیان عرب میں واقع ہے)

تمام قرائن اور واقعات کو پیش نظر رکھا جاوے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظّمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات۔ قرآن مجید کی تصریح۔ احادیث کی تعیین۔ تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربان گاہ ہیں۔ (موطا امام مالک)

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی جو مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ تاہم آنحضرت صلعم نے مروہ ہی کو قربان گاہ اصلی مقرر فرمایا۔ یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

ثم محلھا الی البیت العتیق ھدیا بالغ الکعبۃ

پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے۔ ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے منیٰ نہیں۔ لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کی حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں اس لئے اگر حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح ہوتے تو ان کی کوئی یادگار ان کے ہاں موجود ہوتی۔ بخلاف اس کے حضرت اسماعیلؑ کے خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسماعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں۔ قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولاد اسماعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں۔ اور حج جو ایک بڑا فریضہ اسلام ہے۔ تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا اے ابراہیمؑ۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا (لبیک) میں حاضر ہوں (تکوین باب 1، 22) حج میں مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے جاتے ہیں۔ یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں جس کا ترجمہ ہوتا ہے۔ میں حاضر ہوں۔

(۲) شریعت ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے۔ یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے۔ وہ بار بار معبد یا قربانی

گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفاومروہ کے درمیان جوسات بارسعی کرتے ہیں۔یہ اسی کی یادگار ہے۔

(۳) نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے۔حج میں بھی یہی دستور ہے جب احرام اتارتے ہیں۔ تب بال کترواتے یامنڈاتے ہیں۔خودقرآن مجید میں ہے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ

سروں کے بال منڈاتے ہوئے یا کترواۓ ہو۔

(۴) حج کاایک ضروری رکن قربانی ہے۔یہ وہی حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔اسی بناپرقرآن مجید میں فرمایا ہے۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی۔

یہ تو دلائل تورات کی تصریحات وکنایات کی بناپر تھے۔قرآن مجید کی رو سے قطعاً حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے۔اگرچہ بہت سے مفسروں نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہو۔قرآن مجید میں قربانی کاواقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (الصافات)

اور حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جاؤں گا وہ مجھے راہ راست دکھلائے گا۔خدایا مجھے اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو۔تو ہم نے اس کو ایک سمجھدار لڑکے کی خوشخبری دی۔پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیمؑ نے کہا کہ بیٹے۔میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔تیری کیارائے ہے۔

آیات بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔ تورات سے ثابت ہے کہ جولڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں اور اسی لئے ان کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سنی۔اسی بنا پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے۔وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ اسحاق علیہ السلام نہیں۔

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہے۔اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا وہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں ہیں۔بلکہ حضرت اسماعیلؑ ہیں۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا۔ یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا۔ قرآن مجید میں ہے۔

مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ

تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ خدا کا یہ حکم ہوا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ تو حضرت اسماعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے۔ اس موقع پر خدا نے اسلما کا لفظ استعمال کیا کہ جو اسلام سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی تسلیم اور حوالہ کر دینے کے ہیں۔

فلما اسلما

پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں۔ یہ وصف مقبول بارگاہ الٰہی ہوا۔ اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی۔ ایثار۔ اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی نے آپ اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ اگر حضرت اسحاق علیہ السلام قربان ہوتے۔ تو یہ لقب ان کی اولاد یا ان کی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس سے اصل مقصود کیا تھا۔ قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھایا کرتی تھیں۔ یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی۔ مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔

اکابر صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں۔ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عینی اور تمثیلی۔ عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھلایا گیا تھا اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں۔ یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیے جائیں۔ تورات میں جابجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی۔ مگر خدا نے اس پر متنبہ کر دیا ہے۔ اس بنا پر گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے۔ لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا:

قد صدقت الرویا ان کذالك نجزی المحسنین
تو نے خواب کو سچا کر دکھلایا۔ ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔
بہرحال یہاں اس تفصیل سے یہ مقصود ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا۔ نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل ہوا تھا۔ وہ خدا کے سامنے تھا'' تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔ لیت اسماعیل علیہ السلام یعیش امامك۔ کاش اسماعیلؑ تیرے سامنے زندگی گزارتا۔
اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب کے تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں۔ یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کا نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اول از صفحہ 98 تا صفحہ 107 مطبوعہ کانپور)

اس حدیث کی تنقید جس کو سرسید نے ذبح اسحاق علیہ السلام کی تائید میں لکھا ہے

مولانا شبلی صاحب نے مسئلہ زیر بحث میں اپنے مرقومۂ بالا دلائل و براہین کو بڑی تحقیق و تفتیش سے حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہر شخص با آسانی سمجھ لے گا کہ واقعہ قربانی حقیقت میں حضرت اسماعیلؑ سے متعلق ہے اور جناب اسحاق علیہ السلام سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ یہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کی نفسانیت اور تعصب ہے۔ جو خواہ مخواہ واقعہ قربانی اور اس کے حقیقی موعودلہ اور اصلی مقام قربانی کو طرح طرح کے فریب اور تاویلوں سے خلط ملط کر کے بدل رہے ہیں۔ شخص خاص کی شخصیت موقع کی اصلیت۔ سب کو ادھر سے ادھر کر رہے ہیں۔ ان مقامات کے ایسے نام ونشان بتاتے ہیں جو نہ قدیم جغرافیہ میں پائے جاتے ہیں اور نہ حال کے جغرافیہ میں۔ سر اسٹانلی (SIR STANLEY) کی رائے ہے جو اصلی قربانگاہ کے متعلق مولانا شبلی نے نقل فرمائی ہے۔ وہ میرے بیان کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔
سرسید مرحوم بیر شبع۔ کوہ فاران وغیرہ کی نسبت۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے متعدد اور مختلف اقوال لکھ کر ان کے اغوا اور عالم فریبی کے طومار لکھ چکے ہیں۔ جس کو ہم اوپر انہیں کی تحریر سے نقل کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود اتنی تردید تنقید کے بھی سید صاحب کبھی کبھی ان کی تصدیق و تائید فرما ہی دیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسئلہ قربانی سید صاحب کے موضوع تالیف میں نہیں تھا۔ تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ سید صاحب نے تو خطبات میں ان تمام مسائل کا خاص طور پر انکشاف فرمایا ہے۔ جو اسلام اور غیر مذاہب میں متنازع فیہ تھے۔
قربانی کا مسئلہ اعظم ترین واقعہ ہے۔ جو بارگاہ رب العزت میں حضرت اسماعیلؑ کی قربت منصوصہ اور عظمت مخصوصہ ثابت کرتا ہے۔ اور یہی وہ واقعہ ہے جو ضبط ابراہیمی۔ اور صبر اسماعیلی کی عدیم النظیر یادگار قائم کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ مقدس باپ اگر التابع لامر اللہ تھا تو اس کا مبارک فرزند الراضی لمرضات اللہ پھر ایسے عظیم ترین واقعہ کو۔ جس کی عظمت نصوص قرآنیہ سے ثابت ہے۔

سید صاحب کے جیسا اسلام کا شفیق محقق بغیر تحقیق کے چھوڑ دے۔نہیں۔سید صاحب نے اس کی تحقیق بھی فرمائی۔مگر سوء اتفاق سے اس مسئلہ خاص میں ان کی توجہ اور خیالات زیادہ تر اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی تقلید وتائید کی طرف مڑ گئے۔اور آپ نے مخالفین کی اس عالم فریبی اور اغوا میں پڑ کر وہی طریقہ اختیار کیا جو آپ سے پہلے اکثر اسلامی محدثین ومورخین اختیار کر چکے تھے۔سید صاحب نے حقیقتاً کوئی نئی بات نہیں کی۔ بلکہ وہی جو قبل میں اکثر علماء کر چکے ہیں۔سید صاحب سے جو فروگذاشت ہوئی وہ یہی اور اتنی ہی ہے کہ آپ نے اپنے دستور وعادت کے خلاف اپنی محققانہ سعی وکوشش سے اس مسئلہ خاص میں کام نہیں لیا۔صرف نقل ہی پر اکتفا فرمائی۔اگر ذرا سے تعمق اور غور سے کام لیا جاتا تو کتب قدیمہ کے انہیں اسفار واخبار سے جسے وہ حضرت ابراہیمؑ۔حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کے متعلق خطبات میں قلمبند کر چکے ہیں۔اصل حقیقت کا انکشاف ہوجاتا۔اور اصل واقعہ کی حقیقی صورت صاف صاف جلوہ گر ہوجاتی۔

مخالفین اسلام کے علاوہ۔محدثین ومورخین اسلام کے مختلف آرا اور نظریات سے اس کی تحقیق وتفتیش فرمائی جاتی تو ثابت ہوجاتا کہ حقیقت کیا ہے۔مگر سید صاحب کے نظریہ پر۔اس مسئلہ خاص میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے ذبح اسماعیل کی نسبت مسلمانوں کے استدلال اگر پوری تفصیل سے نہیں تو بالا جمال ضرور لکھ دیئے ہیں۔مگر نہ ان کے اقوال کی تصدیق کی اور نہ ان کے نظریہ کی تائید بلکہ ان سے قطع نظر کی۔وہی کتب قدیمہ کی تقلید اور ذبح اسحاق کے مویدین محدثین اور مورخین کی تائید کو اپنا نظریہ قرار دیا ہے۔سید صاحب کے خلاف مولانا شبلی نے اس مسئلہ میں کسی قدر زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔چونکہ روئے سخن ان کا زیادہ تر مخالفین اسلام سے ہے نہ متبعین اسلام سے اس بنا پر انہوں نے کتب سابقہ کے انہیں اخبار وآثار سے حضرت اسماعیلؑ کا ذبیح اللہ ہونا ثابت کیا ہے۔جن میں سے اکثر کو سید صاحب خطبات میں لکھ چکے ہیں اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ مخالفین اسلام کے مغویانہ اور لغویانہ دلائل کی قطع وبرید اور تردید کے لئے کافی ہیں۔

اگر مخالفین کی کتابیں صحیح۔ان کے مرویات سچے اور ان کی بشارتیں برحق ہیں تو پھر اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ تسلیم کرنے میں مسلمانوں سے زیادہ یہودیوں اور عیسائیوں کو سرگرم اور پر جوش ہونا چاہیے۔اور اگر حقیقت میں ان کو واقعہ کی صحت سے نہیں۔ بلکہ انصاف پسندی اور حق فہمی سے انکار ہے اور حسد وتعصب اور اسلاف کی کورانہ تقلید پر اصرار ہے تو پھر نہ آج اس مسئلہ میں ان کی تشفی ممکن ہے اور نہ پھر قیامت تک ان کا اطمینان ہوسکتا ہے۔

ہمارے نزدیک مخالفین اسلام کی غلط فہمیوں کی اصلاح مولانا شبلی صاحب کے مندرجہ بالا استدلال سے پورے طور پر ہوگئی۔ہمیں اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔لیکن اس کے ساتھ ہی اسلامی مورخین ومحدثین کے باہمی اختلاف وانتزاع کی تفصیلی کیفیت اور حقیقت حال دکھلا دینا ہمارے لئے لازمی ہے۔اس لئے میں ان حضرات کے مختلف نظریات سے اصل واقعہ کی پوری کیفیت ذیل میں قلمبند کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ سید صاحب کی طرح شبلی صاحب نے بھی اسلام کے اتنے بڑے اعظم ترین مسئلہ کو اپنے طریقہ استدلال میں صرف اشارے اور کنایہ سے بتلایا ہے۔اور اس کے متعلق خصوصاً علمائے اسلام میں اختلاف وانتزاع واقع ہونے کی کوئی تفصیل وجہ کیفیت

نہیں بتلائی۔ حالانکہ مولوی صاحب کا یہ فرض تھا کہ جس طرح مخالفین اسلام کے نظریہ کی تردید وتنقید انھیں کے اخبار واسفار سے کر دی گئی تھی۔ اسی طرح علمائے اسلام کے اختلاف پر بھی تنقیدانہ نظر ڈال کر اس مسئلہ کی حقیقت کا انکشاف فرما دیا جاتا۔ اس سے عام اہل اسلام کو اطلاع وواقفیت حاصل ہونے کے علاوہ مخالفین اسلام کے معترضانہ استدلال سے بھی آئندہ کوئی تائیدی قوت پیدا نہ ہوتی۔

مگر باایں ہمہ یہ ہم ضرور کہیں گے کہ سید صاحب سے زیادہ شبلی صاحب نے مسلمانوں کے اظہار دعویٰ اور استقرار حقوق کی طرف اپنی توجہ موڑ دی ہے اور اس مسئلہ میں اپنا وہی نظریہ قائم کیا ہے جس پر اسلام کے تمام طریقوں کے علمائے اعلام اور محدثین کرام کا اتفاق عام ہو چکا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے متلاشی طبیعت صرف اس لکھ دینے کو کافی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی پوری تفصیل اور تحقیق کا کافی طور سے معلوم کرنا ان کا اصلی مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے طالبان تحقیق کی خاطر خواہ تشفی واطمینان کے لئے اس واقعہ کی تفصیلی ارباب تحقیق کا فرض منصبی قرار پا جاتی ہے۔

ہم نے جہاں تک ان دونوں محققین کے اقوال ومختار کو اس بارے میں دیکھا ہے۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ مولانا شبلی صاحب نے اسلامی علما ومحدثین کے مختلف اقوال وارشاد کو اس مسئلہ کے متعلق دیکھا ضرور ہے۔ بخلاف سید صاحب کے جن کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس بحث کے اصل موضوع کو اپنے علما ومحدثین کی تالیفات میں دیکھا بھی نہیں۔ اور اگر دیکھا بھی ہے تو کتب قدیمہ کی تائیدی روایتوں کو۔ اور اپنی رائے میں انہیں کو ترجیح دے کر خاص کر انہیں علماء کی تقلید اختیار فرمائی ہے جو آپ کے ہم خیال تھے۔ یہ موقع تقلیدی تحقیق کا نہیں تھا بلکہ تنقیدی تفتیش کا۔ سید صاحب نے اپنے استدلال میں پہلے ذبح اسماعیلؑ کو اسلام کا مختلف فیہ مسئلہ بتلایا ہے اور اس کے ثبوت میں علامہ مسعودی کا یہ قول دکھلایا ہے۔

قد تنازع الناس فی الذبح فمنهم من ذهب الی انه اسحق و منهم من راے انه اسماعیل فان کان الا مر وقع بمنی فالذبح اسماعیل لان اسحٰق لم یدخل حجاز فکان الا مر بالذبح وقع بالشام فالذبح اسحاق لان اسماعیل لم یدخل الشام بعد ان حمل منه (مروج الذهب مسعودی)

مسئلہ ذبح میں لوگوں کو اختلاف ہے بعض کی رائے ہے کہ ذبیح اسماعیلؑ ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اسحاقؑ علیہ السلام۔ پس اگر واقعہ ذبح منیٰ میں واقع ہوا ہے تو ذبیح اسماعیلؑ ہیں۔ کیونکہ اسحاق علیہ السلام کا حجاز آنا ثابت نہیں ہے۔ اور اگر واقعہ ذبح شام میں واقع ہوا ہے تو ذبیح اسحاقؑ ہیں۔ کیونکہ حضرت اسماعیلؑ کا (حجاز میں آ کر) پھر شام میں جانا ثابت نہیں۔

مسعودی کے اس بیان سے یہ مسئلہ اختلافی تو ضرور ثابت ہوتا ہے اور اس سے سب کو اقرار ہے مگر میرے نزدیک تو مسعودی کا یہ بیان سید صاحب کی رائے سے زیادہ شبلی صاحب کے نظریہ کا موئد ہے۔ کیونکہ علامہ مسعودی صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر واقعہ قربانی

مقام منیٰ علاقہ حجاز میں واقع ہوا ہے تو حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابھی ابھی موریا کے اصلی مقام قربانی ہونے کی تحقیق میں پورے طور سے ثابت کر دیا گیا ہے۔ کہ وہ مقام مروہ ہے جو حوالی مکہ میں واقع ہے اور جس کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اصلی قربانگاہ بتلایا ہے۔ تو پھر مسعودی ہی کی شرط پر حضرت اسماعیلؑ ذبیح اصلی ثابت ہو گئے۔

افسوس ہے کہ سید صاحب نے موریا کی تحقیق کو اٹھایا بھی اور اس کی نسبت مسلمانوں کے دعوے بھی لکھ دیئے مگر چونکہ موریا کا استقرار مقام سید صاحب کے مختار و مدعا کے خلاف ثابت ہوتا تھا اس لئے آپ نے اپنی تحقیق کو محض ناقص چھوڑ کر اس بحث خاص کو گومگو کے حالات میں چھوڑ دیا۔ سید صاحب کی نا تصفیہ کن عبارت یہ ہے۔

یہ اختلاف توریت مقدس کی اس آیت کے مبہم اور غیر مصرح ہونے کی وجہ سے ہے۔ جس میں اس مقام کا ذکر ہے۔ جہاں مذکورہ بالا قربانی کا عمل میں آنا تجویز ہوا تھا۔ وہ آیت یہ ہے۔ تورات ترجمہ فارسی۔

خدا ابراہیم را امتحان کردو با او گفت اے ابراہیم ووے گفت اینک حاضرم و خداوند گفت کہ حال پسر یگانہ خود اسحاق را کہ دوست میداری بگیر و در زمین موریاہ برو (عربی ترجمہ میں بجائے موریاہ کے ارض الرویا لکھا ہے اور ترجمہ سامری عربی میں ارض المختارۃ والمرشد لکھا ہے) ودرانجا اور ااز کوہ ہائے کہ بتومی گویم از برائے قربانی وسوختنی تقریب نما

خدا نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا اور ان سے کہا اے ابراہیمؑ اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ خدا نے کہا کہ اپنے اکلوتے بیٹے جو کہ اسحاق علیہ السلام ہے اور تو اس کو دوست رکھتا ہے۔ اپنے ساتھ لے۔ اور زمین موریاہ میں جا۔ اس کو وہاں کے پہاڑوں میں سے جو میں تجھے بتلاتا ہوں قربانی کر اور چلا۔ (تکوین باب 22، 1-2)

بعض مسلمانوں نے اس گمنام جگہ کو بیت المقدس اور اس کے پہاڑ بتلائے ہیں۔ اور بعض نے مکہ معظمہ کے پہاڑ قرار دیا ہے۔ وہ اپنی رائے کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ لفظ عبری بریم۔ جس کے معنی جبال کے ہیں تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے وہ استدلال کرتے ہیں کہ اس سے مکہ معظّمہ کے مشہور دو پہاڑ صفا اور مروہ میں سے ایک مراد ہے۔

تعجب ہے کہ سید صاحب جیسا محقق اس مقام کو آج تک گمنام سمجھے۔ حالانکہ اس کا تعین اسلامی مورخین کے علاوہ خود کتب تورات میں مرقوم ہے۔ جس کے وثوق پر آپ نے اپنی رائے قائم کی ہے۔ تورات قضاۃ باب 7 آیت 2 میں صاف طور سے لکھا ہے۔

وکان جیش المدیانین شمائلھم عند تل مورہ فی الوادی

مدیانیوں کی فوج شمال کی طرف مورہ کی پہاڑی اور وادی میں تھی۔ (ضمیمہ کتاب بائبل ص 114)

اس کے علاوہ ہمارے سید صاحب تو خود مدین کو عرب میں کیا خاص حجاز میں تسلیم کر چکے ہیں۔ خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور صفحہ 626 میں تحریر ہے۔

کتاب اول سلاطین باب 11۔ آیت 18 میں مرقوم ہے۔ ھدد اور اس کے ہمراہیوں کے

مصر میں جانے کے حال میں لکھا ہے کہ وہ مدیان سے نکلے۔ اور فاران میں آئے اور وہاں سے تو می ساتھ لے کر مصر کو گئے۔ مدیان وہ شہر ہے جس کو عرب میں مدین کہتے ہیں۔ اور ساحل بحر قلزم پر۔ جو حجاز کے جانب ہے تبوک سے تخمیناً چھ منزل جانب جنوب واقع ہے۔ یہ شہر وادی فاران میں واقع تھا جو ٹھیک حجاز ہے۔ خطبات ص626۔

مندرجہ بالا شواہد تورات سے بھی ثابت ہو گیا کہ جبل موریاہ، مریا یا مورہ جو حقیق قربانگاہ بتلایا گیا ہے۔ وہ مدین سے قریب تھا اور مدین ٹھیک حجاز میں واقع تھا۔ جس کا صدر مقام مکہ معظّمہ ہے۔ تو اب اس سے مسعودی والی شرط کہ اگر حجاز قربانگاہ ثابت ہو جائے تو اسماعیلؑ ذبیح اللہ حقیقی تسلیم کئے جائیں گے۔ پوری ہو گئی۔ کیونکہ حضرت اسماعیلؑ کا وہاں مع اپنی والدہ اور آئندہ اپنی اولاد و اعقاب کے ساتھ ہمیشہ کے لئے آباد ہونا جمہور کا مسلمہ ہے بخلاف اس کے حضرت اسحاق علیہ السلام کا حجاز کیا عرب کے کسی قطعہ زمین پر تشریف لانا کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ پھر ان کا ذبیح ہونا کیسے صحیح مانا جائے گا۔ جب انہوں نے اصلی مذبح میں مادام الحیات قدم تک نہ رکھا اور کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کا عرب میں آنا۔ نہ کسی اسلامی مورخ نے لکھا ہے اور نہ کسی یہودی یا عیسائی محقق نے۔ بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ہجرت کے بعد۔ عرب سے شام میں تشریف لے جانا تو خود سید صاحب کے اعترافات سے ہے۔ خطبات احمدیہ میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ انجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جن کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی۔ بروقت وفات حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے پاس موجود تھے۔ خطبات ص40

پھر حاشیہ زیرین صفحہ میں لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو حضرت اسحاق علیہ السلام کے چھٹنے کے بعد گھر سے نکال دیا تھا۔ اس حساب سے حضرت اسماعیلؑ جب جلا وطن ہوئے تھے۔ تو سولہ برس کے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا۔ ایک سو پچھتر برس کے سن میں انتقال ہوا اور حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاق علیہ السلام۔ دونوں نے مل کر کمپلاہ کی غار میں دفن کر دیا۔ (تکوین باب 25، 19)

سید صاحب کی اس عبارت سے تو حضرت اسماعیلؑ کا متواتر شام میں جانا ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر مسعودی کے اس نظریہ کو وہ کیوں تسلیم کرتے ہیں۔ جو کہتا ہے کہ ہجرت کے بعد اسماعیلؑ کا شام میں جانا ثابت نہیں۔ ذبح کے مسئلہ میں آپ نے اسی مسعودی کے قول کو۔

جو ذبح اسحاقؑ کی نسبت اس نے لکھا ہے۔ صحیح مانا ہے۔ اور وہی آپ ہی کی تحقیق اور تحریر سے مقطوع الاسناد وقصیر الاطلاع اور نا قابل اعتبار ثابت ہوتا ہے۔

سید صاحب کہ مرقومہ بالا عبارت تورات سے ایک اور بات بڑے فائدہ کی معلوم ہوئی اور وہ یہ ہے کہ تورات کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں (اسحقؑ و اسماعیلؑ) میں خلوص واتحاد کے باہم مراسم جاری تھے اور ایسے کہ جانبین کے مسالک سے مختلف البطنی کے اختلاف وانتشار کا کوئی اثر اور نشان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ حقیقت تو یوں ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں خلوص واتحاد کے تمام مراسم ہمیشہ قائم تھے۔ یہ تو مابعد کی نسلوں کے حسد ونفسانیت نے باہمی اختلاف ومغائرت کے نقشے جمائے ہیں۔ اور مخالفت اسلام اور بانی اسلام علیہ السلام کے باعث سے یہودیوں اور عیسائیوں نے خوب خوب گہرے رنگ بھرے ہیں۔

مسعودی کی اصل حدیث کی تنقید

یہاں تک تو ہم نے اس مسئلہ میں جزئیات سے بحث کی تھی اب ہم اس کی اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں اور زرقانی کی شرح مواہب لدنیہ سے ان تمام حدیثوں اور ان کے طریقوں کے اسقام وابہام کو ذیل میں علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔ جو حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح بتلاتے ہیں۔

(۱) الدار قطنی عن ابن مسعود و ابن مردویه والبراز عن ابن عباس وفیه المبارك بن فضالة ضعفه الجمهور

دارقطنی نے ابن مسعود اور ابن مردویہ اور براز سے عبداللہ بن عباس کے طریقہ سے روایت کی ہے۔ اس کے راویوں میں مبارک ابن فضالہ ایک راوی ہے۔ جس کو جمہور محدثین نے ضعیف کیا۔

(۲) پھر اس کو رواہ الحاکم من طرف عن العباس وقال صحیح علی شرطهما

حاکم نے اس کو عباس کے طریقہ سے لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ موجودہ (اور قبل مبارک ابن فضالہ کے طریق) دونوں طریق سے صحیح ہے۔

(۳) قال مسعود ذهبی صحیح (98 رواه ابن حدو مردویه عن ابی هریره

مسعودی نے بھی اس طریق سے لکھا ہے اور صحیح کہا ہے۔

ابن مدودیہ نے اس کو ابو ہریرہ سے بیان کیا ہے۔

لیکن ابن کثیر الشامی ان تینوں طریقوں کی تنقید وتردید فرماتے ہوئے بتلاتے ہیں۔ فیه الحسن ابن دینار متروك و شیخه منکر۔ اس کے رواۃ میں حسن ابن دینار متروک ہے (اس سے حدیث نہیں لی جاتی) اور اس کا شیخ۔ منکر الحدیث اس کی حدیث سے سب کو انکار ہے۔

(۵) رواه ابن ابی حاتم مرفوعاً ثم رواه عن فضاله بن مبارك موقوفا وهو اشبه

واضح
ابن ابی حاتم نے پہلے اس کو بطریق مرفوع لکھا۔ پھر اس کو فضالہ ابن مبارک سے روایت بطریق موقوف کر دی اور اس طرح کس کو مشتبہ کہا جائے اور کس کو صحیح۔
ان تمام حدیثوں کو جمع کر کے علامہ زرقانی رقمطراز ہیں۔

و تعقبه السیوطی بان مبارکا قدرفعه مرة فاخرجه البزاز عنه مرفوعا وله شواهد وعند الویلمی عن العباس مرفوعا فی حدیث بلفظ و اما اسحق بذل نفسه للذبح والطبرانی وابن ابی حاتم عن ابی هریره بسند ضعیف والطبرانی ایضاً بسند ضعیف عن ابن مسعود اساد صحیح موقوف

اس کی تعقیب سیوطی نے مبارک سے کی ہے۔ یہ بطریق مرفوع مروی ہے اور براز بھی اس کو بطریق مرفوع روایت کی ہے اور اس کے شواید اس کے پاس ہیں اور ویلمی نے اس کو بطریق عباس سے اس لفظ کے ساتھ لکھا ہے کہ اسحاق نے اپنے نفس کو واسطے ذبح کے دے ڈالا۔ اور ابن حاتم نے بھی ابو ہریرہ سے اس کو بطریق مرفوع لکھا ہے
لیکن بروایت ضعیف لکھا ہے اور امام طبرانی نے بھی اس کو بسند ضعیف ابن مسعود سے لکھا ہے اور معجم کبیر میں اسی مضمون کو آخر میں ابی الاحوص سے لکھا ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہیں مگر موقوف۔ زرقانی ص
ہم نے ذبح اسحاق کی حدیثوں اور ان کے طریقوں کو جمع کر دیا۔ اور زرقانی کی زبانی ان کی تنقیدی کیفیت بھی دکھلا دی جن سے ظاہر ہو گیا کہ ان حدیثوں کا کوئی طریق بھی۔ خدشہ۔ شبہ یا سقم سے خالی نہیں۔ اس لئے یہ حدیثیں صداقت کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔
اب ان کے خلاف جو حدیثیں ذبح اسماعیل کی نسبت مقبول ہیں ان کی حیثیت بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) روی علی ما عند الزمخشری فی الکشاف فی سورة والصافات استدلالا علے ان ذبیح اسماعیل انه صلی الله علیه وآله وسلم قال ابن الذبحین

زمخشری نے اپنی اسناد سے اس کو اپنی تفسیر کشاف میں بذیل سورہ الصافات حضرت اسماعیل کے ذبیح اللہ ہونے کے ثبوت میں استدلالاً لکھا ہے کہ فرمایا آنحضرت صلعم نے کہ میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں۔

(۲) وعند الحاکم فی المستدرك وابن جریر و ابن مردویة والثعلبی فی تفاسیر هم عن معاویه ابن ابو سفیان قال کنا عند رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فاتاه اعرابی فقال یا رسول الله خلقت البلاد یا بستة والماء یا بساً وخلقت

المال عابسا هلك العيال و ضاع المال فعد على هما افآء الله عليك يا بن الذبيحين قال المعاوية فتبسم رسول الله صلعم ولم ينكر عليه

مستدرک میں حاکم نے اور ابن جریر اور مردویہ اور ثعلبی نے اپنی تفاسیروں میں معاویہ ابن ابوسفیان سے منقول کیا ہے کہ ہم ایک بار خدمت رسول صلعم میں بیٹھے تھے کہ ایک مرد اعرابی آیا اور عرض کی کہ عام طور سے تمام شہروں میں قحط پڑا ہے۔ پانی بالکل کم ہوگیا ہے اور لوگوں کی آمدنی موقوف ہوگئی۔ جائیداد تباہ اور اہل وعیال خاک سیاہ ہورہے ہیں۔ آپ ہماری اس مال سے امداد فرمائیں جو خدا نے آپ کو عطا فرمایا ہے اے دو ذبیحوں کے مبارک فرزند۔ یہ سن کر آپ متبسم ہوئے اور آپ نے اس کے اس خطاب کا انکار نہیں کیا۔

زرقانی مرقومہ بالا محدثین کی زبانی لکھتے ہیں۔ فافادانه اسماعیل۔ اس میں صریح افادہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے وهذا احتج به معاويه على من قال انه اسحاق اور اسی سے معاویہ نے ان لوگوں پر اپنا احتجاج قائم کیا جو اسحاق علیہ السلام کو ذبیح کہتے ہیں۔

(۳) عند الحاكم عن الصنالجي حضرنا مجلس معويه فتذكر القوم اسمعيل و اسحاق فقال بعضهم اسماعيل الذبيح وقال بعضهم بل اسحاق فقال معويه سقطتم على الخبير وذكره الحديث جدا يعني بالذبيحين عبدالله و اسماعيل ابن ابراهيم كما قاله جماعة من الصحابة وتابعين ورجه جماعة وقال ابو حاتم انه الصحيح و البيضاوي الاظهر۔

مستدرک میں امام حاکم نے اس کو صنالجی کی اسناد سے یوں لکھا ہے کہ ہم معاویہ کی مجلس میں حاضر تھے کہ حضرت اسماعیل واسحاق کا ذکر پیش آیا۔ بعض لوگ اسماعیل کو ذبیح اللہ کہتے تھے اور بعض اسحاق کو معاویہ نے کہا تم لوگوں کو ابھی خبر نہیں پہنچی ہے اور پھر پوری حدیث بیان کی اور کہا ذبیحین سے مراد عبداللہ واسماعیل ہیں۔ زرقانی کہتے ہیں یہ وہ قول ہے جس کو صحابہ اور تابعین کی ایک معتدبہ جماعت نے نقل کیا ہے اور اسی کو ایک جماعت علما نے ترجیح دی ہے۔ ابوحاتم نے اس کو صحیح بتلایا ہے اور بیضاوی نے اظہر قول شمار کیا ہے۔

علامہ ابن القیم نے مسئلہ زیر بحث پر مفصل اور مستحکم طریقہ سے بحث کی ہے۔ ان کی پوری تفصیل کو موجب تطویل سمجھ کر ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ مگر اس کے ضروری مقامات کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ومما يدل على ان ذبيح اسمعيل انه لا ريب ان الذبح كان بمكة ولذلك جعلت

القرابين يوم النحر كما جعل السعي بين الصفا والمروة ورمي الجمراة بها تذكير الشان اسماعيل وابيه وامه واقامه لذكر الله تعالیٰ و معلوم ان اسماعيل وامه هما اللذان كان بمكة دون اسحاق

جو امور حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ ذبح کا واقعہ بے شک مکہ میں واقع ہوا۔ کیونکہ وہیں تمام مراسم قربانی۔ مثل روزنحر اور سعی مابین مروہ اور صفا اور رمی الجمرات۔ صرف اس غرض خاص سے ادا کی جاتی ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی مادر گرامی قدر کی شان و منزلت ان کی شہرت اور ذکر و عبادت خدا میں ان کا استقلال و استقامت ظاہر اور ثابت ہو۔ اور یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں مکہ میں رہتی تھیں نہ اسحاقؑ۔

پھر اس کے آگے ان کا سلسلہ احتجاج یہ ہے۔

ولو كان الذبح بالشام كما يزعم اهل الكتاب ومن تلقى عنهم فكانت القرابين والنحر بالشام لا بمكة

اگر واقعہ ذبح شام میں ہوتا۔ جیسا کہ اہل کتاب کا زعم ہے تو ان سے جواب طلب ہوگا کہ مراسم قربانی و نحر وغیرہ آج تک شام میں ہوا کرتے۔ نہ کہ مکہ میں۔

پھر سلسلہ استدلال یہ ہے۔

فان الله سمى الذبيح حليماً (في القرآن) لانه لا احلم ممن سلم نفسه للذبح طاعة لربه ولما ذكر اسحاق سماه عليما۔

خدا نے (قرآن میں ذبیح اللہ کو حلم کے نام سے موسوم کیا ہے اس بنا پر کہ اس نے پورے اعتراف و امتیاز سے محض اطاعت اللہ اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا تسلیم کر لیا اور جہاں حضرت اسحاق کا ذکر کیا ہے وہاں ان کو صرف جاننے والے کی صفت سے موصوف بتلایا ہے۔

پھر اسی طریقہ کلام میں رقمطراز ہیں۔

وان الله تعالیٰ اجرى العادة البشرية ان بكر الاولاد احب الى الوالدين ممن بعده وابراهيم لما سئال ربه الولد ووهبه له تعلقت شعبه من قلبه محبته والله تعالیٰ قد اتخذه خليلا والخلة منصب يقتضى توحيد المحبوب بالمحبة وان لا يشارك فيها فلما اخذ الولد شعبة وان لا يشارك فيها فلما اخذ الولد شعبة من قلب

الوالد جائت غیرہ الخلة تنزعها من قلب الخلیل فأمر بذبح المحبوب فلما قدم علی ذبحه وکانت محبة اللہ عندہ اعظم من محبة الولد خلصت الخلة حیئذ من شوائب المشارکة فلم یبق فی الذبح مصلحه اذکانت المصلحة انماحی العزم و توطین النفس و قد حصل المقصود و فسخ الامر وفدی الذبح و صدق الخلیل الرویا۔

اور نیز اس طور سے بھی کہ خدا تعالیٰ نے ہمیشہ سے عادت انسانی ایسی ہی جاری فرمائی ہے کہ والدین اپنی اولاد اکبر کو بمقابلہ دوسری اولاد کے زیادہ چاہتے ہیں۔حضرت ابراہیمؑ نے جب خدا سے عطائے اولاد کی دعا فرمائی فطرت انسانی کے اعتبار سے ان کے قلب میں اس بچہ کی محبت ہوگئی۔مگر خدا نے ابراہیمؑ کو مرتبہ خلعت عنایت فرمایا تھا اور اپنا خلیل گردانا تھا۔اور مراتب خلعت کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کی محبت کے ساتھ پھر غیر کی محبت کا لوث نہ رکھا جائے تو جب آپ کے دل میں لڑکے کی محبت پیدا ہوگئی تو گویا محبت کی وحدت میں شرکت ہوگئی۔اس بنا پر نظام قدرت نے امتحاناً حضرت ابراہیمؑ کو اپنے محبوب کے ذبح کا حکم دیا۔لیکن جب آپ اس امر کے لئے پورے آمادہ اور تیار ہو گئے۔تو ثابت ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ کی محبت آپ کے دل میں آپ کے اس فرزند کی محبت سے کہیں زیادہ بڑی ہوئی تھی۔اسی وقت آپ کی خلعت کا بھی۔محبت غیر کی خلش مشارکت سے تصفیہ کامل ہوگیا اور اس واقعہ ذبح میں آپ کے ارادۂ دل کا امتحان۔استقلال اور اطمینان نفس کی آزمائش مقصود تھی۔اور وہ مقصود حاصل ہو گیا تو وہ امر امتحان و آزمائش بھی فسخ قرار دیا گیا اور اس ذبح کے لئے صدقہ اور بدلہ قبول کر لیا گیا۔اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب بھی سچا دکھلا دیا گیا۔

امام ابن القیم نے مندرجہ دلائل عقلی اور نقلی سے مسئلہ ذبح کو بالکل صاف کر دیا اور ذبح اسماعیلؑ کی حقیقت اور اصلیت ان مشاہد بدیہات سے ثابت کر دیا ہے جس کے مان لینے میں نہ پھر کسی اہل اسلام کو عذر ہوسکتا ہے نہ کسی اہل کتاب کے فرقہ کو عذر واعتراض۔یہ بالکل صحیح اور پر واقع ہے کہ اگر جناب اسحٰق علیہ السلام ذبیح اصلی ہوتے۔اور یہ واقعہ ملک شام یا بیت المقدس میں ظہور پذیر ہوا ہوتا۔تو ضرور تھا کہ اسحٰقؑ کی اولاد اور ان کی قوم وملک کے لوگوں میں ان کے اتنے بڑے عظیم ترین ایثار نفس کی یادگار۔اگر پورے طور سے نہیں تو تھوڑی بہت تو آج تک ضرور قائم رہتی۔مگر اس کے خلاف۔ان کی اولاد۔ان کی قوم اور ان کے ملک و وطن میں تو کہیں ان کی اتنی بڑی مہتم بالشان یادگار کا آج کوئی نام ونشان بھی نہیں بتلاتا۔اور سوائے اس کے کہ ان کی مقدس کتابوں میں حضرت اسحاقؑ کی اس جانفروشی کا ذکر

لکھا ہے۔ان لوگوں میں کہیں اس کا ذکر و مذکور بھی نہیں ہے۔اور شاید ان میں سے ننانوے فیصد ایسے نکلیں گے جو اس واقع سے واقف بھی نہیں ہوں گے۔بخلاف بنی اسحٰق کے نسل اسماعیلؑ کا بچہ بچہ ہزاروں برس کی مدت مدید گذر جانے کے بعد بھی آج تک اس واقعہ کو ایسی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے گویا کہ وہ قربانی کے منظر قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔اور اسی وجہ سے سلسلہ اسماعیلیؑ میں وہ تمام مراسم جو اس واقعہ عظیمہ کے متعلق حضرت ابراہیمؑ۔ان کی زوجہ مطہرہ۔حضرت ہاجرہؑ اور ان کے خلف الصالح جناب اسماعیلؑ نے خاص شہر مکہ معظّمہ۔حرم بیت اللہ اور اس کے متصل مختلف مقامات میں ادا فرمائے تھے۔آج تک ہر سال بلا ناغہ اسی طریقہ سے بجالائے جاتے ہیں اور ان کی تعمیل میں اتنی احتیاط برتی جاتی ہے اور اتنی پابندی پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ کسی طریقہ ادائے مناسکات میں بال برابر بھی فرق نہ آنے پائے اور ادائے مراسم کا کوئی شعبہ نہ چھوٹ جائے۔

نسل اسماعیلؑ میں اس وقت سے لے کر اس وقت تک یہ شب وروز کے واقعات اور مشاہدات اس امر کے تسلیم کر لینے اور مان لئے جانے کے لئے پورے طور سے کافی ہیں کہ اگر حضرت ذبیح اللہ اسماعیلؑ نہ ہوتے تو پھر اہل عرب کو یا ان کی تمام قوموں کو جو ان کی نسل سے ہونے کا شرف رکھتی ہیں۔ان مراسم اسماعیلی کو آج تک اس پر جوشی۔احتیاط اور اتنی پابندی سے قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔مگر نہیں۔یہ ان کے نمایاں شرف کا سبب اور ان کے فخر ومباہات کا مخصوص باعث تھا اور ان کے لئے اس عظیم الشان اور واجب الاحترام واقعہ کی یادگار جاری وقائم رکھنی ایسی ضروری تھی کہ خدائے سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے تمام مراسم ومناسک کی تعمیل ان کے لئے فرض کر دی۔

اتنا لکھ کر ہم پھر اپنے قدیم سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں نے اپنی تحقیق کو زیادہ تر اہل کتاب کے منقولات تک محدود رکھا۔اور سلامی محققین کے دائرہ میں بھی اتفاق سے انھیں علما کے استدلال معقولی سے آگے نہ بڑھے۔جن کو سید صاحب سے ہزار ہا برس پہلے اہل کتاب کے بھی مغویانہ منقولات ومعقولات دھوکہ میں ڈال چکے تھے۔سید صاحب حقیقت واقعہ کی تفتیش میں تھوڑی زحمت اور گوارا فرماتے تو ان پر اصلیت اور حقیقت واقعہ کا پورا انکشاف ہوجاتا اور معلوم ہوجاتا کہ اس مسئلہ پر دوسری صدی ہجری کے آغاز ہی میں۔متکلمین اسلام علمائے یہود سے اس مسئلہ خاص کی نسبت محاکمہ اور تبصرہ کر چکے ہیں۔علمائے اہل سنت میں ابن حجر عسقلانی نے مواہب لدنیہ میں۔زرقانی نے اپنی شرح میں اور علامہ ابن القیم نے استدلال مندرجہ شرح زرقانی میں۔اور علمائے شعیہ میں سے ملا محمدؒ باقر مجلسی نے حیات القلوب جلد دوم میں اس تبصرہ اور محاکمہ کی پوری کیفیت درج کی ہے۔ہم مواہب لدنیہ کی اصل عبارت سے اس کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

وروی فیما ذکرہ المعافی ابن زکریا بن یحیی ان عمر ابن عبد العزیز سال رجلا اسلم من علماء الیہود ای ابن ابراھیم امر بذبحہ فقال واللہ یا امیر المومنین ان الیہود لیعلمون انہ اسماعیل و لکنھم یحسدونکم معشر العرب ان یکون اباء کم للفضل الذی ذکرہ اللہ عنہ فھم یجحدون ذلك ویزعمون انہ اسحاق لا ان

اسحاق ابوهم فانظر ابها بخلیل مافی هذبه القصة من السر الجلیل وهوان الله تعالیٰ بری عبادہ الجبر بعد الکسر و اللطف بعد الشدۃ فانه کان عاقبة صبرها جر وابنها علی البعد والوحدۃ والغوبة والتسلیم لذبح الولد الی۔ ما الت الیه من جعل اثارهما ومواطی اقدامهما مناسك لعبادہ المومنین و متعبدات لهم الی یوم الذین وهذہ سنة الله تعالی فیمن یرید رفعته من خلقه بعد استضعافه وذلة وانکسارہ وصبرہ و تلقیه القضاء بالرضاء فضلا منه قال الله تعالیٰ وتدید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة

معافی ابن زکریا ابن یحییٰ نے لکھا ہے کہ عمر ابن عبد العزیز نے ایک عالم یہودی سے جو حال میں مشرف با اسلام ہوا تھا دریافت کیا کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بیٹوں میں سے کون تھا جس کے لئے ذبح کا حکم خدا نے دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اے امیر المومنین یہود اس کو بخوبی جانتے تھے کہ وہ آپ کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔ لیکن انھوں نے قوم عرب کے ساتھ حسد کیا کہ تمہارے جد اعلیٰ کے ساتھ وہ فضل و مراتب نہ مذکور و مشہور ہوں جو خدائے سبحانہ تعالیٰ نے انہیں عنایت فرمائے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے انکار کیا اور اپنے زعم میں ذبیح اسحاقؑ کو قرار دیا۔ اس لئے کہ وہ ان کے جد اعلیٰ تھے اس واقعہ میں خلت و خلوص خلیل قابل ملاحظہ ہے اور ایک سر جلیل لائق مشاہدہ اور وہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے خدائے سبحانہ تعالیٰ کا مدعا یہ تھا کہ وہ اپنی قدرت کاملہ سے ضعف و ناتوانی کے بعد اسے قوت و توانائی اور رنج و تکلیف کے بعد آرام و اطمینان کے مناظر دنیا کو دکھلائے اور حقیقتاً حضرت ہاجرہؑ اور ان کے فرزند ارجمند جناب اسمٰعیلؑ کے صبر و تحمل کا یہی صلہ تھا اور یہی اجر ان تمام تکالیف و مصائب کا جو ترک وطن۔ اختیار۔ غربت۔ حصول بے کسی و ناداری کی۔

مختلف صورتوں میں ان بزرگواروں کو آزمائشیں پیش آئیں اور ان پر ان حضرات نے صبر کامل فرمایا اور آخر میں ان کے اس صبر و تحمل کا درجہ اتنا رفیع کر دیا گیا کہ ان کے مراسم و مناسک تمام مومنین کے لئے عبادت، اطاعت الٰہی کے خاص معیار قرار دیئے گئے۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ عادتِ الٰہی بھی ایسی ہی جاری ہوئی تھی کہ خداوند عالم اپنے بندوں کو ان کے ضعف و انکسار۔ تکلیف وقت کے بعد رفعت۔ راحت اور اطمینان عطا فرماتا ہے اور ان کے صبر و سکوت کا یوں اجر عطا فرماتا ہے جیسا کہ آیہ نرید ان نمن الذین الخ کی عبارت سے ظاہر ہے۔ (ملخص از شرح زرقانی جلد اول مطبوعہ حیدر آباد دکن از صفحہ 116 تا صفحہ 121)

بہرحال حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے کے ثبوت میں اتنے متواتر مشاہد تاریخی محققین ومورخین کے مختلف اسناد واشہاد سے مندرج کردیئے ہیں کہ پھر کسی تصدیق وتوثیق کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ مگر اس کے ضمن میں ہم کو ابھی اتنا لکھ دینا اور باقی ہے کہ صورت واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت حال وہی ہے۔ جو اس نو مسلم عالم یہود نے عمر ابن عبدالعزیز کے دربار میں بیان کی ہے۔ ہمارے سید صاحب خود بھی خطبات کے اکثر مقامات پر یہودیوں اور عیسائیوں کی ایسی تحریفات وتلبیسات کو دکھلا چکے ہیں۔ چنانچہ خطبات میں بذیل تحقیق مرقع بیابان فاران اور مقام سکونت حضرت اسماعیلؑ اور نیز تحقیق بشارتہائے نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی توریت وانجیل کی اصل عبارات اور ترجموں میں ایک نہیں کثیر التعداد۔ تحریفات اور غلط معانی۔ جس سے بشارت نبوت آنحضرت صلعم نہ ظاہر ہوسکے۔ یا کم سے کم اس کے اصل مقاصد ومطالب مشتبہ اور مبہم ہوجائیں۔ بتلا چکے ہیں اور ثابت کرچکے ہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود اتنی معلومات کے بھی سید صاحب مرحوم نے اس مسئلہ خاص کے متعلق انھیں یہودیوں اور عیسائیوں کی تصدیق وتوثیق فرمائی اور تصدیق فرمانے کے وقت ان کے ان خودغرضانہ اور مغویانہ تحریفات کا کوئی خیال نہ کیا۔

ان دلائل سے قطع نظر کرکے اگر سید صاحب نے اہل عرب کے۔ اس وقت سے لے کر اس وقت تک کے صرف ان اشعار واخبار کی طرف اعتنا فرمائی ہوتی۔ جو ذبح اسماعیلؑ کے متعلق۔ اتنی کثرت۔ شہرت۔ قدامت اور عقیدت کے ساتھ ان میں اور ان کی نسل اور سلسلوں میں۔ جو عرب کے ماسوا اور تمام اقطاع عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تو ہم کو یقین ہے کہ پھر سید صاحب کو حضرت اسماعیل کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

لطف تو یہ ہے کہ مرحوم سید صاحب نے مناسکات حج وغیرہ کی نسبت۔ ان کے ارشاد ابراہیمی اور اثار اسماعیلی ہونے کا پورا اعتراف فرمایا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے انکار کی تردید میں۔ ان کی قدامت۔ شہرت اور کثرت ہی کی بنا پر استدلال کیا گیا ہے۔ مگر ان تمام مناسکات کے شعار ابراہیمؑ اور اثار اسماعیلی مان لینے کے بعد بھی صرف اس کے ایک شعبہ۔ یعنی واقعہ قربانی کے متعلق۔ اس کا تعلق حضرت اسماعیلؑ سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ہمارے نزدیک سید صاحب کا یہ طریق استدلال بالکل ضعیف ہے۔ آپ نے جب اصول شریعت شہرت اور قدامت سے تمام واقعات میں استدلال فرمایا ہے اسی اصول وطریقہ کو تمام مبحث میں جاری وقائم رکھنا آپ کے لئے ضروری ولازمی تھا۔ نہ یہ کہ بعض طرق مبحث میں تو ایک اصول سے بحث کی جائے اور دوسرے طریق مبحث اور جزو مسئلہ میں وہی اصول ناکافی اور غیر معتبر سمجھے جائیں۔ یہی دور ہے جو علمائے منطق علم کلام میں سخت معیوب بتلاتے ہیں۔ ہم ذیل میں سید صاحب کے ان تغیرات فی المختارات کی مثال لکھ کر دکھلا دیتے ہیں۔ جسے دیکھ کر اور پڑھ کر ہر شخص سمجھ لے گا کہ سید صاحب نے عرب کے قدیم شعار اور رسم ورواج تک کو کس یقین۔ وثوق اور اعتبار کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے سکوت یا انکار کے مقابلہ میں ان کو کیسا معتبر اور کتنا مستند تسلیم کیا ہے۔

جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے باب میں ہیں وہ نہایت معتبر ہیں۔
کیونکہ عرب اپنے رسوم آبائی اور اوضاع واطوار کے بدرجہ غایت پابند تھے۔ اور ان کو

کبھی ترک کرنا یا تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے نسب نامہ کو یاد رکھنا قریب قریب اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا جدا جدا نام رکھتا تھا۔ اور اس ذریعہ سے ہر شخص اپنی قوم وقبیلہ کو خوب جانتا تھا۔ اور اپنے حسب ونسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا۔ خطبات مطبوعہ لاہور ص35۔

پھر اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے میں ہیں ان کے رسوم کا علم مندرجہ ذیل امور سے ہوتا ہے۔ (۱) بعض اوقات جب کسی سے قوم کی رائے میں کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس کی ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا ہوتا تھا۔ میدان جنگ میں کوئی جنگ اور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب نسب باآواز بلند نہ دریافت کر لے۔ تنہا لڑائی میں مصروف نہیں ہوسکتا تھا۔ (۲) کسی عام مہم میں ہر شخص اپنی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا۔ عرب میں جرمانہ کا رسم نہایت قدیم ہے اور آجتک الدیۃ علی العاقل کی اصطلاح خاص مشہور ومعروف ہے۔ (خطبات ص37)

پھر اسی سلسلہ میں رقمطراز ہیں۔

حضرت اسماعیلؑ کی عمر۔ جبکہ ان کے باپ نے ان کو گھر سے نکال دیا تھا۔ توریت کے مطابق سولہ برس کی تھی اور یہ عمر ایسی تھی جو روایتیں انہوں نے اپنے والد سے سنی تھیں ان کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد رکھنے کے قابل تھیں۔ اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیمؑ بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ انجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جن کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی۔ بروقت وفات (حضرت ابراہیمؑ اپنے والد کے)۔ ان کے پاس موجود تھے۔ یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہوں گی کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف عرب میں اس قدر شائع ہیں۔ لوگوں کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے پہنچی ہیں۔ اور یہ امور ایسے بدیہی اور ذہن نشین ہونے کے لائق ہیں کہ اگر پھر کوئی شخص یہ کہے کہ اہل عرب کو یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہنچی ہیں تو اس کو سن کر کچھ کم تعجب نہ ہوگا۔ (خطبات ص39)

پھر آئندہ صفحہ میں مرقوم ہے:

عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت سے اپنی اصل روایتوں میں بھی کوئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے وہ بالکل علیحدہ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ہمراہ وہاں آ کے آباد ہوئے۔ تو قدیمی عرب ان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب مستعربہ سے ان کو ملقب کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہل عرب سے بنی اسماعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے تھے۔ اور قدیم عرب نے اپنی روایتوں کا ان سے مبادلہ نہیں کیا اور اس لئے بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہیں تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیائے بنی اسرائیل برحق تھے اور ان پر ایمان لانا چاہیے۔ اس وقت سے بنی اسرائیل اور ان کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہیں تھیں اس لئے عرب کی روایتیں بجائے خود ہمیشہ برقرار رہیں۔ (خطبات ص 40)

پھر دوسرے مقام پر مندرجہ ذیل عبارت قلمبند ہے:

کسی راوی نے یہودیوں کی روایتیں بیان کیں اور سننے والے نے غلطی سے اسے حدیث سمجھ لیا اور اسی ذریعہ سے یہودیوں کی روایات کا اختلاف مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو گیا۔ اگلے نبیوں اور بزرگوں کے قصے جن سے ہمارے ہاں کی تاریخیں اور تفسیریں سیاہ ہیں سب انھیں ذریعوں سے پیدا ہوئے۔ خطبات ص 35

پھر آگے تحریر فرمایا جاتا ہے۔

مخالفین اسلام نے جو اس زمانہ میں زیادہ تر یہودیوں اور مشرکین تھے۔ ان لوگوں نے بہت سی باتیں سچ اور جھوٹ آنحضرت صلعم کی نسبت مشہور کر رکھی تھیں اور وہ عرب میں پھیل گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ بطور روایت کے بیان ہونے لگیں۔ اور لوگوں نے غلطی سے ان کو حدیثوں میں شمار کر لیا۔ (خطبات ص 353)

عبارات تورات اور انجیل کی غلطیوں کے اعتراف میں تحریر ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت کی عبارت اور الفاظ میں غلط طور سے تعبیر کئے اور اس

سب سے وہ غلطیاں ہوئیں کہ خود توریت کے قدیم نسخوں میں جو کوڈیس کہلاتے تھے اور قلمی تھے۔ متعدد وجوہ سے غلطیاں رہ گئیں تھیں اور پھر جن لوگوں نے مقابلہ کر کے ان کو صحیح کیا ان کی تصحیح بھی غلطیوں سے خالی نہ تھی۔ اور سب سے بڑا سبب ان غلطیوں کا یہ ہوا کہ وہ تاریخی واقعات جو انسانوں نے بغرض تسلسل مطلب حضرت موسیٰؑ کے کلام کے ساتھ جدا لکھے تھے۔ اور جن میں بلا شک بہت سی غلطیاں تھیں۔ ان کو بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے مقدس تحریر سمجھا تھا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدائے پاک کے بندوں۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت لوطؑ اور ان کے بیٹوں۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام۔ حضرت یہودیاؑ اور حضرت یعقوبؑ کے پوتوں اور بیٹوں اور ہارونؑ۔ اور داؤد و سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی مٹی خراب رہتی۔ جیسے ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے۔ تمام دنیا کی نظروں میں ویسے ہی حقیر ہوتے۔ جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں۔ جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں۔ یا ان کو ان کے گناہوں کی سزا کے لئے ان کو سولی پر چڑھاتے ہیں صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے۔ جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی اس حد تک دنیا میں پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے۔ (خطبات ص203)

سرسید کی مرقومہ بالا تحقیقات سے اہل عرب کی مرویات کا وثوق اور اعتماد کماحقہ ثابت ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی معلومات کا تسلسل اور نسلاً بعد نسلاً اس انتظام احتیاطی کے ساتھ مختلف قبائل وعشائر میں ان کا محفوظ رکھنا کہ ان کی اصلیت اور حقیقت میں کوئی خودغرضانہ اضافہ ناممکن ہو۔ کافی تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگیا۔ باوجود ان تحقیقات اور اعترافاتِ خاص کے بھی اس مسئلہ میں۔ نہیں معلوم سید صاحب نے اہل عرب کی مرویات کو پھر کس وجہ سے ناقابل اعتبار سمجھا اور ان کے بیان پر کوئی توجہ نہ فرمائی۔ بخلاف ان یہودیوں اور عیسائیوں کی مغویانہ مرویات کو امنا وصدقنا کہہ کر تسلیم کر لیا۔ جن کے لغویات اور مہملات کو خصوصاً انبیاعلیہم السلام کی پاک سیرتوں کے متعلق اس زور وشور سے اپنے تنقیدانہ مضامین تحقیق میں ابھی بھی خود تحریر فرما چکے ہیں۔ اس کا باعث جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں اوپر لکھ چکے ہیں سوائے اس کے کہ کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ سید صاحب نے اہل کتاب کے اتفاق اور مفسرین ومحدثین کے اختلاف کی بنا پر اپنی رائے قائم کی ہے۔ جن میں سے ہم ہم دونوں شعبوں کی تردید وتنقید پورے طور سے اوپر مندرج کر چکے ہیں۔

اول تو ہم نے تورات کی اصلی عبارات سے جو ثبوت مستنبط کئے ہیں وہی کافی طور سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ ثابت کرتے ہیں۔ گو ان پر اغوا اور عالم فریبی کے غلاف ضرور چڑھائے گئے ہیں۔ مگر جب تحقیق کا متلاشی ان قرائن کو واقعات اور اصلی حالات سے ملائے گا تو تورات کی بشارتیں اور ان کے تمام قرائن حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ منطبق پائے گا۔ نہ جناب اسحاقؑ کے ساتھ۔

دوسرے ان اصول کے مطابق جو سید صاحب نے علم تفسیر۔ حدیث۔ سیرت۔ تاریخ وغیرہ وغیرہ کی تحقیق و تنقید کے متعلق اپنے خطبات میں بڑے بڑے علمائے متکلمین کے اقوال سے نقل فرمائے ہیں۔ اتفاق اہل کتاب کے مسئلہ خاص کی حیثیت انھیں علماء کے نظریات سے خود سمجھ لیں کہ تمام علمائے محدثین کا مسلمہ ہے کہ الا تفاق اھل الکتاب لیس له اعتبار۔ اتفاق اہل کتاب قابل اعتبار نہیں۔ (زرقانی جلد اوّل)

اب سید صاحب مرحوم۔ ایسے پکے مسلمان ہو کر اس اتفاق پر اعتبار فرمائیں تو اس کو ان کی تحقیقات کی خامی اور حقیقت امری سے ناکامی کے سوا اور کیا کہا جاوے۔ اتفاق اہل کتاب کی تو یہ کیفیت تھی۔ علمائے اسلام کے اختلاف کا باعث ہم اوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں۔ جس شبہ میں سید صاحب پڑ گئے ہیں۔ اسی مغالطہ میں وہ حضرات بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان کے تمام مرویات کی تنقید پوری تفصیل کے ساتھ قلمبند ہو چکی ہیں۔

اس ضمن میں حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا مصنوعی واقعہ بھی حضرت اسماعیلؑ کے صحیح اور اصلی واقعہ قربانی کے ساتھ خلط ملط ہو گیا اور نقل کرنے والے نے کمی تحقیق اور عدم واقفیت کی وجہ سے اس کو بھی حدیث رسولؐ ہی سمجھ لیا اور اپنی اپنی تصنیفات و تالیفات میں ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کر دیا۔ بعض علمائے اہل اسلام کو حضرت اسماعیلؑ کے ذبیح اللہ حقیقی ہونے میں جو شبہ واقع ہوا۔ اس کی وجہ یہی تھی۔ جو اوپر لکھی گئی۔

قربانی کی حقیقت میں مولانا شبلی صاحب کی نئی اور قیاسی تاویل

ہم سید صاحب کی غلط فہمی کی کامل تنقید و تصحیح ختم کر کے اب ہم شمس العلماء مولانا شبلی صاحب ایک تازہ تخیل اور جدید تاویل کی تفصیل و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مولانا شبلی صاحب (چار ہزار برس کے بعد تقریباً) اس واقعہ قربانی کو خدا کا امر تمثیلی قرار دیتے ہیں اور اپنے موجودہ نظریہ کو قربانی کی حقیقت کے خاص عنوان سے مفصلہ ذیل عبارت میں ظاہر فرماتے ہیں۔

> اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا اس سے اصلی مقصود کیا تھا قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنی اولادوں کو اپنے معبود پر بھینٹ چڑھایا کرتی تھیں۔ یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا۔ لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ اکابر صوفیہ نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو خواب دکھلائے جاتے ہیں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عینی اور تمثیلی۔ عینی میں بعینہ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھلایا گیا ہے اس سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھادیں۔ یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں۔ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کردئے جائیں۔ تورات میں جابجا قربانی کا لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی۔ گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی۔ جو انبیاؑ سے ہوسکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر انہیں متنبہ کردیتا ہے) اس بنا پر گو حضرت ابراہیمؑ اس فعل سے روک دیئے گئے۔ لیکن خدا نے ان کے حسنِ نیت کی قدر کی، اور فرمایا کہ قد صدقت الرویا ان کذالك نجزی المحسنین۔ تو نے اپنے خواب کو سچا کردکھلایا۔ ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔
>
> بہرحال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا۔ نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل ہوئے تھے۔ خدا کے سامنے تھے تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔ لیت اسماعیل

يعيش امامك۔ کاش اسماعیل تیرے سامنے زندگی گزارتا۔ اسی خواہش کے مطابق ان کوخواب تمثیلی کے پیرایہ میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کریں۔ (سیرۃ النبی ص106و107 جلداول)

یہ ہمارے مولانا شبلی صاحب کی طبع عزا ونو ایجاد تاویل۔ جو ان کے اس نظریہ ومعیار سے بالکل خلاف ثابت ہوتی ہے۔ جس کو انھوں نے اصول تاریخ وسیرۃ نویسی کی نسبت اپنے دیباچہ کتاب میں نہایت شدو مد اور بڑی جدوکد سے قائم فرمایا ہے۔ اور یہ التزام و انتظام صرف زبانی دعوؤں میں ظاہر طور پر اپنی کتاب میں قائم رکھے جانے کا اقرار فرمایا ہے کہ کوئی واقعہ تاریخی۔ جب تک کسی حدیث سے نہ ملا لیا جائے اور حدیث بھی کون۔ صحیح ومرفوع اور وہ صحیح ومرفوع بھی کون۔ وہ جو کتب صحاح میں وارد ہو۔ کتب صحاح میں کون کتاب۔ صحیحین شریفین اور صحیحین شریفین میں بھی کون۔ صحیح بخاری (مطلب سعدی ہمیں بود) میں ہو۔ تب تک وہ واقعہ اسلامی تاریخ میں درج کئے جانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔

مگر جہاں تک آپ کے اس شرط واقرار پر غور کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی صاحب نے اپنی اسنادواشہاد کے لئے کوئی حدودو قیوم قائم نہیں رکھے۔ بلکہ اپنے اسلاف کی تقلید میں جہاں سے اور جس کسی سے بھی آپ کو اپنے مطلب کی بات مل گئی۔ آپ کے لئے بس وہی وحی آسمانی ہوگئی۔ پھر اس وقت نہ صحیح بخاری سے تحقیق کی ضرورت رہی اور نہ صحیح مسلم سے تصدیق وتطبیق کی حاجت بیثال کے لئے اکبر صوفیہ کی بلاسند اور غیر مقید اقوال کو خاص کر ایک ایسے مبحث اور مقصد کا اصل الاصول قرار دینا۔ کافی ہے جو اس وقت سے لے کر اس وقت تک تمام فرقہائے اسلامی میں سے کسی فرقہ اور مذہب کے عالم اور محدث نے کہیں بھی نقل نہیں کیا ہے اور جو بالکل معانی ومطالب قرآنی کے مخالف اور ارشاد واقوال رسول صلعم کے معارض ثابت ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ فاضل محقق نے کہیں تو اپنی تحقیق وتفتیش کے حدود احتیاط کو مقدمہ کتاب میں اس قدر تنگ محدود کر دیا تھا کہ وہ اپنے ماخذوں میں سوائے چند قدیم عربی تاریخوں اور چیدہ چیدہ کتب صحاح کے اور کسی اسلامی تاریخ۔ حدیث اور سیر کی کتابوں سے استنباط و استخاذ کو گویا حرام فرمادیا ہے۔ کہیں اپنی اتنی بڑی اعلیٰ اور یکتا تحقیق میں۔ ادھر ادھر کے بے نام ونشان اسناد کی بھرتی کرنے لگے کہ ان کا شمار۔ صحیح موثق اور حسن وغیرہ میں کہاں تک ہوگا۔ مرسل۔ غریب۔ ضعاف اور احاد میں بھی داخل نہیں ہوسکتے۔

یہ بھی کوئی سند ہے کہ ''اکابر صوفیہ کا قول ہے'' استغفر الله۔ یہ اس پایہ کے شخص کی سند ہے جو تمام مستندین کے مقابلہ میں اپنی تحقیق وتلاش کو سب سے زیادہ معتبر ومستند بتلاتا ہے۔ اور جو اپنے مقدمہ کتاب میں اپنی ظاہری شوکت الفاظ سے اور صرف زبانی سخن آرائیوں سے کسی تاریخ واقعہ کو تاوقتیکہ احادیث مندرجہ صحیحین سے منطبق نہ کرلے۔ قابل اندراج نہیں سمجھتا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ لا حول ولا قوة الا بالله۔

بہرحال مولانا شبلی کو اپنے اختیار کردہ طریقہ استخراج واستنباط کے بدلتے وقت اپنے اصل مدعائے حقیقت کو اگر نصوص الٰہی اور منشور حضرت رسالت پناہی سے منطبق کرلینے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ تو کم سے کم ان کو علماء محدثین اکابر مفسرین اور عمائد مؤرخین ہی کے

اقوال وآراسے ملا لینا تو ضرور تھا۔ اور اگر کسی تفسیر، مسند، سنن اور صحیح میں دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی تو اپنے مدعا کی تلاش صرف صحیح بخاری ہی میں کر لی گئی ہوتی۔ کیونکہ آپ کی تمام کائنات تحقیقات ومعلومات تو اسی کتاب پر ختم ہے۔ مگر نہیں معلوم۔ مولانا صاحب کو اکابر صوفیہ کے اس بلا سند قول پر کیسا فوق البشری جوش عقیدت آ گیا کہ اس تلاطم خیز عالم وجد میں۔ قرآن۔ حدیث اور اصح الکتاب بعد کتاب البخاری بھی بالکل نسیاً منسیاً ہو گئی۔

علمائے کرام اسلام میں فریقین کے تمام متقدمین مفسرین محدثین اور مؤرخین سے لے کر متاخرین تک کی کثیر التعداد۔ قوی الاسناد تالیفات وتصنیفات اس وقت میرے پیش نظر ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم انھیں سے کسی ایک کو بھی مولانا شبلی کا ہم خیال نہیں پاتے۔ کسی مفسر۔ محدث اور مؤرخ نے اس وقت سے لے کر اس وقت تک قربانی کے واقعہ میں عینی اور تمثیلی کی دو جداگانہ شاخیں نہیں نکالیں۔ اور اس نبی برحق حکمت الٰہی کے مصدق پر۔ اصل مطالب ومقاصد وحی کے سمجھنے میں غلطی کا الزام نہیں لگایا۔ اور نہ اپنے کسی عقلی ونقلی بیان میں۔ کسی ضعیف سے ضعیف اور احاد سے احاد طریقہ روایت سے بھی اشارتاً و کنایتاً ذکر نہیں فرمایا۔

تحظیہ انبیا علیہم السلام کا مسئلہ مولوی صاحب کے ہاں ایک اختلافی مسئلہ ضرور ہے۔ مگر قاضی عیاض اور امام فخر الدین رازی اس کو بہت کچھ صاف بھی کر چکے ہیں۔ اس اختلاف اور اشباہ بین النفی والایجاب کی رو سے۔ اگر شبلی صاحب حضرت ابراہیمؑ کے خطا کرنے کے قائل ہیں۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور مجھے ان کے خاص عقائد میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مگر جو کچھ کلام ہے اور جو کچھ افسوس ہے وہ مولانا شبلی صاحب کی اسلامی عقائد سے عدم واقفیت پر۔ جو آج تک انبیا اور مجتہد کا بھی فرق نہیں جانتے ہم ان کی یاددہانی کے لئے۔ انھیں کی کتاب الکلام سے صرف دو شہادتیں جو صفات نبوت کی تحقیق میں لکھی گئی ہیں ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں۔ علم الکلام حصہ دوم میں شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ کہ امام غزالی نے احیاء العلوم کے شروع میں ایک ضمنی بحث میں لکھا ہے۔

و کیف ینکر تفاوۃ العزیزۃ ولولا لما اختلفت الناس فی فھم العلوم ولما انقسموا موالی بلید لا یفھم بالتفھیم الا بعد تعب طویل من المعلم والی ذکی یفھم باذنی رمز و اشارۃ والی کامل ینبعث من نفسه حقائق الامور دون التعلم کما قال تعالیٰ یکاد زیتھا یغیء ولولم تمسسه نار۔ نور علی نور و ذالك مثل الانبیاء علیھم السلام۔ اذا یتضح لھم فی بواطنھم امور غامضة من غیر تعلم و سماع و یعتبر ذالك بالالھام وعن مثله عبر النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم حیث قال ان روح القدس نفث فی روحی۔

فطرت کے تفاوت کا کیونکر انکار ہوسکتا ہے۔ یہ تفاوت نہ ہوتا تو علوم کے سمجھنے میں اختلاف مراتب کیوں ہوتا۔ اور یہ بات کیوں ہوتی کہ بعض آدمی ایسے کیوں ہوتے ہیں جو استاد کے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے

ہیں اور سمجھتے بھی ہیں تو مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اور بعض ایسے ذہین ہوتے ہیں کہ ذرا سے اشارہ میں سمجھ جاتے ہیں اور بعض ایسے کامل ہوتے ہیں کہ خود ان کی طبیعت سے حقائق امور پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کہا ہے۔ یَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ۔ اور انبیاعلیہم السلام کا یہی حال ہے۔ ان کے دل میں دقیق باتیں خود بخود بغیر سکھانے اور سننے کے روشن اور ظاہر ہوجاتی ہیں اور اسی کو الہام کہتے ہیں اور اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ روح القدس نے میری روح میں پھونکا۔ علم الکلام ص100

امام غزالی کے قول کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ محدث ابن جزم نے نبوت کی یہ حقیقت بیان کی ہے کہ بغیر تعلم وتعلیم کے حاصل کرے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

فصح ان النبوۃ فی الامکان وھی بعثۃ قوم قدخصھم اللہ تعالیٰ بالفضیلۃ لا لعلۃ الا انہ شاء ذلك فعلمھم اللہ العلم بدون تعلم ولا تنقل فی مراتبہ ولا طلب لہ ومن ھذا الباب مایراہ احدنافی الرویافیخرج صحیحا

یہ بات ثابت ہوئی کہ نبوت ممکن ہے اور نبوت کے معنی یہ ہیں کہ خدا ایک گروہ کو مبعوث کرتا ہے اور ان کو فضیلت کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے۔ نہ کسی علت کی وجہ سے بلکہ صرف اپنی مرضی کی وجہ سے خدا ان کو علم سکھلاتا ہے بغیر سیکھنے کے اور بغیر درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور بغیر طلب کے اور یہ اسی طرح کی بات ہے۔ جس طرح ہم لوگ خواب میں کچھ دیکھتے ہیں اور صحیح نکل آتا ہے۔

پھر اسی سلسلہ میں محدث ابن جزم کا بقیہ قول لکھا ہے:

فوجب بالضرورۃ انہ لا بدمن انسان واحدفا کثر علیھم اللہ ابتداء کل ھذا دون معلم لکن بوحی حققہ عندہ وھذہ الصفۃ النبوۃ

یہ بات ضرور ٹھہری کہ ایک یا ایک سے زیادہ اس قسم کے لوگ پائے جائیں۔ جن کو خدا نے یہ علوم وصنائع ابتداً بغیر کسی معلم کے خواہ اپنی وحی سے سکھلائے اور یہی نبوت کی صفت ہے۔ علم الکلام ص102

کیا شبلی صاحب کسی مجتہد کو ان اوصاف مخصوصہ اور کمالات منصوصہ کے ساتھ موصوف ہونا۔ قیامت تک ثابت کر سکتے ہیں۔ لا واللہ۔

افسوس ہے کہ ابھی تک شبلی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ انبیاء علیہم السلام ان فروگذاشتوں کو اصطلاح شرعیہ میں کیا کہتے ہیں۔ اور معمولی علما و مجتہدین کی عام غلطیوں کا کیا نام ہے۔ یہاں تک تو فریقین کا مسلم ہے کہ انبیا علیہم السلام مجتہد نہیں۔ کیونکہ ان پر بلا فصل وواسطہ وحی الٰہی اترتی ہے۔ اور ان کی تمام معلومات احکام وارشاد۔ افعال واقوال تعلیم وحی کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ سوائے روحانی اور آسمانی

بشارتوں کے کسی انسانی ذریعہ وواسطہ کے متبع اور محتاج نہیں ہوتے ۔ ان کی معلومات وہبی ہوتی ہیں، نہ کسبی ۔ مجتہد تو نبیؐ اور اس کے بعد لگا تار ان تمام جائز الخطا انسانی ذریعوں اور بے شمار طریقوں کے نقل واتباع کا متبع اور مقلد ہے ۔ جس نے اپنی معلومات کو غیر مقید اور غیر محفوظ الخطا ذرائع ووسائل سے حاصل کیا ہے ۔ اگر شبلی صاحب کے ایسے انبیا کو مجتہد تسلیم کر لیا جائے ۔ تو تمام دنیا کے علما و مجتہدین کو گھر بیٹھے نبوت مل جائے اور پھر نبیؐ اور مجتہد کا فرق مابہ الامتیاز دشوار ومحال ہو جائے ۔

ہمیں افسوس ہے کہ مناسبت مقام ہمیں مناصب نبوت ۔ مدارج رسالت اور درجہ اجتہاد کے باہمی امتیاز و اختلاف اور ان کی حقیقت وماہیت جداگانہ کی تفصیلی کیفیت درج کرنے کی فی الحال اجازت نہیں دیتی ۔ ورنہ ہم مولانا صاحب کو حقیقت حال کا پورا مکاشفہ اور مشاہدہ کرا دیتے ۔

قبل اس کے ہم شبلی صاحب کی اس غلط تاویل پر تنقید و تردید کا قلم اٹھائیں ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم مولانا صاحب جیسے جدید محقق کا ایسی عامیانہ فہمی کا اصلی سبب دریافت کر لیں ۔ ہم آپ کی اس غلط تاویل کی جب پوری عبارت پڑھتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ اس کی اس غلط فہمی کا باعث بھی وہی اہل کتاب کی کورانہ تقلید اور علمائے تصوف کے ظنیات کی بے موقع تائید ہے ۔

جب اہل کتاب کے متعلق تبدیلی واقعات اور تغیر حالات کی وجہ تحقیق کی جاتی ہے تو پورے طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ بیت المقدس پر چڑھانے یا اس کی خدمتوں کے لئے وقف کر دیے جانے کے رسم ورواج یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں جاری تھے ۔ اور ان کے انہیں حصول موضوعہ سے محرر ۔ مجرد اور حصور کے جداگانہ طبقے اور فرقے قائم ہوئے ۔ اور آگے چل کر انہیں کی بنا پر رہبانیت شریعت عیسوی میں جزو مذہبی قرار پا گئی ۔ اس لئے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس قربانی کو عموماً انہیں معنوں میں سمجھا اور دنیا کو سمجھایا ۔ اور خصوصاً اپنے تعصب ونفسانیت کی وجہ سے خاص کر ایسی غلط تاویل کے لئے وہ مجبور ہوئے کیونکہ حضرت اسحاقؑ کے متعلق کسی طرح واقعہ ذبح ثابت نہیں ہوسکتا تھا ۔ نہ اصل واقعہ قربانی کو ان سے کوئی واسطہ تھا اور نہ اس کے متعلق ۔ سعی ۔ طواف اور رمی الجمرات وغیرہ کے مناسکات کو ان سے کوئی تعلق تھا ۔

یہ دیکھ کر یہودیوں اور عیسائیوں نے کہ اصل واقعہ کو ۔ جزواً یا کلیتاً ۔ حضرت اسحٰقؑ سے کوئی مناسبت یا مطابقت نہیں ہے ۔ اصل واقعہ کی عملی صورت سے انکار کر دیا اور اس کو ایک دوسری صورت خاص میں بدل دیا ۔ مگر دروغگو را حافظہ نباشد ۔ اس غلط تبدیلی واقعہ کے وقت اس کا خیال ہی نہیں رہا کہ قربانی کی یہ صورت تو حضرت ابراہیمؑ سے ڈیڑھ ہزار برس بعد ۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیانی زمانہ کی ایجاد ہے ۔ اس سے قبل تو تورات میں بھی کہیں اس کا نام ونشان نہیں پایا جاتا ۔ پھر ایک ایسی صورت حال کو حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے زمانہ کی طرف منسوب کرنا سوائے تعصب اور جہالت کے اور کیا ہوسکتا ہے ۔

حقیقت حال سے ناواقفکاروں اور تعصب ونفسانیت کے قلمکاروں نے ۔ ذبیح اور قربانی کی اصلی اور عملی صورت کو ۔ انذار اور احرار کی صورت وشکل میں تبدیل کر دیا ۔ جو بمقابلہ ذبح ۔ عام فہم اور بالکل قریب الامکان تھی ۔ حسن اتفاق سے اہل تصوف نے بھی اپنے ظاہری ترک تعلق کی پرجوشیوں میں تجرد اور رہبانیت کے طریقوں کو اختیار کیا ۔ اور لا رھبانیۃ فی الاسلام کی تاکید پر کوئی اعتنانہ

فرمائی نہ خدا کے حکم و ہدایت پر کوئی توجہ کی۔ اور نہ رسول کی خاص سیرت پر کوئی نظر۔

شبلی صاحب نے اہل کتاب اور اہل تصوف کے اس غلط اتحاد فی الخیال سے یہ دھوکا کھایا ہے۔ ورنہ اگر مولانا شبلی کورانہ تقلید چھوڑ کر آزادانہ تحقیق سے کام لیتے تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ حریت یا خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دیے جانے کی خدمت اور عملی صورت نص الٰہی اور حکم رسالت پناہی سے مستنبط و مستخرج ہوتی اور جواز کا حکم رکھتی۔ آپ کا رسول آپ کا نبیؐ برحق۔ جو مذہب ابراہیمی کا مروج اور شریعت اسماعیلی کا اصل مجدد تھا۔ اور جس نے اسلام کو ملة ابیکم ابراھیم هو الذی سمکم المسلمین۔ (اسلام) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب ہے۔ اسی نے تمہارا نام مسلمان) کی بشارت پہنچا کر شریعت ابراہیمی اور اسلام کو فی صلہ ایک ہی بتلایا تھا۔ تو اس کے لئے ضروری تھا کہ اس نے اپنے عہد رسالت میں۔ جس طرح شریعت ابراہیمی کے اور ارکان۔ قربانی مناسکات۔ حج اور دیگر اخلاقی اور مذہبی مراسم وعقائد کواز سرنو زندہ کر کے اسلامی شریعت میں داخل فرمایا تھا۔ اسی طرح خدمت کعبہ کے لئے وقف اولاد والے مسئلہ کی بھی تعلیم فرما دیتا اور اپنے اقوال وارشاد میں۔ جناب ابراہیمؑ کی اس غلطی اور سوءفہمی (معاذ اللہ) کو اشارتاً کنایتاً بیان کر کے واقعہ ذبح کی حقیقت الامری کا (شبلی صاحب کی طرح) پورا انکشاف کر دیتا۔ مگر نعوذ باللہ۔ رسول اللہ سے بھی اتنی بات رہ گئی۔ جس کو شبلی صاحب اور ان کے اکابر صوفیہ نے خیر پورا کر دیا۔ مگر ہم کہتے ہیں رسولؐ سے کیا معاذ اللہ یہ بات خدا سے بھی رہ گئی۔ کہ اس نے (نعوذ باللہ) یہ سمجھ کر بھی کہ ہمارا محدود عقل والا رسولؐ۔ علم الرویا کے اقسام واصناف اور ان کے اختلاف کی تمیز و معرفت نہیں رکھتا تاہم اس کو مدعائے حقیقت اور منشائے قدرت سے مطلع اور آگاہ نہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کا شیدائی اپنی غلط فہمی اور لاعلمی سے۔ اتنے بڑے خلاف فطرت انسانی۔ قتل اولاد کی شقاوت و بے رحمی پر جرأت کر بیٹھا۔ تب اس وقت خدا کو رسول کی فروگذاشت کے ساتھ اپنی خاموشی اور عدم اطلاع دہی کا خیال آیا۔ اور اس کو قتل عمداً کے ارتکاب سے روک دیا۔ مگر روک دیئے جانے کے وقت بھی خدا کو اصل حقیقت کے انکشاف فرما دیئے جانے کا خیال نہ آیا۔ ارشاد ہوا تو یہ قد صدقت الرویا و کذالك نجزی المحسنین۔ تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھلایا اور ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ اس سے بھی خواب عینی اور تمثیلی کی حقیقت بتلائی جانے کی کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی۔

خدا کا فرض تھا کہ اس قیامت خیز منظر کے وقت یا بعد اپنے رسول کو سمجھا دیتا اور بتلا دیتا اور رسولؐ پر واجب تھا کہ اپنے نذر چڑھائے ہوئے بیٹے کو اس دن سے کیا اسی وقت سے خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دیتا اور اس مقدس چار دیواری کے اندر لا کر بٹھلا دیتا اور پھر اس کو سوائے خدمت کعبہ کے اور کسی شغل میں مصروف نہ ہونے دیتا۔ جیسا کہ مولانا شبلی نے بمطابقت احکام تورات۔ نذر یا قربانی چڑھائے ہوئے۔ لوگوں کے اصول وقواعد بتلائے ہیں۔

مندرجۂ بالا واقعات وحالات میں سے ایک واقعہ بھی حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ کے احوال معاشرت کے متعلق اہل عرب کے کسی اخبار وآثار میں نہیں پایا جاتا۔ اور کسی محدث یا مؤرخ نے اشارتاً یا کنایتاً بھی ان لغویات ومہملات کا۔ جو شبلی صاحب کی جدت وجودت کا تازہ نمونہ ہے۔ ذکر نہیں کیا ہے اگر واقعہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ مولانا شبلی نے اکابر صوفیہ کے کابوسانہ مکاشفات سے اقتباس فرمایا ہے۔ تو پھر حضرت اسماعیلؑ کے طرز معاشرت بھی ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے قوم بنی اسرائیل میں۔ محرر بن بیت المقدس کے طرز زندگی

معلوم ہوتے ہیں۔

بخلاف اس کے جب ہم حضرت اسماعیلؑ کے حالات پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ۔ استغفر اللہ۔ نہ محرر تھے نہ مجرد۔ ایک چھوڑ دو دو بی بی والے تھے۔ چنانچہ ان کی پہلی شادی تو بروایت تورات۔ خود حضرت ہاجرہؑ نے کر دی تھی۔ دوسری بی بی حضرت ابراہیمؑ کے حکم وایما سے کی تھی۔ چنانچہ ہم اس کا پورا واقعہ صحیح بخاری کی عبارت سے اوپر لکھ چکے ہیں اور خلاصہ ترجمہ اس کا بقدر ضرورت پھر ذیل میں لکھ دیتے ہیں۔

> جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کی غیبت میں تشریف لائے اور ان کی پہلی بی بی کے اکرام ضیف اور دیگر خوش اخلاقیوں میں کمی پائی۔ تو ان کی بی بی سے فرما گئے کہ جب اسماعیلؑ شکار سے واپس آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کے کواڑ بدل ڈالو۔ حضرت اسماعیلؑ کی واپسی پر ان کی بی بی نے حقیقت حال ان سے بیان کر دی۔ حضرت اسماعیلؑ نے ان سے کہا کہ کواڑ کی تبدیلی کا حکم نہیں ہے بلکہ تمہاری تبدیلی کا فرمان ہے اسی وقت ان کو جدا کر دیا۔ اور بنی جرہم سے ایک معظّمہ کو اپنے عقد ازدواج میں لائے۔

انہیں بی بی سے آپ کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ جیسا کہ تورات میں ان کی یہی تعداد ان کے ناموں کے ساتھ درج ہے۔ اس کے علاوہ تورات میں خدا تو حضرت ابراہیمؑ کو پہلے ہی سے آپ کے کثیر الاولاد اور پھر ان کے امت عظیم ہونے کی بشارت دے چکا تھا پھر آپ کا محرر ہونا۔ جو نذر کردگانِ خانہ مقدس کے شرائط میں ایک ضروری اور واجب التعمیل شرط تھی۔ حضرت اسماعیلؑ پر کیسے منطبق کی جائے گی۔ آپ کا یہ طریق معاشرت محرران بیت المقدس کی عادت وسیرت کے بالکل خلاف ثابت ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت تک مجرد رہنے کی شرط اس کے لئے خاص نہیں ہوئی تھی اور یہ بعد میں لازمی قرار پائی جیسے یحییٰ اور مریم علیہما السلام کے لئے۔ تو ہم اس کو بھی تھوڑی دیر کے لئے مان کر یہ دکھلائیں گے کہ جیسا کہ شبلی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں۔'' کہ مراد یہ ہے کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھاویں یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیے جائیں۔'' حضرت اسماعیل نے اس کی بھی تو مطلق تعمیل نہیں کی اور نہ کبھی ان قیود پر اعتنا فرمائی۔ واقعات تو یہ بتلا رہے ہیں کہ وہ کعبہ اور کعبہ کی تمام خدمات کو چھوڑ کر۔ دن بھر باہر شکار کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں بار تشریف لانے کے وقت آپ صبح سے شکار کو گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ بخاری شریف کے الفاظ **ذھب بصید** سے ظاہر ہے۔ تو اب مولانا شبلی کی یہ مقررہ شرط وقید کہ وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں۔ حضرت اسماعیلؑ کی نسبت کہاں ثابت ہوتی ہے۔ شبلی صاحب کے قیاسی اقتباسات کے خلاف حضرت اسماعیلؑ تو ان حالات مندرجہ بخاری شریف سے۔ شکار ایسے معمولی کاروبار اور لہو ولعب میں روزانہ مصروف ومشغول پائے جاتے ہیں۔ تعجب ہوتا ہے۔ یہ کیسے خادم کعبہ تھے اور ان کی خدمت کیسی خدمت کعبہ تھی۔ ان سے زیادہ تعجب تو حضرت ابراہیمؑ کے تغافل وتساہل پر ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے قربان شدہ اور وقف کردہ لڑکے کو ایک بار نہیں کئی بار۔ خدمت کعبہ

کو چھوڑ کر شکار کر کے ایسے لہو ولعب میں مصروف ومشغول سن کر اور پا کر بھی۔ ان کو منع کرنے اور باز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور ان کے ایسے صریح خلاف معاہدو شرایط احوال وافعال سن کر تنبیہہ بھی فرمائی تو یہ کہ تمہاری یہ بی بی اچھی نہیں دوسری بدل ڈالو۔

حضرت اسماعیلؑ کے مشاغل صید وشکار میں مصروفیت۔ آپ کے طرز معاشرت کے ساتھ ایسی مخصوص اور قدیم ہے کہ توراتِ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ حضرت اسماعیل کے حالات میں یہ عبارت مسطور ہے۔

خدا اس لڑکے (اسماعیلؑ) کے ساتھ تھا۔ وہ بڑا ہوا اور بیابان میں آباد و مقیم ہوا اور (بہت بڑا) تیرانداز ہوا۔ سفر تکوین باب 21۔ آیت 9 لغایتہ 21

اس کے علاوہ حضرت اسماعیلؑ کا ایک زمانہ دراز تک۔ دیگر انبیا علیہم السلام کی طرح دنبیاں چرانا تمام تاریخوں سے ثابت ہے۔ یہ مشاغل بھی شرائط انذار اور قواعد احرار کے سراسر مخالف ہیں۔

الغرض حضرت اسماعیلؑ کے حالات زندگی پر غور کرنے سے۔ آپ کے طرز معاشرت بھی بالکل انبیا ومرسلین کی عادت وسیرت سے مطابق اور موافق پائے جاتے ہیں۔ اور انھیں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور کوئی نوعیت سرمو پائی نہیں جاتی۔ عبادت الٰہی۔ تبلیغ رسالت۔ ہدایت امت کے روزانہ اشغال کے ساتھ فکر معاش بھی ہے۔ اور خبر گیری اہل وعیال بھی۔ اور یہ امور بھی انسانی فرائض میں دیگر واجبات کی طرح داخل ہیں۔ ان تمام فرائض منصبی کے ساتھ بنائے کعبہ کے وقت سے کعبہ کی خدمات مثل طواف۔ سعی ہدی اور رماۃ وغیرہ وغیرہ۔ جس کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ خود آپ کو دے چکے تھے۔ آپ سے متعلق تھیں۔ مگر یہ تمام خدمات ایام حج کے ساتھ مخصوص تھیں۔ کسی روزانہ خدمت کعبہ کا آپ سے متعلق ہونا۔ جس سے انذار واحرار کے انداز نکلتے ہوں۔ اور اس خدمت مخصوصہ کو آپ کا روزانہ بجالانا۔ نہ کسی اسلامی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے اور نہ تورات سے ثابت۔ نہ اس کی تخصیص کسی محدث اور مؤرخ کی تصنیفات وتالیفات میں پائی جاتی ہیں اور نہ کسی اکابر صوفیہ اور نہ کسی شیخ الطائفہ کے ملفوظات سے۔ ایسی حالت میں شبلی صاحب کے اس بے نام ونشان اور مفقود الاسناد قیاس واقتباس کا کیسے اعتبار ہوسکتا ہے۔

مولانا شبلی صاحب کی یہ تاویل صریح مخالف قرآن اور معارض حدیث ثابت ہوتی ہے۔ خدا تو اپنے خاص لفظوں میں **وتلۃ للجبین** کہہ کر۔ خاص ذبح کی صورت قائم کرے اور پھر اس سارے واقعہ کو ان **ھو لبلاء المبین**۔ ظاہر ترین امتحان قرار دے۔ اور آپ کے بزرف صوفیہ ایسی تصریح کامل اور تشبیہہ عینی کو تمثیلی صورت قرار دے کر ناقص کر دیں اور (نعوذ باللہ) اس کو رسول کی اجتہادی غلطی پر محمول فرمائیں۔

شمس العلماء نعمانی نے افسوس ہے کہ عبارت قرآنی کو نظر انداز فرما کر الفاظ تورات کو اپنے استدلال کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ (تورات میں جابجا قربانی کا لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ سیرۃ النبی ص 106)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اپنے اس دعویٰ کا ثبوت قرآن مجید کی عبارت سے نہیں دے سکتے۔ جب یہ صورت ہے تو تعجب ہے کہ آپ کیسے قرآن کو تمام کتب سابقہ کا ناسخ مان کر۔ منسوخ شدہ کتاب اور اس کی عبارت کو اس کے ناسخ پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیا شبلی صاحب

تفضیل مفضول کے محالات کے قائل نہیں ہیں۔شبلی صاحب تو بہت بڑے اسلامی عالم تھے۔اور عالم بھی کون۔شمس العلما۔مشہور و معروف محقق بڑے پایہ کے مؤرخ مگر اس مبحث خاص میں تو آپ کے عقائد ایسے فاسد اور قرآن و حدیث کے مخالف پائے جاتے ہیں کہ شائد کوئی جاہل سے جاہل اور بے پڑھا لکھا مسلمان بھی ایسے عقائد نہ رکھتا ہوگا۔اور قرآن کی عبارت و بشارت کے مقابلہ میں تورات و انجیل کی منسوخ شدہ عبارتوں کو کبھی ترجیح نہ دیتا ہوگا۔

بہرحال اتنا لکھ کر ہم قرآن مجید کی اس آیت کو۔جسے شبلی صاحب نے اپنے مطلب نکالنے کی غرض خاص سے قطع و برید کر کے لکھا ہے۔ذیل میں لکھتے ہیں۔

ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ

(جب ابراہیمؑ کو بادشاہ بت پرست کے خوف سے باپ نے گھر سے نکال دیا) تو ابراہیم نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ میں (کسی طرف کو) چلا جاؤں گا۔وہ مجھے (کسی اچھے ہی ٹھکانے لگا دے گا۔اور (ابراہیم نے یہ بھی دعا مانگی) اے میرے پروردگار مجھ کو (نیک روحوں میں سے ایک نیک روح بطور فرزند) عطا فرمایا ہم نے اس کو بردبار لڑکے (اسماعیل کے پیدا ہونے کی) بشارت دی۔پھر جب لڑکا جوان ہوا۔اور اس کے (ابراہیم کے) ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے کہا کہ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ (جیسے) میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔پس تم (بھی تو اپنی جگہ) سوچو کہ تمہاری کیا رائے ہے۔(الصافات) (ترجمہ مطابق شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب)

چونکہ مولانا صاحب اپنی خودغرضانہ ضرورت سے اس آیت کے یہیں تک لکھنے پر مجبور تھے۔اس لئے یہیں تک لکھ کر رہ گئے مگر ہم ذیل میں یہ پورا آیہ کریمہ نقل کر کے حقیقت حال اور صورت واقعہ کا پورا انکشاف کر دیتے ہیں۔

ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿١٠٣﴾ۚ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿١٠٤﴾ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿١٠٦﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ۖ

(جب ابراہیمؑ کو بادشاہ بت پرست کے خوف سے باپ نے گھر سے نکال دیا) تو ابراہیم نے کہا کہ میں تو اپنے پروردگار کی راہ میں (کسی طرف کو) چلا جاؤں گا۔ وہ مجھے (کسی اچھے ہی ٹھکانے لگا دے گا۔ اور (ابراہیم نے یہ بھی دعا مانگی) اے میرے پروردگار مجھے (نیک روحوں میں ایک نیک روح بطور فرزند) عطا فرما تو ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے (اسماعیلؑ کے پیدا ہونے کی) خوشخبری دی۔ پھر جب لڑکا جوان ہوا اور اس کے (ابراہیمؑ کے) ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیمؑ نے کہا بیٹا کہ میں خواب میں (کیا) دیکھتا ہوں (جیسے) کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں پس تم (بھی تو اپنی جگہ) سوچو کہ تمہاری کیا رائے ہے (بیٹے نے) کہا۔ ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے۔ (بلا تامل) اس کی تعمیل کیجیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے بھی صابر (ہی) پائیں گے۔ پھر جب دونوں باپ بیٹے تعمیل حکم پر آمادہ ہوئے اور باپ نے (حلال کرنے کے لئے) بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑا تو (ان کی فرمانبرداری نہایت ہی پسند آئی) اور ہم نے ابراہیمؑ سے پکار کر کہا ابراہیمؑ تم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھلایا۔ (اب ہم تمھیں بڑے بڑے مراتب دیں گے) اور نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیں گے۔ بے شک یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ اور ہم نے بڑی قربانی کو اسماعیل کا فدیہ بنایا اور ابراہیم کے بعد) آنے والی امتوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔ (الصافات۔ ترجمہ شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب مطبوعہ دہلی ص719)

اس آیہ قرآنی پر غور کرنے سے پہلے سمجھ لینا چاہیے کہ شبلی صاحب نے بلفظ ذبح کے معنی۔ خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دیئے جانے کے بتلائے ہیں اور آپ کو لفظ ذبح کے یہی صحیح معنی۔ اصلی مراد اور حقیقی مدعائے وحی ہونے پر اتنا یقین کامل ہے کہ (نعوذ باللہ) آپ کے نزدیک جناب ابراہیمؑ بھی اس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے اور آپ سمجھ گئے تو اس بنا پر شبلی صاحب کے نزدیک۔ کسی کو ذبح کر دینا۔ اور کسی کو کعبہ کی خدمت خاص کے لئے علیحدہ کر دینا۔ گویا ایک بات ہوئی۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ کہاں کسی کا ذبح کیا جانا۔ کسی کی جان لے جانا۔ گو وہ خدا ہی کے نام پر کیوں نہ ہو۔ کسی زندگی کو ہمیشہ کے لئے تمام کر دینا۔ اور کہاں ایک شخص خاص کا ایک خدمت خاص کے لئے مختص اور منفرد ہو کر۔ محض بے تعلق بے لوث اور بالکل آزادانہ زندگی بسر کرنا۔

شبلی صاحب کی روح نہ شرمائے۔ وہ کون ایسا لا یعقل انسان ہوگا جو ان دونوں متضاد طریقوں کو مساوی اور برابر سمجھے گا۔ اور وہ کون فاتر العقل ہوگا۔ جو ان دونوں مختلف الفاظ کو مترادف اور متجانس بتلائے گا۔ اتنا تمہیداً لکھ کر اس بحث کا آئندہ سلسلہ بیان ملاحظہ ہو۔

اس آیہ کریمہ کے دو مقامات پر ذبح کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ انی اذبحك کی صورت میں۔ اور دوسری جگہ بذبح عظیم کی مطلق اور غیر مشتق صورت میں۔ پہلی جگہ۔ جیسا کہ شبلی صاحب کے ہم عصر شمس العلما حافظ نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے ثابت ہے۔ خدا کے بتلائے اور سمجھائے ہوئے یہ معنی ہوتے ہیں کہ میں تم کو (گویا) ذبح کر رہا ہوں۔ دوسری جگہ یہ معنی ہوئے کہ ہم نے بڑے ذبح کو اسماعیل کا فدیہ بنایا۔

یہ تو خدا کے معنی ہوئے۔ مولانا شبلی صاحب کے یہ معنی ہوئے۔ پہلی جگہ پر۔ کہ میں تم خدمت کعبہ کے لئے نذر یا وقف کر رہا ہوں۔ دوسرا یہ معنی ہوئے کہ ہم نے بڑے وقف کو اسماعیل کا فدیہ بنایا اور پھر آگے چل کر خدا کے ذبح عظیم اور مولوی صاحب کے وقف عظیم والے مبتدا کی خبر آخر فقرہ آیت و ترکنا علیہ فی الآخرین سے یہ نکلی کہ ہم نے آنے والی امتوں میں۔ اس کا ذکر خیر باقی چھوڑا۔

اب نتیجہ سے شبلی صاحب خود سمجھ لیں کہ آنے والی امتوں یا قوموں میں اس واقعہ کی یاد اور اس ایثار (ابراہیمی کا احیا) ۔آج تک ذبح کی عینی صورت میں کیا جاتا ہے۔ یا وقف ونذر خدمت کعبہ کی تمثیلی پیرایہ میں۔ کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ کبھی اس نے موسم حج میں قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے کی جگہ اپنی اولاد و احفاد میں سے کسی کو خدمت کعبہ کے لئے وقف کر کے اپنے مناسکات حج کو تمام کر دیا ہے۔ یا کوئی اسلامی عالم یا فقیہہ۔ یا اگر خود شبلی صاحب بقید حیات ہوتے تو من حیث الفقیہ و العالم ۔کسی مرد مسلم کو قربانی کے عوض اپنی اولاد کو خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کا فتویٰ دے سکتے تھے۔

اب مرقومہ بالا آیہ کریمہ میں جو ذبح اسماعیلی کی تفصیل ہے اور جس کو ہم نے ترجمہ کے ساتھ اوپر لکھ دیا ہے۔شبلی صاحب کے کہیں ان الفاظ نو ایجاد اور مقاصد طبعزاد کا نام ونشان تک پایا جاتا ہے۔ اور اس کے کسی لفظ اور کسی حرف سے شبلی صاحب کے بتلائے ہوئے معنی منطبق ہوتے ہیں۔ بلکہ بخلاف ان کے بتلائے ہوئے معنی کے۔اس آیہ وافی ھدآیہ کے الفاظ تو صاف صاف بتلا رہے ہیں کہ خواب میں جناب ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہی کا خاص حکم دیا گیا تھا۔ اور نہ کسی دوسرے طریقہ سے خدا یا خانہ خدا کے لئے وقف یا تعین کئے جانے کا۔

ہم تھوڑی دیر کے لیے شبلی صاحب کے اس قیاس کو مان لیتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ میں جو ذبح کا لفظ ہے وہ ابراہیمؑ کی زبانی ہے۔اور حضرت ابراہیمؑ (نعوذ باللہ) غلطی سے اس کو ذبح کی اصلی صورت سمجھے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ وہ تمام امور عمل میں لائے جو ایک ذابح ذبیحہ کے ساتھ عمل میں لاتا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ تعجب سے تعجب ہے کہ ابراہیمؑ سے زیادہ تو ابراہیمؑ کا خدا بے درد نکلا۔ جو باوجود اس علم مطلق کے کہ ابراہیمؑ انسان ہے۔ انسان کی سمجھ کتنی۔ اپنی غلط فہمی سے میرے حکم کے مدعائے اصلی کے خلاف۔ ذبح فرزند کی ایسی بے دردی کر رہا ہے۔ مگر وہ خدا جو ارحم الراحمین ہے۔ خیر الحافظین ہے۔ جس کے اوصاف راحم الشیخ الکبیر بتلائے جاتے ہیں اور رازق الطفل الصغیر وہ ان تمام خونی منظروں کو آنکھ سے دیکھتا ہے۔ مگر تا ہم نہ اس کو اس کی غلطی پر ٹوکتا ہے اور نہ اس کے ذبح کنندہ ہاتھ کو روکتا ہے۔

بہر حال۔ بفرض محال (نعوذ باللہ) اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ نہ ابراہیمؑ اس کی حقیقت کو سمجھے اور نہ ابراہیمؑ کا خدا ان کے سمجھا دینے میں اس وقت مصلحت سمجھا تو پھر اس خدا نے اس واقعہ کی تفصیل فرمانے کے بعد صورت واقعہ کو ان ھذا لھو البلاء المبین (کھلے ہوئے امتحان) سے کیوں تعبیر فرمائی۔ یہ تو حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ بھی نہیں ہیں۔ خدائے سبحانہ کے خاص الہامی الفاظ و مکالمات ہیں۔ جب شبلی صاحب کے قیاس کے مطابق یہ واقعہ صرف وقف اولاد کا معاملہ تھا تو ان ھذا لھو کی تاکید اور البلاء المبین کی تخصیصی تعریف سے اس کی اہمیت اور عظمت کیوں بڑھائی گئی۔ ان الفاظ قرآنی نے ہمیں صاف صاف بتلا دیا کہ یہ واقعہ ذبح وقف اولاد کے معانی و مقاصد میں ہرگز نہیں تھا۔ اگر ہوتا۔ تو کبھی بلاء کے لفظ سے تعبیر نہ فرمایا جاتا۔ کیونکہ معمولی سے معمولی عقل والا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ بیٹے کا ذبح کرنا باپ کے لئے بلاؤ مصیبت کہلائے گا یا اس کے بیٹے کا کسی معبد کی خدمت کے لئے علیحدہ کر دیا جانا اس کے لئے اندوہ و آفت کہلائے گا۔ اگر بلا کے معنی باعتبار ظاہر بلاؤ مصیبت کے نہ لئے جائیں اور جیسا کہ حافظ صاحب کے ترجمہ میں ہے۔ آزمائش

وامتحان ہے کے معنی سمجھے جائیں تب بھی تو بیٹے کے قتل پر ہمت کرنا بلائے مبین ہی کہلائے گا۔ یا اس کو خدمت کعبہ کے لئے وقف کر دینا یا نذر چڑھادینا اعظم ترین امتحان بتلایا جائے گا۔ وہ کون ایسا سادہ لوح اور کوری عقل والا مسلمان ہوگا۔ جو قرآن مجید کے ایسے واضح الفاظ (انی اذبحك اور وفدیناہ بذبح عظیم) کے مقابلہ میں حلال کرنے اور ذبح کئے جانے کے صریح اور صحیح معنوں کو چھوڑ کر آپ کے بتلائے ہوئے وقف خدمت کے مطلب لگائے گا جو نہ قرآن کے الفاظ آیات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ کسی حدیث کی عبارت اور نہ اہل عرب کی کسی مقامی روایت سے ثابت ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس کا جواب شبلی صاحب کے ذمہ ہے۔ وہ بتلائیں کہ آپ کے اس غلط معنی۔ مہمل ترکیب اور بے جا اور نازیبا تاویل کو کون مانے اور کیسے مانے۔

آپ کو یا آپ کے اکابر صوفیہ کو ایسی غلط تاویل کرتے وقت یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس کے معارض قرآن اور مخالف حدیث ہونے کے علاوہ کسی جاہل سے جاہل عرب نے بھی تو آج تک آپ کی تعلیم کے مطابق قربانی کی تعمیل نہیں کی۔ آپ تو بڑے پایہ کے مؤرخ شمار ہوتے ہیں۔ اور اعلیٰ درجہ کے محقق۔ آپ تو خود اپنی اس غلط فہمی کی اصلاح حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے واقعہ کو دیکھ کر اور پڑھ کر کہہ سکتے تھے۔ جو معمولی سے معمولی اسلامی تاریخوں میں عام طور سے درج ہے۔ کہئے۔ اگر آپ کی تحقیق کے مطابق حقیقت میں۔ واقعہ ایسا ہی تھا تو جناب عبدالمطلب کو اپنے ایسے محبوب ترین اور حامل نور سید المرسلینؐ فرزند کو۔ اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاسی و تمثیل میں ذبح فرماتے۔ اور آپ کے تمام اعزہ و اقارب۔ خصوصاً حضرت ابی طالب کو جو عبداللہ کے برادر عینی تھے۔ آپ کے منع کرنے اور باز رکھنے اور بالآخر۔ فدیہ کی قرعہ اندازی وغیرہ کی کوشش فرمانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ نہ معلوم کہ باعتبار قدامت اور خصوصیت کے حضرت عبدالمطلب اور سائر قوم قریش اور دیگر اقوام عرب کو اس موقعہ کی صحت کا زیادہ علم تھا یا مولوی شبلی کو یا ان کے شیوخ صوفیہ کو۔ وہ کون حقیقت سے ایسا نا آشنا ہوگا۔ جو اس زمانہ کے بزرگواروں کو۔ جو قرن اولیٰ سے کچھ ہی پہلے تھے۔ علم و اطلاع پر مولانا شبلی کی اس جدت اور اختراع کو ترجیح دے گا۔

بہر حال ہمارے موجودہ استدلال عقلی اور شبلی صاحب کی طباعی کی حقیقت کا پورا انکشاف ہوگیا۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی یہ تاویل بالکل غلط ہے۔ یہ معنی بالکل مہمل اور بے کار ہیں۔ صحیح وہی ہے جو قرآن نے اپنے ظاہر اور صاف الفاظ میں بتلایا ہے اور اسی کی مطابقت میں بالکل اسی طرح اس کے سچے اور برحق رسول صلعم نے اور اس کے بعد تمام علمائے اسلام نے ہمیں بتلایا ہے۔ شبلی صاحب کے اگر دیدہ بصیرت اور گوش حقیقت شنوا ہوتے تو وہ آپ دیکھ لیتے اور سمجھ لیتے کہ علمائے اسلام نے باوجود اس کے کہ حضرت اسحاقؑ اور اسماعیل علیہما السلام کے ذبیح اللہ ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ کسی نے اسحاقؑ کو اور کسی نے اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ بتلایا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتلا آئے ہیں۔ مگر ذبح کی صورت میں کسی نے آپ کی طرح تمثیلی اور عینی تفریق و تخصیص نہیں قائم کی۔ پھر شبلی صاحب کی اس نرالی اور لاابالی ترکیب والے معنی و مطلب کو کون سمجھ سکتا ہے۔

اس کے بعد ہم مولوی صاحب کو دکھلاتے ہیں کہ وقف خدمت بیت اللہ کے ذکر سے آپ کا قرآن مجید بھی خالی نہیں ہے۔ بیت المقدس کی خدمت کے لئے اولاد کا نذر کر دیا جانا۔ جو ظہور اسلام سے پہلے شریعت موسیٰ کے زمانہ میں رائج تھا۔ سورۂ آل عمران رکوع 11

میں موجود ہے۔ اگر تھوڑی سی زحمت گوارا کر کے اس کے الفاظ و معانی پر غور فرما لیا گیا ہوتا تو شبلی صاحب کی تشفی ہوگئی ہوتی۔ مگر افسوس کہ اس کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ جناب مریم علیہا السلام کے ذکر میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ

ایک وقت تھا کہ عمران کی بی بی نے (خدا کی خدمت میں) عرض کی کہ اے پروردگار۔ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو میں (دنیا کے تمام کام کاج سے) آزاد کر کے۔ تیری نذر کرتی ہوں۔ تو میری طرف سے یہ (نذر) قبول فرما۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس واقعہ نذر اولاد کے ذکر میں جو الفاظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ وہی واقعہ قربانی اسماعیلؑ میں بھی آئے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ شبلی صاحب کے اعتقاد میں تو دونوں واقعہ کے مقاصد و مطالب ایک ہیں۔ تو اس اصول سے قرآن مجید کے الفاظ۔ دونوں واقعات کے متعلق متحد المعنی یا کم سے کم قریب المعنی ہونے چاہیے۔ مگر جب ہم دونوں واقعات کی آیات کے الفاظ پر غور کرتے ہیں۔ تو دونوں آیتوں کے الفاظ میں آسمان زمین کا فرق پاتے ہیں۔ واقعہ قربانی کے متعلق ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ لفظ ذبح دو جداگانہ مقامات پر آیا ہے۔ اور مذبوح کی توصیف تعریف من الصابرین بتلائی ہے۔ اور واقعہ نذر اولاد میں۔ نذر کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اور اس نذر کردہ اولاد کی محرر بتلائی گئی ہے۔ اور نذر کے معنی ہدیہ کرنے کے ہیں۔ جیسا کہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے بھی یہی معنی نکلتے ہیں۔ اسی طرح مذبوح کی تعریف جان کے ایسی بیش بہا چیز دینے پر صبر کرنا ہے۔ اور نذر کردہ اور موقوف کی تعریف ہے کہ وہ دنیا کے تمام تعلقات سے آزاد اور محض بے سروکار ہو کر خدمت معبد کے لئے مخصوص ہو۔ چلئے فرصت ہوگئی۔ حلال اور ذبح ہونے والا صابر کہلایا۔ اور وقف یا نذر کیا ہوا شخص آزاد۔ حقیقت معلوم ہوگئی کہ صبر کرنے والا ذبح کر دیا گیا یا کر دیا جانے والا تھا۔ مگر کسی طرح سے بچ گیا۔ اور وقف شدہ شخص دنیاوی تعلقات سے آزاد اور بے سروکار کہا گیا۔ اب شبلی صاحب کی تاویل کے خلاف۔ ان دونوں واقعات میں قرآن مجید کے الفاظ سے اتحاد ثابت ہوتا ہے یا اختلاف۔ پھر کیسے کوئی مسلمان آپ کی تاویل پر ایمان لائے گا۔

ہاں مولانا شبلی صاحب ہیں تحقیق کے کامل اور عربی کے بہت بڑے فاضل۔ ان الفاظ قرآنی کے ظاہری معانی کے علاوہ۔ شاید اس کے لغوی اور مادی معنوں میں کوئی باریک اور رکیک معنی ایسے ہوں جن سے آپ نے اپنی نو ایجاد تاویل کو مستخرج کیا ہے اور جو آج تک عام اہل اسلام کی موٹی نظر اور موٹی عقل میں نہ آئے ہوں۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ ہم عربی کی لغت سے بھی ان الفاظ کے باہمی اختلاف کو پورے طور سے دکھلا دیں کہ آیندہ پھر کسی کو شبلی صاحب کی اس تاویل کے غلط ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

قاموس میں بذیل لفظ ذبح تحریر ہے۔ ذبح۔ کمنع۔ ذبحاً و ذباحاً۔ شق و فتق و نحر و ختق یعنی ذبح بروزن منع۔ ذبحاً یا ذباحاً۔ یا الف تنوین۔ اس سے مصادر مشتق ہوئے ہیں۔ جس کے معنی۔ شگاف کرنا۔ پھاڑنا یا پھٹنا۔ حلال کرنا۔ اور خون بہانا ہیں۔ پھر اس کے فاضل فیروز آبادی لکھتے ہیں۔

الذبیح المذبوح اسمعیل علیه السلام و فی الحدیث انا ابن الذبیحین لان عبد المطلب لزمه ذبح عبدالله لینذر فقداء بمئاته من الابل۔

ذبیح المذبوح سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ حدیث وارد ہوئی ہے کہ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔ اس لئے کہ حضرت عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کو ذبح کرنے کی نذر کر لی تھی اور پھر ان کے عوض میں سو اونٹ دیے تھے۔ قاموس مطبوعہ کلکتہ ص 282

اب النذر کی تحقیق لفظی ولغوی حسب ذیل ہے:

النذیرہ۔ ما یعطیه۔ وہ چیز جو کسی کو عطا کی جائے۔ والولد الذی یجعله ابوہ قیما او خادما لکنیة ذکرا او انثی۔ اور وہ بچہ جسے اس کے باپ نے کسی معبد میں ہمیشہ کے لئے قیام کرنے یا اس کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا ہو۔ عام اس سے کہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ قاموس ص 497۔

اب الاحرار کی لغوی تحقیق یہ ہے۔

الحر۔ بالضم۔ خلاف العبد۔ خیار کل شی۔ الفرس العتیق۔ غلام کا متضد ہے۔ اس کے معنی نیک ترین اشیا۔ اور آزاد گھوڑا کے ہیں۔ قاموس 397۔

ہم نے اپنے مندرجہ بالا بیان میں ان تینوں لفظوں کے علیحدہ علیحدہ معنی لکھ دیئے ہیں۔ جو آیات قرآنی متعلقہ واقعہ قربانی حضرت اسماعیلؑ اور نذر جناب مریمؑ میں اپنے اپنے مقام پر آئے ہیں۔ اب ان مختلف اور جداگانہ معنوں کے الفاظ کو پڑھ کر ہر شخص آسانی سے سمجھ جائے گا کہ واقعہ قربانی اسماعیلؑ میں ذبح کا خاص لفظ آیا ہے اور وہ واقعہ نذر جناب مریمؑ میں نہیں آیا ہے۔ اسی طرح واقعہ نذر حضرت مریمؑ میں نذر کا خاص لفظ مستعمل ہوا ہے اور وہ واقعہ جناب اسماعیلؑ میں نہیں لایا گیا۔ اس بنا پر ہر شخص بلا کسی تحریک کے خود سمجھ لے گا کہ۔ ذبح کے معنی نذر کے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ذبح کے معنی سوائے حلال کرنے یا خون بہانے کے اور دوسرے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح نذر کے معنی کسی لڑکے یا لڑکی کو کسی معبد کے لئے نامزد کر کے علیحدہ کر دینے اور دیگر مشاغل و تعلقات سے آزاد کر دینے کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے۔

جب یہ دونوں الفاظ آپس میں ایسے متغائر۔ متخالف اور متضاد ثابت ہوتے ہیں۔ تب شمس العلماء نعمانی کا ذبح کے معنی کو نذر کے مطلب میں بتلانا اور نذر کے مقصد کو معنی میں سمجھانا۔ ان کی خاص منطق معکوسی اور ان کے اکابر صوفیہ کی جرح کا بوسی سمجھی جائے گی۔ اگر حقیقتاً یہ دونوں الفاظ متحد المعنی ہوتے تو ضروری تھا کہ واقعہ اسماعیل کے متعلق قرآن مجید میں انی اذبحك کی جگہ انی انذر لك اور فدیناہ بذبح عظیم کی جگہ فدیناہ بنذر عظیم نازل فرمایا جاتا۔ اور اسی طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انا ابن الذبحین کی عوض انا ابن المنذر بن ارشاد فرمایا ہوتا۔ او اعلیٰ ہذا القیاس۔ اہل لغت نے بھی ذبح کے معنی۔ ذبح کئے جانے کے

عوض۔لڑکے کو خدمت معبد کے لئے وقف کر دیا جانا لکھا ہوتا۔غرض کہ شمس العلما صاحب کی جدید تعلیم کے مطابق سلف سے خلف تک کے ادب۔تفسیر۔حدیث۔تاریخ۔لغت غرض تمام علوم وفنون کے دفتر الٹ دیئے جائیں غلط کر دیے جائیں اور مٹا دیے جائیں۔ تب کہیں آپ کی اس لطیف تاویل کا لطیفہ سمجھ میں آئے۔

بہر حال ہم نے اپنی مندرجہ بالا طول طویل اور بالتفصیل بحث میں شبلی صاحب کی اس غلط تاویل کی کامل تردید وتنقید کر دی ہے۔ جس کو انھوں نے بلا سند اور بلا نام ونشان اپنے چند اکابر صوفیہ کے غیر مقید اقوال سے بے ضرورت صرف اپنی جدت طبع کا نمونہ بنا کر اپنی کتاب میں لکھی تھی۔اور واقعہ قربانی کے اصل مدعا کو ایک ایسے غلط اور موضوع منشاء کے ساتھ تبدیل کرنا چاہا تھا۔جو قرآن کا مخالف۔ حدیث کا معارض اور تمام روایت ودرایت کے واقعات کے خلاف اور صریح متضاد تھا۔ہم نے عمداً اس بحث میں طوالت کا ذرا بھی خوف و خیال نہیں کیا۔اور اس کے تمام جزئیات کو عقل اور نقل کے دونوں طریقہ ہائے استدلال سے مختلف اور متواتر اسناد واشہاد کے ساتھ اس غرض خاص سے بیان کر دیا ہے کہ آئندہ پھر کسی اہل اسلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واقع ذبح کو اسی طرح جس طرح قرآن مجید کے الہامی الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی ان کے منصوصی پیرایہ میں مندرج ہے۔وقوع پذیر ہونے کے متعلق کوئی عذر وکلام اور شکوک واوہام باقی نہ رہیں۔

اتنا لکھ کر ہم پھر مولوی صاحب کے اس مخالف نظریہ پر اپنی خلاف رائے دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جو آپ نے اپنے اس نظریہ تحقیق معیار تالیف کے خلاف اختیار فرمایا ہے جس کو آپ نہایت سختی اور احتیاط کے ساتھ اپنی کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرما چکے ہیں۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ تمام تاریخی واقعات کے اسناد کو اسی طرح مرفوع۔مصدق اور صحیح۔اور ان کے تمام روایات کو معتبر ہونا شرط فرماتے ہیں۔جس طریق واصول پر تفسیر۔حدیث اور فقہ وکلام کی تدوین کی جاتی ہے کہاں آپ کی یہ احتیاط۔یہ تاکید وتعقید۔اور کہاں یہ بے احتیاطی اور آزادی کہ مسئلہ زیر بحث میں بلا سند اقوال سے استدلال کیا جاتا ہے۔نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے اور نہ قائلِ قول کا نام و نشان بتلایا جاتا ہے کہ اس کی حیثیت معلوم ہو سکے۔

اس سے پورے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ دیباچہ کی عبارت میں آپ نے اپنی نمائشی تحقیق اور ظاہری احتیاط کا جو کچھ طمطراق اور لام قاف باندھا ہے وہ غریب مسلمانوں کو مرعوب بنانے کی غرض خاص سے ہے۔ورنہ اس میں اصلیت اور حقیقت کا کوئی شائبہ نام شئی بھی موجود نہیں ہے۔

فدیناہ بذبح عظیم کا حقیقی مقصود اور ترکناہ علیہ فی الاخرین کا اصلی مفہوم

اب ہم شبلی صاحب کو یاد دلاتے ہیں کہ آپ نے واقعہ ذبح اسماعیل کے متعلق تو دوراز عقل اور خارج از قیاس تاویلات ومعانی کا انبار لگا دیا۔ اوران مہملات کے بتلانے اور سمجھانے میں بڑی کوشش اور کدوکاش سے کام لیا۔ مگر کبھی آپ کو **وفدیناہ بذبح عظیم** کے اصل مطالب ومقاصد کی تحقیق اورا سکے اصلی مفہوم قائم کرنے ۔ بتلانے اور سمجھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی طرف نہ کبھی آپ کا خیال گیا اور نہ آپ کی نگاہ۔ **استغفر اللہ**۔ حقیقتاً شبلی صاحب اوران کے اسلاف سے ایسے صاف اور با انصاف تحقیق وتفتیش کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ایسی محققانہ اور منصفانہ تاویل ومعانی توان کے اوران کے اسلاف کے اصول عقائد میں گویا معصیت ہے۔ اسی تعصب اور خودغرضی کی بنا پر سواد اعظم کے مفسرین ۔ محدثین اور مؤرخین کا اس کے سچے۔ صحیح اور پر واقع معانی ومطالب بتلانے کے لئے نہ توفیق کا قدم اٹھا تھا اور نہ تحقیق وتفصیل کا قلم ۔ کیونکہ ایسی تفسیر وتفصیل سے اس ذات مقدس کے خصائص اور فضل ومناقب کا اظہار ہوتا ہے۔ جوابتداہی سے آپ کی عقیدت ومعرفت کے دفتر میں مرفوع القلم ہو چکا تھا۔ واعظین اور ذاکرین پر اس کا ذکر کرنا اور سامعین پر اس کے ذکر کوسننا حرام کر دیا گیا تھا۔ جب شبلی صاحب کی شریعت کے احکام اور حکومت کے نظام ۔ دونوں متفقہ قوتوں سے اس کے استخفاف و استیصال پر ابتداہی سے آمادہ اور کمر بستہ ہوں ۔ تو انکشاف حقیقت کی امید آپ سے کیا ہوسکتی ہے۔

مولانا شبلی صاحب اس آیہ وافی ہدایہ کے اصلی معنی بتلائیں اور حقیقی مفہوم سمجھائیں۔ محال ہے اور خیال ہی خیال۔ مگر ہم ان کو اور ان کے ہم خیال حضرات کو بتلائے اور سمجھائے دیتے ہیں کہ واقعیت اور حقیقت کسی شے کی نہ کسی کے چھپائے چھپ سکتی اور نہ مٹائے مٹ سکتی ہے۔ اصلیت پر چاہے کتنی مدت تک سخت سے سخت پردے نہ ڈالے جائیں مگر حقیقت چمک جاتی ہے اور صداقت صاف جھلک جاتی ہے۔

مفسرین اہلبیت علیہم السلام نے ۔ **وفدیناہ بذبح عظیم** کے صحیح معنی اور اصلی مفہوم عام اہل اسلام کو ایک بار نہیں ہزار بار بتلایا اور سمجھایا۔ مگر سواد اعظم اسلام نے اپنے عقائد موضوعی اور مقاصد مصنوعی کے مخالف پا کر اس حقیقت نمائی پر کوئی توجہ اور اعتنا نہ فرمائی۔ اور کیونکر اعتنا فرماتے ۔ مفسرین اہل بیت کا ان کی نگاہوں میں کوئی اقتدار ہی باقی نہیں رہا تھا۔ توان کے ارشاد وہدایات اور اخبار و آثار کا کیا اعتبار کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت سے لے کر اس وقت تک سواد اعظم میں ان حضرات کے لئے اعتباری اور غیر اعتمادی کی وہی صورت قائم ہے۔

مگر باایں ہمہ۔ باوجود کہ ذبح عظیم کے اصلی مفہوم ومقصود سے سواد اعظم کی عدم واقفیت اور حق فراموشی کا وہی عالم ہے مگر پھر بھی اس واقعہ الہامی کی حقانیت اور اس سچی قربانی کی روحانیت کی تاثیر نے بالآخر ۔ انہیں محدثین ومحققین میں سے اکثر کو اس کے اصلی مفہوم سمجھنے اور تسلیم کرنے کی بھی توفیق دی۔ اور ایک مدت کے بعد ۔ جب ان کے خیالات میں انصاف پسندی ۔ حق گوئی اور حقیقت جوئی اور آزادی کے جوہر پیدا ہوئے اور جب ان کی نگاہوں کے سامنے سے تعصب ۔ نفسانیت اور خودغرضی کے حجاب اٹھائے گئے اور جب ان کی گردنیں

متعصب حکومتیں اور ظالم سلطنتوں کے زبردست پنجوں سے چھوٹ گئیں تو انہیں ان اسرار مخفیہ کے متعلق اپنے محققانہ انکشافات اور منصفانہ اقتباسات کا موقع ملا۔ اور انہوں نے جب اس آیہ کریمہ کے اصلی مقصود پر تحقیق کی نظر ڈالی اور کامل غور وغوض سے کام لیا تو ان کو صورت واقعہ اور حقیقت حال پوری معلوم ہوگئی اور وہ سمجھ گئے کہ وفدیناہ بذبح عظیم سے حقیقی طور پر نہ وہ گوسفند بہشتی۔ جو بطور مشہور اس وقت سے لے کر اس وقت تک برابر منقول و مذکور چلا آتا ہے صحیح طور سے مراد و مقصود ہو سکتا ہے۔ اور نہ ان بے شمار گوسفندوں اور لا تعدادو لاتحصیٰ مختلف اقسام جانوران۔ اونٹ۔ گائے۔ وغیرہ کی قربانیاں حقیقی طور پر تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ جو ایام حج میں اس واقعہ عظیمہ کے احیاو یادگار کے خیال سے ہر سال خدا کے نام پر کی جاتی ہیں۔ یہ کیوں؟

اس لئے کہ قرآن مجید میں لفظ فدا مستعمل ہوا ہے۔ اور فدا کی تعریف خاص یہ ہے کہ اول وہ فدیہ من تمام الوجوہ والحیثیۃ اپنے مبدل منہ سے بہتر ہو۔

دوم یہ کہ اگر مبدل منہ سے اس فدیہ و بدل کا اولیٰ تر ہونا مقدور و میسر ہونا ممکن نہ ہو تو بدل اور مبدل منہ میں من تمام الوجوہ والحیثیۃ مساوات ضرور ہو۔

بدل وفدیہ کے اصول مرقومہ بالا کے ثبوت ذیل کے الفاظ الہامی اور ارشاد قرآنی میں ملاحظہ ہوں۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾ (النساء)

اگر تمھیں (کوئی شخص) ہدیہ دے تو تمہیں اس سے بہتر ہدیہ دینا چاہیے اور اگر (اس سے بہتر میسر نہ ہو) تو اس کے جیسا واپس کرنا (اور بھیجنا) لازم۔ خدا تمام چیزوں کا حساب لینا والا ہے۔

یہ نہ کوئی ایسا باریک مسئلہ ہے اور نہ کوئی ایسا دقیق نکتہ۔ جو سمجھ میں نہ آسکے۔ بلکہ یہ تو ایسا کھلا ہوا اور سلجھا ہوا آسان اخلاقی مسئلہ ہے جو عام طور سے ہر شخص کے روزمرہ کی ضرورتوں میں برابر پیش آیا کرتا ہے۔

اب اس اصول ومقدار سے اس واقعہ کی عظمت اور اہمیت پر غور کیا جائے۔ صورت واقعہ صاف صاف بتلا رہی ہے کہ خدائے عزوجل اور اس کے ایک معتبر اور معتمد ترین بنی مرسل کے فیما بین وعدہ وعید کے معاملات پیش ہیں۔ مشیت الٰہی کو صبر خلیل اللہ ہی کا امتحان منظور ہے۔ اگر چہ اس کے قبل بھی ان کی بڑی بڑی آزمائشیں ہو چکی ہیں۔ آگ میں زندہ جلا دینے تک کی مصیبتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ مگر ابھی قدرت کی تسکین اور مشیت کا اطمینان نہیں ہوا ہے۔ وہ اب ایک مافوق البشری طریقہ سے امتحان لینا چاہتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے ارمان اور تمناؤں والے۔ نوجوان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کر کے اپنے صبر واستقلال اور معرفت کے کمال کا امتحان دے۔ یہ وہ طریقہ امتحان ہے جو صبر وتحمل انسانی کے حدود امکان سے بالکل باہر ہے۔ اس عدیم النظیر قیامت کے نظیر سے دنیا کے تمام کارنامے خالی ہیں۔

باپ کون ہے؟ وہی بزرگ مقدس۔ جس نے اسی بیٹے کے عطا فرمائے جانے اور پیدا ہونے کی آرزو وتمنا میں مدت تک دن بھر رات دعائیں مانگی ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں برابر آہ وزاری کی ہے۔ یہاں تک کہ اسی حسرت وتمنا میں جوانی ختم ہوگئی ہے۔ شباب جاتا رہا

ہے۔ بڑھاپا آ چلا ہے۔ خدا خدا کرکے۔ خدا نے اب سنی ہے اور والدین کو یہ نعمت غیر مترقبہ عنایت فرمائی ہے۔ ماں باپ نے بڑے ناز و نعم سے پالا ہے۔ اور اب وہ کامل جوان ہونے والا ہے۔

باپ کو بیٹا بھی کیسا ملا ہے؟ الولد سرالابیہ کا کامل مصداق۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ مقدس باپ کی تقدیس وعظمت کا نمونہ۔ حسنات و برکات اور جملہ صفات پدری کا تیار مجسمہ۔ جس کی قدر و منزلت کی نسبت مصدر قدرت سے ولادت ہی کے وقت نوید بشارت آ چکی ہے۔ اور خطیب مشیت ان الفاظ کے ساتھ کیسا خطاب فرما چکا ہے کہ خدا اس بچہ کے ساتھ ہے۔ یہ امت عظیمہ کا مورث اور بارہ سرداروں (اماموں) کا جداعلیٰ ہے اس کو برکت دے گئی ہے۔ (اسفار تورات سے ان بشارتوں کے حوالہ اوپر نقل ہو چکے ہیں)

ایسے برگزیدہ بیٹے کو اس کا عاشق اور گرویدہ باپ اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے والا ہے کیوں؟ کس لئے؟ اس لئے کہ وہ رویا سے صادقہ کے ذریعہ سے۔ جو وحی ربانی اور الہام یزدانی کا ایک جزو خاص ہے اس امر فوق البشری کے اقدامات وارتکاب پر مامور ہو چکا ہے۔ اس غرض خاص سے کہ وہ امتحان گاہ دنیا میں اپنی صبر و استقامت کا امتحان دے اور آ ماجگاہِ عالم میں اپنے تصفیہ قلب۔ استقلال دل اور تسلیم و رضا کے کمال دکھلا کر ثابت کر دے کہ باوجود اس کے کہ جس فرزند کو اس نے اتنی آرزو و تمنا سے پایا ہے اور ایسی محنت و ریاض اور الفت و محبت سے پالا ہے۔ مگر تاہم رضائے الٰہی اور اطاعت ایزدی کے مقابلہ میں وہ ایک معمولی جانور سے بھی زیادہ عزیز نہیں۔ باوجود اس کے کہ اس کی صورت ہمیشہ آنکھوں میں اس کی یاد ہمیشہ دل میں اس کی خبر گیری۔ دلجوئی اور راحت رسانی کے تمام سامان نگاہوں میں رہا کرتے ہیں۔ مگر جب قدرت کا حکم۔ مشیت کا فرمان۔ اس سے مفارقت اور جدائی اختیار کرنے کے لئے صادر ہوتا ہے۔ تو اس سے ایسی بے تعلقی اور بے سروکاری ثابت کی جاتی ہے کہ گویا باپ بیٹوں میں گویا کوئی علاقہ اور واسطہ ہی نہیں تھا۔

صاحب مواہب لدنیہ نے اس مضمون کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم ان کی اصل عبارت ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

وابراهيم لماسئال ربه الولد ووهبه له تعلقت شعبة من قبله بمحبته والله تعالیٰ قد اتخذه خليلا والخلة منصب يقتضي توحيد المحبوب بألمحبة وان لا يشارك فيها فلما اخذ الولد شعبة من قلب الولد جاءت من غيره۔ الخلة تنزعها من قلب الخليل فامر بذبح المحبوب فلما قدم على ذبحه وكانت محبة الله عنده اعظم من محبة الولد خلصت الخلة حينئذ من شوآئبالمشاركة فلم يبق فی الذبح مصلحة اذكانت المصلحة انما هی العزم و توطين النفس وقد حصل المقصود

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حصول فرزند کی دعا فرمائی اور خدا نے ان کو فرزند (اسماعیلؑ) عطا فرمایا تو حضرت ابراہیمؑ کے ایک گوشہ دل میں محبت فرزند بھی جاگزیں ہوئی۔ اور اس سے قبل ایزد سبحانہ تعالیٰ

آپ کو مرتبہ خلت پر فائز فرما چکا تھا۔ اور خلت وہ منصب عالی ہے جو محبوب کی محبت بالکل خالص اور بلا مشارکت رکھے جانے کا متقضی ہوتا ہے اور حقیقتاً اس کا اصلی مدعا اور غایت منشا یہی ہوتا ہے کہ محبوب کی محبت بلا شریک حصہ داری قائم رکھی جائے۔ مگر جب ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ سا بیٹا مل گیا تو آپ کا ایک گوشہ دل بیٹے کی محبت سے پر اور مملو ہو گیا اور گویا خلاف اصول خلت باپ کے دل کا وہ گوشہ خدا کے سوا دوسرے کا ہو گیا لہٰذا خلت کی صفت ابراہیم میں مشترک ہو گئی۔ اس لئے خدا نے آپ کو ذبح محبوب کا حکم دیا اور جب آپ اس کے اقدام پر کامل طور سے تیار ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ آپ کے دل میں خدا کی محبت بیٹے کی محبت سے زیادہ ہے۔ اس سبب سے آپ کی خلت اسی وقت شائبہ مشارکت سے پاک وصاف ہو گئی۔ اب کوئی مصلحت قربانی کی باقی نہیں رہی۔ اور اگر کوئی مصلحت الٰہیہ تھی تو وہ جناب ابراہیم کے استقلال قلب اور اطمینان نفس کا امتحان تھا اور یہی حاصل مقصود تھا۔

مندرجہ بالا عبارت بتلا رہی ہے کہ ذبح اسماعیل کا یہ عظیم الشان اور عدیم المثال واقعہ ایک طرف تو اسرار وحکمت ربانی کا مظہر تھا اور دوسری طرف صبر واستقلال انسانی کا مظہر۔ خدائے سبحانہ تعالیٰ امر ذبح کا (امتحاناً) آمر ہے اور پیغمبر حاضر (ابراہیمؑ) ذابح تھا اور پیغمبر لاحق (اسماعیلؑ) مذبوح۔ مقام ذبح۔ یا مذبح۔ پیشگاہ بیت اللہ ہے یہ واقعہ اپنی قدرتی عظمت واقتدار اور نیز اپنی نامورین کی ذاتی اور صفاتی قدرومنزلت کے اعتبار سے ایسا مہتم بالشان ثابت ہوتا ہے تو اس کا وہ فدیہ خاص جو منجانب اللہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اور اس وقت تک سے لے کر ابد الاباد تک تمام متبعین شریعت ابراہیمہ اور سائر امت اسلامیہ میں قائم فرمایا گیا ہے۔ وہ اصول فدیہ اور قواعد اخلاق کے مطابق اپنے مبدل منہ سے من حیث الوجوہ اول تو بہتر ہو۔ نہیں تو برابر مساوی اور ہم پایہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ ارشاد الٰہی کے بتلائے ہوئے نصاب فدیہ وہدیہ کے علاوہ روزمرہ کے اخلاقی مراسم ہمیں بتلا رہے ہیں کہ اقوام انسان میں جب ارسال ہدیہ یا ادائے فدیہ کے لئے۔ من افضل شئ ما یعطیہ او یہدیہ کی خاص شرط پائی جاتی ہے اور ہر شخص بقدر امکان اس کی پیروی کرتا ہے اور سالانہ تعمیل۔ تو ذات جناب باری عزاسمہ۔ جس کی استغناء کا کمال ان اللہ غنی حمید و انتم الفقر آء۔ خدا کی ذات غنی اور قابل ستائش ہے۔ اور تم لوگ (بندے) غریب وفقیر میں سے ہو یہ بات ظاہر وثابت ہے۔ اپنے بندہ کے مقدار کے بدلہ دینے اور اس کے فدیہ عطا کرنے میں کتنی لا انتہا فیاضی اور بخشش سے کام لے گا اور اس بدلہ یا فدیہ دینے میں اپنے مبدل منہ سے احسن ہونے یا اس کے ساتھ مساوی اور برابر ہونے کی کیسی احتیاط قائم رکھی ہوگی۔ کیونکہ عام فطرت انسانی اس کی تعمیل پر اس سختی اور احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ثابت ہوتی ہے۔ تو عادت الٰہی جو تمام مخلوق کی عادات وعملیات کی معلم ہے۔ کیونکر اس کی عامل اور آمر نہ سمجھی جاوے گی۔ یہ مشاہد اور قرائن بتلا رہے ہیں کہ آیہ وانی ھدایہ وفدایناہ وبذبح عظیم میں وتر کنۃ علیہ فی الاخرین۔ کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ یہ معمولی دنبیوں یا اور قسم کے حیوانوں اور لاکھوں قسم کے جانوروں کی قربانی نہیں ہے۔ جو اس واقعہ عظیمہ کی یادگار میں اس وقت سے لے

کر اس وقت تک ہر سال خدا کے نام پر کی جاتی ہے مگر حقیقت میں آنکھیں۔معرفت کی آگ کو قلوب خوب جانتے اور پہچانتے ہیں کہ ایک نبی اللہ کے کیا مراتب ہیں۔اور ایک جانور یا بے شمار جانوروں کی جانوں کا اس کے مقابلہ میں کیا وجود ہوسکتا ہے۔خدا کی بارگاہ میں نبی اللہ کے ایک قطرہ خون کی کیا قدر وعظمت ہے۔اور ایک جانور یا بے شمار جانوروں کے دریائے خون کی کیا ہستی ہے اور کیا مقدار۔

حقیقت میں جن لوگوں نے ذبح عظیم سے سالانہ دنبوں کی قربانی مراد لی ہے۔وہ حقیقتاً انبیا ومرسلین سلام اللہ علیہم اجمعین کے خون مطہر کی قدرو قیمت سے بالکل ناواقف ہیں۔اور اگر واقف ہیں اور اپنی کسی خودغرضی سے اس کے اظہار میں تغافل وتساہل اختیار کرتے ہیں تو حقیقتاً ایسے لوگ ان مقدسین ومرسلین کی تحقیر وذلت اور استخفاف مراتب ومدارج کے مرتکب ہوتے ہیں۔تحقیق کی زیادہ نظر ڈالی جائے تو اس خیال اور عقیدے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

عبداللہ ابن عمر صحابی کی مجلس کا مندرجہ ذیل متنفسرہ۔جس کو ہم صحیحین کے اسناد سے لکھتے ہیں۔اس کی حقیقت کا پورا انکشاف کرتا ہے۔اور اس خون مطہر کی عظمت کا کامل اعتراف۔صحیح بخاری باب المناقب الحسن والحسینؑ میں مرقوم ہے۔

حدثنا محمد ابن یشار قال حدثنا شعبه عن محمد ابن ابی یعقوب سمعت ابن ابی نعم قال سمعت عبد الله ابن عمر سئله رجل عن المحرم قال شعبه احسبه بقتل الذباب فقال اهل العراق یسئلون عن قتل الذباب وقد قتلوا ابن بنت رسول الله صلعم

عبداللہ ابن عمر سے کسی عراق کے رہنے والے نے حالت احرام میں مچھر کے مار ڈالنے کا مسئلہ دریافت کیا۔عبداللہ عمر نے کہا اہل عراق قتل ذباب کا مسئلہ تو مجھ سے دریافت کرتے ہیں درآنحالیکہ انہیں لوگوں نے رسول خدا صلعم کے نواسے کو قتل کرڈالا۔(خلاصہ ترجمہ)

اس واقعہ اور متنفسرہ سے اگر اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اس خون مطہر کی نسبت عظمت اور حرمت کا خیال قرن اولیٰ ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔اگرچہ کیسا ہی زبانی اور ظاہری کیوں نہ ہو۔کیونکہ دنیاوی ضرورتیں اور تعلقات اور تحصیل مال ودولت اور فکر وتلاش معاش کی کشمکش کچھ ایسی مجبوریاں۔پاؤں کی بیڑیاں اور زبان کا قفل بن جاتی تھیں کہ آدمی کا اپنے ایک خیال اور اعتقاد پر قائم رہنا سخت دشوار تھا۔یہی بزرگ (عبداللہ ابن عمر) جو حسینؑ (روحی لہ الفدا) کے خون مطہر کو اس عظمت وحرمت کا مستحق قرار دیتے ہیں وہی ذات شریف ان کے قاتل یزید کو خلیفہ برحق تسلیم کرتے ہیں۔اور مدینہ کے مسلمانوں میں سب سے پہلے اس کی بیعت فرماتے ہیں۔اور جو اس کی بیعت سے انکار کرتا ہے اس پر بغاوت۔غداری اور شق عصائے امت کا حکم لگاتے ہیں۔(طبری۔ابن اثیر)

وہ حکم بھی حضرت عبداللہ ابن عمر کا تھا۔اور اب یہ فرمان بھی آپ کا ثابت ہوتا ہے۔تو اب متبعین اور عام گروہ مسلمین ان دونوں مخالف اور معارض میں سے کس حکم کو اختیار کریں۔بینوا و توجزواً۔

بہرحال جب آغاز ہی سے متقدمین صحابہ اور تابعین کی۔ ان معاملات میں۔ یہ تذبذب حالت پائی جاتی ہو۔ تو ان کی زبان وقلم سے اہلبیت طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کے اصل معارف ومشارف کی حقیقت نویسی کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ اور ان کے متعلق اصل واقعات کیسے معلوم ہوسکتے ہیں۔

اتنا لکھ کر ہم پھر اپنے سابق سلسلہ بیان پر آجاتے ہیں۔ ہم اپنی بحث میں اوپر لکھ آئے ہیں کہ ایک جانور کیا بے شمار جانور۔ عام اس سے کہ وہ زمین سے لائے جائیں۔ یا آسمان سے۔ ان کی پرورش چمنستان عالم میں ہوئی ہو۔ یا گلستان ارم میں۔ کسی صحیح دماغ اور سلیم عقل والے کے نزدیک۔ ایک نبی زادے کے ہمسر اور برابر نہیں ہوسکتے۔ اس بنا پر ضرور ہوا کہ حضرت اسماعیل کا فدیہ اور بدل موعود بھی ایسا ہی عظیم المرتبہ ہو جو اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے آپ کا ہمسایہ۔ ہمسر اور ہمثال ثابت ہوتا ہو۔

جب ہمارے استدلال کے تمام عقلی اور نقلی دلائل اور سارے قرائن۔ اور ان سب کے ساتھ اس واقعہ عظیمہ کی صورت حال بھی۔ فدیہ اور بدل میں باہمی مساوات اور مماثلت کو ضروری اور لازمی قرار دیتی ہے۔ تو اب ہم پوچھتے ہیں کہ تاریخ وسیر کے بالاستیعاب سیر کرنے والے اور ہر ہر واقعہ کو تحقیق وتفتیش کی نظر سے پڑھنے والے۔ ہمیں بتلادیں کہ اس واقعہ عظیم الشان کے بعد خاندان ابراہیمی اور دودمان اسماعیلی میں وہ کون سی ایسی قربانی۔ خدا کے نام۔ خدا کی راہ اور خالص امر حق کے اظہار واستقرار کے لئے عمل میں لائی گئی ہے۔

اس کی تلاش وجستجو میں متلاشین حقیقت کو کم سے کم دو ہزار برس تک کے تاریخی واقعات دیکھنے پڑیں گے۔ اور اس مدت میں ایک واقعہ بھی اس کی مثال میں نہیں ملے گا۔ مگر ہاں اس سلسلہ عالیہ میں حضرت عبدالمطلب کے عہد امارت میں۔ آپ کے صاحبزادے۔ حضرت عبداللہ کا ایک واقعہ ملے گا۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ حضرت عبداللہ کی قربانی کے معاملہ کو فدیہ اسماعیلی ہونے کا پورا حق حاصل تھا۔ کیونکہ اس میں اور بدل منہ میں باہمی مساوات بھی موجود تھی۔ مگر جیسا کہ تمام اسلامی مفسرین۔ محدثین اور مؤرخین کا متفق علیہ بیان ہے۔ اس قربانی میں بھی۔ اس مصلحت خاص سے۔ فدیہ اور بدل کا حکم آگیا کہ جناب عبداللہ کی ذات بابرکات سے جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذیجود قائم ہونے والا تھا۔ اس لئے حضرت عبدالمطلب نے جناب عبداللہ کے بدلے میں سواونٹوں کا فدیہ دیا۔

واقعات کی اصلی حقیقت جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ جناب اسماعیل کے واقعہ قربانی میں فدیہ اور بدل واقعہ ہونے کی جو مصلحت مضمر تھی وہی مصلحت اور ضرورت حضرت عبداللہ کے واقعہ ذبح میں بھی لاحق ہوئی۔ اور مدبرین قدرت کو۔ دونوں معاملات میں ہم قالب ہونے کی وجہ سے ایک ہی طرح کا فیصلہ دینا پڑا۔

بہرحال ہمارے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوگیا کہ واقعہ ذبح حضرت عبداللہؑ۔ جو حضرت اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح کی تنہا مثال تھا۔ وہ بھی فدیہ اور بدل واقع ہوجانے سے ناقص اور ناکامل ثابت ہوگیا۔ کیونکہ قرآن مجید میں جو الفاظ فدیہ اسماعیل کی تعریف میں آئے ہیں وہ فدیناہ بذبح عظیم کی تفصیلی صورت میں آئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اسماعیل کا فدیہ ذبح عظیم کی صورت میں دینا چاہیے۔ چونکہ حضرت عبداللہ کے واقعہ میں بھی ذبح واقع نہیں ہوا۔ اس لئے وہ بھی فدیہ اسماعیلی ہونے کا شرف حاصل نہیں کرسکا۔

اب تاریخ وسیر کے ماہرین اور محققین بتلادیں کہ پھر اس مبارک اور مقدس سلسلہ اسماعیلی میں کوئی متنفس کوئی فرد واحد۔ سوائے ذبیح

کربلا۔ قتیل نینوا۔ سید الشہداء۔ خامس آلِ عبا۔ ابی عبداللہ الحسینؑ علیہ التحیۃ والثنا کے فدیہ اسماعیلؑ ہونے کی مفاخرت اور مماثلت رکھنے کا مستحق اور دعویدار ہوسکتا ہے؟ کیونکہ ذبح اور عظیم کے خاص دونوں الفاظ۔ جو فدیہ اسماعیلی کو تعریف میں بطور مخصوص آئے وہ ہر پہلو اور ہر قرینہ سے واقعہ عظیمہ کربلا کے ساتھ پورے پورے منطبق ہو جاتے ہیں۔ اور ذبح اور عظیم۔ دونوں صفات مذکورہ کی اصلی اور حقیقی شکل و صورت پوری تفصیل و تکمیل کے ساتھ اس ایک واقعہ میں قائم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس واقعہ کے بعد آج تک کسی دوسرے واقعہ کا ایسا عظیم اور شدید نہیں واقع ہونا ثابت نہیں کر رہا کہ سوائے اس ایک واقعہ کے کوئی دوسرا واقعہ ذبح عظیم کا نہ مقابل ہوا ہے اور نہ مماثل۔ اور نہ سوائے اس کے ان الفاظ ربانی سے کوئی دوسرا مستفاد ہوسکتا ہے اور نہ مراد۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ناظرین کتاب کو بتلا دیں کہ شبلی صاحب کی طرح میرا یہ بیان میری خاص طباعی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی صحت اور حقیقت کی سند میں ایک ایسے محقق اور قابل نقادفن کا قول ونظریہ پیش کر دیں جو فی الحال سواد اعظم میں شریعت اور طریقت۔ دونوں طریقوں کی جامعیت اور علمیت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ نواب خاں بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس پریانواں مولف تاریخ احمدی وغیرہ وغیرہ۔ اپنے رسالہ البلاء المبین میں رقمطراز ہیں۔

> حضرت اسماعیل کی قربانی کا واقعہ تو سب کو معلوم ہے جس کی نسبت خداوند عالم فرماتا ہے ان ھذا لھو البلآء المبین وفدیناہ بذبح عظیم۔ ان ھذا لھو البلاء المبین کے معنی تو صاف ہیں کہ فی الواقع یہ ایک روشن امتحان ہے۔ لیکن وفدیناہ بذبح عظیم کا مطلب سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کس ذبح عظیم یعنی قربانی بزرگ کے بدلے۔ حضرت اسماعیلؑ کو بچالیا۔ فی الحقیقت وہ ذبح عظیم جس کا ذکر اس آیہ کریمہ میں ہے۔ وہی تھا جو عاشورہ محرم کو کربلا کے میدان قیامت خیز میں بروز جمعہ بوقت عصر واقع ہوا۔ اور ابراہیمؑ کے فرزند کی ناتمام قربانی کو علیؑ کے لختِ جگر حسینؑ نے کامل کر دیا۔ تھوڑا غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ذبح گوسفند کی یہ حقیقت نہیں تھی کہ حضرت اسماعیلؑ کے مقابلہ میں ذبح عظیم کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے۔ اخبار صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب حسب منشاء حکم باری تعالیٰ حضرت اسماعیل کو قربان کرنا چاہا اور بعدہٗ بموجب ارشاد باری اس عمل سے باز رکھے گئے۔ تو آپ کو حزن وملال کے ساتھ یہ خیال پیدا ہوا کہ جس قربانی کے لئے کئی بار شدید تاکید کے ساتھ مامور کئے گئے۔ اس سے کیوں باز رکھے گئے پس حق سبحانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ان ھذا لھو البلاء المبین وفدینه بذبح عظیم یعنی واقعی یہ بہت ہی سخت امتحان ہے اور ہم نے اسماعیلؑ کو ایک بڑی قربانی سے بچا لیا حضرت ابراہیمؑ نے بڑی قربانی کو

دریافت کیا تو ارشاد ہوا کہ تیرا فرزند حامل نور ختم المرسلینؐ ہے اس وجہ سے ہم نے تیرا امتحان لے کر اسمٰعیلؑ کو بچا لیا۔ پھر حق سبحانہ تعالیٰ نے خلیل اللہ کی نظروں سے رفع حجاب فرمایا کہ آپ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل باصفا کا رتبہ جلیلہ مشاہدہ فرمائیں۔ جب آپ نے یہ منظر عالی منزلت ملاحظہ فرمایا تو بہت ہی محظوظ ہوئے اور حسین ابن علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیکھ کر فرمایا یہ کون ہیں۔ جواب آیا کہ یہ اسماعیلؑ کے فرزند ولخت جگر یعنی حضرت محمد مصطفی صلعم کا بیٹا حسینؑ ہے۔ اے ابراہیمؑ اپنی ذریت کو دوست رکھتا ہے یا محمدؐ کو۔ اپنے فرزند اسماعیلؑ کو دوست رکھتا ہے یا محمدؐ کے فرزند حسینؑ کو۔ ابراہیمؑ نے عرض کی کہ خداوند میں محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات سے امام حسین علیہ السلام کو حضرت اسماعیلؑ کی ذات سے زیادہ دوست رکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا اسماعیلؑ کا فدیہ عظیم بھی یہی ہے۔ اشقیائے امت اس کو مع اس کے اطفال خرد سال کے تین دن کا بھوکا پیاسا۔ غربت اور بے کسی کی حالت میں نہایت ظلم وستم کے ساتھ شہید کریں گے۔ جس کو دیکھ کر شجر وحجر۔ آسمان وزمین اور وحش وطیور روئیں گے۔ جب جناب خلیل اللہ نے یہ واقعہ سنا۔ شدت قلق سے آپ پر عالم گریہ طاری ہوا۔ اور سرشک غم دیدہ ہائے مبارک سے جاری ہوئے۔ خطاب آیا۔ اے ابراہیمؑ۔ حسین پر رونا اسی ثواب کے برابر ہے۔ جو اسماعیلؑ کی قربانی سے حاصل ہے۔ مناہج الطالبین قزوینی۔ روضہ الشہداء ملا حسین واعظ کاشفی صاحب تفسیر حسینی۔ حبیب السیر معارج النبوۃ ملا معین ہروی۔

بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کو گھر سے لے چلے اور حضرت ہاجرہ نے چھری اور رسن لینے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا ایک گوسفند قربانی کرنا ہے۔ پس حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک گوسفند قربانی بھیج کر اپنے برگزیدہ نبیؑ کے قول کو پورا کر دیا۔

اس عجیب راز کو تو دیکھو کہ باوجود صدہا زخموں کے جناب سید الشہداء روحی لہ الفدا کی روح مبارک نے جسد اطہر سے اس وقت تک مفارقت نہیں کی جب تک آپ کے گلوئے تشنہ پر خنجر جفا پھر کر لفظ ذبح کا مصداق نہ ہولیا۔ اور اسی لفظ ذبح کی رعایت تھی کہ آپ کے قاتل بھی اسلام کے مدعی تھی کیونکہ ذابح کے لئے کلمہ گو ہونے کی شرط ہے گو وہ زبانی ہی کیوں نہ ہو۔ اور چونکہ شہادت کبریٰ کی تعمیل بھی منظور الٰہی تھی۔ لہٰذا وہی اشرار وملاعین جو

برائے نام اسلام کا دم بھرتے تھے۔ لفحوا کیف یھدی اللہ قوماً کفروا بعد ایمانہم و شھدوا ان الرسول۔ (خدائے سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کیا اور رسول پر شہادت دینے کے بعد پھر کافر ہو گئے ان کو خدا کیسے ہدایت فرما سکتا ہے۔ کفار ناہنجار سے بدتر اور نابکار ہو گئے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ان الذین کفروا بعد ایمانہم ثم ازدادوا کفر لن نقبل توبتہم والئك هم الظلمون۔ جیسا کہ خدائے سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کے بعد پھر کفر اختیار کیا تو انھوں نے اور زیادہ کفر کیا۔ ان کی توبہ کبھی قبول نہیں اور وہی لوگ ظالم ہیں) پس گویا قدرت نے ذبح اور شہادت کے دونوں پہلوؤں کو ایک ہی واقعہ سے ثابت اور مکمل کر دیا۔ (رسالۂ البلاء المبین مطبوعہ کانپور)

لائق ہم عصر نے سواد اعظم کے متذکرہ صدر علما و محدثین اور مؤرخین کے اقوال سے ہمارے اس نظریہ اور تحقیق کی پوری تائید اور کامل تصدیق ہوگئی کہ آیہ وافی ھدایہ و فدیناہ بذبح عظیم کا اصلی مقصود اور حقیقی مفہوم سوائے جناب سید الشہداء شہید کربلا علیہ التحیۃ والثنا اور دوسرا ہو ہی نہیں سکتا اور مقتل اسماعیلی کی پوری اور کامل مماثلت اور مشاکلت سوائے مقتل کربلا کے اقطاع عالم میں کسی مقام کے کسی تاریخی واقعہ اور مشاہدہ سے۔ کوئی تاریخ۔ کوئی سیرت اور کوئی تذکرہ ثابت نہیں کر سکتا۔

ہمارے محقق معاصر نے لفظ ذبح کی تحقیق اور اس کی مطابقت نہایت وضاحت کے ساتھ ثابت فرمائی ہے۔ لیکن اس کی عظمت۔ جو لفظ عظیم سے ظاہر ہوتی ہے۔ کسی قدر تصریح طلب ہے۔ منقول طریقہ سے جیسا کہ محدثین کے نقل اقوال سے اوپر نقل ہو چکا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بمقابلہ حضرت اسماعیلؑ کے زیادہ دوست رکھنے کا اقرار کر لیا تو حسینؑ کی شہادت۔ اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح سے عظمت میں بڑھ گئی۔ اسی لئے لفظ عظیم سے قرآن مجید کے الفاظ الہامی میں مخصوص و منصوص فرمائی گئی۔

معقول طریقہ استدلال سے بھی دیکھا جائے تو بھی ہر قرینہ۔ ہر طریقہ اور ہر پہلو سے قتل حسینؑ کا قیامت خیز واقعہ ذبح عظیم تسلیم کئے جانے کا پورا استحقاق رکھتا ہے۔ اور کیونکر نہ ہو۔ مفصلۂ ذیل واقعات پیش نظر رکھے جائیں۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے کو صرف ذبح کئے جانے کا حکم ہوا تھا۔ جو غیر تعمیل اور بلا تکمیل رہ گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا منتوں والا فرزند چھری کے نیچے سے صحیح و سالم بچ آیا۔ اگرچہ ہمارے رسول خدا مصطفی کا نور نظر۔ فاطمہ زہرا کا لخت جگر۔ شمر کے خنجر بیداد کے نیچے سے نہ بچا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو راہ خدا میں ذبح کرنے پر آمادہ اور تیار ہو گئے۔ حقیقت میں بڑی اور فوق البشری پائیداری و استقامت دکھلائی۔ مگر جب اس کے مماثل واقعات۔ سلسلہ مقتل حسینؑ میں دیکھے جاتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ صابر باپ اسماعیلؑ کے نوجوان بیٹے کو اس پورے یقین کے ساتھ کہ یہ زندہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ بطیب خاطر راہ خدا میں برچھیاں کھانے اور سر کٹانے کے لئے بھیج

دیتا ہے۔ یہ آٹھارہ سالہ جوان قتل ہوجاتا ہے۔ یہ خونی منظر آنکھوں سے دیکھ کر۔ صابر باپ فوراً اس قربانی کی منظوری کے شکریہ میں جھک کر سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اور اس پر حزن وملال کا کوئی ظاہری عالم طاری نہیں ہوتا۔ اور رضائے الٰہی میں اس کی مستعدی۔ راہ خدا میں اس کی ایثار نفسی اور عالی ہمتی کم نہیں ہوتی۔ سجدہ سے اٹھتا ہے اور فوراً ایک طفل شیر خوار کو اپنے ہاتھوں پر گھر سے اٹھالیتا ہے۔ اور تین بھالوں والا تیر کھلوا کر راہ خدا میں قربان کردیتا ہے۔

(۳) حضرت اسماعیل کے نازک گلے پر چھری پھیرنے والا ہاتھ بھی تھوڑی دیر کے لئے اگرچہ قاتل ہی کا ہاتھ کہلائے گا۔ مگر پھر حقیقتاً اسی باپ کا وہی ہاتھ تھا۔ جو اس سے قبل شفقت اور محبت کے غیر متحمل تقاضوں سے اسماعیلؑ کے سر اور پشت پر بے شمار بار پھر چکا تھا۔ مگر حسینؑ اور ان کے جوان۔ کمسن اور شیر خوار بچوں پر ان خونخوار۔ ظالم و بے رحم قاتلوں کی تلواریں اور خنجر پھیر دیئے گئے۔ اور ان ہاتھوں نے خنجر پھیرے۔ جن کے قلب لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے اور ان سے رحم ومروت اور رعایت کی امید رکھنا قطعی محال تھا۔ مگر حضرت کے جوان بیٹے کو مرتے ہوئے دیکھا اور شکر کا سجدہ انہیں کرتے ہوئے دیکھا۔ حسین نے بالآخر ان فوق البشری مصائب پر کیا کیا صبر کیا اور اپنے جوان صالح کے مارے جانے اور فائز شہادت ہونے پر خدا کا شکر کیا۔

(۴) ان کے علاوہ۔ غربت۔ مسافرت کا عالم۔ تپش اور قیامت کی گرمی کا موسم۔ سینکڑوں کوسوں کا سفر۔ دن بھر کی دھوپ۔ رات بھر کی شبنم۔ ہر منزل پر کیا۔ ہر ہر قدم پر قتل وغارت کی دہشت بال بچوں کا ساتھ پانی کی کمی۔ غلہ کا مال۔ پھر داخلہ کربلا کے بعد پانچ دن بعد آب ودانہ کی قطعی بندش چوبیس پہر کی پیاس۔ مجبور اور شکستہ پا خواتین اور بچوں کی بے تابی اور بے قراری۔ اور پھر روز عاشور صبح سے عصر تک اٹھارہ عزیز اور چونسٹھ رفقا کا سامنے قتل کیا جانا۔ وہ قیامت خیز منظر تھا۔ جن میں سے ایک شائبہ بھی حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے پیش نظر نہیں تھا۔ مگر حسینؑ اپنے کمال استقلال سے ایک ایک کرکے ان تمام مصیبتوں کو اپنی تنہا جان پر کھیل گئے۔ یہ خونی واقعات ہر قرینہ اور ہر طریقہ سے حسینؑ کے واقعہ ذبح کو اسماعیلؑ کے واقعہ ذبح سے عظیم ترین ثابت کرتے ہیں۔ یہ وہ مقامات تھے جن میں ایک بھی نہ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور نہ اسماعیلؑ کی جان پر گذرے۔ اسی بنا پر وحی الٰہی نے اس کو مخصوص طور پر لفظ عظیم سے تعبیر کیا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرے امر پر بھی غور کرنا چاہیے۔ آخر فقرہ آیہ مبارکہ جس پر واقعہ ذبح کا اسماعیلؑ کی بشارت تمام ہوتی ہے۔ **وترکنا علیہ فی الاخرین**۔ جس کے ظاہر معنی یہ ہوتے ہیں۔ ہم نے اس کا ذکر آیندہ نسلوں میں یادگار چھوڑا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس واقعہ کے ہمیشہ ذکر قائم رکھے جانے کی بشارت دی جاتی ہے وہ ذبح اسماعیل کے ذکر سے منطبق ہوتی ہے یا ذکر شہادت حسینؑ سے۔ جب ہم اس بشارت کی عملی صورت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ذبح اسماعیلؑ کے متعلق تمام دنیا کے مسلمان سوائے اس کے قربانی والے دن۔ سال میں ایک مرتبہ (دسویں ذی الحجہ) قربانی کردیں۔ اور نہ کبھی آپ کا کوئی ذکر کرتا ہے اور نہ آپ کے واقعات و حالات کا تذکرہ۔ میرے خیال میں اکثر کو اب تک اصل واقعات کی خبر بھی نہیں۔ بخلاف اس کے ذکر حسینؑ۔ آپ کے ابتلا وامتحان کے حالات ووا قعات۔ باوجود اس کے وقت وقوع سے۔ اس کے موقوف کرنے کی بے شمار تدبیریں۔ چھپانے اور مٹانے کی لاکھ لاکھ ترکیبیں کی گئیں۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ غیر اقوام وملت کے لب وزبان پر کامل شرح وبسط کے ساتھ آج تک جاری ہیں۔ اور اس

کے ذکر کے لیے ایام مخصوصہ اور وقت مقررہ کی بھی کوئی تخصیص اور شرط ضروری نہیں تھی۔ یہ وہ ذکر ہے جو ہر وقت تازہ ہے اور ہمیشہ جاری۔ مسلمانوں کے ان کئی کروڑ نفوس کے علاوہ۔ جو اس ذکر کے احیا کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اسلام کے تمام فرقے اور شعبے بھی اس کے ذکر و افکار سے غافل نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے ذکر و احیا سے خاص ہمدردی اور دلچسپی رکھتی ہے۔ اور اکثر اس کو ارادت و عقیدت میں داخل کر لیتی ہیں۔ الغرض جہاں تک تحقیق اور غور سے کام لیا جاتا ہے اور روزانہ مشاہدات سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ امر یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ذبح اسماعیل کے ذکر سے شہادت حسینؑ کا ذکر کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ تو ذبح عظیم و ترکنا علیہ فی الآخرین کا اصلی مدعا اور حقیقی منشاء۔ ذکر حسین سے پورا ہوتا ہے۔ نہ ذکر اسماعیل سے۔ تو پھر اس بشارت کے مطابق۔ ایک اتنے بڑے ذکر مشہور کے ہوتے ہوئے۔ جو صریحاً تمام اقطاع عالم اور ہر قوم و ملت میں ہمیشہ آج تک ذائع اور شائع ہے۔ کیونکہ عقل سلیم اس واقعہ کے ذکر کو عظیم تسلیم کریں گے۔ جو باعتبار ذکر و شہرت کے نہ اتنا مشہور ہے اور نہ اس کثرت سے مذکور۔

اگر زبانی ذکر سے یہاں مقصود نہیں ہے۔ بلکہ تحریر و نقل اور استحفاظ بین الدفتین مراد ہے تو ہم دکھلاتے ہیں کہ جتنے کثیر التعداد دفتر اور بڑے بڑے کارنامے مقتل حسینؑ کے ذکر و تفصیل میں دین اور دنیا کے پیش نگاہ ہیں اور ان کے مقابلہ میں عشر عشیر کتابیں بھی حضرت اسماعیلؑ کے شرح و ذکر واقعات میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ روزمرہ کے مشاہدے ہیں اور امور مسلمہ جس سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس لئے تحریری اور تقریری دونوں طریقوں سے اس بشارت ایزدی کے اس ذکر موعود کا اصلی مقصود واقعہ کربلا ہی کا ذکر ثابت ہوتا ہے۔

عبارت قرآنی کی ترکیب بھی بتلا رہی ہے کہ علیہ کی ضمیر واحد غائب قاعدہ قربت و اتصال کے مطابق ذبح عظیم کی طرف راجع سمجھی جائے گی نہ واقعات ذبح اسماعیلی کی طرف راجع۔ کیونکہ ضمیر متصل کی ضرورت صریح اور موقع مناسب کے ہوتے ہوئے۔ اس کو ضمیر منفصل سمجھنا دلیل مہمل ہے۔

فدیناہ بذبح عظیم کی بشارت قرآنی کا جو حقیقی مفہوم و مقصود تھا۔ وہ عقلی اور نقلی دلائل اور قرائن سے پورے طور پر ثابت کر دیا گیا۔ اب نصوص الٰہیہ کے بعد احادیث و اقوال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کی اہمیت اور عظمت کی شان دیکھنی چاہیے۔ اس امر کی تلاش و تحقیق میں ہمیں صحاح۔ مسانید اور سنن میں۔ غرض تمام اقسام کتب حدیث سے۔ اتنی کثیر التعداد اور صحیح الاسناد حدیثیں ملتی ہیں۔ جن سے تنہا یہ ہی نہیں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلعم نے مقتل حسینؑ کی خبر اپنی زبان صداقت ترجمان سے تمام اہل اسلام کو پہنچائی۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی خبر کو منجانب اللہ ایک بار نہیں کئی بار ایک ملک مقرب کے ذریعہ سے نہیں بلکہ مختلف فرشتوں کی وساطت سے پہنچایا گیا ہے۔ ہم اگر ان تمام حدیثوں کی تفصیل سے صرف نقل اجمالی کا قصد کریں تو پھر یہ جزو تالیف ہمارے مقتل کی ایک اور کامل تیار ہو جائے گی۔ جو ہمارے موضوع تالیف سے زائد ہے۔ اس لئے ہم شریعت کے مقتدا۔ طریقت کے رہنما مرحوم صاحبزادہ حسن میاں صاحب پھلواروی کی کتاب۔ شہادت حسین۔ مطبوعہ لاہور سے۔ صرف ان راہبانوں کے نام۔ جنھوں نے آنحضرت صلعم سے اس واقعہ عظیمہ کی پیشین گوئیوں کو منجاب اللہ ہونا بیان کیا ہے۔ اور انہیں بزرگوں کے ساتھ ان مفسرین محدثین مؤرخین اور ان کی کتابوں کے نام بھی ذیل میں درج کئے دیتے ہیں۔ جنھوں نے اس واقعہ کو اپنی اپنی تالیف میں قلمبند فرمایا ہے۔

صحابہ کبار میں

حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰؑ ۔(خود) حضرت امام حسینؑ ۔حضرت عبداللہ ابن عباس ۔حضرت انس ۔ابوالدرداءاور زیدابن ارقم

امہات مومنین میں خواتین صحابہ

حضرت عائشہؓ ۔حضرت ام سلمہ اور حضرت زینب بنت جحش ۔حضرت ام الفضل مادر حضرت عبداللہ ابن عباس ۔اسماء بنت عمیس اور سلمیٰ نے اس کی پیشین گوئی کی روایت کی ہے۔

مفسرین محدثین اور مؤرخین

ہرطبقہ کے علماومحدثین اس کواپنی کتابوں میں مستند کرتے آئے ہیں۔

امام احمد بن احنبل (۱)،ابن ابی شیبہ (۲)،عبدابن حمید کشی (۳)،ابوداؤد (۴)،ترمذی (۵)،ابن سعید (۶)،طبری (۷)،حاکم (۸)،عبدالرزاق (۹)،ابونعیم (۱۰)،ابویعلی (۱۱)،ابن عساکر (۱۲)،طبرانی (۱۳)،خطیب بغدادی (۱۴)،بیہقی (۱۵) وغیرہم

متاخرین علماومحدثین۔

اور پھران سے اکابر محدثین وعلمائے محققین نقل کرتے آئے ہیں۔

ابن تیمیہ (۱۶)، ابن قیم (۱۷)، نودی (۱۸)، ابن صلاح (۱۹)، سبکی (۲۰)، ابن سبکی (۲۱)، قاضی عیاض (۲۲)، بیضاوی (۲۳)،غزالی (۲۴)،ابن عربی (۲۵)،قرطبی (۲۶)، ذہبی (۲۷)،مزی (۲۸)،ابن اثیر (۲۹)،ابن حجرعسقلانی (۳۰)،ابن حجر مکی (۳۱)، عینی (۳۲)،سخاوی (۳۳)، (سمہودی (۳۴)،شعرانی (۳۵)،جلال الدین سیوطی (۳۶) ۔شیخ علی متقی (۳۶)، شیخ عبدالحق ۳۸،شاہ ولی اللہ (۳۹)،شاہ عبدالعزیز (۴۰)۔

علمائے اندلس

اکابر محدثین وعلمائے اندلس ۔مثل ابوعمر (۴۱) ۔قرطبی ۴۲)،ابن حزم (۴۳)،حمیدی (۴۴)،ابن عربی مالکی (۴۵)،ابن عربی صوفی (۴۶)،ابن عبدربہ (۴۷)،اورمقری (۴۸) وغیرہم بھی واقعہ شہادت کو اپنی کتاب میں درج کر چکے ہیں۔شہادت حسین مطبوعہ امرتسر صفحہ 40۔

جب اتنے صحابہ کبار اور اتنے کثیر التعداد۔محدثین ۔مفسرین اور مؤرخین کی جماعت اس واقعہ کے الہامی ہونے کی تصدیق وتوثیق میں ہم کلام وہم زبان ہے ۔تب خودغرضی ۔تقلید اسلاف وغیرہ کو تھوڑی دیر علیحدہ رکھ کر ۔اس واقعہ کوعظیمہ کی نسبت **وفدیناہ بذبح عظیم** کے سچے مفہوم اور اصلی مقصود تسلیم کرنے میں کسی مسلمان کو کیا عذر ہوسکتا ہے اور کیا کلام۔

ہم اس بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی۔ اس کے کسی پہلو کو ناتمام اور غیر منفصل بھی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اب ہم اسی کے ضمن میں شبلی صاحب کی اس تاویل کو جو انھوں نے حقیقت قربانی کی تفصیل میں۔ تمثیلی اور عینی کی اصلیت کھولنے کی غرض سے قلمبند فرمائی ہے یاد دلاتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ مولوی صاحب کو اس خیالی تاویل کی جگہ۔ ذبح اسماعیل کے تذکرہ میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی صحیح اور قریبی تمثیل یاد آئی ہوتی۔ مگر افسوس جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ایک زمانہ سے یہ حضرات اور ان کے واقعات۔ مصالح ملکی کے مخالف ہونے کے باعث۔ مرفوع القلم ہو چکے ہیں۔ اور بالکل نسیاً منسیاً۔ ان کے کوئی محاسن۔ محامد اور مشارف نہ قابل ذکر ہیں نہ لائق غور وفکر۔ منقولات۔ معقولات۔ قرائن۔ قیاسات۔ اسناد و اشہاد صحیحہ سے اقتباسات ان کے فضائل و مناقب میں دکھلائے جائیں۔ بالکل موضوعات اور مجہولات ٹھہرائے جائیں گے۔ پھر ایسی نفسانیت کے تیرو تار عالم میں ہمیں شبلی صاحب یا ان کے ہم عقیدہ حضرات سے اس واقعہ کی عظمت اور حرمت کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ جس کا سننا گناہ اور ذکر کرنا معصیت ہے۔

ہمارے مرقومہ بالا استدلال نے اس مسئلہ کو کامل طور سے ثابت کر دیا کہ ذبح عظیم سے موجودہ رسم قربانی جانور ان نہ عقلاً مراد ہوسکتی ہے نہ نقلاً۔ اسی طرح تر کناہ علیہ فی الآخرین سے ذکر واقعہ اسماعیل مقصود نہیں ہے بلکہ ذکر شہادت حسین اور لفظ فدیٰ۔ اور ذبح عظیم کا اصلی اور حقیقی مفہوم سوائے قتل حسینؑ کے کوئی اور دوسرا واقعہ نہیں ہوسکتا۔

توریت کے نقب آ ے اثنا عشر

ہم اپنے موجودہ استدلال کے ایک دوسرے پہلو پر نظر کرتے ہیں کہ جناب اسماعیل کے حالات و واقعات میں شبلی صاحب اور نیز سر سید مرحوم نے توریت مقدس کے حوالے اور اسناد پیش کئے ہیں۔ اول ان اسناد و اشہاد سے اس واقعہ کی قدامت ثابت کرنا ہے اور دوسرے یہ کہ مخالفین کو اپنے مشاہد دیکھ کر عذر کا پہلو باقی نہ رہے۔ میں کہتا ہوں۔ دونوں حضرات کی توجیہات صحیح ہیں اور بالکل مناسب۔ مگر اس کے ساتھ اتنی عرض ضروری ہے کہ ان اسناد و اشہاد کے تمام کلیات و جزئیات سے مستفاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یا صرف انہیں مندرجات سے فائدہ اٹھانا چاہیے جن سے آپ حضرات کے مطلب نکلتے ہوں۔

سید صاحب اور شبلی صاحب۔ دونوں صاحبوں نے تورات۔ کتاب اول باب 17۔ آیت 20 سے حضرت اسماعیل کے متعلق یہ عبارت لکھی ہے۔

> اے ابراہیمؑ میں نے تیری دعا اسماعیلؑ کے حق میں قبول کی ہاں میں نے اسے برکت دی اور اسے بارآور کیا اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اس سے بارہ امام (سردار) پیدا ہوں گے اور میں ان کو بڑی قوم بناؤں گا۔

دونوں حضرات نے بارہ امام یا سردار کے مفہوم کو باعتبار ظاہر ان کے بارہ بیٹوں کی تعداد سے مطابق پا کر منسوب کر دیا ہے حالانکہ یہ حضرات اگر ذرا بھی حقیقت کی نگاہوں سے اس مسئلہ کو دیکھتے۔ تو ان کو خود معلوم ہو جاتا کہ جن الفاظ مخصوصہ سے خداوند عالم نے حضرت

اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ اس وقت اس نام ولقب سے مشہور ہوا۔ اور نہ اس وقت تک کوئی اس نام و لقب سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اور نہ خود تورات میں ان کے امام۔ پیشوا۔ یا سردار امت ہونے کی کہیں تصریح ہے یا ان کی نسبت ان انقلاب وآداب کا ذکر و مذکور ہے۔ اور نہ ان مناصب و مراتب کے متعلق ان کے کوئی احکام۔ اقوال یا ارشاد کہیں پائے جاتے ہیں۔ پھر کیسے کوئی عقل سلیم رکھ کر ان لوگوں کو خطاب و القاب مندرجہ تورات کے صحیح معنوں میں تسلیم کرے گا۔ سید صاحب اولاد اسماعیل کی بشارت کے متعلق لکھتے ہیں۔

> جو لوگ ہمارے مخالف (یہود و نصاریٰ) ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اسماعیل سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں بارہ سردار ہوں گے۔ چنانچہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا سرداروں کے تھے پیدا ہوئے۔ اور جس برکت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ دنیاوی تھی نہ روحانی۔

اس بحث کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

> جس مضمون کا وعدہ حضرت اسماعیل سے کیا گیا تھا اور جو لفظ برکت کا حضرت اسمعیلؑ کے وعدے کے متعلق استعمال ہوا۔ اسی مضمون کا وعدہ حضرت اسحاقؑ سے بھی کیا گیا اور وہی لفظ برکت کا اسحاقؑ کے وعدہ میں بھی لایا گیا۔ پھر یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اسماعیلؑ سے جو وعدہ تھا وہ تو دنیاوی تھا اور جو اسحاقؑ سے تھا وہ روحانی تھا۔ (خطبات مطبوعہ لاہور ص595)

سید صاحب نے اپنے استدلال میں صرف لفظ برکت پر توجہ فرمائی ہے اور اسی پر اپنی تمام استدلالی قوت صرف فرمادی ہے صرف اتنا کیا ہے کہ اولاد اسماعیلؑ میں برکت روحانی کا عطا ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ یہیں پر سید صاحب کو اپنا ضعف استدلال بھی سمجھ لینا لازم تھا۔ کیونکہ آگے چل کر جن لوگوں کی نسبت آپ روحانی برکت سے مستفیض ہونا یقین کرتے ہیں۔ ان کے حالات و واقعات سے ان کے صفات روحانی ثابت نہیں کرتے۔ وہ دعویٰ جس کا ثبوت نہ موجود ہو مہمل ہے۔ اور بیکار۔ اولاد اسماعیلؑ میں صفات روحانی نہ ہونے کی وجہ سے تورات کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ اسماعیلؑ سے محض دنیاوی وعدہ تھا۔ وہ اس طرح پورا ہوا کہ ان کے بیٹے اقوام وقبائل کے رئیس وسردار ہوئے۔ ریاست اور سرداری دنیاوی نام ونمود ہیں۔ ان کو روحانی عظمت واقتدار سے واسطہ نہیں۔ اس لئے اسماعیلؑ کے ساتھ دنیاوی برکت کا وعدہ ہونا صحیح ثابت ہوتا ہے اور روحانی وعدہ ہونا غلط۔

بارہ امام یا سردار کے متعلق سید صاحب نے کوئی تحقیق نہیں کی ہے۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی نسبت آپ نے مخالفت کے قول کو صحیح سمجھ لیا ہے تو اس بنا پر گویا امام اور بادشاہ ایک ہی چیز ہے شبلی صاحب کے سکوت کا بھی یہی عالم ہے اور کیونکر نہ ہو۔ ان دونوں صاحبوں کے اصول عقائد بھی ہیں۔ بہر حال امام اور بادشاہ کو ایک شے سمجھنا قطعاً غلط ہے اور مخالف قرآن جناب ابراہیمؑ کو کسی مسلم یا غیر

مسلم محقق اور مؤرخ نے بادشاہ نہیں مانا۔ مگر قرآن ان کو **وجعلناك للناس اماماً** (ہم نے تجھے آدمیوں کا امام (پیشوا بنایا) امام بتلاتا ہے۔ سید صاحب وغیرہ کے اصول کے مطابق۔ امام ہونے کی رعایت سے ماننا پڑے گا کہ وہ بادشاہ وقت بھی تھے جو روایتاً اور درایتاً۔ دونوں طریقوں سے خلاف ہے۔ اگر اولاد انبیا و مرسلین کے لیے۔ عادت الٰہی کا یہی دستور اور قاعدہ خاص مان لیا جائے تو پھر رسولؐ اور نبی کے صاحبزادے کو حکمران زمانہ اور سلطان وقت ثابت کرنا ہوگا۔

حقیقت تو یوں ہے کہ امام کو ملکی حکمران کے معنوں میں تسلیم کرنا عقل کی خوبی ہے جو اہل کتاب کو پہلے اور اہل اسلام کو پیچھے۔ استحکام سلطنت کی غرض خاص سے ضروری معلوم ہوئی۔ اور رفتہ رفتہ اسی نے امر پرستی کا نقص وعیب ان میں پیدا کردیا اور جس طرح کائنین اور رائبین عہد بنی اسرائیل میں سلاطین بنی اسرائیل کو واجب الاحترام اور واجب الاتباع سمجھتے تھے اسی طرح اسلام میں بھی علما و محدثین سلاطین اور فرمانروایان سلطنت کو امام مفترض الطاعت سمجھنے لگے۔

خدائے سبحانہ تعالیٰ نے جن معنوں میں حضرت ابراہیمؑ کی نسبت لفظ امام کا استعمال فرمایا ہے۔ وہ روحانی پیشوا اور مقتداء کے ہیں اور انہیں معنوں کے ساتھ تورات میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ کیونکہ ابھی ابھی سید صاحب حضرت اسحاق و اسماعیل علیہم السلام کی مساوات فی المدارج کی بحث میں دعائے برکت کو روحانی ہونا۔ دونوں کے حق میں بمراتب مساوی ثابت کرائے ہیں۔ پھر یہاں روحانی معنی کی جگہ دنیاوی مراتب کیسے مراد لئے جائیں گے۔

بہرحال لفظ امامؑ کی حقیقت دکھلا کر ہم اس کی اہمیت اور عظمت بتلاتے ہیں کہ منصب امامت ایسا عظیم المرتبت تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی اولاد و ذریت کے لئے اس کے عطا کئے جانے کی دعا خداند عالم سے کی تو منظور بالشرط ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی **مسئلت و من ذریتی** (اور میری اولاد۔ کیا وہ امام نہ ہوں گی) اور خدا تعالیٰ کی اجابت مشروط **لا ینال عهد للظالمین** (ہاں۔ مگر میں ان ظالموں کے ساتھ اپنا وعدہ پورا نہ کروں گا۔) قرآن مجید میں پوری تفصیل کے ساتھ مندرج ہے۔ جس کو پڑھ کر ہر شخص با آسانی سمجھ لے گا کہ ذریت ابراہیمی میں عموماً ہر فرد بشر خدا کے آگے منصب امامت کے قابل نہیں۔ مگر وہی جو بارگاہ احدیت میں اس کا اہل ثابت ہوتا ہے۔ وہی لفظ ہم تورات میں بھی پاتے ہیں تو پھر یہاں بھی اس کے معنوں میں وہی تخصیص کیوں نہیں قائم کی جاتی اور تعمیم کو خواہ مخواہ کیوں داخل کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا عنوان بیان سے ثابت ہوگیا کہ سلسلہ ابراہیمیؑ میں منصب امام کو عام کر دینا اور تمام ابنا اسماعیلؑ کو اس کا اہل قرر دے دینا مخالف قرآن ہے اور جو امر مخالف قرآن ہے اس کو کوئی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا۔ جب سلسلہ اسماعیلیؑ میں آپ کے بارہ بیٹوں کی امامت ثابت نہیں ہوتی۔ تو ہم آپ کی اولاد و اعقاب میں ان ذوات عالیہ اور نفوس قدسیہ کا سراغ لگانا ضروری ہوا۔ کیونکہ الفاظ بشارت مندرجہ تورات و قرآن نے کوئی زمانہ خاص ان کے لئے مقرر نہیں کیا ہے جس کی مدت مقررہ اور زمانہ مخصوص کے اندر ہم اپنی تلاش و تحقیق کو محدود کر رکھیں۔ جب ہم اس کی تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں صاف صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح سلسلہ اسماعیلی میں دو ہزار برس کے بعد ہمیں منصب رسالت و نبوت کے متعلق تورات کے بیان متعدد اور متواتر آسمانی بشارتوں اور روحانی برکتوں کے کامل ثبوت اور صحیح نشان

جناب ختم المرسلین صلعم کی ذات قدسی صفات میں ملتے ہیں اسی طرح اولاد اسماعیلؑ میں ان بارہ امام کی متبرک تعداد حضرات آئمہ اثنا عشر سلام اللہ علیہم اجمعین پر تمام ہوجاتی ہے جو حکم خدا اور ارشاد رسول کے مطابق پیشوایان امت تھے اور حامیان شریعت۔

ہمیں اس مقام پر مناسبت کے اعتبار سے یہ بھی بتلادینا نہایت ضروری ہے کہ توراۃ میں جس طرح جناب اسماعیلؑ کے بیٹوں کی نسبت بارہ امام ہونے کی بشارت دی گئی ہے اسی طرح حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں حضرت ہارونؑ کے بیٹوں کی نسبت بھی تورات وقرآن میں بشارت مرقوم ہے۔قرآن مجید کے الفاظ بشارت یہ ہیں۔ وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا (ہم نے ان میں سے بارہ پیشوا بھیجے ہیں)

ان حضرات کے حالات پر بھی غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان بارہ بزگواروں سے کوئی بھی دنیاوی فرمانروا یا حکمران وقت نہیں مانا گیا۔سب کے سب خدا کی طرف سے روحانی پیشوائے امت بتلائے گئے ہیں اور مقتدائے شریعت اب حضرات آئمہ اثناعشر سے ان کی کامل مماثلت بھی ملاحظہ ہو۔

حدیث منزلت یا اعلی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسی الا لا نبی بعدی (اے علی! میری نزدیک تمہاری منزلت ایسی ہے جیسی ہارون کی موسیٰؑ کے ساتھ۔اگرچہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے) ایسی معتبر اور مستند حدیث مماثل اور حضرت علی مرتضیؑ کو حضرت ہارونؑ کا مقابل بنایا تو ضروری ہوا کہ حضرت علی مرتضیؑ کے صاحبزادے بھی حضرت ہارونؑ کے صاحبزادوں کے ہم رتبہ اور ہم شان ہوں۔اس مماثلت اور مشابہت کا بھی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنی زبان صداقت ترجمان سے اعلان فرما گئے ہیں۔مناقب امام احمد بن حنبل سنن ابوداؤد۔صحیح ترمذی۔سنن دارقطنی۔سنن امام بہیقی۔مستدرک امام حاکم۔ذخائر عقبی طبری۔معجم طبرانی اور تاریخ ابن عساکر میں مرقوم ہے۔

قال علی علیه السلام لما ولد الحسن سمیته حربًا فجاء رسول الله صلعم قال ارونی ابنی ما سمیتموه قال حربًاقال وهو حسن فلما ولد الحسین سمیته حرباً فجاء رسول الله صلعم قال ارونی ابنی ما سمیوه قلنا حربا فقال هو حسین وقال انما سمیتهم بولد هارون شبر و شبیر۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب امام حسنؑ پیدا ہوئے تو میں نے ان کا نام حرب رکھا۔آنحضرت صلعم تشریف لائے اور فرمایا میرے بیٹے کو مجھے دکھلاؤ تم نے میرے بیٹے کا کیا نام رکھا میں نے عرض کی حرب۔ارشاد فرمایا اس کا نام حسنؑ ہے۔پھر جب امام حسینؑ پیدا ہوئے۔تو میں نے ان کا نام بھی حرب رکھا۔پھر آنحضرت صلعم تشریف لائے۔اور مجھ سے فرمایا میرے بیٹے کو دکھاؤ۔تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے۔میں نے کہا حرب۔آپ نے کہا اس کا نام حسینؑ ہے۔میں نے ان دونون کے نام ہارون کے بیٹوں

کے نام پر رکھے ہیں۔
اب ان ناموں کی نسبت ہم تجویز رسالت پناہی صلعم کو عین تجویز الٰہی پاتے ہیں۔ فضائل الخلفاء میں علامہ وصابی ایک طولانی حدیث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

فھبط جبریل فقال یا محمدﷺ صلعم ان ربك یقرئك السلام ویقال لك علی منك بمنزلت ھارون من موسی لکن لا نبی بعدك تسم ابنك ھذا باسم ولد ھارون فقال ماکان اسم ولد ھارون یا جبرئیل فقال شبر فقال ان لسانی عربی فقال سمه الحسن علیہ السلام۔

پس جبرئیل آئے اور کہا اے محمد (صلعم) پروردگار آپ کا، آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ علی تمہارے ایسے ہیں جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے نزدیک۔ لیکن بعد تمہارے نبی نہیں ہے۔ آپ اپنے بیٹے کا نام ہارونؑ کے بیٹوں کے نام پر رکھیں۔ حضرت نے کہا ہارونؑ کے بیٹوں کا کیا نام تھا۔ جبرئیل نے کہا کہ شبر۔ حضرت نے فرمایا میری زبان عربی ہے۔ جبریل کہنے لگے آپ ان کا نام حسنؑ رکھیں۔
اس روایت کو مستدرک۔ شرف النبوۃ اور مناقبات السادات میں بھی لکھتا ہے۔
طبقات ابن سعد میں اس کی تصدیق وتوثیق یوں مرقوم ہے۔

عن عمران بن سلیمان قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم الحسن والحسین اسمان من اسماء الجنة ما سمیت العرب بھما فی الجاھلیة

عمران ابن سلیمان سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حسن اور حسین (علیہما السلام) دو اسم ہیں اسمائے جنت سے کبھی عرب نے یہ نام ایام جاہلیت میں نہیں رکھے تھے۔
آخر توثیق بھی ملاحظہ کر لی جائے۔ جس میں سبط کا لفظ۔ جو اسباط موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بعینہ موجود ہے۔ امام ابو حاتم ایک طولانی حدیث کے خاتمہ میں آنحضرت صلعم کی زبانی لکھتے ہیں۔

وقال حسین منی وانا من الحسین احب الله من احب حسین و حسین سبط من الاسباط

فرمایا آنحضرت صلعم نے کہ حسینؑ مجھ سے اور میں حسینؑ ہوں۔ خدا اسے دوست رکھتا ہے۔ جو حسینؑ کو دوست کہتا ہے حسینؑ اسباط میں سے ایک سبط ہے۔
میری دانست میں کیا کسی کی عقل میں بھی۔ تورات کے مندرجہ الفاظ۔ بارہ امام یا سردار۔ بارہ نقبا اور اسباط کی مشابہت اور مشاکلت کے ثبوت اس سے زیادہ مناسب۔ مطابق اور معتبر اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ہم انہیں کو اپنے ثبوت مدعا کے لیے حد سے زیادہ کافی

سمجھتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیہ کریمہ و بعثنا هم اثنا عشرہ نقیبا کے استدلال کرنے سے جو میرا خاص مدعا تھا وہ یہی کہ باوجود ایسے صریح اشہاد و اثبات فضائل و مدارج اہلبیت علیہم السلام کے جو صاف صاف قرآن مجید کی الہامی عبارتوں میں موجود ہیں کسی صاحب کی نظر توجیہہ اس کی نقل وتحریر کی طرف معطوف نہیں ہوتی۔ اور ہوتی بھی ہے تو شبلی صاحب کی طرح۔ ایسی تاویل کی طرف جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایسے اولی العزم رسولؐ اور معصوم پیغمبر پر غلط فہمی اور خطاء اجتہادی کے نقص والزام وارد ہوتے ہیں۔

افسوس ہے کہ سید صاحب نے خطبات احمدیہ مطبوعہ لاہور میں۔ صفحہ 600 سے لے کر 605 تک میں جناب موسیٰؑ اور جناب ختمی مرتبتؐ کے فیما بین مختلف دلیلوں اور طریقوں سے کامل مماثلت اور مشابہت ثابت کی ہے۔ مگر ان تمام دلائل میں نہ کہیں آیہ متذکرہ بالا و بعثنا هم اثنا عشرہ نقیبا سے استدلال کیا ہے۔ اور نہ حدیث رسول اور خاص ارشاد پیغمبر حدیث منزلت کی عبارت سے ان دونوں صاحبان شریعت اور مبلغان رسالت کی باہمی مساوات اور مماثلت دکھلاتی ہے۔ ان حضرات کی عدم توجہی اور فروگذاشت کے ثبوت میں ایک بھی مثال بہت کافی ہے۔

اگر سید صاحب اس وجہ سے قرآن وحدیث کے استنباط کو مخالفین اسلام کے مقابلہ میں ناقص سمجھتے ہیں۔ کہ ان کے مخالف عیسائی جو ان کے خاص مخاطب ہیں وہ اس کو نہیں تسلیم کریں گے۔ تو ہم عرض کرتے ہیں کہ وہ لوگ آپ کے پیش کردہ قیاسی اور زبانی دلائل کو کب ماننے لگے۔ ہاں اگر آپ نے اپنے ثبوت استدلال میں انھیں کے اقرار واقوال سے کام لیا ہوتا تو البتہ ان کو عذر وکلام کی گنجایش نہ ہوتی۔ اور جب ایسا نہیں اور صرف زبانی الفاظ سے کام لیا گیا ہے تو کس کام کا۔ اس سے تو نقل عبارات کلام الٰہیہ اور احادیث صحیحۂ نبویہ کا قدیم طریقہ استدلال بدرجہا مستحسن تھا۔ جس سے مخالفین اسلام چاہے فائدہ اٹھاتے یا نہ اٹھاتے۔ لیکن عام مسلمان تو آپ کی تحقیق سے پورے طور پر مستفید و مستفیض ہوجاتے مگر نہیں سید صاحب کا قلم اس وجہ سے تھوڑا ہی رکا ہے۔ بلکہ ان کے سکوت بیان اور سقوط تحریر کا اصلی باعث وہی ہے جس کو ہم اس بحث کے آغاز میں اوپر لکھ آئے ہیں۔

پر ہم کہتے ہیں کہ غریب سید صاحب یا بے چارے شبلی صاحب کا کیا وجود اور کیا ہستی ہے۔ جو ان فروگذاشتوں اور استخفاف کی شکایتوں کا ان پر الزام لگایا جائے جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام اور تابعین ہی کے قدیم ایام سے ان واقعات کے استیصال واستخفاف کی اس وقت تک مسلسل کوشش جاری ہے۔

بہر حال۔ ہم ان مستحقین کے مراتب ومدارج جن کا استخفاف واستیصال منظور ہے۔ ذیل میں امام قندزری شیخ الاسلام قسطنطنیہ کے اس نظریہ اور تحقیقی معیار سے قلمبند کرتے ہیں۔ جو انھوں نے آئمہ اثناعشر کی خاص تنقیح اور تخصیص کی بحث میں حدیث بعدی اثناعشرہ خلیفہ کے متعلق لکھی ہے۔

قال بعض المحققین ان الاحادیث الدالة علی کون بعده صلی الله علیه وآله وسلم اثنا عشر قد اشتهرت من طرق کثیرة فبشرح الزمان و تعریف الکون

والمكان اعلم ان مراد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم من حديثه هذا الائمة اثنا عشر من اهل بيته وعترته اذ لا يمكن ان يحمله على الخلفاء بعده من اصحابه عن اثنا عشر ولا يمكن ان يحمل هذا الحديث على الملوك الاموية لزيادتهم على اثنا عشر و لظلمهم الفاحش الا عمر ابن عبد العزيز و الكونهم غير بنى هاشم لان النبى صلى الله عليه وآله عن جابر اخفا صوته صلى الله عليه وآله وسلم فى هذا القول يرجح هذه الرواية لا انهم لا يحسنون خلافة بنى هاشم ولكن لا يمكن ان يحمله على الملوك العباسية لزيادتهم على العدد المذكور ولقلة رعايتهم الاية قل لا اسئلكم عليه اجرا ۔ الا المودة فى القربى و حديث الكسافلا بد من ان يحمل هذا الحديث على الائمة الا ثنا عشر من اهلبيته وعترته صلى الله عليه وآله وسلم لانهم كانوا اعلم زمانهم واجلهم واورعهم واتقاهم واعلاهم نسباً وافضلهم حسباً واكرمهم عند الله وكان علومهم عن آبائهم منصلا بجدهم صلى الله عليه وآله وسلم بالوراثة واللدنية كذا عرفهم اهل العلم والتحقيق واهل الكشف والتوفيق ويويده هذا المعنى اى ان مراد النبى صلى الله عليه وآله وسلم الائمة الا ثنا عشر من اهل بيته ويشهده ويرجحه حديث الثقلين والاحاديث المتكثرة المذكور فى هذا الكتاب وغيرها

بعض محققین کا قول ہے کہ یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ بعد آنحضرت صلعم آپ کے بارہ خلفاء ہیں پس طریقہ کثیرۃ اور ہر زمانہ اور وقت و مقام کی شرح و بیان سے یہ مشہور ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد بارہ خلفا سے آئمہ اثناعشر ہیں جو آپ کے اہل بیت اور عترت طاہرہ سے ہیں کیونکہ ان سے آپ کے صحابہ جو آپ کے بعد خلیفہ ہوئے مراد نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان کی تعداد بارہ سے کم تھی۔ اس حدیث کا ملوک امویہ پر بھی اطلاق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اول تو ان کی تعداد بارہ سے زیادہ تھی دوسرے مظالم وفواحش ان کے اس کے لیے مانع تھے۔ جن میں سے عمر ابن عبدالعزیز مستثنٰی ہیں۔ ان سے مراد بنی ہاشم ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ فرمایا آنحضرت صلعم اور سب ان میں سے بنی ہاشم ہیں۔ مگر

عبد الملک نے جابر سے جو روایت کی ہے اس میں ہے کہ آپ نے اس موقع پر اپنی صدا کو روک لیا جس سے معلوم ہوا کہ اس امر کے لئے تمام بنی ہاشم بھی مراد نہیں تھے۔ پھر ملوک عباسیہ بھی اس سے مراد نہیں ہو سکتے۔ اول اس سبب سے کہ ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہے دوسرے یہ کہ انھوں نے آیہ مودت۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط اور حدیث کسا کے حقوق کی رعایت نہیں کی۔ پس اب سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ اس حدیث سے آئمہ اثنا عشر مراد لئے جائیں۔ جو آپ کے اہلبیت اور عترت طاہرین سے تھے۔ اور یہی حضرات اپنے اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ صاحب علم۔ صاحب ورع۔ اور صاحب تقویٰ تھے اور تمام اہل زمانہ سے باعتبار نسب کے عالی نسب اور باعتبار حسب کے افضل تھے۔ اور سب لوگوں سے زیادہ خدا کے آگے صاحب عزت و اکرام تھے۔ ان کے علوم ان کے آبائے طاہرین کے ذریعہ سے بطریقہ متصل ان کے جد بزرگوار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل تھے اور وراثت لدنیہ دونوں طریقہ حصول علم ان کو حصول تھے انہیں صفات و کمالات سے اہل علم و تحقیق نے ان حضرات کی معرفت پائی ہے۔ اور اہل کشف و توفیق نے انہیں صفات سے ان کو پہچانا ہے اور اس معنی کو۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد آئمہ اثنا عشر کی اپنے اہلبیت میں سے تھی۔ تائید تصدیق اور ترجیح حدیث ثقلین اور کثیر التعداد حدیثوں سے جو اس کتاب اور نیز دوسری کتابوں میں مذکور ہیں پوری طور سے ہوتی ہے۔ (ینابیع المودۃ فی القربیٰ امام سلیمان السندوزی مطبوعہ بمبئی ص 373)

اب اس فاضل محقق اور کامل محدث کے نظریہ سے تو آئمہ اثنا عشر کی امامت و خلافت کی حقیقت پورے طور سے معلوم ہو گئی۔ باوجود کہ حقیقت پر اتنا پردہ ڈالا گیا۔ اصلیت اور واقعیت اتنی چھپائی گئی۔ مگر پھر اس کی حقیقی اہلیت رکھنے والوں کے نام۔ جن کو قرآن و تورات نے۔ امام نقیب۔ اور اسباط کے الفاظ و القاب مبارک سے خطاب فرمایا ہے۔ متلاشیان حقیقت اور محققان معرفت کے لب و زبان پر آ ہی گئے۔ بہرحال ہم ذبح اسماعیلؑ کے متعلق اپنے مرقومۂ بالا سلسلہ بیان میں۔ قد یناہ بذبح عظیم و ترکناہ علیہ فی الاخرین کے حقیقی اور اصلی مفہوم کو ہر طریقہ اور ہر قرینہ سے ثابت کر چکے۔ اب ہم اپنے موجودہ استدلال میں۔ اس سے کسی اور زائد اضافہ کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اور اس مبحث کے خاتمہ پر اپنے ذی استعداد اور صاحب سواد معاصر نواب خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب رئیس کی وہ تحریر نقل کرتے ہیں۔ جس میں انھوں نے ذبح حسینؑ کو ذبح اسماعیلؑ کا تکملہ۔ منشائے قدرت اور انبیاء و مرسلین سلام اللہ علیہم اجمعین کی خاص سیرت بتلایا ہے۔ عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم نے اپنی مکرم مخلوق میں جس کو جیسا رتبہ عالی عطا

فرمایا اسی قدر اس کو انتظامی تکلیف کا مورد بھی بنایا۔ چنانچہ انبیائے عالی شان اور بانیان ادیان نے اپنوں یا بیگانوں کے ہاتھوں جو جو مصیبتیں اٹھائیں ان کا احصاء تاریخی دنیا کے سیر کرنے والے مشکل سے کر سکتے ہیں۔ ابو البشر حضرت آدم علی نبینا وآلہ وعلیہ السلام کی خلقت اور بعثت سے ہدایت اور دین الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف سے آدمؑ انسانی نسلوں کے موجب ہو کر ہمارے لئے قانون الٰہی لائے دوسری جانب سے ستارہ بلاؤ امتحان طالع ہوا۔ گویا مذہب اور آزمائش دونوں ایک ہی روز جلوہ افروز عالم ہوئے۔ ضروری تھا کہ بانیان دین الٰہی اور رہبران ہدایت حق معرض امتحان وآزمائش میں لائے جائیں۔ کیونکہ سونا اگرچہ آگ میں جلنے سے پہلے بھی سونا ہے مگر آگ میں پڑنے سے وہ ثابت کر دیتا ہے کہ میں آزمائش میں کھرا ہوں اور کامل ہوں۔ ؎

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں، تا سیہ روئے شود آنکہ در وغش باشد۔

گو ہمارے ناقص اور کمزور خیالات اس ابتلاؤ آزمائش کو غیر ممدوح معنوں سے تعبیر کریں لیکن روحانی اخلاق کی بنا پر اس قسم کی آزمائش افضال خداوندی اور برکات لامتناہی ثابت ہوتی ہیں۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت نوحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت صالح علیہ السلام۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسماعیلؑ۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ حضرت یونسؑ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جرجیسؑ وغیرہم صلوات اللہ علی نبینا والہ وعلیہم اجمعین کو مخالفین کے ہاتھوں جو ناقابل برداشت اذیتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ وہ قطعی طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ پیروان خدا کو خدا کی راہ میں کس کس قسم کے دشمنوں سے مجاہدہ اور مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ خود ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت امت کی بدولت جن جن مصائب کے سامنے ہوئے ان کی شرح وتفصیل کی حاجت نہیں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل انبیا و مرسلینؑ کے سردار اور جمیع شرائع کے متمم تھے لہٰذا ضروری تھا کہ ان کا امتحان اور بلا بھی ان کے مرتبہ اعلیٰ کے مطابق ہو۔ چنانچہ وہ ان کے پیارے فرزند کے ساتھ مخصوص ہوا۔ جس کے ماتم کے لئے قصر عالم عزا خانہ مخلصین وفادار بن گیا اگرچہ درجہ شہادت فی الاصل ابتلاء رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک انتہائی شعبہ تھا لیکن اس کی قرعہ اندازی حسین ابن علی علیہ السلام روحی فداہما کے نام گرامی پر ہوئی۔ یوں تو جس

طرح حضرت نبی محترم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخالفین کی بدولت تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔اسی طرح ان کے خاندان عظیم الشان کا ہر ایک رکن اراکین شیاطین امت کے ہاتھوں مبتلائے مصیبت وآلام رہا۔لیکن درحقیقت ایک تخصیصی آزمائش اور کامل ابتلاء کا مرتبہ خامس آل عبا کی ذات بابرکات پر ختم ہوگیا۔علامہ اجل شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی کتاب سرالشہادتیں میں واقعہ شہادت کی جو تمہید زیب قلم فرمائی ہے اس کا خلاصہ مضمون یہ ہے۔

جتنے کمالات جدا جدا کل انبیا میں تھے وہ سب ذات سرور کائنات میں مجتمع ہو گئے۔فقط ایک کمال شہادت باقی رہ گیا تھا۔جس کے حاصل ہونے کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس شہید ہوجاتے تو شوکت اسلام ٹوٹ جاتی اور عوام کے نزدیک دین میں خلل پڑتا۔ پس حکمت الٰہی نے چاہا کہ یہ عظیم الشان منصب اور کمال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے اہلبیت میں سے ایسے عزیز وقریب تر کے ذریعے پہنچے جو بمنزلہ فرزند حقیقی کے ہو،تاکہ اس کا یہ درجۂ شہادت جناب رسول خدا کی ذات میں شامل ہوجائے۔ چنانچہ عنایت ایزدی نے حسنین علیہما السلام کو ان کے نانا کا نائب اور قائم قام بنایا اور دونوں کو دو آئینے پرتو کمال محمدیؐ اور خسارے جمال مصطفویؐ کے ٹھہرا کر ان دونوں صاحبزادوں کے توسط سے یہ کمال بھی ذات آنحضرت صلعم میں داخل کردیا۔

فی الحدیث جناب شاہ صاحب کی یہ تحقیق اور یہ ندرت ذکاوت ان کے اتباع کے لیے سرمایۂ فخر وناز ہوسکتی ہے۔لیکن اس قدر افسوس ضرور ہے کہ شاہ صاحب نے حسینؑ ابن علی کی قائم مقامی اور نیابت مصطفوی کوفقط ان کے قتل ہی تک محدود ومخصوص کردیا بمصداق قول شاعر ز صحن کعبہ تابسر بام اذاں من ، درسقف خانہ تابیشیر تا اذاں تو۔مولف (صاحب رسالہ البلاء المبین) کہتا ہے کہ کربلا کا معرکہ شہادت معنوں طور پر وہ عظم المرتبہ امانت تھی۔جس کو قدرت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے حضرت اسماعیلؑ کے خاندان میں سپرد کیا تھا اور 61 ہجری میں عاشورہ کے دن حضرت امام حسین علیہ السلام نے نہایت ہی استقلال اور ثابت قدمی سے ادا کردیا۔ یہ وہی ودیعت تھی جو خاندان اسماعیلؑ میں چلی آتی تھی اور جس کے ادا

کرنے اور بار اٹھانے کا کوئی متحمل نہیں ہو سکتا تھا بالآخر اس کے سچے امین نے نہایت خوشی سے تسلیم و رضا کے ساتھ ذبح عظیم کی پیشین گوئی پوری کر دی اور بی بی ہاجرہؑ کی مبارک نسل کا وعدہ بی بی فاطمہ کی مقدس نسل نے کامل طور سے وفا کر دیا۔ یعنی دس محرم کو حسین ابن علی علیہ السلام نے اس وعدہ کی تکمیل کر کے اپنے دادا اسماعیل ابن ابراہیم علیہما السلام کو سبکدوش کر دیا۔ بمضمون احادیث متواترہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہادت حسین علیہ السلام کا مکرر پہنچا ثابت کر رہا ہے کہ خداوند عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ سے مطلع کرنا یونہی بے معنی نہیں تھا۔ بلکہ یہ وہی وعدہ تھا جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علی نبینا وآلہ وعلیہما السلام سے لیا گیا تھا اور گویا یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جس قربانی کی بنا حضرت اسماعیلؑ سے ہوئی۔ خاندان مصطفویؐ اور دودمان مرتضویؑ کے چشم و چراغ جناب امام حسین علیہ السلام کی ذات پر ختم اور کامل ہوگئی۔ دیکھو اگر امام حسین علیہ السلام چاہتے تو فقط یزید ملعون سے بیعت کر کے اپنی اور اہلبیت کی گلو خلاصی کرا لیتے۔ امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے وہ منحوس سماں اور نامبارک منظر پیش نظر تھا۔ جس میں وہ بے خانماں ہو کر جام شہادت پئیں گے وہ بخوبی جانتے تھے کہ ان کے بعد ان کے اہلبیت اور ذریت کے ساتھ ظلم و ستم میں دشمنان دین کوئی کمی نہیں کریں گے۔ بچوں کی آہ و زاری۔ عورتوں کی بے قراری۔ ایسا مقام۔ جہاں بجز ذات باری نہ کوئی مونس و معین۔ نہ ہمدم و ناصر۔ اپنی جماعت قلیل اور اشقیا کی کثرت۔ آفتاب کی تمازت۔ پانی کا مطلق بند ہونا۔ یہ سب باتیں کیا اس امر کے لئے کافی نہیں تھیں۔ کہ ایک انسان کا دل ہلا کر اس کو امور مخالف طبع ہو کر اپنی وجدانی صداقت اور ایمانی قوت پر قائم رہ سکتا ہے۔ مگر ہاں فاطمہ زہراؑ کے فرزند حسینؑ نے یہ ساری مصیبت اور صعوبت اپنے سر لے لی اور آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے بچے اور عزیز قتل ہو گئے۔ جس دریا سے چرند و پرند سیراب ہوتے تھے۔ وہ اس سے محروم رکھے گئے تھے۔ دھوپ کی تکلیف اٹھائی بھوک پیاس کے صدمے اٹھائے۔ خیمہ جلائے گئے۔ خود جسم پر بے شمار زخم کھائے۔ لیکن ودیعت اسماعیلی کے ضامن اور امانت ابراہیمی کے امین نے ۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔
دم مارنا کیسا یہ بھی تو زبان سے نہ نکلا

کہ خدایا اس بلا سے مجھے نجات دے یا یہ آزمائش مجھ سے ٹال دے۔ مگر باوجود ہزار مصائب کے ذرا بھی بے قرار نہ ہوا۔ اور تمام شب اس بار کے اٹھا لینے اور امتحان میں پورا اترنے کی دعاؤں میں مشغول رہا۔ واقعی امام حسین علیہ السلام کیوں بے قرار ہوتے۔ وہ ایسے نہ تھے کہ اپنے دادا کی امانت کو ادا نہ کرتے اور اپنے نانا کی امت کی کشتی نجات کو گرداب میں ضلالت میں ڈوبنے دیتے۔ بلکہ انھوں نے اس جوش کو پورا کر دیا۔ جو حضرت ابراہیم کے دل میں پیدا ہوا تھا اور اس طوفان سے بچا دیا۔ جس میں امتِ محمدیہ غرق ہو چلی تھی۔ (از رسالہ البلاء المبین)

عرب میں اسماعیلؑ کی تبلیغ رسالت کی ضرورت

ذبح اسماعیلؑ کے عظیم الشان واقعہ کو اس کی تمام تفصیلی جزئیات اور کلیات کے ساتھ بیان کر کے ہم اپنے قدیم سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں اور جناب اسماعیل علیہ السلام کے بقیہ حالات کو قلمبند کرتے ہیں۔ جناب اسماعیلؑ کے طرز معاشرت اور آپ کے مقدس حالات کے متعلق جہاں تک کتب معتبرہ سے تفحص کیا گیا ہے۔ یہ پایا جاتا ہے کہ آپ اپنے تمام اوصاف وکمال میں اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ تھے۔ خلق ومروت۔ محبت وشفقت۔ اکرام ضعیف۔ لطف ومدارا کے صفات سے خاص طور پر پُر اور معمور تھے اور مشہور نزدیک ودور اور یہ تمام اسی سے ثابت ہیں کہ قبیلہ جرھم اور عمالقہ یمنی کے تمام قبائل وعشائر جو ایک زمانہ دراز سے خانہ بدوشی اور پریشان حالی میں ادھر ادھر زندگی بسر کر رہے تھے۔ آپ کے اخلاق واشفاق کے گرویدا اور زیر احسان ہو کر ہمیشہ کے لیے مکہ میں آ کر اس طرح بس گئے کہ پھر اپنے اصلی موطن ومسکن کی طرف رخ بھی نہ کیا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قبیلہ جرہم کی وجہ سے حضرت اسماعیلؑ کو بھی اپنی ضروریات میں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ بہت جلد سلسلہ بیان سے ظاہر ہوگا۔

جناب اسماعیلؑ بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانہ حیات میں تبلیغ رسالت کے درجہ پر فائز تھے۔ مگر حضرت لوطؑ کی طرح تا روز وفات حضرت ابراہیمؑ اپنے پدر بزرگوار کی شریعت کے متبع۔ خاص طور پر قوم عرب کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جہاں حضرت صالحؑ کے بعد سے سلسلہ ہدایت وارشاد اور ذریعہ تعلیم وتلقین معرفت الٰہی گویا مسدود ومفقود ہو چکا تھا۔ اور نظام مشیت کو ان بادیہ نشین قوموں کو بھی اپنی معرفت وہدایت کے فیوض پہنچانے منظور تھے۔ اس لئے کہ یہی ذلیل اور حقیر ترین قوم ایک زمانہ میں بہت بڑی کامل المعرفت اور عظیم الشان قوم ہونے والی تھی۔ اور تمام امم سابقہ کے مقابلہ میں خیر الامۃ اور امت مرحومہ کے خاص خطاب والقاب پانے والی۔

جناب اسماعیل علیہ السلام وہ پہلے مقدس بزرگوار ثابت ہوتے ہیں۔ جنھوں نے امم ثمود کے بعد از سر نو عرب کے نیم وحشی قوموں کی تعلیم وہدایت کا ذمہ اٹھایا۔ اور ان کو دینی۔ قومی اور اخلاقی۔ آداب وتمدن بتلائے۔

اُس وقت کے عرب کے کیا عقائد تھے۔

اُس وقت جاہل عرب کی قوموں کے کیا عقائد تھے۔مشکل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔مگر جو کچھ بھی جستہ جستہ حالات۔قدیم کتبات۔ علمائے اثریات کی جدید تحقیقات اور انکشافات یا ایام عرب کے قدیم اشعار سے پائے جاتے ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی آوارہ اور سر بصحرا قومیں کسی خاص عقیدہ کی پابند نہیں تھیں۔جس طرح ان کے جدا جدا قبیلے اور قومیں تھیں اسی طرح ان کے مرسومات اور معتقدات بھی جدا جدا تھے۔مدینہ۔وادی القریٰ اور علاقہ تیما کے قرب و جوار کے بادیہ نشین عربوں کا کوئی خاص مذہب تحقیق نہیں ہوتا۔ صحرائی اور کوہستانی عرب اوہام پرست تھے۔یمن کی قوموں میں اکثر ستارہ پرست تھیں اور باقی بت پرست۔ظہور اسلام تک اوہام پرستیوں کے اثر باقی تھے۔غزوات ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ کے متعلق محدثین ومحققین اسلام نے جہاں اور مختلف اقوال لکھے ہیں۔وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس مقام پر رقاع نامی ایک بہت بڑا قدیم درخت نہایت مشہور و معروف تھا۔جس کو اہل عرب پوجتے تھے اس سے دعائیں مانگتے تھے۔اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔زرقانی جلد دوم ص95

حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں نیم وحشی عربوں اور صحرائی قوموں میں۔خدا کا وجود۔اس کی وحدت محض۔اور اس کی عبادت کی تعلیم و ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔اور خدائے سبحانہ تعالیٰ نے تبلیغ رسالت کی انجام دہی میں ان کے مساعی جمیلہ کو کامیاب فرمایا۔اور اس کے ثبوت میں تھوڑے ہی دنوں کے بعد عرب کے ان صحرائی قوم وقبائل کا خدا کے وجود۔اس کی وحدت اور قدرت کا قائل ہوکر ایام حج میں اس کے مقدس گھر کے قریب جمع ہونا۔خانہ کعبہ کو بیت اللہ اور اپنا معبد سمجھنا اور حضرت اسماعیلؑ کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق اس کی عظمت۔حرمت اور آداب کے اظہار میں۔مناسکات حج کا ہر سال بجالانا۔صاف صاف بتلا رہا ہے کہ تعلیم و ہدایت اسماعیلی کے فیضان نے ان کے پتھریلے دلوں میں خدا کے وجود۔عظمت اور معبودیت کے اثر قائم کر دیے تھے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ رسالت میں حضرت لوطؑ۔حضرت اسماعیل اور حضرت اسحق علیہم السلام ایک شریعت ابراہیمی کے متبع۔مبلغ اور داعی ثابت ہوتے ہیں اور دیگر انبیا و مرسلین کی آنے والی شریعتوں میں اس کی بہت کم مثالیں پائی جاتی ہیں۔اسی سے شریعت ابراہیمی کی عظمت اور اس کے تبلیغی دائرہ کی وسعت ثابت ہوتی ہے اور کیونکر نہ ہوتی۔ارض شام اور بابل سے لے کر مصر اور ممالک عمالیق تک ایک طرف اور پھر عراق عرب سے لے کر حجاز و یمن تک کے تمام قطعات ملک میں ان کی دعوت کے اعلان بلند تھے۔ ان ملکوں کے تمام قبائل و عشائر آپ کی نبوت کو تسلیم کر چکے تھے۔

حضرت لوطؑ۔حضرت اسمٰعیلؑ و اسحاق علیہ السلام سے پہلے علاقہ حاران میں شریعت ابراہیمی پھیلا رہے تھے۔حضرت اسحاقؑ فلسطین اور ممالک مصر سے ملے ہوئے مقامات میں رسالت ابراہیمی کی تبلیغی خدمات انجام کر رہے تھے اور حضرت اسماعیلؑ ملک عرب اور علاقہ یمن میں باپ کی طرف سے تعلیم و ہدایت پر مامور تھے۔

طرز معاشرت

یہاں تک تو ہم نے نبوت اور ہدایت امت کے متعلق حضرت اسماعیلؑ کے حالات قلمبند کئے۔ اب آپ کے طرز معاشرت اور دیگر حالات کی نسبت جہاں تک تفحص کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ورود مکہ کے وقت سے آپ کی حیات کا ابتدائی حصہ شُبانی اور گوسفندرانی میں صرف ہوا ہے۔ اسی کے ضمن میں صید و شکار کے مشاغل بھی داخل ہیں اور یہ خدمت جمیع انبیاو مرسلین کی مبارک سیرتوں کے متعلق اس کثرت سے پائی جاتی ہے کہ اکثر محققین۔ محدثین اور مورخین اس کو حصول نبوت اور رسالت کا مقدمہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اور عموماً سیرت انبیا علیہم السلام پر ظاہری نظر ڈالنے سے ان مقدسین عظام کے دائرے میں کوئی فرد واحد اس خدمت اور مشغلہ سے خالی معلوم نہیں ہوتا۔

اگر محققین نے اس کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اس خدمت میں ان بزرگواروں کو۔ میدانوں۔ ریگستانوں اور کوہستانوں میں۔ استغراق فی وجوداللہ کی نسبت۔ خلوت اور قدرت الٰہیہ کے علم و حکمت کے مشاہدہ فرمانے کا ہمیشہ اور آسان ذریعہ حاصل ہوا کرتا ہے۔ جو ہر نبیؐ اور رسول کی سیرت کا جزو ضروری ہے اور بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آغاز حالات میں پوری تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

جناب اسماعیل علیہ السلام کے اس زمانے اور معرفت الٰہی کی مشق و ریاضت کے متعلق ایک قدیم روایت اس زمانے کے بہت بڑے عابد و مرتاض کی زبانی اسلام کی اکثر تاریخوں میں مذکور ہیں۔ اس کو ہم حیات القلوب جلد اول کی اصل عبارت سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

روزے حضرت ابراہیم علیہ السلام رفت بیروں و در شہر ہامی گشت کہ از مخلوقات خدا عبرت گیرد۔ پس بگذشت بہ بیابانے۔ ناگاہ دید شخصے راکہ استادہ است و نما میگذارو۔ و صدائش باسمان بلند شدہ است و جہا مہائش از مواست پس ابراہیم نزداو ایسادواز نماز او تعجب کرد۔ پس نشست تا اواز فارغ بشود چوں بسیار طول انجا میدا اور ابدست خود حرکت دادر گفت من بسوئے تو حاجتے ارم سبک کن نماز خویش را پس اوسبک کردنماز راو باابراہیم نشست پس ابراہیم از اوپر سید کہ برآئے کہ نماز میکردی گفت برائے خدائے ابراہیم۔ ابراہیم گفت خدائے ابراہیم کیست گفت آنکہ خلق کردہ است ترا امرا ابراہیم گفت طریق تو مرا خوش آمدہ و من دوست مبدارم کہ باتو برادری کنم از برائے خدا پس بو منزل تو جااست کہ ہر گاہ بخواہم ترا ملاقات کنم و زیارت تمایم۔ توانم کرو۔ گفت تو بانجا نمی توانی

آمد۔ زیرا که درمیان دریائے است که از انجا عبور نمیتواں کرد۔ ابراہیم گفت تو چگو
نه میروی گفت من بروئے آب می روم ابراہیم گفت شاید آنکس که اب رابرائے تو
مسخر کرده است برائے من نیز مسبخر گرداند۔ برخیز برویم وامشب با تو دریک
اطاق باشیم پس چوں بآب رسید ندانمرد بسم اللّٰه گفت و برزوئے آب روانه شد
ابراہیم نیز بسم اللّٰه گفت و بروئے آب رواں شد پس آں مرد تعجب کرد۔ چوں بمنزل
رسید ند ابراہیم گفت تعیش تو از کجاست گفت میوۂ ابن درخت را جمع میکنم و در
تمام سال باں معاش میکنم ابراہیم گفت کدام روز عظیم تراست از ہمه روز ہا عابد
گفت روزے که خدا جزا دہد خلایق رابر کردہائے ایشاں۔ ابراہیم گفت بیادست بدعا
برداریم و دعاکینم که خدا مارا از شترآں روز نگہدارد مایاں را۔ ودر روایت دیگر
آمده که ابراہیم گفت که دعا کن تامن آمین گویم مامن دعا میکنم و توہین بگو۔ عابد
گفت از برائے چه دعا بکنم ابراہیم گفت از برائے آمرزش گناہان موماں عابد گفت نه
ابراہیم پر سید چرا عابد گفت از برائے اینکه سه سال است که دعا میکنم و ہنوز
مستجاب نشده است و دیگر شرم میکنم که از خدا حاجتے بطلیم تاآں ہم مستجاب
نشود ابراہیم گفت خدا ہرگاه بنده رادوست میداد و عایش را جنس میگرداند که از او
مناجات کند و سوال کند و از او طلب کند و چوں بنده رادشمن میدارد و عایش را زو د
مستجات میکند که باز صدایش بسمع قدرت نآید یا درویش چناں یاس می افگند که
دعا نمی کند پس ابراہیم پرسید که چه مطلب است که دراین مدت از حدا طلبیدۂ عابد
گفت روزے دراں جا نماز میکردم ناگاه طفلے در نہایت حسن و جمال گذشت که
نوراز جنبش ساطع بود وکاکلے از قفا انداخته بود و دگاوے چندمی چرانید گویا
روغن انہا برمالیده بودند و گوسفند چند نیز ہمراه داشت در نہایت قربہی و خوش
آیندگی مراازبچه دیدم بسیار خوش آمد و گفتم از یں است گفتم تو کیستی گفت من
اسماعیل پسرا ابراہیم خلیل اللّٰه ہستم پس دعا کردم و از خدا سوال و کردم که خلیل

خود رابمن نماید پس ابراہیم گفت منم ابراہیم خلیل اللّٰہ وآں پسرم اسماعیل است عابد گفت الحمد للہ رب العالمین کہ دعائے او مستجاب شد پس آن شخص ہر دو دست و روئے ابراہیم رابوسیددوست درگردن اوورآوردوگفت الحال دعاکن تائین بردعائے توگویم پس دعاکرد ابراہیم مومنین ومومنات راازاں روز تابہ قیامت تاآنکہ گناہاں ایشاں راببا مرزد دارا یشاں رامی بشوہ عابد امین گفت بردعائے ابراہیم۔ تم آن عابدماریہ ابن اویس بودوعمرش شسصدوشست سال بود۔

ایک روز جناب ابراہیم علیہ السلام گھر سے باہر سفر پر تھے اور مختلف شہروں میں مخلوقات خدا کے مشاہدات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے سیر فرماتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک صحرا میں پہنچے ایک شخص کو دیکھا کہ کھڑا ہوا نماز پڑ رہا ہے۔ اس کی نماز پڑھنے کی آواز (گویا) آسمان تک جاتی تھی۔ وہ بالوں کے کپڑے جسم پر پہنے ہوئے تھا ابراہیمؑ اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کی نماز پر تعجب کرنے لگے اور پھر بیٹھ کر اس کا نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر جب زیادہ دیر ہوگئی تو آپ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے جسم کو حرکت دی اور ارشاد کیا کہ نماز کو کم کرو مجھ کو تم سے کچھ حاجت ہے۔ اس نے اپنی نماز کو کم کر دیا اور ختم کر کے ابراہیمؑ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابراہیمؑ نے پوچھا کہ تم نے کس کی نماز پڑھی ہے۔ اس نے کہا کہ ابراہیمؑ کے خدا کی ابراہیمؑ نے پوچھا ابراہیمؑ کا خدا کون ہے۔ کہا وہی ہے جس نے مجھ کو اور تجھ کو پیدا کیا ہے۔ یہ سن کر ابراہیمؑ نے کہا کہ تیرا طریقہ مجھے بہت پسند آیا۔ میری خواہش ہے کہ راہ خدا میں۔ میں تیرے ساتھ اخوت (بھائی چارہ) اختیار کروں۔ اب بتلاؤ تمھارا گھر کہاں ہے کہ میں جب چاہوں وہاں آ کر تم سے ملاقات کروں۔ اس نے جواب دیا تم وہاں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ درمیان میں دریا ہے۔ جسے تم عبور نہیں کر سکتے۔ ابراہیمؑ نے پوچھا تم کیسے جاتے ہو۔ جواب دیا کہ میں تو پانی پر چلتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ جس نے پانی کو تمہارے اختیار میں کر دیا ہے۔ وہی پانی کو میرے اختیار میں بھی کر دے گا۔ یہ کہہ کر ابراہیمؑ نے کہا کہ اٹھو اور آج کی رات ہم تم ایک جگہ ساتھ رہیں۔ اس کے بعد وہ اٹھ کر چلے جب دریا پر آئے تو اس مرد عابد نے بسم اللہ کہی اور پانی پر چلا گیا۔ ابراہیمؑ نے بھی بسم اللہ کہی اور اسی طرح پانی پر چلے گئے۔ اس مرد عابد نے تعجب کیا۔ جب گھر میں پہنچ گئے تو ابراہیمؑ نے پوچھا کہ تم یہاں کھاتے پیتے کیا ہو۔ اس نے کہا اس سامنے والے درخت کے میوے۔ اس کے میووں کو ایک بار جمع کر لیتا ہوں۔ اور انھیں کو سال بھر کھایا کرتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ تمام روزوں سے عظیم تر کون سے روزے ہیں اس نے جواب دیا کہ وہ دن سب دنوں سے عظیم تر ہے جس دن خدا سب بندوں کو جزا و سزائے اعمال کے لئے طلب فرماوے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ آؤ ہم تم مل کر تمام مومنین گنہگاران کے لیے اس روز کے عذاب سے محفوظ رکھے جانے کی دعا مانگیں اور ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ ابراہیمؑ نے کہا کہ میں دعا کروں اور تم آمین کہو یا تم دعا کرو میں آمین کہوں۔ عابد نے پوچھا کس کیلئے دعا کر دیں ابراہیمؑ نے کہا کہ گنہگار مومن کے لئے۔ عابد نے کہا نہیں میں دعا نہ کروں گا۔ ابراہیمؑ نے کہا کیوں۔ عابد نے کہا اس لئے کہ تین برس ہو گئے میں نے خدا سے ایک امر کے لئے دعا مانگی تھی

اور وہ ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے مجھے خدا سے اب دعا مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہیں یہ بھی مستجاب نہ فرمائی جائے ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ خداوند عالم جس بندہ کو دوست رکھتا ہے اس کی دعا کو اس لئے تاخیر اجابت میں رکھتا ہے کہ وہ بار بار دعا کرے اور خدا بار بار اپنے دوست کی صدا کو سنے اور جس کو دشمن رکھتا ہے اس کی دعا کو جلد مستجاب کر دیتا ہے اس کی بدآواز کو پھر نہ سنے۔ یا نہیں تو اس کے دل میں ایسی مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ وہ طلب دعا کرتا ہی نہیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا تو نے کس مطلب کے لئے خدا سے دعا مانگی تھی۔ عابد بولا حال یہ ہے کہ ایک دن میں اسی جگہ اپنی نماز پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں نہایت قبول صورت اور وجیہہ ایک لڑکا نمایاں ہوا۔ جس کی پیشانی سے نور ہویدا وآشکار تھا اور ایک کاکل بھی اس کے پیچھے پڑی تھی اور چند گائیں چراتا تھا۔ قریبی گاؤں کا یہ عالم تھا جیسے کہ ان کے بدن پر روغن مل دیا ہے۔ اس کی چند بھیڑیں بھی تھیں اور وہ بھی نہایت خوش حال اور بحال تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ گائیں اور بھیڑیں کس کی ہیں۔ اس نے جواب دیا میری ہیں میں نے پوچھا تم کون ہو۔ وہ بولا میں اسماعیلؑ پسر ابراہیم خلیلؑ اللہ ہوں۔ یہ سن کر میں نے اس وقت خدا کی درگاہ میں دعا کی پروردگار تو اپنے خلیل کی زیارت مجھے کرادے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابراہیمؑ نے ارشاد فرمایا کہ میں نبی خلیل اللہ ابراہیمؑ ہوں۔ اور وہ میرا فرزند اسماعیلؑ تھا۔ یہ سن کر عابد بولا۔ **الحمد للہ رب العلمین** کہ میری دعا مستجاب ہوئی۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت ابراہیمؑ کے دست وجبیں کے بوسے لئے اور پھر اپنے ہاتھ ان کی گردن میں ڈال کر عرض کی کہ اب آپ دعا فرمائیں۔ میں آمین کہوں گا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے تمام مومنین ومومنات کی امرزش گناہان کے لئے اس وقت سے لے کر قیامت تک کے دن کے لئے دعا مانگی اور ان سے راضی وخوشنود رہنے کی دعا فرمائی۔ وہ عابد آپ کی دعا پر برابر آمین کہتا رہا۔ اس عابد کا نام ماریہ ابن اویس تھا اور عمر اس کی چھ سو ساٹھ برس کی تھی۔ (حیات القلوب جلد اول ص 112)

واقعہ مذکورۂ بالا سے حضرت ابراہیمؑ کی عظمت کے ساتھ جناب اسماعیلؑ کی علو مرتبت۔ دنبیوں کی گلہ بانی جو بقول شبلی صاحب حقیقت میں جہانبانی کا دیباچہ ہے۔ ثابت ہوگئی۔ اور یہ وہ منصب روحانی ہے جو انبیاء ومرسلین کے طبقہ کرام میں ہر بزرگوار کو عطا فرمایا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ امر کامل طور سے مستحق ہوگیا کہ نزول مکہ معظّمہ کے وقت سے آپ کا ابتدائی زمانہ پہلے معرفت الٰہی کے اسی مقدمہ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ریاست مذکورۂ بالا میں ماریہ ابن اویس نے بکمال خصوصیت حضرت ابراہیمؑ سے اس خدمت کا ذکر کیا ہے اور جناب ابراہیمؑ نے بھی اس کو بغایت رضا وپسندیدگی تسلیم فرمایا۔

اس معروفیت کے بعد صید وشکار کا مشغلہ بھی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت سے اوپر نقل ہو چکا۔ کتب قدیمہ کے اخبار واسفار سے بھی۔ جس کے حوالہ واعتبار پر۔ مغربی تحقیقات کے زیر اثر آئے ہوئے حضرت اس وقت بےضرورت لبیک کہنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کے ان مشاغل کا پورا پتا ملتا ہے۔ اور تورات کے نسخوں میں متواتر مقامات پر آپ کی تیراندازی اور آپ کا ایک مشہور تیرا انداز ہونا مذکور ہے۔ اسلامی محققین کا بھی یہی نظریہ ہے۔ کیونکہ یہ فنون اور ان کی مشق شجاعت ودلیری کا شعبہ خاص ہے اور یہ دونوں اوصاف نبوت اور تبلیغ رسالت کے لئے ضروری ہیں۔

معاشرت کے متعلق ظاہر ہوتا ہے کہ قبیلہ بنی جرہم نے آپ کو کافی مدد پہنچائی اور حقیقتاً یہی لوگ آپ کی معاشرت کی درستی اور ترتیب

کے باعث ہوئے۔ اور کیونکر نہ ہوتے جناب اسماعیل نے بھی تو ان کو قحط آب کی سخت مصیبتوں سے بچایا تھا جس کے لئے وہ تمام دشت و بیابان میں پریشان و حیران تھے۔ اسی عالم پریشانی میں جناب اسماعیلؑ اور ان کی مادر گرامی قدر کا اپنے اس قدرتی چشمہ پر متصرف ہونے کی بلا عذر اجازت دے دینا۔ جو خدائے واہب العطایا نے انھیں مخصوص عطا فرمایا تھا۔ پھر وہیں ان کے قیام کرنے اور ہمیشہ رہنے کے لیے بلا تامل راضی ہو جانا۔ وہ احسانات تھے جو بنی جرہم ہمیشہ کے لئے کبھی بھولنے والے نہیں تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں نے اپنے ایسے فیاض اور مہربان حال محسنین کی نصرت و حمایت کو اپنا فرض سمجھ لیا۔ حیات القلوب کی مفصلہ ذیل عبارت سے اس کی پوری پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

ہاجر جرہم را مرخص ساخت کہ نزدیک ایشاں فرود آمدند و خیمہائے خود زدند و ہاجرہ و اسماعیل با ایشاں انس گرفتند و درمرتبہ سوم کہ ابراہیم بدیدن ایشاں آمد و کثرت مردم و ابادانی درد و رایشاں دید شاد دارپس اسماعیل نشو و نما کر دور قبیلہ جرہم و ہریک ازایشاں یک گو سفند باسمعیل بخشیدند تاآنکہ گلہ بسیار رشد و بان تعیش میکرد

حضرت ہاجرہؑ نے بنی جرہم کو اجازت دی۔ وہ قریب ان کے آباد ہو گئے۔ اور اپنے خیمہ نصب کر دیئے اور رہتے رہتے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ ان کو انس ہو گیا۔ تیسری بار جب حضرت ابراہیمؑ پھر آئے تو آدمیوں کی جمعیت اور آبادی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت اسماعیلؑ نے انہیں لوگوں میں نشو و نما پائی۔ اور ان میں سے ہر ایک شخص نے ایک ایک دنبی اسماعیلؑ کو دی۔ یہاں تک کہ بڑا گلہ ہو گیا اور وہی باعث معاشرت و ذریعہ معاش ہوا۔ (ص129 ج1)

بنی جرہم میں شادی

مذکورۂ بالا اسناد سے حضرت اسماعیلؑ کی درستی اور ترتیب معیشت میں جرہم کا پوری ہمدردی سے حصہ لینا ظاہر ہو گیا۔ آگے چل کر ان کی یہ محبت و اخلاص قرابت کے اختصاص سے تبدیل ہو گئی۔ حضرت اسماعیلؑ نے قبیلہ جرہم کے رئیس مضاض ابن عمر الجرہمی کی لڑکی رملہ نامی سے عقد کر لیا۔ مگر ان کا یہ دوسرا عقد تھا جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ ابن سعد طبقات میں اسلام کے امام الانساب کلبی کے اسناد سے لکھتے ہیں۔

وکانت لا سمعیل امرءۃ من عمالیق ابنۃ صیدی قبل الجرھمیۃ وھی التی کان جاء ھا ابراھیم فجفتہ فی القول ففارقھا اسماعیل ولم تلد لہ شیئا

کلبی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی بی بی قوم عمالیق سے تھیں صیدی کی لڑکی۔ اور یہ ان کی جرہمیہ بی بی

سے پہلے تھیں یہ وہی تھی جس کے سامنے ابراہیمؑ آئے تھے اور اس کی شکایت حضرت اسماعیلؑ سے کر گئے تھے۔ اسی بنا پر اسماعیل نے اسے طلاق دے دی اس سے اسماعیل کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (طبقات ج 1 ص25)

صحیح بخاری اور طبقات کی عبارتوں سے حضرت اسماعیلؑ کی دو بیبیوں کا ہونا ضرور ثابت ہوتا ہے۔ مگر بخاری سے دونوں بیبیوں کا جرہمیہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اور یہ خلاف مشہور و جمہور ہے۔ طبقات کی عبارت اوپر لکھ دی گئی ہے کلبی کا قول نقل ہو چکا ہے تمام محققین و مؤرخین اسلام کا قریب قریب یہی نظریہ ہے۔ تورات کی عبارت سے بھی جو سرسید نے خطبات احمدیہ میں نقل فرمائی ہے اور جس کو ہم حضرت ہاجرہؑ کی ہجرت کے بیان میں لکھ آئے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کا پہلے ایک مصری لڑکی سے شادی کرنا ثابت ہوتا ہے۔

سید صاحب نے بلا تامل اسی کو صحیح تسلیم کر لیا ہے اور اپنی ذاتی رائے و قیاس کی اصابت پر اعتبار کر کے اسی کو استدلالاً پیش کیا ہے۔ جب آپ کے استدلال پر نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے تورات کی تقلید کے کوئی اہمیت نہیں پائی جاتی تورات کا فارسی ترجمہ جو نقل کیا گیا ہے۔ اس میں مصری عورت کا لفظ ضرور ہے مگر نقل کے ساتھ سید صاحب کو عقل سے بھی تحقیق کر لینا ضرور تھا کہ وہ مصری عورت اس وقت حجاز میں اور خاص کر مکہ میں آئی کہاں سے؟ کیونکہ کوئی تاریخ اور کوئی سیر اس وقت حجاز اور مصر میں آمد و رفت جاری رہنے کا پتا نہیں بتلاتیں۔ اور کیونکر بتلا سکتی ہیں۔ حجاز تو ذریت ابراہیمیؑ کی تشریف آوری کے وقت ایسا غیر آباد اور ویران بیابان ثابت ہوتا ہے۔ جہاں انسانی آبادی کا ممکن ہونا ہی قریب المحال ہے۔ اس بنا پر ایک محقق مشکل سے اس عورت کا مصری ہونا تسلیم کر سکتا ہے۔ اس لئے کلبی کا وہ قول جو طبقات ابن سعد کے حوالے سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ زیادہ تر اعتبار کے لائق ہے۔ کیونکہ وہ امرۃً من عمالیق قوم عمالیق کی ایک عورت لکھتے ہیں اور یہ تاریخی مشاہدے کے بالکل مطابق ہے۔ کیونکہ تمام تاریخوں کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ سب سے پہلے مکہ کی آبادی بنی جرہم سے ہوئی۔ اور ان کے بعد قبیلہ عمالیق کے لوگ یمن سے آ کر آباد ہو گئے۔ حضرت ہاجرہؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی شادی جو اپنے زمانہ میں کی اور جو تورات میں بھی مذکور ہے۔ وہ اسی عمالیق یمن کی لڑکی تھی جس کے باپ کا نام کلبی نے صیدی بتلایا ہے۔

اب اس مقام پر سید صاحب کا قیاس بھی صحت تاریخی سے قریب ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ خطبات ص 131 میں تحریر کرتے ہیں۔

> یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بنی جرہم نے ابتدا میں اپنی قوم کی بیٹی کو حضرت اسماعیلؑ کے نکاح میں دینے سے تامل کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ حضرت اسماعیلؑ کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے۔ مگر باہم سکونت پذیر ہونے سے وہ خیال جاتا رہا ہوگا اور اسی سے یقین ہوتا ہے کہ ان کی دوسری بی بی جرہم کی قوم سے تھیں۔''

اب مصری کی جگہ سید صاحب اگر عمالیقی لکھ دیں اور تسلیم کر لیں تو پھر ان کے اور جمع محققین و محدثین اسلامی کے اقوال و نظریہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا۔ شاید سید صاحب کو اس میں تامل ہو۔ تو ہم بتا دیتے ہیں کہ مترجمان تورات کو ترجمہ کرتے وقت ضرور سہو ہوا ہے۔ وہ عمالیق سے عمالقہ مصر سمجھے ہیں اور اسی لیے انھوں نے اس عورت کی قومیت کے اظہار کی جگہ صرف اس کی سکونت بتلا دی ہے۔ اور

قومیت کی حقیقت نہیں بیان کی۔حقیقت یہ ہے کہ عمالقہ مکہ میں سے ایک عورت تھی اور یہ عمالقہ بھی وہی تھے جو یمن سے آ کر جرہم کے بعد مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔اگر اس تحقیق پر بھی اطمینان نہ ہو اور یہ تعریض پیش کی جائے کہ عمالیق بھی عمالقہ مصری کی ایک شاخ ہے۔اگر چہ یہ بھی ثبوت طلب ہے۔مگر ہم ان کے بتلانے کو تیار ہیں کہ مصر کی تمام قومیں بھی آخر میں امم سامیہ کی ذریات اور اعقاب واخلاف ثابت ہوتی ہیں جو اصلاً اور نسلاً خاص الخاص عرب تھے۔جیسا کہ امم سامیہ کے ذکر میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔

فاضل معاصر صاحب ارض القرآن نے اس کی بحث میں جو اپنا نظریہ قائم کیا ہے۔ہمیں اس سے پورا اتفاق ہے اور ذیل میں ہم اس کو نقل کر دیتے ہیں۔

> حضرت اسماعیل کی بی بی کا جرہمی یا مصری ہونا کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔اس عہد میں یہی عرب مصر کے حکمران قبائل تھے۔اس بنا پر وہ عورت جرہمی بھی ہو سکتی ہے اور مصری بھی۔نیز مسلمانوں (بخاری) اور یہودیوں (تالمود) کی روایت میں مذکور ہے کہ اسماعیلؑ نے دو بیویاں کی تھیں۔ممکن ہے کہ ایک مصری ہو اور ایک جرہمی۔'' ارض القرآن ص52

وفات اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل کے تمام حالات قریب قریب اپنے مندرجہ بالا سلسلہ بیان میں قلمبند ہو چکے آخر میں ہمیں اتنا بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ آپ نے اپنی مقدس حیات کا زمانہ تبلیغ رسالت کی خدمات اور اس کی انجام دہی میں صرف فرمایا۔آپ کی تبلیغ و دعوت کا دائرہ علاقہ حجاز سے اُٹھ کر مما لک یمن وحضر موت تک پہنچا ہوا تھا۔اس بنا پر ظاہر ہوتا ہے کہ یمن اور اس کے سرحدی اقوام وقبائل میں بھی شریعت ابراہیمؑ اور دعوت اسماعیلؑ جاری ہو چکی تھی اور جناب اسماعیلؑ جس طرح حجاز اور اس کے حوالی واطراف کی بسنے والی قوموں کی ہدایت کے واسطے مبعوث ہوئے تھے اسی طرح یمن اور حضر موت کے رہنے والوں کی تعلیم وتلقین پر بھی منجانب اللہ مامور تھے۔

جناب اسماعیلؑ نے ایک سو تیس برس کی عمر میں بمقام مکہ انتقال فرمایا اور اپنی والدہ ماجدہ جناب ہاجرہ کے پہلو میں بمقام حجر مدفون ہوئے۔طبقات ابن سعد میں ہے۔

توفی اسماعیل بعد ابیہ فدفن داخل الحجر مایلی الکعبہ مع امہ ھاجر

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے پدر بزرگوار کے بعد انتقال فرمایا اور اپنی ماں کے پاس حجر میں مدفون ہوئے۔(طبقات ج ا ص25)

اُم اسماعیلؑ حضرت ہاجرہؑ

ہم اپنے سلسلہ بیان میں قبل اس کے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد واعقاب کا ذکر آغاز کریں۔جناب ہاجرہؑ کے حالات کا بیان کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ جناب اسماعیلؑ کی طرح اس خاتون مطہرہ کی طرف بھی متعصب یہودیوں اور عیسائیوں نے توہین و

تحقیر کے غلط واقعات بیان کر کے ساری دنیا کو گمراہ کر رکھا ہے۔

عبری زبان میں حضرت ہاجرہ کا نام ہاغان تھا۔اور عربی میں آجر یقول اجر بغیرھا۔ام اسمٰعیلؑ طبقات ج1 ص33۔مگر آگے چل کر بالتدریج۔ پہلے آجر سے ہاجرہ ہوا۔ پھر ہاجرہ سے ہاجرہ ہوگیا۔ ہاجرہ ہونے کی اصلی وجہ شام سے حجاز میں ہجرت فرمانے کی رعایت خاص ہے۔ اسلامی تاریخیں ہاجرہ کے ابتدائی حالات میں بالکل خاموش ہیں اور کچھ نہیں بتلاتیں۔ اس لئے لامحالہ یہود ونصاریٰ کی کتب قدیمہ سے آپ کے آغاز احوال کا تفحص وتجسس ضروری ہوا۔ مگر ان کی حالت معلوم ہے۔ وہ شروع ہی سے ان کی توہین وتحقیر پر حلف اٹھائے بیٹھے ہیں۔ سنگ آمد سخت آمد۔ لیکن حقیقت کے جویا۔ اصلیت کے متلاشی اور حق کے طالب اپنی نیک نیتی کی کوششوں میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں اور ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ ہم نے جناب ہاجرہؑ کے متعلق بہت سے مضامین پڑھے اور قدیم وجدید محققین کی مختلف آراء دیکھیں۔ مگر ان تمام عقلی اور نقلی مباحث و بیان میں وہ بحث جس کو سرسید مرحوم نے مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی کی استفادات سے اپنے خطبات کے ص163 میں تحریر فرمائی ہیں۔ اور جس کو النصوص الباھرہ فی حریرۃ الھاجرۃ کے عنوان سے مندرج فرمایا ہے۔ سب سے زیادہ مفصل اور مکمل سمجھتے ہیں۔ ذیل میں اسی کے اقتباسات کو بقدر ضرورت قلم بند کرتے ہیں۔

حضرت ہاجرہؑ کے ابتدائی حالات

سفر الیشاء میں۔ جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ لکھا ہے کہ شہر بابل دارالسلطنت نمرود میں۔ جہاں تارخ یعنی آذر اور ابراہیمؑ اور ان کے تمام خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ ایک شخص نہایت ہنرمند ذکی الطبع۔ حکیم۔ فطین جو اکثر علوم صنائع وبدائع میں کمال رکھتا تھا۔ رہتا تھا اور اس کا نام رقیون تھا۔ مگر وہ بہت مفلس۔ محتاج اور مفلوک الحال تھا۔ تنگ دستی اور سختی سے وطن میں رہنا نامناسب سمجھ کر اس نے ملک مصر کی راہ لی۔ جب وہاں پہنچا اور اس کی لیاقت و دانشمندی باشندگان مصر پر ظاہر ہوگئی۔ تو بادشاہ مصر نے اس کو براہ قدردانی اعیان سلطنت میں داخل کرلیا۔ رفتہ رفتہ وہ بالکل کاروبار شاہی پر حاوی ہوگیا۔ بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس کا لقب فرعون ہوا۔ اسی فرعون کے زمانہ بادشاہی میں بوجہ قحط سالی جناب ابراہیمؑ فلسطین سے مع اہلبیت کے مصر میں تشریف لے گئے۔ رقیون اور ہاغان دونوں عبری لفظ ہیں اور اس سے استدلال ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں عبرانی یعنی بنی عبر تھے اور کیا عجب ہے کہ اسی قبیلہ کے ہوں جس قبیلہ کے حضرت ابراہیمؑ ہوں اور ظاہراً اس خیال سے کہ بادشاہ مصر ان کا ہم وطن یا ہم قبیلہ ہے اس قحط و مصیبت میں حضرت ابراہیمؑ نے مصر میں جانے کا خیال وقصد کیا ہو۔ جیسا کہ ہر ایک انسان کو ایسے موقع پر اس قسم کا خیال ہوسکتا ہے۔ غرض جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں پہنچے اور انھوں نے حضرت سارہ کا اپنی بی بی ہونا ظاہر نہ کیا۔ بلکہ بہن ہونے کا جو رشتہ تھا وہ ظاہر کیا تو فرعون نے حضرت سارہ سے شادی کرنی چاہی اور حضرت ابراہیمؑ کو کچھ دے کر حضرت سارہؑ کو بقصد شادی کے اپنے گھر لے گیا اس واقعہ سے بھی استدلال ہوسکتا ہے کہ فرعون بادشاہ مصر کو بسبب ہم قوم ہونے کے زیادہ تر حضرت سارہ سے شادی کرنے کی رغبت ہوئی تھی۔ غرضکہ ابھی شادی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف قسم کے صدمات فرعون پر واقع ہوئے اور ان کے سبب سے فرعون نے حضرت سارہ کے حالات کی زیادہ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت

ابراہیمؑ کی بی بی ہیں اسی وقت فرعون نے ان کو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بھیج دیا اور ہاجرہ اپنی بیٹی کو بھی ان کے سپرد کر دیا۔

یہودیوں کی ایک قدیم اور معتبر تاریخ سے۔ ہاجرہؑ کا جن کا اصلی نام ہاغان تھا۔ رقیوں نامی۔ بادشاہ مصر کی بیٹی ہونا ثابت ہوگیا۔ یہیں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اس گمراہانہ اور مغویانہ نقل وتحریر کی اصلیت۔ جو وہ جناب ہاجرہؑ کی مجہول النسبی تمام دنیا میں پھیلائے ہوئے ہیں۔ کہاں تک اعتبار کے قابل ہے۔ ہم اسی کے لیے ان کے اور اعترافات آئندہ سلسلہ بیان میں نقل کرتے ہیں۔

لیکن ان واقعات کے بیان سے پہلے خطبات احمدیہ کی مندرجہ بالا عبارت کے متعلق ہم چند مشتبہ امور کا فیصلہ کر لینا مناسب سمجھتے ہیں جو اسلامی شریعت اور انبیاومرسلین کی پاک سیرت کے خلاف ثابت ہوتے ہیں۔

ناموس رسولؐ کی توہین واجب الاحترام رسول پر الزام

مرقومۂ بالا عبارت میں دو امور مشتبہ اور تنقیح وتنقید طلب ہیں۔ اول یہ کہ فرعون حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت کچھ دے لے کر حضرت سارا کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا۔ دوم یہ کہ ہنوز شادی نہ ہونے پائی تھی کہ فرعون پر مختلف اقسام کے صدمات واقع ہوئے اگر یہ اس یہودی مؤرخ کا قول ہے اور آپ کا قول نظریہ بھی یہی ہے۔ اس سے اور بڑھ کر اتہام وہ حضرت ابراہیمؑ پر لگائے۔ ہمیں نہ کوئی تعجب ہوگا اور نہ شکایت۔ کیونکہ اس کے علم وعقیدہ میں نبوت کی مقدار اور رسالت کی شان جس انداز پر پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ مخالفین اسلام کی جگہ اگر یہ سرسید کا قول ہے یا مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی کا نظریہ۔ تو نہایت شرم اور افسوس کے قابل ہے۔ اور میرے خیال میں مخالفین اسلام کی تقلید وتائید میں بے حد افراط وتفریط اختیار کرنے کا یہی نتیجہ ہے۔ اگر ان کی تقلید وتائید کے خیال کے ساتھ ہی کم سے کم ان کو اپنے اخبار وآثار سے مقابل کر لیا گیا ہوتا تاہم حقیقت حال کا بہت کچھ انکشاف ہوگیا ہوتا۔ مگر یا تو اپنے اخبار وآثار سے بالکل لاعلمی یا ان کی طرف کمال ناتوجہی کے باعث سے ایسے غلط اور فطرت انسانی اور اصول اخلاقی کے خلاف واقعات کی نقل وتحریر پر جرات کی گئی اسلامی تاریخوں میں اس واقعہ کو اگرچہ مختلف طریقوں سے لکھا ہے مگر بالآخر مفہوم ومقصود سب کا ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرعون مصر کی زبردستیوں سے جان وآبرو کے بچنے کی کوئی دوسری صورت نہیں دیکھی تو اپنی ذاتی عظمت اور جناب سارہ کی عصمت کو محافظ حقیقی کی امانت وحفاظت میں دے کر سارہ کو فرعون کے پاس بھیج دیا اور خود نماز میں مشغول ہو کر حفظ ناموس کی دعائیں مانگنے لگے طبقات ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں۔

مرا ابراھیم و سارہ بجبار من الجبابرہ فاخبر الجبار بھما فارسل الی ابراھیم فقال من ھذہ معك قال اختی فلما خرج من عند الجبار دخل علی سارہ فقال لھا ان ھذا الجبار سالنی عنك فاخبرتہ انك اختی و انت اختی فی دین اللہ فان سئلك فاخبرتہ انك اختی فارسل الیھا الجبار

جب ابراہیمؑ اور سارہ کا ایک بادشاہ جبار کے ملک میں سے گذر ہوا۔ تو اس کو ان لوگوں کے آنے کی خبر لگ گئی۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کو بلا بھیجا اور ان سے حضرت سارہؑ کی نسبت پوچھا کہ یہ تمھاری کون ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا میری بہن ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ بادشاہ کے پاس سے لوٹ کر سارہ کے پاس آئے تو ان سے کہا کہ اس نے مجھ سے تمہاری نسبت پوچھا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ میری بہن ہیں اور ظاہر ہے کہ دینی اعتبار سے تم میری بہن ہو۔ اگر تم سے اس کے متعلق وہ پوچھے تو تم بھی کہہ دینا کہ میں ان کی بہن ہوں۔ یہ کہہ کر سارہ کو اس کے ہاں بھیج دیا۔

بات اتنی تھی۔ اس میں نہ تھوڑا مال لے کر حضرت ابراہیمؑ کے راضی ہوجانے کا حال مرقوم ہے نہ بہت سا مال لے کر اور نہ اس روایت کے کسی ایک لفظ سے بھی حضرت ابراہیمؑ کی اس لین دین کی خبر ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مخالفین اسلام کے اخبار وآثار کے نقل کرتے وقت اپنی کتابوں میں ان واقعات کے ملاحظہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی اور کیونکر ہوسکتی تھی اس لئے کہ تحقیقات جدید اور یورپین محققین کی تائید میں اسلامی محققین ومؤرخین کی تمام آراء اور نظریات بے کار اور بالکل ساقط الاعتبار ہیں۔ مگر آخر میں اس بدعنوانی اور مطلق العنانی کا نتیجہ کیا ہوا۔ وہ یہ کہ ایسے عظیم المراتب اور جلیل الشان رسول کے آداب واخلاق پر ناموس فروشی کا بدنما دھبہ لگ گیا۔ اور آپ حضرات کے باغیرت ہاتھ اور حیادار قلم نے آنکھ بند کر کے بلا تامل یہ فقرہ لکھ دیا کہ فرعون حضرت ابراہیمؑ کو بہت کچھ دے کر حضرت سارا کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا۔ خطبات مطبع لاہور ص164

حضرت ابراہیمؑ تو بڑی عظمت اور منزلت کے بزرگ تھے۔ یہ مسئلہ تو ایسا عام ہے اور یہ واقعہ ایسا معمولی کہ ایک ادنیٰ طبقہ اور حیثیت کا آدمی۔ ایک منٹ کے لئے بھی اس ننگ وعار کو اختیار نہ کرے گا۔ افسوس اپنے مقدس پیغمبر پر ایسا شرمناک الزام لگانے سے پہلے آپ نے اس من گھڑت کہانی یا قصہ کے معاملہ کی حقیقت اپنے اخبار وآثار سے معلوم کرلی ہوتی تو آپ کو ثابت ہوجاتا کہ حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں فرعون نے جو کچھ متال ومتاع ہدیتاً پیش کیا تھا وہ جبروت قدرت کی ان جلوہ آرائیوں کے بعد تھا۔ جو اس کے متنبہ کرنے کی غرض خاص سے مشاہدہ کرائی گئیں تھیں۔ اور جو صدمات بقول سید صاحب فرعون پر گذرے تھے۔ وہ اس کی بے ادبی کی سزا تھی۔ اور اسے مدعائے قدرت امتناع حرکت اور اطلاع معصیت تھا۔ اس ظہور قدرت کے قبل حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ کوئی عزت وناموس کا درد کے معاملات پیش نہیں ہوئے تھے۔ جس کو خود سید صاحب اپنی آئندہ عبارت میں اعترافاً لکھ آئے ہیں۔ اور ہم بھی اس کو پوری وضاحت سے آئندہ بیان کریں گے۔

عقل سلیم رکھ کر کوئی کیسے اس بیان کو صحیح مان سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) فرعون مصر نے حضرت ابراہیمؑ کو کچھ یا بہت کچھ دے کر حضرت سارہ سے اپنا عقد کر لینے پر راضی کرلیا۔ یا حضرت ابراہیمؑ فرعون مصر سے تھوڑا یا بہت سا مال لے کر اپنی بی بی سارہ کا عقد اس سے کر دیئے جانے پر رضامند ہوگئے۔ (استغفر اللہ) کیا اسلام نے رسالت کے اخلاق۔ انبیا ومرسلین کی معاشرت اور ان کی حیا وغیرت کے یہی

طریقہ اور وتیرے قائم کئے ہیں۔ پھر نعوذ باللہ من ذالك۔ جب یہ لغویات اور حشویات ان ذوات مقدسین ومطہرین کی عادات کے بالکل مخالف پائے جاتے ہیں۔ تو افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ یا کم سے کم اس کی نقل کرتے وقت وہ مخالف کے ایسے صریح اتہام کی تردید وتنقید سے کیوں رو کا اور خاموش رہ گیا۔

فرجعت الی ابراهیم صلعم وهو یصلی و یدعو الله فقالت ابشر فقد کف الله ید الکافر الفاجر واخدمنی هاجر۔

جب سارا (شاہ مصر کے دربار سے لوٹ کر) حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئیں تو یہ نماز پڑھ رہے تھے اور خدا سے (حفظ ناموس) کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ سارا نے فرمایا۔ ابراہیمؑ تم کو بشارت ہو کہ خدا نے اس کافر فاجر کے ہاتھ سے میری کفایت کی اور میری خدمت کے لیے ہاجرہ کو دیا۔

اب اس عبارت کو پڑھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اگر اس وقوعہ قدرت سے پہلے سارا کے معاملات میں بہت سامال لے کر (نقل کفر کفر نباشد) فرعون سے ان کا عقد کر دیئے جانے پر راضی ہو گئے تھے۔ تو پھر آپ کو اضطرار واضطراب کی جگہ پورا اطمینان ہونا چاہتے تھا۔ نماز پڑھنے اور دعائیں مانگنے کی ضرورت کیا تھی۔ رضا کا سودا تھا۔ زبردستی تو تھی ہی نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا نماز پڑھنا اور دعا مانگنا بتلا رہا ہے کہ آپ کو اپنے حفظ ناموس کا خیال کیسا دل سے لگا تھا کہ حفظ حرمت کی جب کوئی صورت نہیں دیکھی تو فطرت انسانی کا جیسا ہمیشہ دستور ہوتا ہے آپ نے بھی اس بادشاہ جابر کی زبردستیوں کے مقابلہ میں اس حافظ حقیقی کی بارگاہ میں اپنے استحفاظ ناموس کی استدعا پیش کی اور اس کی حمایت وکفایت کے مستدعی ہوئے۔

اسی طرح جناب سارا کا صحیح وسلامت اور باعصمت وعفت اس ظالم کے دربار سے واپس آ کر حضرت ابراہیمؑ کو اس امر کی خاص بشارت پہنچانا کہ خدا نے ان کو اس کافر کے ظلم سے بچالیا۔ ثابت کر رہا ہے کہ یہ معاملات (نعوذ باللہ) جانبین کی رضامندی پر مبنی نہیں تھے۔ بلکہ بخلاف اس کے غایت مجبوری۔ نہایت معذوری اور بے انتہا بے کسی وبے بسی کی ایسی حالتوں میں جب آبروئے جان کے حفظان وامان کی نہ کوئی امید باقی تھی نہ کوئی عنوان تب حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی حمایت پر قناعت وتوکل فرما کر حضرت سارہ کو بادشاہ مصر کے پاس بھیج دیا تھا لیکن باوجود اس کے کہ خدا کی تائید اور اس کی حمایت وحفظان پر پورا یقین واطمینان تھا۔ مگر تاہم دلی انتشار اور قلبی اضطراب کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنی حیا وغیرت کے غیر متحمل جذبات کو نہ سنبھال سکے۔ بالآخر نماز پڑھ کر حفظ حرمت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں لکھ آئے ہیں۔ پھر ایسا مقدس معصوم۔ جو اس وقت ایک مستغیث مظلوم کی سچی شان میں ایسے صریح ظلم وجور کے استغاثہ پر استجابت کا فوری حکم ہوا اور پھر جبروتِ قدرت کو عملی طور پر جو مظاہر وآثار دکھلانے تھے وہ دکھلائے اور وہ اتنی مدت مدید گذر جانے کے بعد بھی آج تک دنیا کے تمام کارناموں میں مذکور ومحفوظ ہیں۔ جل جلالہٗ و جل شانہٗ

حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب معجزات کے قائل نہیں۔ معجزے کا جہاں نام آ گیا۔ آپ کی روح شرما گئی۔ وہ انبیا ومرسلین کے

معجزات یا خوارق عادات کوخلاف معمول تصرفات سمجھ کر محالات میں شمار کرتے ہیں۔حالانکہ ایک دیندار مسلمان اور قائل قرآن کبھی انبیاو مرسلین سے صدور معجزات کا انکار کرہی نہیں کرسکتا۔وہ معجزات اور عام تصرفات کے حدود فاصل کوخوب پہچانتا ہے اور محالات اصلی یا مادی۔ اور غیر ممکنات عادی اور سببی کی فرق و اقسام کوخوب جانتا ہے کیونکہ ہمیں خاص معجزے کے متعلق بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے اس سے بالکل قطع نظر کر کے ہم اپنے اصلی بیان مدعا کی طرف آ جاتے ہیں۔

سید صاحب ان آثار قدرت کومختلف قسم کے صدمات لکھ کر مخفی کرتے ہیں۔آپ کی اس ترکیب سے خدا کی تمام قدرتوں کے قائل۔ رسول کی عظمت اس کے تقدس اور اس کے مجیب الدعوت ہونے پر ایمان رکھنے والوں کی تشفی اور اطمینان کیا ہوگا۔ ہزارہا اقسام و انواع کے شکوک۔اشتباہ اور اوہام دلوں میں پیدا ہوجاتے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی معتبر اور مستند اسناد سے ان صدمات کی تفسیر و تفصیل قلمبند کردیں۔کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس یہودی تاریخ سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے۔اس کی عبارت میں کہیں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ مگر قرائن بتلارہے ہیں کہ اصلی عبارت میں ان معجزات الٰہیہ اور کرامات قدسیہ کا ضرور ذکر کیا گیا ہے۔اس لئے ص166 میں توریت مقدس کے عربی ترجمہ میں یہ عبارت لکھی گئی کہ لمارأ الکرمات التی اخرجت بسارہ۔خود اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔''(فرعون نے) جب دیکھا کہ امات جو بوجہ سارا واقعہ ہوئی'' اب نہیں معلوم کہ سید صاحب کا قلم اعتقاد اس وقت کہاں تھا جو کرامات کا لفظ بھی اس تصریح کے ساتھ کہ بوجہ حضرت سارا واقع ہوا۔ بے دیکھے بھالے اور بے سمجھے بوجھے لکھ گیا۔یہی معجزہ ہے اور یہی کرامت۔اب تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی ان آیات و کرامات کا ذکر توراۃ کی عبارات میں ضرور داخل تھا۔مگر آپ حضرات نے اپنی خاص مجبوری کی وجہ سے نہیں لکھا۔

بہرحال۔جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری کتابوں میں ان معجزات الٰہیہ کا پوری تفصیل سے ذکر موجود ہے تو ہم مخالفین کے ماخذوں سے اس کے لئے خوشہ چینی کیوں کریں۔اس کی مفصل کیفیت طبقات ابن سعد کی عبارت سے حسب ذیل ہے۔

فلما ارسل الیھا الجبار و دخلت علیه دعت الله یکفه عنھا قال ایوب فضبث بیدہ و اخذ اخذۃ شدیدۃ فعاھدھا لئن خلی عنه لا یقربھا فدعت الله فخلی عنه ثم ھم بھا الثانیة فاخذ اخذۃ ھی اشد من الاولی فعاھد ایضا لئن خلی عنه لا یقربھا فدعت الله فخلی عنه ثم ھم بھا الثالثه فاخذ اخذۃ ھی اشد من الا ولین فعاھد ھا لئن خلی عنه لا یقربھا فدعت الله تعالیٰ فخلی عنه فقال الذی ادخلھا اخرجھا عنی فانك ادخلت علی شیطانا ولم یدخل انسانا اخدمھا ھاجر طبقات ابن سعد مجلد اولیٰ صفحه 23

سارہ کو جب اس بادشاہ جابر نے بلا بھیجا اور جب یہ اس کے پاس پہنچیں تو آپ نے خدائے سبحانہ تعالیٰ

سے اپنی حفاظت وحمایت کی دعا مانگی۔ ایوب راوی حدیث کا بیان ہوا کہ اس بادشاہ جابر نے ہاتھ بڑھا کر آپ کو پکڑنا چاہا تو قدرت خدا سے اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس نے سارا سے عہد کیا کہ اگر اس کا کھل جائے تو وہ پھر آپ کے ساتھ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ آپ نے دعا کی ہاتھ کھل گیا۔ پھر اس نے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ ہاتھ شل ہو گیا۔ پھر اس نے ویسے ہی آپ کے ساتھ اقرار کیا کہ اگر اس کا ہاتھ کھل جائے گا تو وہ آپ کے ساتھ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ حضرت سارا نے پھر دعا فرمائی۔ ہاتھ کھل گیا۔ اب پھر تیسری بار اس نے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر تیسری بار اس کا ہاتھ سابق دفعات سے کہیں زیادہ شل اور بیکار ہو گیا۔ تو پھر اس نے آپ سے اقرار کیا کہ اگر اس کا ہاتھ کھل جائے گا تو پھر وہ ایسی حرکت اور قصد نہ کرے گا۔ حضرت سارہ نے پھر دعا کی۔ اس کا ہاتھ کھل گیا۔ تو اس نے اس شخص سے جو آپ کو لے کے آیا تھا بلا کر کہا ان کو ہمارے پاس سے لے جاؤ کہ تو نے مجھ پر تو شیطان کو داخل کر دیا ہے نہ انسان کو۔ پھر سارا کی خدمت کے لیے ہاجرہ کو ساتھ کر دیا۔

یہی وہ قدرت کے آیات اور جبروت مشیت کے تصرفات میں جنھوں نے اپنے اظہار و اختیار سے خدا کے جلیل القدر پیغمبر کے دامن ناموس پر دھبہ نہ آنے دیا اور ان کی حرمت کو بال بال بچالیا۔ حقیقتاً یہ ایسے نازک موقع ہیں جو انسان کو اس کی بے انتہا درجہ کی بے کسی اور بے بسی کے خاص عالم میں پیش آجاتے ہیں اور جن سے وہ بغیر خدا کی تائید و توفیق کے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔

آیات الٰہی تو ملاحظہ فرمائے گئے۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاق اہلبیت۔ جو اصلاً اور حقیقتاً اخلاق الٰہیہ کے خاص پر تو ثابت ہوتے ہیں۔ ضرور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ صاف ظاہر ہے کہ انبیاء و اہلبیت نبوت علیہم السلام کے ساتھ یہ اخلاق کریمانہ مخصوص کئے گئے ہیں وہ ذوات مقدسہ باوجود متواتر ظلم و جور کے اظہار و وقوع کے بھی۔ ظالم کی دعا اور قاتل کی بھی خواہی اور طلب آمرزش سے باز نہیں آتے۔ جس کی ابتدا آل ابراہیمؑ سے ہوتی ہے اور انتہا آل محمدؐ پر ثابت ہوتی ہے۔ اللھم صل وسلم علی محمد و آل محمد کما صلیت و بارکت علی ابراھیم و علی ابراھم انك حمید مجید۔ (خدایا درود بھیج محمدؐ و آل محمد جیسا کہ تو نے درود اور برکت بھیجی ابراہیم اور آل ابراہیم۔ کیونکہ تو ہی قابل ستائش اور بزرگ و برتر ہے)

مرقومہ بالا دونوں شبہات کو پورے طور سے رفع کر کے ہم اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہیں۔

حضرت ہاجرہ پر کنیزی کا غلط الزام

سفر الیشیاء کی عبارت۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہؑ کی سرگذشت جو اوپر لکھی گئی ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ حقیقتاً جناب ہاجرہ۔ رقیون نامی بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔ بادشاہ مصر۔ حضرت سارہ کی وجہ سے ان اسرار الٰہیہ اور اعجاز قدسیہ کو ایک بار نہیں کئی بار

مشاہدہ کر کے اپنے دل میں ان کی عظمت وجلالت کی طرف سے ایسا مرعوب اور متاثر ہوا کہ اس نے اپنی لڑکی کو ان کی خدمت کے لیے دے دیا۔

اسی خدمت کے لفظ نے قیامت ڈھادی۔ سلسلہ اسماعیلی کے مخالفین کو جناب ہاجرہؑ کے مجہول النسب مشہور کرنے پر تنہا تیار نہیں کر دیا۔ بلکہ ان مقدسہ کو عام خادمہ اور اور معمولی لونڈی قرار دینے پر قوی اور مطلق العنان بنا دیا۔ مخالفین کو اپنے تعصب اور نفسانیت سے سلسلہ ابراہیمی میں جتنی حضرت اسحاقؑ کی مدح سرائی مقصود تھی۔ اتنی ہی حضرت اسماعیلؑ کی تحقیر۔ ذلت اور رسوائی۔ جیسا کہ ابھی ابھی واقعہ ذبح میں حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی باہمی مماثلت اور مساوات کی بحث میں ان کے متعصّبانہ اقوال ونظریہ لکھے گئے ہیں۔

اس بنا پر پہلے یہودیوں نے پھر عیسائیوں نے حضرت ہاجرہؑ پر کنیز اور حضرت اسماعیلؑ کو کنیز زادہ مشہور کر دیا حالانکہ یہودیوں ہی کے اقرار واظہار سے رقیون کا عبری سلسلہ سے ہونا اور ہاجرہ کا اس کی لڑکی ہونا ثابت ہوتا ہے تاہم وہ اپنی بے ادبانہ تحریر اور گستاخانہ تحریک سے باز نہیں آتے اور اپنے کذب وافترا سے توبہ نہیں کرتے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اسلامی کتابوں میں بھی جناب ہاجرہؑ کی نسبت خدمت کا لفظ آیا ہے اور اسی روایت میں جس کو ہم نے طبقات ابن سعد سے نقل کیا ہے۔ **واخدمنی ھاجر** کا فقرہ موجود ہے۔ اس فقرہ کا مفہوم۔ جب استفہام استعجابیہ کے معنوں میں لیا جائے گا تو ظاہر ہو جائے گا کہ حضرت سارہ اس بشاشت سے کمال استعجاب کی حالت میں حضرت ابراہیمؑ کو خبر دیتی ہیں کہ ہاجرہؑ (کی ایسی عالی مرتبہ اپنی بیٹی) میری خدمت کے لئے دی۔

خدمت کے لئے دیا جانا۔ یا خدمت کرنا۔ یا محض خادمہ ہونا نہ اس وقت عیب کی بات تھی اور نہ اس وقت ہے اس لئے اسلام کی معتبر کتابوں میں خادمہ کا لفظ پایا جانا نہ ان کی کنیز ہونے پر دلیل ہوسکتا ہے اور نہ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل اسلام بھی ان کی عام کنیز اور معمولی لونڈی ہونے کے ویسے ہی قائل ہیں۔ جیسے یہود اور عیسائی۔ اسلامی کتابوں میں جہاں جہاں آپ کی نسبت خدمت یا خادمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان سے صرف خدمت میں رہنا۔ آداب وترتیب حاصل کرنا مراد ہے۔ اور صرف اتباع مقصود ہے۔ مشرقی تہذیب معاشرت اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی اصول پر قائم ہے کہ گھر کا بڑا بوڑھا مرد۔ گھر کے اور مردوں کے لئے واجب الاتباع ہوتا ہے۔ وہ مخدوم ہوتا ہے اور سب اس کے زیر فرمان اور محکوم۔ اسی طرح گھر میں بڑی بوڑھی عورت واجب الاتباع ہوتی ہے اور سب بہو بیٹیاں اس کے زیر حکم رہتی ہیں۔ صحیح بخاری میں خود آنحضرت صلعم سے مروی ہے۔ **واخدمنہا ھاجرہ**۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے ہاجرہ سارا کی مطیع تھیں اور خدمت گزار۔

اگر رقیون نے جیسا کہ یہودی اور عیسائی قائل ہیں۔ اپنی لونڈیوں میں سے ایک لونڈی ہاجرہ نامی کو سارہ کی خدمت اور ان کا کام کاج کرنے کے لیے ساتھ کر دیا تھا تو پھر ہاجرہؑ کے ساتھ اتنا مال جال۔ لاؤلشکر اور سوار پیادے دے کر اس کو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہاری اسی معتبر تاریخ۔ سفر ایشیاء میں اس قصہ کے سلسلہ میں تحریر ہے۔

> بعد اس کے جب حضرت ابراہیمؑ مع ہاجرہ فرعون کی بیٹی کے۔ وہاں سے چلے تو فرعون نے
> ان کے ساتھ پیادے مامور کر دیئے کہ بحفاظت تمام پہنچا دیں۔ چنانچہ یہ لوگ مع احمال

واثقال اور لونڈی غلام وغیرہ کے۔ جو بادشاہ مصر نے ان کو دیئے تھے۔ اپنے ملک میں
جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی۔ بخیر وخوبی پہنچ گئے۔

اب مخالفین اسلام سے سوال ہے کہ تمہاری تحریر اور اقوال سے جب یہ سامان ظاہر ہوتے ہیں تو تم ہی بتلا دو کہ یہ گھر کی لونڈی دینے کی شان ہوتی ہے یا گھر کی لڑکی دینے کے سامان۔ اس سوال کے جواب میں تم کو کہنا پڑے گا یہ تو گھر سے لڑکی کی رخصت کئے جانے کے سامان ہیں۔ پھر دیکھو تو تمہارا یا کسی اور کا اس عالی مرتبت خاتون کو معمولی لونڈی سمجھنا ترک ادب نہیں۔ معصیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ان تمام مشاہد وقرائن کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلہ کے متعلق سر سید نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ ضرور ماننے کے قابل ہے۔ ہم ذیل میں اس کو نقل کیے دیتے ہیں۔

> فرعون نے اپنی بیٹی کو سارہ کے ساتھ کر دیا۔ ظاہر ہے اس کے کئی سبب معلوم ہوتے ہیں ابراہیمؑ اور سارؑا کی نیکی اور بزرگی۔ اور ان کا اور فرعون و ہاجرہ کا ہم قدم ہونا۔ اس باعث سے بڑی رغبت ہوئی ہوگی کہ فرعون اپنی بیٹی کو ان کی تعلیم اور تربیت اور صحبت میں سپرد کر دے۔ کیونکہ مصر اس کی قوم اور اس کے قبیلے سے نہیں تھے۔ علاوہ اس کے اس زمانہ میں اور اس خاندان میں ہم کفو ہونے کا بہت خیال تھا۔ مصر میں رقیون۔ فرعون مصر کے خاندان کا کوئی شخص نہیں تھا اور یہ بہت بڑی رغبت اس بات کی تھی کہ ہاجرہؑ سارہؑ کے سپرد کر دے تا کہ ان کی تربیت میں رہے اور کہیں کفو میں اس کی شادی کردی جائے ،رخصت کے وقت فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہؑ کو سمجھایا کہ تیرا رہنا ان کے ساتھ تیرے لئے میرے پاس رہنے سے بہتر ہے۔ اس سمجھانے سے بھی ظاہر ہے کہ کس خیال سے فرعون نے اپنی بیٹی ان کے سپرد کی تھی۔ خطبات احمدیہ ص165

ہم سید صاحب کی مرقومہ بالا عبارت میں اتنا اضافہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ وسارہؑ کے ساتھ۔ خیال ہم وطنی اور ہم قومی کے علاوہ۔ فرعون کو ان بزرگواروں کی روحانی عظمت واقتدار کا بھی تو براۃ العین مشاہدہ ہو چکا تھا۔ اس لئے ایسے باخدا اور نیکو کار ہم قوم وقبیلہ حضرات کی ہمراہی میں اپنی لڑکی کو تعلیم وتربیت پانے آداب معاشرت سیکھنے اور ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض خاص سے دے دیا۔ اسی سفر الیشا میں یہی یہودی مؤرخ۔ تھوڑی دور آگے چل کر اپنے سلسلہ بیان میں لکھتا ہے۔ جس کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

ھی کانت بنت فرعون لما رای الا یات التی اخرجت بسارۃ قال ما اطیب ان یکون بنتی خادمۃ فی بیت ذا اولی ان یکون سیدۃ فی بیت احر (عربی ترجمہ سفر الیشاء)

(ہاجرہ) یہ فرعون کی بیٹی تھیں۔ فرعون نے جب وہ کرامات دیکھی جو سارا کی وجہ سے واقع ہوئیں۔ تو

فرعون نے کہا کہ میری بیٹی کا اس گھر میں (ابراہیمؑ کے گھر میں) خادمہ بن کر رہنا۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ اور گھر میں مالکہ اور سیدہ بن کر رہے۔

اب متعصبین یہود ونصاریٰ کی جہالت ونفسانیت کا کیا جواب ہوسکتا ہے کہ وہ صریح طور پر حضرت ہاجرہؑ کو فرعون مصر کی بیٹی ہونے کا اقرار بھی کرتے ہیں اور پھر اقرار کے بعد انکار بھی۔ سرسید مرحوم خطبات میں لکھتے ہیں۔

1850ء میں بمقام کلکتہ اسی بات کا مباحثہ ہوا تھا۔ اور اکثر یہودیوں نے اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ حضرت ہاجرہؑ لونڈی نہیں تھیں۔ بلکہ بادشاہ مصر کی لڑکی تھیں۔

سرسید اس چشم دید مناظرہ کی حقیقت لکھ کر ایک معقول طریقہ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ خاص تورات کے الفاظ سے بھی ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ان کی عبارت یہ ہے۔

لفظ امۃ کی زبان عبری سے تحقیق وتنقید

توریت مقدس سے بھی ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں۔ نہایت صاف اور روشن بات یہ ہے کہ اس وقت کے حالات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جو شریٰ سے یعنی بیچ لئے جاتے تھے۔ دوسرے وہ جو غنیمت سے حاصل ہوتے تھے۔ یعنی وہ لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے پہلی قسم کی لونڈی غلاموں کو جو خریدے جاتے تھے۔ ضیف کہتے تھے اور دوسروں کے لونڈی غلام جو جو لڑائیوں میں اسیر ہو کر آتے تھے وہ کہلاتی حرب۔ یعنی غنیمت جنگ کہلاتے تھے۔ ان کی اولاد بھی لونڈی غلام کہلاتی تھیں۔ مگر حضرت ہاجرہؑ ان باتوں سے پاک تھیں۔ پھر وہ کیونکر لونڈی ہوسکتی تھیں۔ ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔ خطبات ص167

مندرجہ بالا عبارت میں اتنا اضافہ ضرور ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی حضرت ہاجرہ کی لونڈی بتلانے میں سچے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ پہلے وہ ہاجرہ کو مندرجہ بالا دونوں اقسام میں سے کسی ایک قسم کی کنیز ہونا ثابت کرلیں تورات اور اسکے بعد کی تمام کتابوں میں سے کسی ایک کتاب سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ فرعون مصر نے جناب ہاجرہؑ کی خریداری کی تھی۔ یا بطور غنیمت وہ بذریعہ جنگ لائی گئیں تھیں۔ جب ایسا نہیں ہے تو ان لوگوں کا ایسا بیان سراپا افترا ہے اور سراسر بہتان۔

اب اس بحث کے متعلق یہ امر تنقیح طلب ہے کہ پھر یہودی اور ان کی تقلید میں عیسائی۔ حضرت ہاجرہؑ کو کیوں لونڈی کہتے ہیں؟ اول تو اس کا سب سے بڑا اور قوی سبب یہی ہے کہ جیسا کہ آغاز بیان میں بیان ہو چکا ہے کہ یہودی حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں۔ سوائے حضرت اسحاقؑ کے حضرت اسماعیلؑ کی تعظیم وحرمت نہیں کرتے۔ ان کی تعظیم وحرمت نہ کرنے ہی تک اکتفا کی جاتی تو ہمیں کسی شکایت کی مجبوری نہیں تھی۔ مگر حسد ونفسانیت کی بنا پر حضرت اسماعیلؑ کی تحقیر وذلت شروع کر دی گئی اور پھر اس کدوضد کے ساتھ کہ خود تو خود۔ دوسروں کو بھی اپنے اس افترا اور اغوا میں شریک اور رفیق بنالیا گیا۔ عیسائی باوجود اس کے کہ عقائد میں یہودیوں سے بالکل مخالف ہیں مگر

بدقسمتی سے اس مسئلہ میں ان کے ہم زبان ہیں۔ ایک سبب قوی تو یہ ہے جو سرتا پا ان کی نفسانیت اور تعصب پر مبنی ہے۔
دوسرا سبب عبارت توریت کے خوامخواہ غلط معنی سمجھنے اور سمجھانے سے پیدا ہوگیا ہے۔ متعصبین یہود نے الفاظ الہامی کے غلط معنی لگا کر مغویانہ خیالات پہلے خود پیدا کئے اور پھر اور لوگوں میں یہ گمراہانہ عقائد پھیلائے عبارت توریت کی سند و شہادت پر جو غلط استدلال قائم کیا گیا ہے۔ وہ بالکل ترجمہ تورات میں تحریف ہے۔ جس کو ہم سرسید کی اصلی عبارت سے ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

حضرت سارہ اڈھیر ہوگئی تھیں اور ان کی اولاد نہ ہوتی تھی اس لئے انہوں نے حضرت ہاجرہ کو زوجہ بنانے کی (حضرت ابراہیمؑ کو) اجازت دے دی کہ شاید ان میں سے کوئی اولاد پیدا ہو چنانچہ ہاجرہؑ سے اسماعیلؑ پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارہؑ بھی حاملہ ہوئیں اور حضرت اسحاقؑ پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاقؑ کئی برس کے ہوگئے۔ ان کا دودھ بھی چھٹ گیا۔ حضرت اسماعیلؑ ان سے عمر میں بڑے تھے۔ دونوں میں ایک دن کچھ تکرار ہوگئی۔ جیسا کہ دو بچوں میں ہوا کرتی ہے۔ حضرت سارؑا کو یہ بات بری معلوم ہوئی اور اس لڑائی جھگڑے میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے لڑکے کو نکال دو۔

اس مقام پر حضرت سارؑا نے حضرت ہاجرہؑ کو لونڈی کہا تو اس سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقت میں لونڈی تھیں۔ بلکہ جس طرح عورتیں لڑائی اور غصہ میں خصوصاً جب ان دونوں عورتوں بلکہ سوکنوں (سوتوں) میں بچہ پر تکرار ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو ہتک اور حقارت کے کلمات کے اٹھتی ہیں اسی طرح جب سارا نے یہ لفظ امۃ۔ یعنی لونڈی کا حضرت ہاجرہؑ کی نسبت کہا۔ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتا کہ وہ درحقیقت لونڈی تھیں۔ مگر یہودیوں کو اور جو لوگ یہودیوں کی پیروی کرتے ہیں۔ (یعنی عیسائیوں کو) ان کو ایک موقع ہاجرہؑ کو لونڈی کہنے کا مل گیا۔ حضرت سارؑا کی اس بات سے حضرت ابراہیمؑ بہت ناراض ہوئے مگر خدا نے ان کی تسلی کی اور کہا کہ تم اس لونڈی اور بچہ کی طرف سے رنج مت کرو۔ ان کو نکال دو۔ میں اس لونڈی کے بچہ سے ایک قوم پیدا کروں گا۔ اس مقام پر جو خدا نے لونڈی کہا وہ بعینہ سارہ کے قول کی نقل ہے۔ یعنی سارہ نے جس کو حقارت سے لونڈی اور لونڈی کا بچہ کہا ہے اسی سے میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی شخص لائق آدمی کو کہے کہ یہ نالائق کیا کام کرتا ہے۔ پس اس دوسرے شخص کا بھی اس کو نالائق کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ درحقیقت وہ

شخص نالائق ہے اور جب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ حضرت ہاجرہؑ بیٹی رقیون بادشاہ مصر کی تھیں بلکہ ہم قوم و ہم وطن ابراہیمؑ کی تھیں اور جو وہ رقیت (کنیزی) کے اس زمانہ میں تھیں ان سے بھی حضرت ہاجرہؑ بری تھیں تو صرف ان الفاظ سے جو لڑائی اور جھگڑے اور غصہ میں بولے گئے ہیں۔ کسی طرح ان کا لونڈی ہونا مراد نہیں ہوسکتا۔ خطبات ص170۔

سید صاحب کے اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سارا نے امۃ کا لفظ رنج وغصہ کی خاص اور متحمل حالتوں میں استعمال کیا ہے اور توریت میں بالکل اسی کی نقل سے کام لیا گیا ہے۔ اور یہ واقعات ارباب عقل ونقل کے روزمرہ مشاہدات اور بدیہات میں داخل ہیں اور مشاہدات و بدیہات سے کسی کو انکار نہیں۔

اب لفظ امہ کی خاص حقیقت سید صاحب۔ تورات کے مفصلہ ذیل اسناد سے پیش کرتے ہیں۔

لفظ امۃ مجازاً محاورے میں زوجہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہودیوں میں دستور تھا کہ دختر کا باپ بروقت شادی دختر بعوض دختر کے پسر کے باپ سے کچھ روپیہ لے لیا کرتا تھا۔ تب بیٹی دیتا تھا جیسا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بعض قوموں میں دستور ہے اور اس دستور کو بیٹی کا بیچنا کہتے تھے مگر وہ لونڈی نہ ہوتی تھی بلکہ زوجہ شرعی ہوتی تھی اور حقوق زوجہ کے اس کو بالکل حاصل ہوتے تھے۔ ایسی زوجہ پر بھی لونڈی کا مجازاً اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ توریت مقدس کی دوسری کتاب باب 21 آیت 7 میں لکھا ہے۔

خدا نے کہا اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو بیچے امۃ ہونے کے لئے تو وہ لونڈیوں کی طرح نکل نہ جائے گی اگرچہ وہ اپنے مالک میں ناپسند ہو۔ جس سے اس نے زفاف نہیں کیا تو فدیہ دے گا بوجہ ناپسند ہونے کے تاہم کسی اجنبی قوم کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا۔ اور اگر پسر کی خلوت میں دے دیا تو لڑکیوں کی طرح برتاؤ ہوگا اور اگر اس کے اوپر دوسری کرلی تو حقوق زوجیت۔ یعنی کھانا کپڑا اور خلوت کم نہ کرے گا۔ اور اگر یہ تینوں امر اس کے ساتھ نہ کئے جائیں تو بلا تردد وہ چھوٹ جائے گی۔

چونکہ ان آیتوں سے مسائل فقہیہ مستنبط ہوتے ہیں اس لئے علماء یہود نے اس میں بہت غور کیا ہے۔ بلکہ مباحثہ لکھنا طول ہے مگر جس قدر کہ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے مختصراً لکھا جاتا ہے۔

ان تینوں آیتوں میں لفظ امۃ سے لونڈی مراد نہیں ہوسکتی۔ اول تو انھیں آیتوں سے معلوم

ہوتا ہے کہ یہاں لونڈی سے زوجہ شرعی مراد ہے۔ دوسری یہ کہ سب آیتیں بنی اسرائیل کی شان میں ہیں۔ جیسا کہ سیاق عبارت دلالت کرتا ہے اور بموجب تورات کے لونڈیوں کی طرح سے بنی اسرائیل کی بیع شرعی و جائز نہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل توریت مقدس کی تیسری کتاب باب25 اور دوسری کتاب باب 22 آیت ۳ میں مندرج ہے۔ بنی اسرائیل چوری کے جرم میں یا دشمن کی قید میں سے چھڑا لینے کے لئے خریدے جاسکتے تھے اور صرف سات برس تک مالک کے بطور غلام کی خدمت کرتے تھے حضرت یوسفؑ کے بھائی بھی چوری کی علت میں بطور غلام رکھ لئے گئے تھے۔ مگر وہ غلام نہیں تھے اور اگر فرض کریں کہ ان میں جو احکام ہیں وہ غیر بنی اسرائیل کے لئے بھی ہیں تو آیت کے معنی درست نہ ہوں گے۔ کیونکہ غیر بنی اسرائیل لونڈی اور غلام پچاسویں برس از خود آزاد ہوجاتے تھے اور آیت میں حکم ہے وہ آزاد نہ ہوں گے۔ اس مقام پر تفسیر رشی کی عبارت نقل کی جاتی ہے جس سے مطلب مذکور ثابت ہوتا ہے اس کا عربی ترجمہ یہ ہے۔

وان قبحت یعین بعلها لا نه لخلوتها ما هوالذی لم یزفها ولوکان له ان یزفها ویتخلی بها للتزویج و ثمن شرابها هو ثمن نکاحها وفی الایة کنایة بامرالنکاح و بانه لا یجوز مع الغیر عرسها۔

اگر بری ہے اس کی نگاہوں میں یعنی خاوند کی نگاہوں میں (تفسیر) کہ اُسے رغبت نہ ہوئی اس کے ساتھ خلوت کی (توریت) جس نے زفاف نہ کیا (تفسیر) کہ اس کو مناسب تھا اس سے زفاف۔ اس کے ساتھ خلوت کرنا۔ جورو کرنے کے لیے اور قیمت اس خرید کی قیمت ہے۔ اس کی شادی کی اور یہاں کنایہ ہے کہ آیت میں حکم شادی کا ہے اور کنایہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

اس موقع پر اس بات کا بھی خیال کہ جس طرح ایسی بی بی پر جس کی بابت بغرض شادی روپیہ دیا گیا ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے اسی طرح ایسی بی بی پر بھی جو بطور ڈولہ کے آئی ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے۔ جیسا کہ ابی غائل حضرت داؤد کی بی بی پر لونڈی اور خادمہ دونوں کا اطلاق ہوا ہے۔ جس کا ذکر عنقریب آتا ہے اور جو کہ یہ امر حضرت ہاجرہ کے حال سے بھی نہایت مناسب تھا اس لئے مجازاً ان کی نسبت بھی امتہ یعنی لونڈی بولا

گیا۔ مگر جبکہ رقیت کسی طرح ثابت نہیں ہے تو اس لفظ سے حقیقی لونڈی ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان مقاموں میں بھی بی بی مراد ہے مگر یہ تو کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کی لڑکیاں لونڈی ہو ہی نہیں سکتی تھیں تو سریہ کیونکر ہوسکتی تھیں۔

اور اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ جن مقاموں کا بیان کیا گیا ہے وہاں قرینہ ہے جس سے لونڈی مراد نہیں ہوسکتی مگر جہاں حضرت ہاجرہؑ کی نسبت امہ کا اطلاق ہوا ہے وہاں کیا قرینہ ہے جس سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لیے جائیں۔ تو اس شبہ کو رفع کرنے کیلئے ناظرین کو ذرا توجہ کی تکلیف دی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے بعد بھی یہ دستور تھا کہ لونڈی میراث نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے میراث لیا اور راحیل یعقوب علیہ السلام کی بیویوں نے ان سے کہا کہ اب ہمارے لئے اپنے باپ کے گھر میں کچھ حق میراث نہیں ہے۔ کیا ہم اجنبیہ نہیں شمار کی گئیں۔ کیونکہ بیچ ڈالا ہمیں اور قیمت بھی کھا گیا۔ (پیدائش باب 31، 14، 15)

اور لونڈی کی اولاد جو دوسرے شوہر سے ہو وہ بھی لونڈی غلام ہوتی تھی۔ ان کے لئے بھی میراث نہ تھی۔ چنانچہ یہ حکم حضرت موسیٰؑ کو بھی دیا گیا اور لونڈی کی اولاد جو مالک سے ہو وہ بی بی کی اولاد کے ساتھ میراث نہیں پاتی تھی جو کچھ ان کو باپ اپنی زندگی میں دے دے وہی ان کو ملتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قطورا کی اولاد کو اپنی زندگی میں کچھ دے لے کر الگ کر دیا جیسا کہ کتاب پیدائش باب 35 میں مندرج ہے۔

جبکہ قاعدہ سے یہ معلوم ہوگیا تو اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جب سارا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اس لونڈی اور بچہ کو نکال دو تو اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میراث نہ پائے لونڈی بچہ میرے بیٹے اسحاقؑ کے ساتھ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سارا کو اندیشہ یہی تھا کہ اسماعیلؑ اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے پس اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں۔ یا اسماعیلؑ لونڈی کے بچے ہوتے۔ تو میراث پانے کا خیال کیونکر ہوتا بلکہ اس وقت کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ زوجہ مطلقہ میراث نہیں پاتی تھی اور جس لڑکے کو عاق یعنی ساقط المیراث کر دیا جاتا تھا وہ بھی میراث سے محروم ہوجاتا تھا۔ اس لئے حضرت سارہؑ نے حضرت ابراہیمؑ سے درخواست کی تھی کہ ہاجرہؑ اور

اس کے لڑکے کو نکال دو۔ یعنی ایک کو طلاق دو اور دوسرے کو عاق۔ تا کہ دونوں مستحق میراث نہ رہیں۔
یہی قرینہ ہیں کہ ان آیتوں میں امتہ کا لفظ جو خلاف محل واقع ہوا ہے اس سے اس کے مجازی معنی مراد ہیں اور حقیقی نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ان کے اور بھی قوی قرینے ہیں۔ جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

لفظ عبری شفحتہ کی تحقیق

ان مقامات کے سوا۔ حضرت ہاجرہؑ کی نسبت تورات میں امتہ (لونڈی) کا لفظ اور کہیں نہیں آیا ہے۔ بلکہ شفحتہ کا لفظ آیا ہے اور شفحتہ کے معنی لونڈی کے نہیں ہیں۔ انقلوس یہودی نے جس نے توریت کا ترجمہ کالڈی زبان میں کیا ہے۔ شفحتہ کا ترجمہ امتہ۔ جو بمعنی امتہ (عربی) کے ہیں۔ لکھ دیا ہے اور اس سبب سے اکثر مترجموں نے توریت کے اور ترجموں میں بھی اور زبانوں میں کئے ہیں۔ اس لفظ کا لونڈی ترجمہ کر دیا ہے۔ حالانکہ لونڈی کو عبری زبان کے لئے سموئیل باب 29 آیت 41 نقل کرتے ہیں اسی سے شفحتہ کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔ کتاب سموئیل کا عربی ترجمہ یہ ہے۔
وقالت نعم انا امة له خادمة تغسل رجل عبيد سيدى۔
اور کہا ہاں میں اس کی لونڈی خادمہ ہوں۔ جو اپنے سردار کے خادموں کے بھی پاؤں دھونے کے لیے تیار ہوں۔
یہ قول بی بی غائیل حضرت داؤدؑ کی بی بی کا ہے جبکہ حضرت داؤد کے ہاں آئیں تھیں شفحتہ کے اصل معنی جیسا کہ اہل لغت کہتے ہیں۔ قبیلہ کی عورت کے ہیں اور مادہ اس لفظ کا اور مشاخہ کا جس کے معنی قبیلہ کے ہیں ایک ہی ہیں۔ لیکن عرف میں اس کے معنی خادمہ کے ہیں۔ پھر اس سے لونڈی سمجھنا یا تعصب سے یا غلطی سے تیسرا مقام جہاں سے ان کی لونڈی ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ کتاب پیدائش باب 35 آیت پہلی سے لے کر 6 آیت تک جن کا ترجمہ یہ ہے۔ اور ابراہیمؑ نے پھر عورت کی جس کا نام قطورہ تھا۔ اور اس سے زمران یقشان۔ مدان۔ مدیان۔ یشباق۔ شودہ پیدا ہوئے۔ یقشان کے شبا اور ودان پیدا ہوئے۔ ودان کی اولاد اشوریم۔ بطوشیم۔ لامیم۔ مدیان کی اولاد عیفا۔ عفیر۔

حنوخ۔ ابی دع اور الداعا۔ یہ سب قطورہ اور دیا ابراہیمؑ نے جو کچھ ان کے پاس تھا۔ اسحاقؑ کو۔ اور سریہ کی اولاد کو ابراہیمؑ نے اپنی حیات میں کچھ دے کر اسحاقؑ کے پاس سے نکال دیا پورب طرف شرقی عرب میں۔

یہاں چھٹی آیت میں واقع ہے۔ لبنی ھپلغشم۔ جس سے استدلال کرتے ہیں۔ پیلغش یا پلعش۔ جسے کلڈی زبان میں پیلقتا یا پلقتا کہتے ہیں بالحسینا بولتے ہیں۔ اس کے معنی بے شبہ سریہ میں۔ اور اس کی جمع موافق قاعدے کے پیلغشیم آتی ہے۔ ربی سلیمان ابن اسحاق کہتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کے لئے کتبہ صداق یعنی کابین نامہ ہوا۔ اسے ناشیم کہتے ہیں۔ اور جس کے لیے کابین نامہ نہ ہوا اسے پیلغشیم کہتے ہیں۔

بہرنوع یہ امر ثابت ہے کہ پیغلش سریہ ہے۔ استدلال یہ ہے کہ آیت میں پیلغشیم بلفظ جمع ہے اور اس سے مراد ہاجرہؑ اور قطورہ ہیں۔ کیونکہ سارہؑ کے سوا یہی دو بیویاں حضرت ابراہیمؑ کی ثابت ہیں اس لئے یہ سریہ ہونگی یہ شبہ فقط پیلغشیم کی وجہ سے واقع ہوا ہے۔ حال یہ ہے کہ عبری میں جمع ے اور میم سے آتی ہے۔ لہٰذا جمع پیلغشیم ہونا چاہیے۔ لیکن توریت میں اس مقام پر پیلغشیم۔ بدون ے واقع ہوا ہے۔ پیلغشیم نہیں ہے۔ اس لفظ پر مفسرین نے بحث کی ہے۔ بعض نے اس کو جمع مانا ہے اور ے کے نہ ہونے کی یہ توجیہہ کی ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک ہی سریہ تھی۔ اس لیے ے کو گرادیا۔ ''شی'' مقصور لکھا گیا ہے۔ کیونکہ ایک ہی سریہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے مفسرین نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ سریہ ہاجرہؑ تھیں اور وہی قطورہ تھیں۔ یعنی ہاجرہ اور قطورہ ایک ہی نام ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ جس کا بیان ہوگا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اسی طرح اکثر مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ سریہ ابراہیمؑ ایک ہی تھی۔ لہٰذا پیلغشیم سے جمع مقصود نہیں اور نہ بصورت جمع ہے تو اسی وجہ سے انقلوس نے جو قدیم مترجم ہے۔ اس لفظ کے ترجمہ میں لحیانا۔ لفظ واحد اختیار کیا ہے۔ اس حالت میں اس سے استدلال کیونکر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ مدار حجت جمعیت تھی۔ اور وہ غیر مسلم ہے۔

حضرت ہاجرہ اور قطورہ کو ایک قرار دینا غلط اور مہمل تاویل ہے

باقی رہی یہ بات کہ وہ سریہ جس کی شان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے۔ وہی ہاجرہؑ ہے۔ اس

بیان کا کہ ہاجرہؑ کا نام قطورہ ہے۔ دعویٰ بے دلیل ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس باب میں صرف قطورہ اوران کی اولاد کا ذکر ہے اور آیت انھیں کو سریہ بتلاتی ہے۔ علاوہ اس کے سفر التواریخ اول باب 1 کی 32 آیت میں جہاں سب کے نسب نامے لکھے ہیں اور جو اہل کتاب میں بڑی معتبر ہے لکھا ہے۔ ترجمہ۔ اور بنی قطورہ سریہ ابراہیمؑ فلاں اور فلاں یہ وہی شخص ہیں جنھیں پیدائش کے باب 25 میں قطورہ کی اولاد گنایا ہے اور فلسطین کی پورب سکونت کی اجازت دی ہے۔ ان سے قطورہ کا سریہ ہونا بخوبی ثابت ہے۔ اور اسی مقام پر 33 آیت میں لکھا ہے یہی سب قطورہ کی اولاد ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قطورہ ہاجرہؑ نہیں تھیں ورنہ اسماعیلؑ بھی انھیں میں شمار ہوتے۔ بلکہ اسی باب کی 26 آیت میں لکھا ہے اور گنایا ہے۔ ابراہیمؑ کے بیٹے اسحاقؑ اور اسماعیلؑ۔ اس وقت یہ دستور تھا یعنی اکثر یہ محاورہ کہ بیان نسب میں سریہ کی اولاد کو ماں کی طرف نسبت کرتے تھے۔ اور بی بی کی اولاد کو باپ کی طرف۔ اس لئے نسب نامہ اسماعیلؑ کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب کیا اور قطورہ کی اولاد کی نسبت ابراہیمؑ کی طرف نہیں کی بلکہ قطورہ کی طرف۔

علاوہ اس کے ہاجرہؑ کی اولاد پاران میں بسی اور قطورہ کی اولاد فلسطین کے پورب میں۔ جیسا کہ توریت میں واقع ہوا ہے۔ باوجود ان سب بتائن اور تغائر کے دونوں کے (ہاجرہ اور قطورہ) ایک کہنا بناوٹ ہے۔

علاوہ اس کے ابراہیمؑ نے ہاجرہؑ کو طلاق دی تھی۔ اور آئمہ کو زن مطلقہ سے نکاح جائز نہیں چنانچہ موسیٰؑ کی شریعت میں یہ حکم منصوص ہے تو اگر یہی حکم شریعت ابراہیمؑ میں بھی تھا۔ جیسا کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ قطورہ اور ہاجرہؑ ایک ہیں۔ بالکل خلاف ہے۔ اور اگر ابراہیم کے وقت یہ شریعت بھی رہی تو خلاف دستور انبیا کے ہے۔ سوائے نبی آخر الزماں علیہ السلام کے زن مطلقہ سے نکاح کرنا ثابت نہیں ہے۔

اب ہم رجوع کرتے ہیں پیلغشیم کے لفظ اور اس آیت کے معنی کی طرف۔ اگر تسلیم کرلیا جائے کہ یہ لفظ جمع ہے۔ جیسا اب نسخہ موجودہ مطبوعہ لندن اور اسٹراڈم وغیرہ میں دیکھا گیا ہے۔ ان میں ے اور میم کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ جو خلاف بیان مفسرین کے پایا جاتا ہے۔ تو بھی مدعا متدل کا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ جائز ہے پیلغشی یہ جمع اسم منسوب کی ہو۔ جیسا کہ اسم منسوب کی اس وزن پر متعارف ہے۔ پیلغشی کے معنی سریہ زاد کے ہیں۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ ابراہیمؑ نے سریہ زائر کچھ دے کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ اور ان کو فلسطین کے پورب بسنے کی اجازت دی۔ لیکن ان میں اسماعیلؑ تو نہ تھے۔ بلکہ اسی باب کی نویں آیت میں لکھتا ہے کہ دفن کیا ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ اور اسحاقؑ ان کے لڑکوں نے غرض توریت اور اس کی تفسیر دیکھنے والوں پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ حضرت ہاجرہؑ کا لونڈی ہونا کتب مقدسہ سے کسی طرح ثابت نہیں۔ (ملخص از خطبات احمدیہ از صفحہ 173-177)

اس طول وطویل استدلال میں یہودیوں اور عیسائیوں کے جملہ اشکال واحتمال کا بال بال علیحدہ کر دیا گیا ہے اس میں کوئی کلام نہیں کہ مرحوم سرسید اور ان کے شیخ مولوی عنایت رسول صاحب نے جناب ہاجرہؑ کو ایک صحیح النسب اور شریف النسل اور آزاد خاتون ثابت کرنے میں۔ پھر اس لطف کے ساتھ ان کے استدلال کے تمام اسناد واشہاد معترضین ہی کو کتب مقدسہ سے مستنبط و متخرج فرما گئے ہیں۔ بہت بڑی عالمانہ تحقیق سے کام لیا ہے۔ جس کے لئے تمام اہل اسلام کو ان کا ممنون ہونا چاہیے۔

مرقومہ بالا مبحث کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہر شخص یہودیوں اور عیسائیوں کے بے حد تعصب اور لا انتہا نفسانیت کی پوری حقیقت معلوم کر لے گا۔ اپنے اس ایک گمراہانہ خیال کے پیچھے کہ حضرت اسحاقؑ پر حضرت اسماعیلؑ کو ترجیح نہ دی جائے کتنا سر مارا ہے۔ اور ایک بات میں کتنی شاخیں اور ایک شاخ میں کتنے شوشے نکالے ہیں۔ پہلے تو جناب ہاجرہؑ کے کنیز ہونے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ لیکن جب انھیں کی کتابوں سے اس معظّمہ کا شاہزادی ہونا ثابت ہو گیا۔ تو ان کو اور قطورہ کو جو حقیقتاً حضرت ابراہیمؑ کی سریہ تھیں۔ ایک ہی عورت ٹھہرایا۔ ان متعصبین کو ایسے مہمل اور سراپا غلط استدلال پیش کرتے وقت اس کا بھی خیال نہ رہا کہ ان کا موجودہ استدلال تو کتب مقدسہ تورات کی ان تمام عبارتوں کو پامال کر ڈالے گا۔ جن میں ہاجرہؑ اور قطورہ کے واقعات علیحدہ بیان کئے گئے ہیں۔ ہاجرہؑ کی اولاد اور ان کا موطن و مسکن علیحدہ بتلایا گیا ہے۔ اور قطورہ اور ان کی اولاد کے مساکن و اماکن جدا دکھلائے گئے ہیں۔ اب ان بے بصیرتوں سے کوئی پوچھے کہ تمہارا خدا۔ تمہارے خدا کی کتاب جن پر تم ایمان لائے ہو۔ وہ تو ہاجرہؑ اور قطورہ کو دو علیحدہ عورتیں اور دونوں کی اولادوں کو دو جداگانہ قومیں اور پھر ان دونوں کے مقام سکونت دو مختلف اور متفرق مقامات میں صحیح اور صاف طور سے بتلا رہی ہے۔ مگر تم ہو کہ اپنی خود غرضی اور نفسانیت میں گرفتار ہو کر دونوں کو ایک سمجھتے ہو اور سمجھاتے ہو۔ اب تمھیں کہو کہ تمہارے خدا اور اس کی صحیح اور صریح بشارتوں کے مقابلہ میں تمہارے ان لغویات کو ایک منٹ کے لیے بھی کوئی مانے گا۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔

جب اس سے بھی ان کا مطلب نہ نکلا تو جناب ہاجرہؑ کو زن مطلقہ اور حضرت اسماعیلؑ کو پسر عاق شدہ (نعوذ باللہ) ٹھہرایا گیا مگر ان کو انھیں کی کتب مقدسہ کے مندرجہ واقعات بتلاتے ہیں کہ یہ زن مطلقہ حضرت ابراہیمؑ کی آنکھوں میں نہیں ایسی وقیعہ اور قابل قدر تھی۔ اور یہ عاق کردہ فرزند ان کو اتنا پیارا تھا کہ باوجود اس افتراق کے۔ آغاز فرقت سے لے کر وقت وفات تک سال بھر میں ایک بار نہیں کئی بار۔ ان کے دیکھنے کو شام سے حجاز میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور کافی طور سے ان کا تفقد حال فرمایا کرتے تھے۔ ابراہیمؑ کے وہی

طلاق دادہ اور عاق کردہ اہل وعیال ہیں۔ جن کی دلبستگی اور راحت وآرام کے لئے بنی جرہم اور بنی عمالیق۔ قبیلہ ہائے یمن کو وہاں آباد ہونے کی اجازت دی یہ ابراہیمؑ کے وہی برگزیدہ اور خدا رسیدہ اہل وعیال ہیں۔ جن پر توریت مقدس کی متعدد اور متواتر بشارتوں سے خدا اور خدا کے فرشتوں کا براۃ العین ظاہر ہونا اور ان کو ان کے موجودہ اضطرار واضطراب میں تسکین وتشفی دینا ثابت ہے۔ اور پھر ان کی ہجرت اور ترک وطن کے واقعات کے بعد بھی ان بزرگواروں کے لئے مختلف اور متعدد بشارت اور صایاے ابراہیمی انھیں کی کتب معتبرہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان اسناد واشہاد کے مقابلہ میں جو مخالفین کے خاص معترفات ہیں۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی عقل والا آدمی بھی کبھی ایسے محبوب ترین اہل وعیال کو کسی شریف۔ مرد آدمی کے گھر سے نکالی ہوئی ذریت یا طلاق دی ہوئی عورت قرار دے گا۔

حقیقتاً اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ کیوں ان حضرت سے ترک تعلق فرمانے کے بعد۔ اپنے تعلقات بڑھاتے اور ان سے ملنے جلنے کے لیے علاقہ شام سے ملک حجاز میں بار بار آتے جاتے۔ اور اگر بفرض محال۔ خدا کے حکم سے نہیں محض سارہؑ کے اصرار ہی سے۔ ان سے شرعی مفارقت اور دائمی جدائی اختیار فرمائی گئی تھی تو پھر خلاف مرضی خدا اور بلا رضائے سارہ۔ ان کے پاس آپ کا جانا اور برابر دیکھ بھال کرنا کس غرض سے تھا۔ اگر حکم خدا سے مفارقت کی گئی تھی۔ اور پھر آمدورفت جاری رکھی تھی تو معاذ اللہ۔ آپ کا یہ فعل حکم خدا کے صریح خلاف تھا۔ اور اگر صرف سارہ ہی کے اصرار سے بقاعدہ شرعیہ طلاق دی گئی تھی۔ تاہم بعد طلاق اجرائے رسم وراہ اور بقائے تعلقات قطعی ممنوع ومعیوب تھا۔ ان عیوب ونقائص کے لئے عام انسان قابل الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اتنا بڑا اولی العزم پیغمبر۔

ان تمام دلائل وقرائن کو پیش نگاہ رکھ کر آسانی سے سمجھ لیا جائے گا کہ حضرت ہاجرہ اور جناب اسماعیلؑ سے قطع تعلق کئے جانے کی نسبت یہودیوں اور عیسائیوں نے عام گمراہی اور عالم فریبی کے جو طوفان باندھے ہیں وہ بالکل ان کے تعصب اور نفسانیت پر مبنی ہیں۔ انھوں نے صاف صاف لفظوں میں حضرت ابراہیمؑ پر اتہام لگایا ہے۔ جس کا کوئی وجود اور کوئی اثر ان کی کتاب مقدسہ سے خود ثابت نہیں ہوتا۔

حقیقت حال وہی ہے۔ جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ولادت اسماعیلؑ کے بعد ہی سے۔ ہاجرہ کے ساتھ سارہؑ کو رشک وحسد پیدا ہوا۔ پھر چند دنوں کے بعد حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت نے ان کے خیال کو اور قوی کر دیا اور وہ یہ تھا کہ معمولی عورتوں کے انداز میں ان کی طبیعت نے یہ بیجا اصرار پیدا کیا کہ اسحاقؑ کے ساتھ اسماعیلؑ وراثت میں شریک وسہیم نہ ہونے پائے۔ اس خیال نے اصرار کے ساتھ قوت پکڑی نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ سخت تاکیدوں میں اس کا اظہا کیا گیا۔ ورنہ حقیقتاً حضرت ابراہیمؑ کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ ان تمام مصالح پر نظر فرما کر۔ جیسا کہ آج تک ایسے موقعوں پر ایسے ہی انتظام مفید ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؑ سے علیحدہ کر دیا گیا اور ہاجرہؑ کو حکم الٰہی کے مطابق مع ان کے فرزند اسماعیلؑ کے اس مقدس پیغام پر پہنچا دیا گیا۔ جو بارگاہ مشیت سے۔ ان حضرات کے لئے عظمت وجلالت اور تقدیس وتعظیم کا مرکز قرار پا چکا تھا۔

لفظ ساراسین کی تحقیق

Saracene یہودیوں کی تقلید میں عیسائی متعصبین نے بھی حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی صرف توہین وتحقیر کے قصد وخیال

سے ان کی اولاد و ذریات کو سارقین کے حقیر نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی عصبیت اور نفسانیت کی یہ کیفیت ہے کہ زمانہ موجودہ کی کامل تاریخی تحقیقات اور کافی اطلاعات حاصل ہو جانے پر بھی ان کو اپنی اس غلط بیانی پر یقین نہیں آتا۔ چنانچہ یورپین قومیں آج تک اہل عرب کو جو بالکل صحیح طور سے آل اسماعیل ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ سارقین کہتی ہیں۔ متعصبین یہود و نصاریٰ کا عرب کے تمام اقوام و قبائل کو اس نام سے موسوم و مشہور کرنا ان کی کھلی کھلی عالم فریبی ہے اور مغالطہ دہی۔ ہم اس لفظ کی تنقیدانہ تحقیق ذیل میں قلمبند کرتے ہیں۔

اس مغویانہ اور متعصّبانہ تسمیہ کی ابتدا تو یونانیوں سے ہوئی۔ جنھوں نے پہلے پہل چند عرب کے خاص قبائل کو اس نام سے موسوم و مخصوص کیا۔ پھر غایت تعصب و نفسانیت کی وجہ سے یہودی و عیسائی جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندوں کو عام طور سے۔ اسی نام سے پکارنے لگے۔ اس غلط تسمیہ کی اصلیت اور حقیقت تو اتنی ہے۔ اب کثرت اور وسعت اشاعت کا سبب تو صرف حسد و عداوت معلوم ہوتا ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ ریورنڈ مسٹر پوکاک Revd Me Pacoke

جو گذشتہ صدی کے بہت بڑے عیسائی پیشوا۔ صحائف و کتب قدیمہ کے مشہور عالم۔ اقوام و قبائل عالم کے بہت بڑے محقق اور مستند مؤرخ ہیں۔ اپنی کتاب موسومہ تاریخ عرب میں۔ لفظ سراسنیس کی خاص تحقیق کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

> اس مضمون پر ہمارے مصنفین نے اس وقت تک جو کچھ شائع کیا ہے ان میں ہم کسی جگہ اس امر کی قابل اطمینان دلیل نہیں پاتے کہ وہ لوگ جو عرب کہلاتے تھے۔ آخر میں سارا سنیس کیوں موسوم ہوئے۔ جن لوگوں نے اس نام کو سرح سے مشتق سمجھا ہے۔ ان کی کامل تردید کر دی گئی ہے۔ اب عموماً یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ نام سرق (چوری) سے نکلا ہے۔ جس سے ایک وحشی اور لٹیری قوم صریح مراد ہے۔ مگر یہ نام ان کو کہاں سے ملا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ نام خواہ انھیں (عرب) کے ہاں سے شروع نہیں ہوا ہوگا۔ بلکہ کسی اور قوم کی زبان سے یہ لفظ لیا گیا ہے۔ کیونکہ عرب ایسے نام کو جو موجب رسوائی اور ذلت کا ہے اپنے لئے کیوں گوارا کرتے۔ اب محققین کو یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ آیا ان لوگوں کے نام جو عام طور پر علانیہ قزاقی اور رہزنی کے لئے مشہور ہیں۔ لفظ سرق سے مشتق کرنا جائز ہوگا یا نہیں۔ جس کے معنی خفیہ چوری کرنے کے ہیں۔
>
> اب اگر کوئی سراسنیس کی تحقیق میں میری اتباع کرنا چاہے تو اس کو اپنی آنکھیں مشرقین کی جانب کھولنی چاہئیں۔ کس واسطے کہ سارا سنیس اور سراسی تاپے کی آواز میں شرقی اور اس کے جمع شرقیوں اور شرقیین کی نسبت کیا فرق ہوگا۔ جس کے معنی اہل شرق یعنی باشندگان مشرق کے ہیں۔ جس طرح کہ سابق میں عربوں کو خصوصاً یہودی خیال کرتے تھے کیونکہ اس زمین کا شرقی حصہ حسب قول طاسیطوس عرب سے محدود ہے۔ اسی طرح

توریت مقدس (سفر تکوین باب 10، 30) میں یقطان کی اولاد کو جو عرب تھے۔ مشرق میں بیان کرتے ہیں۔ یعنی ساحل کے اس حصہ پر جو مابین بشام اور سفار کے مشرق میں ایک پہاڑ ہے۔ واقع ہے۔ اگر اوساڈیاس۔ قابل اعتبار ہو من مکۃ الی تجئ مدینۃ الجبل الشرقی الی مدینۃ الشرقی۔ یعنی مکہ سے وھال تک کہ تم اس مشرقی پہاڑ کے شہر تک آؤ جیسا کہ سسو قدوکوڈیکس میں مرقوم ہے یعنی مشرقی شہر تک (جس سے میری دانست میں مدینہ منورہ مراد ہے۔ سرسید مرحوم) جو جانب شرق واقع ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی عقل تمام اہل شرق کی عقل سے بڑھ کر خیال کی گئی ہے۔ یعنی (حسب بیان اس یہودی کے۔ گو وہ کوئی ہو۔ جس نے صحف ملوک کا عربی میں ترجمہ کیا ہے) سراسین یا عربی کی عقل ہے۔ اسی طرح یرمیاہ نبی (باب 49، 28) میں اعراب بنی قیدار کو اہل الشرق کہتے ہیں۔ علامہ گروگروشیش بیان کرتا ہے کی سابق عیسائیوں کی یہ رائے تھی کہ وہ عقلاً جو حسب بیان متی حواری (باب 2) پرستش کو آئے تھے۔ ملک عرب سے آئے تھے۔ اور اس کا خود بھی عقیدہ تھا۔ نناسوس (فولیس میں) لکھتا ہے کہ میں نے اپنی سفارت کی خدمت جو بجانب بنی عشوقیہ بنی حمیر۔ اور ساراسنیس اور دیگر اقوام پرستش کنندہ کے تھی۔ تعمیل کر دی۔ اس لئے ساراسنیس کا اور مشرقی اقوام کے زمرے میں شامل ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ مشرق میں آباد تھا۔

مجد الدین فیروز آبادی صفی الدین اور دیگر لوگوں کا بیان ہے کہ مشرق کے چند اور مقامات بھی بایں وجہ کہ وہ مشرق کے اور حصوں میں واقع تھے۔ بنام الشرقیہ یا المشرقیہ موسوم تھے۔ اور یہ بھی ان کا بیان ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ ان مقامات کے باشندے اہل الشرق کہلاتے ہیں۔ ایسی ہی دلیلوں سے ان لوگوں بھی جو ایسے ملک میں بستے ہوں کہ بلحاظ اور ملکوں کے الشرق یعنی پورب کہلاتا ہو۔ اس نام سے ملقب کیوں نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ اپنے اور ان لوگوں کے درمیان جو اپنی بولی میں اپنے آپ کو مغربی باشندے (جریرہ موری تانیا) کہتے ہیں کس طرح پوری تمیز کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سے۔ جیسے کہ باشندہائے ملک مغرب المغاربہ کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو عرب میں متوطن ہیں۔ المشارقہ یا ساراسنیس کہے جا سکتے ہیں۔ اور یہ نام ان کے عادات واوضاع کے لحاظ سے نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح تم اس مشہور ومعروف حکیم بوعلی سینا کی اس نامی

کتاب کا نام۔ سارا سینک فلاسفی۔ یعنی الفلسفۃ الشرقیہ۔ کچھ اس کی جہالت کی وجہ سے نہیں کہتے ہو۔ بلکہ اس کے مشرقی ہونے کی وجہ سے۔ رہی یہ بات کہ عربی حرف ''شین''۔ کا یونانی کے مانند تلفظ ہوا ہے۔ اس سے کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ وہ (یونانی) عبرانی حروف کا بھی اسی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ (ماخوذ از خطبات احمدیہ از صفحہ 146-161)

تعصب کا مقتضا ہے کہ حقیقت چھپائی جائے۔ حسد اور نفسانیت کا مدعا ہے کہ اصلیت پر پردہ ڈالا جائے یا کم سے کم واقعیت پر غلط بیانی کا حاشیہ چڑھا کر اصلی مضامین کو تبدیل کر دیا جاے۔ اس انگریزی محقق کی تحریر سے کامل طور پر متعصبین یہود ونصاریٰ کی مغویانہ قلمکاریوں کی قلعی کھل گئی۔ اور ثابت ہوگیا کہ ان خودغرض۔ حاسد اور کینہ پرور فرقے کو اپنی نفسانیت اور خودغرضی کے مقابلہ میں۔ استخفاف حق۔ تحریف۔ تبدیل لفظ ومعانی اور غلط بیانی کی بداخلاقیوں سے نہ کوئی غیرت ہے اور نہ کوئی شرم۔ ایک محض معمولی لفظ کے اصل معانی اور مدعا میں تو حسد ونفسانیت سے اتنے مفاسد پیدا کیے گئے۔ اور گمراہ فطرت کے تقاضہ سے تمام دنیا کے لوگ سخت مغالطہ میں ڈال دئے گئے۔ تو پھر کتب الٰہیہ سے اہم ترین دفاتر وذخائر کے اصلی ترجموں اور ان کے دقیق مسائل کی تشریح وتحقیق میں ان سے راستبازی یا صداقت شعاری کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

قدامت کعبہ کے متعلق مخالفین اسلام کے اعتراضات کی تردید مع دیگر حالات

ہم اپنے سلسلۂ بیان میں جناب ابراہیمؑ۔ جناب اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ علیہم السلام کے حالات تفصیل کے ساتھ قلم بند کر چکے۔ حضرت ہاجرہؑ نے مکہ معظّمہ میں انتقال فرمایا اور مقام حجر میں جو خانہ کعبہ سے ملحق ہے مدفون ہوئیں۔ اسی ضمن میں مناسبت مقام کی ضرورت ہمیں شہر مکہ اور عمارت مکہ کی قدامت اور اس معبد مقدس کی اولیت کے مسئلہ کی انکشاف حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہم اس کو اپنی تالیف کے موضوع کا جزو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس لئے کہ مخالفین اسلام نے اس کی قدامت کے مسئلہ پر بھی اعتراضات وارد کیے ہیں۔

تعمیر کعبہ کے حالات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم جناب ابراہیمؑ کے حالات میں لکھ آئے ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق ہمیں اعادہ اور اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی قدامت کے مسئلہ کو ہم نے وہاں طوالت اور اصل مدعائے بیان سے دور جا پڑنے کے خوف سے بیان نہیں کیا۔ مگر اب چونکہ ان تمام مقدس حضرات کے حالات کو ہم تمام کر رہے ہیں جو اس بنائے ربانی کے اصلی بانی ہوئے۔ اس ضرورت سے اس کے متعلق تمام حالات وواقعات کو بھی تمام کر دینا ہمارے لئے ضروری ہے۔

قرآن مجید میں کعبہ معظّمہ کی قدامت کے متعلق یہ عبارت مندرج ہے۔

ان اول بیت وضع للناس ببکۃ مبارکا و ھدی للعلمین

آدمیوں کی عبادت اور دو عالم کی ہدایت کی غرض سے۔ پہلا گھر جو دنیا میں بنایا گیا وہ شہر مکہ میں ہے۔

علمائے اسلام اس کی قدامت کو حضرت آدمؑ کے وقت سے بتلاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کی پہلی عمارت حضرت آدمؑ کے عہد میں تیار ہوئی تھی۔ مگر امتداد ایام کی وجہ سے وہ گر کر بالکل منہدم ہوگئی۔ تعمیر ابراہیمی اس مقدس عمارت کی تعمیر ثانی ہے۔

انیسویں صدی کے اسلامی جدید محقق اور مؤرخ۔ مغربی تحقیق و تعلیم کے مقلد اور موید۔ اس بیان کو دوراز قیاس سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کی خوش عقیدگی کا محض اضافہ ٹھہراتے ہیں۔

میرے خیال میں ہبوط آدمؑ کے مسلمہ اور متفقہ واقعہ سے تو دنیا بھر میں کسی قوم، کسی فرقہ کو کیا کسی بنی آدم کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر اگر دنیا میں حضرت آدمؑ آئے۔ اور وہ دنیا کی ہدایت و نظم کے لئے من جانب اللہ آسمان سے زمین پر بھیجے گئے اور انھوں نے خدا کی عبادت کے لئے ایک گھر بنایا۔ اور وہ گھر ایک مدت کے بعد گر کر ایسا منہدم اور نیست و نابود ہوگیا کہ ایک زمانہ دراز تک کسی کو اس کے نشان و آثار کا کوئی علم باقی نہیں رہا۔ پھر ایک عرصہ دراز کے بعد انھیں کی مبارک نسل میں ایک نبی برحق نے جو خداوند عالم کے حکم سے اس معبد اعظم اور یادگار آدم کی دوسری دفعہ تعمیر کی۔ تو یہ تمام واقعات اور محالات و ناممکنات کیسے سمجھے جائیں گے۔

محالات و ناممکنات کیسے۔ ہمارا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ امور تو روزمرہ کے حالات اور آئے گئے دن کے معاملات میں جو ہر شخص کے شبانہ روز کے مشاہدات میں داخل ہیں۔ یہ تمام شہروں۔ قصبوں اور دیہاتوں میں عموماً یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے کہ پرانی عمارتوں کے افتادہ قطعات زمین۔ کئی پشتوں تک۔ خاندانوں کی مالی کمزوریوں اور دیگر مجبوریوں کی وجہ سے ایسے ویران اور غیر آباد حالتوں میں پڑے رہتے ہیں کہ دیکھنے والے مشکل سے وہاں کسی مکان یا عمارت کا قیاس کر سکتے ہیں۔ پھر ایک عرصہ کے بعد اسی مقام پر ایک خوش نما عمارت اور محل سرا تیار ہوجاتی ہے۔ تو کیا حقیقت میں وہاں موجودہ عمارت سے قبل کسی مکان کا وجود بیان کیا جانا محال اور ناممکن تسلیم کیا جائے گا۔ ہمیں ان میں مشاہدات روزمرہ کے اصول متداولہ پر عمارت مکہ مشرفہ کو حضرت آدمؑ کے وقت بنایا جانا تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ ہم اس سے زیادہ اس بحث کے متعلق لکھنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمیں اپنے موجودہ سلسلہ بیان میں خانہ کعبہ کے متعلق اس سے زیادہ تفصیلی حالات و واقعات قلمبند کرنے میں اور مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کی تنقید و تردید کرنا ہے۔ جو خوامخواہ اس کی قدامت اور عظمت سے انکار کرتے ہیں۔

ہمیں ان کے اعتراضات کی کوئی شکایت نہیں۔ تعجب ہے اور حیرت ہے تو ان کے اقرار کرنے اور پھر مکر جانے پر اور باایں ہمہ۔ تمام دنیا سے اپنی کامل اور سچی تحقیق کا دعویٰ بھی۔ اس تحقیق کی یہ حالت کہ ابھی ایک امر کی تحقیق کی اور ابھی آپ ہی اس کی تردید پر تیار ہو بیٹھے۔

بہر حال علماء اسلام حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے اس کی قدامت بتلاتے ہیں۔ آخر الذکر زمانہ پر جمہور کا اتفاق ہے۔ یہود و نصاریٰ کو اس کی قدامت و عظمت سے انکار ہے۔ عظمت و حرمت سے ان کا انکار تو ہمارے لئے قابل شکایت ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ اہل اسلام کی طرح ان کا معبد نہیں۔ پھر اس کی حرمت و عظمت کے لئے مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ باقی رہا اس کی قدامت سے انکار تو یہ ان کا صریح تعصب ہے۔

ہمیں یہی سمجھ کر اپنا اطمینان کر لینا چاہیے کہ اسلام کے معتقدات اور محرمات میں سے وہ کون سی ایسی چیز ہے جن کے ساتھ یہ مخالف اسلام فرقے اپنی حد درجہ کی نفرت اور توہین وحقارت کا اظہار نہیں کرتے۔ پھر کعبہ معظّمہ کی نسبت ان کا انکار یا کسی بے ادبی کا اظہار۔ ہمارے لئے کیوں تعجب خیز ہوگا۔ مخالفین اسلام اس کو آدمؑ کی عمارت کہاں تک تسلیم کریں گے اس کو عمارت ابراہیمیؑ بھی تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی اتنی قدیم عبارت نہیں۔ مولوی شبلی صاحب سیرۃ النبی مارگیولوس (Marcolioth) جرمن مستشرق کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شہر مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی، مولوی شبلی صاحب اس قول کی تردید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اصابہ نے اس کے ثبوت میں اصابہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ہمیں اس کی صحت سے انکار نہیں ہے۔ اصابہ میں جو تصریح ہے وہ یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید یا سعد بن عمر نے تعمیر کی لیکن مارگیولوس کو یہ معلوم نہیں کہ مؤرخین عرب نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارت بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے۔ اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں۔ بلکہ خیموں او شامیانوں میں رہتے تھے۔ اور اسی طرح ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔ سیرۃ النبیؐ ج1 ص111

شبلی صاحب سے مجھ کو پورا اتفاق ہے۔ صاحب اصابہ کا لکھنا بھی صحیح ہے۔ مگر مارگیولوس کو نہ اسلام کی مذہبی تہذیب اور نہ اس کے دینی آداب کی کوئی اطلاع ہے اور نہ وہ اس کے تعظیم شعائر اللہ کی اہمیت سے واقف ہے۔ اس لئے اصابہ کی تحریر بطور ظاہر اپنے مدعا کے مطابق پا کر اس نے آنکھ بند کر کے نقل کر دی۔ نہ وہ واقع کی اصلیت تک پہنچ سکا اور نہ صاحب اصابہ کے مدعائے حقیقت کو سمجھ سکا۔

مخالفین کا یہ اعتراض اور دعویٰ کہ شہر مکہ اور عمارات کعبہ کی قدامت کا دعویٰ۔ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے قدیم اخبار و اسفار سے اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ان کا انکار بعد الاعتراف ہے۔ باوجود اتنی کامل اور وسیع تحقیق کے بھی۔ محققین یورپ کے واقعات سے اتنی کوتاہ نظری اور بے خبری پر سخت تعجب ہوتا ہے اور بڑی عبرت آتی ہے۔ لیکن اس پر بھی ہم کہنے کو تیار ہیں کہ نہ وہ کوتاہ نظر ہیں اور نہ لاعلم و بے خبر۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے علمائے متقدمین کی تحریر اور ان کی تقلید کی قدیم لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ اور تقلید اسلاف کے اسی غلط اور کورانہ طریقہ نے ان کی چشم حقیقت کو کوتاہ کر دیا ہے۔

ان کا پہلا اعتراض کہ کعبہ کی قدامت کا مسئلہ مسلمانوں کی خاص ایجاد ہے کبھی صحیح ثابت نہیں ہوسکتا۔ بلکہ تمہاری ہی کتب مقدسہ اور اخبار و اسفار قدیمہ سے اس کا وجود پورے طور سے ثابت ہوتا ہے۔ اہل اسلام اس معبد الٰہی کی اولیت اور صداقت کے اس بنا پر مدعی ہیں کہ قرآن مجید میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ٩٦

یہ پہلا گھر ہے جو آدمیوں کے لئے عبادت خدا اور ہدایت عالمین کی غرض سے مکہ مبارکہ میں بنایا گیا۔

اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ شہر بکہ (مکہ) کا وجود قرآن کے سوا اور دیگر کتب قدیمہ میں بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو کتب قدیمہ پر ایمان رکھنے والوں کو اس شہر مبارک کی قدامت کا ضرور قائل ہونا پڑے گا۔ اور قرآن مجید کی یہ عبارت ان کی کتابوں کی بشارت سے بالکل مطابق ہو جائے گی۔ اس مدعا کی تحقیق اور اس دعویٰ کی تصدیق میں۔ ہم مولوی شبلی کی سیرۃ النبی سے ذیل کے ثبوت نقل کرتے ہیں۔

کتاب زبور باب 84 آیت 6 میں ہے کہ وہ بکہ کے وادی میں گذرتے ہوئے۔ اسے ایک کنواں بتاتے۔ برکتوں سے مورۃ کو ڈھک لیتے۔ قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس عبارت میں جو مکہ کا لفظ آیا ہے وہی مکہ معظّمہ ہے۔ لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے اسم مشتق قرار دیں تو اس کے معنی رونے کے ہوں گے۔ اور یہ وہی لفظ عربی بکاء ہے۔ جس کے معنی رونے کے ہیں چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے اس لئے ان کے مترجمین نے عبارت مذکورہ میں (خاص کر) بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے۔ لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟

زبور کی عبارت مذکورہ میں اوپر کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی تشہید میں حضرت داؤد نے مکہ معظّمہ اور مروہ اور قربانگاہ اسماعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے۔ حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں اے فوجوں کے خدا۔ تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں۔ میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے۔ اے خدا تیری قربانگاہ۔ میرے مالک اور میرے خدا مبارک ہوا ان لوگوں کو جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں۔ اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد مکہ والی آئتیں ہیں۔ اب غور کرو۔ حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں وہ اس مقام پر صادق آ سکتا ہے۔ جس میں ذیل کی باتیں پائی جاتی ہوں۔

(۱) قربان گاہ ہو (۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں (۳) وادی بکہ کہلاتا ہو۔ (۴) وہاں مقام مورۃ بھی ہو۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ ''بکہ'' وہی مکہ معظّمہ اور ''مورۃ'' وہی ''مروہ'' ہے۔ اس کے ساتھ یہ

بھی اندازہ ہوجائے گا کہ یہودی کس طرح الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں۔ **یحرفون الکلم عن مواضعہ**۔ ڈاکٹر ہسٹینگس (Dr. Hastings) نے ڈکشنری آف۔ دی بائبل Dictionary of the Bibles میں وادی بکا پر جو آرٹکل (Article) لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس لفظ سے اگر واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہوسکتی ہے۔

(۱) ایک وادی ہے جس سے ہوکر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

(۲) وادی اخور ہے۔ جو یشوعا باب 7۔ آیات 24۔26 وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۳) وادی رغایوں ہے۔ جو ساموئیل دوم۔ باب 5۔ آیت 18۔22 وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۴) کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے۔ اس راستہ کی آخری منزل ہے۔

(دیکھو رینان (Reynon) کی کتاب۔ حیات عیسیٰ باب 4)

لیکن عجیب بات ہے۔ ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالات کثیرہ میں کہیں مکہ معظّمہ کا پتا نہیں لگتا۔

مصرع۔ ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجاست۔

حیرت پر حیرت تو یہ ہے کہ جن جن وادیوں کے نام لئے ہیں ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں۔ یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں۔ بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں۔ فرق اسی قدر ہے کہ جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

جدید انسائیکلو پیڈیا (NEW ENCYLOPEDIA) میں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگیولوس کا لکھا ہے۔ اس میں مکہ معظّمہ کی نسبت تحریر ہے۔ قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا۔ سوائے اس کے زبور (84۔6) میں وادی بکہ کا لفظ مذکور ہے۔

لیکن مارگیولوس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر ڈوزی (Professor Dozie) جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی داں عالم ہے۔ لکھتا ہے کہ

بکہ وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ داں ماکروبہ کہتے ہیں۔
لیکن کارلائل صاحب نے اپنی کتاب ہیرو اینڈ ہیروز ورشپ CARALAYALS
HEROES AND HEROES WORSHIP میں لکھا ہے۔
رومن مؤرخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم اور اشرف ہے۔ اور یہ ولادتِ مسیحؑ سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے اگر کعبہ حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا ہوگا۔ کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے۔ اسی کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔ (ملخص از سیرۃ النبی ج1 ص112۔110)

اس عیسائی محقق (کارلائل) نے تو صاف صاف لفظوں میں کعبہ مشرفہ کی قدامت اور شرافت بالتصریح والترجیح کا اظہار واقرار کر دیا۔ اگر چہ اس سے پہلے پروفیسر ڈوزی اور کسی قدر مار گیولیوس نے بھی اس کا اقرار کیا تھا۔ وہ بزبان دیگران کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے اس کو قطعی اور واقعی نہیں کہہ سکتے تھے۔ کارلائل نے سائیلس کے ایسے قدیم مؤرخ کے نظریہ تحقیق سے یہود ونصاریٰ کے اتنے قدیم استخفاف حقیقت کا پورا انکشاف کر دیا۔ اور بتلا دیا کہ مستشرقین یورپ کا یہ استخفاف۔ اور ان کا بعد الاعتراف کس قدر مضحکہ خیز اور شرمناک ہے۔

سقفِ کعبہ اور غلافِ کعبہ

اس مضمون کی نسبت ہم اس سے زیادہ تفصیل کو مناسب نہیں سمجھتے ہیں اور کعبہ مشرفہ کے دوسرے حالات وواقعات کی تصریح وبیان کا آغاز کرتے ہیں۔ ہم اس معبد مقدسہ اور عتبہ مشرفہ کے تعمیر ہونے کے تمام وکمال حالات اوپر لکھ آئے ہیں۔ ان کے یہاں اعادہ یا اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مؤرخین ومحدثین اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے سعد ابن تبع حمیری۔ بادشاہ یمن نے عمارت کے کعبہ پر غلاف چڑھایا اور قصی ابن کلاب نے اس کو منسقف اور مقفل کر دیا قدیم محققین ومحدثین کے علاوہ حال کے مؤرخین کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لیکن علمائے اہلبیت علیہم السلام کی اخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کی عمارت حضرت اسماعیل ہی کے زمانہ میں مسقف ہوگئی تھی اور اس پر غلاف بھی چڑھا دیا گیا تھا۔ اور جس عقیدتمند اور اخلاص شعار خاتون معظّمہ نے تعظیم شعائر اللہ کی یہ سب سے پہلی رسم ایجاد کی اور پوشش کعبہ نذر کی وہ جناب اسماعیل کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ حیات القلوب کی مفصلہ ذیل عبارت سے اس کے پورے حالات محقق ہوتے ہیں۔

آن زن عاقلہ با اسماعیل گفت کہ آبا برایں دو در دو پردہ بیاد یزنم یکے از اینجانب ویکے از انجانب گفت بلے۔ دوپردہ ساختند کہ طول آں دو ازدہ ذراع بود ویراں درہا آو یختندپس آں زن را خوش آمد آں پردہ ہا و گفت آبا برائے کعبہ جامۂ بیافم کہ ہمہ کعبہ

رابپو شانم که ایں سنگها بد نما است اسماعیلؑ گفت بلے۔ پس بسرعت متوجه کا رشه و پشم فرستا د میاں قبیلهٔ خود (بنی جرہم) که آنهارا برائے اور بریسند و ازاں روز ایں سنت درمیاں زناں بہمر سید که ازیک دیگر مدد بطلبند۔ دریں باب پس بسرعت میکر دند یاری از قبیله و خویشاںخود مے طلبید و ازہر طرفے که فارغ مے شدمی آو یخت۔ پس چوں موسم حج رسید کی طرف ماند که جامه اش تمام نشده بود۔ باسماعیل گفت چه کنیم اینجانب راکه جامه اش تمام نشده است پس برا ے آں طرف از برگ خرما جامه ترتیب داده بیاد و یخت عرب بسیار آمدند بروجہے که پیشتر چناں نمی آمدند وامرے چند مشاہده کردند که ایشاں را خوش آمد پس گفتند سزا وار نیست که برائے عمارت کندۂ ایں خانه ہدیه بیاد وریم۔ پس ازاں روزہدیه بیاد وریم۔ پس ازاں روز ہدیه برائے خانه کعبه مقرر شد پس ہر قبیله از قبیلہائے عرب ہدیه برا ے خانه کعبه آوردند از زرو چیز ہائے دیگر تاآنکه مال بسیار جمع شد پس آں لیف خرمارا برداشتند و خانه کعبه را اتمام کردند و در دَور کعبه آو یختند و کعبه سقف نداشت۔ اسماعیل ستونہاگذاشت۔ مانند ایں ستونہا که می بینداز چوب و سقف آنرا به چوبہا و جرید ہاراست کردوگِل برآں مالید پس چوں سال دیگر عرب آمدند داخل کعبه شد ند۔ دید ند که عمارت کعبه زیاده شدا است۔ گفتند سزاواراں است که برائے عمارت کننده ہدیه را زیاده کنیم پس سال آئینده ہدیه بسیار آوردند و اسماعیل ندانست که آں ہدی راچه کند۔ پس حق تعالیٰ بادوحی نمود که بکش اینہارا طعام کن حاجیاں را۔ (حیات القلوب ملاء مجلس جلداول ۱۳۱ لکھنؤ)

زوجہ حضرت اسماعیلؑ نے کہا کہ کعبہ کے دروازے کے دونوں جانب ہم دو پردے لٹکا دیں۔اسماعیل نے کہا ہاں لٹکا دیئے جائیں۔وہ پردہ بارہ گز لمبے بنائے گئے اور لٹکائے گئے۔زوجہ اسماعیل کو یہ آرائشی پردے بہت خوش نما معلوم ہوئے تو پھر اسماعیلؑ سے پوچھا کہ اگر آپ کہیں تو پورے خانہ کعبہ کے لئے ہم ایک کپڑا یا پوشش بن کر تیار کر دیں کہ یہ پتھر جو بدنما معلوم ہوتے ہیں۔چھپ جائیں۔حضرت اسماعیل نے اجازت دے دی۔وہ خاتون اسی وقت سے بعجلت تمام اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور بہت سا اون لے کر اپنے قبیلہ میں بھیج دیا کہ اس کو کات کر جلد بھیج دیں اسی وقت سے غلاف کعبہ کے لئے عورتوں میں اون کاتنے کا رواج ہوا۔اس کام میں اس معظّمہ نے بہت جلدی کی اور آپ

اور اپنے عزیز و اقارب سے اس میں مدد لی۔ اور جس سمت کا غلاف یا پوشش تیار ہو جاتا تھا وہ اس سمت کی دیوار پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ ہر طرف غلاف تیار ہو کر چڑھ گیا۔ صرف ایک طرف کا رہ گیا۔ اور حج کا موسم آ گیا۔ تب انھوں نے اسماعیلؑ سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ ایک طرف کی پوشش تیار نہیں اور حج کے دن آ گئے۔ اس لئے خرمے کی چھال سے اُس طرف کی پوشش مرتب کر دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سال ہر برس سے زائد عرب حج کعبہ بجالانے کی غرض سے آئے اور پوشش کعبہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آپس میں مل کر کہنے لگے کہ اس کے بنانے والے کے لئے ہم لوگوں کو ہدیئے لانے چاہئیں اسی زمانہ سے خانہ کعبہ کے واسطے ہدیہ لانے کا دستور قائم ہوا۔ یہ ہدیہ نقد و جنس سب اقسام کے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سا مال اس رقم میں جمع ہو گیا۔ وہ لیف خرما کا غلاف اتار دیا گیا اور پوشش کعبہ اونی کپڑے کی مرتب کر دی گئی۔ اس وقت تک کعبہ کی چھت نہیں تھی۔ حضرت اسماعیلؑ نے ستون کھڑے کئے اور ان پر شہتیر اور کنڈیاں رکھیں اور ان پر مٹی ڈال دی۔ آئندہ سال جب عرب آئے اور خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے تو دیکھا عمارت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ سب مل کر کہنے لگے کہ ہم لوگوں کو اس عمارت کی تعمیر کنندہ کے لئے پہلے سے بھی زیادہ ہدیئے لانے چاہئیں دوسرے سال وہ لوگ بہت زیادہ ہدیئے (بھیڑ دنبے) لائے حضرت اسماعیلؑ نہیں جانتے تھے کہ انھیں کیا کیا جائے خداوند علام نے ان کو بذریعہ وحی یہ حکم دیا کہ ان سب کو ذبح کر کے حاجیوں کی ضیافت کر دو۔

مندرجۂ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی زوجہ مطہرہ نے آپ کی استرضا و استمزاج سے پوشش کعبہ ایجاد کی اور اس کے نذر کئے جانے کی ابتدا فرمائی۔ اسی طرح جناب اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ کی عمارت کو اپنے دست مبارک سے ہی اپنے وقت میں مسقّف فرما دیا ہے۔ اس بنا پر جیسا کہ اقوال و ارشاد آئمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین سے مستفاد ہوتا ہے۔

بیت النذ ر واللہ شرفہا کی یہ ضرورتیں اسی وقت پوری ہو چکی تھیں اور اس کی اولیت اور ایجاد بھی۔ بالکل ممکن اور قریب العقل ہے کہ قصیٰ نے اپنے وقت میں بار دیگر اس کی چھت بنوائی ہو اور اسی طرح سعد ابن تبع حمیری نے اس کے بعد خواب دیکھا ہو اور اس کی تعمیل میں پردہ کعبہ نذر چڑھایا ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر سعد ابن تبع کا زمانہ حضرت اسماعیلؑ سے قبل تھا تو البتہ سعد کے اول غلاف چڑھانے والا واقعہ مان لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اور اگر مابعد ہے تو قرینہ غالب یہ ہے کہ سعد نے حضرت اسماعیلؑ کے بعد یہ خدمت ادا کی ہو۔

سلسلہ سلاطین حمیریہ کی تفصیل جو ہم نے تاریخ ابوالفدا اور دیگر عربی ماخذوں سے آغاز کتاب میں لکھی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سعد ابن تبع کا زمانہ حضرت اسماعیلؑ سے بہت بعد ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کیا وہ تو ملکہ بلقیس سے بھی کئی پشتوں بعد کا آدمی سلسلہ حمیری میں ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سباء اکبر عبدالشمس اول کے زمانہ کے بزرگوار ہیں۔ جو تمام قبائل و ملوک یمن کا جدالقبیلہ اور سلاطین حمیری کا مورث اعلیٰ پایا جاتا ہے اس اعتبار و شمار سے حضرت اسماعیلؑ کے متعلق اس خدمت کی شہادت موجود ہوتے ہوئے اس کی ایجاد اور اولیت کو کثیر التعداد پشتوں کے بعد ایک محض غیر تعلق اور بیواسطہ شخص کے ساتھ منسوب کرنا سیاق تحقیق اور معیار تصدیق کے بالکل خلاف ہے۔ اسی طرح عمارت کعبہ کے مسقّف کئے جانے کے واقعات کو بھی سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد قصیٰ ابن کلاب نے اس کی بار دیگر چھت بنوائی ہو اور کامل مرمت کرائی ہو۔ اسی طرح مرقومہ بالا روایت سے نذر و ہدیٰ کے مراسم کی اولیت بھی حضرت اسماعیلؑ ہی کے زمانہ سے معلوم ہوتی ہے۔

مزید برآں سید صاحب نے کعبہ کی دیواروں اور چھت کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ چھت نہیں تھی اور دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا اور اس میں نہ کواڑ چڑھے تھے اور نہ کُنڈی لگی تھیں۔ اور بلا شبہ اس زمانہ کی حالت ایسی ہی تھی کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں گو وہ خدا ہی کا گھر بنایا گیا ہو کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ خطبات 519

بہر حال سید صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تعمیر ابراہیمی اور تعمیر قریشی کے درمیان۔ جس سے تمام تعمیر قصٰی ابن کلاب مراد ہے اور کوئی دوسری تعمیر نہیں ہوئی۔ سید صاحب پر منحصر نہیں۔ اکثر اسلامی مؤرخین کو بھی شبہ ہوا ہو۔ حالانکہ ان دونوں تعمیرات کے درمیان دو اور تعمیروں کا ذکر اکثر تاریخوں میں موجود ہے۔ لطف یہ ہے کہ سید صاحب نے خود ان دونوں تعمیروں کا ذکر علامہ عبدالرزاق کی تاریخ مکہ سے لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ایک فرانسیسی مؤرخ نے اپنی کتاب متعلق احوال مکہ میں حضرت علیؑ کی روایت سے لکھا ہے کہ پہلے بنی جرہم نے اور ان کے بعد عمالیق (عمالیق ثانی) نے کعبہ کی تعمیر کی۔ خطبات 523

مرحوم سید صاحب کی عادت تھی خواہ مخواہ یورپین ماخذوں کے حوالہ دینے کی۔ حالانکہ بنی جرہم اور عمالیق دونوں کی تعمیرات کا ذکر عام طور سے عربی کی تمام تاریخوں میں موجود ہے۔ اور خود آپ ہی نے تاریخ مکہ کے حوالہ سے خطبات میں درج فرمایا ہے دونوں تعمیرات کے متعلق آپ کی بلفظہ عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

قالو او توفی اسماعیل و دفن فی الحجر کانت امه قد دفنت فی الحجر ایضا و ترك ولد اسماعیل من رعله ابنة مضاض لما ولد اسماعیل و کلفهم لا نهم بنو ابنته فلم یزل امرجرهم یعظم بمکة و یستفحل حتی ولوا البیت وکانوا اولا ته الاحکام بمکة فجآء سبل فدخل البیت فانهدم فاعادته جرهم علی بناء ابراهیم و کان طوله فی السمآء تسعة اذرع (از کتاب اخبار مکة صفحفه 48)

کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت اسماعیل اس کے محافظ رہے جب ان کا انتقال ہوا تو بنی جرہمیں اس میں مداخلت ہوئی کیونکہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار تھے اور بنی اسماعیل کے خیر خواہ و محافظ تھے۔ مضاض ابن عمر جرہمی جو اسماعیلؑ کے بیٹوں کے نانا تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ میں سب اختیار لے لئے بنی جرہم کے اختیار کے زمانہ میں پہاڑی نالہ آیا اور کعبہ میں پانی چڑھ گیا اور کعبہ گر گیا۔ جس کو بنی جرہم نے انھیں

بنیادوں پر۔ جو ابراہیمؑ نے بنائی تھیں اور اسی صورت پر پھر بنایا۔ اس کی بلندی زمین سے نو ذرعہ تھی۔
(کتاب اخبار مکہ ص48)، (منقول از خطبات احمدیہ ص521)

سید صاحب تاریخ مکہ مندرجہ بالا اقتباس کو لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ ہمیں کسی تاریخ سے اس تعمیر کا زمانہ نہیں معلوم ہوا اور اسی سبب سے ہمیں کوئی زمانہ اس کی تعمیر کا قرار نہیں دے سکتے۔

سید صاحب جیسے کامل محقق سے ایسا عاجزانہ عذر کتنا تعجب انگیز ہے۔ اس کے ایسے لامعلوم الایام اور غیر معلوم الوقت واقعات کے صحیح ایام وقوع تو اسی خطبات میں آپ نے مختلف قرائن و دلائل عقلیہ سے معلوم کر کے لکھ دیئے ہیں اور حقیقتاً وہ قابل قبول بھی ثابت ہوتے ہیں مگر اس ایک واقعہ کی نسبت۔ جس کا زمانہ وقوع قریب قریب بالکل معلوم ہے۔ آپ اپنا عجز اور مجبوری ظاہر فرماتے ہیں۔ علامہ ازرقی اصل عبارت میں توفی اسماعیل لکھ کر اور آپ اس کے ترجمہ میں کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد تحریر فرما کر اس کے وقوع کا زمانہ گویا بتلا چکے اور قائم فرما چکے۔ یوں سمجھ لیا جائے کہ اس عبارت مذکورۂ بالا سے تعمیر جرہم کا زمانہ وفات اسماعیلؑ ظاہر ہوتا ہے۔ آپ ہی کی تحریر سے اس کے سن وقوع کا بھی اندازہ ہم بتلا دیتے ہیں۔ خطبات ص563 میں تحریر فرماتے ہیں کہ اسماعیلؑ 2094 دنیوی مطابق 1910 قبل مسیح کے پیدا ہوئے پھر خطبات ص40 میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا ایک سو پچھترویں برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں نے مل کر مکپیلاہ کے غار میں دفن کیا تھا (توریت سفر تکوین باب 25 آیت 9) اس لئے حضرت اسماعیلؑ کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی۔ اب اسی سے حساب لگا لیا جائے۔ اسماعیلؑ کی عمر بالاتفاق ایک سو تیس برس کی بتلائی جاتی ہے۔ تو اس حساب سے سن وفات 1780 قبل مسیح ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے مکہ میں عہد جرہمی شروع ہوتا ہے۔ تو قرینہ غالب ہے کہ سولھویں صدی اور سترہویں صدی کے زمانہ میں تعمیر جرہمی عمل میں لائی گئی۔ یہ تو بالکل کھلا ہوا اور صاف حساب ہے۔ پھر سید صاحب اس کے علم و تعین زمانہ سے اپنی مجبوری اور عجز کیوں ظاہر فرماتے ہیں۔

یہ تو تعمیر جرہمیہ کی نسبت سید صاحب کے اقتباسات تھے۔ تعمیر عمالیقی کے متعلق آپ کے حسب ذیل مکاشفات ہیں:

> عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں جن کی نسل یقطان یا قحطان سے چلی ہیں۔ اور تمام قبائل عرب اسی نسل میں ہیں حمیر بھی انھیں کا ایک قبیلہ ہے اور بنی حمیر میں بھی ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے تھا جو مکہ میں بستا تھا اس پچھلی قوم نے بنی جرہم پر غلبہ پالیا تھا۔ اور کعبہ کی نظر یہ ہوگئی تھی۔ اس زمانہ میں اس قوم عمالیق نے کعبہ کو پھر بنایا۔ جو غالباً پہاڑوں کے نالے چڑھ آنے سے ٹوٹ جاتا تھا۔
>
> بعض مؤرخین نے ان دونوں قوموں میں تمیز نہیں کی اور عرب البائدہ میں جو قوم عمالیق تھی اس کی نسبت تعمیر کعبہ کو خیال کیا اور چونکہ وہ قوم بنی جرہم سے پہلے تھی اس لئے لکھ دیا کہ عمالیق نے قبل بنی جرہم کے تعمیر کعبہ کی تھی۔ حالانکہ اس زمانہ میں نہ ابراہیمؑ تھے نہ

کعبہ تھا۔

اس کے بعد سید صاحب عمالیق ثانی کی تعمیر کا واقعہ ایک فرانسیسی مؤرخ کی کتاب سے حضرت علیؑ کی زبانی لکھ کر جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اپنا یہ نظریہ قائم فرماتے ہیں۔

> عمالیق ثانی کی تعمیر کا زمانہ بھی نہیں معلوم ہوسکتا۔ لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی سے ایک صدی پیشتر وہ لوگ مکہ پر قابض ہو گئے تھے اس لئے کہ جذیمہ بادشاہ دوم خاندان جرہ کی ایک نہایت سخت لڑائی عمالیق سے ہوئی تھی۔ جس میں عمالیق نے شکست فاش کھائی تھی اور یہ واقعہ سنہ عیسوی سے تخمیناً سو برس پیشتر ہوا تھا۔

بہر حال۔ ہمیں تعمیر عمالیقی سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہمیں تو تعمیر جرہمی سے تعلق ہے اور وہی ہمارا موضوع بحث ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح غلاف کعبہ کے متعلق اس کی ایجاد و اولیت کا شبہ سعد ابن تبع حمیری کی طرف ہوا ہے۔ حالانکہ روایت مندرجہ بالا اور دیگر قرائن و دلائل قویہ سے اس کی اولیت حضرت اسماعیلؑ کی زوجۂ مطہرہ کی نسبت ثابت کی گئی۔ جو جرہمی الاصل تھیں۔ اسی طرح ہمارے قدیم مؤرخین کو سقف کعبہ کی اولیت کی اصل حقیقت نہیں معلوم ہوسکی اور انھوں نے قصّی بن کلاب کو جو بقول سر سید جناب ختمی مرتبت علیہ السلام والتحیۃ سے کل دو سو برس پہلے تھے۔ کعبہ کا پہلے پہل مسقف اور دیگر مراسم و مناسک حج وغیرہ کا مقرر کرنے والا بتلایا ہے۔ حالانکہ وہی حضرات باستثنائے سقف کعبہ۔ نذر۔ ہدیٰ اور رفادہ وغیرہ خدمات کعبہ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانہ کے مرسوم و دستور لکھتے اور بتلاتے آئے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر دکھلا آئے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا اور تسلیم کر لینا کتنا قریب العقل بلکہ صحیح ہو جائے گا کہ اس واقعہ میں بھی اصل حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے متقدمین نے سقف اسماعیلی کے جزوی حالات تعمیر جرہمی کے واقعات کلی کے ساتھ ضم کر کے دونوں کو ایک سمجھ لیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سقف کعبہ پر کیا منحصر ہے پوری عمارت کعبہ سیلاب آب کے باعث سے جرہمیوں کے عہد میں گر گئی ہو۔ جیسا کہ تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے بنی جرہم نے پھر از سر نو اس کو مع سقف کے اٹھایا ہو۔

سید صاحب کا یہ بیان کہ چار دیواری کے اندر ایک گڑھا اس غرض سے کھودا تھا اور اس میں نذر کعبہ کے رقوم اس لحاظ سے رکھے جاتے تھے کہ چوری سے محفوظ رہیں۔ صاف صاف اس عمارت کے مسقف کرنے کی ضرورت کو بتلا رہا ہے۔ ورنہ محض چار دیواری کھڑی کر کے۔ مالی رقوم کو اگر چہ ایک گڑھے ہی میں کیوں نہ چھوڑ دینا اور پھر اس کے چوری سے محفوظ رہنے کا خیال بھی ساتھ ساتھ رکھنا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور نہ کوئی عقل والا اسے قبول کر سکتا ہے۔ یہ قرینہ بتلا رہا ہے کہ وہ عمارت اسی وقت یا اس کے بہت بہت قریب زمانہ میں چھت پاٹ کر محفوظ کر دی گئی ہوگی۔

اب رہا سید صاحب کا یہ عذر کہ اس وقت کا موجودہ تمدن ایسا ہی تھا کہ جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیواریں دیواریں تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا۔ اس میں کواڑ چڑھے تھے نہ کنڈی لگی تھی اور بلا شبہ اس زمانہ کی حالت ہی ایسی تھی کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں۔ گو وہ خدا ہی کے لیے گھر بنایا گیا ہو اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔'' بالکل خلاف واقع ہے اس وقت عرب کا

تمدن یقینی اس سے کہیں زیادہ تھا۔ہم اس کے تمدن کو پوری تفصیل سے سید صاحب کے ہم عصر وہمنوا شبلی صاحب کے اسی اعتراض کے متعلق اوپر لکھ آئے ہیں۔جس سے پوری طور پر ثابت کر دیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے زمانہ میں خصوصاً حجاز کے اہل عرب کا تمدن۔اگرچہ یمن کے تمدن کے برابر نہیں تھا تاہم وہ اتنا پیچھے اور خراب حالت میں بھی نہیں تھا۔جیسا کہ ان حضرات نے صرف اپنے قیاس کی بنا پر خیال کر لیا ہے۔حالانکہ یورپین محققین جوان کی تحقیقات کے سرمایۂ ناز ہیں۔ان کے خلاف اس وقت میں عربوں کے متمدن قوم ہونے کا اعتراف ظاہر کرتے ہیں (دیکھو تمدن عرب)

ان دلائل وقرائن کے علاوہ اگر زمانہ کے اعتبار سے بھی اس کی اوّلیت پر غور کیا جائے تاہم یہ واقعہ صحیح اور پر واقع مانا جاتا ہے۔تمام تاریخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کا سن سو برس کا تھا۔سرسید نے حضرت ابراہیمؑ کا سن وفات کے وقت ایک سو پچھتر برس کا بتلایا ہے۔تعمیر کعبہ کے وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر تیس برس کی بتلاتے ہیں وفات ابراہیمی کے وقت ان کا سن (89) نواسی برس کا لکھتے ہیں اور مجموع عمر آپ کی بالاتفاق ایک سو پچاس برس کی بتلائی جاتی ہے۔(طبقات ابن سعد۔طبری۔ابن اثیر) اس حساب سے حضرت اسماعیلؑ اپنے والد ماجد کے بعد ساٹھ برس تک زندہ رہے۔اس بنا پر ہر شخص آسانی سے سمجھ لے گا کہ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں عمارت کعبہ مسقّف نہیں ہوئی تھی تو جناب اسماعیلؑ کے شش سالہ مدت میں۔جیسا کہ روایت مندرجہ سے مستفاد ہوتا ہے۔اس کو مسقّف کرنے کی ضرورت ہوئی اور آپ نے اپنے زمانہ میں عمارت کی موجودہ ضرورت کو کامل فرمادیا۔

یہ تمام واقعات۔یہ تمام قرائن اور یہ تمام دلائل۔جو اوپر لکھے گئے ہیں۔مرقومہ بالا روایت کی کامل تصدیق وتوثیق کرتے ہیں اور صاف صاف بتلاتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ کعبہ کا مسقّف کر دیا جانا کبھی خلاف واقع اور بلا سند نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب اس روایت کی دیگر خدمات کعبہ کی تفصیل قدیم اور جدید محققین اسی زمانہ کی ایجاد تسلیم کر رہے ہیں۔

اب رہا یہ شبہ اور اس کا جواب کہ قدیم محدثین ومؤرخین عرب نے اس روایت کو کیوں نظرانداز کیا۔تو اس کا نہایت واضح اور صاف صاف باعث اصلی یہی ہے کہ اس روایت کے رواۃ اور اس کے تمام ماخذوں پر شروع ہی سے اہل اسلام نے نہ اعتبار رکھا اور نہ کوئی علاقہ اور نہ سروکار۔حالانکہ اهل البیت ادری بما فی البیت (گھر والے اپنے گھر کی اندرونی حالت جانتے ہیں) کے مسلمہ کی بنا پر ان مقدسین سے زیادہ ان امور کا جاننے والا تمام ملک عرب میں اور کون ہوسکتا ہے۔کیونکہ سلسلۂ ابراہیمی اور خانوادۂ اسماعیلی میں۔یہی وہ نفوس برگزیدہ ہیں جن پر اس وقت سے لے کر اس وقت تک اہل البیت کا الہامی اور روحانی خطاب اپنے حقیقی معنوں کے ساتھ صادق اور مطابق آتا ہے۔جس طرح پہلے پہلے یہ خطاب خاص کر آل ابراہیمؑ کے لئے الہام خداوندی اور احکام ایزدی کے مطابق مستعمل ہوا تھا اور اسی باہمی مشابہت ومماثلت کے ثبوت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اہل اسلام کو تعلیم درود کی ترکیب میں یہ کلمات تلقین فرمائے تھے۔ اللهم بارك وسلم علی محمد وآل محمد کما بارکت و سلمت علی ابراهيم و علی آل ابراهيم انك حميد مجيد۔

تولیت خانۂ کعبہ

خانۂ کعبہ زاد اللہ شرفہا کے متعلق مندرجہ بالا خدمات کے علاوہ ایک مہتم بالشان اور عظیم المراتب خدمت اس معبد مقدسہ اور عتبہ مطہرہ کی تولیت تھی۔ اور جس کا جلیل القدر عہدہ اور گرانمایہ منصب منجانب اللہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بعد بقاعدۂ توریث حضرت اسماعیلؑ کو تفویض فرمایا گیا۔ اور چونکہ اس معبد مشرفہ کو خدا نے بیت (اول بیت وضع للناس) کے نام سے موسوم کیا ہے اسی رعایت سے اس کے محافظین اور متو الئین کو اہل البیت کے القاب مخصوص اور خطاب منصوص سے مخاطب فرمایا۔ اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ اور ہر طبقہ میں ان حضرات کی تحریم۔ عظمت اور تعظیم تسلیم کی گئی اور یہ وہی وعدۂ الٰہی ہے اور بشارت خلیل اللہ جو نسل حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کے متعلق خداوند عالم نے ان حضرات کی ہجرت فرمانے کے وقت حضرت ابراہیمؑ سے کیا تھا۔ اور جو متواتر مقامات پر کتب قدیمہ اور نیز قرآن مجید میں موجود ہے۔

تولیت کعبہ کا مسئلہ بہت بڑا قدیم اور عظیم مسئلہ ہے جو نہ تنہا مذہب اسلام میں عظمت و احترام سے دیکھا جاتا ہے بلکہ تمام ادیان و مذاہب قدیمہ میں اس کی تحریم و تعظیم کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ تولیت کے جلیل القدر منصب کی تفویض بھی تجویز انسانی کے متعلق نہیں ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ قطعی طور پر تجویز و تدبیر مشیت ربانی پر منحصر ہے۔ جن لوگوں کو مذاہب سابقہ کے اخبار و آثار کے مطالعہ کی توفیق ہوئی ہے وہ مسئلہ تولیت کی اہمیت اور اس کی اصلی حقیقت سے خوب واقف ہیں۔

مشاہد تاریخی اور کتب ساویہ کے متواتر اخبار و آثار صاف صاف بتلا رہے ہیں کہ کعبہ مشرفہ اور اس کے بعد کے عتبات مطہرہ کی تولیت اور خدمت کا عہدۂ جلیلہ امم سابقہ میں بڑی عظمت و حرمت سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ہر زمانے اور ہر امت میں اس کا تعین اور تقرر منجانب اللہ ہوتا تھا۔

تولیت کعبہ کی خاص عظمت کی تفصیل سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر کے ہم اس کے بعد والے معبد اعظم بیت المقدس اور اس کی تولیت کے احترام و اکرام کو بیان کرتے ہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ بیت المقدس کی بناء کعبہ ابراہیمیؑ سے تقریباً دو ہزار برس بعد حضرت داؤد کے زمانہ نبوت و امارت میں قائم ہوئی۔ اور تکمیل تعمیرات کے وصی و وارث حضرت سلیمانؑ عہد حکومت و رسالت میں کی گئی۔ اور پھر اس وقت سے لے کر بخت نصر کی غارتگری کے وقت تک ہمیشہ اور برابر ایک پیغمبرؑ دوسرے پیغمبرؑ کے بعد تولیت بیت المقدس کے گرانمایہ منصب پر فیض ہوتا چلا آیا۔ اور وہی اس کا محافظ بھی تھا۔ اور وہی اسکا ملازم و خادم بھی۔ اسفار توراتکے مطالعہ سے حضرت عیسیٰؑ تک یہ سلسلہ مسلسل اور مکمل ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ولادت حضرت مسیحؑ کے زمانے میں حضرت زکریاؑ کی تولیت تھی۔ **و کفلها زکریا شاهد ہے** یہ ایسے واقعات مسلم ہیں اور تاریخی مشاہدات محکم اور مشہور بین الجمہور کہ ان کی تصدیق و توثیق کے لئے ہمیں کسی ثبوت یا شہود پیش کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس زمانہ میں خانوادۂ نبوت و رسالت میں ایک ایسا ستودہ صفات بزرگ اس منصب اعلیٰ کے لئے منجانب خدا انتخاب کیا جاتا تھا جو اوصاف رسالت و نبوت سے بھی آراستہ و پیراستہ ہوا کرتا تھا۔ دستور الٰہی صاف صاف بتلا رہا ہے کہ یہ منصب اور خدمت بھی جز و رسالت و امامت قرار پا جاتی ہے اور اس کے لئے مشیت ایزدی انھیں چیدہ افراد اور برگزیدہ اشخاص کو منتخب کرتی ہے۔ جو

اس کے نزدیک اس جلیل القدر اور مہتمم بالشان خدمت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بیت المقدس کی تولیت کی عظمت وشان کو بیان کر کے ہم جناب موسیٰؑ ابن عمران اور ان کے وقت کے معبد قبۃ الزماں۔اس کی تولیت اور خدمت کے خاص احترام واہتمام کو اپنے سلسلہ بیان میں قلمبند کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے توریت کی کتاب الاعمال کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔ وہ قبۃ الزماں کی حقیقت سے خوب واقف ہوں گے۔ قبۃ الزماں حضرت موسیٰؑ کی اس عبادتگاہ اور قربان گاہ کا نام ہے جو آپ نے دوران سفر میں عبادت الٰہی بجالانے کے لیے تیار فرمائی تھی۔ یہ اصل میں ایک خیمہ نہایت وسیع اور تمام قوم کے خیموں سے رفیع تھا یہ ہمیشہ سفر میں ساتھ رہتا تھا۔ اور ہر منزل پر جہاں تمام قوم کے خیمے ڈیرے کھڑے کئے جاتے تھے وہاں یہ خیمہ مقدس ایک اچھی اور پاک و پاکیزہ جگہ پر نصب کیا جاتا تھا۔ اس میں شریعت موسوی کی قرارداد تمام اشیاء اور سامان عبادت بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھے جاتے تھے اور اس کی زیب وزیبائش اور حسن وآرائش بھی بڑی عقیدت اور ادب سے کی جاتی تھی۔ اس میں سونے اور چاندی کی متعدد شمعیں۔ طلائی اور نقرئی بڑے بڑے کاسے اور طرح طرح کے خوشبودان اور دیگر قیمتی اور بیش بہا ظروف اپنے اپنے مقامات مقررہ پر سجے ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کی تمام اقوام وقبائل یہیں آ کر خدا کی عبادت اور اس کے مراسم بجالایا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ کو قوم عمالقہ اور قبطین سے زمانہ دراز تک جنگ کرنی پڑی اور اس ضرورت سے سالہا سال سفر میں رہنا ہوا۔ اس لئے اس عبادت گاہ کی بنا قائم کی گئی اور ایک خیمہ مراسم عبادت بجالانے کی غرض سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس کا نام قبۃ الزماں رکھا گیا۔ اس معبد کی خدمت اور تولیت کے لیے اولاد ہارونؑ مخصوص کر دی گئی۔ عبادت نذر اور قربانی کے تمام مراسم وارکان کی بجاآوری اور انجام دہی خاص طور پر انہیں حضرات سے متعلق کر دی گئی۔ اور ان کی اس تخصیص میں کسی طریقہ یا ذریعہ سے کسی شائبۂ تعمیم کی کوئی مداخلت جائز نہیں رکھی گئی۔ (سفر اخبار باب 16)

قبۃ الزماں کے سب یا اکثر سامان عبادت اور صندوق الواح وغیرہ بھی چیزیں تھیں جو اولاد ہارون اور دیگر بنی لاویوں سے حاصل کر کے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کے معبد میں سابق ترتیب اور ترکیب کے مطابق رکھیں تھیں۔

ہم نے معبد ابراہیمی کے مابعد معبدوں کی تولیت اور ان کی خصوصیت کو یہاں اس وجہ سے لکھ دیا ہے کہ اس جلیل القدر منصب کا تعین انتخاب قدرت پر منحصر ہونا پہلے ہی سے یقین کر لیا جائے۔ نہ جناب ابراہیمؑ کی محبت اولاد پر۔ جس کا ثبوت ذیل کے آیہ قرانی سے پورے طور پر ملتا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ١٢٤

جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور ان میں ان کو پورا پایا تو خدا نے فرمایا کہ ہم تمھیں لوگوں کا امام بنانے والے ہیں۔ عرض کی۔ اور میری اولاد میں سے؟ ارشاد ہوا (ہاں مگر) ہمارے

(اس) اقرار میں وہ داخل نہیں جو برسر ناحق ہیں۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ عوام الناس کو چھوڑ کر سلسلہ ابراہیمی کے خواص میں بھی علی الاکثر ایسے حضرات ہیں۔ جن میں تولیت اور دیگر خدمت معبد الٰہی کی۔ جو اصل امامت کے فروغ ہیں۔ صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے اور اسی لئے خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا و مدعا کو بطور تعمیم مستجاب نہیں فرمایا اور اس میں تخصیص کی ترمیم کر دی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب عام حضرات میں پیشوائی امت اور منصب امامت کی صلاحیت موجود نہ ہوگی تو وہ عبادت الٰہی اور دیگر اوامر ومناہی دینیات کی تعلیم وتلقین کیسے پوری کر سکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس منصب کو اپنی اولاد کے ساتھ محدود ومخصوص کرنا چاہا تھا۔ اور یہ اصول فطرت کے بالکل مطابق ہے۔ مگر مشیت نے اس تخصیص کو بھی ان کے عام سلسلہ میں عام کر دینا مصلحت کے خلاف پایا۔ اور اس میں بھی اپنے انتخاب وتعین کی قید لگا دی اور یہی اصول خانہ کعبہ کی آغاز تولیت سے لے کر مابعد کے معبدوں کی تعین تولیت اور انتخاب امام وامامت کے متعلق مشیت الٰہی کی طرف سے ہمیشہ قائم رہے۔

ابھی ابھی قبط الزماں اور بیت المقدس کی خدمات کے متعلق لکھ کر بتلا دیا گیا ہے کہ اس عہدۂ جلیلہ کی انجام دہی میں تعلیم وہدایت امت بھی خاص طور پر شامل تھی اور تمام لوگوں کی عبادت۔ عملیات اور اوامر ومناہی کی خبر گیری داخل۔ اس لئے اس کی ذمہ داری اور ادا کاری کی بھی انھیں نفوس مخصوص سے خاص طور پر متعلق کی گئی۔ جو امام اور پیشوائے امت ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ خانوادۂ ابراہیمی سے لے کر۔ آل ہارون۔ آل داؤد اور آل عمران تک ان تمام مبرک سلسلوں میں تولیت کعبہ کی عظیم الشان خدمت انھیں خاص بزرگوں کے متعلق کر دی گئی جو امت کے امام وپیشوا اور عوام الناس کے رہنما بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

اسلام نے بھی اس منصب گرانمایہ کے حفظان مراتب کا شروع سے لحاظ رکھا۔ بلکہ اگر زیادہ تحقیق وغور سے دیکھا جائے تو اس کی قدر ومنزلت میں شریعت سابقہ سے زیادہ اضافہ کیا۔ اگرچہ ان برگزیدہ اور پسندیدہ حضرات کے ناموں میں اپنی طرف سے کوئی نوعیت اور تبدیلی نہیں کی گئی اور اہلبیت کے مبارک ومقدس القاب سے جیسا کہ زمانہ ابراہیمی میں مخاطب کئے جاتے تھے۔ اسی القاب وخطاب ہی سے اسلام اور بانی اسلامؐ نے بھی ان حضرات کو ملقب اور مخاطب فرمایا۔ اور کتب قدیمہ کے اصول بشارت کے مطابق۔ الہام واحکام قرآنی نے بھی ان مقدسین کے فضائل ومراتب سے تمام اہل اسلام کو واقف ومطلع فرما کر۔ ان کی نسبت تعلیم وارشاد ابراہیمی کو از سر نو زندہ کر دیا۔ انھیں احکام ربانی کی تعمیل واجرا میں بانی اسلامؐ نے یہاں تک اصرار فرمایا کہ ان برگزیدگان الٰہی کے ساتھ محبت ومودت رکھنے کو اپنی تبلیغ رسالت کا اجر ومعاوضہ قرار فرما دیا۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى۔

میں تم سے اجر تبلیغ رسالت کچھ نہیں مانگتا۔ سوائے اس کہ تم میرے اقرباء کے ساتھ محبت رکھو۔

اللھم صل وبارك علی محمد وآل محمد کما صلیت و بارکت علی ابراھیم و آل

ابراهيم انك حميد مجيد۔

انھیں مشاہدتاریخی سے پورے طور پر ثابت ہوگیا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس طرح عہدۂ جلیلہ امامت آپ کے اہلبیت کے ساتھ مخصوص ومنصوص تھا۔اسی طرح امامت کے متعلق تمام جزوی اورکلی خدمات بھی انھیں حضرات سے مخصوص تعلق رکھتے تھے۔اورمنصب امامت کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر اپنے سلسلہ بیان میں ثابت کرآئے ہیں تولیت کعبہ کی خدمت بھی اسی جلیل القدر عہدہ کا جزوضروری تھی۔مگر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے اہلبیت طاہرین سے جہاں تمام اختیارات وحقوق چھین لئے گئے انھیں کے ساتھ یہ حقوق اورمنصب بھی ضبط ہوگئے۔اورتخت سلطنت کے پایہ کے نیچے دبادیئے گئے۔

حجرالاسود

اسلامی کتابوں صحاح وسنن سے تاریخ وسیر تک کی تمام مشہورومعروف کتابوں میں اس حجر مقدس کی قدامت اورعظمت کی نسبت انواع واقسام کی روایات قلمبند ہیں۔جومشاہدتاریخی میں اگرنہ داخل ہوسکیں توعقائد اسلامی میں شامل ہونے کےتوضرورقابل ہیں۔
مرویات اسلامی اورروایات عرب عموماًاس پتھر کا حضرت آدمؑ کے ساتھ نزول من اللہ ہونا بتلاتے ہیں۔جدید محققین چڑھ چڑھ منہ آتے ہیں اوراس کومتقدمین کی قدامت پرستی ٹھہراتے ہیں۔مگرمسٹر برٹن(Mr. Burton)اپنے مشاہدات میں اتنا ضرور بتلاتے ہیں کہ اس پتھر کے اجزامعمولی حجریت سے مشابہ نہیں ہیں بلکہ اس میں شہاب ثاقب کے ایسے اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں برٹنس گولڈ مائن آف مدنا ان(BURTONS GOLD MINES)اب جدید محققین خودتصفیہ فرمالیں کہ شہاب ثاقب یادیگراجرام فلکی کا حرکت ثقلی کے ذریعہ سے آسمان سے زمین پرنازل ہونا ثابت ہے کہ نہیں۔
تاریخی حیثیت سے اس مقدس پتھر کی عظمت وحرمت یہاں تک ثابت ہے کہ تعمیر کعبہ کے وقت اسی پتھر کے ذریعہ سے حضرت ابراہیمؑ نے استادہ ہوکر کعبہ کی اونچی دیواروں کا کام پورافرمایا تھا۔اوراختتام تعمیر کے بعد پھراپنے مبارک ہاتھ سے اس کودیوار کعبہ میں نصب فرمادیا۔اہل اسلام آج تک اس کے استیلام کوارکان حج میں داخل سمجھتے ہیں۔اوراس کا یہ احترام حقیقتاًاس شعر کا پورا مصداق معلوم ہوتا ہے۔

جمال ہمنشین درمن اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

خانہ کعبہ زاداللہ شرفھا کے تمام متعلقات کوکافی اورکامل تفصیل سے بیان کرکے ہم اپنے آیندہ سلسلہ بیان میں حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کے حالات اوران کی سکونت کے مختلف مقامات کو بیان کرتے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اوران کے نام یہ ہیں:
نباتوت (۱)، قیدار (۲)، اوبئیل (۳)، بیسام (۴)، مشماع (۵)، دوماہ (۶)، مسا (۷)، تیما (۸)، یطور (۹)، یافیش (۱۰)، قیدماہ (۱۱)، حدر (۱۲)۔

ان میں سب سے بڑے بیٹے نباتوت اوران سے چھوٹے قیدار تھے۔اور یہی دونوں آئندہ تاریخ عرب میں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔یہ تمام بھائی باپ کے زمانہ میں اور ایک عرصہ تک حجاز ہی میں آباد رہے اور چچازاد بھائی کے بیٹوں یعنی فرزندان مدین کے ساتھ مل کر یمن وحجاز سے شام ومصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبودار چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔(تکوین باب37، آیت26)

خوشبو کی چیزیں یمن سے حجاز کی راہ سے مصروشام کو جاتی تھیں۔شام اور یمن کے بیچ میں درمیانی منزل شہر مکہ تھا۔اسلئے بنواسماعیل تجارت میں بہت جلد فروغ حاصل کرسکے ہوں گے۔بنواسرائیل اسماعیلیوں کو کبھی اسماعیلی اور کبھی ماں کی نسبت سے ہاجری کہتے ہیں۔اور تورات میں انھیں ناموں سے ان کا ذکر ہے۔بنواسماعیل کا تورات میں سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پوتے یعقوبؑ کے زمانے میں (تقریباً2000ق م) تجارت کی حیثیت سے نام آیا ہے۔حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کو بھائیوں نے ایک کنوئیں میں ڈال دیا تھا، اتفاقاً ایک کارواں کا گذر ہوا جس نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا۔اور مصر میں ایک امیر کے ہاتھ بیچ ڈالا یہ کارواں اسماعیلی اور مدیانی تھے تاریخ میں تجارت کا یہ سب سے پہلا قافلہ نظر آتا ہے۔(تکوین باب37)

حضرت موسیٰؑ کے عہد میں (تقریباً1500ق م) بنی اسماعیل تمام حجاز میں یمن (حویلہ) سے شام (شور) تک پھیل گئے تھے۔(تکوین باب25 آیت ۱۸) حضرت موسیٰؑ کے بعد قضاۃ بنی اسرائیل کے زمانہ میں (تقریباً1300ق م) وہ عمالیق ومدین کے پہلو بہ پہلو سپاہیانہ جوہر کے ساتھ بنی اسمٰعیل پر چھاپہ مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔سات برس کامل تک متصل بنی اسرائیل اسماعیلیوں کے پنجہ میں گرفتار رہے۔سال میں جب فصل تیار ہوتی۔اسماعیل برق وباد کی طرح آتے اور سب کاٹ کرلے جاتے۔آٹھویں برس بنی اسرائیل میں جدعون نامی ایک پہلوان پیدا ہوا اس نے اسماعیلیوں کو شکست فاش پہنچائی۔(قضاۃ6۔7۔8)

اس زمانہ میں بنی اسماعیل کا نہایت دولتمند قوموں میں شمار تھا۔کانوں میں مرد سونے کے زیور پہنتے تھے۔اونٹوں کے گلے میں سونے کے قلاوے ڈالتے تھے۔اس جنگ میں بنی اسرائیل کو جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس میں صرف کان کے زیوروں کے سونے کا وزن سترہ سو مثقال تھا۔(قضاۃ باب8 آیت26)

شاؤل (طالوت) کے عہد میں (غالباً1050ق م) بنواسماعیل حجاز سے نکل کر بادیہ شام اور بادیہ عراق میں پھیل گئے تھے۔عموماً مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ مکہ اور حجاز میں جب اسماعیلؑ کی اولاد بہت زیادہ ہوگئی تو نجد وحدود عراق وغیرہ ممالک میں پھیل گئی (معارف

ابن قتیبہ وسیرت ابن ہشام) اس کی تائید روایات یہود سے بھی ہوتی ہے اسی زمانہ میں بنی اسرائیل کا ایک ٹکڑا بھی نہر فرات کے قریب بادیہ عراق میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ آخر بنو ہاجرہ سے سامنا ہو گیا۔ بنی اسرائیل نے لڑ کر بنو ہاجرہ کو نکال دیا۔ اور ان کے خیموں میں جا کر خود آباد ہو گئے۔ (ایام باب 5 آیت 10)

اس واقعہ کے چالیس برس بعد بنو اسماعیل و بنو ہاجرہ شمالی عرب و حدود شام کے قبائل سے متحد ہو کر حضرت داؤدؑ کے عہد میں (غالباً 1000 ق م) بنی اسرائیل پر حملہ کی تیاریاں اور مشورے کر رہے تھے (زبور باب 83 آیت 5 و 6) 700 ق م میں جلعا د اور حدود شام میں جنگ آزما اسرائیلی دوبارہ بنو ہاجرہ سے برسر مقابلہ ہوتے ہیں اور ان کو شکست دیتے ہیں۔ مال غنیمت میں ان کو پچاس ہزار اونٹ۔ ڈہائی لاکھ بھیڑ۔ دو ہزار گدھے اور ایک لاکھ قیدی ہاتھ آئے۔ (2۔ ایام باب 5 آیت 20۔21) اس کے بعد 600 ق م میں وہ زمانہ آتا ہے جب بنو خذ رندر (بخت نصر) آندھی کی طرح اسیریا سے اٹھتا ہے اور تمام شام و عرب کی خاک اڑا دیتا ہے۔

اور پھر ہمیشہ کے لیے بنو اسرائیل اور آل اسماعیل کی مخاصمانہ حوصلہ مندیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ یہ بنو اسماعیل کی اجتماعی تاریخ تھی۔ اب تفرق و انتشار کے بعد ہر ایک کی اولاد اور نسل کی تاریخ کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے علیحدہ علیحدہ بہ ترتیب اہمیت و امتیاز لکھتے ہیں۔ (ملخص از کتاب ارض القرآن جلد دوم ص 57-58)

(۱) بیسام ابن اسماعیل علیہ السلام

ان کے اور ان کے خاندان کے متعلق کوئی حالات نہیں معلوم ہوتے۔ محققین یورپ بھی تلاش و فکر سے تھک گئے۔ ریورند مسٹر فارسٹر (REVE MR. FORESTOR) لکھتے ہیں۔ اس اسماعیلی شخص کے نام و نسل کے آثار بہ نسبت اس کے اور بھائیوں کے کمتر اور بالکل ضعیف ہیں۔ پورا نام نہ قدیم جغرافیہ عرب میں ملتا ہے اور نہ جدید جغرافیہ میں۔ (فارسٹر جغرافیہ عرب ج ۱ ص 68)

(۲) ادبائیل ابن اسماعیلؑ

عرب مؤرخین کو اس کے متعلق کوئی واقفیت نہیں۔ تورات میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ فارسٹر کا بیان ہے کہ یہودی مؤرخ یوسیفورس نے لکھا ہے کہ یہ اسماعیلی آبادیوں۔ یعنی (نیل و فرات) کے درمیان یہ خاندان آباد تھا۔ (جغرافیہ عرب ج ۱ ص 274)

(۳) مشماع ابن اسماعیلؑ

عبرانی اس کو مشماع لکھتے ہیں۔ یونانی ترجمہ توریت میں مسما لکھتا ہے یوسیفورس نے مسماءُ وس لکھا ہے اور بطلیموس نے مسمانیس قرار دیا ہے۔ عرب اس کی اولاد کو بنی مسما کہتے ہیں۔ اور یہ امر محقق ہے کہ یہ قبیلہ نجد کے قریب آباد تھا۔ (فارسٹر جغرافیہ ج ۱ ص 285)

(۴) مسا ابن اسماعیلؑ

یونانی اور عرب جغرافیہ نویسوں کی شہادت کی بنا پر حدود عراق میں اس خاندان کے آثار نظر آتے ہیں۔ پلینی (رومن مؤرخ) نے مسیا (MISAIE) اور بطلیموس نے مسیانی (MASANI) کے نام سے ان اطراف میں بعض قبائل کا ذکر کیا ہے۔ (فارسٹر ج ا ص285)

عرب جغرافیہ نویسوں میں سے ذکریا قزوینی۔ مشان نام ایک مختصر آبادی کا یہیں پتہ دیتا ہے۔ (اثار البلاد قزوینی ص308)

یاقوت حموی اسی مقام پر واسطہ و بصرہ کے مابین۔ میان نام ایک شہر کا ذکر کرتا ہے۔ یہودی اس شہر کا نہایت احترام کرتے ہیں اور اس کو حضرت عزیرؑ کا مدفن قرار دیتے ہیں۔ عہد اسلام میں بھی زیادہ تر یہاں یہودیوں کی آبادی تھی۔ (معجم البلدان ج8 ص224 مصر) سفر ایام نے جن بنو ہاجرہ کا بادیہ عراق میں ذکر کیا ہے شاید وہ یہی خاندان ہو۔ (2 ایام باب5 آیت 12)

مسا کے متعلق سید صاحب خطبات میں تحریر کرتے ہیں کہ مسٹر فارسٹر نے غلطی سے ان کی سکونت عرب کے حصہ الجزائر میں بتلائی ہے۔ حالانکہ حقیقتاً یہ ان کی اولاد یمن میں جا کر آباد ہوئی اور یمن کا مشہور معروف مقام موسا انہیں کے آثار قدیمہ کا یادگار ہے۔ لیکن اسانید متذکرہ بالا کی روسے تو مسٹر فارسٹر صاحب نے غلطی نہیں کی ہے۔ بلکہ سید صاحب کو خود دھوکا ہو گیا ہے۔

(۵) حدر یا حدد ابن اسماعیلؑ

سفر تکوین میں اسکا املا۔ حدر اور سفر ایام یں حدد ہے۔ حدر کے آثار عرب میں متعدد جگہ پائے جاتے ہیں۔ تیما کے پاس حدو نام ایک پہاڑی ہے نجد میں بھی ایک قطعہ زمین کا نام حدو ہے (معجم البلدان ج3 ص232) جوہری عرب کے ایک قبیلہ کا نام بھی حدد بتلایا ہے۔ نیوبھر (NIEUBHUR) انیسویں صدی کا ایک یورپین سیاح عرب۔ شہر حدیدہ واقع یمن کو بھی اسی حدو سے متعلق سمجھتا ہے۔ لیکن مشرقی نگاہ میں حدد اور حدیدہ میں نہایت عظیم فرق ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ عربی مؤرخ۔ زبیری اور مسٹر فارسٹر دونوں اس قول پر متفق ہیں کہ شہر حدید آج تک انھیں کی یادگار ہے۔ (خطبات احمدیہ)

(٦) یطور ابن اسماعیلؑ

یطور۔ ساؤل کے زمانہ میں (1050 ق م) حدود شام کے صوبۂ حوران میں نظر آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی جماعت سے برسر پیکار ہوتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں (سفر ایام باب5 آیت 12) لیکن یونانی جغرافیہ نویس اسٹرابو (24 ق م) تک ان کی یاد قائم رہتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

> وہ تمام سلسلہ کوہ جو لبنان اور بصرے کے درمیان نظر آتا ہے عربوں سے اور یطوریوں سے آباد تھا۔ (فارسٹر ج ا ص210)

یونان میں یطور جطور ہو گیا ہے۔ اس بنا پر بکھارو (BUKHARD) ایک یورپین سیاح شام کے شہر جدور کو اسی جطور سے نسبت دیتا ہے (فارسٹر ج ا ص310) یہ شہر مشرقیہ جغرافیہ نویسوں سے بھی مخفی نہیں۔ (معجم البلدان ج3 ص66) لیکن اگر جدور ہی کو یطور کا مسکن قرار

دینا ہے تو یہی نام ہمیں حجاز میں مدینہ منورہ سے چھ میل کی مسافت پر نظر آتا ہے لیکن ایک عام فہم مشرقی بھی جانتا ہے کہ یطور کی شکل کسی صورت میں جدور نہیں ہوسکتی۔

(۷) یافیش ابن اسماعیلؑ

سفر ایام ثانی باب 5 آیت 12 سے ثابت ہوتا ہے کہ یطور کے ساتھ یہ خاندان بھی حوران ہی میں آباد تھا اور بنی اسرائیل کے مقابلہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شریک تھا۔

(۸) دوماہ ابن اسماعیلؑ

اس خاندان کا مسکن اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ دومۃ الجندل شمالی عرب میں مدینہ وشام کے درمیان ایک مشہور مقام ہے عرب جغرافیہ نویسوں نے تصریح کی ہے کہ دومۃ الجندل اسی دوما کی طرف منسوب ہے۔ پچھلے زمانہ میں یہاں نصاریٰ آباد تھے۔ (معجم ج4 ص106)

(۹) تیماء ابن اسماعیلؑ

حدود عرب وشام میں اس خاندان کے انتساب سے ایک قدیم آبادی ہے ایوب نبیؑ کے زمانہ میں اس خاندان کو کسی قدر فوجی اہمیت حاصل تھی (سفر ایوب 6-19) میں تیماء کے سواروں کا ذکر ہے۔ اشعیاہ نبیؑ نے بھی (800ق م میں) سرزمین تیماء کا نام لیا ہے (21-14) زمانۂ اسلام میں یہاں یہود آباد تھے۔

(۱۰) قیدماہ ابن اسماعیلؑ

فارسٹر صاحب نے قیدماہ کو فاطمہ (واقع خلیج فارس) کا مرادف سمجھا ہے اور اس لئے اس کو خلیج فارس پر جگہ دیتے ہیں کاظمہ یقیناً انگریزی لب ولہجہ میں ''کیڈما'' ہوجائے گا لیکن ہر مشرقی لب ولہجہ کا واقف کار اس پر ہنس دے گا کہ قیدماہ اور کاظمہ ایک چیز ہے۔ قرآن مجید میں ایک قبیلہ کا نام اصحاب الرس مذکور ہے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ قیدماہ ہی کا نام اصحاب الرس تھا۔ ہمارے ہاں مفسرین اصحاب الرس کی تعین میں نہایت مشکوک الرائے ہیں۔ امام طبری نے ارباب روایت کی تین رائیں نقل کی ہیں۔

(۱) رس کنوئیں کو کہتے ہیں۔ ایک امت نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ اس لئے اس کو اصحاب الرس کہتے ہیں۔

(۲) رس ملک آذربائیجان کے پار ایک آبادی کا نام ہے (شاید روس سے مقصد ہو)

(۳) رس غار کو کہتے ہیں اور اس سے مراد اصحاب الاخدود ہیں۔

لیکن مؤرخ سعودی بلا تزلزل رائے لکھتے ہیں۔

اصحاب الرس کانوا من ولد اسمعیل وھم قبیلتان یقال لا حداھما قد مان

والاخری یأمین و قیل دعویل وذلك بالیمن (مروج الذهب)

اصحاب الرس بنواسماعیلؑ تھے۔اوران کے دو قبیلے تھے۔ایک قدمان کہلاتا تھااور دوسرا یامین بعضوں نے اس کوعویل بھی لکھا ہے۔اور یہ یمن میں تھے۔

قید مان قید ماہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔اصحاب الرس کا اس کے علاوہ کوئی اور حال نہیں معلوم ۔قرآن مجید نے دو مقام پر اصحاب الرس کا ذکر کیا ہے۔لیکن کوئی حال بیان نہیں کیا۔صرف گنہگار قوموں کی فہرست میں ان کا نام آیا ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَوَأَصْحَابَ الرَّسِّ(فرقان)

عاد۔ثموداوراصحاب الرس کو

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۱۲

ان سے پہلے نوح کی قوم ۔اصحاب الرس اورثمود نے جھٹلا یا

اصحاب الرس کا بنواسماعیل ہونا ثابت ہوگیا اوراسی کے ساتھ ان کا امت مذموم ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ان اسناد واشہاد سے ہمارے اس استدلال کی پوری تصدیق ہوجاتی ہے۔جس کو ہم ابھی ابھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات میں آپ کی اس دعا کے متعلق لکھ آئے ہیں کہ ان کی تمام اولا دوذریات میں امامت اور پیشوائی امت کا منصب تفویض فرمایا جائے جس کے جواب میں خداوند عالم نے واللہ لا ینال عهد الظلمین۔ارشادفرما کر۔اہل۔نااہل۔عادل اور ظالم کی تفریق وتخصیص ظاہر فرمادی۔اورحضرت ابراہیمؑ پر حقیقت حال کا صاف صاف انکشاف فرمادیا گیا کہ آپ کی دعا آپ کی اولادوذریات میں ذوات عادلین کے لئے مستجاب کی جاتی ہے۔غیر عادلین اور ظالمین کے لئے نہیں۔اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ اگر اس منصب عظیم میں تعمیم کا معمول قائم ہوتا تو اصحاب الرس جو بلا شبہ و کلام ذریات واولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے قوم ظالمین اور گروہ کافرین میں نہ شمار کئے جاتے۔

(۱۱)نبایوط یانبط یانابت ابن اسماعیلؑ (اصحاب الحجر)

نبایوط کو اہل عرب عموماً نابت کہتے ہیں۔ان کی روایتوں کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیلؑ کے بعد سب سے بڑے بیٹے نابت کے حصے میں آئی (اخبارالدول ابوحنیفہ دنیوری وحیات القلوب ملاءمجلسی)اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبایوط نے حجاز ہی میں قیام کیا۔لیکن بعض حوالوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فرزندان نبایوط عراق میں موجود تھے لیکن اصل یہ ہے کہ بدویانہ زندگی کے ساتھ وہ حجاز سے عراق تک خانہ بدوشانہ پھیلے ہوئے ہوں گے۔

تحریری حیثیت سے نبایوط کا نام ساتویں صدی ق م میں نظر آتا ہے۔خرقیال نبی پیشین گوئی دیتے ہیں کہ نبایوط کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی۔(60-7)اشوربانیپال۔اسیریا کا بادشاہ۔جس کا بھی تقریباً یہی زمانہ ہے اپنے مفتوحین کی فہرست میں نباطی قوم کا نام لیتا ہے۔یوسیفورس یہودی۔جو پہلی صدی مسیحی میں تھا لکھتا ہے۔

ملک بحر احمر (حجاز) سے نہر فرات (عراق) تک اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں
ہے جن کے سبب سے اس کا نام ملک نباطینہ پڑ گیا ہے۔(حوالہ آ تا ہے)

اسی زمانہ میں جب رومی شام پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو نبطی عربوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوتی ہے اور شام وعرب کے حدود پر ان کی ایک عظیم الشان حکومت نظر آتی ہے۔اہل عرب بھی ان نبطیوں سے واقف تھے۔اسی لفظ نبط کی جمع عربی میں انباط ہے۔

انباط اور روایات عرب

مؤرخین عرب فرزندان نبایوط اور انباط سے واقف نہیں ہیں۔وہ صرف انباط کے نام اور ان کے مسکن تخمینی سے البتہ واقف ہیں ان کا نام کبھی نبط اور کبھی ارامی بتلاتے ہیں اور ان کا مسکن شام وعراق ظاہر کرتے ہیں ابن خلدون نے لکھا ہے۔

واول ملك العرب بالشام فيما علمناه للعمابقه ثم لبنی ارم بن سام و يعرفون بالارمانيين

جہاں تک ہمیں معلوم ہے عربوں کی پہلی حکومت شام میں عمالقہ کی تھی۔پھر ارم بن سام کی۔جو ارمانی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔

اس عبارت کے ساتھ حمزہ اصفہانی کی عبارت ذیل ضم کرو۔

الارمانيون نبط الشام ولاا ردوانيون نبط العراق

ارمانی۔شام کے نبطیوں کا نام ہے اور اردوانی عراق کو نبطو یوں کا

انباط نے چونکہ ایک متمدن وغیر بدوی زندگی اختیار کر لی تھی اس لئے عربوں کے محاورہ میں۔

اما النبط فكل من لم يكن راعبا او جند يا عند العرب من سا كنی الارضين (ياقوت۔ عربه 23)

نبط عرب کے نزدیک ہر وہ شخص ہے۔جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو

اہل عرب عموماً نبط کو اصلاً وقوماً غیر عرب سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک عرب وعجم جس طرح دو متقابل نام ہیں اسی طرح نبطی وعربی کو بھی باہم متقابل سمجھتے ہیں۔اس کا سبب صرف معاشرت۔طرز زندگی اور زبان کا اختلاف ہے۔ورنہ حقیقت نبط بھی اسماعیلی عرب ہیں۔لیکن چونکہ انھوں نے عموماً حدود عرب اور حدود عرب سے باہر غیر قوموں میں اپنا مسکن اختیار کیا اس لئے وہ اپنا نسب نامہ محفوظ نہ رکھ سکے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں۔

تعملوا النسب ولا تكونو كنبط السوا داذاسل احدهم عن اصله قال من قرية

كذا (عقد الفريد ج3ص 37)

نسب نامہ سیکھو۔عراق کے نبط کی طرح نہ ہوجاؤ۔کہ جب ان میں سے کسی سے پوچھا جائے تم کس خاندان کے ہوتو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔

ہمارے مؤرخین کی معلومات انباط کے متعلق صرف اسی قدر ہیں۔لیکن انباط کی خود معاصر قوموں نے ان کے حالات کو سیاسی تعقلات کی بنا پر بہت کچھ محفوظ کر رکھا ہے اور اب اکتشافات اثریہ نے بھی ان معلومات میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے۔

انباط اور نبایوط اور نابت کا ترادف

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ انباط جن کی تاریخ کا مفصل تذکرہ یونانی مؤرخین نے کیا ہے اور نبایوط پسر اسماعیل جن کا تورات میں ذکر ہے اور نابت بن اسمٰعیل جن سے عربوں کو ہم نسبی کا دعویٰ ہے۔کیا درحقیقت ان مختلف الفاظ سے ایک ہی مفہوم مراد ہے؟ ہمارا جواب اثبات میں ہے۔اہل عرب انباط کو عربوں سے الگ الگ بیرونی قوم سمجھتے ہیں۔لیکن یہ درحقیقت ایک مدت تک کے تباعد اور تفرق کا نتیجہ ہے جن یونانی اور رومی مؤرخین نے انباط کا ذکر کیا ہے۔انھوں نے متفقہ طور پر ان کو عرب لکھا ہے۔سب سے بڑی معتبر شہادت یہودی مؤرخ یوسیفورس کی ہے۔جو انباط کا معاصر اور نسل و وطن کے اعتبار سے بھی ان کے قریب تھا۔اس لئے یقین ہے کہ ان کے متعلق اس کی شہادت پایہ اعتبار سے ساقط نہ ہوگی وہ بتصریح تمام لکھتا ہے کہ انباط اسماعیل عرب از نسل نبایوط ہیں (حوالہ آتا ہے) مؤرخ طبری بھی لکھتے ہیں۔

ومن نابت و قيدار نشر الله العرب

قوم عرب کو نابت اور قیدار کی نسل سے خدا نے پھیلایا (ج اص 352)

یاقوت حموی نے (لفظ عربہ کے تحت میں) ایک نئی بات لکھی ہے کہ عرب ہر اس قوم کو نبط کہتے ہیں جو گلہ بان اور سپاہی نہ ہو۔دوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو غیر بدوی زندگی بسر کرتی ہو۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نبط نے عراق کے تاثر سے متمدن زندگی اختیار کر لی تھی اس لئے بادیہ نشینان عرب نے ہر غیر بدوی قوم کو نبط کا مترادف سمجھ لیا۔

حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان کا نسب نامہ پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں ثی (واقع عراق) کے نبط ہیں اور یہ بالاتفاق معلوم ہے کہ وہ اسماعیلی قریشی (ہاشمی) عرب تھے۔اس سے ثابت ہوگا کہ نبط اسماعیلی عرب ہیں جو عراق تک پھیلے تھے۔

نابت کی بقیہ اولادیں خود اندرون ملک میں بھی تھیں۔اور متعدد وجوہ سے ہماری یہ رائے ہے کہ عرب شمال کی وہ اکثر قومیں جو غلطی سے قحطانی کہلاتی ہیں وہ دراصل نبطی ہیں۔منجملہ دیگر قبائل کے غسان اور اوس وخزرج کے متعلق تو بتصریح ثابت ہے کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ نابتی ہیں تفصیل آتی ہے۔

انباط کا عہد حکومت

انباط ایک مدت تک دیگر قبائل عرب کی طرح بحر احمر سے لے کر بحر فرات تک مستقل وادیوں میں بدویانہ زندگی کے ساتھ آوارہ پھرتے رہے۔اس بدویت کا زمانہ 2000 ق م (عہد اسماعیلؑ) سے 700 ق م تک قرار پاتا ہے۔تورات نے نبایوط کا فرزندان اسماعیل کے ضمن میں 2000 ق م میں پہلی بار نام لیا ہے۔اور آخراً خرقیال نبیؑ نے جو کم وبیش 700 ق م میں تھے۔نبایوط کا ذکر کیا ہے کہ نبط (نبایوط) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی (60-7)

کتبات میں نبط کا نام اشور بانیپال۔شاہ اسیریا کے کتبہ میں تقریباً اسی عہد یعنی 700 ق م میں نظر آتا ہے وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں ناتان۔شاہ ونبط کا ذکر کرتا ہے (تاریخ بابل راجرس امریکانی جلد دوم صفحہ 276) خرقیال کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبط اس وقت چوپانی یعنی بدوی زندگی بسر کر رہے تھے۔لیکن یہ اسیری کتبہ ایک نبطی حکومت کی اس عہد میں خبر دیتا ہے۔ممکن ہے کہ بادشاہ مقصود ایک نبطی بدوی شیخ ہو۔بہرحال نبطی کی تاریخ از روئے تاریخ یونانی وکتبات نبطی سے 400 ق م سے پہلے روشن نظر نہیں آتی۔آخری تاریخ 106 ق م میں ہے۔جبکہ رومی حکومت ان کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

انباط کا رقبہ وحکومت

انباط کی حکومت کے حدود اولاً وہ قطعہ ملک تھا۔جس کو یونانی عرب سنگستان (ARABIA PATERIA) کہتے ہیں اور عبرانی ادوم اور سعیر (سراۃ) یعنی خلیج عقبہ سے بحر میت تک۔ڈائیڈورس (Diedorius) بیان کرتا ہے کہ انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں اسٹرابو (STRABO) (24ء) ایک ضمنی تذکرہ کہتا ہے کہ اہل ادوم انباط میں (گولڈ مائینس آف مدین ص 235) لیکن ادوم سے آگے بڑھ کر اب وہ عرب ابادان پر بھی قابض ہو گئے تھے۔مصنف مذکور لکھتا ہے کہ اہل ادوم وسبائی جو شام کے اوپر واقع ہیں جنھوں نے عرب ابادان (ARABIA FLEX) پر قبضہ کیا ہے۔یوسیفورس جو پہلی صدی مسیحی میں تھا بیان کرتا ہے کہ اس عہد میں وہ عربستان ریگستان (ARABIA DESERT) تک پھیل گئے تھے۔اس کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

> ملک بحر احمر سے نہر فرات تک اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں تھا۔جن کے سبب سے اس کا نام ملک نباطینہ (NABATINA) پڑ گیا ہے۔اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (PETRIA) سے مل گئی ہے اور بہت سے بیابان اور بلند وفراز زمینیں اس میں شامل ہیں جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتھی ہوتی ہے۔عموماً اس ملک کے باشندوں کا نبایوط (NEBAJATH) عرب ہے (اینتی کوئیٹی ج ا ص 12)

ان شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انباط کا ملک مغرب میں بحر احمر اور مشرق میں خلیج فارس تک وسیع تھا اور اس کے درمیان تمام ممالک یعنی عرب سنگستان وعرب ریگستان وبعض قطعہ عرب ابادان پر قابض تھے۔لیکن اس طویل وعریض ملک میں انباط کی اصل آبادی خلیج عقبہ

(ایلہ) کی اطراف میں تھی۔ڈائیڈورس کا بیان ہے۔

> اوپر گذرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) (LAINAITIES) میں داخل ہو گئے۔جس کی حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط (NABATAISI) کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف ساحل کے بڑے حصہ پر قابض ہیں بلکہ وہ اندرون ملک میں بھی دور تک پھیل گئے ہیں کیونکہ زمین آباد اور نہایت سرسبز ہے۔(گولڈ مائینس آف مدین ص182)

تخصیص کے ساتھ ملک انباط کے دس شہروں کے نام یوسیفورس (اینٹی کوئیٹی 14 باب ا بند 4) میں مذکور ہے۔لیکن یونانی تلفظ نے عربی رنگ و روغن ان کے چہروں سے بالکل اڑا دیا ہے وہ شہر یہ ہیں۔میدابیہ۔بنالو۔لیبس۔ترابسہ۔اغالہ۔اثوان۔صور۔اورون۔مریسہ۔رودہ۔لوسہ۔عروبہ۔ان کے علاوہ رقیم (پڑا) اور حجر مشہور شہر تھے۔

انباط کا دارالحکومت

انباط کا ملک جن حدود پر مشتمل تھا وہ حقیقت میں تین قدیم ممالک کا مجموعہ تھا ملک ثمود (وادی القریٰ جس کا دارالحکومت حجر تھا۔ملک مدین۔جس کا پایہ تخت خاص شہر مدین تھا۔اور ملک ادوم جس کی حکومت کا مرکز شہر رقیم تھا (پڑا) انباط کا پایہ تخت پہلے شہر رقیم تھا (پیڑا) جہاں اب تک ان کے آثار باقی ہیں۔لیکن پہلی صدی ق م میں جب رومیوں نے مصر وشام پر قبضہ کیا تو رفتہ رفتہ وہ پٹرا (رقیم) پر بھی قابض ہو گئے۔اسٹرابو (24ء) بیان کرتا ہے کہ اب (24ء) انباط اور شامی دونوں رومیوں کی رعایا ہیں (گولڈ مائینس آف مدین ص 182) اس مفتوحی سے مقصود پیڑا یعنی رقیم کی مفتوحی ہے۔ورنہ نفس حکومت تو 106ء تک باقی تھی پٹرا (رقیم) سے ہٹ کر انباط نے اب حجر کو اپنا مرکز قرار دیا تھا۔جو ملک ثمود میں واقع تھا اسی لئے قرآن میں ان کو اصحاب الحجر سے یاد کیا ہے (تفصیل آگے آتی ہے)

حجر جس صوبہ ملک میں واقع ہے۔عربوں کے ہاں اس کا نام وادی القریٰ ہے۔اس کے لفظی معنی آبادیوں کی وادی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ میدان عہد قدیم میں نہایت کثرت سے آباد تھا۔اس کی تصدیق اب معاصر مؤرخین کی روایتوں سے بھی ہوتی ہے۔ابھی ڈائیڈورس کا بیان گذر چکا ہے جو کہتا ہے کہ حدود ایلہ پر انباط کی بہت سی آبادیاں ہیں۔اور وہ نہایت کثرت سے آباد ہیں۔اسٹرابو بھی انباط کی نہایت گنجان آبادی کا ذکر کرتا ہے۔(کتاب مذکور ص184)

شاہان انباط

اشوری کتبہ کی شہادت کی بنا پر گو شاہان نبط کا ابتدائی سلسلہ 700 ق م سے شروع ہوتا ہے۔جبکہ ناتان۔شاہ انباط۔بادشاہ اسیریا۔اشور بانیپال کی خدمت میں نذر پیش کرتا ہے (تاریخ بابل راجرس ج2 ص276) لیکن یونانی تاریخ اور موجودہ نبطی اثار اور سکے 200 ق م سے پہلے کسی نبطی بادشاہ کا ذکر نہیں کرتے۔اس کے اسباب بھی واضح ہیں یونانیوں کو اس سے پہلے انباط سے سروکار نہ تھا۔اور نہ خود انباط

اس سے پہلے متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔

بہر حال تاریخ و آثار نے اب تک جو انکشاف حال کیا ہے اس کی اعانت سے اب تک دو سے (DASSAU) نام ایک فرنچ مستشرق نے ان بادشاہوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی ہے۔(فرنچ اشیا ٹک سوسائٹی جرنل 1904ء) یہ فہرست 169 ق م سے شروع ہو کر 106ء میں میں ختم ہو جاتی ہے۔اس میں ایک نام مالک اول کا اضافہ ہم خود یوسیفورس کے حوالے سے کرتے ہیں (قدامت یہود کتاب 12 باب 5 بند)

نمبر	نام بادشاہ	سال حکومت	
۱	حارث اول	169 ق م	مالک چہارم ۱۰۱ء ۱۰۶
۲	زید بابل	سنہ ۱۴۶ ق م	
۳	مالک اول	سنہ ق م	
۴	حارث ثانی	سنہ ۱۰۰ ق م سنہ ۹۶ ق م	
۵	عبادۂ اول	سنہ ۹۰ ق م	
۶	ریبال اول بن عبادۂ اول	سنہ ۸۷ ق م	
۷	حارث ثالث بن ریبال	سنہ ۸۷ ق م سنہ ۶۲ ق م	
۸	عبادہ ثانی بن حارث ثالث	سنہ ۶۱ ق م سنہ ۴۷ ق م	
۹	مالک دوم بن عبادہ ثانی	سنہ ۴۷ ق م سنہ ۳۰ ق م	
۱۰	عبادہ ثالث بن مالک دوم	۳۰ ق م ۹ ق م	
۱۱	حارث رابع بن مالک دوم	سنہ ۹ ق م سنہ ۴۰ ئ	
۱۲	خلدو (خالدہ) زوجہ حارث		
۱۳	شقیلہ زوجہ حارث		
۱۴	مالک سوم بن حارث	سنہ ۴۰ء سنہ ۷۵ئ	
۱۵	شقیلہ زوجہ مالک		
۱۶	ریبال ثانی بن مالک ثانی	سنہ ۷۵ء سنہ ۱۰۱ئ	
۱۷	جمیلہ زوجہ ریبال		

انباط کے تمدنی حالات

ہر شائستگی کی ابتداء عہد بداوت ہے۔ انباط کی ابتدائی زندگی عام قبائل عرب کی سادہ اور غیر مصنوع زندگی تھی۔ جن کی بدولت تنہا خزانہ مواشی تھی (خرقیال 60-7) لیکن جب مغربی قوموں نے انھیں اپنے تمدن و شائستگی کے بل پر شکست دینی چاہی تو ان کو بھی مجبوراً متمدن بننا پڑا۔ مؤرخین یونانی میں سے ڈائیڈورس (80 ق م) اور اسٹرابو (۲۴ء) نے انباط کے آداب معیشت و تمدن کو سب سے بہتر بیان کیا ہے۔

> وہ یعنی انباط کھلی ہوا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور نا قابل سکونت ہوا میں رہتے ہیں ان کے ملک میں نہ کوئی دریا ہے اور نہ چشمہ۔ جس سے حملہ آور دشمن فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کا قومی آئین یہ ہے کہ وہ نہ غلہ کی زراعت کریں اور نہ درخت لگائیں نہ شراب پئیں اور نہ گھر بنائیں۔ جو شخص اس کے خلاف کرتا ہے اس کو سزائے موت دی جاتی ہے۔
>
> بعض لوگ اونٹ کے گوشت پر بسر کرتے ہیں اور بعض بھیڑ اور بکری کے گوشت پر۔ صحرا میں بہت سے قبائل رہتے ہیں لیکن دولت میں انباط سب سے زیادہ ہیں اور اپنے ہمسایوں کا ان کو امتیاز حاصل ہے گو کہ ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کا ملک پانی سے بالکل خالی ہے۔ اپنے لئے پہاڑوں میں بڑے بڑے حوض کھود کر بناتے ہیں جن کا منہ باہر سے تنگ اور اندر چوڑا رہتا ہے اور ان کی لمبائی۔ 250 فیٹ تقریباً ہوتی ہے۔ ان حوضوں میں بارش کا پانی جمع کر کے ان کو چھپا دیتے ہیں اور ان پر کوئی نشانی بنا دیتے ہیں۔ جب سفر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جانوروں کو تین روز کا پانی پلاتے ہیں۔ انباط گوشت۔ دودھ اور بعض جنگلی سبزی کھاتے ہیں۔ جنگلی شہد (من) بھی ان کو ملتا ہے۔ جس کو پانی میں گھول کر پیتے ہیں۔ ان میں عرب کے غیر نبطی قبائل بھی شامل ہیں۔ جن میں سے بعض شامیوں کے ساتھ گھر میں رہنے کے علاوہ اور تمام عادات میں مماثل ہیں۔ (فارسٹر جغرافیہ عرب ج ا ص 226)

یہی مصنف پھر لکھتا ہے

> آگے بڑھ کر تم خلیج ایلانہ (عقبہ) میں داخل ہو گئے۔ جو ان عربوں کے بہت سے گاؤں سے محدود ہے۔ جن کو لوگ نباطینہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف ساحلی مقامات کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ بلکہ وہ اندرون ملک میں بھی دور تک پھیلے ہیں کیونکہ یہ زمین آباد اور نہایت شاداب ہے۔

زمانہ سابق میں اپنے قوانین انصاف کے مطابق اپنے گلوں اور جانوروں پر مطمئن رہ کر زندگی بسر کرتے تھے لیکن جب اسکندریہ (مصر) کے یونانی بادشاہوں نے خلیج کو تجارت کے لئے جہاز رانی کے قابل بنایا تو ان نبطیوں نے شکستہ جہازوں کے ملاحوں کو جمع کیا اور چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر بحری ڈاکہ زنی کرنے لگے۔ آخر کار ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے استحقاق کے مطابق ان کو سزا دی گئی (گولڈ مائنس 183)

اسٹرابو (24ء) جو ڈائیڈورس کی طرح انباط کا معاصر تھا۔ ان کے متعلق دلچسپ واقعات بیان کرتا ہے۔

شہر پیڑا (رقیم) جو عمدہ قوانین رکھتا ہے۔ اس پر شاہی خاندان میں سے ہمیشہ ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ وزیر ہمیشہ اس بادشاہ کے ساتھیوں میں سے ایک ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بھائی کہہ کر پکارتے ہیں انباط کفایت شعارانہ ذخیرہ ملکیت کے شائق ہیں۔ جماعت ان پر جرمانہ کرتی ہے جو اپنی دولت ضائع کرتے ہیں اور جو اپنی دولت بڑھاتا ہے اس کو انعام دیتی ہے۔ انباط کے پاس غلامی کم ہیں۔ اکثر ان کی خدمت ان کے متعلقین کرتے ہیں یا ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ یا ہر شخص اپنا نوکر آپ ہوتا ہے۔ یہ طریقہ بادشاہوں تک جاری ہے۔ جو جمہور کی رضامندی کے اس قدر آرزومند ہیں کہ وہ اپنی رعایا کی خدمت کرتے ہیں۔ بادشاہ کو انتظام ملکی کے متعلق بیانات لوگوں کو دینے ہوتے ہیں اور وہ اکثر بادشاہ کے ذاتی حالات وعادات بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔

لوگ غیر سرکاری صحبتوں میں تیرہ تیرہ آدمی مل کر کھاتے ہیں بادشاہ بھی لوگوں کو بڑی بڑی دعوتیں دیتا ہے اور شاہی عمارتوں یں جشن دعوت بپا کرتا ہے۔ غنا کرنے والے مہمانوں کی ہر جماعت میں دو مغنی رہتے ہیں۔ ہر مہمان کو گیارہ جام سے زیادہ شراب پینی ہوتی ہے۔ یہ جام سونے کے ہوتے ہیں۔ جبہ یا کرتہ پہننا یہ لوگ نہیں جانتے۔ کمر میں تہ بند لپیٹتے ہیں پاؤں میں کھڑاؤں پہنتے ہیں۔ مکانات عالیشان اور رنگین ہیں۔ آبادیوں میں شہر پناہیں نہیں ہوتیں۔ ملک کا بڑا حصہ سرسبز ہے تاہم وہاں زیتون نہیں۔ (جانوروں کی پیداوار کا بیان ہے)

گھوڑے نہیں ہوتے۔ ان کی بجائے اونٹ مصرف میں لائے جاتے ہیں۔ بعض اشیائے تجارتی کی درآمد بھی یہاں ہے اور بعض چیزیں خود ملک میں ہوتی ہیں۔ جیسے سونا چاندی اور بہت سے خوشبو مسالے۔ لیکن لوہا نہ تانبا۔ ارغوانی کپڑے۔ زعفرانی۔ عود۔

قسط۔ سنگتراشی۔ نقاشی اور تصویروں کی چیزیں مجسمے ملک میں نہیں پائے جاتے۔ انباط مردوں کی لاش کھاد کے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔ اسی لئے وہ بادشاہوں تک کی لاشوں کو بھی زمین میں دفن کرتے ہیں۔ مذہباً یہ سبائی دیوتا آفتاب کی پوجا کرتے ہیں۔ اس دیوتا کا ہیکل باقربا نگاہ۔ مکانات کی چھتوں پر بناتے ہیں اور اس پر شراب چڑھاتے ہیں اور اندر روز بخور جلاتے ہیں)۔ گولڈ مائینس ص228)

سیاسی حالات

انباط ہمیں سب سے پہلے 700 ق م میں سیاسی میدان میں نظر آتے ہیں۔ اسیریا اور بنی قیدار (برادران انباط) کے درمیان اس عہد میں جنگ برپا ہوتی ہے۔ بنی قیدار کا شیخ شکست کھا کر انباط کی چھوٹی سی ریاست میں پناہ لیتا ہے۔ پھر انباط اور بنی قیدار کی متحدہ فوج اسیریا کے مقابلہ میں آتی ہے۔ لیکن سوءِ قسمت سے ناتان شاہ انباط گرفتار ہوجاتا ہے ۲ (راجرس تاریخ بابل جلد 2 صفحہ 276)

بابل کے بعد ایران و یونان کی قوت دنیا کی تاریخ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انباط جہاں آباد تھے یہ وہ مقامات تھے جو اہل فارس اور یونانیوں کی دائمی جنگ کے طبعی راستے تھے۔ اس بنا پر دو فریق ان نبطی عربوں کی دوستی اور ہمدردی کے طالب تھے جن کی اعانت کے بغیر ان خشک و بے آب ریگستانوں کا طے کرنا ناممکن تھا۔

سکندر سے پہلے جو چوتھی صدی ق م کے اواسط میں تھا۔ عموماً اہل فارس کا پلہ یونانیوں سے بھاری تھا۔ اس بنا پر شمالی عرب (جو اس عہد بنی لحیان میں تھے) میدان جنگ میں اہل فارس کے دوش بدوش تھے۔ 332 ق م میں سکندر نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ اور عراق سے لے کر مصر و شام تک اس کی فتوحات کا جولا نگاہ بن گیا۔ ہندوستان سے واپس آ کر عرب کی فتح کا عزم تھا کہ وہ خود موت کے ہاتھ مفتوح ہوگیا۔ سکندر کے بعد ممالک کے مفتوحہ سکندر کے مختلف سرداروں میں منقسم ہوگئے۔ بطلیموس نے مصر و شام پر قبضہ کیا۔ انٹی گونس نے ایشیائے کوچک لیا۔ سلیوکوس (سلاقس) نے بابل و فارس و ترکستان پر استیلا حاصل کیا۔ یہ تینوں بادشاہیاں بیچ میں حدود عرب پر آ کر ملتی تھیں۔ انٹی گونس ایک بہادر تھا بلند حوصلہ۔ اس سے اپنی قسمت پر قناعت نہ ہوسکی۔ سب سے زرخیز اور قریب تر شام کا ملک تھا اس نے شام پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن درمیان میں نبطی حائل تھے۔ ان کو اپنا شریک بنانا ضروری تھا۔ لیکن وہ بطلیموس کے طرفدار پہلے ہی بن چکے تھے۔ نتیجہ جنگ و محاربہ تک پہنچ گیا۔

انٹی گونس نے 312 ق م میں اپنے ایک سردار اتھیناوس (ATHENAEUS) کی سرکردگی میں ایک مہم روانہ کی۔ جس نے گو بے خبری میں اپنے بیٹے ڈیمیٹر یوس (DEMMITRIUS) کی زیر قیادت ایک دوسری جماعت روانہ کی بے سروساماں نبطی عرب میدان میں مقابلہ نہ کرسکے اور قلعہ بند ہوگئے۔ یونانیوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس قید سے تنگ آ کر ایک دن ایک نبطی عرب نے ڈیمیٹر یوس کو ان الفاظ میں مخاطب کیا۔

اے بادشاہ ڈیمیٹر یوس تم کس غرض سے اور کس کے حکم سے مجھ سے لڑتے ہو۔ ہم صحرا

میں رہتے ہیں جہاں پانی ہے نہ غلہ ہے نہ شراب ہے اور نہ ضرورت کی کوئی چیز ہے۔
صرف ہم نے اپنی آزادی کی خاطر اس صحرا کی سکونت اختیار کی ہے اور تمام آسائش کی
چیزیں دوسروں کے لئے چھوڑ دی ہیں اور ہم نے اس حیوانی زندگی پر قناعت کی ہے۔
تمھیں ہم نے ستایا نہیں۔تم ہمیں کیوں ستاتے ہو۔خدا تم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔
ہمارے تحائف قبول کرو اور واپس جاؤ۔اور آج سے ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ورنہ یاد رکھو
کہ تم اس طرح زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتے۔تم کو پانی اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہوگی۔
اور تم ہمیں اپنے طرز زندگی کے بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔اگر تم نے قلعہ پر قبضہ بھی پالیا
تو تڑپتی لاشوں اور چند غمزدوں کے سوا جو کبھی دوسروں کے سامنے نہیں جھکا سکتے تم کچھ
نہیں پاؤ گے۔

ڈیمیٹر یوس اس گفتگو سے بے حد متاثر ہوا اور صلح قبول کر لی۔اس اچانک حملہ نے ان نبطی عربوں کو ایک منتظم سیاسی جمعیت کے قالب میں بدل جانے پر مجبور کر دیا۔چنانچہ اس انقلاب نے اس بدوی قوم کو وہ اہمیت بخشی کہ یونان عظمٰی اور رومۃ الکبرٰی اور خاندان اسرائیل کی گردنیں بھی اس کے آگے کبھی کبھی جھک جاتی تھیں۔آگے کے واقعات سمجھنے کے لئے یونان۔روم اور یہود کی تاریخ کے بعد بھی چند فقرے پڑھ لینے چاہئیں۔

انٹی گونس کی حوصلہ مندی کی اس شکست سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا اس نے رفتہ رفتہ بطلیموس سے شام سلیوکوس سے بابل (عراق) لڑ کر چھین لیا۔ناچار سلوکوس اور بطلیموس دونوں نے متحدہ طاقت سے ۳۰۱ ق م میں انٹی گونس کی مملکت مقبوضہ کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لئے۔اس تقسیم کی رو سے شام سلوکوس کو اور مصر و قبرص بطلیموس کو ملا۔مؤرخین عرب خاندان سلوکیوس کو سلوقیین اور خانوادۂ بطلیموس کو بظالمسہ یا بطالمہ (جمع بطلیموس) کہتے ہیں۔سلوقیین اور بطالمہ نے ان ممالک پر ایک مدت تک حکومت کی۔

شام میں بنی اسرائیل کی پہلی حکومت کو شاہان بابل نے برباد کر دیا۔بابل پر فارس کی حکومت نے جب غلبہ حاصل کیا تو ان کو 500 ق م میں پھر آزادی نصیب ہوئی اور فارس کے زیر اقتدار بنی اسرائیل کے ایک خاندان یہود نے جن سے یہود کی بنیاد پڑتی ہے۔ایک نیم آزاد حکومت پھر قائم کی۔لیکن 333 ق م میں سکندر نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا اس کے بعد مملکت یہودیہ (بیت المقدس) بطلیموس۔انٹی گونس اور آخر سلوقیین کی ماتحت ہو کر فنا ہوگئی۔دوسری صدی ق م میں جب یونانیوں کی ہر سال قوتیں نوجوان رومی خون سے ہر جگہ شکست کھا کر اس کے لئے جگہ خالی کر رہی تھیں۔یہودیہ کی ابدی الموت زندگی نے آخری بار بدن کو جنبش دی اور مکابئین کے نام رومیوں کے بل پر 168 ق م میں ایک حکومت یہودیہ میں قائم ہوئی۔

مکابئین اولاً مذہبی کاہن کی حیثیت رکھتے تھے۔لیکن آخر بادشاہ بن بیٹھے حصول سلطنت کیلئے ہمیشہ اس خاندان کے ارکان باہم نبرد آزما رہے۔رومی آہستہ آہستہ ان کی آزادی کرتے جاتے تھے۔پہلے یہودیہ سے ادوم میں حکومت منتقل کر دی اور اس کے بعد پاپی

رومی نے 24ء میں ہمیشہ کیلئے اس تماشہ گاہ پر پردہ ڈال دیا۔

یہ تاریخ تمام تر نبطی عربوں سے گونا گوں تعلق رکھتی ہے۔ ملک یہودی نباطیہ سے ہم سرحد تھا۔ دونوں صوبوں میں تقریباً ایک ہی قسم کے سیاسی حالات رونما ہوتے تھے۔ سلوقی خاندان ابھی صرف سو برس شام پر حکومت کرنے پایا تھا کہ 166 ق م میں۔ یہودا مکابی۔ بانی خاندان یہود نے بغاوت کی۔ یہود خود عرب گئے۔ اور نبطی عربوں سے شکست و اعانت کی درخواست کی کہ ہم لوگ متحدہ طاقت سے ان بیرونی قوموں کو نکال دیں (قدامت الیہود ج 2 کتاب 12 باب 8 فقرہ 3) سلوقیوں نے جب یہ دیکھا تو انھوں نے بھی ان عربوں کی طرف ہاتھ بڑھایا (فقرہ 4) اس وقت غالباً حارث اول۔ انباط کا بادشاہ تھا۔ جس کا زمانہ 169 ق م ہو۔

زید بابل نبطی کے عہد میں سکندر سلوقی اور ڈیمیٹر یوس سلوقی کے درمیان دعوے تخت کی بنا پر منازعت پیدا ہوئی۔ ڈیمیٹر یوس کے طرفدار نبط تھے اور یہود سکندر کے حامی تھے۔ سکندر نے شکست فاش کھائی اس وقت عرب کی آزاد زمین کے سوا اس کو کوئی مامن نظر نہ آیا۔ لیکن درحقیقت اس کی روح اس وقت حقیقی امن کی تلاش میں نکلی تھی۔ زید بابل نے سکندر کا سر کاٹ کر بطلیموس کے پاس بھیج دیا۔ (قدامت الیہود ج2-13-4-8)

یونانیوں کی اس کشمکش نے یہود و انباط میں منازعت پیدا کر دی۔ یانا تانی مکابی رئیس یہود۔ جس کی قوت یونانیوں کے ضعف سے نشوونما پا رہی تھی۔ اس نے اچانک نبطیوں پر حملہ کیا اور ان کو نقصان پہنچایا۔ (قدامت ج2-13-5-1)

حارث دوم کے زمانہ میں یونانیوں نے غزہ کے یہودیوں پر حملہ کیا۔ حارث اس وقت انباط کی قوت کا مالک تھا۔ اپنے عہد کا ممتاز بادشاہ تھا۔ اس نے یونانیوں سے اعانت کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عربوں کی کمک پہنچے یونانی خود خانگی منازعات میں مبتلا ہو گئے۔ (قد۔ج3-13-13-3)

حارث دوم کے بعد عبادۂ اول مملکت انباط پر تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں سکندر مکابی جو یہود کا ایک مجنوں رئیس تھا۔ انباط پر حملہ آور ہوا۔ اور گودہ جنگ میں نبطیوں کے ہاتھ سے بمشکل جانبر نہ ہو سکا۔ تاہم صوبہ مواب اور جلعبا د کے 12 شہر ان سے چھین لے گیا۔ (13-13-5 اور 14-1-4) لیکن یہود اس فتح سے خوش نہ ہوئے اور انہوں نے سکندر کو مجبور کیا کہ وہ مواب اور جلعبا د کے علاقے عرب کو واپس کر دے کہ وہ دشمنوں کے شریک نہ بن سکیں۔ (13-14-2)

حارث سوم (86 تا 62 ق م) حکومت انباط کا سلطان اعظم تھا۔ انطیاخوس۔ ڈیانیسوس سلوقی اس وقت ملک عرب پر حملہ آور ہوا۔ حارث کی فوج خالص عرب شجاعت کے ساتھ یونانیوں کے مقابل تھی۔ پہلے حملہ میں وہ پسپا ہو رہی تھی کہ دفعتاً حارث دس ہزار سواروں کے ساتھ میدان جنگ میں نمودار ہوا۔ انطیاخوس بہادری سے لڑتا رہا۔ اور عین اس وقت جبکہ جلوۂ فتح اس کے سامنے تھا۔ لڑائی میں کام آیا اس کے مرنے کے ساتھ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ حارث کے لئے اب یہاں سے دمشق تک جو سلوقیین کا پایہ تخت تھا کوئی روک نہ تھی۔ اور خود بطلیموس خاندان باہم خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ چنانچہ خود اہل دمشق کی دعوت پر حارث دمشق پہنچا اور سکندر اعظم کے جانشینوں (سلوکیوس) کا تخت اس کے پاؤں کے نیچے تھا (13-15-1)

پہلی صدی ق م کے اواسط میں اسکندر مکابی کے دو بیٹوں میں تخت یہودیہ کے لئے منازعت ہوئی ایک نے بھاگ کر حارث کے دامن میں پناہ لی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ تخت نشین کر دیا گیا تو جن بارہ نبطی شہروں پر اس کا باپ قابض ہو گیا تھا واپس کر دے گا (قدامت ج 2۔14۔1۔14) حارث پچاس ہزار سپاہ کے ساتھ رقیم (ٹپرا) سے نکلا۔ یہودیوں نے میدان میں شکست کھائی۔ اور یروشلم میں قلعہ بند ہو گئے۔ یروشلم کا محاصرہ کئے ہوئے حارث پڑا تھا کہ نو شباب رومیوں کی فوج سامنے سے نمودار ہوئی جس نے 200 ٹالنٹ (25 لاکھ روپے) پر یہودیوں سے جنگ خرید لی۔ ناچار حارث کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ (بحوالہ سابق باب 2 فقرہ 1۔2) اور اسی کے سپہ سالار سکاروس (SACARIUS) نے پہلی صدی ق م کے اواسط میں بار بار رقیم (ٹپرا) پر حملہ کیا۔ لیکن راستہ کی دشوار گذاری ہمیشہ کے لئے قلعہ ثابت ہوئی۔ ناچار سکاروس نے ادھر ادھر شہروں کو جلانا اور برباد کرنا شروع کر دیا۔ آخر 40 ٹالنٹ یعنی تقریباً 20 لاکھ روپے ایک ادومی سردار انٹی ٹپر کی دلالی سے اپنے وحشیانہ اعمال کی قیمت لے کر واپس گیا۔

یہ واپسی رومیوں کی تخئیل میں عظیم الشان فتح تھی اس کی یادگار میں ایک سکہ جاری کیا گیا۔ جس میں دکھایا گیا کہ حارث سرنگوں ہے۔ ایک ہاتھ میں اونٹ کی مہار اور دوسرے میں ایک خوشبودار درخت کی ٹہنی (جو ملک عرب سے شاید عبارت ہے) لئے کھڑا ہے۔ سکاروس کے بعد گبنیوس (GABINIEUS) اس کی جگہ پر آیا۔ اس نے یہودیہ رومیوں کی خیر خواہی کے معاوضہ میں انٹی ٹپر ادومی کے حوالہ کیا اور خود فتح انباط کے ارادہ سے نکلا اور کہتے ہیں کہ غالب آیا (برٹینیکا طبع یازدہم ج 24 ص 305)

عبادہ ثانی کے عہد کا کوئی واقعہ معلوم نہیں ہوا۔

مالک ثانی (47 تا 30 ق م) کا زمانہ بعض حیرت انگیز واقعات کا سلسلہ ہے حانٹی پٹر مر چکا تھا۔ اس کی بجائے ہیرود۔ یہودیہ کا رئیس تھا۔ روم میں سیزر اعظم (قیصر) کے قتل کا معاملہ درپیش تھا اور انٹیونی اپنے حریف (قاتلین مصر) پر غالب آ رہا تھا۔ مصر میں خاندان بطلیموس کی آخری شہزادی کلیوٹپرا تخت نشین تھی۔ ہیرود دروپیوں کی تھیلی دے کر رومیوں سے بادشاہ یہود کا لقب خریدنا چاہتا تھا اور اسی ضرورت سے مالک کے پاس جانا چاہا کہ اس سے کچھ رقم بطور قرض یا دوستانہ حاصل کرے۔ لیکن مالک نے ملاقات سے انکار کر دیا کہ فارس کی ہمسایہ حکومت اس کو پسند نہیں کرتی۔ ہیرود رنجیدہ ہو کر روم واپس گیا۔ (قد 14۔14۔انجا۔14۔1) لیکن عرب جن کی ضرورت ہر قدم پر ہمسایہ حکومتوں کو ہوتی ہے ان سے کب تک اعراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد ایک فوج کشی میں پانی کے لئے نبطی عربوں کی اعانت کی حاجت محسوس ہوئی۔ روم سے چل کر انٹونی اب مصر و شام کا فرمانروا تھا۔ عرب کو میدان میں مفتوح نہیں ہوئے تھے تاہم رومیوں کی سیاسی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے۔ انٹونی سب کچھ جو اس کا تھا کلوپٹرا کو نذر کر چکا تھا۔ وہی ان ممالک سے خراج وصول کرتی تھی۔ یہودیہ اس کے لئے تیار تھا۔ لیکن عرب نبط اس کی محکومی کے لئے تیار نہیں تھے شاہِ یہود کے توسط کے بعد بھی مالک خراج دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر الامر یہود نے رومیوں کی محبت اور کلوپٹرا کی ناز برداری میں عربوں پر حملہ شروع کیا۔ بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں طرفین سے ہزاروں آدمی کام آئے اور یہودی مؤرخ یوسیفورس کے مطابق اکثر عربوں کو شکست ہوتی رہی (قدامت 15 باب 4۔5۔6)

عبادہ ثالث (30 تا 9 ق م) گو ایک سست طبع اور ناکارہ تھا لیکن اس کا وزیر نہایت ہوشمند اور چالاک تھا۔ یونانی تلفظ میں اس کا نام سالیوس (SYLIEUS) تھا (اصل شاید۔ سائل یا سائیل ہو) سالیوس ہمیشہ اپنی دانشمندانہ سازشوں سے یہودیوں اور رومیوں کو زک دیتا رہا۔ (قدامت 16، 17، 6 و باب 9 محا، 1، 24، 6) 8 ق م میں۔ رومیوں کو جو فتح عرب کے خواب دیکھ رہے تھے۔ عرب کے بے آب صحرا میں جس طرح ان کی ہمت شکست دے کر واپس پھرا لیا۔ وہ اب تک ہر رومی اور یورپین مؤرخ کے قلم کے لئے سرمایہ غم و ندامت ہے۔ واقعہ کی تفصیل ''حمیر'' کے ذکر میں اس سے پہلے گذر چکی ہے۔

حارث رابع (9ء تا 40ء) حضرت یحییٰ بن زکریاؑ اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا معاصر تھا۔ اس کا پہلا نام انیس تھا۔ عبادہ کی وفات کے بعد جب یہ بادشاہ ہوا تو اپنے لئے شاہی نام حارث اختیار کیا۔

ہیروڈ۔ شاہ یہودیہ حارث کا داماد تھا۔ یہ شخص نہایت بدکار اور ستم دوست تھا۔ اپنے بھائی کے مرنے پر اپنی بھاوج سے جو اس کی علاتی بھتیجی بھی ہوتی تھی۔ شادی کرلی۔ حضرت یحییٰؑ ان دنوں پند و موعظت کے پیغمبرانہ اثر سے قلوب کو مسخر کر رہے تھے۔ ان کی محبوبیت یہودیہ میں جتنی ترقی کرتی جاتی تھی۔ ہیروڈ اسی قدر کانپتا جاتا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے ہیروڈ کو اس شادی پر ملامت کی۔ خون آشام بادشاہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ حضرت یحییٰؑ کا سر کاٹ کر منگوایا۔ ہیروڈ کی پہلی بی بی عرب اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ عرب کا بادشاہ۔ حارث اپنی اس خاندانی اہانت پر غصہ سے بے تاب ہوگیا۔ فوراً یہودیہ پر فوج کشی کی تیار کردی اور اس زور و شور سے حملہ آور ہوا کہ ہیروڈ تاب نہ لا سکا اور سخت ہزیمت اٹھا کر بھاگا۔ یہودی معتقد تھے کہ یہ شکست حضرت یحییٰؑ کے قتل کا پاداش عمل تھا (قدامت 18۔5) حارث سید ہاد مشق پر قابض ہوگیا۔ پولوس۔ سینٹ پال (St Pual) موجودہ عیسائیت کا بانی اسی حارث کے ہاتھ میں گرفتار ہوکر قید ہوا تھا۔ آخری ڈوری لٹکا کر اسی کے سہارے قید خانے سے نکل کر بھاگا۔ (نامہ پال بنام قرنتیوں 23212) رومی ہیروڈ کی مدد کے لئے آئے۔ لیکن اتفاقاً اسی اثنا میں 37ء میں خود قیصر مرگیا۔ حارث کئی برسوں تک دمشق پر قابض رہا۔

حارث کے بعد دولت انباط رومی اقتدار کے پردے میں بالکل چھپ گئی۔ گویا حارث کا وجود اس چراغ کا آخری سنبھالا تھا۔

انباط کے مٹنے کے بعد بہت سے عرب قبائل اندرون ملک سے خالی جگہ کو بھرنے کے لئے نکل آئے جن میں زیادہ مشہور آل غسان ہیں جو انباط کے ہم نسب تھے۔

تقریباً 530 برس کے بعد جب اسلام آیا تب بھی انباط دنیا سے معدوم نہ تھے۔ ملک شام میں ان کا پیشہ غلہ و روغن فروشی رہ گیا تھا (زرقانی ج ا صحیح بخاری و غزوہ تبوک) اوپر کے شہر۔ تدمر۔ معان۔ بصریٰ وغیرہ ال غسان کے ہاتھ میں۔ اور حجر۔ تیماء خیبر وغیرہ جو نبطیوں کے گھر اور قلعے تھے۔ ان سب پر یہود قابض تھے نبطیوں کی بقیہ آبادی قومی حیثیت کھوکر۔ یہودیوں۔ یونانیوں اور رومیوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ عہد اسلام میں ان اطراف میں جب عرب پھیلے تو کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکا۔ عربوں نے ہمیشہ ان کو ایک اجنبی قوم سمجھا اور یہ خود بھی اپنے کو نبطی کہتے تھے۔ انھیں میں حسان نبطی ہے۔ جو ہشام ابن عبدالملک کا درباری تھا۔ (ابن خلکان تذکرہ خالد القسری)

اصحاب الحجر

اس عظیم الشان قوم کا عروج وزوال ۔ حیات وموت ۔ زندگی وفنا ۔ ہم قوم عرب کے لئے کس قدر سبق آموز ہوسکتی ہے ۔ تعجب ہوتا اگر قرآن مجید اس عبرتناک تاریخ سے خالی ہوتا ۔

آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ انباط کے مرکز حکومت دور تھے ۔ رقیم (ٹپرا) متصل شام اور حجر (اجرا) اندرونِ عرب قرآن مجید نے ان کو اسی قریب تر شہر کے مالک کہہ کر پکارا ہے ۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ(٨٠) وَاٰتَيْنَاهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ(٨١) وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ(٨٢) فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ(٨٣) فَمَآ أَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

اہل حجر نے پیغمبروں کو جھٹلایا (یعنی گذشتہ اور معاصر پیغمبروں کی ہدایت قبول کیں) ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں ۔ ان سے منہ پھیرلیا ۔ یہ پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بناتے تھے ۔ جن میں امن وآرام کے ساتھ رہتے تھے ۔ ان کو عذاب نے صبح ہوتے ہی لے لیا پھر ان کے کارناموں نے ان کو کوئی فائدہ نہ بخشا ۔

تمام مفسرین نے اصحاب الحجر سے ثمود مراد لیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ثمود کا دارالحکومت بھی یہی شہر تھا ۔ لیکن قرآن مجید کا عام طرز ادا بتاتا ہے کہ اصحاب الحجر سے ثمود کے علاوہ ان کے بعد کی آبادی مراد ہے ۔ قرآن مجید نے ثمود کا 26 جگہ ذکر کیا ہے ۔ لیکن ہر جگہ ان کا نام لیا ہے ۔ اس اجمال کے ساتھ یعنی ''حجر والے'' کہہ کر کہیں نہیں بیان کیا ہے ۔

ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے ۔ ثمود کی تعمیر وسنگتراشی کا قرآن میں جہاں ذکر ہے ۔ وہاں مقام کا نام بھی بتا دیا ہے ۔ یعنی وادی القریٰ وثمود الذین جابوا لصخر بالواد '' ثمود جنھوں نے وادی القریٰ میں پتھر تراشے اور یہاں حجر والے کہہ کر ان کی تعمیر و سنگتراشی کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے اشارہ یہ ہے کہ ان کی سنگین عمارتیں حجر میں واقع تھیں ان کے نشان اور آثار اب تک موجود ہیں ۔ ان پر جو کتبات منقوش ہیں ان میں بانی اپنا نام نبطیو بتاتا ہے ۔ جس کو ہر نبطی خط وزبان کا عالم ہر وقت پڑھ کر تصدیق کرسکتا ہے ۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اصحاب الحجر انہیں انباط کا لقب تھا ۔ صحیح بخاری اور احادیث وسیر کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلعم تبوک کو تشریف لے جاتے ہوئے مقام حجر سے گذرے تھے ۔ اس موقع پر بھی اکثر روایتوں میں ثمود کا نام نہیں ۔ یہ فقرہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا ۔

لا تدخلوا مساکن الذین ظلموا انفسھم الا ان تکونوا باکین ان یصیبکم مثل ما اصابھم

ان اپنی جانوں پر آپ ظلم کرنے والوں کے گھروں میں روتے ہوئے چلو ایسا نہ ہو کہ جو مصیبت ان پر آئی تم پر بھی آئے ۔

یہ روایت امام بخاری نے باب غزوۂ تبوک ۔ تفسیر ۔ سورۂ حجر اور ثمود کے ذکر میں درج کی ہے ۔ اس میں ثمود کا مطلق نام نہیں ۔ ایک روایت میں بھی حدیث بزیادت الفاظ اس طرح مروی ہے ۔ ان الناس مع رسول اللہ نزلوا ارض ثمود الحجر ۔ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حجر ثمود کا بھی ملک تھا ۔ اور اس سے ہمیں انکار نہیں ۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ کم از کم 160 ق م 106ء تک انباط ان مقامات پر قابض تھے۔ اب ڈائیڈ درس اور پلینی کی شہادتوں کو باہم پیش نظر رکھو۔ ڈائیڈ درس (80 ق م) کہتا ہے۔

اوپر گذرتے ہوئے تم خلیج ایلہ (عقبہ) میں داخل ہو گئے۔ جس کی حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں۔ جن کو لوگ نبط کہتے ہیں۔ یہ نہ صرف ساحل کے بڑے حصہ ملک پر بلکہ اندرون ملک میں بھی وہ دور تک پھیل گئے ہیں۔ (دیکھو فصل ''انباط کا رقبۂ حکومت'')

مورخ پلینی 79ء اسی خلیج ایلہ کے ذکر میں کہتا ہے۔

خلیج کے اندرونی گوشے میں جہاں ایلانی لوگ بستے ہیں۔ جن کے سبب سے اس خلیج کا نام ایلہ ہوا (یہ تحقیق بالکل غلط ہے۔ بلکہ واقعہ برعکس ہے یعنی سکونت خلیج ایلہ کی خصوصیت سے ان کو ایلی کہتے ہیں) اور جو اگر (حجر) اپنے شاہی شہر میں بھی رہتے ہیں۔ (طلاے مدین۔ یعنی گولڈ مائینس آف مدین ص 312)

قرآن مجید نے ان کی سنگی عمارتوں کا ذکر کیا ہے گو ان کے آثار اب تک حجر۔ تیماء اور علاء وغیرہ میں موجود ہیں لیکن انباط کی معاصر تاریخ بھی اس کے ذکر سے خالی نہیں۔ اسٹرابو لکھتا ہے۔

مسلمان جغرافیہ نویسوں نے ان عمارتوں کو تیسری چوتھی صدی میں دیکھا تھا۔ اصطخری بیان کرتا ہے۔

الحجر قریته صغیرة قلیل السکان وهو من وادی القری علی یوم بین جبالٍ وبها کانت منازل ثمود و رأیت المساکن مثل بیوتنا فی اصنعاف الجبال (یاقوت۔ الحجر)

حجر وادی القریٰ سے ایک دن کی راہ پر پہاڑوں کے بیچ میں ایک کم آباد گاؤں ہے۔ یہیں ثمود کے گھر تھے ہم نے اپنے گھروں کے برابر ان گھروں کو پہاڑوں کے سلسلوں میں دیکھا ہے۔ (یاقوت الحجر)

حجر میں اب تک یہ عمارتیں موجود ہیں۔ ان میں اکثر مقبرے ہیں۔ جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان عمارتوں پر نبطی خط اور ارامی زبان میں مذہبی کتبے لکھے ہیں۔ ان میں انباط کے بتوں کے نام بھی ہیں۔ جن میں قیس۔ ذوالشریٰ۔ مناۃ۔ مشہور دیوتا ہیں۔ موجودہ عمارات میں ایک عمارت قصر البنت کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام مضمون عرب)

۱۲ قیدار ابن اسمٰعیلؑ

ملۃ ابیکم ابراھیم

قیدار۔حضرت اسماعیلؑ کا دوسرا بیٹا تھا۔شہرت اوراعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے ممتاز تھا۔لفظ قیدار کے عبری میں معنی۔سیاہی اورغم کے ہیں۔عربی میں بھی لفظ''کدر''و''کدورت''موجود ہے۔شاید حضرت اسماعیلؑ نے یہ نام باپ سے جدائی اورصحرانوردی کے غم کی یادگار میں رکھا ہو۔قیدار برنبا سے روایات تورات عرب حجاز میں آباد ہوا تھا۔فارسٹر صاحب جن کی موافقانہ شہادت نہایت مشکل سے میسر آسکتی ہے لکھتے ہیں۔

> اشعیاہ نبیؑ نے قیدار کے جس ملک کا اقرار وذکر کیا ہے۔اس کو ہر شخص جو جغرافیہ سے واقف ہے۔فوراً کہہ دے گا کہ وہ عرب کے صوبۂ حجاز کا صحیح نقشہ ہے۔جس میں مکہ اور مدینہ کے مشہور شہر واقع ہے۔عربوں کی قومی روایت بھی تاریخی رتبہ حاصل کرلیتی ہے۔جب ایک طرف اس کی تصدیق کتب مقدسہ سے بھی ملتی ہے۔جس سے قیدار کا اسی حصۂ ملک میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔اور دوسری طرف اریانوس۔بطلیموس اور پلینی کے بیان سے ملتی ہے۔جو کیدار(قیدار) قوم کی اسی صوبہ میں موجودگی کی غیر مشتبہ شہادت دیتے ہیں۔''(فارسٹر جغرافیہ عرب ج ا ص248(ملخصاً)

قیدار کی اہمیت اورعظمت کے لئے یہ دلائل کافی ہیں کہ اس کا نام تورات کے صفحات میں اسیریا کے کتبات میں اور یونان کے جغرافیات میں ہرجگہ موجود ہے۔لیکن اس سے بھی عظیم الشان عزت اس کو یہ حاصل ہے کہ وہ نورالٰہی جو آدمؑ و براہیمؑ کوودیعت ہوا تھا۔وہ اسماعیلؑ کے بیٹے قیدار کی پشت سے جلوہ افروز عالم ہوا۔یعنی پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔نسل قیدار کی شاخ عدنان سے پیدا ہوئے۔ایک قوم ہونے کی حیثیت سے قیدار کا نام سب سے پہلے 110 ق م میں حضرت داؤدؑ کی زبور میں نظر آتا ہے بنوقیدار اس زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے۔حضرت داؤدؑ شاہی سے پہلے بہت دنوں تک بنی قیدار کے خیموں میں رہے تھے(زبور(120-5)

100 ق م میں حضرت سلیمانؑ بھی اپنی غزل میں قیدار کے خیموں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں اور میں قیدار کے خیموں کی طرح سیاہ ہوں۔یہ سیاہ خیمہ کالے کملوں کے ہوتے تھے۔جواب تک بدوی عربوں کے لئے صحرا میں قصروکاشانہ ہیں۔خود مکہ آنحضرت صلعم سے چند پشت پیشتر صرف خیموں کا شہر تھا۔کوئی پتھر یا مٹی کی عمارت موجود نہ تھی۔

تحریری حیثیت سے دو برس کے بعد پھر قیدار کا نام اسیریا کے کتبات میں ملتا ہے۔ملک عرب کا نام ان کتبات میں عربی ہے۔اول زمیبی اور شمسی دوشاہزادیوں کا ذکر ہے۔زمیبی کی اصل شاید زتار اور شمسی کی حقیقت شمسیہ ہو۔ذیل کی عبارت میں ہم ان کتبات کا اقتباس ایک نہایت معتبر کتاب سے کرتے ہیں۔

ملکہ زمیبی (زبائی) تغلات پلاسر سوم۔شاہ اسیریا (745ق ۔737ق م) کی معاصر تھی تغلات پلاسر سوم۔ملکہ زمیبی سلطانہ عربی کو صرف مفتوحین اور باجگذاروں کی فہرست میں داخل کرتا ہے (ص121) اس کے بعد زمیبی ملکہ عربی کا دوبارہ ذکر آتا ہے۔زمیبی (نے 738ق م میں خراج ادا کیا تھا اس کے بعد سے پھر عرب سے خراج وصول نہیں ہوا۔ اب بجائے زمیبی کے ملکہ شمسی (شمسیہ) تخت نشین تھی۔شمسیہ نے خراج دینے سے انکار کر دیا۔اور اسیری سپاہ کو ناکامیاب واپس کر دیا۔ناچار وہ لڑنے پر مجبور کی گئی۔اسیری غالب آئے اور شمسیہ کے ملک کے اونٹ اور بیل لوٹ لیے گئے۔ایک اسیری سردار تحصیل خراج کے لئے متعین ہوا۔اس کا یہ اثر ہوا کہ سبا نے بھی شاہ اسیریا کو نذریں پیش کیں۔(ص130۔131)

713ق م میں۔سرجون ثانی شاہ اسیریا نے شمال عرب پر فوج کشی کی۔خیفہ ایک قبیلہ تھا جس نے سرتابی کی تھی۔ثمود۔عبادیدی (عبادی) اور مرسینی۔خیفہ کے طرفدار تھے۔ خیفہ انتہائی شمال میں موجودہ شہر مدینہ کے متصل اور بقیہ قبائل مکہ کی طرف سے نیچے آباد تھے۔یثعمر سبا اور شمسیہ ملکہ عرب نے۔جس کا ملک انتہائے شمال میں واقع ہوا تھا۔ نذریں پیش کیں۔ص164

اشور بیناپال شاہ اسیریا کے عہد حکومت (675 تا626ق م) میں یوقع بن ہزائیل عربی کا بادشاہ تھا اور عادیہ اس کی اس بادشاہ بیگم تھی۔یوقع (یوشع) نے اپنے حدود مملکت میں عرب ادوم۔بیرود۔بیت عموں حوران۔موآب۔سعیر داخل کر لئے تھے۔اور ان مقامات کی حدود پر عربوں کی چوکیاں مقرر کیں۔یوقع نے بنی قیدار کی ایک فوج دو عرب شیخ ابی تیغ اور اباموکے ماتحت روانہ کی۔بنی قیدار کی یہ فوج بابل سے پیچھے ہٹا دی گئی۔ اور کم از کم ان میں سے ایک شیخ گرفتار کر لیا گیا۔عرب جو اسیریا میں آباد تھے جبراً اس فوج کی شرکت سے باز رکھے گئے تھے۔اس لئے متوقع کمک عربوں کو نہ پہنچ سکی۔یوقع نبطیوں (نابینوں) کی چھوٹی سی ریاست میں پناہ گزیں ہوا۔یویط (UITA) یوتع کا بھتیجا اس پر قابض ہو گیا اور بہادری کے ساتھ اسیری قوت کی مدافعت کرتا رہا۔آخر اہل اسیریا کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گیا۔اور پابزنجیر اسیریا لایا گیا۔دروازہ پر نگہبان کتے کی طرح پاسبانی کی خدمت اس کے لئے مقرر ہوئی اسی سلسلہ میں قیدار کا ایک دوسرا سردار عم

العدی بھی قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ وہ فلسطین جا کر پناہ گزیں ہوا۔لیکن وہاں بھی اس کو امان نہیں ملی۔فلسطین فتح کر لیا گیا اور وہ قید کیا گیا ملکہ عادیہ بھی گرفتار ہوئی اور اب ابی یثع عربی کا بادشاہ ہوا۔ابی یثع کی مدت حکومت بہت کم معلوم ہوتی ہے اور یکا یک تخت سے عویط بن بیرود تاریخی سے غائب ہوجا تا ہے۔اور پھر ایک زمانہ کے بعد ''شیخ بنی قیدار'' کی صورت میں نظر آ تا ہے۔اب نتو (ناتان) رئیس انباط۔یوئتی۔رئیس عربی اور ابی تبع شیخ قیدار متفقاً اسیریا کے مقابلہ میں اٹھتے ہیں۔لیکن سوءقسمت سے ناتان گرفتار ہوجاتا ہے اور سب بچ کر نکل آتے ہیں۔(ص575۔576)

کتبات مذکورہ کے بیانات سے یہ صاف صاف نہیں واضح ہوتا کہ زمیبی۔شمسی (شمسیہ) خاندانِ بنی قیدار سے تھیں یا نہیں۔ لیکن آخری فقروں سے قیاس غالب یہ ہوتا ہے کہ یہ خاندان قیدار ہی تھا ان کتبات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نابت اور قیدار کی اولادیں اس وقت الگ الگ ہوگئی تھی اور شمالی عرب کے مختلف گوشوں میں ان کی متفرق ریاستیں قائم ہوچکی تھیں۔

اشعیاہ بنی۔جو تقریباً اسی زمانہ میں تھے۔یعنی آٹھویں صدی ق م میں وہ بیان کرتے ہیں کہ قیدار ایک شاندار اور بہادر قوم ہے (21۔16) گاؤں میں ان کی بہت سی آبادیاں ہیں (42۔11) بھیڑ۔بکری ان کی دولت ہے اسی کی وہ تجارت کرتے ہیں۔(60۔70)

قیدار کے متفرق رؤسا میں سے عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے قیدار کی نسل کی تمام شاخیں شجرۂ انساب میں اسی عدنان تک منتہی ہوتی ہیں۔چھٹی صدی ق م میں بنوخذ نذر (بخت نصر) (605۔562ق م) جس کو عرب بخت نصر کہتے ہیں۔اسیریا کے تخت پر جلوۂ نما ہوتا ہے اور عراق سے لے کر شام۔مصر اور عرب تک کی خاک اڑا دیتا ہے۔اہل عرب کا بیان ہے کہ اس وقت عربوں کا رئیس کل معد بن عدنان تھا۔

اشعیا (750ق م) خرقیال (597ق م) اور یرمیاہ (586ق م) نبیوں نے خانوادہ قیدار کو اس خونخوار اور سفاک بادشاہ کے خروج سے ہوشیار کیا ہے۔سب سے پہلے اشعیاہ بنی کہتے ہیں:

قیدار کا تمام جاہ وجلال مٹ جائے گا۔تیرانداز اور بہادر فرزندانِ قیدار کی تعداد گھٹ جائے گی۔(اشعیا 21۔16۔17)

باب 24۔آیت 11 میں ہے:

ان دیہاتوں میں آواز دوجن میں قیدار رہتے ہیں۔

باب 60 درس 7 میں ہے:

قیدار کے گلے اور نبایوط کی بھیڑیں اکٹھی کی جائیں گی۔

یرمیاہ بنی نے کہا (49۔28)

قیدار اور حضورا کی حکومتوں پر افسوس ہے۔ جن کو بابل کا بادشاہ بنوخذ نذر (بخت نصر) تباہ
کرے گا خدا کہتا ہے اٹھو اور قیدار کے پاس جاؤ اور اہلِ مشرق کو برباد کرو۔

اہل عرب نے روایت کی ہے کہ بخت نصر حملہ کرتا ہوا حجاز تک پہنچ گیا تھا۔ معد بن عدنان برسرِ مقابلہ ہوا۔ اور ایک غیر منفصل جنگ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یرمیاہ نبیؑ نے معدہ کو بچا لیا۔ اور شاید اس شکست سے بنوقیدار کو کچھ زیادہ صدمہ نہیں پہنچا۔ خرقیال نبیؑ جو بخت نصر کی ان جہاں سوزیوں کے زمانہ میں موجود تھے اور فلسطین سے قید ہو کر (597ق م) بابل گئے تھے۔ قیدار کے شہزادوں کا ذکر کرتے ہیں۔

عرب اور قیدار کے تمام شہزادوں نے بھیڑ بکری کا تجھ سے بیوپار کیا۔ (27-21)

ان انبیا کی معاصرانہ شہادتوں سے بنوقیدار کی معاشرت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خیموں اور گاؤں میں آباد تھے۔ بہادر اور شجاع تھے۔ قبائل کے سردار تھے۔ بدویانہ جاہ وجلال اور شان وشکوہ ان کو حاصل تھا۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اور بعینہ یہی نقشہ ان کا زمانہ اسلام تک موجود تھا۔ (ملخص از کتاب ارض القرآن جلد دوم۔ تذکرہ انباط وقیدار)

مشرقی مؤرخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ عدنان کے دو بیٹے تھے۔ معد اور عِک۔ عِک کی نسبت وہ صرف اتنا ہی لکھتے ہیں کہ وہ علاقہ جات یمن کی طرف جا کر سکونت پذیر ہوا۔ باقی حالات پر پردہ ہے۔ لیکن زمانہ حال کی تحقیقات علم القدامت کے افادات۔ خصوصاً ان کتبوں کی عبارات سے۔ جو علاقہ حضرت موت کے مقام حصن غراب میں پائے گئے ہیں اور جن کو مسٹر فارسٹر قوم عاد کے اخبار وآثار سے شمار کرتے ہیں۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ عِک نے کچھ عرصہ تک اسی علاقہ میں شاہی کی تھی۔ مذکور الصدور کتبوں کو حضرموت کے علاقہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہازی افسروں نے 1834ء میں پایا تھا۔ ان کتبوں کا پورا بیان مع نقشوں کے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل جلد سوم میں مندرج ہے۔ مسٹر فارسٹر نے اس کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عِک وہاں کا حاکم تھا۔

معد۔ عدنان کے بعد قبائل عرب کے سردار اور حکومت معد سے تعلق رکھتی تھی۔ معد اور حضرت یرمیاہ اس وقت کے پیغمبرؑ زمانہ دونوں ہم عصر تھے۔ اور ان دونوں میں باہمانہ مراسم اتحاد قائم تھے۔ مؤرخ مسعودی نے مروج الذہب میں صرف اتنا لکھا ہے۔ وقد کان لا رمیا معہ معد ابن عدنان اخبار یطول ذکرھا۔ حضرت ارمیا کے ساتھ معد ابن عدنان رہتے تھے اور یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ تاریخوں سے مسعودی کے اس مجمل بیان اور معذرت کی حقیقت اس طرح پائی جاتی ہے۔

معد ابن عدنان اور حضرت ارمیاہ کے حالات اور باہمانہ تعلقات جو گذرے ہیں وہ حقیقتاً بہت طول طویل ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بخت نصر نے حملہ کیا اور عرب میں بنی عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور شہر مکہ کو بالکل لوٹ لیا اور وہاں کے سینکڑوں باشندوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ تو اس وقت خدا تعالیٰ نے معد ابن عدنان کی جان کو بال بال بچا لیا۔ حضرت ارمیاہ اور ان کے وصی و جانشین برخیا (کاتب الوحی) کو معد بن عدنان کی حمایت میں بھیج دیا۔ یہ دونوں حضرات مکہ میں آئے اور عدنان کو بھی اپنے ساتھ جران یا جیرون میں۔ جو علاقہ شام میں ہے لے گئے۔ اور ان کو ایک معتدبہ زمانہ تک بحفاظت وآرام رکھا۔ وائلہ۔ ملقب بہ ابن کلیب ابن ربیعہ

بھی معد ابن عدنان کی اولاد میں سے تھا۔ عرب کا بادشاہ ہوا۔ اور یمن والوں سے چند لڑائیاں لڑیں۔ زہیر ابن خذیمہ اور قیس ابن رہبر بھی باری باری سے حجاز پر حکمرانی کرتے رہے اور یہ سب سلاطین صحیح طور پر معد ابن عدنان کی اولاد میں تھے۔

مگر بات یہ ہے کہ ان متذکرہ بالا۔ عدنانی سلسلہ حکمرانی کا زمانہ حکومت صحت کے ساتھ قائم کرنا اور بتلانا سخت دشوار ہے اور مؤرخین حقیقتاً ان حکومتوں کا یقینی طور پر ہمیں کوئی خاص زمانہ بتلانے سے بالکل مجبور ہیں۔ کیونکہ ان کی معلومات کا کوئی قوی اور معتبر ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں۔ لیکن غور و خیال کرنے کے بعد ہم اتنا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان اسماعیلی الاصل فرمانروایان عرب کا زمانہ حکومت اسی وقت ہوگا۔ جب یمن کی سلطنتیں اور دیگر ہمسایہ حکومتیں اپنے عروج وارتقا کے زمانہ کو تمام کر کے اضمحلال اور ادبار کی حالتوں میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ (خطبات احمدیہ 564)

معد ابن عدنان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام نزار تھا۔ نزار کے پانچ بیٹے تھے۔ پانچوں بیٹوں سے پانچ مشہور شاخیں قائم ہوئیں۔ انمار (۱)۔ ایاد (۲)۔ ربیعہ (۳)۔ قضاعہ (۴)۔ مضر (۵) عرب کے تمام قیداری قبائل انھیں کے فروع ہیں۔ میلادِ مسیحؑ کے پس وپیش زمانہ میں۔ طولاً یہ یمن سے شام تک اور عرضاً حجاز و نجد سے بحرین و عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور زمانہ اسلام تک ان کا یہی نقشہ تھا۔

یہ پانچوں شاخیں پھر چھوٹے چھوٹے مختلف خاندانوں پر منقسم ہوگئیں۔ ان کا مجموعی نام اپنے اپنے مورث اعلیٰ کی نسبت سے۔ بنو عدنان۔ بنو معد اور بنو نزار قائم ہوا۔ نزار کے پانچ خاندانوں میں سے۔ انمار اور ایاد نے کوئی بڑی وقعت حاصل نہیں کی۔ ربیعہ۔ قضاعہ اور مضر نے کثرت تعداد۔ دنیاوی اعزاز اور سیاسی اقتدار میں بڑی ناموری حاصل کی اور حجاز و نجد و عراق میں ان کی عظیم الشان حکومتیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں بنو عبدالقیس کے بحرین میں۔ بکر و تغلب اور کندہ کے نجد میں اور آل منذر کے عراق و حیرہ میں نظام حکمرانی جاری ہوئے۔

قبیلہ قریش

سلسلہ نسب مضر کی شاخ متعدد اور وسیع خاندانوں میں منقسم ہوگئی۔ جن میں سے ایک قریش کا خاندان ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔
(۱) فہر ابن مالک (۲) ابن نضر (۳) ابن کنانہ (۴) ابن خزیمہ (۵) ابن مدرکہ (۶) ابن الیاس (۷) ابن مضر (۸) ابن نزار (۹) ابن معد (۱۰) ابن عدنان۔

عدنان تک سلسلہ نسب حرف بحرف صحیح ہے اور نا قابل شک۔ صحیح روایات سے ثابت ہے۔ احادیث صحیح میں مروی ہے۔ اشعار عرب میں مذکور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ نسب بھی انھیں واسطوں سے عدنان تک پہنچتا ہے۔

وجہ تسمیہ قریش

فہر کا لقب قریش تھا۔ اس بنا پر اس کی نسل نے "قریش" اپنا خاندانی علم قرار دیا لفظ قریش کے عربی میں متعدد معنی ہیں۔ اس کا ایک ماخذ "قریش"، و"تقریش" ہے۔ جس کے معنی اکتساب و تحصیل ہے۔ خیال ہے کہ چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت ہے۔ اس لئے

قریش کے نام سے موسوم ہے۔ (مؤرخین و محققین عرب اس استخراج اور استقاق کو ذکر نہیں کرتے اور نہ تقرش کے معنی تحصیل و اکتساب کے بتلاتے ہیں۔ بلکہ تقرش سے تجمیع و اجماع کے مفہوم لیتے ہیں۔ جیسا کہ بہت جلد سلسلہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے) قریش ایک دریائی درندہ جانور کا بھی نام ہے جو دریائی جانوروں کا شکار کرتا ہے۔ فہر نے اپنے استیلاء و قوت کے اظہار کے لئے یہ لقب اختیار کیا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اسی دوسری تاویل کو اختیار کیا ہے۔

مستشرقین یورپ نے جن کو ہماری تاریخ سے خودغرضانہ محبت ہے۔ اسی دوسری رائے کو پسند کیا ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ وہ روایتاً صحیح تر ہے بلکہ اس لئے کہ توٹمزم (طوطمیت) کے ثبوت کے لئے ایک سند ہاتھ لگتی ہے۔ حالانکہ اس کی تردید کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے نام کی نہ پوجا ہوتی تھی اور نہ اس نام کا کوئی دیوتا تھا۔

قریش کی شاخیں

قریش بھی کوئی ایک قبیلہ نہ تھا۔ چھوٹے بڑے دس مختلف خاندانوں پر منقسم تھا۔ (۱) ہاشم (۲) نوفل (۳) عبدالدار (۴) اسد (۵) تیم (۶) مخزوم (۷) عدی (۸) جمح (۹) سہم (۱۰) امیہ۔ ان کا سلسلہ نسب حسب ذیل ہے:

سب سے پہلے قریش کون کہلایا

معد ابن عدنان کے بعد اس خاندان میں مدت تک کوئی شخص قابل الذکر نہیں گذرا۔ ان سے آئندہ چودھویں پشت میں خزیمہ بن مدرکہ ایک ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جس کے بیٹے زہیر نے حجاز میں حکومت کی اور اس کے بعد اس کے بیٹے قیس نے بھی حکمرانی کی۔ مگر افسوس کہ یہ دونوں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شجرہ نسب میں داخل نہیں ہیں۔ اس لئے ہم نے ان کے تفحص حالات کی زیادہ فکر نہیں کی۔

خزیمہ کی ایک پشت بعد نضر کے وقت سے اس سلسلہ کے کسی قدر مسلسل حالات و واقعات تاریخوں میں پائے جاتے ہیں۔ عربی۔ فارسی۔ اردو اور انگریزی کے قدیم و جدید مؤرخین و محققین نے اس سلسلہ کے حالات کو نضر ابن کنانہ بن خزیمہ کے عہد سے ایک سلسلہ اور ترتیب کے ساتھ لکھا ہے۔ اکثر محققین کا اسی بنا پر یہ نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادہ میں پہلا شخص جو قریش کہلایا وہ نضر ابن کنانہ تھا۔ بعض فہر ابن مالک ابن نضر (نضر کے پوتے) کو اول قریش بتلاتے ہیں۔ حافظ سراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں۔

اما قریش فالاصح فہر جماعہا والا کثرون النضر

قریش۔ صحیح یہ ہے کہ وہ فہر (بن مالک) تھا۔ جس نے ان کو جمع کیا اور اکثروں نے نضر کو بتلایا ہے۔

اس شعر قدیم عرب سے فہر کی صحت تخصیص تو ضرور معلوم ہوئی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ نضر کا شمول بھی اس کے تسمیہ میں ظاہر ہو گیا قول اول کے مطابق ممکن ہو کہ قریش کی خصوصیت نضر ہی کے وقت سے پیدا ہوئی ہو۔ مگر اس نے اس خصوصیت اور اس کی شہرت کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ لیکن اس کی دوسری ہی پشت میں اس کے پوتے فہر ابن مالک نے اس کی شہرت کا خاص اہتمام کیا اور تمام بنی نضر کو جمع

کر کے ان کا قریشی ہونا بتلایا۔

نضر اور فہر پر موقوف نہیں۔ان سے دو تین پشت بعد قصٰی ابن کلاب کی نسبت بھی اکثر مؤرخین کی رائے ہے کہ پہلے یہی شخص قریش کے لقب سے مشہور ہوا۔کیونکہ قریش کے قومی وجود۔آثار اور اقتدار کا قیام اور ان کا اجماع اسی شخص کے وقت سے اور اسی کے اہتمام و انتظام سے قائم ہوا ہے۔اور حقیقتاً تمام مشاہد۔قرائن اور دلائل سے یہی وہ شخص تاریخوں میں پایا جاتا ہے جس نے قریشیوں کو عربوں کے قبائل و اقوام سے ایک جدا گانہ اور مشہور زمانہ قوم بنایا۔اور پھر ایسے اعزاز و امتیاز کے ساتھ کہ کچھ اہل عرب ہی نے اس کے اس قومی القاب و نام کو تسلیم نہیں کیا۔بلکہ غیر قوموں اور دوسرے قبیلوں نے بھی۔ان اوصاف و خصائص کے اعتبار سے نضر ابن کنانہ اصل قریش اور اول قریش کہلانے کا اتنا مستحق ہوسکتا ہے اور نہ فہر ابن مالک ابن سعد نے طبقات میں اپنا یہی نظریہ قائم کیا ہے۔اس کے ثبوت میں وہ حسب ذیل مشاہد پیش کرتے ہیں۔

قال حذافه بن غانم العدوی لا بی لهب بن عبد مناف ابو کم قطی کان یدعی مجمعا به به جمع الله القبائل من فهر

حذافہ بن غانم العدوی نے ابوالہب ابن عبد مناف کی تعریف میں کہا کہ تمہارے باپ قصٰی مجمع ہیں۔اس لئے کہ خدا نے قبائل بنوفہر کو اسی کے وقت میں جمع فرمایا ہے اس کے بعد ابن سعد لکھتے ہیں۔

فدعی قطی مجمعا یجمعه قریشا و یقصی سمیت قریش قریشا و کان یقال لهم قبل ذلك بنو النضر

قصی کا لقب مجمع (جمع کنندہ) قرار پایا۔اس وجہ سے کہ ان کے وقت میں قریش کا اجماع (من حیث القوم) واقع ہوا۔قصٰی ہی کے وقت سے قریش کا لقب قریش ہوا۔اس سے پہلے وہ لوگ بنونضر کہلاتے تھے۔

ایک دوسری شہادت پیش کرتے ہیں۔

عن سعید ابن محمد ابن عبد الملك ابن مروان سئل محمد ابن جبیر متی سمیت قریش قریشا قال حین احتمعت الی الحرم من تفرقها فذلك التجمع ترش فقال عبد الملك ما سمعت هذا ولكن سمعت ان قصیا كان یقال له القریشی ولم تسم قریش قبله

سعید ابن محمد کا بیان ہے کہ محمد ابن جبیر سے عبدالملک ابن مروان نے پوچھا کہ کس وقت میں قریش کا لقب

قریش قائم ہوا محمد نے جواب دیا اس وقت سے جب انھوں نے اپنی مدت کے اختلاف کے بعد آپس میں پھر اتفاق اختیار کیا۔ کیونکہ تقرش کے لغوی معنی تجمع کے ہیں۔ عبدالملک نے کہا کہ میں نے آج تک یہ نہیں سنا تھا۔ لیکن میں نے یہ سنا تھا کہ قصٰی کا نام قریش پڑا اور اس سے قبل اس قبیلہ کا نام قریش نہیں تھا۔

قصٰی کے اول قریش ہونے کی تیسری شہادت یہ ہے۔

عن عبد الرحمان ابن عوف قال لما نزل قطی الحرم وغلب علیه فعل افعالا جمیلة فقیل له القرشی فهو اول من سمی به (طبقات ج۱ ص 40)

عبدالرحمن ابن عوف کا قول ہے کہ جب قصٰی مکہ میں آئے اور ان کو غلبہ حاصل ہو گیا اور ان سے افعال حسنہ ظاہر ہوئے تو ان کا لقب قریش مقرر ہوا اور وہ پہلے شخص ہیں جو اس لقب سے موسوم ہوئے۔

عیسائی بلا کے متعصب ہیں۔ ارض القرآن کے حوالہ سے اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وہ بنو اسماعیل میں ٹوٹو نزم (طموطمیت) ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سے بنو اسماعیل کی۔ جو اسلام کی اصل میں۔ ایک گونہ ذلت منظور ہے (مارگیولوس۔ حیات محمد) فاضل معاصر صاحب ارض القرآن نے ایک (دھیما سا جواب بھی دے دیا ہے اور بتلا دیا ہے کہ اگر قریش کے لغوی معنی ''جانور درندہ دریا'' کے سبب سے یہ خیال پیدا کیا ہے۔ تاہم خلاف واقع ہے۔ کیونکہ قریش میں کسی وقت جانور پرستی (طموطمیت) ثابت نہیں۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر مخالفین اسلام کو اسی وجہ تسمیہ کی خصوصیت پر اصرار ہے۔ جس کا قدیم وجدید عربی تاریخوں میں کہیں نشان نہیں ملتا۔ تو ہم ان سے استفسار کرتے ہیں کہ عرب کے ان قبائل نے ایام جاہلیت میں جانوروں پر اپنے نام رکھ کر اپنی طوطمیت (جانور پرستی) کا اظہار کیا تھا۔ مگر آپ حضرات تو اس چکا چوند والی روشنی اور تہذیب کے زمانے میں بھی۔ مسٹر اولف (بھیڑیا) مسٹر پیکاک (مور) مسٹر پیرٹ (طوطا) مسٹر ڈکسن (بطخ کا بچہ) وغیرہ امثالہم نام رکھ کر آج تک اپنے ٹوٹو یزم کا پورا ثبوت پہنچا رہے ہیں۔

تسمیہ قریش کی اولیت کی نسبت ہم نے ابن سعد کی شہادتیں جو اوپر پیش کی ہیں۔ ان کو اور ان سے پہلے جو اقوال لکھے گئے ہیں۔ ان کو ایک جگہ جمع کر کے ایک تحقیق طلب شخص با آسانی حقیقت حال کو سمجھ کر اپنا یوں اطمینان کر لے گا کہ اہل عرب (بنو اسماعیل) میں قبائل و عشائر کو ایک خاص قوم بنانے اور اس لئے ایک خاص امتیازی نام سے شہرت دیئے جانے کا خیال سب سے پہلے نضر ابن کنانہ کو پیدا ہوا۔ اور اس نے اس بنا پر اپنے قبیلہ اور عشیرے والوں کو جتنے بھی اس وقت جمع ہو سکے۔ پہلے اسی شخص نے اکھٹا کیا۔ اور اس تجمیع کی رو سے وہ قریش کہلایا۔ اس کے بعد مالک بن نضر نے اس امر کی طرف توجہ نہیں کی۔ مالک کے بیٹے فہر نے پھر اس خیال کو زندہ کیا۔ اور قومی مجموعہ کی ترتیب دی۔ مگر وہ بھی خاطر خواہ کامیاب نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ غیر قبائل پر حاکمانہ غلبہ نہ نضر ہی کو حاصل ہو سکا اور نہ فہر کو۔ لیکن کسی کا ریاض کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی۔ کوشش موقوف ہو جاتی تھی۔ ارادہ اور نیت تو دل سے مٹتا نہیں تھا۔ اس اصول کی بنا پر قریش کی ترتیب قومیت کی نسبت فہر ابن مالک کی سعی ومحنت بھی ایک حد تک عرب کے جریدہ میں یادگار رہ گئی۔ اور مؤرخین اخبار و محققین انساب نے ان کو

بھی موجدانِ تسمیہ قریش کے ذیل میں تسلیم کر لیا۔

مگر تاریخ وانساب کی کامل اور پر غور ورق گردانی کے بعد محقق ہو جاتا ہے کہ ان تمام کوششوں کی تکمیل قصیٰ ابن کلاب کے زمانہ میں ہوئی۔اور قریش کے ان تمام مجوزہ قومی اصلاح واتحاد کی بنیاد کا تکملہ اسی شخص کی ذات خاص سے ہوا۔اور قبیلہ قریش کی قومی یکجہتی۔ان کا خاندانی وقار واقتدار اور حکومت واثار غرض سب کچھ اسی کے زمانہ میں قائم ہوئے۔اور پھر ایسے استقرار واستحکام کے ساتھ کہ ظہور اسلام تک حکومت حجاز اور امارت کعبہ اسی خانوادہ میں برقرار رہی۔جیسا کہ مفصلہ ذیل سلسلہ بیان سے ظاہر ہے۔

قصیٰ ابن کلاب سے پہلے تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے حالات

قبل اس کے کہ ہم خانوادۂ ابراہیمیؑ کے اس جلیل القدر اور نام آور بزرگ کے تاریخی حالات شروع کریں مناسبت مقام اور سلسلہ کلام قائم رکھنے کی ضرورت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے متعلق وہ حالات وواقعات جن کو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کے وقت تک لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔بطور اجمال بیان کر کے قصیٰ ابن کلاب تک اس کا سلسلہ پورا اور تمام کر دیں۔

یہاں تک اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے نابت ابن اسماعیل پر امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کے منصب تفویض ہوئے۔مگر جیسا کہ علامہ ارزقی اور قریب قریب تمام مؤرخین ومحققین نے لکھا ہے یہ تمام اختیارات قرابت قریبہ کی وجہ سے بنی جرہم کے دست اقتدار میں دے دیے گئے۔علامہ ارزقی کی عبارت یہ ہے:

و ترك (اسماعيل) ولدا من رحلة بنت مضاض بن عمرو الجزهمي فقام مضاض امر ولدا اسماعيل و كفلهم لانه بنو ابنته فلم يزل امرجرهم يعظم بمكه و يستفحل حتى ولو البيت و كانوا اولاته و حجابه ولاة الا حكام بمكة

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رعلہ بنت مضاض بن عمر جرہمی کے بطن سے اولاد عقب چھوڑی۔مضاض نے وفات اسماعیلؑ کے بعد ان کی اولاد کو اپنے ساتھ رکھا اور ان کی کفالت کی کیونکہ وہ سب ان کے حقیقی نواسے ہوتے تھے۔اسی وقت سے بنی جرہم کی مکہ میں عظمت قائم ہوگئی۔جہاں تک تولیت خانہ کعبہ، خدمت حجاب اور شہر مکہ کی امارت وحکومت بھی ان کے قبضہ واختیار میں آ گئی۔

علامہ ارزقی نے خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کی امارت کے متعلق اتنے ہی بیان پر اکتفا فرمائی۔مگر ہم اس کو کسی قدر زیادہ تفصیل سے لکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔تاریخ طبری، ابن اثیر، زرقانی کے مفصلہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹوں میں نابت سب سے بڑے تھے۔اپنے پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اپنے آبائی منصب پر فائز ہوئے۔قبیلہ جرہم جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجازت سے مکہ میں آباد ہوا تھا۔نابت اور ان کے تمام معاملات کا نگران ہوا۔اس

لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے رعلہ بنت مضاض بن عمر جرہمی سے شادی کر لی تھی اور تمام بنو اسماعیل انہیں کی اولاد تھے۔ اس قرابت قریبہ کی رو سے قبیلہ جرہم نابت اور تمام بنو اسماعیل کا ولی اور قریب تر خیر خواہ مقرر ہوا۔ اور مضاض بن عمر رئیس جرہم کو اسی ذریعہ سے تولیت کعبہ اور امارت مکہ حاصل ہوئی۔

مکہ میں اس وقت دو قبیلے آباد تھے۔ ایک تو بنی جرہم۔ دوسرے بنی قطورہ (عمالیق) بنی قطورہ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری بی بی کی اولاد تھے۔ جو یمن سے آ کر مکہ میں بس گئے تھے۔ اس وقت مضاض بن عمر قبیلہ جرہم کے رئیس تھے اور سمیدع بنی قطورہ کا امیر۔ مکہ کے حصہ اعلیٰ میں جرہم مع بنو اسماعیل آباد تھے۔ اور وہاں کی حکومت بنی جرہم سے متعلق تھی۔ شہر کے حصہ پائین میں بنی قطورہ بستے تھے اور وہاں کی امارت ان سے تعلق رکھتی تھی۔ حصول ترجیح اور تفضیل کی بنا پر ان دونوں مختلف قبائل میں بڑی بڑی خونریزیاں واقع ہوئیں اور بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ مضاض نے سمیدع کو قتل کر ڈالا اور اس کے قبیلہ کو سخت شکست پہنچائی اور ہمیشہ کے لیے ایسا کمزور کر دیا کہ پھر انہوں نے جرہموں کے مقابلہ میں سر نہ اٹھایا۔ اس فتح یابی کے بعد مضاض ابن عمر جرہمی تمام مکہ کا امیر اور حاکم تسلیم کر لیا گیا اور خانہ کعبہ کی تمام خدمات و اختیارات اس کے قبضہ اقتدار میں پہلے سے تھے ہی۔

مضاض کے بعد اس کی اولاد میں مدت تک نسلاً بعد نسلاً امارت کعبہ اور حکومت مکہ کے تمام اختیارات باقی اور قائم رہے اور بنو اسماعیل کچھ تو قرابت قریبہ اور زیادہ تر اپنے مال اور قومی ضعف اور اضمحلال کی وجہ سے اپنے موروثی اختیار و اقتدار کے واپس لینے کے لیے جرہمیوں سے برسر مقابلہ نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ بنی جرہم کے اطوار و رفتار میں بمقابلہ قدیم روش اور حسن سلوک کے بہت بڑا اختلاف اور فرق آ گیا۔ ان میں ریاست کی شان اور امارت کی تمکنت آ گئی اور ان کی موجودہ شاہانہ سطوت اور امیرانہ شوکت بنو اسماعیل کے ساتھ قرابت مندانہ اور عزیز دارانہ محبت ہمدردی کی جگہ بیدردی اور نفرت کا اظہار کرنے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو اسماعیل اور بنی نابت کے کثیر التعداد قبائل و عشائر مختلف و عائر مختلف اقطاع و حصص ملکی میں جلاوطن ہو ہو کر بروبانہ زندگی بسر کرنے لگے جیسا کہ تاریخ آل نابت کی تفصیل میں ہم اوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں۔ بنو اسماعیل و بنو نابت کے معدودے چند قبائل وہیں رہ گئے۔

بنو جرہم کے ظلم و تعدی کی خبریں جب تمام دنیا میں عالم گیر ہوئیں تو آس پاس کے تمام علاقوں کے قبائل ان کے خلاف برانگیختہ ہو گئے۔ یمن کے قبیلہ بنی قحطان کی ایک شاخ جو بنی خزاعہ مشہور تھی بنی جرہم پر حملہ آور ہوئی اور ان کو شکست دے کر تمام شہر اور اس کے حوالی پر قابض ہو گئی۔

بنی جرہم نے بنی خزاعہ سے شکست پا کر مکہ سے نکل جانے کے وقت یہ حرکت کی کہ عمرا ابن حارث جو اس وقت بنی جرہم کا رئیس تھا اس نے اپنی قوم و قبیلہ کی صلاح و مشورت سے حجر الاسود کو اس کے مقام سے اوکھاڑ لیا اور ان دونوں سونے کے ہرنوں کو جو اسفند یار شہریار فارس نے خانہ کعبہ کے نذر کئے تھے اور وہ بیش بہا زرہیں جو خانہ کعبہ کے خزانہ میں مدت سے محفوظ و مخزون چلی آتی تھیں نکال کر چاہ زمزم میں پوشیدہ کر دیں اور اس کنویں کو مٹی ڈال کر ایسا چھپا دیا کہ چاہ زمزم کا کوئی اثر اور نشان باقی نہیں تھا۔

عدنان ثانی

بنی جرہم کی امارت وحکومت تیسری صدی ق م تک قائم رہی۔ اسی طرح بنی خزاعہ کی حکومت اور امارت کا سلسلہ سن عیسوی کے سو برس پہلے تک باقی رہا۔ اس اثنا میں بنی اسماعیل کی قوت روز بروز ضعیف اور کمزور ہوتی گئی۔ ظالم بخت نصر کے حملوں نے جس کی مدافعت کے لیے بنی جرہم اور بنی خزاعہ نے حب وطن اور حفاظت بیت اللہ کے تقاضے اور جذبات سے باہم اتفاق کر لیا تھا۔ مگر ناکامیاب رہے۔ ان کے معاون ومحافظ قبیلہ جرہم کی رہی سہی قوتوں کو بالکل زائل کر دیا تھا۔ مگر نظام مشیت نے عدنان دوم کے زمانہ سے بنی اسماعیلؑ کی درستی کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس طرح کہ عدنان دوم نے بنی جرہم کے ایک رئیس اور متمول شخص کی لڑکی سے شادی کر لی اور مکہ میں اسی ذریعہ سے آہستہ آہستہ اپنا اقتدار اور اثر بڑھایا۔ اور اتنا کہ ان کے صاحبزادہ معد ثانی کی اولاد واعقاب اور اعیان واصحاب حجاز سے نکل کر علاقہ نجد تک پھیل گئے۔

پھر بنی عدنان موجودہ عروج واقتدار کی ترقیوں میں چھ (6) پشت تک خلاف امید رکاوٹ پیدا ہوگئی اور معد ثانی سے لے کر کنانہ ابن خزیمہ تک کوئی ذی اثر اور مقتدر شخص ان میں پیدا نہ ہوسکا۔ مگر ان لوگوں میں اگر کوئی ایسی ترقی بھی نمایاں نہیں ہوئی تو کچھ ایسا ضعف بھی نہیں پیدا ہوا ایک سکونی حالت برابر قائم رہی۔ پھر قصٰی ابن کلاب کے زمانہ میں انہوں نے پورا عروج واقتدار حاصل کر لیا۔

قصٰی ابن کلاب

قصی ابن کلاب کے حالات زندگی بالکل حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً ایسے ہی ہیں جیسا کہ تاریخوں سے بڑے بے نمود اران اور سرداران ملکی کے حالات وواقعات پائے جاتے ہیں۔ یوں تو اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے امارت مکہ اور تولیت کعبہ کی خدمات کو انجام دیا ہے مگر حقیقتاً امارت مکہ اور تولیت کعبہ اصول وقواعد کے مطابق قصٰی کے وقت اور حکم سے قائم ہوئی۔ اسی طرح ملکی رفاہ اور قومی اصلاح کی جو تدبیریں اور ترکیبیں قصٰی نے جاری کیں اور ان سے اپنے تمام ملک وقوم کو فائدہ پہنچایا وہ میرے سلسلہ بیان سے آئندہ ظاہر ہوں گی۔

ابتدائی حالات

قصیٰ ابن کلاب کے باپ کلاب بن مرہ نے خاندان ازد میں فاطمہ بنت سعد سے شادی کی تھی۔ قبیلہ ازد کے لوگ بھی شہر مآرب علاقہ یمن سے آ کر مکہ میں بس گئے تھے۔ اور قبیلہ بنی الدیل بن بکر سے شادی بیاہ کر کے انہیں میں مل جل گئے تھے۔ اسی قبیلہ میں فاطمہ بنت سعد ازدی سے کلاب ابن مرہ کی شادی ہوئی جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ فاطمہ کے بطن سے پہلے زہرہ ابن کلاب پیدا ہوئے اور پھر ایک عرصہ کے بعد قصٰی ابن کلاب کی ولادت ہوئی۔ مگر قصٰی کے دودھ چھٹنے کے بعد ہی کلاب کا انتقال ہو گیا۔ اور فاطمہ نے ربیعہ ابن خرام قضاعی سے شادی کر لی۔ ربیعہ نے چند دن کے بعد فاطمہ کو اپنے مسکن وموطن شہر عذرہ علاقہ شام میں ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا اور فاطمہ کو آخر کار جانا ہی پڑا۔ زہرہ ابن کلاب چونکہ سن تمیز تک پہنچ چکے تھے ان کو ان کے قبیلہ والوں میں چھوڑ دیا اور قصٰی کو کمسن ہونے کے باعث ہمراہ لے لیا اور ربیعہ اپنے موجودہ شوہر کے ساتھ فاطمہ علاقہ شام میں چلی گئیں۔

علامہ ابن سعد طبقات میں قصّٰی کی وجہ تسمیہ کی نسبت حجاز سے علاقہ شام تک کی مسافت طے کرنے کو ان کے قصّٰی نام رکھے جانے کا خاص سبب قرار دیتے ہیں۔ بہرحال قصّٰی نے شہر عذرہ اور قبیلہ بنی قضاعہ میں پرورش پائی اور ہمیشہ اپنے آپ کو ربیعہ کا بیٹا خیال کیا۔ فاطمہ کے بطن اور ربیعہ کے سلب سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زراح رکھا گیا۔ ربیعہ نے باوجود اس کے کہ فاطمہ سے اب اس کی صلبی اولاد بھی پیدا ہو چکی تھی قصّٰی پر اپنے اشفاق و اکرام کم نہیں کیے بلکہ سلسلہ ابراہیمی اور خانوادۂ اسماعیلؑ ہونے کے باعث سے ان کی عظمت و حرمت ویسی ہی قائم اور برقرار رکھی۔

قصیٰ کو اپنی حقیقت کی اطلاع

قصیٰ جب سن تمیز کو پہنچے تو ایک دن بنی قضاعہ کے ایک شخص سے تیراندازی میں اَن بَن ہو گئی۔ اور ان کے درمیان بات بڑھتے بڑھتے مقابلہ اور مقاتلہ کی نوبت پہنچ گئی۔ اس مرد قضاعی نے باہمی مکالمہ میں تعریضاً یہ بھی کہہ دیا کہ تم ہمارے قبیلہ اور ہمارے موطن سے چلے جاؤ اور اپنے بطن و وطن کی طرف واپس جاؤ۔ ہمارا تمہارا میل جول مناسب نہیں کیونکہ تم ہماری قوم و قبیلہ سے نہیں ہو۔ قصّٰی کو جو اس وقت تک اپنے آپ کو بنی قضاعہ کا ایک فرد خالص سمجھتے تھے اس کی یہ تعریض بہت بری معلوم ہوئی۔ قصہ کو رفع دفع کر کے فوراً اپنی ماں کے پاس آئے اور پوچھنے لگے میرے باپ کا کیا نام ہے۔ ماں نے کہا کہ ربیعہ۔ قصّٰی بولے اگر وہ سچ ہوتا تو لوگ اس سے انکار نہیں کرتے۔ اب تو ماں سمجھ گئی کہ آج کسی نے حقیقت حال اس سے کہہ دی۔ ماں نے جواب دیا کہ یہ تم سے کس نے کہہ دیا اور جس نے بھی کہا ہو تو میں تم سے کہتی ہوں کہ تم اپنے قوم و وطن کے اعتبار سے اس کہنے والے شخص سے بدرجہا بہتر ہو۔ تم ذات شرافت، نسبی نجابت اور وطنی مفاخرت میں معترض سے بمراتب اعلیٰ ترجیح و تفضیل کے مستحق ہو۔ تمہارا باپ کلاب بن مرہ ابن کعب قرشی ہے اور تیرے قبیلہ کے لوگ مکہ معظّمہ میں بیت اللہ اکرام اور اس کے چاروں گرد آباد ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ قصّٰی کے دل میں قومی غیرت کا وہ غیر متحمل جوش آیا کہ فوراً ماں کے پاس سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ قسم خدا کی میں اب یہاں ہرگز نہیں رہوں گا۔ ماں نے کہا کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ حجاج کے قافلے یہاں سے روانہ ہوں تو میں تمہیں ان کے ساتھ کر دوں کیونکہ تمہارا تنہا جانے سے مجھے تمہاری جان کے نقصان کا خطرہ ہے۔

مکہ میں قصّٰی کی بازگشت دو بچھڑے بھائیوں کی مدت بعد ملاقات

جب بنی قضاعہ کے لوگ حج کرنے کو مکہ جانے لگے تو انہیں کے ساتھ قصّٰی بھی ایک مدت مدید کے بعد مکہ واپس آئے۔ اس وقت تک زہرہ ابن کلاب، ان کے بڑے بھائی زندہ تھے۔ قصّٰی مکہ میں کہیں نہیں ٹھہرے۔ بلکہ اپنی ہمراہی جماعت بنی قضاعہ کو ساتھ لیے ہوئے اور تلاش کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی زہرہ ابن کلاب کے مکان پر پہنچے۔ بھائی بہت ہی کبیر السن ہو چکے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے بصارت کی قوت بھی زائل ہو چکی تھی اور وہ بینائی سے ایسے مجبور و معذور ہو چکے تھے کہ زہرہ قصّٰی کو مطلق دیکھ نہ سکے۔ بالآخر قصّٰی نے اپنی معرفت آپ کرائی اور کہا کہ میں آپ کا چھوٹا بھائی قصّٰی ابن کلاب ہوں۔ زہرہ مرحبا کہہ کر اٹھ کھڑے ہو گئے اور کہا قریب آ جاؤ قصیٰ جب قریب پہنچے تو زہرہ نے ان کا بدن ٹٹول کر پہچان لیا اور کہا کہ تم بے شک میرے بھائی ہو زہرہ کے بدن پر تمام بال تھے اور

ایسے ہی قصٰی کے بھی تھی۔اور تمام جسم پر بال کا ہونا قدیم سے اس خاندان کا معیار تھا۔زہرہ نے ان کا بدن ٹٹول کر اپنے اسی معیار خاندانی کی تلاش کی تھی اور جب وہ پا گئے تو تصدیق کر دی۔

مکہ میں قیام اور بنی خزاعہ میں شادی

بھائی نے پھر تو اپنے مدت سے چھوٹے ہوئے بھائی کو گلے لگا لیا اور پھر بڑی مسرت سے قصٰی اور اس کی ہمراہی جماعت کو اپنا مہمان کیا جب حج سے فراغت ہوگئی تو جماعت قضاعہ نے معاودت وطن کے لیے عجلت کی اور قصٰی سے واپسی کے لیے اصرار کیا بالآخر قصٰی نے واپسی سے قطعی انکار کر دیا اور خود بھائی کے پاس مکہ میں رہ گئے اور ان کے تمام ہمراہی اپنے اپنے مقام کو واپس گئے۔

قیام مکہ کے تھوڑے دنوں کے بعد قصٰی نے اپنی شادی حبیٰ بنت حلیل سے کر لی۔حلیل اس زمانہ میں امیر مکہ تھے اور متول کعبہ معظّمہ۔حوالی مکہ سے لے کر تمام علاقہ حجاز میں بہت بڑے صاحب اقتدار و اختیار مشہور تھے۔قبائل خزاعیہ کے علاوہ گردونواح کے دیگر عربی قبائل و عشائر بھی ان کو اپنا سردار اور حکمراں تسلیم کرتے تھے۔اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس قرابت و پیوند سے قصٰی کی آئندہ کامیابیوں میں بڑی قوت آ گئی مگر قصٰی نے کبھی اس قرابت پر مفاخرت نہیں کی اور نہ اس کو کبھی اپنے مشارف نسبی پر ترجیح و تفضیل دی۔

حلیل کا انتقال ہو گیا۔اس کا بیٹا المحترش اس کا قائم مقام ہوا۔مگر وہ سراپا نااہل تھا اور بقول ابن سعد مکہ کے تمام لوگ اس کے اطوار و کردار سے ناخوش تھے۔وہ سخت شرابی تھا۔ہمیشہ مخمور اور نشہ میں چور رہتا تھا۔قصٰی نے اسے شراب پلا کر بیت اللہ کی کنجیاں اس سے لے لیں۔آخر زمانہ کے اکثر اسلامی مؤرخین نے اس قول کو اپنی تصنیفات و تالیفات میں نقل کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی کلید برداری مکہ کی امارت کعبہ کی تولیت

مغربی محققین کا کیا کہنا۔انہوں نے صرف اس وجہ سے کہ مکہ کے اکابر و عمائد میں شرابخواری کی عادت ثابت ہو۔اس قول کو اتنا معتبر کہا ہے کہ گویا اسی کو اپنا نظریہ اور اپنی تحقیق کا معیار قرار دے رکھا ہے۔حالانکہ اس روایت کے بعد ہی دوسری روایت بھی طبقات ابن سعد میں موجود ہے۔جو اس سے زیادہ قوی اور قریب الامکان اور سریع الفہم ہے۔مگر اس پر نظر نہیں جاتی ہم ان کے ملاحظہ کے لیے اصل عبارت ذیل میں قلمبند کرتے ہیں:

حدثنی فاطمه بنت مسلم لاسلمیه عن فاطمة الحراعية و كانت قد ادركت اصحاب الرسول الله صلعم قالا لما تزوج قطی الی حلیل ابن حبشیه ابنته حبی ولدت له اولاده قال حلیل اما ولد قطی ولدی هم بنوا ابنتی فا وصی بولاية البیت والقیام بامر مكة الی قطی

فاطمہ بنت مسلم الاسلمیہ فاطمہ الخراعیہ سے روایت کرتی ہیں کہ جنھوں نے اصحاب رسول اللہ صلعم کا زمانہ

دیکھا تھا کہ جب قصی نے حلیل ابن حبشیہ کی لڑکی حبی نامی سے شادی کی اور اس سے قصی کے بال بچے ہو گئے تو حلیل نے کہا کہ قصی کی اولاد میری ہی اولاد ہے کیونکہ وہ میری بیٹی کی اولاد و اعقاب ہیں۔ پھر مرتے وقت تولیت بیت اللہ اور امارت شہر مکہ کا منصب قصی کے لیے وصیت کر گیا اور کہہ گیا کہ وہی ان کا سب سے زیادہ مستحق ہے

ایسے صاف و پاک طریقہ استحصال امارت مکہ اور تولیت کعبہ کی موجودگی میں اس ناپاک ذریعہ کو کس کی عقل سلیم قبول نہیں کرے گی۔

تولیت کعبہ اور امارت مکہ قصی کا موروثی اور جائز حق تھا

قبل اس کے کہ ہم اپنے سلسلہ بیان کو آگے بڑھائیں ہمیں اس مقام پر لکھ کر دکھلا دینا نہایت ضروری ہے کہ تولیت کعبہ اور امارت مکہ کا منصب جیسا کہ ہم کامل تفصیل اور قوی دلیل سے اوپر لکھ آئے ہیں ذریت اسماعیل کا موروثی اور جائز حق تو ضرور تھا لیکن یہ استحقاق اور یہ مناسبت منجانب اللہ ان میں سے انہیں نفوس کے ساتھ بطور منصوص مخصوص کیا گیا تھا جو اس عہدۂ جلیلہ کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھتے تھے اور ان کی یہ اہلیت اور صلاحیت بھی ودیعت الٰہی کے خاص انتخاب و عنایات پر موقوف تھے۔ مشاہدات کثیرہ بتلا رہے ہیں کہ باوجود اس کے کہ یہ استحقاق اور یہ مناسبت دوسروں کے قبضہ و اختیار میں چلے بھی جائیں اور غیر مستحقین ان پر غصب، جبر، غلبہ، استیلا یا اور کسی تدبیر اور حکمت عملی سے متصرف بھی ہو جائیں مگر وہ ایک نہ ایک دن انہیں غیر مستحقین سے اپنے اصلی مستحقین کی حقیت اور اصلیت کے اقرار و اعتراف کرا ہی چھوڑتے تھے۔ ثبوت کے لیے حلیل خزاعی کا واقعہ جو ابھی ابھی لکھا گیا ہے موجود ہے حلیل خزاعی باوجود اس کے کہ سالہا سال اور پشتہا پشت سے تولیت کعبہ اور امارت مکہ پر متصرف اور متقابض چلا آتا تھا۔ عرب کے قریب قریب تمام قبائل و عشائر مدت سے بنی خزاعہ کو اس تولیت اور امارت کا جائز حقدار تسلیم کر چکے تھے مگر تاہم جب اس حقیقی مستحق کا سامنا ہو گیا تو آخر حلیل خزاعی کو اتنی مدت مدید کے قبضہ و تصرف کے خلاف قصی کے اصلی حقوق و تصرف کا اقرار و اعتراف کرنا ہی پڑا۔ اور خود دست بردار ہو کر اپنے بعد قصی کے قبضہ و اختیار میں واپس کرنا پڑا۔

بنی خزاعہ اور بنی بکر سے مقابلہ اور قصی کی فتح مکہ

حلیل نے واگذاشت حقوق قصی کی وصیت تو کر دی مگر اس کی وصیت پر عملدر آمد نہیں ہوا اور بنی خزاعہ اور بنی بکر نے مل کر قصی کو امارت و تولیت کے منصب پر قابض نہیں ہونے دیا۔ قصی نے ان سے فوری منازعت کو مصلحت نہ سمجھا۔ تھوڑے دن صبر کیا یہاں تک کہ چند روزوں میں قصی اور ان کی اولاد نے مکہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اپنے کاروبار تجارت کے ذریعہ سے اپنی مالی حالت ایک حد تک درست کر لی۔ اسی اثنا میں قصی نے تمام قریش اور بنی کنانہ کو جو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صحیح النسل اولاد تھے ایک مجمع خاص میں مجتمع کر کے تولیت کعبہ اور امارت مکہ کے متعلق ایک طولانی تقریر کی اور اس میں پوری تفصیل سے بیان کیا کہ قریش اور بنی کنانہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صحیح اولاد ہیں اور قبیلہ خزاعہ اور بنی بکر کے مقابلہ میں امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کے خاص طور پر مستحق ہیں تو اس بنا پر

ہماری موجودگی میں کسی دوسرے کو اس پر قبضہ وتصرف کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ان سے پہلے بالمساہلت ان امور کے منتزع کرنے کی کوشش کی جائے اگر وہ بالمساہلت اس کا تصفیہ نہ کر سکیں تو پھر یہ تمام اختیارات ان سے بالمنازعت واپس لیے جاویں۔

یہ سن کر تمام قریش اور بنی کنانہ نے قصٰی کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی اطاعت ومتابعت اختیار کر لی۔ اسی روز سے قریش کا نام اس خصوصیت کے ساتھ شہرت پذیر ہوا۔ کیونکہ ان کا اتفاق واتحاد اسی وقت سے مستحکم ہو گیا اور یہی وہ قوی وجوہ ہیں جو نضر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک وغیرہ کے مقابلہ میں قصٰی کو قریش کے اصلی باعث تسمیہ ہونے کا صحیح ثبوت پہنچاتے ہیں۔ ابن سعد محمد ابن عمر کی اسناد سے طبقات میں لکھتے ہیں:

لما فرغ قطي و نفى خزاعه و بنى بكر عن مكة تجمعت اليه قريش فسميت يومئذ قريشا لحال تجمعها والتقرش التجمع طبقات ج1ص38

جب قصٰی کو کسی قدر فارغ البالی حاصل ہوئی تو بنی خزاعہ اور بنی بکر نے ان کو قیام مکہ سے منع کیا۔ تب قریشیوں نے اس کے پاس مل کر اجماع کیا اور اسی دن سے ان کا نام قریش مشہور ہوا کیونکہ قریش کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔

تاریخوں کے مطالعہ سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ بنو اسماعیلؑ کے دل میں تولیت خانہ کعبہ اور امارت مکہ کے نہ ملنے یا کسی وجہ سے اس سے نکل جانے یا باز رکھے جانے کا بہت بڑا خیال اور ملال پیدا ہوتا تھا جس کو وہ اپنی مجبوری اور ضعف کی وجہ سے ظاہر نہیں کرتے تھے مگر جب کبھی ان کی حالتوں میں ذرا بھی درستی اور قوت آ جاتی تھی تو وہ فوراً غیر قوموں کے قبضہ واختیار سے اپنے ان حقوق مخصوصہ کو واپس لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ نضر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک نے بھی اپنے اپنے وقتوں میں اسی امر خاص کے لیے اپنے قوم وقبیلہ کو مجتمع کیا تھا۔ مگر اس اجماع سے نہ نضر ابن کنانہ اپنا کام نکال سکا اور نہ فہر ابن مالک اپنے ارادہ میں کامیاب ہو سکا۔ چونکہ مشیئت ایزدی اس کامیابی کا سہرا مخصوص طور قصٰی کے سر باندھ چکی تھی اس لیے فہر سے چھ پشتوں کے بعد قصٰی نے اپنی اس آبائی تمنا ومدعا کو خاطر خواہ پورا کیا۔

اتنا لکھ کر ہم اپنے سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں۔ قصٰی نے جب مکہ میں اپنی قوم وقبیلہ کو اس مہم کی انجام دہی پر پورے طور سے راضی اور آمادہ کر لیا تو اس نے اندرونی قوت کے ساتھ اپنی بیرونی طاقت کی درستی کا بھی سامان کیا اور اپنے بھائی زراع ابن ربیعہ کو لکھ بھیجا۔ وہ بھائی کا خط پاتے ہی اپنے قبیلہ سے ایک معتد بہ جمیت لے کر مکہ میں پہنچ گیا جب قصٰی اور بکر و بنی خزاعہ میں بالمساہلت کوئی تصفیہ نہ ہوا اور بنی خزاعہ اور بنی بکر کسی طرح قصٰی کی تولیت اور امارت پر راضی نہ ہوئے تو بالآخر جانبین سے مقابلہ کی نوبت پہنچی۔ مقام ابطح میں سخت معرکہ آرائی ہوئی۔ طرفین سے کثیر التعداد لوگ مارے گئے۔ آخر کار جانبین سے مصالحت پیش ہوئی۔ یعمر ابن عوف حکم ہوئے اور انہوں نے قصٰی کو تولیت کعبہ اور امارت مکہ معظّمہ دلوا دی۔ اور بنی بکر وخزاعہ کا خوں بہا بھی قصٰی سے نہیں دلوایا۔ بلکہ اس کے خلاف بنی بکر و بنی

خزاعہ سے قصٰی کے مقتولین کی دیت دلوادی اور اسی وجہ خاص سے حجاز میں یعمر ابن عوف کا نام شداخ ہو گیا کیونکہ اس نے بہت خونوں کو رائگاں کر دیا۔(طبری، ابن سعد)

قصیٰ نے زور شمشیر سے مکہ کو فتح کیا ہے نہ کسی حیلہ وتدبیر سے

جب قصٰی کے تمام معاملات خاطر خواہ درست ہو گئے تو قصٰی نے اپنے علاقائی بھائی زاح ابن ربیعہ اور اس کی ہمراہی جمیت کو ان کے وطن کی طرف رخصت کر دیا اور اسی وقت سے قریش اور بنی ربیعہ کے مابین باہمی تعلقات اتحاد اور زیادہ قوی اور مستحکم ہو گئے۔ قوم ربیعہ کے لوگ سالانہ ایام حج میں بلا ناغہ آنے لگے اور قصٰی کے مہمان رہنے لگے۔ قریش بھی قصٰی کے ساتھ ان کی قرابت کی رعایت سے بنو ربیعہ کی تعظیم وتکریم کرنے لگے اور جنگ خزاعہ کے وقت سے بنو ربیعہ کو اپنا شریک ومعین یقین کرنے لگے۔

ہم نے قصٰی کے حالات کو اس وجہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ اکثر محققین ومؤرخین کا یہ خیال کر لینا کہ قصٰی ابن کلاب نے امارت مکہ وتولیت کعبہ بے محنت ومشقت صرف اپنے حیلہ وحکمت سے المحترش ابن حلیل کو شراب پلا کر حاصل کر لی۔ محض بے اصل ہے متذکرہ بالا مشاہد تاریخی ثابت کر رہے ہیں کہ اپنی آبائی قوت واختیار اور امارت واقتدار کے حاصل کرنے میں قصٰی کو کتنی زحمتیں اٹھانا پڑیں اور کتنے سامان فراہم کرنے پڑے۔ یہ ممکن ہے کہ المحترش کو شراب پلا کر کلید کعبہ حاصل کر لی گئی ہو مگر صرف کنجی مل جانے سے یا ایک المحترش کے شریک ورفیق بن جانے سے قصٰی کو امارت مکہ اور تولیت کعبہ حاصل ہونے والی نہیں تھی۔ بنی بکر اور بنو خزاعہ کب اس کو قبول کرتے۔ جب کہ وہ خاتمہ جنگ تک باوجود اس کے حلیل کی وصیت اور المحترش کی نااہلیت اور قصٰی کے ساتھ اس کے ساز باز سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔ قصٰی کے استحقاق ومطالبات سے انکار کرتے رہے۔

ان مشاہد کو پیش نگاہ رکھ کر ایک محقق آسانی سے تصفیہ کر لے گا کہ قصٰی ابن کلاب نے اپنی آبائی حکومت وامارت اور خاندانی عظمت واقتدار ایک سخت لڑائی کے بعد جیسا کہ عربی قبائل میں لڑائیاں ہوتی ہیں پھر از سر نو حاصل کیا ہے۔ حالات وواقعات مذکورہ بالا سے کامل طور پر ثابت ہے۔ ان مشاہد تاریخی کے مقابلہ میں شرابخواری والی روایات اگر مان بھی لی جائیں تو قول منفرد ثابت ہوتی ہیں جس کی کوئی تفصیل تصریح ثابت نہیں۔ اس بنا پر اس روایت کو تاریخی واقعہ کہنا غلطی ہے۔

قومی اصلاح اور دارالندوہ کا افتتاح

قصیٰ نے اسی اثنا میں بنی نفر بنی کنانہ اور بنی فہر کے قبائل کو جو بنو بکر و بنوخزاعہ کے غلبہ وظلم سے سکونت مکہ ترک کر کے مختلف مقامات میں آباد ہو گئے تھے۔ پھر مکہ میں واپس بلا لیا۔ شہر میں عموماً تمام اور بیت اللہ کے خصوصاً چاروں طرف دور دور تک خاردار درختوں کے جنگل کھڑے تھے اور اس معبد الٰہی کی صفائی اور پاکیزگی کو بالکل بدنما بنا رہے تھے۔ قصٰی نے سب سے پہلے ان تمام مقامات کی صفائی کو مدنظر رکھ کر ان تمام جنگلوں کے کٹوا دینے کا اہتمام کیا۔ قبیلہ قریش کے اکثر اور عرب کے دیگر اقوام وقبائل نے اپنی قدامت پسندی اور اوہام پرستی کی بنا پر قصٰی کو اس امر سے روکنا چاہا مگر قصٰی نہ مانے اور اعوان وانصار کو ہمراہ لے کر ان جنگل جھاڑیوں کو خود کاٹنے لگا۔ اس کی

یہ مستعد یاور آمادی دیکھ کرتمام عرب اس کے شریک ہو گئے۔تھوڑے عرصہ میں وہ مقامات بالکل صاف وشفاف ہو گئے۔توقصٰی نے ان تمام مقامات کو چارحصوں میں منقسم کیا۔اور باہر سے آئے ہوئے قریشیوں کے مختلف قبائل وعشائر کوانہیں مقامات میں بسایا۔ان انتظامات نے قبائل قریش پر ہی نہیں بلکہ تمام اقوام عرب پرقصٰی کی امارت وحکومت کے کامل اور مستحکم اثر پیدا کر دیئے اوراہل عرب دینی اوردنیاوی حیثیت سے قصٰی ابن کلاب کواپنا پیشوااورسردارتسلیم کرنے لگے۔

قصیٰ بن کلاب کے دیگرانتظامات متعلقہ تولیت کعبہ وامارت مکہ کی تفصیل میں ابن سعد لکھتے ہیں:

عن ابی صالح عن ابن عباس قالا کان قصی ابن کلاب اول ولد کعب ابن لوی اصاب ملکا اطاع له قریش قومه و کان شریف اهل مکة لا ینازع فیها فاتبنی دار الندوه و جعل بابها الی البیت ففیها کان یکون امر قریش کل وما ارادوا من فکح او حرب مشورة فیها ینولهم حتی ان کانت الجاریة تبلغ ان تدرع فما یشق درعها الا فیها ثم ینطلقولها الی اهلها ولا یعقدون لوآء حرب لهم ولا من قوم غیرهم الا فی دار الندوة بعقده لهم قصی ولا یعذر لهم غلام الا فی دار الندوة ولا تخرج غیر من قریش فیرحلون الا منها ولا یقدمون الانزلوا فیها تشریفا له و تیمنا برایة و معرفة بفضله و یتبعون امره کالدین المتبع لا یعمل بغیره فی حیاته و بعد موته وکانت الیه الحجابة و السقابة والرفادة واللوآء والندوة و حکم مکله کلة وکان یعشر من دخل مکة سوی اهلها

ابی صالح ابن عباس سے ناقل ہیں کہ کعب بن لوی کی اولاد میں قصٰی ابن کلاب پہلاشخص ہے جس نے ملکی حکومت حاصل کی اوراس کی تمام قوم نے اس کی اطاعت اختیار کی اور بلا منازعت کسی ایک کواعتراض نہ ہونے کی بناء پرحکومت کی وہ پہلاشخص ثابت ہوتا ہے جوشریف مکہ تسلیم کیا گیا۔اسی نے دارالندوہ کی بنیاد قائم کی اوراس کے دروازہ کوحرم محترم کے اندرداخل کیا گیا۔اسی مکان میں قریش کے تمام امور پیش ہوتے تھے۔ضرورت نکاح،حرب وضرب مقابلہ ومقاتلہ اوردیگرتمام ضروریات کی نسبت اسی مکان میں جمع ہوکر مشاورت کی جاتی تھیں۔یہاں تک کہ عروس کاخلعت عروسی بھی یہیں قطع ہوتا تھااوریہیں پہنایا جاتا تھا۔اوریہیں سے وہ اپنے گھر رخصت کی جاتی تھی اورقریش کےعلاوہ عرب کے دوسرے قوم وقبیلہ کےلوگ بھی سوائے اس جگہ کےاورکسی دوسری جگہ اپنا علم جنگ آراستہ کرنے کےمجازنہیں تھےاوراس علم

کوسوائے قصٰی کے کوئی دوسرا مرتب بھی نہیں کرسکتا تھا اور ہر غلطی کرنے والا جوان اور غلام اسی ڈیرے پر معافی اور عذر خواہی کرتا تھا۔ یہاں سے کہیں اور نہیں پیش کرسکتا تھا۔ اور کوئی قافلہ سوائے اس مقام کے کسی دوسرے مقام سر مرتب ہوکر اٹھا یا نہیں جا سکتا تھا۔ اور اسی طرح داخلہ کے وقت بھی اس کو تحریم و تکریم کے خیال سے پہلے اسی مقام پر آنا ہوتا تھا۔ اور یہ تمام امور قصٰی کے فضائل و معارف کی معرفت اور اس کے اختیار و اقتدار کی متابعت پر مبنی تھے۔ اور تمام لوگ اس کے حکم و احکام کو فرائض منصبی کی طرح واجب التعمیل سمجھتے تھے اور کوئی شخص اپنی حیات یا وفات کے بعد بھی اس سے خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا اور قصٰی کے قبضہ اختیار میں حجابت کعبہ، سقایۃ الحجاج، رفادہ، اللوائ، دارالندوہ، امارت مکہ، غرض تمام ملکی، قومی اور دینی مناصب قائم اور برقرار تھے۔ (طبقات ج ا ص 39)

مذکورہ بالا خدمات کعبہ میں سقایہ اور رفادہ کے ماسوا اور بقیہ خدمات کی تفصیل کامل طور سے اوپر بیان ہوچکی ہے۔ ذیل میں سقایہ اور رفادہ کی تفصیل بھی قلمبند ہوتی ہے:

فرض قطی علی قریش السقایة والرفادة فقال یا معشر قریش ان بکم جیران الله و اهل بیته و اهل الحرن و ان الحاج ضیفان الله و زوار بیته و هم احق الضیف بالکرامته فاجعلوا لهم طعاما و شرابا ایام الحج حتی یصدروعنکم فافعلوا فکانوا یخرجون ذلك کل عام من اموالهم خرجا یترافدون ذلك فیدفون الیه فیصنع العام الناس ایام منی و بمکة و یصنع حیاضا للماء من ادم فیسقی فیها بمکة و منی و عرفة فجری ذلك من امره فی الجاهلیة علی قومه حتی قام الاسلام ثم جروا فی الاسلام علی ذلك الیوم (طبقات ج ا

قصٰی نے ایام حج میں قریش پر حجاج کی ضیافت اور پانی پلانے کی خدمت کو فرض کر دیا۔ اس کی تفصیل کیفیت یہ ہے کہ قصٰی نے تمام قریش کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ مقربان خدا ہو اور اہل بیت خدا اور اہل حرم کہلاتے ہو اور حجاج حقیقت میں خدا کے مہمان ہیں اور اس کے خانہ مقدس کے زوار اور تکریم اکرام کے متعلق وہ تمہارے اور مہمانوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لیے تم لوگ ان کے سقائی اور مہمانداری کا اس وقت تک پورا انتظام تیار کر رکھو جب تک کہ وہ تم سے رخصت ہوکر تمہارا شہر سے واپس جائیں۔ تمام

لوگوں نے قصٰی کے اس حکم کو مان لیا اور اقرار کیا کہ ہم حجاج کو پانی پلائیں گے اور کھانے کھلائیں گے۔ ان لوگوں نے اسی وقت سے یہ قاعدہ اختیار کر لیا کہ سال بھر میں ہر شخص ضیافت حجاج کے لیے اپنے مال سے کچھ خرچ نکال لیا کرتا تھا اور سب اس کو قصٰی کے پاس جمع کراتے تھے۔ اسی مجموعہ رقم سے قصٰی حجاج کی ضیافت کا سامان ان کا قیام مکہ و منی کے ایام میں کیا کرتے تھے۔ قصٰی نے اس کے متعلق بڑے بڑے متعدد حوض بنوائے تھے اور مقامات، مکہ، منی اور عرفات میں انہیں حوضوں کے ذریعہ سے تمام حجاج کو پانی پلایا جاتا تھا۔ قصٰی نے ایام جاہلیت میں اس قومی انتظام کو رائج کیا تھا اور فی نفسہ اور باصلہ یہ امور ایسے مفید تھے کہ اسلام بھی آج تک ان کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ (طبقات ابن سعد ج1 ص41)

قصیٰ ابن کلاب کے یہ حالات و واقعات تھے جن کو ہم نے مختلف ماخذوں سے مندرجہ بالا عبارت میں جمع کر دیا ہے اور شبلی صاحب کے اختصار بالجمال بیان سے قطع نظر کر کے ان واقعات کے حتی الامکان وسعت اور تفصیل کے ساتھ اس ضرورت خاص کی وجہ سے قلم بند کیا ہے کہ قبیلہ قریش پر تنہا موقوف و محدود نہیں بلکہ تمام اقوام عرب کا نام و نمود، ان کا تمدن، ان کی تہذیب و اخلاق و معاشرت، غرض عرب کے تمام دینی، دنیاوی، ملکی اور قومی اقتدار اسی شخص کی تنہا قابلیت، صلاحیت، تجویز اور تدبیر سے وجود پذیر ہوئے اور تاریخوں سے یہی شخص پہلا اور تنہا ثابت ہوتا ہے جو قوم عرب کو ایک علیحدہ قومیت کی امتیازی صورت میں لایا اور ان کو دوسرے اقوام و قبائل کی نگاہوں میں تعظیم، تکریم اور وقعت کے قابل ٹھہرایا۔

قصیٰ کے جن ملکی اور قومی رفاہ و اصلاح کے کاموں کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں وہ کامل طور سے تمدن، تہذیب، سیاست اور حسن معاشرت میں اس کی اعلیٰ قابلیت و استعداد کو ثابت کر رہے ہیں۔ علی الخصوص خانہ کعبہ اور حجاج کعبہ کی ضیافت کے انتظام و سامان اس کو وارث دستر خوان خلیل اللہ اور خانوادہ اسماعیلی کا سرمایہ ناز بتلاتے ہیں۔ اس نمودار قوم اور افتخار قبیلہ نے 480ء میں انتقال کیا۔

عبدِ مناف ابن قصٰی کی امارت

قصیٰ ابن کلاب کے چار (4) بیٹے تھے۔ ان میں عبدالدار سب سے بڑا تھا، لیکن بالکل ضعیف اور کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ قصیٰ نے اگرچہ مرتے وقت حرم محترم کی تمام خدمات عبدالدار ہی کو دیئے، مگر اس کی ناقابلیت اور ضعیف المزاجی کے باعث قصٰی کے بعد قریش کی دستار ریاست عبدمناف کے سر بندھی۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

کان عبدالدار بکرہ واکبر ولدہ وکان ضعیفا وکان اخوتہ قد شرفوا علیہ (طبقات ج1 ص41)

عبدالدار قصٰی کے پہلوٹے اور اکبر اولاد تھے مگر ضعیف المزاج تھے اور اسی بناء پر ان کے بھائیوں کو ان

پر فوقیت حاصل ہوگئی۔

عبدمناف کے زمانہ امارت مکہ میں کوئی قابل الذکر واقعہ تاریخوں میں نہیں پایا جاتا جس کو خصوصیت کے ساتھ ہم ان کے ذکر میں نقل کرتے سب سے بڑا اشرف جو عبدمناف کو حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ انہیں کی نسل میں سرور کائنات شرف موجودات حضرت ختم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذیجود قائم ہوا۔

مبارک آں صدف باشد کہ چوں تو گوہرے وارد

ہاشم ابن عبدمناف کی آمارت مکہ

عبدمناف کے چھ (6) بیٹے تھے۔ ان میں حضرت ہاشم نہایت ہی مشہور و معروف اور قابل عظمت بزرگ تھے۔ اور تمام قریش میں یہ وہ نمودار اور ذی اقتدار شخص گذرا ہے۔ جس کے ذاتی اوصاف و قابلیت نے تمام قوم قریش کی گذشتہ وجاہت اور اثر کچھ علاقہ حجاز اور حوالی مکہ ہی میں نہیں بلکہ عرب اور تمام ہمسایہ مما لک اور اقوام وقبائل میں بالاستقلال قائم کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بنو اسمٰعیل میں قریش کی نموداریوں کی ابتداء جیسا کہ ہم اوپر لکھ کر بتلا آئے ہیں قصی ابن کلاب کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ مگر جب ان واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی ترقی کا اس وقت محض آغاز ہی آغاز تھا۔ قصی کی قابلیت اور لیاقت میں کوئی عذر نہیں۔ انہوں نے اپنے وقت میں اپنی گذشتہ قومی اور خاندانی قوت وعظمت واپس لینے میں اور اپنے ملک وقوم کی حالتوں کے درست کرنے میں اور اس کے نظام ترتیبی کو درست وفراہم کرنے میں بہت ہی مفید اور کارآمد تدبیریں سوچیں اور ان میں سے اکثر کو عمل میں بھی لائے اور ان کے مفید نتائج بھی دکھلائے۔ مگر اصول ارتقاء کے مطابق چونکہ ہر شئ کی تمہید اور تکمیل بیک وقت نہیں ہو سکتی تھی اس نے قصی کی مختلف تجاویز وتدابیر ان کے قومی اور ملکی عروج وترقی کا مقدمہ تھا۔ جن کی ترتیب وتکمیل حضرت ہاشمؑ کے زمانہ میں عرش الکمال تک پہنچ گئی اور اسکے اہتمام واتمام کا سہرا انہیں کے سر باندھا گیا۔ جیسا کہ ہمارے سلسلہ بیان سے آئندہ ظاہر ہوگا۔

خانہ کعبہ کی خدمتیں

حضرت ہاشمؑ نے سب سے پہلے خدمات کعبہ کی درستی وترتیب کی طرف توجہ فرمائی جس کی نسبت قصی ہی کے زمانہ سے چند قسم کے انتظامی شکاتیں چلی آرہی تھیں۔ مگر عبدالدار قصی کے وقت ہی سے ان خدمات کے منتظم قرار پا چکے تھے اس لئے اس میں کسی قسم کی مداخلت سے آپس کی مشاجرت کا پورا خوف تھا۔ مگر بنی عبدالدار کی بے احتیاطی اور بے ترکیبی بڑھتے بڑھتے اس زمانے میں ناقابل برداشت ہوگئی تھیں۔ اس لئے حضرت ہاشم نے ان خدمات مبارکہ کی اصلاح ودرستی کی ضرورت کو آپس کی مشاجرت اور مخالفت کے خوف پر ترجیح دی۔ ایک دن اپنے سب بھائیوں کو جمع کیا اور ان کے مجمع میں ان امور کو پیش کیا۔ سب نے بنی عبدالدار سے ان خدمات کے واپس لینے کی تجویز میں ہاشم کی رائے سے اتفاق کیا۔ بنی عبدالدار کو ان خدمات کے واپس دینے کا پیغام بھیجا گیا۔ انہوں نے قطعی انکار کر

دیا۔ اس بنا پر ان کے درمیان کشیدگی اور رنجیدگی پیدا ہوگئی۔ اور پھر تھوڑے دنوں میں بڑھتے بڑھتے جانبین سے مقابلہ اور مقاتلہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بالآخر موجودہ مخالفت اور مشاجرت اس شرط مصالحت کے ساتھ ختم کر دی گئی کہ خدمات کعبہ کے متعلق سقایہ اور رفادہ کے خدمات بنی عبدالدار سے واپس لے کر بنی عبد مناف کو واپس کر دیئے گئے اور حجابہ۔ لوا۔ اور دارالندوہ کے خدمات بنی عبدالدار کی تحویل میں چھوڑ دیئے گئے۔ مگر ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ دارالندوہ کے اختیارات بنی عبدالدار کے ہاتھوں میں کبھی نہیں گئے جب تک کہ عکرمہ ابن ہاشم ابن عبد مناف نے معاویہ ابن سفیان کے ہاتھ اس کو بیچ نہ ڈالا۔ اس بنا پر سقایہ اور رفادہ کے ساتھ دارالندوہ کا منصب بھی ہاشم ابن عبد مناف کے قبضہ میں آ گیا۔

مولوی شبلی صاحب کی یہ تحریر بالکل غلط ہے کہ امارت مکہ اور تولیت کعبہ حضرت عبدالمطلب کے عہد میں بنی ہاشم سے منتزع ہوگئی تھی۔ آپ کی یہ رائے شائد صلح نامہ مرقومہ بالا پر مبنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طبقات کی عبارت پر نظر نہیں پڑی بہر حال ہم اس مسئلہ کو حضرت عبدالمطلب کے خاص حالات میں مفصل طور سے لکھ کر بتلا دینگے کہ مولانا صاحب کا یہ قیاس ان کی تحقیق کی خامی ہے۔

ان تینوں خدمات (سقایہ۔ رفادہ اور الندوہ) کو جس خوش اصلوبی سے حضرت ہاشمؑ نے اپنے زمانہ حیات میں انجام دیا وہ آج تک تاریخ عرب میں ان کے حسن انتظامی اور خوش لیاقتی کی یادگار ہے۔ خانہ کعبہ کی مقدس خدمات کی خاطر خواہ اصلاح و ترمیم فرما کر حضرت ہاشم ملکی اور قومی رفاہ و ارتقاء کی طرف متوجہ ہوئے۔

ملکی اور قومی رفاہ و اصلاح

دنیا جانتی ہے کہ عرب چٹیل میدان اور تمام تر ریگستان ہے اور اہل عرب بالکل مفلس اور نادار قوم۔ اپنی کم سرمائیگی اور بے سروسامانی کی وجہ سے وہ کسی طرح اپنی حالتوں کو درست نہیں کر سکتے تھے۔ انکی ناداری انکا افلاس اور انکی ترقی و خوشحالی کا سخت مانع تھا۔ یہی ہاشم کی قومی ہمدردی اور ملکی رفاہ کی خدمات تھیں۔ جس نے اپنے ملک و قوم کو ایک مدت مدید اور عرصہ دراز کی تنزلی و مفلسی اور ناداری کے بعد۔ ترقی اور مرفہ الحالی کے درجوں تک پہنچایا۔ اور رفتہ رفتہ اپنی مفلوک الحال اور بے سرمایہ قوم و قبیلہ کو تجارت پیشہ قوم اور کاروباری فرقہ بنایا۔ تمام مغربی اور مشرقی مؤرخین اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ قریش کے مشہور و معروف قبیلہ میں کاروبار اور بیوپار کرنے کا خیال اور شوق اور مذاق ہاشم نے ہی پیدا کیا۔ اگرچہ علم آثار کے انکشافات و تحقیقات جدیدہ کے عرب میں مشغلہ تجارت کا وجود ہاشم سے بہت قبل پایا جاتا ہے۔ مگر وہ بنی قطورہ اور بنی سارہ (عرب ادومی) اور اصحاب مدین وغیرہ خاص اقوام و قبائل تک محدود تھا۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں بنو ہاجرہ یا اسمٰعیلی عرب کا ذکر آ جاتا ہے تو ان کا شمول کوئی خاص تعلق میں شمار نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں غیر قومی تاجروں کے ذیل و ضمن میں تصور کرنا ہوگا۔

ہاشم کے ایسے سچے اور خاص حامی قوم نے دو ہزار برس کی جہالت کے اس تاریک زمانہ میں اپنی ملکی رفاہ اور قومی اصلاح و ترقی کیلئے اپنی قوم و ملک کو سب سے پہلے وہی ذریعہ اور وسیلہ بتلایا جو فی زمانہ۔ کمال تہذیب، کمال تمدن اور کمال ترقی کے موجودہ زمانہ میں بھی ہمارے ملکی اور قومی ریفارمر (مصلح) اپنی اپنی مختلف قوم اور جماعتوں کو ان کے عروج و ترقی حاصل کرنے کیلئے بتلایا اور دکھلایا کرتے ہیں

۔اس لئے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ ملکی اور قومی رفاہ کے خدمات و خیالات کے متعلق حضرت ہاشم کی حسن تدبیر، آپکا اعلیٰ تمدن دو ہزار برس پہلے بھی ترقی اور کمال کے اسی درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔جس درجہ اور مقدار تک زمانہ موجودہ کے ہمدردان قوم و وطن کے خدمات و خیالات پہنچے ہوئے ہیں۔

قریش کی قومی تجارت میں ترقی

قومی ہمدردی اور ملکی رفاہ کے خیالوں سے بیحد متاثر ہوکر حضرت ہاشمؑ نے ان کو تجارت کی طرف خاص طور پر رغبت دلائی۔اور اپنے خاص سرمایہ سے ہمت بھی۔کیونکہ عرب کی جاہل قوموں کو اگر دنیا کے کاروبار میں کسی شئ سے دلچسپی تھی بھی تو وہ تجارت ہی تھی۔عموماً تمام لوگ تو اپنی کم مائیگی اور ناداری کی وجہ سے تجارت کا شغل پیدا نہیں کر سکتے تھے۔مگر وہ لوگ جو کسی قدر سرمایہ والے تھے وہ تمام تر تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے۔انہی میں حضرت ہاشم ابن عبد مناف بھی تھے۔اس اصلی نباض قوم نے ان کے اصلی مرض اور اس کے تیر بہدف علاج کو فوراً معلوم کرلیا۔اور اسی کے مطابق عملی تدبیر اختیار کی۔ان سے قبل جو سرمایہ دار حضرات تھے وہ کسی قدر خود غرضی اور نفع اندوزی کے خیال سے جو اکثر اہل تجارت کی طبیعت کا لازمہ ہے۔وہ اپنی قوم کو ان امور کی طرف رغبت دلانے کیلئے ایک حد تک مجبور تھے۔مگر ہاشم فیاض کی پرہمت اصول عدالت حقوق مساوات پر قائم تھے۔اور اس میں ذاتی منفعت اور خود غرضی کو ذرا بھی مداخلت نہیں تھی۔اسی وصف خاص کا نتیجہ تھا کہ حضرت ہاشم نے اپنے تمام قوم و قبیلہ کو تجارت کی طرف لگایا۔اور ان میں سے نادار اور بے سرمایہ لوگوں کو اپنے سرمایہ سے کافی مدد پہنچائی اور ان کو ایک معتد بہ جماعت میں پہلے مجتمع کر کے ایک قافلہ اور تجارتی کاررواں بنایا۔اور ان کو سال بھر میں دو مرتبہ دو مختلف اطراف میں تجارت کرنے کی غرض سے بھیجے جانے کا قاعدہ مقرر کیا۔جس طرح قصیٰ کو اپنے زمانہ میں تجمیع کی رعایت سے قریش کا لقب دیا گیا تھا اسی طرح حضرت ہاشم بھی اپنے وقت میں ایلاف قریش اور دابہ القریش کہے جاتے تھے جیسا کہ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں

وکان (ھاشم) صاحب ایلاف قریش و ایلاف قریش دابہ القریش

ہاشم کو صاحب ایلاف قریش (کاررواں سالار قریش) کہتے تھے۔اور ایلاف کے معنی حرکت کنندگان قریش کے ہیں۔

قریش کے یہ قافلے جاڑے کے موسم میں یمن اور حبشہ تک جاتے تھے۔اور گرمیوں میں شام کے علاقے غزہ تک جاتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حضرت ہاشمؑ کی یہ حسن تدبیر ان کی ملکی اور قومی رفاہ و فلاح کیلئے ایسی مفید اور پرنفع ثابت ہوئی کہ دو تین بار کی آمد و رفت اور الٹ پھیر کے بعد نادار قریش اور مفلوک الحال اہل عرب کی حالتوں میں ایک حد تک درستی اور ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ان مشاہدات نے حضرت ہاشمؑ ہی کو نہیں بلکہ ملک و قوم کے تمام افلاس زدہ اور مفلوک الحال لوگوں کو اس کی غیر متحمل ہمت دلائی اور وہ اب بلا تحریک و تحریص خود اسی کاروبار میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

حضرت ہاشم اور قیصر روم

جب قریشیوں کی تجارت کو دوسری قوموں کی تجارت میں واضح فروغ ہونے لگا۔تو شام و یمن کی مقامی تجارت پیشہ قومیں حسد و نفسانیت کی بنا پر ان کے کاروبار میں غیر متوقع رکاوٹیں پیدا کرنے لگیں۔حضرت ہاشمؑ اکثر اپنے کاروانوں کے ساتھ اپنا مال تجارت لے کر بھی جایا کرتے تھے۔اور کبھی کسی ضرورت سے خود مکہ میں بھی رہ جاتے تھے مگر اہل یمن و شام کی بے رخی اور ناتوجہی کی خبر جب ان کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کی فوری اصلاح کو ضروری سمجھا اور بذات خاص قیصر کے پاس ان امور کی درستی اور اصلاح کیلئے چلے گئے قیصر نے ان کا بڑا اعزاز کیا۔ہاشم نے قیصر سے اپنا مدعا بیان کیا۔اور اس کی رعایا کے ہاتھوں قریش کے کاروان تجارت کو جو جو دشواریاں پیش آئی تھیں ایک ایک کر کے بیان کر دیں۔قیصر نے بکمال رغبت قریش کے کاروان تجارت کے امن امان اور حفاظت مال و جان کا پورا سامان کیا۔منزلوں کے قیام اور سفر کے ایام و حالت میں عام شاہراہوں اور گذر گاہوں میں اپنی طرف سے معاہدہ لکھ کر حضرت ہاشم کے حوالے کر دیا۔اور اسکی نقل اپنے قلمرو میں خصوصاً ان علاقوں میں اور مقاموں میں جو مکہ سے شام آنے والے راستہ کے قریب تھے۔یا ملحق تھے وہاں کے عمال اور رئیسان قبائل کے پاس بھجوادی۔طبقات ابن سعد ج 1 ص 40

نجاشی شاہ حبشہ کے نام ہاشم کا خط

ملک شام کی تجارتی مشکلوں کو پوری کامیابی کے ساتھ رفع دفع کر کے حضرت ہاشمؑ علاقہ یمن و حبشہ کی درستی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے۔مگر اس کیلئے بادشاہ حبشہ کے پاس بذات خاص حاضری کی ضرورت نہ دیکھ کر ایک خط لکھ دیا گیا اور اسی سے خاطر خواہ کام نکالا گیا ۔جیسا کہ ابن سعد کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

و کتب الی النجاشی ان ید خل قریشا ارضه و کانو تجارا

نجاشی بادشاہ حبشہ کے پاس خط لکھ کر بھیجا گیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو تجارت کرنے کی اجازت دے

خط پہنچنے کی دیر تھی۔نجاشی کو کوئی عذر نہ ہوا۔قریش کو حبش کے ملک محروسہ میں آزادانہ تجارت کرنے کی اجازت ہو گئی مولوی شبلی صاحب ان حالات کو ذیل کے مختصر الفاظ میں یوں لکھتے ہیں۔

ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے سرانجام دیا۔حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھلاتے تھے۔چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے۔تجارت کو ترقی دی۔قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوا دیا کہ قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔کیونکہ اہل عرب جاڑوں میں اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کیلئے جایا کرتے تھے۔اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے۔قیصر کا پایہ تخت تھا۔تجار قریش انگوریہ میں برابر جایا کرتے تھے۔تو قیصر نہایت عزت و حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔عرب کے راستہ محفوظ نہ تھے۔ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے ان قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں

گے۔جس کے صلے میں کارروان قریش ان قبائل میں انکی ضرورت کی چیزیں لے کر جائے گا۔اوران سے خرید وفروخت کرے گا۔یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔سیرۃ النبی ج1 ص20

الغرض۔حضرت ہاشم نے ان مشکلات کو جو قریشی کارروان تجارت کو اپنے کاروبار میں حائل تھیں نہایت خوبی اور خوش اصلوبی سے رفع کر دیا کہ پھر وہاں کی مقامی قوموں کو ان کی مخالفت اور ضرر رسانی پر جرأت نہ ہوسکے۔اوراس طرح ہمیشہ کیلئے قریش کے کارروان تجارت کا راستہ مکہ سے یمن اور شام تک صاف ہو گیا۔ملکی رفاہ اور قومی اصلاح وفلاح کے متعلق حضرت ہاشم کی یہ اعلیٰ تدبیریں تھیں۔یہ محاسن خدمات تھیں جو قریب قریب دو ہزار برس کے بعد بھی قوم وملک کی بیشمار اور لا انتہا شکر گزاریوں کے ساتھ عربی دفاتر تاریخ ہی میں نہیں۔بلکہ تذکرات عالم کے مختلف صحائف وجرائد میں آج تک محفوظ ومرقوم ہیں۔

حضرت ہاشمؑ کی اس ہمدردی اور دلسوزی نے تمام ملک وقوم کو ان کا مطیع ومنقاد اور والہ وشیدا بنا رکھا تھا اور ایسا کہ ہر شخص ان کی متابعت کو اپنی مفاخرت سمجھتا تھا اور اپنے تمام مصائب وحوائج ضروریہ کے وقتوں میں اپنا حامی معین اور متکفل یقین کرتا تھا۔اور تھا بھی ایسا ہی۔حضرت ہاشم کی ثروت اقتدار کا اثر اس زمانہ میں ملک عرب اور قوم قریش ہی تک محدود نہیں تھا۔بلکہ اطراف وجوانب کے بیرونی قبائل بھی پوری طرف سے ان کی ذاتی وجاہت اور عظمت کے زیر اثر تھے۔اوراس کی سب سے بڑی وجہ اور قومی سبب یہ تھا کہ بیرونی قوم وقبائل کے بیشار لوگ سالانہ ایام حج میں آ کر حضرت ہاشم کے ہاں تین شبانہ روز تک مہمان رہا کرتے تھے۔اور رفادہ کے قدیم خدمت جو قصی ابن کلاب کے وقت کا دستور تھا۔اور جو فی الحال ان سے خاص طور پر تعلق رکھتا تھا۔حضرت ہاشمؑ کی طرف سے اس اعلیٰ ہمتی فیاضی اور کشادہ دلی کے ساتھ عمل میں لائی جاتی تھی اور بلا اختصاص وامتیاز اصول مساوات وعدالت کے تمام شرائط احتیاط کے ساتھ عرب کے تمام صادرین وواردین کی عام ضیافت کی جاتی تھی کہ وہ تمام اقوام وقبائل حضرت ہاشم کی اعلیٰ فیاضی اور مہمان نوازی کے غلام بیدام بن جاتے تھے اوران کے جود وسخا اور مہر وعطا کے واقعات میں بڑی بڑی نظمیں اور مطول ومفصل قصائد تصنیف کر کے یادگار چھوڑتے تھے۔

ہم قصی ابن کلاب کے ذکر میں خدمت رفادہ کے متعلق ان تمام انتظامات کو جو ان کے وقت میں کیے جاتے تھے تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں۔اور اب ذیل میں اس خدمت کے متعلق حضرت ہاشم کی فیاضیوں نے جس وسعت اور ہمت سے کام کیا ہے۔اس کو بالتفصیل قلمبند کرتے ہیں۔ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

ان ولی هاشم بن عبد مناف بن قصی السقایه والرفادہ وکان رجلاً موسرًا وکان اذا حضر الحج قام فی قریش فقال یامعشر قریش انکم جیران اللہ واهل بیته فانه یاتیکم فی هٰذالموسم زوار اللہ یعطمون حرمة بیته فهم ضیف اللہ واحق الضیف بالکرامة ضیفه وقد خصکم اللہ بذالك و اکرمکم به و حفظکم منکم بافضل ما حفظ جارہ من جارہ فا کرمو ضیفه و زورہ سیاتون شعثا

غيرا من كل بلد على ضوا مر كا نهن لقداح قد از حفواوتفلو و قملو و ارسلو فافروهم وسقاهم فكانت قريش ترافد على ذالك حتى ان كان اهل البيت اليرسلون بالشئ اليسير على قدرهم وكان هاشم بن عبد مناف بن قطى يخرج فى كل عام مالا كثيرا و كان قوم من قريش اهل يساره يترافدون وكان كل انسان يرسل بمائة مثقال هر قليه وكان هاشم بامر الجياض من ادم فنجعل فى موضع زمزم ثم يسقى فيها الماء من التبار التى بمكة فبشر به الحاج وكان يضعمهم اول ما يطعم قبل الترويه بيوم مكة و بمنىٰ و جمع وعرفة وكان يثردلهم الخبز واللحم والخبزوالسمن والسويق والتمر ويجعل لهم الماء فيسقون بمنى والماء يومئذقليل فى حياض الادم الى ان يصدروامن منى ينقطع الضيافةو يتفرق الناس فى بلادهم ۔طبقات ج1ص45

جب ہاشم ابن عبدمناف ابن قطی کوسقایہ کی خدمات ملیں اور رفادہ حاج کی ۔ہاشم ابن عبدمناف ابن قطی تمام قبیلہ قریش میں ایک مرفہ الحال بزرگ تھے۔ جب یہ عہدے ان کے سپرد ہوئے اور موسم حج قریب آیا تو ہاشم نے تمام قبیلہ قریش کوجمع کر کے فرمایا کہ آئے جماعت قریش تم خدا کی جماعت ہواور اس کے گھر والے ان ایام میں تمہارے پاس خانہ خدا کی زیارت کرنے والے اس کے خانہ مقدس کی عظمت بڑھانے کے خیال سے آتے ہیں ۔پس وہ لوگ خدا کے مہمان ہیں ۔اور میزبان کا سب سے بڑا حق یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مہمانوں کی باحسن سلوک ضیافت کرے اور یہ ایک ایسا حق ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے تمہیں اس کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور تم میں ان حقوق کو اس طرح محفوظ رکھا ہے جس طرح وہ اپنے بندوں کی جماعت کو دوسری جماعت سے محفوظ رکھتا ہے۔پس تم اپنے ان مہمانوں اور زائروں کے ساتھ باکرام پیش آوَ۔جو بالکل گردوغبار میں اٹی ہوئی جماعتوں کی صورت میں دور دراز ملکوں سے تمہارے پاس آتے ہیں ۔گویا وہ فوج مقابلہ کنندگان کی جماعت میں جو دوری مسافت اور تکالیف سفر کی وجہ سے ضعیف اور لاغر شکستہ افتاں وخیزاں تمہارے پاس آتے ہیں ۔پس تم بالطاف واکرام ان کو اپنے پاس بلاوَ اوران کو پانی پلاوَ۔ہاشم کا یہ حکم سن کر تمام قریش نے جو اہل بیت کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے ہیں

مال کثیر اس خدمت کیلئے ہدیہ کرنا آغاز کر دیا۔اور خود ہاشم ابن عبد مناف بھی ہر سال بیت المال کثیر اپنے سرمایہ سے اس مصرف خاص کیلئے نذر کیا کرتے تھے اور جو لوگ کہ قریش میں متمول تھے وہ طعام داری کا سامان کرتے تھے۔اور انہیں سے ہر شخص سو مثقال ہر قلیہ کعبہ کیلئے نذر نکالا کرتا تھا۔ہاشم نے حجاج کے پانی پلانے کیلئے چمڑے کے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے اور وہ زم زم کے پاس رکھ دیے جاتے تھے اوران میں مکہ کے کنوؤں سے لا لا کر پانی بھر دیا جاتا تھا۔(کیونکہ چاہ زمزم تو مدت سے پٹا ہوا بے نام و نشان پڑا تھا)اور یہی تمام حجاج کو پلایا جاتا تھا۔اور حجاج کو پہلے یوم ترویہ کے روز کھانا کھلایا جاتا تھا اور یہ اول ضیافت خاص شہر مکہ میں کی جاتی تھی۔ پھر دوسرے روز منیٰ میں یہی سلسلہ عرفہ تک برابر جاری رہتا تھا۔ اول روز ان کو روٹی گوشت کھلایا جاتا تھا۔ دوسرے روز روٹی اور روغن اور تیسرے روز سَتُّو اور خرمے۔اور پھر مکہ سے پانی لے جا کر منیٰ میں تمام حجاج کو پلایا جاتا تھا اور اس دن چمڑے کے حوضوں میں پانی قلیل المقدار رہ جاتا تھا۔اس لیے منیٰ سے لوٹنے والے دن سلسلۂ ضیافت ختم ہوجاتا تھا۔اور تمام لوگ اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے تھے۔

بہر حال سقایہ اور رفادہ کی تعمیل خدمات کی یہ تفصیل تھی جو حضرت ہاشم کی اس اعلیٰ ہمتی اور کشادہ دلی کو ان کے اسلاف کی قدیم فیاضی اور سخاوت سے کہیں بڑھ چڑھ ہی ثابت کرتی ہے۔یہ تو حضرت ہاشم کے وہ محاسن اخلاق واشفاق تھے جو عموماً حجاج کعبہ کی آرام رسانی کے متعلق عرب کے تمام تاریخی کارناموں میں اُن کی ابدی یادگار ہیں۔اب اس کے بعد ان کی اس فیاضی اور ایثار کی تفصیل ذیل میں قلمبند کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے ہم وطن اور ہمسایہ اقوام وقبائل کے ساتھ مکہ کی تین سالہ قحط کے مصیبت ناک زمانہ میں دکھلائی ہیں۔مولانا شبلی صاحب حضرت ہاشم کے اس مشہور ومعروف ایثار نفسی اور فیاضی کو ان الفاظ مختصرہ میں بیان کرتے ہیں۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا۔اب ہاشم نے اس قحط میں شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے کھلائیں۔اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا۔عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں،جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

اب اس مجمل اور مختصر بیان کی تفصیل طبقات کی اصلی عبارت سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

مکہ میں قحط سالی اور حضرت ہاشم کی فیاضی

اصابت قریشا سنوات ذھبن بالاموال فخرج الی الشام فامر بخبز کثیر فخبز له فحمله الفرائر علی الابل حتی وافی مکة فهشم ذلك الخبز یعني کسرہ و ثرّدہ و نحرہ تلك الابل ثم امر الطهاة فطخوا ثم کفاء القذور علی الجفان فاشبع اھل

مکة فکان اول الحیاء بعد السنة التی اصابتهم فسمی بذلك هاشما و قال عبدالله ابن الزبعری فی ذلك عمر العلی هشم الثرید لقومه و رجال مکة مسنتون عجاف

قوم قریش ایک بار متواتر قحط کی مصیبت میں مبتلا ہوئی۔ یہاں تک کہ جو کچھ ان کے پاس سرمایہ موجود تھا وہ بالکل اٹھ گیا۔ ہاشم سے اپنی قوم و ملک کی یہ مصیبت نہیں دیکھی گئی۔ تو وہ شام کی طرف بذات خاص چلے گئے اور وہاں سے کثیر المقدار روٹیاں پکوا کر اور بڑی بڑی کھالوں میں بھروا کر اونٹوں پر مکہ میں لدوا لائے۔ مکہ پہنچ کر ان روٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروایا اور شوربے میں ڈلوا کر ثرید تیار کروایا۔ پھر جن اونٹوں پر وہ روٹیاں لاد کر لائے تھے ان کو ذبح کروایا اور پکوایا۔ جب کھانا پک کر تیار ہو گیا تو بڑے بڑے ظروف بھروا کر تمام جماعتوں کو کھلوایا۔ یہاں تک کہ تمام اہل مکہ سیر ہو گئے۔ گویا قحط کی مصیبتوں کے بعد مکہ کے غربت زدہ لوگ اول بار پھر از سرِ نو زندہ ہوئے۔ اس ایثار عام کے لحاظ سے حضرت ہاشم اس دن سے ہاشم مشہور ہو گئے کیونکہ ہاشم کے معنی توڑنے والے کے ہیں۔

چنانچہ عبداللہ ابن الزبعری نے ہاشم کے اس ایثار عظیم کی یادگار میں ذیل کا شعر یادگار چھوڑا جس کا ترجمہ ہے:

عالی ہمت عمر (ہاشم کا اصلی نام) نے ثرید کا چورا اپنی قوم کے لیے تیار کرایا۔ ایسی حالت خاص میں کہ باشندگان مکہ قحط زدگی کے باعث بالکل ضعیف و لاغر ہو چکے تھے۔

ابن ہشام نے ایک شعر اس کے علاوہ لکھا ہے۔ وہ یہ ہے:

منة الیه الرحلتان کلاهما
سفر الشتاء و رحلة الاصیات

باشندگان مکہ کے لیے دو سفروں کا انتظام کیا۔ ایک گرمی اور ایک جاڑے کے ایام میں

طبقات ابن سعد میں وہب بن عبد قصی کے یہ اشعار درج ہیں جن میں یہ پورا واقعہ نظم کر دیا ہے۔

تحمل هاشم ما ضاق عنه
و اعیاً ان یقوم به ابن بیض
اتاهم بالفرائر متافاتٍ
من ارض الشام بالبرا النفیض
فاوسع اهل مکة من هشیم
و شاب الخبز باللحم الغریض

فضل القوم بين متقلات

فظل القوم بين مكللاتٍ

ہاشم نے اپنی قوم کی مصیبت پرتحمل کیا اوران کی امداد کے لیے ایک رائیس ابن رئیس کی شان میں آمادہ ہوئے اورارض شام سے میوہ خرید لائے باشندگان مکہ کے لیے کھالوں میں بھروا کر اذوقہ لائے تمام باشندگان مکہ کو روٹی اور گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھلائے۔تمام قوم اس طرح ان کے احاطہ فیض کے زیر سایہان تمام تکالیف کے بعد آ گئی۔(طبقات ص 44)

حقیقت میں ہاشم مرحوم کی تمام ملکی اورقومی خدمتیں۔قوم ووطن کی ترقی اور مرفہ الحال اوردرستی معاشرت کے لیے ایسی مفید اورکارآمد ثابت ہوئیں جواس وقت سے آج تک اہل عرب کے دل سے بھولے ہیں۔اورنہ ابدالاباد تک بھول جانے کی امید کی جاتی ہے قوم وملک کے ساتھ ان کی ایسی سچی،خالص اوربے لوث ہمدردی،کوشش اورسعی ایسی پراثر ثابت ہوئی کہ اس نے باشندگان مکہ اورقرب وجوار کے تمام ہمسایہ قوم وقبائل کے قلوب کوتسخیر کرلیا۔اس سے زیادہ ان فیاضانہ قومی ایثار کی عام قبولیت اورکیا ہوسکتی ہے کہ فیاض کی مدح واوصاف میں بڑے بڑے معرکتہ الآراقصیدے لکھے گئے اوراُس کی فیاضی کے اظہار واعتراف میں طول وطویل اور پرتفصیل نظمیں تیار کی گئیں۔اس زمانہ میں حضرت ہاشم کی وجاہت،عظمت اورحکومت وامارت کے سکے عرب کی تمام قوم وقبائل پر ایسے جم گئے تھے کہ ان کے مقابلہ میں کسی کی رو داری اورنموداری کچھ کام نہ کرسکی۔

ہاشم کے ساتھ امیہ کی مخاصمانہ مخالفت

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

باوجود اس مقبولیت عام کے بھی حضرت ہاشم کی یہ بےنظیر اورلاجواب خدمات،رشک،حسد اورنفسانیت کے اظہار سے خالی نہ رہی اوراس وقت سے ان کی نموداری اورذی اقتداری کے استیصال کی فکر کی گئی۔مگر رشک وحسد کانخل تمنانہ بارآور ہوا ہے نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ ان کے مخالفین کواپنی مخالفانہ کارروائیوں میں ذرہ بھر بھی کامیابی نہیں ہوئی۔سارے انتظام وتمام اہتمام اورسب کوششیں ایسی کی ایسی ہی رہ گئیں۔ان کا مخالف نیش پہلو بن کران کے گھر ہی پیدا ہوا۔ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتے ہیں:

ان عبد شمس و هاشما تو امان و ان احدهما ولد قبل الاخر و اصبع له ملصقة بجبهه صاحبته فحيت فسال الدم فقيل يكون بينهما دم دولّى هاشم بعد ابيه عبد مناف ما كان اليه من السقاية والرفادة فحسده اميه بن عبد شمس على رياسته فكانت اول عداوة وقعت بين هاشم و اميه(كامل ابن اثير)

عبد مناف کے دو بیٹے عبدشمس اور ہاشم جڑواں پیدا ہوئے تھے۔اس طرح کہ ایک کی انگلی دوسری کی

پیشانی سے چسپاں تھی۔ جب اس کو جدا کیا تو خون جاری ہو گیا۔ لوگ اس کو فال بد سمجھ کر کہنے لگے کہ ان دونوں میں خونریزیاں ہوں گی۔ جب ہاشم اپنے باپ عبد مناف کے بعد ان کی ریاست (سقایہ اور رفادۃ) کے رئیس اور ولی ہوئے تو امیہ بن عبد شمس کے دل میں ہاشم کی طرف سے رشک و حسد پیدا ہوا اور جو عداوت پشتہا پشت خاندان ہاشم اور قبیلہ بنی امیہ میں باقی اور قائم رہی۔ اس کی یہ ابتدا تھی۔

طبقات ابن سعد میں اس کی تفصیل یوں قلمبند ہے۔

فحسدہ امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قطی و کان ذا مال فتکلف ان ضیع ہاشم فعجز عنہ فشمت بہ ناس من قریش فغضب و قال من ہاشم و دعاہ الی المنافرہ فکرہ ہاشم ذلك لسنۃ و قدرہ فلم تدعہ قریش و احفظوہ قال فانی انا فرك علی خمسین ناقہ سود الحدق نحرھا بمکۃ والجلاء عن مکۃ

امیہ ابن عبد شمس بن مناف ابن قطی کو ہاشم کے ساتھ بوجہ امارت وحکومت رشک وحسد پیدا ہوا اور یہ صاحب مال و دولت تھا اور اپنے مال وقوت کے اعتبار سے انہوں نے ہاشم کے ساتھ عظمت وجاہت میں مساوی اور مقابل ہونے کے لحاظ سے وہی امور بجالانے کی کوشش کی جو ہاشم کرتے تھے لیکن حقیقتاً امیہ نہ کر سکا اور عاجز رہا۔ تمام لوگوں نے اس کی خفیف الحرکاتی پر سخت طعن تشنیع کی۔ امیہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے ہاشم سے اس کی شکایت کی اور اس کے ساتھ ہاشم کو منافرہ کی دعوت دی۔

عشر سنین فرضی میہ بذٰلك وجعل بینھما الکاھن الخزاعی فنفرھا شما علیہ اخذھا شم الابل فخرھا واطعمھا من حضرہ وخرج امیہ الی الشام فاقام لھا عشر سنین فکانت اول عداوت وقعت بین ھاشم و امیہ۔ طبقات ص45

ہاشم نے منافرہ کے انعقاد کو اپنی شان کے خلاف سمجھ کر انکار کر دیا۔ لیکن قوم وقبیلہ کے لوگوں نے اسکے وقوع پر مجبور کیا۔ بالآخر ہاشم نے امیہ کے ساتھ منافرہ کے یہ شرائط ٹھہرائی کہ جانبین سے جو فریق مغلوب ہوا وہ پچاس سیاہ آنکھوں والے اونٹ نحر کریگا اور دس برس تک مکہ کی سکونت ترک کر دیگا۔ امیہ نے یہ شرائط قبول کر لئے۔ جانبین سے قبیلہ خزاعہ کا ایک منصف مقرر ہوا۔ جانبین سے منافرہ قائم ہوا۔

اور اس میں ہاشم امیہ پر غالب آئے اور ہاشم نے وہ اونٹ شرط منافرہ کے مطابق امیہ سے لے کر ذبح کئے اور اسی وقت ان کا گوشت پکوا

کر تمام حاضرین مجلس کو کھلوا دیا۔ اور امیہ نے اسی وقت سکونت مکہ چھوڑ دی اور دس برس تک شام میں جا کر مقیم رہا۔ اور یہ پہلی عداوت تھی جو سلسلئہ ہاشمیہ اور خانوادہ امیہ کے درمیان واقع ہوئی۔

بہر حال یہ تھے ہاشم اور امیہ کے باہمی مفاخرت اور منافرت کے صحیح واقعات جو فریقین میں باوجود باہمی رحم متصل ہونے کے کامل طور سے جانبین کے فطرتی فرق مابہ الامتیاز کو ثابت کر رہے ہیں۔

مولوی شبلی صاحب کی واقعات صحیح سے صریح چشم پوشی

افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس واقعہ تاریخی کو جو سیرت بنی ہاشم کے لکھنے والے کو قلمبند کرنا از حد ضروری تھا بالکل مرفوع القلم فرما دیا ہے۔ حالانکہ قریب قریب تمام عربی ماخذوں میں بالتفصیل مندرج ہیں۔ اور ہم نے انہیں کے اصل ماخذ و مسند طبقات ابن سعد سے اوپر نقل کیا ہے اکثر حضرات بطور ظاہر اس فروگذاشت کو مولوی صاحب کی کوتاہ قلمی اور اتفاقی سہو سے تعبیر فرمائینگے۔ مگر ہم اسکو مولوی صاحب کی کمال عاقبت اندیشی اور نہایت دور بینی تسلیم کرینگے۔ شبلی صاحب نہ کوتاہ قلم ہیں اور نہ سہو و نسیان کے ملزم۔ وہ ان مضامین کے انتخاب و اندراج کے غور و فکر کے متعلق امام بخاری اور ابن حجر وغیر ہم کے ہم وزن اور ہم سنگ ہیں۔ بلکہ ان امور کے اظہار و استشہار میں ان حضرات سے زیادہ محتاط اور محدود۔

ہاشم و امیہ کے واقعات ہی کو آپ نے مخالف و مقاصد پا کر نہیں چھپایا ہے بلکہ قصٰی ابن کلاب اور ہاشم ابن عبد مناف کے ان خطبات کو بالکل قلمزد فرما دیا ہے۔ جو خدمت کعبہ اور ضیافت حجاج کے متعلق مجمع قریش میں بیان کئے گئے تھے۔ اور جس میں اہلبیت کے قدیم مفاخر و مشارف کا اظہار کیا گیا تھا۔ اور یہ دونوں خطبے طبقات ابن سعد میں جو شبلی صاحب کی تمام تحقیق کا اصل معیار ہے موجود ہیں۔ مولوی صاحب نے مرقومہ بالا دونوں واقعات کو عمداً حفظ ماتقدم کے لحاظ سے اس لئے چھپایا اور مرفوع القلم فرمایا کہ ان واقعات سے سلاطین امویہ کے معاقب و مناقص اور بنی ہاشم کے فضائل و مناقب کا پورا پورا انکشاف ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں امر آپ کے مدعا کے خلاف تھے۔ کیونکہ سلاطین امویہ کے ساتھ آپ کو دلی ارادت اور قلبی عقیدت کا شرف بھی حاصل تھا۔ اور ولید ابن عبدالملک آپ کی مجوزہ تالیفات اسلامی ہیروز کی فہرست خاص میں داخل تھا۔ رسول صلعم کے انتقال فرمانے کے بعد بنی ہاشم اور بنی فاطمہ سے آپکو واسطہ اور تعلق رکھنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ پھر ان امور کے اظہار و انکشاف کو اس کے مرکز اور مبداء سے مستاصل کرنا اور استخفاف کی کماحقہ کوشش کرنا جس سے اپنے ممدوحین کے مصائب اور بے ضرورت اور بے کار لوگوں کے مناقب نہ ظاہر ہونے پائیں آپ کا فرض لازمی اور نصب العین قائمی تھا۔

مگر بایں ہمہ یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ شمس العلماء صاحب دنیا میں اکیلے باریک بین یا روشن ضمیر تو تھے ہی نہیں ان کے ایسے سینکڑوں اور ہزاروں دور بین، بالغ نظر، حقیقت حال کا سراغ لگانے والے اور بال کی کھال نکالنے والے خدا کے ایسے بندے موجود ہیں جو مولوی صاحب کے استخفاف کے پھندے دار جالوں کو توڑ کر حقیقت حال کا پورا پورا مشاہدہ اہل دنیا کی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

اہل بیت

تمہیداً اتنا لکھ کر ہم اپنے مدعائے حقیقی کی طرف آ جاتے ہیں۔ چونکہ شبلی صاحب کے قلمزد واقعات سے ہمارے بہت سے موجودہ اور آئندہ مضامین کو پورا تعلق ہے اس لئے ان کی تحقیق اور تفصیل ہمارے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ہمیں قصی اور ہاشم کے خطبات سے ،اہل بیت اور ان کے خصائص ،فضائل ومناقب جن کو ہم دونوں خطبوں کے اصل عربی الفاظ میں ابن سعد کی عبارت سے اوپر لکھ آئے ہیں ۔ یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اہل بیت کا لقب خطاب اور منصب عرب میں نہایت قدیم اور ہمیشہ قابل تعظیم وتحریم تسلیم کیا گیا ہے اور اس مبارک لقب وخطاب سے انہیں معززین کی مخصوص جماعت قرار دی جاتی تھی جو بیت اللہ کے منصب تولیت پر فائز ہوتے تھے۔اور اپنے ذاتی اور صفاتی کمالات کے اعتبار سے تمام قوم وقبیلہ میں واجب الاحترام سمجھے جاتے تھے۔اور یہ مسلم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ واسماعیل سلام اللہ علیہما بیت اللہ کی عمارت مقدسہ کی بحکم خدا بنیاد رکھ کر اسکو تکمیل تک پہنچایا۔سب سے پہلے خدا سبحانہ وتعالی نے انہیں بزرگواروں کو اہل بیت کے معزز لقب سے بطور خاص مشرف فرمایا ان کے بعد ان کی ذریت اور سلسلہ نے اپنے آپ کو اس خطاب سے مخاطب کئے جانے کو ہمیشہ اپنا خاص استحقاق اور خاندانی افتخار قرار دیا۔اور یہ لوگ اپنی اس حقانی مفاخرت واعزاز اور اس روحانی شرف وامتیاز کو کسی حال اور مقام میں نہ بھولے۔اگرچہ زمانہ کی مساعدت اور اہل زمانہ کی ناموافقت نے ایک مدت مدید تک ان کا گریبان نہ چھوڑا اور دنیا کے انقلابات اور نامہربان قوم وقبیلہ کے باہمی اختلافات نے ان کے تمام آثار واقتدار کو مٹا کر ان کو ایسا کمزور اور ضعیف بنا دیا کہ بالآخر ان کو سکونت مکہ ترک کر کے ادھر ادھر جا کر آباد ہونا پڑا۔جیسا کہ عربی تاریخیں یک زبان ہو کر بتلا رہی ہیں۔مگر اس درمیان میں جب کبھی ان کی حالتوں میں ذرا بھی قوت آئی۔انہوں نے سب سے پہلے اپنے اہل بیت ہونے کے حقوق پر بیت اللہ مقدس کی تولیت کا مطالبہ کیا ان کوششوں میں ان کو کبھی وقتی اور عارضی کامیابی بھی ہوئی اور کبھی قطعی ناکامی۔جیسا کہ نصر ابن کنانہ اور فہر ابن مالک کے حالات سے ظاہر ہے۔مگر باوجود ان تمام مطالبات مشکلات اور مصائب کے وہ اپنے اصلی حقوق کی خواستگاری سے دست برداری نہ کر سکے یہاں تک کہ قصی ابن کلاب نے آخر اسکو بزور باز واپنے فریق مخالف سے واپس لیا۔اسی لئے قصی نے اپنی قوم وقبیلہ کی جماعت میں اپنی فتح یابی کے بعد بیت اللہ مبارک کی خدمات اور اسکی انتظامی ترتیب وترمیم کے متعلق جو خطبہ دیا ہے اور انکو اس کی انجام دہی کی طرف مخاطب کیا ہے اس میں ان کو اہل بیت کے خاص لفظ سے منسوب کر کے ان کے فضائل ومناقب کو انہیں یاد دلایا ہے۔

پھر قصی ابن کلاب کے بعد عبد مناف نے بنی عبدالدار سے جو باقرار ابن سعد **کان ضعیفا و کان اخوته قد شرفوا علیه** (عبدالدار ضعیف المزاج آدمی تھا اور اسی وجہ سے اس کے اور بھائیوں کے اوپر شرف اور غلبہ ہو گیا۔اختیارات تولیت خانہ کعبہ اور امارت شہر کو منتزع کر لیے۔یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ عبدالدار حقیقتاً ان مناصب جلیل کے لیے شایاں وشان اہل نہ تھا۔اسی طرح عبد مناف کے بعد حضرت ہاشم نے اپنے وقت میں رفادہ اور سقایہ کی خدمات جو بنی عبدالدار کے پاس تھیں۔واپس لے لیں۔صرف اس لیے کہ وہ فیاضی اور کشادہ دلی سے حجاج کے اتنے بڑے مجمع کی ضیافت اور سقایت نہیں کر سکتے تھے۔لطف تو یہ ہے کہ ان عہدوں کی واپسی لے جانے والے شوری میں عبدالشمس بنی امیہ کے باپ بھی داخل تھے۔

جب بنی عبدالدار سے یہ اختیارات واپس مل گئے تو ہاشم نے اپنی حسن انتظامی اور خوش لیاقتی سے ان خدمات کو باحسن الوجوہ انجام دیا اور تمام قوم وقبیلہ کی ترقی اور مرفہ الحال کا ایسا انتظام کیا جو آج تک نہیں ہوا تھا۔ امیہ کو ہاشم کے ساتھ اتحاد نسبی اور اصلیت کی یکجہتی کے غلط قیاس پر مساوات، برابری اور ہمسری کا خیال ہی پیدا ہوا۔ انہیں خیالوں کے ساتھ رشک وحسد بھی اشتعال طبع کے باعث ہوا۔ حالانکہ سلسلہ واقعات سے برابر ثابت ہو چکا ہے کہ اس منصب جلیل کے حصول کے اسباب کوشش انسانی سے زیادہ تدبیر ربانی اور تقدیر یزدانی سے مہیا اور فراہم ہوتے ہیں اور ظاہری طور پر تمام قوم وملک کا اسی خوش نصیب اور اقبال مند شخص واحد پر اتفاق واتحاد بھی ہو جاتا ہے جس کو مدبرین قدرت اس عہدہ جلیلہ کے لیے پہلے سے منتخب کر لیتے ہیں۔ ورنہ اہل عرب اور ان کے قوم وقبائل کے دائمی اختلاف سے کبھی ایسے ایسے متحدہ اور متفقہ نظام قومی اور ملکی کی امید نہیں ہوسکتی ہے۔ مگر حقیقت کے جوہر شناس خوب جانتے ہیں کہ یہ قدرت کے خاص تصرفات تھے جو اپنی عملی صورتیں پیدا کرنے کی ضرورتوں سے ان میں فوراً اتفاق واتحاد پیدا کر دیتے تھے۔ جیسا کہ قصٰی بن کلاب، عبد مناف اور حضرت ہاشم کے حالات وواقعات سے ثابت ہوتا ہے۔

یہ امر بھی ضروری اور لحاظ کے قابل ہے کہ اس منصب جلیل کے حصول کے وقت ہر بزرگ قوم نے خاص طور پر لقب اہل بیت کی خصوصیت کے ساتھ اپنے مفاخر کا اظہار کیا ہے۔ قصٰی اور ہاشم کی تقریریں صاف صاف اس دعوٰی کو بتلا رہی ہیں۔ ظاہری طور پر اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ اتحاد اصل اور نسل کی بنا پر قریش پر کیا منحصر ہے تمام ذریت اسماعیلؑ اس لقب سے یاد کیے جانے کی مستحق ہے۔ مگر اس تعمیم میں ایک روحانی تخصیص بھی صاف طور پر مضمر ہے جس کو مشاہدات تاریخی علیحدہ کر کے بتلا رہے ہیں کہ وہ تخصیص عام طور سے ہر شخص کے اختیار وقابو میں نہیں تھی کہ جس وقت جو چاہتا وہ حاصل کر لیتا۔ یہ مخصوص اہلیت اور قابلیت جبروت قدرت کے متعلق تھی اور اس میں انسانی تدبیر وتجویز کو بہت کم مداخلت تھی۔ ورنہ بنی عبدالدار پر عبدمناف کو اور بنی عبدمناف پر ہاشم کو اور پھر اسی طرح امیہ بن عبدالشمس پر ہاشم کو باعتبار ہم حسبی اور ہم نسبی کے ترجیح وتفضیل کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔

بنی عبدالدار اور بنی عبدمناف کی مخالفتیں نہ ایسی شدید تھیں اور نہ اتنی دیرپا۔ اور نہ شیوع اسلام تک ان کا کوئی اثر اسلام کی مضرت یا مخالفت کا باعث ہوا۔ سوائے اسکے کہ بنی عبدالدار اور بنی عبدمناف نے مشرکین قریش اور کافرین مکہ کا ساتھ دیا اور عام اہل عرب کی طرح اسلام کے مخالف بنے رہے۔ اس لئے ان کی مخالفت اتنی قابل الذکر نہیں۔ بخلاف اسکے بنی امیہ کی دائمی اور قائمی مخالفت اس وقت سے لے کر ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ جب تک کہ اس نے بنی ہاشم اور خاندان رسول سلام اللہ علیہ کو بالکل خاک وخون میں غلطان نہ کر لیا۔ ہاشم کے مقابلہ میں امیہ کا دعوٰی ہمسری۔ امارت مکہ۔ تولیت کعبہ۔ اور اہل بیت کہلانے کی آرزو نسلاً بعد نسلاً اور بطناً بعد بطناً بنی امیہ کے خاندان میں برابر قائم رہی۔ ہاشم سے امیہ کا مقابلہ۔ عبدالمطلب سے حرب ابن امیہ کا سامنا ہوا۔ ابوسفیان ابن حرب کا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقاتلہ معاویہ ابن ابوسفیان کا امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ متواتر معرکے تاریخ کے ایسے مشاہدات ہیں جن سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ معاویہ ابن ابوسفیان کو آخر وقت میں ہزاروں مغویانہ اور مفسدانہ مکر وحیلہ اور جعل وفریب سے امارت حکومت عرب ملی بھی تو وہ صرف ان کو امیر بنا کر تمام ہو گئی۔ اور باوجود اتنی سطوت وثروت کے بھی کسی نے ان کو اہل بیت کے

معزز اور گرانمایہ القاب وخطاب سے کبھی مخاطب نہ کیا
اسی سے حقیقت میں آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اور اصلیت شناس قلوب پہچان لیتے ہیں کہ اتنی شدید اور مدت مدید کی مخالفت کے بعد بھی بنی امیہ کو بنی ہاشم سے اس روحانی مفاخرت اور عظمت وجلالت کے واپس لینے میں کبھی کامیابی نہ ہوئی جس کے حصول کیلئے انہوں نے امیہ کے وقت سے ابتدا کی تھی۔

بہرحال پہلے قصّی نے اور قصّی کے بعد ہاشم نے اہل بیت کی روحانی عظمت وجلالت پر کسی قدر روشنی ڈالی تھی اور انکے اعزاز وامتیاز سے قوم وملک کو آگاہ کیا تھا۔مگر پھر انہیں حضرت ہاشم کے زمانہ سے یہ منصب جلیل جیسا کہ نظام الٰہیہ کی مشیت ظاہر ہوتی ہے۔انہیں کے سلسلہ میں ایسا قائم اور مستقل ہوگیا کہ پھر ذریت اسماعیلی یا سلسلہ قریش کے کسی دوسرے شعبہ یا فرع میں نہ گیا اور نہ انشاء اللہ المستعان ابدالاباد تک جائیگا۔اسلام اور ربانی اسلام علیہ السلام نے عہدہ جلیلہ اہل بیت کی روحانی عظمت وجلالت کو نصوص۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم اھل البیت الرجس ویطھر کم تطھیرا

تحقیق کہ خداوند تعالی نے ارادہ کرلیا ہے کہ اے اہل بیت تم سے تمام آلائشوں کو دور رکھے اور ایسا پاک و پاکیزہ رکھے جو پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

قالو اندع ابنائنا وابنآئکم نسائنا ونسآئکم وانفسنا وانفسکم

(نصاریٰ) سے کہہ دو کہ ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو۔ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو (مباہلہ) کیلئے بلاؤ۔

قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ

(اے پیغمبر مسلمانوں سے) کہہ دو کہ میں تبلیغ رسالت کا تم سے کوئی معاوضہ یا اجرت نہیں مانگتا ہوں۔
سوائے اس کے قرابت مندان رسول کے ساتھ محبت رکھو۔

کے مطابق پورے طور سے بتلا دیا اور تمام دنیا کو سمجھا دیا کہ اس لقب جلیل کی عطا وتفویض کا تعلق بالکل خدا کی مشیت سے ہے نہ بندے کی کوشش وہمت سے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ بنی ہاشم کے فضائل ومناقب اور بنی امیہ کے مناقص ومعائب بھی بتلا دیئے اور ثابت کردیا کہ فطرت اور خلقت کے اصول اختلافی کے مطابق بنی امیہ کو بنی ہاشم سے کبھی ہمسری اور مساوات کا حق حاصل نہیں ہوسکتا تھا اور قرابت و رشتہ مندی کے ظاہری اتحاد ان کے روحانی اختلاف اور باطنی امتیاز کو زائل نہیں کرسکتے تھے۔اس کے ثبوت وتصدیق میں حدیث و تاریخ کے اخبار وآثار کثرت سے موجود ہیں۔جن میں سے چند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔صحیحین بخاری ومسلم اور ترمذی میں مرقوم ہیں۔

عن عائشہ قال قال رسول اللہ ﷺ ان اللہ اصطفی من بنی کنانہ قریشا ثم اصطفی من قریش بنی ھاشم

حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ فرمایا جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ خدا سبحانہ تعالی نے بنی کنانہ سے قریش کواور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کرلیا۔

قاضی عیاض نے اپنی کتاب شفاء میں لکھا ہے۔

عن واثله ابن الاسقع قال قال رسول الله ان الله اصطفی من ولد ابراهیم اسمٰعیل و اصطفی من ولد اسمعیل بنی کنانه قریشا و اصطفی من قریش بنی هاشم و اصطفانی من بنی هاشم۔ اخرجه ایضا فقال هذا حدیث صحیح

واثلہ ابن الاسقع سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ برگزیدہ کیا اللہ تعالی نے اولاد ابراہیم میں بنی اسمٰعیل کو اور بنی اسمٰعیل میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں مجھ کو اس حدیث کو ترمذی نے بھی لکھ کر بتایا ہے کہ حدیث صحیح ہے

تاریخ ابوالفدا میں ہے

عن عائشة قالت قال رسول الله صلی الله علیه و سلم قال لی جبریل قلبت الارض مشارقها و مغاربها فلم اجد احدا افضل من محمد و قلبت الارض مشارقها و مغاربها فلم اجد بنی اب افضل من بنی هاشم

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جبرائیل نے کہا میں نے روئے زمین میں مشرق سے مغرت تک گشت کی کسی شخص کو محمد صلعم سے افضل نہ پایا اور پھر میں نے روئے زمین کو مشرق سے مغرت تک گشت لگا کر دیکھا مگر کسی باپ کے بیٹے کو بنی ہاشم سے افضل نہ پایا۔

تاریخ وحدیث کے مرقومہ بالا معتبر و مستند مشاہد میرے مدعائے بیان کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ ان سے بنی امیہ پر کیا منحصر ہے۔ تمام قریش اور جمیع سلسلہ اسماعیلی اور جملہ ذریات ابراہیمی پر بنی ہاشم کی فضیلت اور ترجیح قطعی طور پر ثابت ہے۔ ایسے مخصوص شرف و مفاخر کے مقابلہ میں بنی امیہ کے قبیلہ کی کیا ہستی اور کیا وجود ہے۔ جو بنی ہاشم سے شرف وفضیلت میں مقابلہ کرے۔ اس کی حقیقت اور وجود اسلام اور بانی اسلامؐ کی نگاہوں میں جتنا اور جیسا کچھ ثابت ہوا ہے وہ ذیل کی تفسیر وحدیث کی متفقہ اور متحدہ شہاد و اسناد سے کما حقہ ظاہر ہے۔ امام جلال الدین سیوطی تفسیر درمنثور میں لکھتے ہیں۔

اخرج ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و الطبرانی فی الاوسط و ابن مردویه والحاکم و صححه من طرق علی ابن ابی طالب رضی الله عنه فی قوله تعالی

الم ترا الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفرا قال هما الافجران من قریش بنو امیہ و بنو المغیرۃ

ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، ابن مردویہ اور حاکم نے بطریق صحیح حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے دین خدا کو کفر سے بدلا وہ فاجر ترین قوم قریش بنی امیہ اور بنو مغیرہ ہیں۔ تفسیر در منثور

عالم اسلام میں بنی امیہ کی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے اس کے باوجود پھر وہ کون لایعقل ہوگا جو ان کو بنی ہاشم کا ہم وزن اور ہم پایہ خیال کرے گا۔ بنو عبد مناف ہونے کی اجداد کی تنہا بناء پر نا ہموار ان بنی امیہ کو بزرگوار ان بنی ہاشم کا مقابل ٹھہرائے گا بلکہ بخلاف اس کے ان کو اعیان قبیلہ ہاشم کا بالکل مخالف اور متضاد پائے گا۔

بہر حال مرقومہ بالا اسناد و اشہاد سے بنی امیہ کے اس وہم و گمان کی پوری تردید کر دی گئی ہے جو ان کے دلوں میں بنی ہاشم کے ساتھ مساوات فی المراتب حاصل ہونے کے متعلق خطور کر رہے تھے۔ بنی امیہ پر بنی ہاشم کی فضیلت و شرافت کو قرآن و حدیث، تفسیر اور حدیث سے ثابت کر کے ہم اہل بیت کے اعزاز و امتیاز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہم اس اعزاز قدیم کی عظمت و حرمت مخصوصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے قصٰی اور ہاشم کے زمانوں تک ثابت کر آئے ہیں اور مشاہد تاریخی سے بتلا آئے ہیں کہ وہ اپنے ان مراتب و مدارج پر اس وقت سے لے کے اس وقت تک دیگر اقوام کے مقابلہ میں برابر شرف و مفاخرت کا خاص طور پر اظہار کرتے آئے۔ باوجودیکہ ایک وقت مدید تک ان کے یہ اقتدار و آثار ان کے قبضہ اختیار سے نکل گئے ان کی حالت بالکل خراب ہوگئی اور عرصہ دراز تک یہ گمنام اور بے نام و نشان رہے۔ لیکن اس ضعف و اضمحلال کی خاص حالتوں میں بھی انہوں نے اپنے اس خاندانی شرافت و عظمت کا دعویٰ اور مطالبہ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ قصٰی ابن کلاب اور ہاشم ابن عبد مناف نے ان تمام اختیار کو اغیار کے قبضہ اختیار سے واپس لے لیا جیسا کہ ابھی ابھی تاریخی اسناد سے اوپر لکھا گیا ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے اپنی قوم و قبیلہ کو اسی لفظ اہل بیت سے ان کے قدیم اقتدار و عظمت کو یاد دلا کر درستی احوال اور ترقی اموال کی راہوں پر لگایا۔ حضرت ہاشم تک تو اسی منصب کو قریش اپنا موروثی اعزاز سمجھتے رہے مگر ہاشم کے بعد جب بنی ہاشم کے ساتھ اس کا مخصوص تعلق قائم ہو گیا تو اہل بیت سے صرف بنی ہاشم سمجھے جانے لگے۔ ہاشم کے وقت تک گو بنی عبد مناف، بنی عبد الدار وغیرہ قبائل و عشائر کے۔ جدا جدا تخصیصی نام رکھے گئے تھے۔ مگر حقیقتاً سب قریش کے ایک ہی نام سے مشہور تھے۔ مگر ہاشم کے بعد بنو ہاشم کے مخصوص اور جداگانہ تفریق قائم ہو گئی۔ طبقات ابن سعد میں ہے۔

اوصی هاشم ابن عبد مناف الی اخیہ مطلب ابن عبد مناف فبنوا هاشم و بنو مطلب یدواحدہ الی الیوم و بنو انوفل و بنوا عبد شمس اما عبد مناف ید

واحدہ الی الیوم (ص 6 ج 1)

ہاشم ابن عبد مناف نے اپنے بعد اپنے بھائی مطلب ابن عبد مناف کو اپنا وصی قرار دیا۔ اسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو مطلب ایک ہو گئے اور آج تک ایک ہیں۔ اسی طرح بنو نوفل اور بنو عبد شمس (بنو امیہ) ایک ہو گئے اور آج تک ایک ہیں۔

اس بنا پر وہ تمام روحانی عظمت واقتدار بنو ہاشم کی طرف ودیعت ہو گئے اور ان کی سیرت وعادت سائر قریش سے بالکل علیحدہ ہو گئی اور اب اہل بیت کا مقدس ومعزز لقب بھی کلیتاً اور قطعاً انہیں سے متعلق ہو گیا۔ اصل میں تو اہل بیت کے اعزازی خطاب اور امتیازی القاب سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل وعیال کو جنہوں نے بیت الٰہی کی تعمیر کو انجام دیا اور سب سے پہلے اس کی خدمت پر مامور ہوئے۔ منجاب اللہ تفویض فرمایا گیا جیسا کہ نصوص قرآنی سے ثابت ہے۔ حضرات ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے بعد سے حضرت ہاشمؑ کے وقت تک اسی سلسلہ اور خانوادہ کے لوگ اصول وتوریث کی بنا پر اس کو اپنا جائز حق سمجھتے رہے۔ مگر جہاں تک تحقیق کی جاتی ہے اس کی حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ اس منصب کا تعلق اور اس گرانمایہ القاب وخطاب کی تفویض بھی حصول رسالت اور نزول نبوت کے ساتھ ساتھ تھی۔ چونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام رسالت ونبوت کے عہد ہائے جلیلہ پر فائز تھے اس لیے خدمات کعبہ بھی انہیں مقدسین کے سر دھوئی اور سب سے پہلے یہی گرانمایہ القاب وخطاب اہل بیت سے مخصوص ومعروف فرمائے گئے۔ حضرت ہاشم کے زمانہ تک چونکہ اس سلسلہ میں کسی کو منصب رسالت اور عہدۂ نبوت تفویض نہیں ہوا مگر ہاں اس سلسلہ ابراہیمی اور خانوادہ اسماعیلی میں محامد واوصاف کریمہ اور افعال واعمال حسنہ سے آراستہ وپیراستہ پایا گیا۔ وہ اس خطاب والقاب کا خاص کر مستحق وسزاوار سمجھا گیا۔ گو اس کے قبیلے اور عشیرے والے برائے نام اہل بیت ہونے کے دعویدار زبانی بنے رہے مگر یہ دعوے انہیں کے لئے خاص ہو کر رہ گئے۔ عام لوگوں نے نہ اسے منظور کیا اور نہ مشہور جیسا کہ بنی ہاشم کے مقابلہ میں بنی امیہ کے زبانی جمع خرچ ہاشم ابن عبد مناف کے بعد اس کی تخصیص بنی ہاشم کے ساتھ ہو گئی جیسا کہ ہم ابھی ابھی اوپر لکھ آئے ہیں۔ مگر بنی ہاشم کی تخصیص، انتخاب اور اصطفا اگرچہ احادیث سے ثابت ہے مگر یہ اختصاص وانتخاب بھی ان کے محامد ومحاسن ذاتی پر مبنی تھا۔ اور اس کے اجزائے رسالت اور شعبائے نبوت سے تعلق نہیں تھا۔ مگر حضرت ہاشم سے چوتھی ہی پشت میں جناب سید المرسلین اور خاتم النبیین سلام اللہ علیہ وآلہ کو قدرت نے مبعوث فرما کر آپ کے انوار رسالت اور شعاع نبوت سے خاندان ہاشم اور دودمان عبد المطلب میں چار چاند لگا دیے۔ **واللہ یختص برحمتہ من یشاء** بارگاہ قدرت اور آئینگاہ مشیت سے اس شرف مخصوص اور فضائل ومراتب کی سند منصوص اس خانوادہ مطہر کے لیے جدید اور مزید کر دی گئی۔ **وھذا فضل اللہ یوتیہ من یشآء** اور اہل بیت کا مقدس خطاب والقاب اس خاندان کے لیے مستقل اور ابدی کر دیا گیا اور اس عہدۂ جلیلہ سے تعمیم کے قدیم قیاسات وتوہمات کو بالکل مستاصل ومنسیت ونابود کر کے صرف پانچ نفوس **قدسیہ خمستہ النجبار** کو (پنجتن پاک علیہم السلام) اور ان کے بعد ان کی اولاد معصومین کو۔ اس عظمت وجلالت کا اصلی مستحق قرار دیا۔ جو نصارائے نجران کے ساتھ مباہلہ کے موقع پر منکرین مسیحی کے مقابلہ میں خدا کی وحدانیت اور اس کے رسول برحق کی صداقت ثابت کرنے کے لئے خدا کے آگے کھڑے کیے گئے

تھے۔اس وقت اہل اسلام کی اتنی کثیر جماعت میں یہی پانچ نفوس قدسیہ خدا کی توحید اور رسول کی نبوت کی تصدیق کے شاہد معتبر دستیاب ہوئے اور ان کے اسی تکملہ ایمانی اور مجاہدہ نفسی کے عوض میں ان بزرگواروں کو انما یرید اللہ کی بشارت تفویض فرمائی گئی جیسا کہ ان شاء اللہ بالتفصیل اپنے مقام پر بیان کی جائے گی۔

سیرت النبی جلد اول میں شبلی صاحب نے ہاشم وامیہ کی تفضیل وترجیح اور مخالفت ومشاجرت باہمانہ کو خاص طور پر اس لیے چھپایا اور اتنے بڑے واقعات تاریخ کو مرفوع القلم فرمایا کہ نہ بنی ہاشم کے فضائل ومراتب ظاہر ہوسکیں اور نہ بنی امیہ کے مناقص ومعائب اور بنی قصی اور بنی عبد مناف ہونے کی یکجہتی کے مغالطہ میں پڑ کر ان دونوں متضاد قبائل وعشائر میں ہمسری اور برابری سمجھی جاوے اور آپس کی مخالفت ومخاصمت سے بالکل بے علم اطلاع رہ کر جانبین میں مراسم واتفاق واتحاد اور ذرائع اخوت ومحبت یقین کئے جائیں۔وان ھذا ضلال مبین۔

شبلی صاحب کی یہ ایجاد بھی طبعزاد نہیں ہے بلکہ تحقیق سے اس کی ابتدا بھی معاویہ کے مبتدعات ومخترعات پر منتہی ہوتی ہے۔چنانچہ معاملات صفین میں پہلا خط جو معاویہ نے جناب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا ہے اس کی عبارت عنوان یہ تھی:

> ہم بنی عبد مناف ایک چاہ سے پانی پیتے تھے اور ایک ماں کی چھاتی سے دودھ۔
> ہم میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں تھی اور ہمارا کوئی قائم اپنے قائد پر فخر وافتخار نہیں رکھتا۔مجبور اور ممتاز ہمارے دونوں مؤید تھے۔اور ہماری جماعت متفق تھی۔ترجمہ تاریخ اعثم کوفی۔

مولوی شبلی صاحب کی تنہا کوششوں سے حقیقت کا استخفاف نہیں ہوسکتا۔ان کے اختیار وقدرت میں بس اتنا ہی تھا کہ وہ اپنی کتاب میں لکھیں جیسا انھوں نے کیا۔مگر ان بے شمار کارناموں کو کیا کریں گے جو دو ہزار برس سے ان واقعات کی حقیقت کا تمام دنیا کو مشاہدہ کرا رہے ہیں۔

سلمیٰ بنت عمر سے عقد اور وفات

مرقومہ بالا مشاہدات تاریخی سے ثابت ہوگیا کہ امیہ ابن عبدالشمس کی حسد ونفسانیت ہاشم کی عظمت اور اقتدار کا کچھ بگاڑ نہ سکی بلکہ اس کے خلاف تمام اہل عرب نے امیہ کو خفیف الحرکات، حاسد اور ناقابل سمجھ۔حضرت ہاشم بڑی ثروت، بڑے اقتدار اور بڑی شان و شوکت سے امارت مکہ اور تولیت خانہ کعبہ کے خدمات انجام دیتے رہے اور تمام ملکی اور قومی رفاہ واصلاح کی تدبیروں اور کوششوں کو کسی وقت نظر انداز یا فراموش نہ کرسکے۔حکومت وامارت کے ملکی نظام وتدبیر کے علاوہ قومی تجارت اور کاروبار کی ترقی وکامیابی کی تجویزیں ہمیشہ پیش نظر رہیں اور کہیں اس سے ناتوجہی اختیار نہ کی۔کاروان تجارت کے ساتھ خود آتے جاتے رہے۔راستوں، گذرگاہوں اور منزلوں میں اہل کاروان اور ان کے سامان کی حفاظت اور امن وامان کے انتظام واہتمام فرماتے رہے۔یہاں تک کہ اس شیدائے ملک و

وطن اور فدائی قوم نے انہیں فکر و انتظام میں اپنی جان نثار کر دی۔ تفصیل یہ ہے ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں:

فخرج هاشم فی عیرالقریش فیها تجارات و کان طریقهم علی المدینه فنزلو السوق النبط فصادفوا سوقا تقوم بها فی السنة یحشدون لها نبا عوادا اشتروا و نظروا الی امرة علی موضع مشرف من السوق فرای امرئة قام بما یشتری ویباع لها فرای امراة حازمة جلدة مع جمال فسائل هاشم عنها ایم هی ام ذات زوج فقیل له ایم کانت تحت اجة بن الجلاح فولدت له عمرا و معبد ثم فارقها و کانت لا تنکح الرجال لشرفها فی قومها حتی یشرطوا لها ان امرها بیدها فاذا کرهت رجلا فارقته و هی سلمی بنت عمر بن زید بن لبید بن خداش بن عامر ابن غنم ابن عدی النجار فخطبها هاشم فعرفت شرفه و نسبه فزوجة نفسها ود خل بها وصنع طعاما و دعا من هناك من اصحاب العیر الذین کانوا معه و کانو اربعین رجلا من قریش فیهم رجال من بنی عبد مناف و مخزوم وسهم و دعا من الخزرج رجالا و قام باصحابه ایاما و علقت سلمی لعبد المطلب فوارته و فی راسه شیبه فسمی شیبه و خرج هاشم فی اصحابه الی شاام حتی بلغ غزه فاشتکی فاقاموا علیه حتی مات فدفنوه بغزة (ص46)

ہاشم کاروان قریش کے ساتھ بغرض تجارت نکلے اور مدینہ کے راستہ پر بازار نبط میں پہنچے۔ جہاں ہر سال بہت بڑا بازار لگا کرتا تھا اور قرب و جوار سے لوگ جمع ہو کر خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور اس وقت بھی لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ اور ایک زن معظّمہ کی طرف متوجہ ہوئے جو بازار کے ایک مقام بلند پر مقیم تھی اور وہ خاتون ان لوگوں کو اپنی اشیائے ضروری کی خرید و فروخت کے لیے حکم کرتی تھی اور سب لوگ اس کی طرف سے خرید و فروخت کر رہے تھے۔ وہ قبول صورت صاحب جمال خاتون تھی۔ ہاشم بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اس کی نسبت لوگوں سے پوچھا کہ یہ بیوہ ہے یا صاحب شوہر ہے تو معلوم ہوا کہ زن بیوہ ہے۔ یہ پہلے احیجہ بن جلاح کے حبالہ نکاح میں تھیں اور ان سے اس کے دو بیٹے عمر اور معبد نامی پیدا ہوئے اس کے بعد اججہ نے طلاق دے دی اور آپ یہ اپنی شرافت و نجات ذاتی کی وجہ سے کسی

مرد سے اس وقت نکاح کرنا نہیں چاہتی تاوقت کہ وہ مرد اس امر کا اقرار نہ کر لے کہ نکاح کے بعد ان کو اختیار رہے گا کہ اگر وہ اس کو ناپسندیدہ پائے گی تو اس سے مفارقت اختیار کر لے گی۔ان کا نام سلمیٰ بن عمر بن عمر بن زید بن لبید بن خداش بن عامر بن غنم بن عدی قبیلہ بنونجار سے ہیں۔ یہ سن کر ہاشم نے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا کیونکہ وہ صاحب حسن و جمال تھیں۔سلمیٰ کو جب ہاشم کی شرافت حسبی نسبی کا حال معلوم ہو گیا تو ہاشم سے نکاح کر لیا۔ ہاشم نے عقد سلمیٰ کے ولیمہ کی بڑی تیاری کی۔کھانا پکوایا اور جتنے لوگ کاروان قریش میں اس وقت اس کے ساتھ تھے سب کی دعوت کی۔سب کو بلایا اور کھلایا۔اور سب مجموعہ چالیس آدمی تھے اور ان میں بنی عبد مناف، بنی مخزوم اور بنی سہم کے قبیلے والے موجود تھے۔سلمیٰ کی کی طرف سے خزرج کے قبیلے والے بھی بلائے گئے۔شادی کے بعد ہاشم نے چند دن وہاں قیام کیا۔ انہیں دنوں سلمیٰ کو عبدالمطلب کا حمل رہ گیا۔اس کے بعد ہاشم اپنے اصحاب کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔مقام غزہ پہنچ کر بیمار پڑ گئے۔ان کی علالت کی وجہ سے قافلہ والوں نے وہیں قیام کیا۔ہاشم نے بالآخر کر وہیں وفات پائی۔قافلہ والوں نے غزہ ہی میں ان کو دفن کر دیا۔طبقات ج 1 ص 46۔

ہاشم کی وفات تقریباً 510ء میں واقع ہوئی اور یہی عبدالمطلب کا سال ولادت بھی ہے۔مرقومہ بالا واقعات انہیں مضامین کے ساتھ سیرت ابن ہشام ص 66 مطبوعہ مصر میں بھی مندرج ہیں۔حضرت ہاشم کے جیسے محسن، سرپرست اور نمودار قوم و ملک کی وفات پر مرثیہ نہ لکھے جائیں۔امکان سے باہر ہے۔اہل عرب نے ان کی وفات پر بے شمار مراثی لکھے ان تمام مراثی میں ان کی دو صاحبزادیوں کے دو مرثیے خاص طور پر مشہور ہیں اور عرب کی تاریخ و ادب کی کتابوں میں آج تک محفوظ و مسطور ہیں۔ہم ابن سعد اور ابن ہشام کے جامعات سے ان کا ایک ایک شعر ذیل میں نقل کرتے ہیں۔خالدہ بن ہاشم کا شعر:

بکرا النعی بجیر من وطئ الحسی

ذی المکرمات و ذی الفمال الفاضل

بہترین گریہ زاری اس نیکوکار کے لیے شایان شان ہے جو اپنے قبیلہ و جماعت میں سب سے بہتر تھا۔صاحب مکارم تھا اور صاحب اعمال حسنہ

شفاء بنت ہاشم کے مرثیہ کا یہ شعر ہے:

عین جودی بعرۃ و سجوم

و اسفحی الدمع للجواد الکریم

اے آنکھ اس غم و مصیبت میں اور اس کریم و جواد مرد بزرگ کے لیے رو اور اپنے آنسو بہا

حضرت ہاشم کا نام عمر ابن مناف اور لقب ہاشم تو تمام تاریخ وسیر میں مندرج ہے۔مگر کنیت کم دیکھی گئی۔صاحب صراح اللغات نے ابوفضلہ کنیت بتلائی ہے اور وجہ کنیت یہ ٹھہرائی ہے کہ بنی ہاشم تمام عرب میں بہت بڑے تیرانداز مشہور تھے۔اور اس فن کے کامل تھے یہ کمال ان کو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے وراثتاً پہنچا تھا۔اسی رعایت سے ہاشم کی کنیت ابوفضلہ مشہور تھی۔صراح مطبوعہ کلکتہ ص986

مطلب ابن عبدمناف کی امارت

محمد ابن سائب الکلبی امام الانساب کے اسناد سے اوپر لکھا گیا ہے کہ ہاشم نے اپنی وفات کے وقت اپنے بھائی مطلب کی امارت کیلئے وصیت کر دی تھی۔ابن سعد لکھتے ہیں

المطلب بن عبد مناف بن قطی اکبر من ھاشم ومن عبد الشمس وھوالذی عقدالحلف القریش من النجاشی فی متجرھا وکان شریفا فی قومہ مطاعا سیدًا و کانت قریش تسمیۃ الفیض لسماحۃ فولی بعدالھاشم السقایۃ والرفادۃ

یعنی مطلب ابن عبدمناف ابن قطی ،ہاشم اور عبدالشمس دونوں سے بڑے تھے۔اور یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے قریش کیلئے بادشاہ نجاشی سے معاہدے قائم فرمائے وہ اپنے قوم وقبیلہ کے سید وسردار اور اشرف ترین مرد تھے۔اور یہ وہی بزرگ ہیں جن کی فیاضی اور سخاوت کے اعتبار سے قریش نے ان کا لقب الفیض رکھا تھا۔حضرت ہاشم کے بعد خدمت کعبہ میں سقایہ اور رفادہ کے متولی ہوئے۔طبقات ص47

افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس بزرگ ہاشمی کا کوئی ذکر نہ کیا شائد اس کوتاہ قلمی میں یہ مصلحت مضمر ہو کہ بزرگان اور نموداران بنی ہاشم کی تعداد میں جہاں تک کمی ہو وہ آپ کے مدعائے تالیفی کے مطابق اور مناسب ہوگی نہ ان کی امارت کا کوئی ذکر کیا ہے اور نہ نجاشی کے ساتھ معاہدہ جدید کی قومی خدمت کا تذکرہ۔لکھا بھی تو حضرت عبدالمطلب کے حالات میں اتنا کہ مطلب ہاشم کے بھائی تھے۔انکو (اپنے ننھیال میں رہنے کے حالات) معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے۔وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو شروع کی سلمٰی نے ان کا حال سنا تو بلا بھیجا تین دن مہمان رہے۔چوتھے دن شیبہ (عبدالمطلب) کو ساتھ لیکر مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔سیرۃ النبی جلد اول میں 121۔

اس عبارت سے غریب مطلب کی کیا معرفت ہوئی اور آپ اس مختصرہ سے دنیا کو مُطلب ابن عبدمناف کے ذاتی اوصاف،خدمات اور حالات کیا معلوم ہوئے۔کیا ایک محقق،مورخ اور سیرۃ نگار کا معیار تالیف اور شعار تصانیف یہی ہونا چاہیے کہ وہ ہر شخص کے حالات اور ذکر واذکار میں بلاضرورت اتنا اختصار اختیار کرے کہ اس کے نہ ذاتی حالات معلوم ہوسکیں اور نہ خدمات۔

افسوس ہے کہ شبلی صاحب کے نزدیک یہ بزرگ ہاشمی اگر کسی توجہ اور التفات کے قابل نہیں تھا تو اس سے اس کی عظمت وجلالت

میں سرمو کمی نہیں آتی۔کیونکہ وہ یہ نمودار اور ذی اقتدار قریش ہے جس کے لطف وایثاء کے زیر بار ہو کر تمام ملک وقوم نے اسکو فیاض کا لقب مخصوص تفویض کیا ہے۔

حضرت مطلب کی وفات علاقہ یمن کے شہر قروان میں واقع ہوئی۔مطلب قریش کے کاروان تجارت کے ساتھ حسب المعمول یمن گئے تھے۔قروان میں پہنچ کر علیل ہو گئے۔اور اسی علالت میں انتقال کر گئے۔مطلب کی وفات ہاشم کے انتقال سے دس برس بعد تقریباً 520 میں واقع ہوئی۔

حضرت عبدالمطلب ابن ہاشم کی امارت

حضرت عبدالمطلب کا اصلی نام شیبہ تھا۔شیبہ نام رکھے جانے کی وجہ ابن سعد اور ابن ہشام یہ بتاتے ہیں۔

علقت سلمی بعبد المطلب فولدته وفی راسه شیبه نسمی شیبه ص46

ہاشم سے سلمی کو عبدالمطلب کا حمل ہو گیا۔جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے سر میں سفید (بھورے) بال تھے اس وجہ سے ان کا نام شیبہ ہوا۔

حضرت ہاشم کے انتقال کے بعد سے یہ برابر ننہال میں رہے۔سلمی نے بوجہ اپنی خوشحالی کے سسرال کی کوئی پرواہ نہیں کی اور نہ ان لوگوں سے کسی قسم کے تعلقات قائم رکھے۔اور معاملات توریث کو شیبہ (عبدالمطلب) اپنے یتیم بچے کے جوان ہونے تک اٹھا رکھا اور اس درمیان میں سلمی نے اپنی طرف سے اس بچہ کی خبر گیری یا اس کے وہاں طلب کر لیے جانے کی تحریک کو اپنی غیرت اور شریفانہ ہمت کے خلاف سمجھا۔اور بالکل خاموشی اختیار کی۔اس لیے عبدالمطلب کی طرف سے بنو ہاشم کو ایک عرصہ تک قطعی لاعلمی رہی۔یہاں تک کہ مطلب کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ان کے برادر مرحوم کا کوئی یتیم معصوم دنیا میں یادگار موجود ہے۔

مطلب کو عبدالمطلب کے حالات کی کیسے اطلاع ہوئی

شبلی صاحب ان اقسام کے حالات وواقعات کو زوائد میں شمار کرتے ہیں اور اپنے سیاق تحریر کے خلاف سمجھتے ہیں۔مگر ہم تاریخ تحقیق،اور سیرت نگاری کی موجودہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے کسی خاص شخص کے حالات وواقعات پر ہر جزوی اور کلی تفصیل کو جس سے اس خاص شخص کے ذاتی اور صفاتی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہو۔اپنا فرض تالیفی سمجھتے ہیں۔اس لئے شبلی صاحب کے ان اختصارات سے جو اکثر مقامات پر صرف اشارات ہو کر رہ جاتے ہیں۔قطع نظر کر کے ان حالات کو اسی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔جس تفصیل سے وہ اپنے اصلی ماخذوں میں مندرج ہیں۔اس کے متعلق طبقات ابن سعد سیرت ابن ہشام اور تاریخ کبیر ابن جریر طبری میں مرقوم ہے۔

وقدم بن المنذر بن حزام وهوا ابو حسان ثابت الشاعر مكة معتمر ا فلقى المطلب وكان له خليلا فقال له لو رائيت ابن اخيك شيبه فينا لرائيت جمالا وهيبتۀ و شرفا لقد نظرت اليه وهوينا ضل فتيانا من اخواله فيدخل رمايته جميعا فى مثل راحتى هذه و يقول كلما خسقى انا ابن العمر العلى فقال المُطلب ياابا اوس لا امسى حتى اخرج اليه فاقدم به فقال ثابت ماارى سلمى تدفعه اليك ولا اخواله حتى يكون هوالذى يقدم عليك الى ما ههنا راغبا فيك فقال المُطلب ياابا اوس ما كنت لا دعه هناك ويترك ما ثرقومه و سطته و نسبه و شرفه فى قومه ما قد علمت فخرج المُطلب فورد المدينه فنزل فى ناحيه وجعل يسال عنه حتى وجده يرمى فى فيتان من اخواله فلما راه عرف شبه ابيه فيه ففاضت عيناه و ضمه اليه و كساه حلة يمانيه والشآء يقولعرفت شيبة والنجارقد حفلتابناء ها حوله بالنبل تنتضل عرفت اجلاده منا و شيمته ففاض منى عليه وابل سبل فارسلت سلمٰى الى المُطلب فدعته الى النزول عليها فقال مشانى اخف من ذالك ما اريد ان احل عقدۃ حتى اقبض ابن اخى والحقه ببلده وقومه فقالت لست بمرسلته معك و غلظت عليه فقال المُطلب لا تفعلى فانى غير منصرف حتى اخرج به معى ابن اخى قدبَلَغَ وهوا غريب فى غير قومه و نحن اهل بيت شرف قومنا والمقام ببلده خير له من المقام ههنا وهو ابنك حيث كان فلما رائت انه غير مقصر حتى يخرج به استنظرته ثلاثة ايام وتحول اليهم فنزل عندهم فاقٓم ثلاث ثم احتمله و انطلقا جميعا فانشاء المُطلب يقول كما انشدنى هشام بن محمد عن ابيهابلغ بنى النجار ان جئتهم انى منهم وابنهم والخميس رائيتهم قوما اذا جئتهم هودا القآئى واحبو حسيسى ودخل به المطلب مكه ظهرا فقالت قريش هذا عبدالمطلب فقال و يحكم انما هوا ابن اخى شيبه ابن عمر ۔ طبقات ص 48،49

ثابت بن منذر ابن حزام حسان ابن ثابت شاعر کے باپ مکہ میں بقصد حج وعمرہ آئے اور مُطلب سے ملے ان میں اور ان میں مراسم اتحاد تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اگر تم نے اپنے بھتیجے شیبہ نامی کو جو فی الحال ہمارے قبیلہ کے ہمراہ ہے۔ دیکھو تو اس کو خوش جمالی ہیبت اور شرافت کا سراپا تصویر پاؤ گے میں نے اسکو اسکے ماموں کے لڑکوں کے ساتھ تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھا اور جب اس کا تیر نشانہ پر بیٹھتا تھا تو وہ بآواز بلند پکار اٹھتا تھا کہ میں ہوں عمر علی کا بیٹا۔ (عمر ہاشم کا نام تھا) یہ سن کر مُطلب نے کہا کہ میں تو اس کو اپنے ساتھ لائے بغیر اب نہیں رہ سکتا۔ ثابت نے کہا کہ میں تو نہیں دیکھتا کہ سلمٰی یا اس کے ماموں جو اس کے ہم بطن ہیں۔ اس کو تمہارے ساتھ آنے دیں گے۔ اور آپ کو بھی ابھی اس کو یہاں نہیں لانا چاہیے کیونکہ وہ اپنے ماموں کے ساتھ ہے کسی غیر کے گھر تو نہیں ہے اور پھر ایسی حالت میں کہ تم کو اس کے لانے کی اور مشاہدہ کرنے کی خود رغبت ہوئی ہے۔ مُطلب نے نہایت متانت سے جواب دیا اے ابا اس (ثابت کی کنیت تھی) یہ مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس کو لائے بغیر چھوڑ دوں اور اس آثار، اقتدا، اور نسبی افتخار کو جو میری قوم میں اس کو حاصل ہے اس سے چھڑا لوں یا ان سے اس کو محروم رکھوں۔ الحاصل مُطلب مکہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچے اور بیرون شہر مقیم ہوئے اور بھتیجے کی تلاش کرنے لگے۔ اور بالآخر اس کو پا گئے اسی حالت میں جیسا کہ ثابت نے ان سے بیان کیا تھا۔ شیبہ اور بچوں کے ساتھ تیر اندازی میں مصروف تھے دیکھتے ہی مُطلب نے پہچان لیا اور ان کو اپنے باپ کا ہو بہو ہم صورت وہم شبیہہ پایا۔ مُطلب کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے فوراً اس کو لپٹا لیا اور ایک حلہ یمانی جو مخصوص ان کیلئے گھر سے لے گئے تھے پہنا دیا اور یہ اشعار اپنی زبان پر جاری کیے۔ میں نے شیبہ کو ایسی حالت میں دیکھا کہ بنی نجار کے لڑکے تیر اندازی میں اسے گھیرے ہوئے تھے پہچان لیا میں نے اس کی جسمانی ساخت کو بالکل اپنے لوگوں سی پائی اور اس سے اپنی خوشبو بھی پائی۔ بس میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ اب سلمٰی کو مُطلب کے آنے کی خبر ملی انہوں نے مُطلب کو اپنے گھر بلا بھیجا مُطلب گئے اور کہنے لگے کہ میرے لیے بڑی بدنامی کا باعث ہوگا۔ اگر میں تم سے اپنے بھتیجے کے لے لینے اور اپنے شہر لے جانے کا عزم وارادہ چھپاؤں۔ یہ سن کر سلمٰی نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ اسکے بھیج دیئے جانے پر کبھی راضی نہ ہوں گی اور اس پر سلمٰی نے سخت قسمیں کھانی شروع کر دیں مُطلب نے کہا ہاں ہاں یہ نہ کرو

۔ کیونکہ میں تو اب بغیر اس کو لیے یہاں سے ٹلتا نہیں ہوں کیونکہ تم خود سوچو کہ میرا بھتیجا بلوغ کے قریب پہنچ گیا ہے اور وہ اب تک ایک غیر قوم وقبیلہ میں یکہ وتنہا ہے اور ہم لوگ اہل بیت ہیں۔ جو اپنے تمام قوم و قبیلہ میں اشراف ترین افراد ہیں اور یہ بھی غور کرو کہ اس کے لیے اس مقام میں رہنے سے اپنے خاص شہر میں رہنا زیادہ مناسب ہے اور یوں وہ جہاں رہے گا تمہارا بیٹا ہے اور تمہارا فرزند۔ بالآخر جب سلمٰی کو یقین ہو گیا کہ مُطلب اپنے ارادے سے باز نہ آئیں گے تو مُطلب نے تین دن اور سلمٰی اور قبیلہ بنی النجار کے اظہار رائے کا انتظار کیا اور انہیں لوگوں پر اس امر کو ٹال دیا اور تین دن تک بنی النجار کے مہمان رہے۔ آخر کار ان کی رضا و استمزاج سے لڑکے کو ہمراہ لے چلے اور بنی نجار کے تمام لوگ رسم ترخیص کے اصول پر۔ مُطلب کی مشایعت کی غرض سے ان کے ہمراہ ہوئے۔ اور مُطلب نے اُنکے یہ اخلاق و اشفاق دیکھ کر یہ اشعار افشاء کیے۔ میری طرف سے بنی نجار کو یہ پیام پہنچا دو کہ میں نے اُن کے پاس آ کر یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کے اہل وعیال اور تمام گروہ گویا میرے لوگ ہیں اور گویا میں اپنے ہی لوگوں میں ہوں۔ میں نے ان لوگوں کو ایک ایسی قوم پایا کہ میں جب ان لوگوں کے پاس پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری ملاقات کیا میری آواز تک کے مشتاق ہیں۔ بہر حال مطلب اپنے بھتیجے شیبہ کے ساتھ پشت مکہ سے شہر میں داخل ہوئے۔ قریش نے اس لڑکے کو ان کے پیچھے بیٹھا دیکھ کر کہا کہ یہ تو عبد المطلب ہے۔ غلام مُطلب، مُطلب نے ان کے اس غلط قیاس کی فوراً تردید کر دی اور کہا افسوس ہے تم پر یہ شیبہ ابن عمر (ہاشم) میرا خاص بھتیجا ہے۔ (طبقات از صفحہ 48-49)

قبیلہ بنی نجار کے انہیں محاسن اخلاق کے اعتراف میں جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داخلۂ مدینہ کے وقت قبیلہ بنی نجار کو اپنی فرودگاہ بننے کے شرف خاص سے مشرف فرمایا۔ جس کو ہم تفصیل سے اپنے مقام پر لکھیں گے۔ بنی نجار کی نموداری اور ذی اقتداری کے لیے یہی ثبوت کافی ہیں۔

آمدم برسر مطلب مندرجہ بالا واقعات کو شبلی صاحب کے موجودہ طریقہ اختصارات و اشارات کے خلاف ہم نے تفصیل وتطویل سے کیوں لکھا۔ صرف اس لیے کہ شبلی صاحب جن مختصر اور گنے ہوئے الفاظ میں اس تاریخی واقعہ کو لکھا ہے وہ بھی معلوم ہو جائے۔ عربی ماٴخذ کی اصلی عبارت بھی اس غرض سے نقل کر دی گئی ہے کہ دونوں عبارتوں کے مقابلہ اور موازنہ کے وقت بآسانی معلوم ہو جائے کہ مولوی صاحب کے مختصرہ سے اس بزرگ ہاشمی اور سید قریشی کے متعلق ان امور کی کوئی اطلاع کوئی خبر اور کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ جن سے اس بزرگ کی ذاتی وجاہت اور ذی اثر ہونے کا ثبوت خاص اسی کے قوم وقبیلہ میں نہیں پایا جاتا بلکہ دوسری قوم وقبائل میں بھی اس کی عظمت اور

حرمت اسی طرح مسلم اور مقدم سمجھی جاتی ہے۔

اسی تفصیل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بنی ہاشم میں اس وقت اپنی قومی حمیت اور خاندانی شرف ومفاخرت کا کس حد اور کس درجہ تک کا پاس ولحاظ تھا۔ کہ مُطلب اپنے گم گشتہ عزیز خاندان کے حالات ثابت کی زبانی سن کر جونہایت آرام وراحت سے اپنے ننہال میں پرورش پا کر جوانی میں پہنچ گیا تھا۔ یعقوبؑ اور بیتاب ہوگئے۔ اور پھر ایک منٹ تک اسکے پرورش پانے کو قبیلہ غیر میں گو وہ قرابت اور عزیز داری میں کتنا ہی قریب نہ ہو۔ گوارا نہ کرسکے مدینہ پہنچے سلمٰی اور تمام اکابر وعمائد بنی نجار لڑکے کے چھوڑ جانے کیلئے اصرار پر اصرار کرتے رہے مگر مُطلب نے ایک نہ مانی اور کسی طرح اپنی حمیت خاندانی اور عظمت موروثی کے حقیقی افتخار اور اصلی اقتدار کو یہ کہہ کر ہم اہل بیت ہیں اور اپنی قوم وقبیلہ میں اشرف ترین افراد۔ ان کے اخلاق واشفاق کا زیر بار نہ ہونے دیا۔

کیا شبلی صاحب ان واقعات کو جن کے لفظ لفظ اور حرف حرف سے مطلب خاندان ہاشم کے فضائل وخصائص ثابت ہوتے تھے۔ اپنے مدعائے تالیفی سے زائد سمجھتے تھے؟ کیا ان واقعات سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد بزرگوار کے اعلیٰ محاسن اخلاق، طرز معاشرت، شریفانہ حمیت اور رئیسانہ شان وشوکت کا اظہار نہیں ہوتا؟ کیا اپنے بھتیجے کی تلاش میں مطلب کی یہ تمام سرگزشت واقعات تاریخی کی تعریف میں نہیں آتی؟ کیا یہ واقعات ایک تاریخ نویس اور سیرت نگار کیلئے قابل الذکر نہیں ہیں؟ نہیں واقعات تاریخی بھی ضرور ہیں اس لئے کہ شبلی صاحب کے شیخ التحقیق ابن سعد کی طبقات میں موجود ہیں اور قابل الذکر بھی ضرور ہیں اس لئے کہ اس سے مکہ ومدینہ کے دو نمودار اور ذی اقتدار قبیلوں کے حسن معاشرت اور تہذیب وتمدن کے حالات پورے طور سے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ہاں مولوی شبلی کیلئے اس وجہ خاص سے قابل ذکر نہیں ہیں کہ ان سے آپ کے مجوزہ ہیروز آف اسلام کے فریق مخالف بنی ہاشم کی فضیلت، شرافت قومی عزت اور خاندانی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ آپ کی تیغ نازک کے لئے ناگوار ہے۔ مولوی صاحب کے مقلدین ہی اس طریقہ اختصار کو پسند کریں گے ورنہ ایک محقق اور مؤرخ تو ان حالات کی تفصیل کو اپنی تاریخ وسیر کے تالیفی مقاصد کے اجزا لازمی تسلیم کرے گا اور اسی اصول کی بنا پر قدیم وجدید مؤرخین واہل سیرت نے اپنی تالیفات وتصنیفات میں ان واقعات وحالات کو مفصل طریقہ سے قلمبند کیا ہے۔

شیبہ کی وجہ تسمیہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں مگر قوم قریش نے ان کے تحمل ووقار اور شوکت واقتدار کے اعتبار سے ان کو شیبۃ الحمد کا خطاب دیا تھا۔ مگر تمام لوگ عبدالمطلب ہی کہتے تھے اور بالآخر یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مُطلب نے اپنی وفات کے وقت انہیں کو اپنا وصی ووارث قرار دیا۔ طبقات میں ہے:

فولی عبدالمطلب بن هاشم بعده الرفادہ والسقایة فلم یزل ذلك بیده یطعم الحاج و یسقیهم فی حیاض من ادم بمکة فلما سقی زمزم یترك السقی فی الحیاض بمکة و سقاهم من زمزم حین حفرها و کان یحمل الماء من زمزم الی عرفة فیسقیهم

مُطلب نے رفادہ اورسقایہ کے منصب اپنے عہد بعد عبدالمطلب کو سپرد کر دیئے۔ اورانہوں نے کبھی حجاج کا کھانا کھلوانا اور چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں پانی بھر بھر کران کو پانی پلانا ترک نہیں کیا۔لیکن جب سے انہوں نے چاہ زمزم کو کھود کر پانی پلانا شروع کیا تو اسی وقت سے ان چرمی حوضوں کے ذریعہ سے پانی پلانے کا طریقہ موقوف ہوگیا۔(طبقات 49)

شبلی صاحب نے اس بزرگ کی نسبت میں بھی وہی کوتاہ قلمی اوراختصار پسندی کا قدیم طریقہ اختیار کیا ہے چنانچہ تلاش وتیاری چاہ زمزم کے متعلق صرف اتنی ہی خاصہ فرسائی گوارا فرمائی گئی ہے:

عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ زمزم جو ایک مدت سے اٹ کر گم ہو گیا تھا انہوں نے اس کا پتا لگایا اورکھدوا کر نئے سرے سے درست کرا دیا۔(سیرۃ النبی ج1 ص121)

یہ تو شبلی صاحب کی مختصرہ عبارت ہے مگر آپ سے سینکڑوں برس پہلے کی عربی تاریخ سے جو اس کے تفصیلی حالات تحقیق ہوتے ہیں وہ ذیل میں مندرج کیے جاتے ہیں۔ سیرت ابن ہشام میں، بنی جرہم کے اخراج مکہ وترک تولیت خانہ کعبہ کے ذکر میں لکھا ہے:

فخرج عمر ابن الحرث بن مضاض الجرهمي بغزالی الكعب والحجرا كن قدفنها في زمزم انطق

عمرابن الحرث ابن مضاض الجرہمی نے کعبہ کے دونوں ہرنوں کے مجسمے اورحجرالاسود کعبہ کے اندر سے نکال لیے زمزم میں ان کو دفن کر دیا اور چلے گئے۔

حافظ جمال الدین محدث شیرازی نے کامل ابن اثیر کی اسناد سے اس واقعہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب روضۃ الاحباب میں لکھا ہے۔ان کی اصل عبارت یہ ہے:

چوں حال باین منوال رسید قوم جرہم را یقین گشت کہ ریاست مکہ از یشاں زائل میشود۔دل ازاں برداشتند۔ درپیش ایشاں دراں وقت عمرابن حارث بود۔ حسد اورا باعث شد برانکہ حجرالاسود دراز رکن برکند۔ و صورت دو آہو برہ از طلاکہ اسفندیار فارسی بہدیہ کعبہ فرستادہ بود وانرا غزال الکعبہ خواندندی باسلاحی چند کہ در خانہ کعبہ بود۔ ہمہ را برداشت در چاہ زمزم پنہاں کرد دآنرا اپنا شت و بازمین ہموار نمود

جب اس طریقہ پر حال پہنچ گیا تو قوم جرہم نے یقین کرلیا کہ مکہ کی ریاست ہم سے چلی جاتی ہے تو انہوں نے اس کی طرف سے اپنا دل اٹھالیا۔ اس وقت ان کا سردار عمرابن حارث تھا۔ اس پر حسد نے غلبہ کیا۔ اس نے کعبہ سے حجر الاسود کو اکھاڑ کر اوران دونوں ہرنوں کے طلائی مجسموں کو جو اسفند یار شہر یار فارس نے کعبہ میں نذر چڑھائے تھے لے کر اوران چند سلاحوں کو جو کعبہ میں تھیں سب کو اٹھا کر چاہ زمزم میں پوشیدہ کر دیا اور زمزم کو پاٹ کر زمین کے برابر کر دیا۔ روضۃ الاحباب جلد اول میں مطبوعہ لکھنو

زمزم کی تلاش اور از سرنو مرمت حضرت عبدالمطلب کی بے نظیر ہمت

چاہ زمزم کے مفقود اور بے نام ونشان کی یہ وجہ ہوئی۔ زمزم سلسلہ ابراہیمی اور خانوادہ اسماعیلی کی عظمت وتقدیس کا قدرتی اور نہایت قدیم یادگار تھا۔ اس لیے بنواسماعیل اس کی یاد کبھی بھول نہیں سکتے تھے۔ اتنا لکھ کر ہم اپنے سلسلہ بیان پر آ جاتے ہیں۔

باجودیکہ بنی جرہم و بنی قضاء کے بعد امارت مکہ پھر بنواسماعیل کے قبضہ میں آ گئی مگر تاہم حضرت عبدالمطلب کے وقت تک کسی بزرگ ہاشمی کو چاہ زمزم کے سراغ لگانے اور مرمت کرانے کی طرف نہ توجہ ہوئی اور نہ ہمت۔ امتداد زمانہ کے سبب سے بنواسماعیل کے اکثر افراد زمزم کا نام اوراس کی حقیقت کو فراموش کر گئے۔ ساکنین عرب عموماً اور باشندگان مکہ خصوصاً پانی کو ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ کہتے تھے جس کے مقابلہ میں وہ دنیا کی کسی دولت کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ مکہ میں انسانی آبادی کا اصل باعث یہی زمزم کا چشمہ ثابت ہوتا ہے جس کو پہلے حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام اوران کے بعد بنواسماعیل نے گھیر کر ایک حوض مدور یا کنویں کی صورت میں بنالیا تھا۔ وہ اتنی مدت مدید سے مفقود اور لاوجود ہو گیا تھا۔ مکہ والوں کو کمی آب کی جیسی تکلیف ہو رہی تھی وہ بالکل اندازہ سے باہر ہے۔ خیریت تھی کہ شہر میں کچھ کنویں کھود لیے گئے تھے۔ جن سے پیاسوں کی پیاس بجھ جایا کرتی تھی مگر تاہم سالہا سال مکہ میں پانی کا قحط بنا رہتا تھا۔ حج کے ایام میں یہ تکلیف اور بڑھ جاتی تھی اور منصب ارسقایہ کی گویا جان پر بن آتی تھی۔ سمجھ لینے کے لیے کافی ہے کہ جس مقام پر وہاں کی ضرورت کے لیے پانی کافی نہ تھا وہاں باہر کے آنے والی حجاج کی بے شمار جماعت کے لیے کافی طور پر پانی فراہم کرنا آسان بات نہیں تھی۔

قصیٰ بن کلاب کے ایام امارت سے لے کر مطلب ابن عبد مناف کے عہد حکومت تک تو جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے بڑے بڑے چرمی حوضوں میں شہر کے کنوؤں سے پانی بھر کر خانہ کعبہ کے صحن میں رکھ دیا جاتا تھا اور وہی حجاج کو پلایا جاتا تھا۔ عرفات ومنیٰ میں جانے والے دن بھی یہی حوض اٹھا کر وہاں لے جائے جاتے تھے اور یہی ان دونوں مقاموں میں بھی حجاج کے کام آتے تھے۔

عبدالمطلب نے بھی اپنی امارت کے ابتدائی ایام میں یہ چندے خدمت سقایہ کی انجام دہی میں یہی قدیم طریقہ اختیار کیا اور وہ بھی انہیں حوضوں کے ذریعے سے تمام حجاج کو پانی پلایا کرتے تھے۔ بالآخر انہوں نے اس کو حد درجے کی تکلیف کا باعث سمجھا اور اصلی چاہ زمزم کے سراغ لگانے اور وہاں پھر از سرنو ایک نیا کنواں بنانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے اس ارادہ وتجویز کو دینی اور قومی ضرورتوں کے اعتبار سے بہت بڑا کار خیر اور ثواب بے حساب کا باعث سمجھا اور حقیقت میں تھا بھی ایسا ہی۔

ممکن تھا کہ حضرت عبدالمطلب صحن کعبہ یا اور کسی مقام متصل میں ایک معمولی کنواں کھدوا دیتے اور سقایہ کی موجودہ ضرورت پوری ہو جاتی مگر نہیں۔ ان کے دل میں اسی قدرتی چشمہ رحمت کی تمنا تھی جو خدا کی طرف سے ان کی خاندانی عظمت وتقدیس کا معیار قرار دیا گیا تھا۔ ان کا خلوص ان کی ہمت خدا سے شرط کر چکی تھی کہ یہ کنواں وہیں کھودا جائے گا جہاں اصل زمزم واقع تھا اور وہ صورت و ہیئت میں چاروں طرف ہاتھوں سے بنائی ہوئی مینڈ سے گھرا ہوا حوض تھا۔ جس کو حضرات ہاجرہ واسماعیل نے اپنے مبارک ہاتھوں سے بنایا تھا اور چشمہ زمزم کے آب رحمت کو اس میں جمع کر رکھا تھا۔ اسی شرط کی وجہ سے حضرت عبدالمطلب کی تعمیل تعمیر میں تاخیر ہو گئی ورنہ یہ عالی ہمت اپنی نیت کو کب کا پورا کر چکا ہوتا۔

ہمت مرداں مدد خدا۔ جناب عبدالمطلب نے زمزم کے اصلی مقام کے پتا لگانے میں اپنی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر کسی سے کوئی پتا یا نشان نہ ملا۔ بالآخر عبدالمطلب نے اس کے اصلی مقام کے پتا لگانے میں اس ہادی حقیقی کی طرف رجوع کی۔ جس نے زلال رحمت بنا کر اس کو اسماعیلؑ کے لیے پیدا کیا تھا۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں:

كانت زمزم سقيا من الله اتى فى المنام مرات فامر بجفرها و وصف له موضعها

زمزم خاص خدا کی رحمت کی سقائی تھی۔ عالم رویا میں یہ متواتر طور پر عبدالمطلب کو بتلایا اور اس کے کھودے جانے کا حکم ہوا۔

الغرض عبدالمطلب کے ارادہ کے ساتھ مشیت کا ارادہ بھی شامل ہو گیا اور خدا کے بتلائے ہوئے مقام پر کھودنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ حضرت عبدالمطلب کی سب سے زیادہ قدرت کے قابل ہمت تو یہ تھی کہ آپ نے اپنے اس کام میں اپنی قوم وقبیلہ سے کسی قسم کی مدد و حمایت نہیں مانگی اور خدا کی راہ میں اس کار عظیم کو صرف دو باپ بیٹوں نے مل کر از آغاز تا انجام تمام کیا۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

مرمت زمزم میں قریش کی مخالفانہ ممانعت

برا ہو حسد، نفسانیت اور برابری ومساوات کے غلط انداز غرور ونخوت کا جس نے عبدالمطلب کی ایسی ایثار نفسی اور رفاہ وفلاح کے کام میں بھی تمام قریش کو ان کی مخالفت اور حضر زمزم کی ممانعت پر آمادہ کر دیا۔ اول تو انہوں نے یہ کہہ کر عبدالمطلب کو کنویں کھودنے سے روکنا چاہا کہ ہم اپنے بتوں کے سامنے گڑھا کھودنے نہیں دیں گے مگر حضرت عبدالمطلب اور ان کے بیٹے حارث، قریش سے مقابلہ اور مقاتلہ پر فوراً تیار ہو گئے۔ مزاحمین کی جماعت مرعوب ہو گئی اور عبدالمطلب کے تیور برے دیکھ کر موقع سے ہٹ گئی۔ ابن سعد قریش کی اس اول مخالفت کا کوئی ذکر نہیں کرتے مگر ابن ہشام اپنی سیرت میں ذیل کی تفصیل عبارت لکھتے ہیں:

فغدا عبدالمطلب و معه ابنه الحرث و ليس له يومئذ ولد غيره فوجد قرية النمل ووجد الغراب ينقر عندها بين الوثنين اساف و نائلة الذين كانت قريش تخر عند هماذبائحها فجاء بالمعول و قام ليخرحيث امرقفامت اليه

قريش حين او اجده فقالو ا والله لا يتركك نحفرين و ثنيانا هذين الذين تخر عندهما فقال عبدالمطلب لابنه الحرث و عنى حتى احفر فوالله لامضين لما امرت به فلما اعرفوا انه غير نأزع خلوا بينه و بين الحر (ابن هشام ص50 مطبوعه مصر)

صبح سویرے عبدالمطلب اپنے بیٹے حارث کو اور اس وقت تک ان کا یہی ایک بیٹا تھا ساتھ لے کر کنواں کھودنے کی غرض خاص سے گئے اور قریۃ النمل وغراب کی [1] علامات و بینات قدرت کے مطابق جو عالم رویا میں خدا کی طرف سے ان کو بتلائے گئے تھے اور جو ان دونوں بتوں کے درمیان واقع تھا جن کا نام اساف و نائلہ تھا اور جن کے پاس آ کر قریش اپنے جانوروں کی قربانی کو نحر کیا کرتے تھے جب یہاں عبدالمطلب کنواں کھودنے کے لیے تیار ہو کر اور کدال وغیرہ لے کر آئے تو ایک مرتبہ قریش ان کی مخالفت پر آمادہ و استادہ ہو گئے اور کہا ہم تم کو اپنے ان دونوں بتوں کے درمیان کنواں نہیں کھودنے دیں گے۔ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حارث سے کہا کہ ان لوگوں کو ہمارے پاس سے ہٹا دو کہ ہم بغیر کنواں کھودے نہیں جائیں گے اور کبھی اس کام کو نہ چھوڑیں گے جس کے انجام کرنے کا حکم مجھ کو مل چکا ہے۔ ان کی یہ تقریر سن کر قریش کو یقین ہو گیا کہ یہ اپنے ارادے سے ہرگز باز نہیں آئیں گے۔ اس لیے وہ ان کو گڑھا کھودنے کے مقام پر چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ واقعہ صاف صاف بتلا رہا ہے کہ قریش نہیں چاہتے تھے کہ بنی ہاشم اپنی کوئی نمود قائم کریں وہ ان کے کسی کام کو عام اس سے کہ وہ ان کے اور تمام قوام الناس کے لیے کیسا اور کتنا ہی مفید ہو، صرف اس نفسانیت کے خاص خیال سے کہ وہ بنی ہاشم کر رہے ہیں۔ اپنی ٹھنڈی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حسب و نسب کی یکجہتی کے غلط قیاس پر ان کے سروں پر بنی ہاشم کی برابری اور ہمسری کے جن سوار تھے۔ جو عفریت خانہ بنی امیہ سے نکل پڑے تھے حالانکہ وہ اپنے ان توہمات کی غلطی کو دیکھتے جاتے تھے اور مقابلہ کے وقت برابر خفت،

---

[1] غراب اور قریۃ النمل۔ صفحہ گذشتہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبدالمطلب کو عالم رویا میں اصل زمزم کا نشان اور خاص مقام جہاں بتلایا گیا تھا اس جگہ ظاہری علامات بھی بتلائے گئے تھے۔ ایک تو چونٹیوں یا دیمک کا پہاڑ (قریۃ النمل) دوسرے کوے کا آشیانہ سے اوڑنا۔ طبقات، سیرت ابن ہشام، ابن اثیر اور روضۃ الاحباب کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے رویائے صادقہ کی ہدایت کے مطابق اس مقام خاص پر دیمک ایک ٹیلا پایا۔ جو امتداد ایام کی وجہ سے وہاں پیدا ہو گیا تھا۔ جب یہ کھدا تو اس میں سے کورے بھی جو اس کے اندر آشیانہ رکھے تھے نکل کر اڑے۔ اس بنا پر خدا کے بتلائے ہوئی علامات کی تصدیق ہو گئی۔ وھو علی کل شیء قدیر

ندامت اور ذلت پر ذلت اٹھائے جاتے تھے۔ مگر طبیعت کی ناہمواری سے باز نہیں آتے تھے۔

بہر حال چاہ زمزم کے کھودے جانے کے متعلق قریش کی عبدالمطلب کے ساتھ یہ پہلی مخالفت تھی۔ آگے چل کر اس کی صورت اور ہیبت ناک معلوم ہوتی ہے اور اس کے آخر میں جو ذلت قریش کے پیرامون حال ہوئی وہ سخت سے سخت عبرت ناک ثابت ہوئی ہے۔ ابن سعد اور ابن ہشام کی متفقہ عبارتوں سے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فحفر ثلاثة ايام ثم بدا له الطوى فكبر و قال هذا طوى اسماعيل فعرفت قريش انه قد ادرك الماء فاتوه فقالو اشركنا فيه فقال ما انا بفاعل هذا امر خصصت به دونكم فاجعلوا بيننا و بينكم من شئتم احاكمكم اليه قالوا كاهنة بنى سعد هذيم و كانت بمعان من اشراف الشام فخرجوا اليها (طبقات ص49)

تین دن تک باپ بیٹے (عبدالمطلب اور حارث) نے مل کر وہ کنواں کھودا۔ تیسرے روز جا کر اصل چاہ زمزم کا نشان ملا۔ دونوں صاحبوں نے تکبیر کے نعرے بلند کیے اور کہا کہ یہی اسماعیلؑ کا اصل کنواں ہے۔ قریش نے جب دیکھا کہ بنی ہاشم یا عبدالمطلب پانی کو پا گئے تو ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں بھی اس کام میں شریک کرلو۔ عبدالمطلب بولے ہم تو ایسا نہیں کریں گے کیونکہ تم لوگوں کو چھوڑ کر یہ امر میرے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے مگر ہاں اگر تم چاہو تو ہمارے تمہارے باہمی تصفیہ کے لیے تم لوگ کسی کو حکم مقرر کرلو۔ قریش نے کہا کہ ندیم نامی کاہنہ کو جو قبیلہ بنی سعد سے ہے اور شام کے بالائی حصہ مقام معان میں رہتی ہے اس امر کے تصفیہ کے لیے حکم مقرر کرتے ہیں۔ پس سب مل کر اس کی طرف چلے۔

ابن ہشام اس کو اور توضیح سے لکھتے ہیں۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو:

فلم يحفر (عبدالمطلب) الا يسيرا حتى بدأ له الطى فكبر و عرف انه قد صدق فلما تمادى به الحفر وجد فيها غزالين من ذهب و همام الغزالان الذان دفنت جرهم فيها حين خرجت من مكة ووجد فيها اسياف قلقية و ادراعا فقالت له قريش يا عبدالمطلب لنا معك فى هذا الشرك و حق قال لا ولكن هلم الى امر نصف بينى و بينكم (سیرت شام جلد اول ص50 مطبوعہ مصر)

عبدالمطلب نے تھوڑا کھودا تھا کہ قدیم آثار چاہ نکل آئے تو عبدالمطلب نے خوشی میں تکبیر کہی اور یقین ہو گیا کہ خواب میں انہیں جو کچھ بتلایا گیا ہے وہ صحیح ہے جب کچھ اور کھودا تو دونوں سونے کے ہرن نکلے جن کو

بنی جرہم نے مکہ سے جاتے وقت چاہ زمزم میں دفن کر دیا تھا۔ پھر اس میں عبدالمطلب کو قلعی کی ہوئیں چند تلواریں اور زرہیں بھی دستیاب ہوئیں۔ تب تو قریش پھر آئے اور آ کر عبدالمطلب سے کہنے لگے کہ ان اشیا برآمد شدہ میں ہمارا بھی حق وحصہ ہے۔ عبدالمطلب نے کہا نہیں مگر ہاں اگر تم با خود تصفیہ چاہو تو ہم نصفا نصف کر دیں گے۔

اب قریش کی اصل مخالفت اور علت مخاصمت معلوم ہوگئی۔ یہاں مال واسباب کی برآمدگی موجودہ مخاصمت کی وجہ تھی اور انہیں کے برآمد ہونے کی خبر نے ان کو عبدالمطلب کے ساتھ فساد وتکرار پر برانگیختہ کر دیا۔ وگرنہ صرف کھدجاتا اور کوئی چیز برآمد نہ ہوتی تو پھر قریش کچھ نہ بولتے۔ ان چیزوں نے قریش کی حسد ونفسانیت اور حرص وطمع میں بار دیگر پُر جوشی اور نئی آمادگی پیدا کر دی اور وہ ان کے ساتھ مخاصمت اور فتنہ انگیزی پر آمادہ اور مستعد ہوگئے۔ ابن سعد بقیہ حالات یوں لکھتے ہیں:

خرج مع عبدالمطلب عشرون رجلا من بنی عبد مناف وخرجت قریش بعشرین رجلا من قبائلها فلما كانوا بالقفير من طريق الشام اوحذوه فنى ماء القوم جميعا فعطشو فقالو العبدالمطلب ما ترى فقال هوا لموت فليحفر كل رجل منكم حفرة لنفسه فكلما مات رجل دفنه اصحابه حتى يكون أخرهم رجلاً واحدا فيمتون ضيعة اليسر من ان تموتو جميعا فحفرو ثم قعدو ينتظرون الموت فقال عبدالمطلب والله ان القائنابايدينا هكذالعجز الا نضرب فى الارض فعسى الله ان يرزقنا ماء ببعض هذالبلاد وفار تحلوا فقام عبدالمطلب الى راحلته فركبها فلما انبثت به انفجر تحت خفها عين ماء عذب فكبّر عبدالمطلب وكبرا صحابه وشربوا جميعا ثم دعاء القبائل من قريش فقالو هلمو الى المآء الرواء فقد سقاناالله فشربو واستقو وقالوا قد قضى لك علينا الذى سقاك هذالمآء هذه الفلاة هوالذى سقاك زمزم فوالله لا نخاصمك فيها ابدا فرجع ورجعوا معه ولم يصلوا الى الكاهنه وخلوا بينه وبين زمزم۔

عبدالمطلب کے ساتھ بیس آدمی عبدمناف کی اولاد میں سے اور قریش کے ساتھ تمام قبائل میں سے ایک ایک آدمی مکہ سے نکلے۔ جب علاقہ شام کے مقام قفیر یا جذوہ میں پہنچے تو تمام لوگوں کا پانی ختم ہوگیا۔ اور سب پیاسے ہوگئے۔ تو سب نے عبدالمطلب سے کہا کہ اب تمہاری کیا رائے ہے۔ کہا کہ تم میں سے ہر

آدمی اپنے لیے ایک گڑھا کھودر کھے جو آدمی مرے اس کا ہم راہی اس کو دفن کرے۔ یہاں تک کہ ایک آدمی تنہا باقی رہ جائے گا اور وہ البتہ جو بلا تیارداری اور محض بے کسی و بے یاری کی سخت موت مرے گا۔مگر اس سختی کے ساتھ ایک آدمی کا مر جانا اتنے آدمیوں کی سختی سے مرنے سے آسان تر ہوگا۔ان لوگوں نے اپنے اپنے گڑھے کھودے اور اپنی اپنی موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔جب حضرت عبدالمطلب نے ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا کہ یہ ہمارے ہاتھوں کی بلائی ہوئی مصیبت کہی جائے گی۔اور یہ ہماری ضعف و کمزوری کا نتیجہ سمجھی جائے گی۔اور اس طریقہ سے ہماری جہالت اور ذلت کی دنیا میں ایک مثال قائم ہو جائے گی۔اگر خدا کو منظور ہے تو اس مقام سے دوسرے مقام پر ہمیں پانی عنائت فرمائے گا۔یہ سن کر وہ لوگ وہاں سے چلنے پر تیار ہو گئے۔اور حضرت عبدالمطلب بھی سوار ہونے کیلئے اپنی سواری کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔جیسے ہی وہاں سے چلے ویسے ہی آپ کے پیروں کے نیچے آب شیریں کا ایک چشمہ ریگ میں نظر آیا۔اس کے دیکھتے ہی حضرت عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں جوش مسرت میں تکبیریں کہیں اور سب نے سیر ہو کر پانی کو پیا اور پلایا پھر ان لوگوں نے قریش کے قبائل کو بھی آواز دی اور کہا کہ اس آب رواں کی طرف دوڑ آؤ۔جو خداوند عالم نے ہمیں عنائت فرمایا ہے اور پلایا ہے۔پس وہ تمام لوگ بھی آئے اور اس پانی کو پیا اور پلایا اور کہنے لگے کہ اب ہماری موجودہ نزاع کا فیصلہ ہو گیا۔جس شخص نے ہمیں اس سرزمین سے پانی پلایا ہے بے شک وہی ہمیں چاہ زمزم کا بھی پانی پلائے گا۔خدا کی قسم اس امر میں ہم اس کے ساتھ کبھی مخاصمت نہ کریں گے پس وہ لوگ حضرت عبدالمطلب کے ساتھ ہو کر اسی وقت لوٹ آئے اور اس کاہنہ شامیہ کے پاس نہیں گئے اور پھر زمزم اور عبدالمطلب کے معاملات سے بالکل دستبردار ہو گئے۔

سیرت ابن ہشام کی عبارت بھی قریب قریب یہی ہے۔مگر اس میں جو امر خاص قابل ذکر ہے وہ قریش اور بنی ہاشم کے اخلاقی اوصاف کے اختلاف ہیں۔ذیل کی عبارت سے ان کا پورا انکشاف ہوتا ہے۔

فخرجو حتی اذا کانوا ببعض تلك مفاوزة بین الشام و الحجاز فنیٔ مآء عبدالمطلب و اصحابه فظمئو حتی لیقنوا بالهلکة فاستقوا من معهم من قبائل قریش فابوا علیهم فقالوا انا بمفازة ونحن و نخشی علی انفسنا مثل ما اصابکم فلما رای

عبدالمطلب ما صنع القوم وما یتخوف علی نفسه و اصحابه قال ماذا ترون قالو ایما رائینا الا اتبع رایك فامرنا بما شئت

فریقین نکلے اور جب حجاز و شام کے مابین پہنچے تو یہاں آ کر حضرت عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں کا پانی ختم ہو گیا اور وہ لوگ پیاسے رہ گئے۔ اور جب پیاس سے ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو انہوں نے قریش کے قبائل سے پانی پلانے کی درخواست کی ان لوگوں نے قطعی انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنی جانوں کیلئے اسی مصیبت کا خوف و اندیشہ کرتے ہیں۔ جو تمہاری جانوں پر پڑی ہے اور جسکو ہم خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہ جواب صاف پا کر حضرت عبدالمطلب نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ تم دیکھتے ہو جو تمہاری قوم تمہارے ساتھ کر رہی ہے اور اسکو ہمارے اصحاب اور ہماری جان کی کوئی فکر نہیں ہے اب تمہاری کیا رائے ہے۔ اصحاب عبدالمطلب نے جواب دیا ہماری کوئی رائے سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہم آپ کی رائے کی متابعت کریں جو آپ تجویز کریں وہ حکم ہمیں دیں۔

اس واقعہ سے پہلے جس چیز کا انکشاف ہوتا ہے وہ تعمیم و تخصیص کا مسئلہ ہے معمول کے ظاہری اصول پر ہر شخص تخصیص کو اکثر حسن ارادت کا نتیجہ اور خلوص و عقیدت کا مقتضاء سمجھتا ہے۔ اسی بنا پر اکثر لوگ بنی ہاشم کی بنی امیہ یا سائر قریش پر تفصیل و ترجیح کو قابل ذکر نہیں سمجھتے اور اس کو عموماً مؤلفین کی خوش عقیدگی سمجھ کر اکثر قلم انداز کر دیتے ہیں۔ شبلی صاحب بھی اسی مسلک کے بزرگ ہیں۔ ابن سعد ابن ہشام ابن اثیر وغیرہم کی ایسی ایسی صدہا کتابیں اور عربی ماخذ یا یوں کہیے کہ مصر و قسطنطنیہ کے کتب خانے کے کتب خانے سیرۃ النبی کی تدوین کے وقت آپ کے پیش نظر تھے۔ جن میں یہ واقعات تحریر تھے مگر آپ نے اپنے اصول طبعی کے مطابق مذکورہ بالا ماخذوں کی نقل۔ واقعات سے صریح چشم پوشی اختیار فرمائی۔ اور بنو ہاشم کی ایسی لاجواب اور بے نظیر اخلاقی فیاضانہ اور قومی ہمدردی کے واقعات کو بالکل چھپا دیا اور قطعاً لاوجود بنا دیا۔ حالانکہ یہی دو واقعات آپ کی تنبیہ کیلئے کافی تھے۔ جن سے آپ بخوبی سمجھ سکتے تھے کہ بنی امیہ اور تمام قوم قریش کو باوجود ہم اصلی اور ہم بطنی کے بنی ہاشم کے ساتھ، اخلاق، تہذیب، عام ہمدردی، فیاضی اور اشفاق کے تمام محاسن اوصاف کوئی مشابہت و مماثلت نہیں ہے۔ اور انہیں واقعات سے آپ یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ ان اوصاف و محامد کیلئے ہم قومی و ہم بطنی کی ضرورت نہیں۔ ان کی تفویض قدرت کی تجویز اور مشیت کی تدبیر پر موقوف ہوتی ہے ورنہ انسانی عالم میں ممکن نہیں ہے کہ ایک قوم ایک ملک اور ایک شہر کے لوگ اپنی جمیعت میں اتنے لوگوں کو گو ان کے وہ اس وقت مخالف خیال ہی کیوں نہ ہوں پیاس سے مرتا ہوا آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے پاس کافی مقدار میں پانی رکھ کر بھی ان پیاس سے مرتے ہوئے انسانوں کو پانی دینے سے صاف انکار کر دیں۔ اور ایک بوند نہ دیں جیسا کہ ابن ہشام کی مرقومہ بالا عبارت سے ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں نے پیاس سے پھڑک پھڑک کر اور ہلاکت کے قریب پہنچ کر اپنے ہم قوم اور ہموطن قریشی بھائیوں اور عزیزوں سے پانی مانگا اور ان لوگوں نے نہ دیا۔

اس واقعہ کا دوسرا رخ بدلا جاتا ہے تو طبقات اور ابن ہشام دونوں کی متفقہ عبارت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے جب لب تشنگان عبدالمطلب کو آب شیریں کا چشمہ مل گیا تو ان سرچشموں نے اپنا تنہا پینا اور اس زلال رحمت سے خوب سیر ہونا۔ اپنے فطرتی اخلاق کے خلاف سمجھا۔ دردمندان قوم نے منکرین اور خشم گین جماعت قریش کو بلایا اور اس چشمہ رحمت کا سب کو پانی پلایا۔

یہی وہ واقعات جانبین کی فطرت اور مقتضائے طبیعت کو بخوبی بتلاتے ہیں۔ دونوں ہم نسل بھی ہیں اور ہم بطن بھی۔ مگر ایک کی طبیعت میں قساوت و عداوت کے اتنے عناصر و اجزاء بھرے پڑے ہیں کہ ان کی ظاہری تصویر انسانی بالکل ترکیب حیوانی معلوم ہوتی ہے۔ بخلاف ان کے دوسرے کے مزاج و فطرت ہمدردی رحم مروت اور اخلاق کے بے انتہا اور بیش بہا جوہروں سے پر اور مملو ہے کہ باوجود ایسی شدید مخاصمت و مخالفت کے بھی وہ اپنے ایسے مخالف اور دشمن کو بھی اس نعمت میں شریک کرنے اور حصہ دینے میں ذرا بھی تامل نہ کر سکے۔ جو خدائے سبحانہ وتعالی کی طرف سے خاص طور پر ان کو تفویض فرمائی گئی تھی۔

یہی دو واقعات بنی امیہ اور عام قریش کی طبائع حیوانی اور بنی ہاشم کے علی الاکثر خصائص روحانی اور تعمیم و تخصیص کی حقیقت کا پورا انکشار کرتے ہیں۔ یہ اختلاف اور تضاد نسلاً بعد نسلاً اور بطناً بعد بطناً فریقین کے سلسلہ میں برابر قائم اور برقرار رہے۔ جو فتح مکہ کے دن تمام قریش کے اتنے مظالم کے بعد لا تثریب علیکم الیوم کے الفاظ میں لبہائے رسالت سے مترشح ہوئے۔ پھر معرکہ صفین کے ابتدائی ایام میں بار دیگر قبضہ آب فرات کے وقت زبان ولائت سے کلمہ واللہ لاافعل کما فعل اتبائمہ وظلمھم ترنم ہوا۔ پھر بار دیگر شہادت کے بعد وفات سے بالکل قریب اپنے قاتل کو شربت پلانے کے موقع پر اشربہ قبل ان یشربنی کی تقریر میں جلوہ پذیر ہوا۔ پھر یہی اختصاص قدرت اور امتیاز فطرت واقعہ صفین سے اکیس برس بعد کربلا کے قیامت خیز مقتل میں یوں ظاہر ہوا کہ انہیں سے ایک فریق قاتل کی صورت اپنے دوسرے فریق مقتول کے سینے پر سوار ہے فریق مقتول ذبیحہ کی شکل و صورت میں اس کے زانو کے نیچے دبا پیاس سے دم توڑنا چاہتا ہے۔ ایک قطرہ آب کا قاتل سے سوال کرتا ہے اور وہ بے درد باوجود یہ کہ ایک جام یا ایک کوزہ آب کیا پورے دریائے فرات پر قابض ہے۔ مگر اس کو ایک قطرہ آب نہیں دیتا۔ اور جلد جلد ذبح کر رہا ہے۔ مقتول مایوس ہو کر قاتل کی اس بیدردی کے جواب میں اپنے قاتل کو دعائیں دیتا ہوا دنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جاتا ہے۔ اور سلسلہ ہاشمیہ کی پاک سیرت اور نیک اخلاق کی بے نظیر مثال دنیا میں یادگار چھوڑ جاتا ہے۔

بہر حال جیسا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یہ دونوں واقعات تاریخی جس طرح بنو ہاشم کے قبائل میں تخلیص روحانی ثابت کرتے ہیں اسی طرح ان میں خاص خاص بزرگواروں کا موید من اللہ ہونا بھی بتلا رہے ہیں۔ کیونکہ تخصیص روحانی کا منصب تائید ربانی کے بغیر دشوار ہے اور محال۔ یہی مشاہد تاریخی یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ امارت و حکومت قومی مفاخرت اور اخلاقی محاسن و مکرمت ہی اسی سلسلہ میں قدیم ہے اور یہ استحقاق اور یہ دعوے حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لے کر اس وقت تک خدائے سبحانہ تعالیٰ کی طرف سے ان حضرات کے لیے وراثت میں ودیعت فرمائے گئے ہیں۔

واقعہ چاہ زمزم جو بقول شبلی صاحب حضرت عبدالمطلب کی حیات کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس رئیس بنی ہاشم کے موید من اللہ

ہونے کا اصلی معیار عربی کے دو معتبر اور مستند تاریخوں سے اوپر لکھ دیا گیا۔ ان میں حضرت عبدالمطلب کے استقلال اور پائیداری کی مثال بالکل بےنظیر اور لاجواب ثابت ہوتی ہے۔ چاہ زمزم کا کام اس ہاشمی فیاض نے محض ملکی اور قومی رفاہ وفلاح کے خیال کرنے کے علاوہ کعبہ اور حجاج کعبہ کی آرام رسانی کے لحاظ سے اپنا فرض سمجھ کر آغاز کیا تھا۔ جس میں ان کی ذاتی منفعت اور فائدہ کا کوئی تعلق اور لوث نہیں تھا۔ مگر قریش صرف اپنی عداوت اور نفسانیت کے تقاضوں سے ان کے اس کار خیر اور رفاہ عام کی عملی ایثار کو بھی ٹھنڈی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے آغاز ہی سے ان کو روکا۔ اور اپنی قوم وقبائل کی کثرت پر ان سے سخت مخالفت کا اظہار کیا۔ ممکن تھا کہ حضرت عبدالمطلب ان کی قوت وکثرت سے مرعوب ہو کر اپنے اس ارادے سے باز آجاتے۔ مگر نہیں یہ خدا کا کام تھا۔ اور خدا کی طرف سے یہ اس کے لیے مامور ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے ارادے میں ایک روحانی قوت تھی۔ جو انسانی قوت سے مغلوب اور مرعوب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اس باعث سے قریش کی مخالفت کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنے ارادے میں اسی طرح مستقل رہے۔ تاریخیں بتلا رہی ہیں کہ عبدالمطلب نے قریش کی متفقہ عداوت ومخاصمت کا عین اس وقت میں مقابلہ کیا ہے جب ان کے ساتھ سوائے حارث کے اس موقع پر دوسرا حامی اور مددگار نہیں تھا۔ آخر قریش بھی ان کے عزم بالجزم کی قوت اور اپنی جہالت کے قائل ہوگئے اور اپنے مفسدوں سے باز آئے۔ یہ پہلی مخالفت تھی۔

دوسری مخالفت اس سے کہیں زیادہ شدید تھی۔ یہ اصول فطرت سے مطابق تھی۔ کیونکہ اس میں مال ومتاع اور قیمتی اشیا کی دستیابی کی امید وطمع شامل تھی۔ حالانکہ عبدالمطلب نے ان کے مقابلہ کے وقت ہی ان اموال کے ساتھ اپنے قبضہ وتصرف کی خصوصیت اور قریش کی غیر سروکاری صاف صاف لفظوں میں بیان کر دی تھی۔ مگر چونکہ اس امر میں اب کی بار طمع وآرزو کا زیادہ دست دراز تھا اس لیے قریش کسی طرح نہ رک سکے۔ بالآخر محاکمہ کی نوبت آئی اور اس کے تصفیہ میں نظام قدرت نے قریش کی دوں طبعی کا منظر اور بنی ہاشم کی خوش اخلاقی اور فیاضی کا محضر ان کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا تو پھر محروم ان قریش کو تو یہ انابت اور خجالت وندامت کے سوا ار چارہ ہی کیا تھا۔ یہ تاریخی واقعات انہیں حالات ومشاہدات کے آئینے میں جن میں حقیقت کے پورے انکشاف ہوتے ہیں۔

تمام تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چاہ زمزم کی تکمیل تعمیر تک قریش نے بالکل خاموشی اختیار کی مگر تکمیل زمزم کے بعد مخالفت قریش کی ایک اور مذبوحی حرکت تاریخوں سے پائی جاتی ہے جو حسب ذیل ہے:

عبدالمطلب کی مخالفت میں قریش کی ایک آخری حرکت مذبوحی

جب زمزم کی تعمیر تمام ہوگئی تو حضرت عبدالمطلب نے چاہ زمزم کو تمام اقوام مکہ کے لیے وقف کر دیا۔ ایک تو ایسے متبرک اور مقدس کنوئیں کی قدامت اور پھر حرم محترم کے اندر واقع ہونے کی خصوصیت اور برکت نے تمام لوگوں کو اس کے استعمال کی طرف خاص توجہ اور رغبت دلائی مکہ میں اس وقت بارہ کنوئیں اور بھی قبل سے بنے موجود تھے۔ اس طرح کہ ہر قبیلہ کے لیے ایک کنواں علیحدہ تھا۔ ان کی تفصیل پوری تصریح کے ساتھ سیرت ابن ہشام میں مندرج ہے۔ ص50۔

زمزم کی تعمیر کے بعد جیسا کہ مواہب لدنیہ کے اسناد سے صاحب روضۃ الاحباب کا نظریہ ہے کہ مکہ کے یہ تمام کنویں بے کار ہو گئے۔ ان کا مصرف محض افاقی ضرورتوں کے وقت تک محدود ہو گیا۔ زمزم کے مرجوعہ عام نے جس کی بنا تعمیر کو حضرت عبدالمطلب کی خاص

فیاضی اور عالی ہمتی سے تعلق تھا آپ کی عظمت اور قدر و منزلت اہل عرب کی نگاہوں میں پہلے سے بھی زیادہ کر دی۔ حضرت عبدالمطلب نے جس خلوص و عقیدت سے اس کارِ خیر کی ابتدا کی تھی اسی نیک نیتی اور پاک نفسی کے ساتھ اس کو انجام تک پہنچا بھی دیا۔ تجدید و ترمیم زمزم کو حضرت عبدالمطلب نے خدا کی طرف سے سمجھ کر اپنا فرض عینی یقین کر لیا تھا۔ اسی لیے اس کی انجام دہی میں جیسا کہ ہم اوپر بتلا آئے ہیں بڑے حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ چاہ زمزم سے جو اشیا برآمد ہوئے تھے اور جو قریش کے تمام مفسدوں کے اصلی باعث تھے ان کو آپ نے جیسا قریش کا گماں تھا اپنی ضرورتوں کے لیے کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ ویسا کا ویسا ہی محفوظ رکھا۔

جب چاہ زمزم تیار ہو گیا تو قریش نے اس میں حصہ پانے کا پھر مطالبہ کیا۔ عبدالمطلب نے پھر دینے سے انکار کیا۔ بالآخر قرعہ اندازی کی گئی۔ سونے کے ہرنوں اور قلعی دار تلواروں پر تو کعبہ کا نام نکلا اور وہ اسی وقت سے کعبہ کی نذر کر دی گئیں۔ باقی رہیں زرہیں ان پر عبدالمطلب کا نام نکلا۔ وہ ان کو مل گئیں۔ قریش کا نام کسی پر نہ نکلا۔ یہ بالکل محروم رہ گئے۔ ؎

ملمع راسہ حرفست و ہر سہ تہی

سیرت ابن ہشام ص50، مصر

ان اشیا کعبہ کے متعلق دو قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے سونے کے ہرنوں کو توڑ کر اسی سے درہائے کعبہ کے کبہ (کلمنجیں) قفل اور کنجیاں بنوایں اور تلواروں کو باب کعبہ پر عظمت و جلالت کے اظہار کے لیے آویزاں کر دیا۔ (طبقات ابن سعد ص50، ج1، جرمن)

دوسری روایت یہ ہے کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ بلکہ ان اشیا کو اسی طرح در کعبہ پر آویزاں کر دیا۔ ایک مدت تک یہ دونوں چیزیں آویزاں رہیں پھر قریش ان کو چرا کر لے گئے۔ طبقات ابن سعد صفحہ ایضاً۔

ان سعد نے مختصر الفاظ میں اس کی کیفیت یوں کہی ہے:

فلما حفر عبدلمطلب زمزم استخرج الغزال و سیوفا قلعیه فضرب علیها القداح فخرجت الکعبة فجعل صفائح الذهب علی باب الکعبة فغدا علیه ثلاثة نفرا من قریش فسرقواه

جب عبدالمطلب نے زمزم کو کھودا تو اس میں سے سونے کے دو ہرن قلعی کی تین تلواریں اور زرہیں برآمد ہوئیں۔ ان پر قرعہ اندازی کی گئی۔ یہ اشیاء خانہ کعبہ کے نام پر نکل آئیں اور وہ سونے کی اشیاء باب کعبہ پر آویزاں کرا دی گئیں۔ وہ آویزاں تھیں۔ یہاں تک کہ قریش کے تین آدمی اسے چرا لے گئے۔

محدث شیرازی نے روضۃ الاحباب میں اس واقعہ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ اصل عبارت حسب ذیل ہے:

قریش نزد عبدالمطلب آمدندن و گفتند ترا نصیبیی از ایں مال بمابابید دا دو آغاز

مخاصمت کردند۔ عبدالمطلب گفت اگرچه شمارا در ایں حصے نیست زیراکه مرا دریں امر اعانت نگردید بلکه مانع شدید لیکن من انصاف دہم و باشما قرعه برآرم۔ ایشآں راضی شدند۔ عبدالمطلب مال را دو قسم کردند۔ آہو برہا را قسمتے ساخت و اسلحه جات را قسمتے۔ و قرعه را بنام کعبه تعین ساخت۔ دیگرع بنام قریش و دیگرے بنام خود چوں قرعه زدآہو برہا بنام کعبه برآمد و اسلحه بنام عبدالمطلب و قریش را چیزیں نرسید۔ عبدالمطلب ان اسلحه را که بنام دے برآمدند در مصالح خانه کعبه صرف کرد۔ فرمود تا در اسنہین برائے کعبه کعبه ساختدند و ازاں در اہنین برائے خانه کعبه بساختند و ان دو آہو بره زریں که نصبیب خانه کعبه بود بدادتاکو کبہائے ازاں بساختند و براں در اہنیں نشاندند۔ دور روایتے آنست که ایشآں را بہماں صورت بردر کعبه آویختند و ہمچناں آدیخته بود تا شبع جماعت از قریش بخوردن خمر مشغول بودند۔ و ابولہب درمیان یشاں بود و کنیزگان مغنیه ہم بودند چوں اسباب طرب ایشاں ختم شد۔ متوجه خانه کعبه شدند و آں دو آہو بره للاء که آنجا آویختند که خمر بمکه آوروه بودنده ہرچه درآن قافله لود بیکبار در بہآئے آن بستند و یک ماه بطرب و لہو مشغول وندو درآن یئکماه پچکس را معلوم نبود که انکار از که صادر شده تاشبے عباس ابن عبدالمطلب را افاق مرور بر در سرائے که ننجماعت در انجا بودند واقعه شد۔ کنیزگان مغنیه سرودمی گفتند و در اثنائے سرددگفتن بیانے که مشتمل بود بر سرقه آں دو ہو بره از در خانه کعبه و فروختن باہل قافله میخواندند عباس بشنید و قریش راازاں مطلع ساخت آنجماعت راگرفتند و تادریب بلیغ کردند و بعضے راقطع ید کرند

قریش عبدالمطلب کے پاس آئے اور کہا کہ تم کو اس مال میں ہم لوگوں کو بھی حصہ دینا چاہیے اور مخاصمت شروع کر دی۔ عبدالمطلب نے کہا کہ اگرچہ اس مال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ اس کام میں تم لوگوں نے مجھے کوئی مدد نہیں پہنچائی ہے بلکہ مجھ کو تو تم نے اس سے باز رکھنا چاہا تھا۔ مگر تا ہم میں تمہارے

ساتھ انصاف سے کام لوں گا اور اس کام کو قرعہ سے انجام دوں گا۔ وہ راضی ہو گئے۔ عبدالمطلب نے مال کے دو حصہ کیے ایک حصہ میں سونے کے ہرنوں کو رکھا اور دوسرے میں زرہوں کو۔ ایک قرہ کعبہ کے نام۔ ایک قریش کے نام اور ایک اپنے نام ڈالا جانا تجویز کیا۔ اسی کے مطابق قرعہ ڈالا گیا۔ جب قرعہ ڈالا گیا تو سونے کے ہرنوں پر کعبہ کا نام نکلا اور زرہوں پر عبدالمطلب کا نام نکلا اور قریش کا نام کسی چیز پر نہیں نکلا۔ عبدالمطلب نے ان زرہوں کو جو ان کے نام سے نکلی تھیں خانہ کعبہ کے اصلاح کے کاموں میں صرف کیا۔ اس سے کعبہ کے آہنی دروازے بنائے جانے کا حکم کیا۔ اور وہ بنائے گئے اور ان سونے کے ہرنوں کو دیگر خانہ کعبہ کے کواڑوں کی میخیں تیار کرائیں۔ اور کواڑوں پر ٹھلائیں۔ سونے کے دونوں ہرنوں کو جو لٹکے ہوئے تھے چرالیا اور اسی رات کو شراب فروشوں کے قافلہ کے ساتھ جو مکہ میں فروتھا ان کو بیچ ڈالا اور جتنی شراب ان کے پاس تھی سب ایک بار خریدلی اور ایک مہینہ تک شراب پیتے رہے یہ کسی کو نہ معلوم ہوا کہ یہ فعل کس سے صادر ہوا یہاں تک کہ ایک شب کو عباس ابن مطلب کا قریش کی اس صحبت عیش کی طرف سے گذر ہوا۔ کنیزان مغنیہ گا رہی تھیں اور اپنے گیتوں میں اُن دونوں حلائی ہرنوں کے چوری کرنے اور قافلہ کے ہاتھ بیچ دینے کے پورے حالات گویا گلے پھاڑ پھاڑ کر بیان کر رہی تھیں۔ عباس نے ان گیتوں کو سنا اور قریش کو تمام حالات کی اطلاع کی۔ جماعت کی جماعت پکڑی گئی۔ ان کی سخت تنبیہ وتادیب کی گئی اور بعلت جرم سرقہ بعضوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے۔ (روضۃ الاحباب ص 63)

ابن سعید کی اجمالی تفصیل تھی اور روضۃ الاحباب نے قریش کے حرکات ناشائستہ کی کامل تشریح کر دی۔ ان تمام فضیحتوں کے بعد بھی قریش بنی ہاشم کے ساتھ ہم بطنی اور ہم نسبی کے غلط قیاس پر مساوات کے دعوے دار بنے تھے اور اپنے تعیم کے زعم میں تخصیص کے نظام ربانی میں خواہ مخواہ اپنے آپ کو داخل وشامل سمجھتے تھے اور باوجود متواتر ناکامیابیوں کے بھی اپنے زعم حماقت سے باز نہیں آتے تھے۔ ہم ان کے نام ہنجار کردار ورفتار کو بہت جلد اپنے آئندہ بیان میں قلمبند کرتے ہیں۔

ہاشم مرحوم کے حالات میں امیہ ابن عبدشمس کے زعم باطل اور اُس عظیم منافرہ کی پوری کیفیت جوانہوں نے ہاشم کے مقابلہ میں قائم کیا تھا اور بالآخر جو ذلت ورسوائی اٹھائی تھی بالتفصیل لکھ آئے ہیں۔ امیہ کے بعد ان کے بیٹے حرب ابن امیہ نے بھی حضرت عبدالمطلب کے ساتھ ہی خیال باطل پیدا کیا۔ اور خواہ مخواہ عرب کی قدیم رسم جہالت منافرہ کی پھر بنیا دڈالی۔ گرچہ نتو اند پسر تمام کند۔

بہر حال تعمیر چاہ زمزم کے متعلق ہم مفصل حالات لکھ چکے ہیں۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاوے تو حضرت عبدالمطلب کی یہ ہمت، یہ فیاضی اور احسان اپنے خاص ملک واحسان کے لیے محدود نہیں تھا بلکہ ان تمام بے شمار اور لاانتہا قوم وقبائل کے لیے بھی جو حج کے

موسم میں دور دور سے زیارت بیت اللہ کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا کارنمایاں تھا اور احسان بن فراواں جو حضرت عبدالمطلب کی فیاضی اور عالی ہمتی کی لاجواب مثال بن کر ابدالاباد تک قائم رہا۔

حضرت عبداللہؑ ذبیح ثانی کی قربانی

چاہ زمزم کی تکمیل کے بعد آپ کی حیات گرامی صفات کا واقعہ حضرت عبداللہ ذبیح ثانی کی قربانی ہے۔اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

چاہ زمزم کی ترمیم حقیقتاً ایک کارعظیم تھی۔ اول تو اس قدیم آثار ابراہیمی کا احیا اس کی تجدید خلف الصالح ہونے کی حیثیت سے حضرت عبدالمطلب کی سعادت درشادت کا فرض منصبی تھا۔ دوسرے حجاج کعبہ اور رفاہ عام کی خالصتاً قربتاً الی اللہ خدمت آپ کی اس فیاضانہ اور دلیرانہ ہمت کی محرک تھی۔ان سب پر عرب کی سنگلاخ زمین پر عموماً اور حجاز کی سطح آہنی پر خصوصاً، کنواں کھودنا اور پانی نکالنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ بلکہ بڑے کلیجے والے کا کام تھا۔حضرت عبدالمطلب بھی اپنی ذمہ داری۔اس امر مہتم بالشان کی دشواری اور اس بارعظیم کی گرانباری کو خوب سمجھتے تھے۔اس پر اپنے ہم قوم اور ہم وطن قبائل کی مخالفت اس امرعظیم کی تکمیل کی طرف سے آپ کو کس قدر مایوس اور بے دل بنا رہی تھی مگر آپ کے روحانی استقلال و پاداری نے ان امور کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ جو کام اپنے ذمہ لیا تھا ان تمام دقتوں اور دشواریوں کی موجودگی میں بھی تمام کر دیا۔

ان تمام دشواریوں کے خوفناک عالم میں اپنی اس خدمت جلیل کی انجام دہی کے متعلق اس شرط و اقرار کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں نذر مانی تھی کہ اس خدمت فی سبیل اللہ کے صلہ میں اگر منعم حقیقی ان کو دس بیٹے عنایت فرمائے گا اور ان سب کو سن بلوغ تک پہنچائے گا تو ان میں سے ایک بیٹے کو وہ خدا کے نام پر قربانی کر دیں گے۔

مجیب الدعوات نے اس نیک نفس بزرگ کے اس پاک ارادے اور نیت کو بھی پورا کر دیا۔حارث، زبیر، ابی طالب، عبداللہ، حمزہ، ابولہب، غیداق، المقوم، ضرار اور عباس دس بیٹوں کی تعداد پوری ہوگئی۔تو حضرت عبدالملب ایفائے نذر کے لیے تیار ہو گئے۔طبقات ابن سعد میں اس منظر کو ذیل کی عبارت میں دکھلایا ہے:

ثم اخبرھم و دعاھم الی الوفاء اللہ بہ فما اختلف علیہ منھم احدا و قالوا اوف بنذرك و افعل ما شئت

حضرت عبدالمطلب نے اپنے تمام بیٹوں کو جب سب بالغ ہو چکے اپنے ارادے سے مطلع فرمایا اور ان کو خدا کے ایفائے نذر کے لیے بلایا ان میں سے کسی ایک نے بھی باپ کے حکم سے اختلاف نہیں کیا اور متفق اللفظ ہو کر عرض کی آپ شوق سے اپنی نذر کے وعدے کو پورا کریں اور جو تجویز فرمایا ہے اس پر عمل فرمائیں۔(طبقات ج ا ص 53 جرمن)

ایک بیٹے کی قربانی کا وعدہ ہے اور یہاں باپ کے حکم پر دسوں بیٹے لبیک کہہ رہے ہیں۔اب اس میں سے کسے قربانی کیا جائے۔ باپ کا دل اس کا تصفیہ نہ کر سکا۔مگر حضرت عبدالمطلب کے استقلال و پاداری نے قرعہ اندازی کے ذریعہ سے اس رحلے کو بھی طے کر لیا۔ حسن اتفاق سے ان کے محبوب ترین فرزند عبداللہ کے نام قرعہ نکلا۔اب اس سے زیادہ دشواری سے سامنا ہوا۔مگر حضرت عبدالمطلب کا استقلال بے مثال تھا۔ ہمت لا جواب تھی۔فوراً پیارے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور مذبح کی طرف لے چلے۔اس حسرتناک عالم کو ابن سعد طبقات میں یوں دکھلاتے ہیں:

فاخذ بیدہ یقودہ الی المذبح و معه المدیه فبکی بنات عبدالمطلب و کن قیاما و قالت احداهن لابیها العذر فیه بأن تضرب فی ابلك السرائم التی فی الحرم

حضرت عبدالمطلب حضرت عبداللہ کو ہاتھ پکڑ کر مذبح کی طرف لے چلے تو اس وقت عبدالمطلب کے ساتھ ان کے اہل وعیال، خویش و اقارب کی جماعت کی جماعت ساتھ تھی۔ ان میں سب سے زیادہ ان کی صاحبزادیاں بھائی کی محبت میں بے قرار اور زار وزار روتی تھیں بالآخر ان میں سے ایک نے باپ سے عرض کی کہ عبداللہ اور ان اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی کیوں نہیں کی جاتی جو حرم میں چر رہے ہیں۔ (ابن سعد)

سیرت ابن ہشام میں بنات عبدالمطلب کے ساتھ حضرت عبداللہ کے ننہال اعزہ و اقارب بھی اس قرعہ اندازی کی تجویز میں شریک پائے جاتے ہیں۔اصل عبارت یہ ہے:

و قال له المغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخذوم و کان عبداللہ ابن اخت القوم واللہ لاتذبحه ابدا حتی تعذر فیه فان کان فداؤہ بأموالنا فدیناہ

مغیرہ ابن عبداللہ ابن عمر بن مخذوم نے جو رشتہ میں حضرت عبداللہ کے ماموں ہوتے تھے۔عبدالمطلب سے کہا کہ ہم عبداللہ کو ہرگز ذبح نہ ہونے دیں گے تاوقتیکہ ان کے لیے بھی قرعہ اندازی کی جائے اور ان کا جو فدیہ ہوگا وہ ہم اپنے مال سے ادا کریں گے۔(سیرت ابن ہشام ص 52 مصر)

حضرت عبدالمطلب نے بالآخر قرعہ اندازی کی تجویز اختیار کی۔ چونکہ شریعت ابراہیمی میں رقم دیت کے نصاب مقررہ کی نسبت عشر مقابل کا طریقہ جاری تھا۔اس لیے حضرت عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کے بدلے پہلے دس اونٹوں کی تعداد پر قرعہ ڈالا۔قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلا۔عبدالمطلب نے پھر دس کی تعداد بڑھا کر دس کے بیس کر دیے۔ پھر عبداللہ ہی کا نام نکلا۔حضرت عبدالمطلب بقاعدہ عشر دس دس اونٹ برابر بڑھاتے گئے۔ یہاں تک کہ سو اونٹوں کی تعداد پوری ہوگئی۔تو قرعہ اونٹوں کے نام برآمد ہوا۔اور حضرت عبداللہ قربانی سے بچ گئے۔

حضرت عبدالمطلب کو اپنی نذر کے نامکمل رہ جانے سے ایک گونہ ویسے ہی ملال ہوا۔ جیسا آپ کے مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت ابراہیمؑ کو فدیہ اسماعیل کے نازل ہونے سے مستول ہوا تھا۔ اس لیے حضرت عبدالمطلب نے خاص کر اپنے اطمینان کلی حاصل اور فرمان ایزدی کے کامل کر لینے کی غرض سے اس حکم کے آ جانے پر بھی تین بار پھر قرعہ اندازی فرمائی۔ اس مستقل مزاج اور مستقیم الارادہ بزرگ ہاشمی کی اس حزم و احتیاط کا منظر ابن ہشام نے ذیل کی عبارت میں دکھلایا ہے۔

فخرج القدح علی الابل فقالت قریش و من حضر قد انتهی رضا ربك یا عبدالمطلب قال لا والله حتی اضرب علیها ثلاث مرات فضربوا علی عبدالله و علی الابل و قام عبدالمطلب یدعو الله فخرج القدح علی الابل ثم عادوا الثانیة و عبدالمطلب قائم یدعو الله فضربوا فخرج القدح علی الابل ثم عادو الثالثة و عبدالمطلب قائم یدو عوراالله فضربوا فخرج القدح علی الابل نحرت (ابن هشام 52)

جب اونٹوں پر قرعہ نکل آیا تو قریش اور جملہ حاضرین نے حضرت عبدالمطلب سے کہا کہ اب تو خداوند عالم عبداللہ کے فدیہ پر راضی ہو گیا۔ عبدالمطلب نے جواب دیا میں اس کو نہیں مانوں گا جب تک کہ تین بار قرعہ اندازی کر کے اس حکم کو محکم نہ کر لوں چنانچہ پھر قرعہ ڈالا گیا۔ حضرت عبدالمطلب اب کی بار بھی سابق کی طرح خدا سے دعا مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ پھر اونٹوں ہی کے نام قرعہ نکلا۔ دوسرے بار پھر دہرایا۔ اور عبدالمطلب اس طرح دست بدعا رہے۔ مگر اب کے بھی قرعہ اونٹوں ہی کے نام نکلا۔ تیسری بار پھر قرعہ ڈالا گیا اور عبدالمطلب کھڑے ہو کر دست بدعا رہے مگر قرعہ اونٹوں ہی کے نام نکلا۔ یہ مشاہدہ فرما کر عبدالمطلب نے اونٹوں کو نحر فرمایا۔

اس واقعہ سے حضرت عبدالمطلب کے کمال استقلال و پاداری کے پورے ثبوت ملتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کو خدا کے کاموں کے بجالانے اور تعمیل میں کس قدر حزم و احتیاط، استحکام و استقلال لاحق حال رہتا ہے۔ ان سب امور کے ساتھ اس راز عظیم کا بھی پورا انکشاف ہو گیا کہ سلسلہ ابراہیمی میں یہ دوسری قربانی بھی فدیہ سے بدل گئی اور انی اذبحك کی نیت و ارادہ اپنی اصلی صورت میں اس وقت تک جلوہ آرا نہیں ہوا جب تک کہ ایک سو بارہ برس کے بعد اس خاندان کے مایہ افتخار ابی عبداللہ الحسین ابن علی علیہما السلام نے عدیم المثال استقلال سے خدا کی راہ میں جان دے کر اس کمی کو پورا نہ کر دیا۔

یہ واقعہ بھی حضرت عبدالمطلب کے کمال و استقلال، ہمت اور ایثار نفسی کا عظیم ترین واقعہ ہے جو تعمیر و ترمیم چاہ زمزم کی خاص فیاضی

سے کبھی کم نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ قلبی تعلقات و جذبات کے اعتبار سے تو ہر شخص اس واقعہ کو اس سے بھی زیادہ دشوار و غیر تحمل قرار دے گا۔ حقیقت میں یہ نیاز و انداز ایسا کامل۔ ایسا خالص اور ایسا بے مثال تھا کہ ان کے بعد ان کی اولاد نے اس شرف مخصوصہ پر برابر مفاخرت کا خاص اظہار کیا۔ یہاں تک کہ فخر موجودات، مفل کائنات، اشرف المرسلین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ الطاہرین نے انا ابن الذبیحین کا اعتراف فرما کر اس کی روحانی عظمت، تقدیس قرار فرمایا۔

عرب کے تمام قدیم و جدید مؤرخین بڑی شرح و بسط سے حضرت عبدالمطلب کے اس بے نظیر ایثار و انداز کے واقعہ کو اس وقت سے لے کر اس وقت تک برابر لکھتے آئے ہیں مگر سر سید صاحب نے بڑی دلیری سے اس متفق العام اور مشہور بین الجمہور واقعہ کی تردید و تکذیب کی ہے۔ ان کے افکار کا اصلی اور حقیقی سبب وہی قربانی اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے متعلق ان عیسائیوں اور یہودیوں کی کورانہ تقلید و تصدیق ہے جس کی پوری تنقید کر دی گئی ہے۔ سید صاحب کا یہ انکار، عربی تاریخ و سیرت سے ان کی بے خبری اور کوتاہ نظری ثابت کرتا ہے۔

حرب بن امیہ (پدر ابوسفیان) کی حاسدانہ مخالفت

حضرت ہاشم کے حالات میں امیہ ابن عبدشمس کے زعم باطل اور اس عظیم الشان معرکہ منافرہ کی داستان کامل جو امیہ نے ہاشم کے مقابلہ میں کیا تھا اور بالآخر جو ذلت و رسوائی اٹھائی تھی ہم پوری تفصیل سے اوپر لکھ آئے ہیں۔ امیہ کے بعد حرب بن امیہ نے بقولیکہ ؎ بیٹا وہی قدم بقدم ہو جو باپ کے۔ حضرت عبدالمطلب کے ساتھ وہی خیال باطل پیدا کیے اور خواہ مخواہ عرب کی قدیم رسم جہالت، معرکہ منافرت کی بنیاد ڈالی۔

قبل اس کے کہ ہم اس جاہلانہ رسم منافرت کا جو حقیقتاً باہمانہ مفاخرت کی زبانی رجز خوانی ہے مفصل حالات قلم بند کریں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی تفصیل سے پہلے اس کے اسباب وقوع کو بیان کر دیں حقیقت یوں ہے کہ حضرت عبدالمطلب کی نیک نیتی، فیاضی، حسن اخلاق، محاسن تہذیب اور ذاتی اعزاز و وجاہت کے اوصاف نے آپ کو اپنے بزرگوں کے اقتدار و عظمت کا کامل نمونہ بنا رکھا تھا۔ خصوصاً زمزم کی تعمیر نے قریش اور عام باشندگان مکہ اور گرد و نواح کے تمام قبائل و اقوام کو آپ کا مطیع و منقاد بنا دیا تھا۔ معاملات زمزم میں قریش کو شکست فحش پہنچ ہی چکی تھی۔ عبدالمطلب کی اس تازہ نام و نمود نے ان کے حسد و کینہ کو پہلے سے بھی زیادہ مشتعل اور برانگیختہ کر دیا۔ نذر و قربانی کے معاملہ نے یہ قیامت کی نوعیت کر دی کہ عبدالمطلب کی روحانی عظمت و تقدیس کا تمام عرب کو براۃ العین مشاہدہ کرا دیا۔ اور اس واقعہ عظیم سے وہ آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا اصلی وارث اور قائم مقام یقین کرنے لگے اور آپ کی امارت و حکومت کے ساتھ عقیدت و ارادت کے تعلقات بھی اہل عرب کے قلوب میں پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد ہی بنی ثقیف کی منافرت کا واقعہ پیش ہوا۔ اگرچہ وہ غیر مقام تھا اور غیر لوگ تھے مگر حسد و نفسانیت کی وجہ سے قریش میں سے کسی نے بھی عبدالمطلب کے ساتھ اس منافرہ میں ساتھ نہیں دیا لیکن ایسی تنہائی اور غربت کے عالم میں بھی خدا نے عبدالمطلب کی بات رکھ لی۔ معرکہ منافرہ میں بنی ثقیف ہارے اور بنو ہاشم و بنو عبدالمطلب جیتے۔ اس واقعہ نے حرب بن امیہ کو خواہ مخواہ سب سے زیادہ پر جوش بنا دیا اور ایسا کہ پھر وہ قرابت و اتماد سب کو

بالائے طاق کھ کر فوراً مقابلہ پر تیار ہو گیا۔

کان لعبد المطلب بن هاشم ماء بالطائف يقال له ذوا لهزم و كان فی بدی ثقیف وهراً ثم طلبه عبدالمطلب منهم فابوا عليه و كان صاحب امر ثقیف جندب بن بن الحارث فابی علیه و خاصمه فيه فدعا هماذالك الى المنافره الى الكاهن العذری و كان يقال له عزی سلمه و كان بالشام فتنافر اعلی ابل سموها فخرج عبدالمطلب فی نفر من قریش و معه ابنه الحارث ولا ولد له يومئذ غيره و خرج جندب فی نفر من ثقیف فنفد ماء عبدالمطلب و اصحابه فطلبوا الى الثقيفيين ان يسقوهم فابوا ففجر الله لهم عينا من تحت حر ان بعير عبدالطلب فحمد الله عزوجل و علم ان ذلك منه فشربوا ربهم و حملوا حاجتهم و تفقد ماء الثقيفين فبعثوا الى عبدالمطلب يستسقونه فسقاهم و اتو الكاهن فنفر عبدالمطلب عليهم فاخذ عبدالمطلب الابل فخرها و اخذ ذوالهرم و رجع و قد فضله عليه و فضل قومه على قومه

عبدالمطلب بن ہاشم کا طائف میں ایک چشمہ آب تھا جس کا نام ذوالہزم تھا اور وہ مدت سے بنی ثقیف کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔عبدالمطلب نے اس کا مطالبہ کیا۔قبیلہ ثقیف نے انکار کر دیا۔جندب بن الحارث ان کا امیر تھا۔اس نے چشمہ کے دینے سے انکار کیا اور مخاصمت پر آمادہ ہو گیا۔جانبین سے منافرہ کے شرائط مقرر ہوئے اور قبیلہ عذرا کا کاہن جو عزی سلمی کے نام سے مشہور تھا طرفین سے حکم مقرر ہوا۔اور معاوضہ میں دونوں فریق سے ایک ایک اونٹ علیحدہ کیا گیا۔اس لیے کہ جس کا حق ثابت ہو وہ ناحق والے سے ایک اونٹ تاوان لے۔عبدالمطلب قریش کی جماعت کو لے کر نکلے۔اور آپ کے ساتھ حارث آپ کے بیٹے بھی تھے۔اور اس وقت تک یہی ایک لڑکے تھے۔اس طرف سے جندب بھی بنی ثقیف کی جماعت لیکر باہر نکلا۔دونوں جماعتیں حکم کے آنے کی منتظر رہیں۔حکم کے آنے میں غیر امید دیر ہوئی۔اسی اثنا میں عبدالمطلب کا ہمراہی پانی تک گیا۔انہوں نے ثقیف سے پانی مانگا۔ان سب نے پانی دینے سے قطعی انکار کر دیا۔قدرت خدا نے عبدالمطلب کے اونٹ کے پاؤں کے نیچے ایک چشمۂ رواں پانی کا پیدا کر

دیا۔عبدالمطلب اور ان کے ہمراہیوں نے خداوند عالم کا شکر ادا کر کے وہ پانی پیا۔اپنی تمام جماعت کو وہ پانی پلایا اور بقدر ضرورت بار کرلیا۔ابن بنی ثقیف کا پانی بھی ختم ہوگیا۔تو سب کے سب عبدالمطلب کے پاس آئے اور پانی کے خواستگار ہوئے۔آپ نے ان سب کو بھی پانی پلایا۔پھر دونوں فریق مل کر کاہن کے پاس گئے۔اس نے عبدالمطلب کے حقوق کو ترجیح دی۔اور شرط منافرہ کے مطابق عبدالمطلب نے ان اونٹوں کو لے لیا اور ذبح کیا اور چشمہ اب ماوسومہ ذی الہرم کو جو جانبین میں بناء تنازع تھا بنی ثقیف سے واپس دلوا دیا۔عبدالمطلب پھر وہاں سے واپس آئے اور اس دن سے ان کو اور ان کی قوم کو بنی ثقیف اور ان کی قوم پر فضیلت وترجیح حاصل ہوگئی۔(سیرت ابن ہشام ص 53)

بنی ثقیف پر حضرت عبدالمطلب اور بنی ہاشم کی فتحیابی نے حرب ابن امیہ کے دل میں خواہ مخواہ نفسانیت پیدا کر دی اور پھر ایسی کہ وہ اس سے ایک دم کے لیے بھی سنبھال نہ سکا اور باوجود یکہ حضرت عبدالمطلب کے ساتھ مراسم تھے اور ان کے درمیان کوئی مشاجرت بھی نہیں تھی مگر سب سے قطع نظر کر کے حضرت عبدالمطلب سے منافرت اور مخاصمت پر آمادہ ہوگیا۔طبقات میں ابن سعد لکھتے ہیں:

تنافر عبدالمطلب ابن هاشم و حرب ابن امیه الی النجاشی الحبشی فابی ان ینفر بینهما فجعل بینهما نفیل ابن عبدالعزی فقال الحرب یاابا عمر ا تنافورجلا هو اطول منك قامة و اعظم منك هامة و اوسم منك وسامة و اقل منك لامة و ا کثر منك ولدا و اجزل منك صفدا و اطول منك مزودًا فنفره علیه فقال حرب ان من انتکاث الزمان ان جعلناك حکما (طبقات ص52)

عبدالمطلب ابن ہاشم اور حرب ابن امیہ کے درمیان منافرہ قرار پایا۔اور نجاشی حاکم حبش کو حکم ہونے کے لیے لکھا گیا۔اس نے ان لوگوں کے درمیان حکم مقرر ہونے سے انکار کر دیا۔تب طرفین سے نفیل ابن عبدالعزی حکم مقرر ہوا۔نفیل نے حرب کو مخاطب کر کے کہا کہ تم کیونکر ایسے شخص سے منافرہ کر سکتے ہو جو قد و قامت میں تم سے زیادہ طویل، ہمت میں تم سے زیادہ وسیع، حسن و جمال میں تم سے زیادہ وجیہہ، عیوب و مناقص میں تم سے بہت ہی کم، اولاد و اعقاب میں تم سے بہت زیادہ جود و سخا میں تم سے زیادہ فیاض اور تقریر و بیان میں تم سے زیادہ لسان۔یہ کہہ کر نفیل نے عبدالمطلب کو حرب پر فضیلت دی۔حرب نے کہا کہ یہ ہماری شومی ایام تھی کہ ہم نے تجھ کو اپنا حکم مقرر کیا۔

یہ تھے بنی امیہ حضرات کے حرکات جو ابتدا سے بنی ہاشم کی مخالفت میں انواع واقسام کی خوفناک صورتیں پیدا کیا کرتے تھے۔ہر

شخص ان حالات و واقعات کو دیکھ کر سمجھ لے گا کہ جس طرح تمام اہل عرب میں قریش کی اور تمام قریش میں بنی ہاشم کی فضیلت اور قدر و منزلت قدیم ہے اسی طرح بنی امیہ کے مقابل میں کامل طور پر بنی ہاشم کی مفاخرت بھی اور اسی کے ساتھ جس طرح بنی ہاشم کے قریش ہمیشہ مخالف بنے رہے اسی طرح بنی ہاشم کے بنی امیہ بھی جانی دشمن۔

اصول اضداد کے اعتبار سے قریش وامیہ کی مخالفت بنی ہاشم کی وجاہت کو صدمہ پہنچانے کی جگہ **کل شیء یعرف باضدادھا** (تمام اشیا اپنے اضداد سے پہنچانے جاتے ہیں) کے مطابق تمام دیار و امصار میں ان کے اثار و اقتدار کو فضیلت دی گئی۔ افسوس ہے کہ جس طرح ہاشم اور امیہ کے باہمی مخاصمت و منافرت کو مولوی شبلی نے چھپایا ہے اسی طرح حرب و عبدالمطلب کی مشاجرت کو بھی۔ حالانکہ واقعات ان کے اصل ماخذ طبقات ابن سعد میں موجود ہیں اور ہم نے خاص کر اسی سے نقل کیے ہیں۔

ہم شبلی صاحب کے اس استخفاف کے لیے پھر وہی لکھیں گے جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اس کے لیے مولانا صاحب سخت مجبور ہیں کیونکہ ان حالات کا لکھنا عام اس سے کہ یہ کیسی ہی معتبر تاریخی ماخذوں میں مندرج نہ ہوں ان کے موجودہ مدعائے تالیف کے لیے بے حد مضر تھے۔ اس استجاب واستخفاف سے وہ جو کام لینا چاہتے تھے وہ یہی تھا کہ بنی ہاشم کے ذاتی اقتدار، ثروت واختیار میں وہ تخصیص و تائید ربانی کی اہمیت نہ ظاہر ہونے دیں بلکہ عام ملکی عوج وزوال اور قومی ترقی وادبار کی معمولی صورت میں۔ اصول تعمیم کے مطابق۔ ان کے معاملات کو بھی غلبہ اور استیلا وغیرہ کا نتیجہ قرار دیں۔ مگر حقیقت کا متلاشی جس طرح حقیقت کی باریکیوں کو پالیتا ہے اسی طرح خودغرضی اور نفسانیت کی تاریکیوں کو بھی۔ جیسا کہ ان واقعات نے اصل حقیقت کی چہرہ کشائی کر دی۔ تعمیر زمزم، نذر عبداللہ، منافرہ قریش، منافرہ بنی ثقیف اور منافرۂ بنی امیہ۔ حیات عبدالمطلب کے قابل الذکر واقعات تھے جن کو شبلی صاحب نے یا تو سرے سے مرفوع القلم فرما دیا یا ان میں سے بعض کو (زمزم کی مرمت، عبداللہ کی نذر) لکھا بھی تو اس اختصار کے ساتھ جو تلخیص التخلیص کا جوہر مقطر کہا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ انہیں واقعات کی طرح اہدام کعبہ کے قصد سے اصحاب فیل کی فوج کشی کے حالات ہیں۔ جو عبدالمطلب کی زندگی کے مشہور ترین واقعات ہیں۔ ہم ان کو ابن ہشام اور زرقانی کے اصلی عبارتوں سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ابرہہ بن الصباح (اصحاب الفیل) کی خانہ کعبہ پر ناکامیاب فوج کشی

ابرهه بن الصباح الاشرم لانه لما قلب علی الیمن و ملکها من قبل نجاشی رای الناس یجهزون ایام الموسم للحج فقال ابن تذهبون فقیل الحجون بیت الله بمکه فقال من هو قبل من الحجارة قال وما کسوه نه ا یاتی من هنا من الوصائل فقال والمسیح لا بنین لکم خبر منه فبنی لهم کنیسة بصنعاء بالرخام الا بیض والاحمر والاصفر والاسود وجلاه بالذهب والفضة وانواع الجواهر و اذل

اهل اليمن على بنائها و كلفهم فيها انواعا من الشجر ونقل لها الرخام المجزع
والحجارة المنقشة بالذهب والفضة من قصر بلقيس وكان على فرسخ من موضعها
ونصب فيها صليبا نا من ذهب و فضة و منابر من عاج و ابنوس و غيره وكان
تشرف منها على عدن لا رتفاع بنائها و علوها ولذا سماها القليس فلما قيل
ماراداالحج اليها كتب للنجاشى انى بنيت كنيسه باسم الملك لم يكن مثلها
قبلها اريد صرف حج العرب اليها و امنع الناس من الذهاب الى المكة فلما
اشتهر الخبر عندالعرب خرج رجل من كنانه مغضب فتغوط فيها ثم خرج
فلحق بارضه فاغضبه ذالك شديد و حلف لينقضن الكعبه حجرا حجرا و كتب الى
النجاشى يخره ذالك وسائله ان يبعث اليه فيها محمودا فلما قدم الفيل اليه
خرج فى ستين الفاحتى اذا بلغ المغمس بطريق الطائف ثم ارسل ابراهه
خيلاله الى المكةفاخذت بلاً لعبدالمطلب فذهب له و بلغ عبدالمطلب ذالك
فقال يا معشر قريش لا تفزعو ا الا انه لا يصل الى هدم البيت الان هذالبيت
ربا يحمسه و يحفظه عند ابى اسحاق بعث ابرهه حناطه الحميرى الىٰ المكة و قال له
اسئل عن سيد اهل البلد و شريفهم ثم قال ان لملك يقول لم ات لحربكم
انما جئت لهدم هذالبيت فان لم تعرضه دونه لجربه فلا حاجه ـ لى بدمائكم
فان هو لم يرد حربا فانتهى به فدخل فساءل فقيل له عبدالمطلب فقال لما امر
به ابرهه فقال عبدالمطلب والله ما يريد حربه وما لنا بذالك من طاقة هذا بيت
الله الحرام و بيت خليله ابراهيم فان يمنعه فهو بيته و حرمه و ان يخل بيته و
بيتيه فوالله ما عندنا دفع عنه قال حناطة فانطلق اليه فانه امرنى ان تاتيه بك
فانطلق به عبدالمطلب و معه بعض ابنته فتكلم انيس سائيس فيل ا برهه
فقال ايها الملك هذا سيد قريش ببابك يستاذن عليك وهو صاحب عزه مكه و
يطعم الناس فى السمال والوحوش والطير فى رؤس الجبال فاذن له ابراهه و كان

عبدالمطلب او سم الناس اجملهم و اعظمهم فعظم فی عین ابرهه فا جله و اکرمه عن ان یجلس تحته و کره ان تراه الحبشه یجلس معه علی سریر ملکه فنزل عن سریره فجلس علی بساطه اجلسه معه الی جننیه ثم قال له جمانه قال له ما حاجتك فقال له حاجتی ان یرد الملك علی مائتی بعیرا صابها فقال له جمانه قال له کنت اعجبتنی حین رایتك ثم قد زهدت فیك اتکلمنی فی مائتی بعیرو نترك بیتا وهوا دینك و دین ابآئك قد حیث لهدمه لا تکلمنی فیه فقال عبدالمطلب انی انا رب الابل وان للبیت ربا سنمنعه قال ما کان لتمنع منی قال انت و ذالك فرد علیه ابله وزاد عن کلبی فقلدها و اشعرها و جلدها و جعلها هدیة للبیت و بثها فی الحرم

جب ابرہہ ابن صباح الاشرم نے غلبہ کر کے نجاشی کی طرف (شاہ حبش) سے علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تو اس نے لوگوں کو ایام حج میں حج کیلئے سفر کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ تم لوگ کہاں جاتے ہو۔ان لوگوں نے جواب دیا۔مکہ میں خانہ خدا کا حج کرنے جاتے ہیں ۔پوچھا وہ کہاں ہے ۔کہا مکہ علاقہ حجاز میں دریافت کیا یہ کپڑے کیسے ہیں۔جواب دیا۔یہ اس خانہ خدا کے ہدیہ میں جو وہاں جاتا ہے یہ لیکر جاتا ہے اس نے کہا مسیحؑ کی قسم ۔میں اس سے بہتر تمہارے لئے یہیں بنائے دیتا ہوں۔ پھر اس نے شہر صنعاء دارالسلطنت یمن میں سفید، سرخ، زرد اور سیاح قسموں کے سنگ رخام سے ایک کنیسہ بنایا اور اس پر سونے چاندی کی پچی کاری کروائی اور انواع و اقسام کے جواہرات جڑوائے اہل یمن کو اس کے بنانے اور تعمیر کرنے کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں اور ذلت پہنچائی۔اور جلا دیئے ہوئے سنگ رخام اور سونے چاندی سے نقش و نگار کئے ہوئے پتھر قصر بلقیس کی کہنہ عمارت سے جو ایک فرسخ کے فاصلے پر تھا۔نکال لائے تھے۔اس کلیسا پر دو صلیبیں سونے اور چاندی کی نصب کی تھیں اور اس میں متعدد منبر عاج کی لکڑی اور آبنوس وغیرہ کے رکھے تھے۔اور چونکہ وہ شہر کی تمام تر عمارتوں سے بلند تر تھا۔اس رعایت سے اس کا نام قلیس رکھا۔جب ابرہہ نے اس میں مراسم حج بجالانے کا ارادہ کیا تو نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ہم نے بادشاہ کے نام سے اس شہر میں ایک کنیسہ بنایا ہے۔جس کے ایسا کوئی کنیسہ پہلے نہیں بنا تھا۔میں نے قصد کیا ہے

کہ تمام عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر حج ادا کیا کریں اور مکہ کا حج کیا جانا روک دیا جائے۔ جب یہ خبر تمام مشہور ہوگئی۔ تو اہل عرب کو بھی معلوم ہوئی تو بنی کنانہ میں سے ایک شخص کو ابرہہ کی اس حرکت پر سخت طیش آیا اور اس کنیسہ میں جا کر پاخانہ بھر آیا۔ اور پھر وہاں سے بھاگ کر اپنے مقام پر چلا آیا۔ اس حرکت نے ابرہہ کو بہت غصہ دلایا۔ اور اس نے قسم کھائی کہ اب جب تک وہ کعبہ کی اینٹ سے اینٹ نہ اکھاڑ دیگا دم نہ لے گا۔ اس نے اسی وقت نجاشی کو اس کی خبر بھیجی اور اس سے درخواست کی کہ اس کا مشہور و معروف اور عظیم الشان ہاتھی محمود نامی بھیج دیا جاوے۔ بہر حال نجاشی کے ہاتھی جب پہنچ گئے تو ابرہہ نے ساٹھ ہزار جمعیت کے ساتھ مکہ کا رخ کیا۔ جب اپنی ہمراہی جمعیت کے ساتھ وہ طائف کی راہ سے مکہ کے قریب مغمس (ایک مقام کا نام) تک پہنچ گیا تو ابرہہ نے اپنی فوج کا ایک دستہ وہاں سے مکہ میں بھیجا اور اس دستہ فوج نے مکہ میں آ کر حضرت عبدالمطلب کے اونٹ چرا لئے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جب اس فوج کشی کی خبر حضرت عبدالمطلب کو ہوئی تو آپ نے تمام قریش کو جمع کر کے کہا کہ تم لوگ انہدام کعبہ کی خبر پا کر گریہ و زاری نہ کرو۔ کیونکہ یہ خدا کا گھر ہے اور وہ اس کی ضرور حفاظت اور حمایت کرے گا۔ اور ابن اسحاق کے مطابق ابرہہ نے حناطۃ الحمیر ی نامی ایک فوجی افسر کو اس غرض سے مکہ بھیجا کہ وہ امیر شہر اور سردار اہل مکہ سے یہ پیغام شاہی پہنچا دے کہ وہ اہل شہر کے ساتھ لڑنے کی نیت سے کبھی نہیں آیا ہے۔ بلکہ کعبہ کے انہدام کے تنہا ارادے سے۔ پس اگر وہ لوگ انہدام کعبہ کے متعلق اس سے معترض نہ ہونگے تو اس کو اہل شہر کی مفت خونریزی کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر وہ لوگ جنگ پر آمادہ ہو جائیں گے تو مجھکو وہاں آ کر لڑنا پڑے گا ابرہہ کا فرستادہ افسر آیا اور اس نے سید قوم اور امیر شہر کو دریافت کیا تو لوگوں نے حضرت عبدالمطلب کا بتایا۔ امیر فوج نے ابرہہ کا پیغام عبدالمطلب سے دوہرایا تو انہوں نے جواب دیا قسم خدا کی مجھے بھی اس سے جنگ مقصود نہیں ہے اور حقیقتاً ہم میں اس سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ خدا کا گھر ہے اور اس کے خلیل ابراہیمؑ کا۔ وہی اس کو اس کے انہدام سے باز رکھے گا۔ کیونکہ یہ گھر اسی کا گھر ہے۔ اور یہ حرم اسی کا حرم ہے اور وہی اپنے گھر کو اس سے خالی کرا سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کے دفاع کی قوت نہیں ہے۔ حناطہ امیر فوج ابرہہ نے یہ سن کر کہا کہ تو آپ میرے ساتھ چلے چلیں کیونکہ ابرہہ نے کہا تھا کہ اس سردار قوم کو میرے پاس لیتے آنا۔ یہ سن کر حضرت عبدالمطلب چلے اور آپ کے

بعض لڑکے بھی آپ کے ساتھ ہو لئے۔ ابرہہ کا داروغہ فیل خانہ انیس عربی النسل تھا اسی کے وسیلہ سے یہ لوگ خیمہ شاہی تک پہنچے۔ اور انیس نے خیمہ کے اندر جا کر ابرہہ کو اطلاع کی کہ قریشیوں کے سید و سردار دروازے پر کھڑے ہیں۔ ان کو اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ وہ معززین اہل مکہ ہیں اور یہ وہ فیاض بزرگ ہیں جو لوگوں کو عام گذرگاہوں پر کھانا کھلاتا ہے اور وحوش و طیور کیلئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر خوان کرم رکھوا دیتا ہے۔ یہ سن کر ابرہہ نے فوراً اجازت دے دی اور حضرت عبدالمطلب کو اندر بلا لیا۔ چونکہ عبدالمطلب تمام قریش میں سب سے زیادہ معزز اور معظم تھے۔ اس لئے ابرہہ کی نگاہوں میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اس نے یہ نہ چاہا کہ یہ ہم سے نیچے بیٹھیں اور اس کو یہ بھی شبہ ہوا کہ اہل حبشہ مجھ کو اور عبدالمطلب کو ایک ساتھ تخت شاہی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر پسند نہ کریں ان وجوہ سے ابرہہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا اور عبدالمطلب کو اپنے ساتھ فرش پر بٹھا لیا۔ پھر اپنے ترجمان سے کہلوایا کہ آپ کس غرض سے آئے ہیں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میری یہی حاجت ہے کہ میرے دوسو اونٹ جو تمہاری فوج کے لوگ لوٹ کر لائے ہیں وہ مجھے واپس مل جائیں۔ یہ سن کر ابرہہ نے اپنے ترجمان سے کہلوایا کہ مجھے آپ کے اس بیان پر سخت حیرت ہوتی ہے کہ آپ مجھ سے اپنے اونٹوں کیلئے تو استدعا کرتے ہیں اور اس گھر کے انہدام کے متعلق۔ جو آپ کے اور آپ کے آبائے کرام کا دین ہے کوئی عرض و معروض نہیں کرتے عبدالمطلب نے جواب دیا کہ میں اونٹوں کا مالک ہوں۔ اور اس گھر کا بھی ایک مالک ہے اور وہی تم کو اس کے انہدام سے باز رکھے گا۔ اس نے کہا کہ وہ کون ایسا ہے جو مجھے اس ارادے سے باز رکھے گا۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ یہ تم جانو اور وہ۔ پھر ابرہہ نے عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیئے۔ امام کلبی نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ عبدالمطلب نے ان اونٹوں کو آراستہ کر کے خانہ کعبہ پر نذر چڑھا دیا۔ اور حرم میں لا کر چھوڑ دیا۔

فوج ابرہہ کی مکہ پر چڑھائی۔ انہدام کعبہ کے اسباب۔ وجوہ اور اس کے ابتدائی حالات۔ ہم نے عربی کے دو معتبر اور قدیم ماخذوں سے پوری تفصیل کے ساتھ نقل کر دئے مفصلہ بالا حالات و واقعات سے حضرت عبدالمطلب کی ذاتی وجاہت، قدر و منزلت اور اعزام و اکرام جو قوم و قریش اور تمام اہل عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے اکابر و عمائد کے نگاہوں میں بھی قائم تھے اور آپ کا صبر و تحمل اور تائید الٰہی کی امید پر توکل کامل طور پر ثابت ہو گیا۔

ابرہہ کے پاس سے واپس آ کر حضرت عبدالمطلب نے موجودہ فتنہ و فساد کے لحاظ سے مکہ کا قیام ترک فرما دیا اور جماعت قریش کو

ساتھ لے کر پہاڑوں پر چلے گئے۔زرقانی لکھتے ہیں:

وانصرف الی قریش و اخبرھم الخبر و امرھم بالخروج من مکة والتحرز فی شعف الجبال و الشعاب تخوفا علیھم من معر الحبشه

حضرت عبدالمطلب نے ابرہہ کے پاس سے واپس آ کر قریش سے یہ تمام واقعات دہرائے اور ان کو قیام مکہ کے ترک کر دینے اور پہاڑوں کے شگاف اور دروں میں پناہ لینے کے لیے حکم دیا۔حضرت عبدالمطلب کے اس مفید اور ضروری حکم کو سب نے مان لیا۔

تمام قریش فوج ابرہہ کے قتل وغارت کے خوف سے شہر چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے گئے اور مکہ کی آبادی بالکل خالی ہوگئی۔حضرت عبدالمطلب نے اس وقت تک شہر کو نہ چھوڑا جب تک کہ تمام قوم کے لوگ پہاڑوں کی طرف نہ نکل گئے۔

خانہ کعبہ سے وداع ہونے کی خاص کیفیت زرقانی کی مفصلہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتی ہے:

ثم قام عبدالمطلب فآخذ بحلقة الکعبة و معه نفر من قریش یدعون الله و یستنصرونه علی ابرھه و جندہ ثم ارسل حلقه الباب وانفلق ھو و من معه من قریش الی الجبال و ینظرون ما ابرھه فاعل بمکة

حضرت عبدالمطلب زنجیر خانہ کعبہ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔آپ کے ساتھ ایک جماعت قریش بھی تھی۔آپ نے ان کے ساتھ مل کر ابرہہ اور فوج ابرہہ پر نصرت وحمایت فرمائی جانے کی درگاہ رب العزت سے دعا مانگی۔اور پھر دروازہ کعبہ کی زنجیر چڑھا دی اور اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں پر چڑھ گئے۔اور ابرہہ کی کاروائیوں کا انتظار کرنے لگے۔

بہرحال مرقومہ بالا عبارت سے ثابت ہوا کہ حضرت عبدالمطلب خدا کا گھر خدا پر چھوڑ کر پہاڑوں کے دروں میں اپنے اہل وعیال کو لے کر چلے آئے اور نصرت وحمایت الٰہی کے مشاہدہ قدرت کا انتظار فرمانے لگے۔

انہدام کعبہ کے متعلق اصحاب الفیل کی ناکامی

ابرہہ ابن الصباح علی الصبح اپنی تمام جمعیت کے ساتھ مصلائے ابراہیمی کے انہدام کے مصمم ارادے سے شہر مکہ میں آ داخل ہوا اور اپنے ہمراہی ہاتھیوں کی فلک نما قطاروں سے خانہ الٰہی کے انہدام وتباہی کا جونہی قصد کیا ویسے ہی پل بھر کی دیر میں ،سبحان اللہ! شان تیری۔جبروت قدرت نے محض بے مقدار اور ادنی مخلوق کی فوج تیار کر کے ابرہہ کے ایسے اعلیٰ درجہ کی باقاعدہ اور تربیت یافتہ لشکر کو ان

طویل القامت ہاتھیوں کے ساتھ دم کے دم میں تباہ و برباد کر ڈالا۔ زرقانی اور ابن ہشام کی عبارت تفصیلی حسب ذیل ہے:

فارسل اللہ تعالیٰ علیھم طیرا من البحر امثال الخطاطیف والبلسان مع کل طائر منھا ثلاثۃ احجار یحملھا حجر فی منقارہ و حجران فی رجلیہ امثال الحمص والعدس لا تصیب احد الا ھلك و لیس کلھم اصابت وخرجوا ھاربین ینتدرون الطریق الذی منہ جاؤا فخرجوا یساقطون بکل طریق و ھلکون بکل مھلك علی کل منھل و اصیب ابرہ فی جسدہ و خرجوا بہ معھم یسقط انملۃ انملۃ کما اسقطت منہ انملۃ ابتعتھا منہ مدۃ تمث قبح ودم حتی قدموا بہ صنعاء

(ابن ھشام ج1، ص19 مصر

خدا تعالیٰ نے سمندر (بحر عرب) کی طرف سے ایک قسم کے جانوروں کے جھنڈ اور فوج کی فوج نازل فرمائی۔ ان میں سے ہر طائر کی چونچ میں ایک اور دونوں چنگلوں میں دو پتھروں کی مونگ اور ماش کے برابر برابر کنکریاں تھیں۔ پرندوں کے اس بے شمار جھنڈ نے جبروت قدرت کے اشارہ سے ابرہہ کی فوج شاہی پر اس زور سے سنگباری کی کہ اس کے کثیر التعداد لشکر میں سے کوئی ایسا نہ بچا ہو جو نہ مر گیا ہو یا کم سے کم بے انتہا نہ زخمی ہوا ہو اور وہ سب کے سب اگر وہیں ہلاک نہیں ہو گئے تو بھاگ نکلے اور یہ حال ہوا کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتے تھے کہ کس راستہ سے بھاگیں اور بھاگنے پر ہی تمام راستوں میں ان کے غضبناک کنکر گرتے جاتے تھے اور تمام راستوں میں مرتے جاتے تھے۔ ابرہہ خود بھی اس عذاب میں مبتلا ہوا اور وہ بھی لشکر کے ساتھ بھاگ نکلا اور اس کی انگلیاں بھی پور پور سے جدا ہو کر گر گئیں اور اسی کے جیسا اور لوگوں کی انگلیوں کا بھی حال ہوا۔ اور مقامات افتادہ سے خون جاری ہوا اور وہ اس خراب حالت سے شہر صنعا (دارالحکومت یمن) میں پہنچے۔

خانہ کعبہ کے ساتھ ابرہہ کی بے ادبی اور ہتک حرمت کی سزا و تنبیہہ دنیا میں ابدلا باد تک خوف الٰہی کے لیے کافی ہو گئی اور پھر اس وقت سے لے کر اس وقت تک کسی غیر عرب اور غیر مسلم قوم کو اس بیت معظم کے انہدام و غارت کی جرات نہ ہوئی اور نہ ان شاء اللہ قیامت تک ہو گی۔ کرشمۂ قدرت نے ایک چشم زدن میں ابرہہ اور نجاشی کے دو بڑے سلاطین کی جبروت و سطوت کو خاک میں ملا دیا اور ان کے تمام سامانوں کو جو انہوں نے نظام شاہی کے اعلیٰ پیمانہ پر مہیا کیا تھا ایک آن واحد میں محض معمولی اور بے وجود مخلوق سے تباہ و برباد کر ڈالا۔

مولانا شبلی نے اس واقعہ قدیم کو نہیں لکھا

عرب کی تمام قدیم اور جدید مؤرخین نے اصحاب فیل کے واقعہ کو پوری تفصیل سے لکھا ہے۔قرآن مجید میں بھی اصحاب فیل اور نزول ابابیل کے حالات وواقعات درج ہیں مگر مولانا شبلی صاحب اتنے بڑے واقعہ تاریخی کو جس سے خانہ کعبہ کی تقدیس اور عظمت پورے طور پر ثابت ہوتی تھی بالکل نسیاً منسیاً کر دیا۔مرقومہ بالا چند واقعات کی نسبت آپ کے استخفاف کی وجہ اور مجبوری معلوم بھی ہوتی تھی۔مگر اس کے مرفوع القلم فرما دیے جانے کا کوئی خاص سبب ظاہر نہیں ہوتا۔اگر بنو ہاشم یا عبدالمطلب کے خصائص ثابت ہونے کا وہی عذر یہاں بھی آپ کو لاحق ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ خانہ کعبہ زاداللہ شرفا کی عظمت وحرمت کا اظہار وانکشاف بھی تو ہوتا تھا۔مگر نہیں، حقیقتاً آپ کے لیے وہی وجہ اول مانع ہوئی اور اس کی بناء پر اس کا استخفاف بھی ایسا ہی ضروری اور لازمی ٹھہرا کہ پھر اس کے مقابلہ میں اس واقعہ کی اہمیت قابل توجہ اور لائق التفات نہیں سمجھی گئی۔حالانکہ تاریخ عرب کا یہ ایسا عظیم الشان واقعہ ہے کہ اس کے وقوع سے ایک جدید سن کی ایجاد قائم ہوئی اور سن عام الفیل کی بنیاد پڑی۔اس کی ندرت اور شہرت مشرقی مما لک سے ہوتی ہوئی مغربی اقالیم تک پہنچ گئی اور تمام مغربی محققین ومؤرخین نے اس واقعہ کو اور اس کے باعث سے عرب میں ایک نئے سن کے قائم ہونے کو شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔

زمانۂ حال کے مغربی مؤرخین نے گذشتہ صدی سے تاریخ کو اصول فلسفہ پر ترتیب کرنے کی تعلیم شروع کی ہے اور معمول و مشاہدات روزمرہ کے اصول پر ان تمام تاریخی واقعات کو خارج از عقل اور بیرون قیاس ٹھہرایا ہے جو قدرت کے تصرفات اور مشیئت کے کرامات تھے۔ممکن ہے کہ شبلی صاحب نے بھی اپنی سیرۃ النبی کو فلسفہ تاریخی کے پیمانے پر صحیح اتارنے کے لیے اس واقعہ کو غلط اور مضحکہ خیز کہہ کر نظر انداز کر دیا ہو۔اگر ایسا ہی تھا تو بھی سرسید احمد خاں کے اتنا اس واقعہ کو لکھ کر اور اہل عرب کی رواۃ پرستی کا مقتضا کہہ کر غلط اور خلاف عقل ٹھہرا دیا ہوتا اور نزول ابابیل کے واقعہ کو شیوع مرض آبلہ (چیچک) سے ظاہر طور پر فرما دیا ہوتا تا ہم غنیمت تھا کیونکہ اس سے اصل واقعہ فوج کشی ابرہہ قصداً انہدام خانہ کعبہ۔شیوع وبائے آبلہ (چیچک) اور ہزیمت جنود حبشہ اور حفاظت بیت اللہ کے صحیح واقعات تو دنیا کو معلوم ہو جاتے اور تاریخ عرب کا اتنا بڑا قدیم وعظیم واقعہ مرفوع القلم اور کالعدم ہونے سے بچ جاتا۔

تعجب ہے کہ مولانا شبلی صاحب کے ایسا محقق اور فلسفی مؤرخ اس کی ضرورت کے فلسفہ کو نہ سمجھ سکا۔اسکے اصل اور خارجی باتوں میں بھی امتیاز کر سکا۔

اچھا یہ تسلیم کر لیا کہ ابابیلوں کا عذاب نہیں آیا تھا بلکہ مکہ میں چیچک کی وبا پھیل گئی تھی اور یہی ابرہہہ اور اس کے لشکر کی تباہی وغارت کا اصل باعث ہوئی تو اس سے کیا ابرہہ کا انہدام کعبہ کی نیت سے اپنے لشکر جرار کے ساتھ آنا اس کی فوج کشی، محاصرے، ہزیمت اور فسخ عزیمت کے تمام حالات وواقعات جو نہ قدرت کی تصرفات ہیں نہ کسی کے معجزۂ وکرامات، جس کسی کے سمجھ میں نہ آئیں، یہ سب غلط ہو جائیں گے؟ یہ تو نہ کسی مشرقی مؤرخ کی جدید تحقیقات کا نتیجہ ثابت ہوتا ہے اور نہ کسی مغربی محقق کے اقتباسات مزید کا مدعا۔دیکھیے باوجود

انکار معجزات اور خوارق عادات، آپ کے محسن و معلون ڈاکٹر سرسید احمد خاں صاحب اس واقعہ کی حقیقت کا کس تفصیل سے انکشاف فرماتے ہیں:

> میں اپنے اس خطبہ میں اس لغو اور بے ہودہ روایتوں اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اس واقعہ کی بابت بیان کی ہے بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ایک لمبا مباحثہ ہے مگر جو واقعہ کہ گذرا اس کو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔
>
> کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب فیل سے پہلے تبع نے تین دفعہ کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر ظلمت و آفت میں گرفتار ہوئے (کیا یہ قدرت کا اظہار اور اعجاز و کرامت کا اقرار نہیں ہے)
>
> وہ قصے چنداں مشہور نہیں ہیں۔ مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے۔ ابرہہ الاشرم جو ایک عیسائی حاکم یمن تھا۔ اس نے صنعا یمن میں قریب غمان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا اور قلیس اس کا نام رکھا تھا اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑ دیں اور اس کنیسہ کا حج کیا کریں اور اس لیے اس کے ڈھانے کا ارادہ کیا۔ اور مع فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا اور مغمس میں اترا۔ اس وقت قریش کنانہ، غزاعہ اور ہذیل سب لڑنے کو تیار ہوئے مگر انہوں نے ابرہہ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پائی۔ ابرہۃ الاشرم نے کہلا بھیجا کہ مجھے تم سے جدال و قتال منظور نہیں ہے بلکہ کعبہ کا ڈھانا صرف مقصود ہے۔ اس گفتگو میں چند روز گذرے اور اسی درمیان میں ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ پھر تمام لشکر برباد ہو گیا۔ بہت سے مر گئے خدائے تعالیٰ نے ان پر ایسی آفت ڈالی کہ جو بد ارادہ انہوں نے کیا تھا اس پر کامیاب نہ ہوئے۔ (کیا یہ معجزہ کا اعتراف اور اقرار صاف نہیں ہے) مفسرین نے اس قصہ کو عجب طرح سے رنگا ہے۔ قرآن مجید میں جو لفظ طیرا ا اور **الحجارۃ** آئے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کی مناسبت سے جو مفسرین اور وضاعین نے چاہا بنا لیا ہے جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ خطبات ص552، لاہور۔

مرقومہ بالا عبارت میں سید صاحب نے باوجود تردید و تنقید معانی اصل مطالب کو بالکل ویسا ہی لکھ دیا ہے جیسا کہ ہم عربی کے معتبر اور مستند ماخذوں سے اوپر لکھ آئے ہیں۔ اصل واقعہ سے نہ سید صاحب کو انکار ہو سکتا ہے نہ دنیا بھر میں کسی کو بھی۔ مگر تمام دنیا کے خلاف شبلی صاحب تنہا اس کو مرفوع القلم فرماتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ واقعہ ہوا نہیں۔ حالانکہ سیرۃ النبی کے لکھنے والے اس کو

آپ کی ولادت سے کل دو مہینے قبل کا واقعہ تمام تاریخوں میں بتلاتے ہیں اور تمام مشاہد تاریخی سے یہ امر صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ واقعہ اصحاب فیل کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود ذیجود قائم ہو چکا تھا۔ اور یہ ودیعت الٰہی سات مہینوں سے جناب آمنہ بنت وہب سلام اللہ علیہا کے بطن مظہر میں امانت تھی۔ ابن سعد لکھتے ہیں:

ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و الہ و سلم یوم الاثنین لعشر لیال خلون من شھر ربیع الاوّل و کان قدوم اصحب الفیل لنصف من المحرم فبین الفیل و بأبن مولد رسول اللہ صلعم خمس و خمسون لیلۃ

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دسویں ربیع الاول کی رات کو دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے اور نصف (۱۵) محرم میں اصحاب الفیل مکہ میں آ چکے تھے۔ تو اس حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور واقعہ اصحاب فیل کے درمیان کل پچپن راتوں کی مدت گذری تھی۔ طبقات ص ۶۲، مطبوعہ جرمن)

اسی بنا پر ابن ہشام نے بھی ص ۵۶ میں آنحضرت صلعم کی ولادت اور مکہ میں اصحاب فیل کی آمد ایک ہی سال کے اندر تحریر کی ہے۔ پھر ایک مؤرخ ایک سیرت نویس اور ایک محقق اتنے قریب کے گذرے ہوئے ایسے مشہور و معروف واقعہ کو جس سے اس ملک کی تاریخ میں ایک زمانہ قائم ہوتا ہو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ مگر مولانا شبلی تمام سیر و تواریخ کے خلاف اس کو مرفوع القلم فرما گئے۔ اگر اس کے استخفاف واستقصار کی مصلحت آپ نے ایک فلسفی مؤرخ ہونے کی حیثیت سے اختیار کی ہے تو یہ بھی آپ کی عقل کی خوبی ہے۔ آپ کی مختصرات یا سیرۃ النبی کا کوئی فلسفہ تاریخ عرب نہیں کہہ سکتا نہ کم سے کم ابن خلدون کا نمونہ سمجھ سکتا۔ آپ کو جو کچھ فلسفہ یا منطق کے اصول دلائل تاریخ وحدیث کی تحقیق وتنقید میں بیان کرنے تھے وہ آپ مقدمۃ الکتاب میں بیان کر چکے۔ مولانا شبلی صاحب کو یقین کر لینا چاہیے کہ جب تک آپ خدا کی قدرت اور اس کی بے شمار اور لا انتہا تصرفات سے قطعی انکار نہ کر لیں گے اس وقت تک آپ ان جبروت الٰہیہ کے کسی مشاہدہ کو خارج از عقل اور ناممکن نہیں کہہ سکتے۔ اور شبلی صاحب پر کیا منحصر ہے تمام بنی نوع انسان کو عام اس سے کہ وہ تبلیغی ہوں یا ہیئت داں ہوں، مؤرخ ہوں یا محدث، شاعر ہوں یا ادیب جب تک کہ وہ خدا اور اس کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں ان کو ان تمام خارج (عقل، محالات اور ناممکنات کو بالکل مطابق عقل معمول قدرت اور ممکن الوقوع ماننا ہی پڑے گا)۔

اگر شبلی صاحب کا بھی یہی خیال ہے اور اسی خیال کی بنا پر موجودہ عام تاریکی کے زمانہ میں صرف نئی روشنی والوں کے خوف تشنیع سے آپ نے اس واقعہ کو مرفوع القلم فرمایا ہے تو وہ اپنی اسی کتاب میں دیکھیں کہ آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لے کر آنحضرت صلعم کی وفات تک خدا کی جبروت قدرت کے کتنے واقعات مندرج کیے ہیں اور صرف نقل واندراج ہی نہیں بلکہ انہیں کے استنباط پر اپنے استدلال قائم فرمائے ہیں۔ پھر اپنے ہی اختیار کردہ نظریہ ومعیار کی خلاف ورزی۔ شعار دانشمندی نہیں۔

ہم اتنا لکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شبلی صاحب سے اچھی تو ان کے تلمیذ رشید مولانا سلیمان صاحب ندوی نکلے جنہوں نے باوجود اس کے کہ یہ واقعہ ان کا موضوع تالیف ہی نہیں تھا، اپنی کتاب ارض القرآن میں اس واقعہ کو من حیث الوقوع پوری تفصیل سے لکھ کر جدید مفسرین کے بعض محرکات کی تنقید بھی کر دی ہے۔ افسوس کہ آپ تو اتنا بھی نہ کر سکے۔

سید صاحب کی تغیرات فی اللفظ اور تصرفات فی المعنی کی تنقید و تردید

اب رہا یہ امر کہ سید صاحب نے بھی اس سے انکار کیا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ سید صاحب نے اصل واقعہ سے ذرا بھی انکار نہیں کیا ہے اور سید صاحب پر کیا کوئی بھی اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ سید صاحب نے اس واقعہ کے متعلق صرف ابابیلوں کے ذریعہ سے سنگباری پر اعتراض کیا ہے اور اس کو معمولی افسانہ اور محض کہانی ٹھہرایا ہے۔ شبلی صاحب نے تو واقعہ کو سرے سے مرفوع و مقطوع فرما دیا ہے گویا اس کا وجود وقوع آپ کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔ ایسی حالت میں آپ کا نظریہ اور سید صاحب کی رائے کیسے مساوی ہو سکتی ہے۔ ہر ذی فہم آسانی سے سمجھ لے گا کہ تحقیق و تلاش واقعات میں آپ کا کیا سرمایہ ہے اور سید صاحب کا کیا پایہ۔

سرسید کو اس پر اعتراض کی کیا ضرورت لاحق ہوئی۔ سید صاحب نے لندن میں بیٹھ کر اور ایل ایلبی کی ڈگری کے امیدوار بن کر اپنے خیالات کے اقتباسات کو اپنی کتاب خطبات میں اتحاد بین المذاہب کے اصول پر جمع کیا۔ اتحاد کا خیال تو اسلام میں بہت قدیم ہے۔ تمام مذاہب کے خلاف اسلام ہی نے سب سے پہلے اتحاد فی المذاہب کی حقیقت کا انکشاف کیا اور اس مسئلہ کو صاف کر کے بتلا دیا کہ ہمارا وہی مذہب ہے جو آدمؑ کا مذہب ہے۔ ہمارا وہی دین ہے جو ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ہمارا وہی طریق ہے جو عیسیٰؑ کا طریق ہے۔ **کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام** تمام انسان فطرت اسلام پر مخلوق کیے گئے ہیں۔ اسی کی پہلی تعلیم ہے۔ اس نے یہ مسئلہ گویا اسلام کی ایجاد ہے اور اسلام ہی اس کا موجد ہے۔ اس بناء پر یہ اتحاد تو ہمارا خاص اعتقاد ہے۔ اس سے ہمیں انکار ہو ہی نہیں سکتا جو کچھ اختلاف بین المذاہب ہے وہ بعد کے معتقدات اور عملیات ہیں جن کے لاانتہا اور بے شمار اختلاف رائے والعمل نے رشتہ اتحاد کو پارہ پارہ کر کے ہر مذہب و ملت کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر دیا بلکہ ایک کو دوسرے کا سخت مخالف بنا کر مقابلہ اور مقاتلہ پر آج تک تیار کر رکھا ہے۔

چونکہ اختلاف مذاہب پر بحث کرنا میرا مقصود نہیں ہے اس لیے اس سے قطع نظر کر کے ہم اپنے مدعائے بیان پر آ جاتے ہیں۔ سید صاحب نے اول تو اسی اتحاد کے اصول کو اپنے خطبات کی ترتیب و تدوین کے وقت پیش نظر رکھا ہے۔ دوسرے اسی ضرورت سے انہوں نے ماہرین فلسفہ مغربی اور محققین علم ہیئت کی تحقیقات کے پیمانے پر علم الٰہیات کے خاص مسائل کا بھی موازنہ کرنا چاہا ہے لیکن اس موازنہ میں مغربی تحقیقات کی حسن قبح، رطب و یابس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی جرات نہیں کر سکے۔ سید صاحب کی تنقیدی قوت سر ولیم میور اور ان متعصب عیسائیوں کے لغویات کی تردید و تکذیب تک تمام ہو گئی ہے جنہوں نے بے باکی سے آنحضرت صلعم کی سیاست نظام حکومت اور احکام شریعت پر اعتراض کیے ہیں مگر ان امور کی نسبت ہمیشہ کوتاہ قلمی اور قطعی النظری سے کام لیا گیا ہے۔ یورپین محققین کے مقابلہ میں عربی مؤرخین کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ یورپین محققین کی ایسی شدید تقلید اختیار کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ایسے سہل اور عام فہم الفاظ کے وقت خیز غیر موسوم، خلاف محاورات اور غیر مصطلحات معانی بتلائے ہیں اور دراز قیاس تاویل فرمانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ

کھلے کھلے الفاظ میں قدرت الٰہیہ کے جبروت اور اس کے اظہار کی غیر متحمل ضرورت، خانہ کعبہ کی حفاظت وغیرہ کے تمام حالات و واقعات سے بالکل انکار کر کے ان مشاہدات قدیمہ اور کرامات عظیمہ کو جھوٹے فسانے اور ان کے سلسلہ رواۃ کو جن میں ہر طبقہ اور ہر درجہ کے اسلامی محدثین و مفسرین شامل ہیں ایک سرے سے (نعوذ باللہ) وضاع اور کذاب ٹھہرا دیے گئے ہیں۔ مگر قیاسین یورپ کے قیاسات پر تنقید و تحقیق کی نگاہ سرسری بھی نہیں ڈالی گئی۔ حالانکہ انہیں یورپ والوں کے کتب قدیمہ کے اخبار و آثار پر اگر محض سطحی نظر بھی ڈالی جاتی تو غالباً ان کے خاص مرویات، معتقدات میں اتنا مہلات اور محالات جو اصل میں ان کے توہمات کے طومار اور انبار ہیں مشاہدہ کیے جاتے جس کسی کے عقل میں کیا وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ عبرت ہے اور افسوس ہے کہ سید صاحب کے خطبات میں نہ ان کی کوئی تفصیل ہے اور نہ تنقید۔

بہر حال اگر سید صاحب کی یہ خاص رائے ہے تو بہتر ہے وہ اپنے ہی معتقدات تک اس کو محدود و موقوف رکھیں عام مسلمانوں کو اس کے تسلیم کی تکلیف نہ دیں اور یقین کر لیں کہ آپ کی اس تعلیم سے تمام مسلمانوں کو جبروت قدرت کے تصرفات اور ضرورت کے وقت ان کے عجائب و غرائب مشاہدات سے انکار کرنا پڑے گا۔ جو ان کے عقائد کو باطل اور ان کے قلوب سے نور ایمان و عرفان کو زائل کر دے گا۔

یہاں تو ابلہ سے ابابیل بصیغہ جمع عام قیاس کیا گیا ہے اور طیرا کو یطیر کے مادہ سے بقاعدہ استخراج متخرج بتلایا گیا ہے اور اس کے معنی فال بد کے مراد لیے گئے ہیں مگر القمل والجرادع کے صاف و صریح الفاظ قرآنی میں قوم فراعنہ پر عذاب الٰہی کی جو مختلف صورتیں بتلائی گئی ہیں ان کے صیغوں میں مسلمانوں کو کونسی تاویل بتلائی جائے گی۔

ابابیل تو عقل صحیح کے سامنے کسی مقدار کا جانور تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے مگر نمل جسے آپ پسو کہتے ہیں اس کی تو ابابیل کے مقابلہ میں کوئی مقدار ہی نہیں قائم کی جا سکتی۔ پھر قوم فراعنہ کے ایسے توانا اور قوی ہیکل انسانوں کو ایسے بے مقدار اور لا وجود حشرات الارض کا تباہ و برباد کر دینا جو نصوص قرآنی سے ثابت ہے کیونکہ خلاف عقل اور ناممکن ٹھہرایا جائے گا۔ اب کوئی بتلائے کہ سید صاحب کی اس تعلیم سے غریب مسلمانوں کو قرآن سے انکار صریح کرنا ہوگا یا نہیں اور انکار قرآن کے بعد پھر نہ وہ مسلمان رہیں گے اور نہ ان کا ایمان ایمان۔

قرآن پر موقوف نہیں۔ قرآن سے پہلے کی تمام کتب مقدسہ میں ان مشاہدات قدرت کی اس سے زیادہ تصریح و تفصیل مندرج ہے مگر اس وقت سے لے کر اس وقت تک ان کے متبعین اور معتقدین اقوام کو جن میں زیادہ تر یورپ کے محققین شامل ہیں ذرا بھی انکار نہیں ہے۔ نہ وہ ان کو اپنے مقامات میں غلط ٹھہراتے ہیں۔ ان کو مصنوع و موضوع بتلاتے ہیں۔ یورپ کے تمام ممالک میں بچہ بچہ اس وقت فلسفہ و ہیئت کا پتلا دکھلائی دیتا ہے مگر جب اس کے اعتقادات اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں یا جس وقت اس کا کوئی مذہبی پیشوا کسی مذہبی جلسہ میں یا خاص طور پر ان مشاہدات قدرت کو جو جناب عیسیٰؑ مریمؑ کی تصدیق رسالت اور ترکیب ولادت کی ضرورت سے مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوئے اور نیز آپ کے مابعد بھی عیسائیت کے اثبات و استدلال میں حواریوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے ان سے بیان کیے جاتے ہیں تو وہ سمعاً و اطاعاً کہہ کر انہیں مان لیتا ہے اور ان کے محال عقل اور بیرون قیاس ہونے پر اپنے فلسفہ ہیئت کی ذرا بھی روشنی نہیں ڈالتا۔ کیونکہ وہ ان امور کو ابتدا ہی میں سمجھ چکا ہے اور یقین کر چکا ہے کہ جب قدرت کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو اس کے عمل سے

انکار صریح جہالت ہے۔ اکثر محققین یورپ کی احتیاط کی اب تک یہی حالت ہے ان میں سے چند نظریہ ذیل میں لکھ دیتے ہیں:

فرانس کا مشہور فاضل کیمل فلامریاں (camal flameran) جو فزیکل سائنس میں استاد مانا جاتا تھا۔ اپنی کتاب سپر پچوزلیزم میں لکھتا ہے۔

انسان کی فطری عادت ہے کہ جو چیز بظاہر مشکوک ہوتی ہے یا جس کو وہ نہیں جانتا اور سمجھ نہیں سکتا اس کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس یا پلینی کی تحریروں سے اگر ہم یہ پڑھتے کہ ایک عورت کی ران میں چھاتی تھی اور اسی سے وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتی تھی تو ہمیں بے اختیار ہنسی آتی اور ہم استہزا کرتے۔ لیکن پیرس کی علمی کانفرنس منعقدہ ۲۵ جون ۱۸۲۷ء میں یہ واقعہ براۃ العین مشاہدہ کیا گیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص ہم سے یہ کہتا کہ ایک شخص مر گیا اور جب اسکی تشریح کی گئی تو اس کے پیٹ میں ایک بچہ پایا گیا۔ جو اس شخص کا توام تھا اور اس کے جسم میں پرورش پا رہا تھا۔ تو ہم اس واقعہ کو محض خرافات سمجھتے لیکن چند روز ہوئے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بچہ چھپن برس تک جسم میں ہی پرورش رہا اور پھر ظاہر ہوا۔ ہیروڈوٹس کا ایک مترجم لکھتا ہے کہ لوگوں کا یہ بیان کہ سکندر کی بیوی روکسان نے ایک ایسا بچہ دیا تھا جس کا سر نہ تھا۔ خلاف عقل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج تمام طبی ڈکشنریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ بہت سے بچے بغیر سر کے پیدا ہوتے ہیں،۔

اس قسم کے واقعات ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ جو لوگ بغیر بصیرت کے انکار کر دیتے ہیں وہ جاہل اور کودن ہیں (کامل فلامریان کی کتاب ص ۲۴۶ بحوالہ الکلام شبلی ص ۱۱۸ ج ۲)

مولوی شبلی صاحب الکلام دوم میں خرق عادت اور روحانی فیوضات کی نسبت خود تحریر فرماتے ہیں کہ۔

چونکہ ہمارے ملک میں عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ یورپ عام طور پر خرق عادات کا منکر ہے اور اسی بنا پر جدید تعلیم کا ایک ایک بچہ ہر قسم کے ایک ایسے واقعہ پر جو محسوسات عام کے خلاف ہو۔ استہزا اور انکار کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ خرق عادت کے متعلق یورپ کے مشہور و مستند حکما اور فضلا کے اقوال و آرا اس موقع پر نقل کریں۔

۱۸۶۹ء میں بمقام لندن ایک بہت بڑی مجلس ان امور کی تحقیقات کیلئے منعقد ہوئی اس مجلس کے ارکان یہ تھے۔

سر جان لیک (sir jhon lake) ممبر پارلیمنٹ صدر انجمن

پروفیسر ہکسلی (PRO Haxely) علم طبیعیات کا سب سے بڑا عالم وکیل

لوئیس (louis) فزیکل سائنس کا بہت بڑا عالم وکیل

الفرڈ ویلز (Alfred wales) جوڈاردن کا ہم عصر اور مسلہ ارتقا میں برابر کا شریک تھا۔ ممبر

مارگن (morgen) مجلس علوم ریاضیہ کا صدر انجمن ممبر

جان کاکس (Jhon cox)

ان کے سوا اور بھی بہت سے فضلا شریک تھے۔ اٹھارہ مہینے تک یہ مجلس برابر تحقیقات کرتی رہی اخیر میں مجلس نے جو رپورٹ تیار کی

اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

مجلس نے اپنی تحقیق کا مدار صرف ان تجربوں پر رکھا جو مجلس نے براۃ العین مشاہدہ کئے اور جن میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مجلس میں چار ممبر ایسے تھے جو شروع میں اس قسم کے واقعات کے سخت منکر تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یا تو ان واقعات میں فریب اور شعبدہ بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ یا خود انسان کا عصبی نظام کا اثر ہے۔ لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ خرق عادات حقیقی اور واقعی ہیں۔

اس کے بعد امریکہ اور انگلستان میں اس کی تحقیقات کیلئے ایک مجلس قائم ہوئی۔ جس کے صدر انجمن ہیزلوب اور ہوڈسن تھے۔ یہ مجلس قریباً بارہ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی اور بالآخر 1899ء میں اس نے اپنی تحقیقات ختم کیں اور ان واقعات (خرق عادات اور روحانی اثرات) کی صحت کا اعتراف کیا۔ ہیزلوب نے جو رائے لکھی اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔۔

مجھ کو امید ہے کہ میں بیس دن بعد تمام دنیا کے سامنے دلایل قطعیہ سے ثابت کر دوں گا کہ اس عالم فانی کے بعد ایک اور عالم ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرق عادات دیکھے جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہوسکتا۔

ہوڈسن کی رپورٹ کے بعض جملے یہ ہیں۔

دنیا کو بہت جلد عظیم الشان جدید اطلاعیں حاصل ہونے والی ہیں۔ مجھ کو امید ہے کہ ایک برس میں میں دنیا کیلئے انسانی زندگی کیلئے قوانین فطرت کی نئی تفسیر پیش کروں گا۔ اگر پروفیسر ہیزلوب نے یہ دعوی کیا ہے کہ اس نے مردوں کی روحوں سے باتیں کی ہیں تو اس نے بالکل سچ دعوی کیا ہے۔ پروفیسر کاکس۔ جو امپریل سائنٹیفک سوسائٹی کا صدر انجمن ہے۔ اس نے مجمع عام میں کہا۔ میں صرف یہی نہیں کہتا کہ یہ (خرق عادات اور روحانی اثرات) ممکن ہے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل حقیقت واقعی ہے۔

اپنی کتاب اسپریچو لیزم میں لکھتا ہے۔

چونکہ مجھ کو ان واقعات کا قطعی یقین ہو چکا ہے۔ اس لئے یہ اخلاقی نامردی ہے کہ میں ان کو ظاہر کرنے کیلئے اس بنا پر ہچکچاؤں کہ نکتہ چیں میری ہنسی اڑائیں گے۔

جرمن کا مشہور ہیئت داں زولنر بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے ساتھ چند فضلا شریک ہوئے جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

ویبر

فیشنر　فزیکل سائنس کا استاد اور یونیورسٹی کا پروفیسر

ونڈٹ　نہایت مشہور فاضل اور یونیورسٹی کا پروفیسر

بالآخر بہت ہی تحقیقات کے بعد ان تمام فاصلوں نے روح کے عجیب وغریب کرشموں کا اعتراف کیا زولنر بہت بڑا عالم تھا اس کے اعتراف پر لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اس نے دھوکا کھایا ہے۔ چنانچہ چند مشہور پروفیسروں نے یہ خیال اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیا ۔ اس پر زولنر نے ایک رسالہ لکھا۔ جسکا نام اوراق علمیہ ہے اس میں نہایت زور وشور سے اپنے مشاہدات کا حوالہ دیا اور ان کی صحت پر دلائل

قائم کیئے۔

۱۸۹۱ء میں جو علمی کانفرنس منعقد ہوئی اس کے ایک جلسہ میں پروفیسر لووج نے جو بہت بڑا ریاضی دان ہے ایک لیکچر دیا اور روح کے متعلق تقریر کرتے وقت کہا۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ مادی اور روحانی عالم میں اب تک جو حد فاصل تھی وہ ٹوٹ جائے جس طرح اور بہت سی حدیں ٹوٹ گئیں اس طریقہ سے ثابت ہو جایئگا کہ ممکنات کی کچھ حدود انتہا نہیں اور یہ کہ جس قدر ہم جانتے ہیں وہ بمقابلہ ان چیزونکے جو ہمیں معلوم نہیں ہیں کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔

۲۲ جون ۱۸۹۸ء کو جو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں پروفیسر ڈوٹروشیہ نے اپنی اسپیچ میں کہا۔

یہ خرق عادات جو اس وقت ہم نے مشاہدہ کیے اور جن کے ذکر سے ان لوگوں کو طیش آ جاتا ہے جو اپنے آپکو عالم خیال کرتے ہیں اور جزئی مسلہ و مباحث علمیہ پر گفتگو کرتے ہیں۔انہیں متواتر مشاہدات کے سلسلہ میں داخل ہیں جو ایک مدت سے ہمارے تجربہ میں آ رہے ہیں اور جن کی نسبت شک کرنا اب غیر ممکن ہو گیا ہے۔

۱۸۹۳ء میں بمقام میلان ایک بہت بڑی کمیٹی منعقد ہوئی۔ جس کے ممبر حسب ذیل تھے۔

الیگزینڈر رگزاکوف

جیوفانی۔ میلان کے رسد خانہ کا سیکٹری

کارل وو پرل۔ جرمن کا مشہور ڈاکٹر

جیوروب جیروزا۔ فزیکل سائنس کا پروفیسر

لمبروزو

ان علماء نے ۱۷۔ اجلاس میں ان امور کی تحقیقات کی اور بالآخر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ۔

جو خرق عادات ہم نے مشاہدہ کیئے۔ان میں کسی قسم کی شعبدہ بازی یا چالاکی نہیں تھی۔اور یہ مشاہدات یہ درجہ رکھتے ہیں کہ مسائل علمیہ میں داخل کیئے جائیں۔

(منقول از کتاب الکلام جلد دوم مولفہ مولوی شبلی صفحہ 120 تا 125)

ہم نے شبلی صاحب کے خاص استفادات کلامیہ سے خرق عادات اور معجزات کے وجود ثبوت میں محققین یورپ کے اتنے اعتراضات پیش کر دیئے اور ہماری موجودہ ضرورت تنقیدی کیلئے اتنی ہی کافی ہے حیف ہے مسلمانوں پر اور عبرت ہے ان نادانوں پر جو بلاتحقیق وتفتیش اور بلا تامل وتکلف ایک ذرا سے شبہ پر نصوص الٰہی اور اس کے تمام مفسرین۔ محدثین اور موئرخین کو بیدھڑک وضاعین اور کذابین کہہ دیتے ہیں۔

سید صاحب اور علی الاکثر انگریزی تعلیم یافتہ مجددین ومجتہدین کو معانی قرآن میں ایسے لغو اور مہمل تاویل کی جس وجہ سے جرآت ہوئی ہے۔ وہ سیرت ابن ہشام کی یہ عبارت ہے

قال ابن اسحق حدثنی یعقوب ابن عتبه انه حدث ان اول ما روئیت الحصبة والجدری بارض العرب ذالك العام و انه اول ماروی لها مرائر الشجر الحرمل والحنظل والعشر ذالك العام۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ یعقوب ابن عتبہ نے مجھ سے بیان کیا کہ اسی سال ملک عرب میں جسم پر دانے نکلے اور آبلہ والی بیماری نمودار ہوئی اور اسی سال عرب کی سرزمین پر کالے ناگ پھنی اور عشر (ایک قسم کا گوند پیدا کرنے والا درخت کے پیڑ بھی نکلنا شروع ہوئے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ابن ہشام اپنے اس بیان میں بالکل منفرد ہے۔ واقدی اور ابن سعد اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اس بنا پر یہ شخص کہہ سکتا ہے کہ مورخین ومحدثین میں سے کسی نے اسکے وقوع کا اقرار نہیں کیا۔ اور شبلی صاحب کے اصول تحقیق اور تنقید کے اعتبار پر جب تک یہ واقعہ تاریخی علماے حدیث کا خصوصاً صحیحین کا نظریہ نہ ثابت ہو جائے۔ مانا نہ جائے گا۔ اور کسی صحیح الاعتقاد مسلمان کے نزدیک قابل اعتبار واعتماد سمجھا نہ جائے گا۔

اور اگر سید صاحب کی زبانی خرم واحتیاط کے خلاف ابن ہشام کو اس کی قدامت کی وجہ سے قابل اعتبار سمجھ بھی لیں تو بھی یہ کہا جائے گا کہ ابن ہشام نے اس کو قصہ ابابیل کی کامل تشریح وتفصیل کے بعد لکھا ہے۔ اس بنا پر یہ بخوبی ثابت ہے کہ اس روایت پر نہ ابن اسحاق نے اپنا نظریہ قائم کیا ہے اور نہ ابن ہشام نے۔ کیونکہ سیاق عبارت سے اس کیلئے کوئی زمانہ مقرر نہیں کیا گیا ہے جس سے یہ سمجھا جاوے یا یقین کر لیا جاوے کہ چیچک کی وبا عین اسی روز یا اسی وقت پھوٹ نکلی جب ابرہہ الاشرم اپنی فوج گراں لے کر خانہ کعبہ کے انہدام کیلئے

مکہ میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ یعقوب ابن عتبہ کا بیان ہے کہ اسی سال عرب میں جسم میں دانے اور آبلے پڑنے والی بیماری کا آغاز ہوا اور اس سے پہلے نہ تھی۔

اس عبارت سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ اسی سال کے اندر اس وبا کا شیوح ہوا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام کے متفقہ اقوال کے مطابق اصحاب فیل کا واقعہ نصف ماہ محرم میں وقوع پذیر ہوا اس لئے ممکن ہے کہ سال بھر کے اندر محرم سے لے کر آیندہ ذی الحجہ تک کہ بارہ مہینوں کی مدت میں یہ امراض وبائی نمایاں ہوئے۔

پھر جب اس روایت سے اس وبا کا اصحاب فیل یا ان کے حملات کے عین وقت پھوٹ پڑنا ثابت نہیں ہوتا تو قرآن مجید کی ایسی صاف اور کھلی معنیوں میں تاویلات مہملہ کا انبار لگانا محض بے سود اور بے کار ہے۔

ہم بھی تسلیم کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمام مسلمان بھی کہ ابن ہشام نے بھی صحیح لکھا ہے۔ اور ابن اسحاق سے ابن ہشام نے بھی صحیح روایت کی ہے کہ اسی عام الفیل کے اندر اندر اس قادر مطلق نے قوم عرب کی تنبیہ اور عبرت کیلئے اس عارضی عذاب کے ساتھ ہی ساتھ اس دائمی اور قائمی بلا و مصیبت (وبائے چیچک) کو نازل فرمایا۔ تو اس سے واقعہ ابابیل کے ظہور و وقوع میں کیا نقصان وفتور پیدا ہوتا ہے۔ ہاں اگر ابن ہشام نے ابابیل کے واقعہ کو نہ لکھا ہوتا اور صرف وبائے چیچک کے شیوح کو قلمبند کیا ہوتا تو کسی قدر ان حضرات کے تاویلات اور مہملہ کیلئے گنجائش ہو سکتی تھی۔

ابابیل کو آبلہ کی جمع بتلانا ابلہ فریبی ہے۔

ابن ہشام اور ابن اسحاق دونوں بزرگوار عربی النسل تھے۔ عربی ان کی خاص زبان تھی۔ ادب ولغت کے ماہر کامل تھے۔ اور عالم و فاضل۔ وہ ہندی نژاد خام عربی دانوں کی طرح ابابیل کو آبلہ کی جمع بتلا دینے کی ابلہ فریبی نہیں کر سکتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی انگریزی تعلیم یافتہ حضرات نے ابابیل کو آبلہ کی جمع سمجھ کر اپنی عربی دانی اور ایجاد طبعی کا نمونہ دکھلایا ہے۔ ان کی اس قیاسی لفظ شناسی کی حقیقت کا انکشاف صراح اللغات کی مفصلہ ذیل عبارت سے وہ جاتا ہے۔

و کذا طیرا ابابیل قال و ھکذا یجیئی فی معنی التکثیر وھوا من الجمع الذی لا واحد لہ وقال بعضھم واحدہ ابول مثل عجّوّل وقال بعضھم ابیل وقال ولم احد العرب تعرف لہ واحدا۔ صراح مطبوعہ کلکتہ ص 882

اسی طرح ابابیل ہے (مشتق لفظ ابل سے) اور جماعت وکثرت سے اس کو ابابیل کہتے ہیں۔ اور یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے۔ بعضوں نے ابول کو مثل عجول کو اس کا واحد قرار دیا ہے اور بعض ابیل کو اس کا واحد قرار دیتے ہیں۔ مگر آخر قول یہ ہے کہ اہل عرب میں سے کسی ایک نے بھی اس جمع کا واحد نہیں بتلایا ہے۔

اب یہ قیاس کے ابابیل آبلہ کی جمع ہے یا اس کے مشتقات سے ہے کیسی صریح غلطی ہے۔ اور کھلی کھلی ابلہ فریبی۔ وہ محدود علم واطلاع

والے مسلمان جو اس لفظ کے لغوی تحقیق سے قاصر ہیں وہ اس عالم فریبی میں پڑ کر عبارت قرآنی کے صحیح مطالب و معانی کو سمجھنے میں ضرور تامل کریں گے۔ ان کی نیت میں فساد، عقیدت میں ارتداد اور معرفت میں استباہ کے سیاہ داغ لگ جائیں گے۔ مگر وہ طبقہ جو ان مطالب و مقاصد کی حقیقت پر کافی علم و اطلاع رکھتا ہے وہ نہ کبھی ان وساوس شیطانی پر متوجہ ہوتا ہے اور نہ ان مفاسد نسیانی کو کبھی خیال میں لاتا ہے

۔

آبلہ عربی کا کوئی لفظ نہیں۔

لغت عرب میں آبلہ کوئی لفظ نہیں۔ بلہ، تبرک، حرف الف ایک لفظ ہے۔ جس کے معنی بے وقوف کے ہیں۔ فارسی کے ابلہہ۔ بزیادت حرف الف غالباً اسی سے مشتق ہے۔ آبلہ خالص فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی پھولے یا پھپھولے کے ہیں جو اکثر جل جانے کی وجہ سے انسان کے جسم پر پڑ جاتا ہے اور آبلہ سے مرض چیچک کی مناسبت بالکل صحیح اور فی الواقع ہے۔ مگر آبلہ سے ابابیل کا تناسب بالکل جہالت ہے۔

اب رہا اس واقعہ کا محال عقلی ہونا۔ اس کی نسبت سید صاحب نے جو اپنی طرف سے یہ لکھ کر کہ ان لغو اور بیہودہ روایتوں پر اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین سے اس قصہ کی نسبت بیان کی ہے۔ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ جس میں ایک لمبا جداگانہ مباحثہ ہے۔ خطبات میں ص 552 جو مجبوری دکھلائی ہے۔ وہی مجبوری مجھ کو بھی لاحق ہے۔ کیونکہ میری موجودہ تالیف تاریخ و سیر کے مضامین پر حاوی ہے جس کو منقولات سے تعلق ہے نہ معقولات سے۔ مگر تاہم ہم نے خرق عادات اور قدرت کے تصرفات کے متعلق محققین یورپ اور مجددین مغرب کے اعترافات اوپر لکھ دیئے ہیں۔ جن سے معترضین اور مشتبھین حضرات کی پوری تسکین ہو جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ

مگر تاہم ناظرین کتاب کی مزید تشفی کیلئے اتنا اور لکھ دینا میرے لئے ضروری ہے۔ جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں لکھا گیا ہے کہ جب خدائے واجب الوجود کے وجود اور اس کے تمام صفات کو عین ذات سمجھ کر ہم تسلیم کر چکے ہیں اور صرف اسکو تسلیم ہی نہیں بلکہ انکو عین مشاہدات یقین کر کے ان کی شہادت دے چکے ہیں اور یہ امور بحکم ظاہر ہے جسے پوشیدہ اور مخفی ہیں اور پھر ایسے کہ ہمیں کسی وقت اپنے حواس اور قوت کے ذریعے سے انہیں معلوم اور محسوس کرنے کی کوئی امید نہیں ہے نہ ان کے احساس کیلئے ہمارے اعضائے جسمانی کام آتے ہیں نہ قوت اذہانی تو جب ایک ذات خاص کی نسبت باوجود اتنے محالات کے اس کے واحد۔ قادر۔ حاضر و ناظر ہونے کا ہم زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرتے ہیں تو پھر اس قادر مطلق کے اظہار قدرت کی مختلف صورتوں کو عام اس سے کہ ہماری ظاہر میں نگاہوں میں کتنی ہی عیب و غریب نہ معلوم ہوتی ہیں۔ کیسے ناممکن اور محال کہہ سکتے ہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب قدرت یزدانیہ اور جبروت ربانیہ کی ان جلوہ آرائیوں کا سلسلہ تاریخی دنیا میں افرینش عالم کے زمانہ سے لے کر اس دم تک ہر زمانے اور ہر وقت میں جاری و ساری ثابت ہوتا ہے۔ تو اب غرض منقول اور معقول دونوں طریقوں سے کرشمہائے قدرت کی جلوہ نمایوں کی تصدیق و اقرار اسی طرح لازم ہو گیا جس طرح اس قادر مطلق کے وجود اور جبروت کا یقین و اعتراف اور یہ اصول اسلام کا ایسا مسلم مسئلہ اعتقاد ہے جو اصحاب حقیقت اور

ارباب معرفت کی نگاہوں سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے تمام علماء اعلام اور فضلاے کرام حق سبحانہ تعالی کے تمام صفات کو عین ذات اور اسکی مقدس و منزہ ذات کو عین صفات یقین کرتے ہیں اور اسی کی تعلیم کرتے ہیں۔اس بنا پر اس کے افعال قدرت کو اس کی قدرت سے جدا یا اس کی قدرت کو اس قادر مطلق کے علیحدہ تصور کرنا۔اور اسکی حقیقت معرفت کا ادراک ظاہر یہ اور قوائے حسیہ کے ذریعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔صریح کوتاہیٔ عقلی ہے اور صحیح قطعی رالنظری۔قدرت ہی کی یہ قدرت ہے اور اس کے جبروت ہی کی یہ قوت کہ باوجود ان تمام تعریض و تکذیب کے بھی غافل سے غافل انسان کو بھی ایک خاص نتیجہ اور حالت پر پہنچ کر اس کی جبروت قدرت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

سید صاحب نے بھی باوجود ایسے سخت و شدید اعتراض اور انکار کے بھی۔اصحاب فیل اور عذاب ابابیل کے واقعہ میں بالآخر یہ لکھ کر ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے نہیں تھی۔تمام لشکر برباد ہوگیا، بہت سے مر گئے۔اور بہت سے اسی حالت میں پھر گئے۔خدا تعالی نے ان پر ایسی آفت ڈالی کہ جو بدارادہ انہوں نے کیا تھا اس پر کامیاب نہ ہوئے۔(خطبات ص552)اس قادر مطلق کی قدرت کا پورا اقرار کر ہی دیا۔یہی قدرت کے اصل تصرفات ہیں۔

ہم اس بحث کے تمام مقاصد کو ختم کر چکے۔اس کے خاتمہ پر ہمیں صرف اتنا لکھ دینا باقی رہ گیا ہے کہ تمام مسلمان اصحاب فیل کے واقعہ کو حرفاً حرفاً اور لفظاً لفظاً اسی طرح صحیح اور فی الواقع یقین کرتے ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید کی فصیح اور عام فہم عبارت میں نازل ہوا ہے،ہم ایک قادر مطلق کا اقرار کر چکے ہیں تو اب اس کے ظہور قدرت سے انکار کرنا ہماری شان عبودیت کے خلاف ہے۔

اپنی یہی ہے شان فدا اسکی شان کے

موجودہ زمانہ کے روشن ضمیر محققین۔فلسفہ جدید کی شیدائی ہیئت اور طبعیات کے فدائی۔اس واقعہ کو محض اتفاقات پر محمول کریں یا معمولی حادثات سے تعبیر کریں۔مرض بتلائیں یا وبا۔مگر ہم تو نصوص قرآنی کے مطابق اس واقعہ میں عذاب الٰہی کو سخت بلا یقین کرتے ہیں اور عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام کی نسبت سے قدیم اور عظیم فتح۔جو عیسائیوں کے ان گمراہانہ تحریک و تہذیب کی سزا و پاداش میں حق تعالی کی طرف سے ان پر نازل فرمائی گئی۔جس کو انہوں نے اپنے تعصب و نفسانیت کی بنا پر اس قدیم اور واجب بیت الٰہی کی توہین و انہدام کیلئے اختیار کیا تھا۔جس کے معمار ابراہیمؑ تھے اور مزدور اسمٰعیلؑ۔

اگر تاریخوں کی ورق گردانی کی خفیف سی زحمت گوارا فرمائی جائے تو ارباب تحقیق کی نگاہوں میں عیسائیوں کے لاانتہا تعصب اور بے حد نفسانیت کما حقہ ظاہر ہو جاتی ہے۔یہودیوں کی کورانہ تقلید میں عیسائیوں کی بنو اسماعیل کے ساتھ قلبی نفرت کا یہ پورا زمانہ تھا۔ان کی بنو اسماعیل اور بنو ہاجرہ کے ساتھ عداوت اس شدت کے ساتھ بڑھی ہوئی تھی کہ باوجود اخبار و آثار صحیحہ سے قدامت و عظمت کعبہ ثابت ہونے کے بھی وہ نہ اس کو معبد الٰہی تسلیم کرنا گوارا کرتے تھے اور نہ اس کو صرف امارت ابراہیمی ماننا چاہتے تھے۔حالانکہ عرب کے تمام آثار قدیمہ کافی طور سے اس کا ثبوت دے رہے ہیں اور روم و یونان کے غیر عرب محققین بھی۔جنھوں نے یہود کی کتب قدیمہ کا ترجمہ کیا ہے اس کی شرحیں لکھی ہیں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ بخت نصر اور شاہان بابل کی تاخت تاراج کے بعد جب یہودیوں نے عرب اور خصوصاً حوالی مکہ و

مدینہ میں سکونت اختیار کی تو وہ بھی اہل عرب کی طرح اس معبد الٰہی کی عظمت وتحریم کرتے تھے۔اس کو خالص عمارت ابراہیمی یقین کرتے تھے۔اور عربوں کے ساتھ سالانہ مراسم وارکان حج بجالاتے تھے مگر آگے چل کر جب گردونواح کے ممالک میں عیسائیت کا اقتدار قائم ہو گیا اور بنواسماعیل کی قوت واختیار میں کمی آئی تو یہ ابن الوقتی کر کے عربوں کے اتفاق واتحاد سے دستبردار ہو کر عیسائیوں کے معین ومددگار بن گئے اور بیت المقدس کی مسافت بعید دکھلا کر اپنا کعبہ الگ بنانے کی ترغیب دی۔ابرہہ الاشرم نے اس تجویز میں مذہبی خیال کے ساتھ سیاسی نظم وتدبیر کو بھی شامل کر دیا۔اور اس تدبیر سے اس نے اپنی تخت گاہ۔شہر صنعاء کو مکہ کی طرف مرفہ الحال تجارت اور کاروباری شہرت کا مرکز بنانا چاہا۔اور اس طریقہ اور قاعدہ سے ملکی اور قومیہ رعایا کو ان تمام منافع اور محاصل سے منتفع اور مالا مال بنا دینا چاہا۔جن ذرائع اور وسائل سے مکہ اور تمام علاقہ حجاز کے اقوام وقبائل ہر سال ایام حج میں مستفید ہوا کرتے تھے۔

مگر ابرہہ الاشرم کو اپنی سیاسی تدبیر کی فکروں میں مشیت کے ارادے اور تقدیر کے نیرنگ کی کیا خبر اس نے سوچنے کو تو سب کچھ سوچ لیا اور کرنے کو حتی الامکان سب کچھ کر لیا۔مگر جبروت کے ایک ہاتھ نے آن کی آن میں اس کے سارے منصوبے۔اس کے سارے سامان خاک میں ملا دیئے۔اور اس کی فوجی سیاسی اور تمدنی غرض تمام قوتیں منہ دیکھتے رہ گئیں۔واللہ یفعل ما یشاء۔

حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کی شادی

ابن ہشام۔ابن سعد۔طبری۔ابن اثیر اور ابوالفدا اغرض قریب قریب تمام عربی تاریخوں نے حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کی شادی کے واقعہ کو اصحاب فیل کے واقعہ کئے بعد لکھا ہے۔حالانکہ انہیں کے نظریہ سے اصحاب فیل کا واقعہ ولادت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کل پچپن روز پہلے کا ثابت ہوتا ہے۔بات یہ ہے کہ حضرات متقدمین کو سلسلہ ترتیب وسنین سے زیادہ واقعات کی اہمیت مدنظر رہتی ہے اور اس بناء پر وہ مطابقت سنین کا اس قدر خیال نہیں کرتے تھے۔

بہر حال ابن سعد کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب کا سن شادی کے وقت سترہ برس کا ثابت ہوتا ہے۔یوں تو آپ کی نسبت مکہ کے تمام اشرف واعلیٰ قبائل سے بھی برابر آمادگی کا اظہار تھا۔مگر نظام مشیت نے اس ازدواج کا شرف مکہ والوں کی خوش قسمتی کا نتیجہ نہیں ٹھہرایا تھا۔بلکہ اس فخر ومباہات کو بنی زہرہ کا تمغہ شرافت قرار دے رکھا تھا جو بیرونِ مکہ آباد تھے۔اس کی مثال مفصل ذیل واقعہ سے باآسانی معلوم ہو جائے گی۔

قتیله بنت نوفل اخت ورقه ابن نوفل و کانت تنظر وتعتاف فمر بها عبدالله بن عبدالمطلب فدعته یستبضع منها ولزمت طرف ثوبه فابی وقال حتی ایتك و خرج سریعاً حتی دخل علی امنة بنت وهب فوقع علیها فحملت برسول الله صلی الله علیه وآله وسلم طبقات ص59

قتیلہ بنت نوفل۔ورقہ ابن نوفل مشہور ومعروف عالم قریش کی بہن جو اس وقت دوشیزہ بھی تھیں اور بہت بڑی عفیفہ۔ایک بار حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے سامنے سے گذریں قتیلہ نے دیکھتے ہی آپ کو اپنی طرف بلا لیا۔اور نکاح کی درخواست کی اور ان کا گوشہ دامن پکڑ لیا۔حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب نے قطعی انکار کیا اور اس کے پاس سے سرعت تمام چلے آئے۔اس واقعہ کو عرصہ ہو گیا اس درمیان میں آپ کی شادی حضرت آمنہ سے ہو گئی اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حمل واقع ہو گیا۔

نتیجہ ذیل کی تتمع عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

ثم رجل عبدالله ابن عبدالمطلب الی المراءۃجدها فانتظرہ فقال هل لك فی الذی عرضت علی فقالت لا مرت وفی ووجهك نور ساطع ثم رجعت و ليس فيه ذالك النور ۔طبقات ص59

عبداللہ ابن عبدالمطلب نے ایک بار پھر اس لڑکی کو دیکھا تو پوچھا کہ اب اس امر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔جس کی نسبت تم نے ایک بار مجھ سے درخواست کی تھی اس نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں کیونکہ جب اس دفع تم میرے پاس سے ہو کر نکلے تھے تو میں نے تمہارے چہرے سے ایک نور ساطع دیکھا تھا۔اب جو تم لوٹ کر آئے ہو تو وہ نور تم میں نہیں پاتی ہوں۔

ابن سعد نے اس واقعہ کو قتیلہ بنت ورقہ کے علاوہ فاطمہ بنت مرہ خثعمیہ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔

بہر حال چونکہ مشیت کو اس ازدواج واتحاد سے اپنی ودیعت خاص کی استبداء وایجاد منظور تھی جس کیلئے عمائدو اشراف قریش میں بنی زہرہ زیادہ ترموزوں تجویز کئے گئے تھے۔گویا مشیت کی اسی تحریک پر حضرت عبدالمطلب اہل مکہ کی تمام نسبتوں کو نامنظور فرماتے گئے اور بنی زہرہ کی آئی ہوئی نسبت کو قبول فرما کر حضرت عبداللہ کی شادی حضرت آمنہ بنت وھب سے کر دی۔اور اپنی شادی ہالہ بنت وہیب سے کر لی۔وہیب،وہب کے چھوٹے بھائی تھے۔اور وہب کے بعد ان کے قبیلے کے سردار اور اپنے زمانہ کے ذی اقتدار وصاحب اختیار۔یہ دونوں صاحب عبدمناف ابن زہرہ ابن کلاب کے صاحبزادے تھے ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

كانت امنه بنت وهب فی حجر عمها وهيب ابن عبد مناف ابن زهره فمشى اليه عبدالمطلب ابن هاشم بابنه عبدالله ابی رسول الله ﷺ فخطب عليه امنه بنت وهب فزوجها عبدالله بن عبدالمطلب و خطب اليه عبدالمطلب ابن هاشم فی مجلسه ذالك ابنته هاله بنت وهيب على نفسه فزوجه اياها فكان تزوج

عبدالمطلب بن هاشم و تزوج عبدالله بن عبدالمطلب فی مجلس فولدت هاله بنت وهیب لعبد المطلب حمزه بن عبدالمطلب فکان حمزه عم رسول الله صلعم فی النسب و اخاه من الرضاعة لما تزوج عبدالله ابن عبدالمطلب امنه بنت وهب واقام عندها ثلاثا کانت تلك السنه عندهم اذا دخل الرجل علی امراته فی اهلها ۔طبقات ج1ص57

آمنہ بنت وہب اپنے چچا وہیب ابن عبدمناف کی کفالت میں تھیں ۔حضرت عبدالمطلب حضرت عبداللہ کو لے کر بنی زہرہ کی قیام گاہ پر گئے ۔اور حضرت آمنہ کا نکاح اپنے صاحبزادے عبداللہ پدر جناب رسالتمآب صلعم سے پڑھا اور آمنہ کو عبداللہ سے بیاہ دیا۔اور وہیب کی لڑکی ہالہ بنت وہیب سے خود خطبہ نکاح پڑھ کر شادی کر لی ۔اور یہ دونوں نکاح ایک ہی مجلس میں بیک وقت واقع ہوئے ۔ہالہ کے بطن سے حضرت عبدالمطلب کے ہاں حضرت حمزہ پیدا ہوئے ۔ہالہ نے جناب رسالتمآب صلعم کو دودھ پلایا۔اس بنا پر حضرت حمزہ سلسلہ نسب میں تو آنحضرت صلعم کے عم محترم تھے ۔مگر علاقہ کی رضاعیت کے اعتبار سے وہ آپ کے رضاعی بھائی تھے ۔جب حضرت عبداللہ کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب سے ہوگئی تو آپ سسرال میں تین دن تک قیام فرمار ہے ۔کیونکہ یہ دستور تھا کہ شادی کے بعد شوہر اپنی عروس کے ہاں تین دن تک قیام کرتا تھا۔

حضرت عبدالمطلب پر اپنے بیٹے کے ساتھ بیک وقت اور بیک مجلس اپنی بھی شادی کر لینے کیلئے جو ان طبع مولفین معترضین دیدہ اعتراض نکالتے ہیں اور عیسائی متعصبین تو کھل کھل کر استہزا کرتے ہیں ۔مگر دونوں حقیقت شناسی سے علیحدہ ہیں ۔یہ حضرات اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کی طرح اس زمانہ اور اس کے اہل زمانہ کو بھی قیاس کرتے ہیں ۔ان کا یہ موازنہ سرتا پا غلط ہے ۔مجھ کو ان کے اس غلط قیاس کی تردید اور تنقید کی مطلق ضرورت نہیں ۔مگر حقیقت امری کا بتلانا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عبدالمطلب کی اس شادی سے جو نتیجہ نکلا۔اور حقیقتاً جو تدبیر الٰہی کا عین مقصود ثابت ہوتا ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس اتحاد و مواصلت کی علت و غایت جناب حمزہ کی ولادت تھی ۔جناب رسالت مآب ﷺ کے بارہ چچا تھے ۔ان تمام حضرات میں اعانت اسلام اور رفاقت حضرت سیدالانام میں ۔بعد ابی طالب جس خلوص وعقیدت کے ساتھ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب نے اپنی خدمات کے جوہر دکھلائے ۔ویسے کسی ایک نے بھی نہیں ۔ کما لا یخفی علی المدبر

ظہور کرامات کے واقعات سے سر ولیم میور صاحب کا انکار

عیسائیوں کے قدیم تعصب اور نفسانیت کی لکیر پیٹنے والوں میں سر ولیم میور نے بڑا نام پایا ہے اور اسلام کی مخالفت کا خاص بیڑا اٹھایا ہے۔ اسلام کی تفسیر حدیث اور تاریخ کے بیانات سے لے کر مشاہدات و بدیہات تک سے انکار فرماتے ہیں اور تائید عیسائیت کے اس غلط طریقہ کو وہ اپنی مجاہدانہ کوشش یقین کرتے ہیں حالانکہ این راہ کہ میروی بترکان است۔ لیکن حقیقت بین اور انصاف پسند حضرات ان کی مساعیہ واہیہ کو ایک مجنونانہ حرکات سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتے۔ وہ محض معمولی سے معمولی اسلامی اخبار و آثار کی تنقید وتردید کر کے اپنی دانست میں دین اسلامی کو لغو ثابت کرتے ہیں۔ ان ھذا ضلان بعیں۔ حالانکہ انہیں معلوم نہیں کہ کوئی مذہب ہو اُس کی اصل اور اُس کی بنا حقیقت کے کن اخبار اور معیار پر قائم ہوتی ہے۔

اپنی نفسانیت اور تعصب کے اسی سلسلہ بیان مین سر ولیم میور صاحب نے ظہور کرامات کے واقعات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کو سرے سے بے اصل اور راویوں کے محض مخترعات بتلایا ہے۔ ان کے علاوہ ان مشاہدات کو بھی۔ جن کو روایات ہونے کے علاوہ تاریخی واقعات ہونے کی بھی پوری حیثیت حاصل ہے اور وہ دورانِ حمل اور وقت ولادت متعدد اور متواتر طریقوں سے تمام احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں قابل مضحکہ ٹھہرایا ہے اور خوب قہقہہ لگایا۔ ومن ضَحِكَ ضُحِكَ۔

جہاں تک میور صاحب کے ان تنقیدی مضامین پر غور کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسد ونفسانیت کی عصبیت نے میور صاحب کو حقیقت شناسی اور انصاف پسندی کے راستہ سے بہت دور پھینک دیا ہے۔ انہوں نے ان مرویات سے اسلام کی لغویت ثابت کرنے کا خیال خام پیدا کیا ہے اگر وہ کسی مذہب کی اصلیت اور حقیقی معرفت سے واقف ہوتے اور ان اصول ضروریہ کو جانتے ہوتے جن پر مذہب کی بناء ہوتی ہے۔ تو ان روایات کی تنقید وتردید سے تکذیب اسلام ثابت کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

اگر بفرض محال یہ مرویات اسلامی معیار تحقیق وتصدیق کے مطابق بھی نہ اتریں تو ان سے حقیقت اسلام میں کیا نقصان آتا ہے۔ سر ولیم میور ان مرویات کے جیسے توریت وانجیل کی ان متعدد اور متواتر واقعات ومندرجات کی نسبت کیا رائے قائم کریں گے۔ جو محالات کے بھی درجہ سے گر کر مہملات کی حدود تک پہنچے ہوئے پائے جاتے ہیں اور جو عموماً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں اُس وقت سے لے کر اس وقت تک ان کی مذہبی کتابوں میں بڑے اہتمام اور رنگینیوں سے لکھے جاتے ہیں جن کو اُن ذوات مقدسہ اور نفوس مطہرہ کے متعلق ذکر کرنا کیسا ان کی طرف منسوب کرنا بھی اہل اسلام خلاف ادب واحترام سمجھتے ہیں۔ مثلاً جناب مریم علیہا السلام پر نزول روح القدس اور استقرارِ حمل مسیح علیہ السلام کی ترکیبات یا ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یوسفؑ نجار کے گھر جا کر جناب عیسیٰؑ کے دیگر علاقائی بھائیوں کی ولادت جن کو مسیحی اصطلاحات میں دی برادرز (The Brothers) کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ ایسے لغویات ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں اور سننے والوں کے کان جلے جاتے ہیں۔

مگر جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کوئی عیسائی فلاسفر (Philosofer) کوئی سائنٹسٹ (Seicntist) ان واقعات کو غلط ٹھہراتا ہے، مگر نہ محالات وممکنات بتلاتا ہے۔افسوس ہے کہ ان اعتراضات سے پہلے سرولیم میور نے لوقا کی انجیل کھول کر حضرت عیسیٰؑ کی زبانی ان احکام ربانی کو نہ پڑھ لیا ہوتا تو اس ذرے کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہی دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جوشہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا۔اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ سے شہتیر نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ کا ذرہ صاف نظر آنے لگے گا۔لوقا باب 6۔آیت 41و42۔مطبوعہ لاہور۔

میور صاحب کی طرح ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے بھی حضرت آمنہ کا فرشتوں کو دیکھ کر ڈر جانے اور عرب کے دستور کے مطابق لوہے کے تعویذ کو گلے میں لٹکانے اور بازو پر باندھ لینے سے یہ معنی لگائے ہیں کہ حضرت آمنہؑ کو دماغی ضعف کی شکایت تھی اور صرع کا جرح تھا۔''ہم اس ناانصاف یورپین محقق سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آمنہؑ کو تو واقعات کے بیان کے لیے ضعف دماغ اور صرع کی بیماریوں میں مبتلا ہونا تجویز ہوتا ہے۔مگر حضرت سارہؑ اور حضرت مریمؑ نے جو فرشتوں کو دیکھ کر حجاب واستعجاب کی صورت میں خوف کھایا تھا اُس کے لیے ڈاکٹر صاحب کون سی بیماری اور کون سا جرح تشخیص فرمائیں گے۔بہر حال اگر سرولیم میور اور اُن کے ہم خیال خصائص انبیاء کے قائل نہیں ہیں اور ان خاصان خدا کو عوام کالانعام کے برابر جانتے ہیں تو وہ اپنے اس غلط استدلال کو اہل اسلام کے مقابلے میں جو ابتدائے اسلام سے لے کر اس وقت تک تخصیص وتفضیل انبیاء کے برابر معتقد وموید ہیں اور انشاء اللہ ابدالاباد تک قائل رہیں گے۔اس وقت تک پیش کرنے کا حق نہیں رکھ سکے گا۔جب تک کہ وہ ان اقسام کی مرویات کو اپنی تمام مذہبی کتابوں سے قلم زد نہیں کرلیں گے۔یا کم سے کم اُن پر محالات وناممکنات ہونے کا پورا یقین نہ کرلیں گے۔ہم نے اُن کے جملہ اعتراضات کی تردید میں اس کلیہ کو لکھ دیا اِس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔مگر چونکہ سرولیم میور نے فرشتے کے ذریعہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا کو اس مولود کو احمدؐ نام رکھے جانے کی ہدایت کرنے پر بڑی حیرت واستعجاب کا اظہار فرمایا ہے۔اس لیے ہم مختصراً اُن کے استعجاب کا ذیل میں جواب عرض کیے دیتے ہیں۔سرولیم میور کو اس حصہ روایت کی تردید کی ضرورت جس بناء پر واقع ہوئی ہے۔اس کو ہم خوب جانتے ہیں۔(احمد ﷺ) کے نام ولقب سے ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا ہے۔کیوں اس لیے کہ یہ وہی مقدس اور مبارک نام ہے جس کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ نے صعود آسمان کے وقت حضرت خاتم الانبیاء علیہ والہ التحیہ والثنا کے ظہور اور رسالت کی نوید وبشارت اس عبارت کے ساتھ تمام مسیحی امت کو پہنچائی تھی کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضروری ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (احمد مصطفیٰؐ) تمہارے پاس نہیں آئے گا اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

انجیل یوحنا باب 16۔آیت 7وباب 14۔آیت 25،26۔

فارقلیط کا اصل ترجمہ احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے جس کی تصدیق وتوثیق قرآن مجید کے الفاظ بشارت **ومن یاتی بہ اسمہ احمد** سے بخوبی ہوجاتی ہے۔ہم فارقلیط اور احمدؐ کے متحد المعنی اور صحیح ترجمہ ہونے کی بحث کو اور ان تمام مشکلات کو جو عیسائیوں نے اس لفظ کے ترجمہ ومعانی میں پیدا کردی ہیں اپنی کتاب کے باب البشارت میں کتب قدیمہ کی اصلی عبارت کے ساتھ بالتفصیل بیان

کریں گے۔ بہرحال آمدم برسرِ مطلب۔ سرولیم میور صاحب کو جناب آمنہؑ کے پاس فرشتہ کا آنا اور اس بچہ کا نام جو اس وقت تک حمل میں تھا احمدؐ رکھے جانے کی تاکید کرنا حیرت خیز اور تعجب انگیز بھی معلوم ہوا ہے۔ محال بھی ناممکن الوقوع ولا مثال بھی۔ اچھا تھوڑی دیر کے لیے یونہی سہی۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ افسوس سرولیم میور صاحب بدقسمتی سے ان واقعات ومشاہدات کی ان متعدد اور متواتر مثالوں کا کیا کریں گے۔ جو بجنسہ اور بلفظہ ان کی آسمانی کتابوں میں بھی اس وقت سے لے کر اس وقت تک مرقوم ومسطور چلی آتی ہیں اور محفوظ ومذکور۔ توریت مقدس کے باب پیدائش میں لکھا ہے۔

''ہاجرہؑ سے اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتہ نے آ کر کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے اور تیرا ایک لڑکا پیدا ہوگا اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھنا۔''

(کتاب پیدائش باب 16۔ آیتہً 11) اور پھر اسی کتاب میں ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ تیری بی بی سارہ کا بیشک ایک لڑکا ہوگا تو اس کا نام اسحق علیہ السلام رکھنا۔ باب 15۔ آیت 19 توریت کی عبارت ہو چکی۔ اب انجیل کی بشارت ملاحظہ ہو۔ انجیل متی باب 1 آیت 30 میں ہے)۔

اس کے ہاں (مریمؑ) ایک بیٹا پیدا ہوگا اور تجھ کو (یوسفؑ کو) چاہیے کہ اس کا عیسیٰؑ نام رکھ۔ کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دیگا۔ ان اعتراضات کے جواب میں عیسائیوں سے عموماً اور میور صاحب سے خصوصاً التماس ہے کہ ان متعدد اور متواتر مثالوں کی موجودگی میں جن کے صحیح اور فی الواقع ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا وہ کس منہ اور کس زبان سے مسلمانوں کی ان مرویات پر محالات اور ناممکنات کا حکم لگائیں گے۔ اس لیے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں تاوقتیکہ وہ اپنی کتب مقدسہ سے ان واقعات کو نکال دیں گے۔ ان کو جناب آمنہ سلام اللہ علیہا پر نزولِ فرشتہ اور ہدایت تسمیہ کے متعلق تعریض وتنقید کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

نزول رحمت،ظہوررسالت

ولادت باسعادت

جناب آمنہؑ کے ایام حمل تمام ہوئے یایوں کہیے کہ امین الٰہی کی امانت کی مدت ختم ہوئی اور وہ دن آ گیا کہ ودیعت الٰہی کا وہ۔۔۔۔۔۔۔

نایاب گوہر	قدرت لامتناہی کالاجواب جوہر	علم وایقان کامخزن	عرفان واتقان کامعدن
بشارت موسیٰؑ کامدعا	نویدعیسیٰؑ کامقتضا	اصل وحدت کامعلم	امررسالت کامتمم
آئینہ معرفت کبریاء	خاتمہ سلسلہ انبیاء	گوہرگنجینہ علم وکمال	جوہرآئینہ حسن وجمال
شمسہ ٔ ایوان قضاوقدر	خمسہ ارکان عقول بشر	جلوہ دہ شاہدواحدانیت	سجدہ گاہ عاشق روحانیت
علتِ غائتیہ ہرجزوکل	اوّل ہرخلقتِ ختم الرسل	ہفت فلک ازکرمش اُستوار	ہشت بہشت ازقدمش نوبہار
منتظم نظم قضاوقدر	مقتدرومعتمدومعتب	ناموپش اول ابجدشدہ	احمدؐومحمودؐومحمدؐشدہ

افضل المرسلین،خاتم النبیین شہنشاہ کونین،رسول الثقلین،فخرہاشمی وقصیٰ،مفخرعبداللہؑ،نازپروردآمنہ اول خمسہ آل عبا۔حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،رحمت الٰہیہ اور برکت قدسیہ کااسوہ حسنہ بن کررونق افروزگلستان عالم ہوئے۔

تاریخِ روزاورسن ولادت

بارہویں ربیع الاول روزپیرکادن سنہ ا عام الفیل مطابق 29۔اگست 570ء ثابت ہوتی ہے۔علماءاہلبیتؑ کے اتفاق وارشاد سےسترھویں ربیع الاول روزدوشنبہ پائی جاتی ہے۔

احوال ولادت کےمتعلق حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا کی زبانی جس کی تصدیق آگےچل کرخودقول رسولؐ سے ہوجاتی ہے۔تمام تاریخوں میں یہ حالات وواقعات درج ہیں۔ہم ابن سعدکی طبقات سےذیل میں لکھتےہیں۔

ان امنه بنت وهب وفقلت لقد علقت به یعنی رسول صلعم فماوجد ت له مشقة حتیٰ وضعة فلما فصل منی خرج معه نوراضاءله بین المشرق الی المغرب ثم وقع الی الارض معتمداً علیٰ یدیه ثم اخذقبضة من تراب فقبّضها ورفع راسا الی السماء وعن عبدالله ابن عباس عن ابیه عباس بن عبدالمطلب ولد النبی صلی الله علیه واله وسلم مختوناًمسروراً۔طبقات ابن سعد

ترجمہ: جناب آمنہؑ ناقل ہیں کہ جب سے مجھے جناب رسول خداؐ کا حمل ہوا مجھے کوئی گرانی محسوس نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ وضع حمل ہوا۔ جس وقت آپ متولد ہوئے۔ پورپ سے مغرب تک ایک نور پھیل گیا۔ وقت ولادت آپؐ نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور ایک مشت خاک اٹھائی اور آسمان کی طرف اپنا سر مبارک بلند فرمایا اور حضرت عبداللہ ابن عباس نے اپنے پدر بزرگوار حضرت عبداللہ ابن عبدالمطلب سے روایت کی ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ختنہ شدہ وناف بریدہ پیدا ہوئے۔

حضرت عبدالمطلب کو خبر ولادت

ابن سعد واقعہ ولادت کی تفصیل میں آگے لکھتے ہیں۔

ولما ولد اٰمنه بنت وهب رسول الله صلی الله علیه واله وسلم ارسلت الی عبدالمطلب فجاءه البشیر وهو جالس فی الحجر معه ولده ورجال من قومه فاخبره ان اٰمنه ولدت غلاماً فسر ذلك عبدالمطلب وقام هو ومن كان معه فدخل علیها فاخبرته بكل مارأت وما قیل لها وأمرات به قال فاخذه عبدالمطلب فدخله الكعبه وقام عندها یدعوالله ویشكر ما اعطاه۔

جب جناب رسالت مآبؐ پیدا ہوئے تو حضرت آمنہؑ بنت وھب نے آدمی بھیج کر حضرت عبدالمطلبؑ کو اطلاع کی۔ وہ اس وقت اپنے بیٹوں اور قوم کے چند لوگوں کے ساتھ کعبہ کے مقام حجر میں تشریف فرما تھے۔ اس آدمی نے حاضر ہوکر بشارت دی کہ آمنہؑ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ یہ سن کر آپ مسرور ہوئے اور آپ کے ساتھ آپ کے تمام ہمراہی کھڑے ہوگئے اور جب گھر میں آمنہؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے وہ تمام حالات جو آپ نے دیکھے تھے یا جو کچھ (منجانب خدا) آپ سے کہا گیا تھا یا جس کے لیے آپ کو حکم دیا گیا تھا۔ حضرت عبدالمطلبؑ سے بیان کردیئے۔ حضرت عبدالمطلبؑ نے اس مولود مسعود کو گود میں لیا اور خانہ کعبہ کے اندر آکر کھڑے ہوگئے۔ اس مولود مسعود کی سلامتی کی دعا مانگی اور اس نعمت کے عطا فرمائے جانے کا شکریہ ادا کیا۔

تقریب ولادت کی یادگار میں حضرت عبد المطلب کے اشعار

ابن سعد طبقات میں مندرجہ بالا حالات لکھ کر محمد ابن عمر اسلمی کے اسناد سے اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ حضرت عبد المطلب نے اس واقعہ مسرت افزا کی یادگار میں ذیل کے اشعار منظوم فرمائے جن سے آپ کے قلبی جذبات کا پورا پورا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

الحمد لله الذی اعطانی
هذاالغلام الطیب الا ردان
فدساد فی المهد علی الغلمان
اعیذه بالله الذی ذی ارکان
حتی اراه بالغ البنیان
اعیذه من شر ذی شأن
من حاسد مضطرب العنان

ترجمہ: میں خدا کی تعریف کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسا فرزند عطا فرمایا جو اپنی قوم میں پاک و پاکیزہ ہے۔ وہ اپنے گہوارے میں غلاموں کی حفاظت میں آرام کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ جو رکن و مقام کا مالک ہے اس کو اپنی پناہ میں رکھے یہاں تک کہ میں اپنی آنکھوں سے اسے جوان دیکھ لوں اور خدا اسے اس کے برا چاہنے والے حاسدوں سے محفوظ رکھے اور ان کے شریک سے بھی جو اس کا اچھا نہیں چاہتے ہیں۔

روز اور وقت ولادت

سال و ماہ ولادت کی تفصیل و تحقیق اوپر لکھی جا چکی ہے۔ رائٹ انریبل مسٹر سید امیر علی باالقابہ سپرٹ آف اسلام ص 70 کے زیر حاشیہ لکھتے ہیں کہ جس سال آنحضرتؐ پیدا ہوئے وہ کسریٰ نوشیروان کا چالیسواں سال جلوس تھا اور سن سلاقسی (یونانی) کا 880 سال تھا۔ باتفاق فریقین ثابت ہے کہ ولادت باسعادت کے دن کے وقت بعد طلوع آفتاب پیر کے روز واقع ہوئی۔ مسلم ابن قتادہ انصاری سے ایک طولانی حدیث اس کے متعلق موجود ہے جس کی سند پر امام قسطلانی نے مواہب لدنیہ نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ هذا الحدیث یدل انه صلعم ولد نهاراً۔ یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ آپ کی ولادت دن کے وقت واقع ہوئی۔ اسی حدیث میں پیر کے دن کا بھی تعین مندرج ہے۔ ملاحظہ ہو زرقانی ص 161۔

مقام ولادت

فریقین کے متفقہ نظریہ سے شعب بنی ہاشم (جو بعد میں شعب ابی طالب علیہ السلام کے نام سے مشہور ہوا) مقام ولادت ثابت ہوتا ہے۔ زرقانی میں مقام ولادت کی تفصیل اور تخصیص کے متعلق یہ لکھا ہے کہ شعب بن ہاشم میں وہ مقام اصلی مقام ولادت تھا۔ جس کو زقاق مدکک کہتے تھے۔ اور یہ وہی مکان تھا جو بقول مؤرخ ابن اشیر آنحضرتؐ نے عقیل بن ابی طالب علیہ السلام کو ہبہ فرما دیا تھا اور بعد مرور ایام ان کی اولاد نے محمد ابن یوسف ثقفی برادر حجاج ابن یوسف الثقفی کے ہاتھ بیع کر دیا اور اس کے بعد جب ہارون الرشید حج کرنے آیا تو اس نے محمد ابن یوسف کے ورثاء سے خرید کر یہاں مسجد بنوادی۔ جو آج تک مولد النبی صلعم کے نام سے زیارت گاہ عالم ہے۔ (زرقانی ص165)

رسم تسمیہ وولیمہ عقیقہ

رسم تسمیہ اور ولیمہ عقیقہ کی نسبت زرقانی نے تاریخ خمیس کے اسناد سے تفصیلی حالات لکھتے ہیں۔

وفی الخمیس روی انه لما ولد صلی الله علیه واله وسلم امر عبدالمطلب بخرور فنحرت ودعا رجالاً عن قریش فحضروا وطعموا وفی بعض الکتب کان ذلك یوم سابعة فلما فرغوا من الاکل قالوا ما سمیهٗ فقال سمیتُهٗ محمدًا فقالوا ارغبت عن اسمآئهٖ ابآئهٖ فقال اردت ان یکون محمودًا فی السماء لله وفی الارض الخلقه وقیل بل سمیتُهٗ بذلك امه لما ر ته وقیل لها فی شانه ویمکن الجمع بأن امه واذا کان بسبها الصح القول بانها سمته بهٖ زرقانی ص154۔

ترجمہ: تاریخ خمیس میں ہے کہ جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت عبدالمطلب نے اونٹوں کی قربانی کا حکم دیا۔ چنانچہ اونٹ ذبح کیے گئے۔ قریش کے لوگوں کو دعوت دی گئی۔ وہ حاضر ہوئے اور کھانا کھایا۔ بعض کتابوں میں یہ دعوت ولادت سے ساتویں دن بیان کی گئی ہے۔ جب کھانے سے فراغت ہو چکی تو لوگوں نے حضرت عبدالمطلب سے پوچھا کہ اس مولد کا کیا نام رکھنا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا محمدؐ (صلعم) لوگوں نے پوچھا آپ کو اپنے بزرگوں کے نام سے رغبت نہیں ہے۔ عبدالمطلب نے فرمایا اس لیے اس کا نام محمدؐ رکھا ہے کہ یہ خدا کے نزدیک آسمان پر بھی محمود اور اس کی خلقت کے لیے زمین پر بھی محمود ہو اور یہ قول بھی آیا ہے کہ آپ کا یہ نام آپ کی ماں نے رکھا تھا۔ جیسا کہ

آپ کو خواب میں اس بچہ کے نام اور اکرام شان کے متعلق بتلایا گیا تھا اور ان دونوں مختلف اقوال میں اجماع ممکن ہے۔ اس طرح کہ آپ کی مادر گرامی قدر نے جو کچھ خواب میں مشاہدہ فرمایا ہو وہ آپ کی جدامجد سے دہرا دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ بچہ کا یہی نام رکھا جائے اور اسی کے مطابق تسمیہ واقع ہوا ہو۔ لیکن صحیح ترین یہی ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کا نام رکھا تھا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

کنیت

باتفاق فریقین آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم ثابت ہے۔

القاب

اسلامی کتب تفاسیر احادیث اور تاریخ میں آپ کے کثیر التعداد القاب مرقوم ہیں۔ اخبارالوفاء میں امام **سموی** نے ننانوے القاب مع توجیہات کے پوری تفصیل کے ساتھ قلم بند فرمائے ہیں۔ ان سب میں مشہور ترین القاب، **خاتم النبین** اور نبی الرحمۃ ہیں۔ جو نصوص قرآنی سے منصوص مخصوص ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مرضعات آنحضرت صلعم

ماں کو کسی نے اصولاً مرضعات میں شامل نہیں کیا ہے۔ مجازاً گا شمار نہیں۔ اس بنا پر حضرت آمنہؑ کے بعد سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابولہب کی آزاد کردہ جاریہ ثوبیہ نے دودھ پلایا۔ اس سعادت کی تقدیم کا شرف اس لونڈی کی خوش قسمتی کا حصہ تھا۔ **واللہ یوتیہ من یشاء** ابن سعد لکھتے ہیں۔

اول من ارضع رسول اللہ صلعم ثوبیۃ بلبن ابنھا مسروح ایاما قبل ان تقدم حلیمۃ وکانت قد ارضعت قبلہ حمزۃ بن عبدالمطلب وارضعت بولدہ باسمہ بن عبدالاسد المخزومی وان ثوبیۃ کان ابولھب اعتقھا۔

ترجمہ: سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ثوبیہ نے اپنے بیٹے مسروح کا دودھ پلایا۔ حلیمہؓ سعدیہ اس وقت تک نہیں آئی تھیں اور آنحضرتؐ سے پہلے ثوبیہ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؑ کو دودھ پلایا تھا اور پھر ان کے بعد ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو شوہر اول ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو دودھ پلایا۔ ثوبیہ کو ابولہب نے آزاد کر دیا تھا۔

زرقانی حالات رضاعت کا زیادہ وضاحت سے ذیل کی عبارت میں لکھتے ہیں۔

امنہ ارضعہ تسعۃ ایام (صاحب الدرر والغرر) وغیرھما وقیل ثلاثہ ایام وقیل سبعۃ ایام (حَکَاھُمَا الخمیس عن اھل السیر) زرقاری ج ص167

ترجمہ: جناب آمنہؑ آپ کی ماں نے آپ کو کل نو دن دودھ پلایا۔ اس روایت کو صاحب دُرر وغرُر وغیرہ نے لکھا ہے۔ بعض کہتے ہیں کل تین دن دودھ پلایا اور بعض سات دن بتلاتے ہیں۔ ان اقوال کو صاحبان سیرت سے صاحب تاریخ خمیس نے لکھا ہے۔ خوش قسمت ثوبیہ کے حالات کی کس قدر وضاحت کی۔ ابن سعد کی طبقات سے اس طرح ظاہر ہوتے ہیں۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم وھو بمکۃ وکانت خدیجہ تکرمھا وھی یومئذ مملوکۃ فطلبت الی ابی لھب ان نتباعھا فابی ابی لھب فلما ھاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم الی المدینہ اعتقھا ابی لھب وکان رسول اللہ صلعم یبعث الیھا بصلۃ وکسوۃ حتی جاءہ خیرا!انھا مات قد توفیت منۂ سبع مرجعۃ من خیبر فقال مافعل ابنھا مسروح فقیل مات قبلھا ولم یبق من قرابتھا احد۔ طبقات جرمن۔ ص18

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثوبیہ کو برابر صلہ جات عطیات عنایت فرمایا کرتے تھے۔ اور جناب خدیجہؑ اس کی بہت تکریم فرمایا کرتی تھیں۔ ثوبیہ اس وقت تک حالت مملوکیت میں تھی۔ جناب خدیجہؑ نے ابولہب سے کہلا بھیجا کہ ثوبیہ کو ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو مگر ابولہب نے انکار کر دیا۔ مگر جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو ابولہب نے ثوبیہ کو آزاد کر دیا۔ قیام مدینہ کے زمانہ میں بھی آپ وہیں سے روپے پیسے اور کپڑے وغیرہ سے ثوبیہ کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہجرت کے ساتویں سال جب غزوہ خیبر سے آپ مدینہ میں لوٹے تو سنا کہ ثوبیہ مرگئی۔ آپؐ نے پوچھا کہ اس کے بیٹے مسروح کا کیا حال ہوا۔ کہا گیا کہ وہ تو اس سے قبل مر چکا تھا اور اب ثوبیہ کے اقرباء سے کوئی باقی نہیں ہے۔

ثوبیہ کے ایام رضاعت

ثوبیہ کے ایام رضاعت بہت قلیل تھے۔جس کی مدت خاص کسی تاریخ وسیرت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ہاں قلت کا ذکر سب کرتے ہیں۔زرقانی بھی اتنا ہی لکھتے ہیں۔ارضعته ثوبیه ایاما قلائل قبل قدوم الحلیمه ثوبیہ نے حلیمہ کے آنے سے قبل تھوڑے دنوں آپ کو دودھ پلایا تھا۔

حلیمہ سعدیہ کی خدمات رضاعت

ایک دن،دو دن یا ایک ہفتہ خواہ دو ہفتے ثوبیہ کو دودھ پلائے ہوئے تھے۔کہ حلیمہ سعدیہ مکہ معظّمہ میں آئیں اور آنحضرت صلعم کی خدمات رضاعت اس عالی قسمت سے متعلق ہوئیں۔

تاریخ سیر اور حدیث کی تمام کتابوں میں اس کی تفصیل یوں پائی جاتی ہے کہ قدیم الایام سے عرب کے تمام شرفاء اور طبقہ اعلا میں پرورش اطفال کا یہ دستور قائم تھا کہ وہ اپنے بچوں کو خاص کر پرورش پانے کے لیے ان اعراب صحرائی عورتوں کے حوالہ کر دیتے تھے جو ہر سال شہر مکہ میں اسی لیے آیا کرتی تھیں۔اس سے اول مدعا تو بچوں کا کھلے اور صاف ستھری ہوا میں رہ کر پرورش پانا اور صحیح وتندرست رہنا ہوتا تھا۔کیونکہ شہر میں کثرت آبادی کی وجہ سے اکثر وبائی امراض پھوٹ پڑتے ہیں اور دوسرے اس سے زبان کی درستی اور فصاحت وبلاغت کی خاص تعلیم بھی مقصود ہوتی تھی۔کیونکہ عرب میں اس وقت زبان دانی کا علم اور اس کی مشق کمال درجہ تک پہنچی ہوئی تھی اور ہر انسان میں ہر شخص کی نگاہ پہلے اسی جوہر کی متلاشی رہتی تھی اور خاص زبان کی نسبت گویا یہ مانی بات تھی کہ عرب صحرائی کی زبان اہل شہر اور قصباتی باشندگان ملکی زبانوں سے زیادہ شیریں اور شُستہ ہوتی تھیں۔کیونکہ بیرونی الفاظ خارجی محاورات اور اصطلاحات کے اختلاط سے صحرائی زنان بالکل پاک وصاف رہتی تھی اس بناء پر شرفاء اور روساء مکہ میں بچوں کی ابتدائی پرورش کا یہ طریقہ اور تعلیم زبان کا یہ دستور قدیم سے جاری تھا۔مگر میرے نزدیک جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی پرورش میں حفظ وصحت کی ضرورت کو تعلیم زبان کی ضرورت سے زیادہ یقین کرنا چاہیے۔کیونکہ می وگویا بزبان فصیح:۔از الف آدمؑ ومیم مسیحؑ کے اصلی مضمون ومفہوم کو حقیقت کی نگاہوں سے دیکھنے والے اس طریقہ کی تعلیم کو افصح العرب والعجم صلعم کے لیے حسب معمول ضروری نہیں سمجھتے۔ہاں ظاہری اور عملی صورتوں کے مشتاق اس کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ خود آنحضرت صلعم کے اقوال وارشاد سے اس کا ثبوت دیتے ہیں۔لیکن ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ زبان رسالت نے اپنے ارشاد میں بنو سعد کی فصاحت وبلاغت کے اقرار واعتراف سے انا اعربکم انا من قریش (میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں اس لیے کہ میں قریش ہوں) پہلے کہا کہ قریش وہاشم کی زباندانی اور اعلیٰ درجہ کی فصیح وبلیغ ہونے کی خاندانی عظمت ومفاخرت کو اپنے ارشاد میں مقدم رکھا ہے۔ کمالا یخفی علی الناظر

ثوبیہ کے دوران رضاعت میں عرب کے دستور قدیم کے مطابق عورتوں کی مختلف جماعتیں مکہ میں خدمت رضاعت تلاش کرتی

ہوئی آئیں۔اس قافلے میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں۔ان کے شوہر کا نام حارث ابن عبداللہ تھا۔اور عرب کے مشہور قبیلہ ہوازن کی قریبی شاخ بنوسعد سے تھے۔جو عرب میں اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے خاص طور پر مشہور تھا۔اتفاق سے حلیمہ کی تمام ہمراہی عورتوں کو شرفاء اور رؤساء مکہ کے شیر خوار بچے رضاعت کے لیے مل گئے۔مگر حلیمہ غریب کی رضاعت کا کہیں بندوبست نہیں ہوا۔یہ اسی فکر و تلاش میں حضرت عبدالمطلب کے دولت سرا میں آئیں۔جناب آمنہؑ نے اپنے یتیم بچہ کی رضاعت کے لیے انہیں مقرر کرنا چاہا۔مگر پہلے انہوں نے یہ معلوم کر کے کہ یہ بچہ یتیم ہے۔کچھ پس و پیش سا کیا۔لیکن پھر اپنے مطلق معطل رہ جانے کا خیال کر کے اس ودیعت الٰہی کی خدمت رضاعت کو قبول کیا۔اور اس دریتیم کو گلے کا تعویذ بنا کر مکہ سے اپنے مقام و مسکن پر واپس چلی آئیں۔جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم چھ (6) برس تک حلیمہ سعدیہ کے پاس ان کے قبیلہ میں پرورش پاتے رہے۔حلیمہ سعدیہ نے اس رضاعت کی مدت میں یہ دستور قائم رکھا تھا کہ ہر چھ مہینہ کے بعد آپ کو ہمراہ لے کر مدینہ میں آتی تھیں اور اس طرح دو چار روز یا ہفتہ عشرہ ماں، دادا، چچا اور تمام گھر والے اپنے اس گوہر یتیم مرحوم عبداللہؑ کی نشانی سے اپنے دیدہ و دل کو نورانی کر لیتے تھے۔پھر حلیمہ آپ کو اپنے گھر لے جاتی تھیں۔اس طریق سے رضاعت کے دو برس بخیر و خوبی تمام ہوئے۔تو حلیمہ سعدیہ حسب دستور آپ کو جناب آمنہ کے پاس مستقل طور پر پہنچا جانے کے لیے لے آئیں۔اتفاق سے ان دنوں مکہ میں امراض وبائی کی کثرت تھی۔جناب آمنہؑ نے درد مادری کے تقاضہ سے ایسے اضطرابی عالم اور روایت آب و ہوا کے خاص موسم میں آنحضرت صلعم کو گھر رکھ لینا کسی طرح مناسب نہیں سمجھا اور حلیمہ سعدیہ سے صورت حال بیان فرما کر بچہ کو واپس لے جانے کا حکم دیا۔رضاعی ماں کو بچہ کی محبت اصلی ماں سے کم نہیں ہوتی حضرت حلیمہ بھی جناب آمنہ کا یہ عذر معقول سن کر اور تمام شہر کی اضطرابی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ کر از حد متاثر ہوئیں اور فوراً آنحضرت صلعم کو اپنے گھر واپس لائیں۔دو برس کے بعد پھر لا کر پہونچا گئیں۔عبدالباقی زرقانی۔حلیمہ سعدیہ کے گھر میں آپ کی پرورش کے زمانہ کو اسی چار برسوں کی مدت میں تمام کر دیتے ہیں۔لیکن ابن اسحاق اپنی سیرت میں چھ برس کا زمانہ بتلاتے ہیں اور شبلی صاحب ابن اسحاق ہی کے قول کو اپنا نظریہ بناتے ہیں۔جو صحیح نہیں معلوم ہوتا۔کیونکہ زرقانی نے تمام اختلافی اقوال جمع کر کے ان الفاظ میں ان کے اختلاف کا آخری فیصلہ کر دیا ہے۔

الراجح انہ صلعم رجع الی امہ وھو ابن اربع سنۃ

ترجمہ: قول راجح یہی ہے کہ آپ چار برس کے سن میں اپنی والدہ گرامی قدر کے پاس واپس چلے آئے۔

زرقانی ص181۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ نے بنوسعد کے قبیلے میں اپنے پرورش پانے کے زمانے کو ہمیشہ یاد رکھا اور اس قبیلہ کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد فرمایا اور لِسَانِي لِسَانُ بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ (میری زبان قبیلہ بن سعد بن بکر کی زبان ہے) ارشاد فرما کر ان کی اعلیٰ زباندانی کی بھی تصدیق فرمائی۔یہ آپ کے خلق عظیم اور حفظ مراتب کا عین مقتضا تھا۔

حلیمہ سعدیہ کے ساتھ آئندہ محاسن سلوک

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ساتھ مفرط درجہ کی محبت تھی۔ یہ محبت والفت کچھ رضاعی ماں ہی کے ساتھ محدود نہیں تھی۔ بلکہ آپ اپنی تمام رضاعی بھائی، بہنوں کے ساتھ ہمیشہ الطاف واشفاق سے پیش آتے تھے۔ یہ فطرت انسانی کے تقاضے بھی کہے جاسکتے ہیں۔لیکن ہم زیادہ تر ان کو آپ کے خلق عظیم اور لطف عمیم کے خاص محاسن قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ تمام رؤساء اور شرفاء میں ایسے ہی دودھ پلائیاں کثرت سے تھیں۔ مگر عربی مؤرخین جو سینکڑوں برس قبل کے ہر قبیلہ اور عشیرہ کی ذار حالات وواقعات یاد کرنیوالے ہیں۔ اور لکھ کر دنیا کو بتلانے والے۔ وہ بھی کسی تاریخ میں کسی شریف یا رئیس خاندان مکہ کے متعلق مرضعات کے ساتھ ایسے اشفاق تفقد احوال کے کوئی واقعات نہیں بتلاتے ہیں۔

ثوبیہ کے ساتھ جو اشفاق فرمائے گئے وہ اوپر لکھے جاچکے گئے اب ہم اپنے سلسلہ بیان میں حلیمہ سعدیہؓ کے ساتھ جو تکریم وتعظیم یا اشفاق والطاف کہلائے گئے۔ ان کو ہم عرب ماخذوں سے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

استأذنت امرئة علی النبی صلعم قد کانت ارضعة فلما دخلت علیه قال امی امی وعمد الی ردائه فبسطه لها فقعدت الیه (طبقات ج۱ ص۷۱)

ترجمہ: اس عورت نے جس نے آپ کو دودھ پلایا تھا (حلیمہؓ) آپ سے ملنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اذن دیا۔ وہ جونہی آپ کے سامنے آئی۔ آپ میری ماں آپ میری ماں کہہ کر دوڑ پڑے اور فوراً رداء مبارک دوش مطہر سے اتار کر بچھا دی اور اس پر اس کو بٹھایا۔ سرسید مرحوم اپنے الفاظ میں اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم دودھ کے رشتہ کو خون کے رشتے کے برابر سمجھتے تھے اور حضرت حلیمہؓ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اور ان کا ادب اور ان کی تعظیم ماں کے برابر کرتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنی رداء مبارک جس کو مسلمان سر پر رکھتے اور آنکھوں سے لگانے کی لائق سمجھتے ہیں۔ حضرت حلیمہ کے لیے بچھادی اور وہ اس پر بیٹھیں۔ خطبات۔ ص719 لاہور۔

اس واقعہ سے حلیمہ سعدیہ کی جتنی قدر ومنزلت آپ کو مدنظر تھی کما حقہ ظاہر ہوگئی۔ اشفاق والطاف کے متعلق طبقات ابن سعد کا دوسرا واقعہ حسب ذیل ہے۔

قدمت حلیمه علی رسول الله صلی الله علیه واله وسلم بمکة وقد تزوج خدیجة فشکت حدب البلاد وهلاك الماشیة فکلم رسول الله خدیجة فیها فاعتطها اربعین شاة بعیرا موقعا لظیتعته وانصرفت الیٰ اهلها

ترجمہ: حلیمہؓ مکہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں اس زمانہ میں آئیں۔ جب آپ حضرت خدیجہؓ سے شادی کر چکے تھے۔ حلیمہؓ نے قحط پڑ جانے اور مویشیوں کے مرجانے کی شکایت خدمت مبارک میں عرض کی۔ آپ نے ان کی نسبت حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا کہ اس مخدومہ نے چالیس بکریاں اور چالیس تیز رفتار اونٹ مع ہودج کے عطا فرمائے اور وہ ان کو لے کے اپنے اہل وعیال میں چلی گئیں۔

اولاد حلیمہ سعدیہ کے ساتھ محاسن سلوک

یہ تو رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ کے ساتھ اشفاق نبوی کی صورت حال دکھلائی گئی۔ اب رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ اخلاق مصطفوی کی شان ملاحظہ ہو۔

تاریخ وسیر کا اتفاق ہے کہ آپ کے چار رضاعی بھائی بہن تھے یا یہ کہ حلیمہ کی چار اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا تین بیٹیاں ان کے نام یہ ہیں۔ ا۔ عبداللہ ۲۔ انیسہ ۳۔ حذیفہ ۴۔ حذاقہ۔ جو زیادہ تر شیما کے نام سے تاریخوں میں مرقوم ہے۔ طبقات ابن سعد سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا تو ثابت ہوتا ہے۔ باقی اور دو کے حال پر پردہ ہے۔

خذاقہ جو شیما کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ زمانہ رضاعت میں آپ کو کھلاتی تھی اور ہمیشہ آپ کو گود میں لیے رہتی تھی۔ زرقانی نے اس کے حالات کس قدر تفصیل سے لکھے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیما کو آنحضرت صلعم سے خاص محبت تھی اور خاص الفت آپ کے کھلانے کے وقت کا ایک گیت جو شیما کے متعلق زرقانی نے لکھا ہے۔ اس سے بچپن ہی سے اس کی ذہانت اور حقیقت شناسی ظاہر ہوتی ہے۔ زرقانی کے الفاظ یہ ہیں۔

الشیمآء اختہ من الرضاعۃ تحضہ وترقصہ وتقول ھذا اخ لی لم یلدہ امی ولیس من نسل ابی وعمی۔ زرقانی 176 جلد اول

ترجمہ: شیما آپ کی رضاعی بہن تھی۔ آپ کو کھلاتی تھی کوداتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ یہ میرا وہ بھائی ہے جو میری ماں کا زائیدہ ہے اور نہ میرے باپ اور چاچا کی نسل سے ہے۔

ظاہر طور پر اس شعر کے مفہوم سے نفی اخوت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ نفی اور انکار عین اثبات واقرار ہے۔ اگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو اس بدوی لڑکی کا یہ شعر بطور خاص ایک پر لطف معما ثابت ہوتا ہے وہ اس طرح کہ اس نے بظاہر ان سب ذریعوں سے انکار کر دیا ہے جن سے انسان کسی کا بھائی ہوتا ہے۔ لیکن تاہم ھذا اخ لی کہہ کر اس کے بھائی ہونے کا دعویٰ بھی کرتی ہے۔ تو جب ماں، باپ اور چچا کے ذریعے اس کے بھائی ہونے کا رشتہ بالکل منقطع ہو گیا۔ تو اب اس کی صحت دعویٰ کے لیے سوائے رشتہ رضاعت کے

اورکون سا ذریعہ اس کے بھائی ہونے کا باقی رہااور یہ ایسا ہی قوی ذریعہ اور دعویٰ اس کے بھائی ہونے کا ہے جو منجانب اللہ شیما کو اس وقت سے لے کر قیامت تک حاصل ہے۔یہی حقیقت حال ہے اور صورت واقعہ اس ذہین لڑکی کے شعر سے ایک امر خاص کی نفی بھی ظاہر ہوتی ہے اور اثبات بھی۔مگر نفی بالکل ظاہر ہے اور اثبات بڑی خوبی سے مخفی۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو کھلاتے وقت شیما کے کچھ اشعار زرقانی نے لکھیں ہیں وہ یہ ہیں۔

یاربنا اتق اخی محمّدا

حتی اراء بألغاوامر دا

ثم اراہ سید او مسوّدا

والبیت اعادیه معاد الحسد

واعطه عزّاًیدوم ابدا

ترجمہ:ہمارے پروردگار! ہمارے بھائی محمدؐ کو تو سلامت رکھ۔یہاں تک کہ ہم اس کو جوان اور بالغ دیکھ لیں اور پھر اس کو سید وسردار قوم پائیں۔اس کے ساتھ دشمنی اور حسد رکھنے والوں کو ذلیل کر اور اس کو ایسی عزت دے جو ابدالاباد تک قائم رہے۔

امام ازوی شیما کے ان دعائیہ اشعار کی نسبت لکھتے ہیں کہ :ما احسن ما اجاب الله دعاها لجميع ماطلبت (کس خوبی سے خداوند عالم نے شمیا کی تمام دعاؤں کو جو اس نے طلب کی تھی مستجاب فرمایا)۔

ان واقعات سے محقق ہوتا ہے کہ تمام بھائی،بہنوں میں شیما کو آنحضرتؐ کے ساتھ ایک خاص محبت تھی۔شیما کے ساتھ زمانہ نبوت میں جو خالص الطاف واحسانات فرمائے گئے ان کو ہم تاریخ طبری کی عبارت مندرجہ ذیل سے نقل کرتے ہیں۔

شیما کے ساتھ خاص الطاف

ان رسول الله صلی الله علیه واله وسلم قال نجیلة التی بعث ان قدر تم علی یجادرجل من بنی سعد بنی بکر فلا یفلتنکم وکان یجاد قد احادیث حدثا فلما ظفر به المسلمون ساقوه واهله وساقوا اخته شیما بنت الحارث بن عبدالله بن عبدالعزٰی اخت رسول الله صلعم من الرضاعة فعفوا علیها فی السیاق معهم فقالت للمسلمین تقامون والله انی لا خت صاحبکم من الرضاعة فلم

يصدقوا ها حتى اتوا بها رسول الله صلى الله عليه واله وسلم لما انتهى بالشيما الى رسول الله صلعم قالت يارسول اللهﷺ انى اختك قال وما علامة ذلك قالت عضة عضضيتها فى ظهرى وانا متوركنك قال فعرف رسول الله صلعم العلامة فبسط لها رداء ها ثم قال ههنا فاجلسها عليه وخيرها وقال انى اجبت فعندى محبة مكرمه وان احببت امنعك وترجعى الى قومك قالت بل تمنعتنى وتردنى الى قومى فمتعها رسول الله صلى الله عليه واله وسلم وردها الى قومها فزعمت بنو سعد بن بكره كانه الحطاها غلاما يقال له مكحول وجارية فزوجت حداهما الاخر فلم يزل فيهم من نسلهما بقيه طبری جلد 3 ص 1669 مطبوعہ جرمن

ترجمہ: قبیلہ بنی سعد بن بکر پر چڑھائی والے دن جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم عام دیا کہ جب تم قبیلہ بنی سعد بن بکر پر غالب آؤ تو ان پر ایک بار نہ جا پڑو۔ اگر چہ ان کی احداث (زیادتیاں) تم پر کیسے ہی نہ بیان کیے گئے ہوں۔ جب مسلمانوں کو ان پر فتح ہوئی تو مسلمانوں نے تمام اہل قبائل کو گرفتار کیا۔ اُن میں شیماء بنت حارث بن عبداللہ بن عبدالعزی بھی تھیں۔ جو رسول اللہ صلعم کی رضاعی بہن ہوتی تھیں۔ وہ بھی گرفتار ہوئیں۔ ان کے ساتھ کچھ لوگ سختی سے پیش آئے۔ تو شیما نے چلا کر کہا کہ مسلمانوں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ میں تو تمہارے رسول صلعم کی رضاعی بہن ہوں۔ مگر مسلمانوں نے ان کے کہنے پر اعتبار نہ کیا اور ان کو تصدیق کے لیے رسول اللہ صلعم کے پاس لے آئے۔ یزید ابن عبید السعیدی کا بیان ہے کہ شیماء آپ کے پاس لائی گئیں تو انہوں نے آپ کے منہ پر کہا کہ یارسول اللہ صلعم میں آپ کی بہن ہوں۔ آپؐ نے فوراً انہیں پہچان لیا۔ پھر جلدی سے اپنی ردائے مبارک ان کے لیے زمین پر بچھا دی اور ان کو قریب بلا کر ارشاد فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ پھر ان کو بہت کچھ دیا اور ارشاد فرمایا کہ مجھ کو تمہاری محبت وتکریم دل سے منظور ہے۔ اگر تمہاری طبیعت چاہے تو میرے ساتھ رہو اور اگر تمہارا دل نہ چاہتا ہو تو میں تم کو تمہارے قوم وقبیلہ کے پاس واپس کر دوں۔ شیماء نے عرض کی کہ مجھے میرے قبیلہ میں بھیج دیا جائے۔ آنحضرت صلعم نے ان کو اکرام واحترام کے ساتھ ان کے قبیلے کی طرف بھیج دیا۔ بنی سعد بن بکر میں بعضوں کا یہ بیان ہے کہ آپ نے شیماء کو ایک غلام اور ایک لونڈی بھی

دی تھی۔ غلام کا نام مکحول تھا ان میں سے ایک کا بیاہ بھی آخر وقت میں ہو گیا تھا۔ مگر ان کی نسل میں سے کوئی باقی نہیں بچا۔"

یہ تھے اس رحمت عالم کے اشفاق رفیع اور اس لطف مجسم کے اخلاق وسیع جس نے اپنی ایک رضاعی بہن کے ساتھ لطف وایثار کے وہ رعایات ومحاسن سلوک قائم کیے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ رضاعی ماں کے ساتھ جس تکریم وتعظیم کے ساتھ پیش آئے اور جس قدر رعایت وعنات سے ملوک ہوئے وہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ رضاعی بہن کے ساتھ جو رفق ومدارا اور اشفاق واخلاق برتے گئے وہ بھی ابھی ابھی معلوم ہو چکے۔ اب ہم اپنے سلسلہ بیان میں اخلاق نبویہ اور اشفاق مصطفویہ کی اس وسعت وکثرت کو ذیل میں قلم بند کرتے ہیں۔ جو صرف حقوق رضاعت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے تمام قبیلہ ہوازن کے ساتھ قائم فرمائے تھے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

تمام قبیلہ ہوازن کے ساتھ صلائے عام

قدم وفد هوازن على رسول الله صلى الله عليه واله وسلم بالجعفرانه بعد ماقسم الغنائم وفى الوفد عم النبى صلعم من الرضاعة ابوثروان وفى رواية الثانى قال والمتكلم ابوصرد زهير ابن صرد فقال يارسول الله صلعم انا اصل وعشيرة قد اصابنا من البلاء مالايخفى عليك يارسول الله انما فى هذه الخطائر عماتك وخالتك وحواضنك اللاتى هن يكفنك ولوانا ملحنا للحارث ابن ابى شمر والنعمان ابن المنذر ثم نزلا منا بمثل الذى نزلت به رجونا عطفهما وعادتهما وامت خير المكفولين ويقال انه قال يومئذ صردانما فى هذه الخطآئر اخواتك وعماتك وخالتك وبنات عمك وبنات خالتك وابعدهن قريب منك يابى انت وامى انهن حضنك فى حجورهن وارضعناك بثديهن وتوكنك على اوراكهن وانت خير المكفولين فقال رسول الله صلى الله عليه واله وسلم ان احسن الحديث اصدقه وعندى من ترون من المسلمين افابناء كم ونساء كم احب اليكم ام اموالكم فقال يارسول الله صلعم خيرتنا بين احسابنا واموالنا وما كنا ليدعن بالاحساب شيئاً فرد علينا ابنآئنا ونسائنا فقال النبى صلى الله عليه

واله وسلم اماما لی ولبنی عبدالمطلب فهولکھ و اسأ ل لکم الناس فاذا صلیت بالناس اظهر فقولوا اننستشفع برسول الله الی المسلمین والمسلمین الی رسول الله فانی ساقول لکم مالی ولبنی عبدالمطلب فهولکم وسأطلب لکم الی الناس فلما صلے رسول الله صلی الله علیه واله وسلم الظهر قاموا فکلموا اباالذی قال لهم رسول الله صلعم فردعلیهم رسول الله صلعم ماکان له ولبنی عبدالمطلب وردالمهاجرون وردالانصار وسئال لهم قبائل العرب فاتفقوا علی قول واحد بتسلیمهم ورضاهم وردفع ماکان فی ایدیهم من السبی الاقوما تمسکوا بها بمافی ایدیهم فاالحطاهم بلا عوضا ذلك ۔ ج1 ص73

ترجمہ: مقام جعفرانہ میں اموال غنیمت کی تقسیم کے بعد قوم ہوازن کا ایک وفد رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔جس میں ابوثروان جناب رسول اللہ صلعم کے رضاعی چچا بھی تھے۔طبقات کی دوسری روایت میں ابن سعد لکھتے ہیں۔کہ اس وفد میں ابوصرد زہیرابن صرد نامی ایک شخص نے وفد کی طرف سے تقریر کی اور خدمت رسولؐ میں عرض کیا۔کہ ہم آپ کے عزیز وقریب ہیں اور جس بلاء ومصیبت میں گرفتار ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ان گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں آپ کی عمائیں اور خالائیں ہیں اور آپ کی دائیاں ہیں اور کھلائیاں بے چاریاں ہیں۔جنہوں نے آپ کو پالا ہے اور پرورش کی ہے۔اگر ہم لوگوں نے حارث ابن ابی شمر اور نعمان ابن منذر وعرب کے دو مشہور اور نامی یمنی سلاطین کو دودھ پلایا ہوتا اور ان کے زمانہ میں یہ بلاء اور مصیبت ہم پر نازل ہوئی ہوتی جو آج ہم کو پیش آئی ہے۔تو ہم کو ان سے اکرام والطاف کی توقع اور امید ہوتی اور یوں تو آپ بھی ہمارے بہترین کفالت کرنے والے ہیں اور بعض روایتوں میں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابوثرد نے اپنے سلسلہ تقریر میں یہ بھی کہا کہ انہی جھونپڑیوں میں آپ کی رضاعی بہنیں ہیں۔عمائیں ہیں۔خالائیں ہیں۔پھوپھی زاد بہنیں اور خالہ زاد بہنیں ہیں اور ان کے تمام قریب ودور کی رشتہ دار ہیں۔میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یہ وہی مصیبت کی ماریاں ہیں جنہوں نے آپ کو اپنی گودیوں میں کھلایا ہے اور اپنی چھاتیوں سے دودھ پلایا ہے اپنی پہلوؤں میں سلایا ہے اور ہر طرح سے آپ ان کے لیے بہترین کفالت کرنے والے ہیں۔یہ سن کر رسول صلعم نے

ارشاد فرمایا کہ تم نے جو کچھ بیان کیا وہ بالکل صحیح اور فی الواقع ہے۔لیکن تمہارے معاملے میں مجھے عام مسلمانوں سے مشاورت کی ضرورت ہے۔اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اپنی اولاد اور عورتیں زیادہ عزیز ہیں یا اموال و جائیداد۔حاضرین وفد نے جواب دیا کہ جب ہم کو اہل و عیال اور اسباب و اموال کے درمیان تفریق کا اختیار دیا جاتا ہے تو ہم کسی طرح سے اموال و جائیداد یا کسی شئے کے مقابلے میں اپنی نسواۃ و اولاد پر ترجیح دینے سے باز نہیں رہ سکتے تو اس بنا پر ہمارے لڑکے بالے ہمیں واپس دلائے جائیں۔یہ سن کر اور بے حد متاثر ہو کر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا تمہارے اموال میں ہمارا اور تمام بنی عبدالمطلب کا اس وقت تک از روی تقسیم حصہ قائم ہو چکا ہے وہ تمہارا ہو چکا ہے۔میں تمہاری نسبت نماز ظہر کے وقت تمام مسلمانوں سے دریافت کروں گا اور کہہ دوں گا کہ یہ لوگ اپنے معاملے میں مسلمانوں کے پاس رسول اللہؐ کی سفارش لائے ہیں اور مسلمانوں کی سفارش رسول اللہؐ کے پاس۔میں نے ان سے کہہ دیا کہ تمہاے اموال غنیمت میں جو کچھ میرا اور جمیع بنی عبدالمطلب کا حصہ قائم ہو چکا ہے وہ سب تمہارا ہو چکا۔اور میں اس طرح تمام مسلمانوں سے تمہارے لیے درخواست کروں گا۔پس رسالت مآب صلعم نماز ظہر ادا کر چکے تو بنی ہوازن اور بنو سعد کے وفد والے کھڑے ہو گئے۔اور انہوں نے جس طرح سے آنحضرت صلعم سے ہدایت فرمادی تھی۔تمام مسلمانوں کے پاس اپنی درخواست پیش کی۔جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اس وقت تمام اہل اسلام کے سامنے اپنا اور تمام بنی عبدالمطلب کا حصہ ان لوگوں کو واپس دے دیا اور اس طرح تمام مہاجرین و انصار نے بھی اپنے اپنے حصے ان لوگوں کو پھیر دیئے۔اہل عرب کے دوسرے قبائل سے بھی وہ ایسے ہی خواستگار ہوئے۔ان مسلمانوں نے بھی اتفاق کیا اور اپنے حصے واپس دے دیئے۔باقی رہے ایسے لوگ جو اس وقت نقدیات کو صرف کر چکے تھے ان لوگوں نے قیمت لگا کر معاوضہ میں اتنے اونٹ دے دیئے۔

یہ تھے اُس فیاض، سیر چشم، عمیم الاشفاق اور عظیم الاخلاق پیغمبر برحق کے لطف و ایثار اور رعایات و مراعات کہ رضاعت کے معمولی تعلقات اور نسبت کی بنا پر قوم کی قوم قبیلہ کے قبیلہ کے تمام خطا و مفسد سے ایسے معاف کر دیئے گئے جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہ تھا۔نہ لڑنے آئے تھے اور نہ دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔سیرت کے واقعات پکار رہے ہیں کہ وہ تمام قوم ہوازن کی جمعیت جن کی تعداد کئی ہزاروں سے زیادہ تھی۔رسولؐ سے لڑنے آئی تھی اور مسلمانوں کا خون کرنے۔کیا شیما، ابوثر دان اور ابوصرد اور تمام قبیلہ بنو سعد کے دلوں میں مقابلہ و مقاتلہ کے قصد سے نکلنے کے وقت خیال دل میں نہیں آیا تھا کہ ہم کس بزرگ سے لڑنے جاتے ہیں۔یہ تو وہی ہے جس کے ہم

رضاعی چچا ہوتے ہیں اور بھائی۔اور ہماری عورتیں اس کی رضاعی بہنیں، پھوپھیاں اور خالائیں اور پھر وفد میں ان کے بیانات اوران کے اعترافات صاف صاف بتلارہے ہیں کہ وہ ان تعلقات کو اس وقت سے جانتے تھے۔ اوران حقوق فیما بین سے بھی کما حقہ واقف تھے۔لیکن اپنی شامت اور بداعمالیوں سے انہوں نے ہمسایہ قوم مشرکین کا ساتھ دیا

اور جناب رسول خداصلعم کے حقوق کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ یہ ان کا ظرف تھا۔ جناب رسالت مآبؐ ان امور کو جانتے تھے مگر تاہم چشم پوشی فرمائی گئی۔ یہ رحمۃ اللعالمین کی شان تھی۔

حلیمہؓ کے لئے انعام خدمات

رضاعت کی چار سالہ مدت رضاعت تمام ہوگئی اور حضرت حلیمہؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو عالیہ مکرمہ جناب آمنہ سلام اللہ علیہا کی خدمت میں پہونچا گئیں۔ حضرت آمنہ اپنے نونہال کو تندرست اور خوشحال پاکر حلیمہ سعدیہؓ کی خدمات سے جیسی کچھ خوش ہوئی ہوں گی اس کا اندازہ اس وقت بھی اس زمانہ کے والدین باسانی کرسکتے ہیں۔ بنی ہاشم کا قبیلہ ہمیشہ سے فیاض تھا۔ ان کا ایثار خدمت کے انتظار پر موقوف نہیں تھا۔ پھر ایسے گھر میں حلیمہ سعدیہؓ کی خدمت رضاعت کتنی وقعت اور عزت سے دیکھی گئی ہوگی۔ تاریخ الخمیس میں ہے **وجھز حلیمه خیر الجھاز** (حلیمہ کا رخصتانہ انعام سب کے رخصتانہ انعام سے بڑھا ہوا تھا)

حلیمہ سعدیہؓ کا انعام

ابن کثیر شامی لکھتے ہیں کہ حلیمہ قبل اعلان نبوت رحلت کرگئیں۔ مگر جمہور محدثین نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ ابن ابی خثیمہ نے اپنی تاریخ مین ابن جوزی نے حداء میں منذری نے مختصر سنن ابی داؤد میں اور ابن حجر نے اصابہ میں باالاتفاق تصریح کی ہے کہ ابن کثیر کی یہ تحقیق صحیح نہیں۔ مغلطائی نے جو عرب کا قدیم مؤرخ ہے حلیمہ سعدیہ کے اسلام لانے کے متعلق ایک خاص رسالہ لکھا ہے جس کا نام التحفۃ الحسیمه فی اسلام الحلیمهؓ ہے۔

ابن حجر اصابہ فی معرفۃ الصحابہ میں حلیمہؓ کے شوہر ابوذیب حارث ابن عبدالغری کا اسلام لانا بھی ثابت کرتے ہیں اور ان کے ایمان لانے کے متعلق یہ واقعہ قلم بند فرماتے ہیں کہ اعلان نبوت کے زمانے میں حارث ابن عبدالغریٰ جناب رسول خداصلعم کے خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ کی اس دعوت کی نسبت عرب کے تمام اقوام وقبائل میں یہ کیا مشہور ہے۔ آپ نے ان سے مدعائے رسالت بیان کرکے ارشاد فرمایا کہ ایک دن آپ دیکھ لیں گے کہ میں جو کچھ کہتا تھا وہ بالکل سچ نکلا۔ آپ کے انداز استقامت اور طرز متانت نے حارث کے دل پر حقیقت اسلام کا ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ اپنے دل میں کہنے لگے کہ میں اس دن کا انتظار ہی کیوں کروں۔ آج ہی اس دن کا اقرار کرلوں یہ کہہ کر اسی وقت مسلمان ہوگئے۔

طفولیت میں ضبط اوقات اور پاک عادات

مدبر قدرت نے فطرت صالحہ کے اعلیٰ جوہروں سے پیکر رسالت کو مرتب کیا تھا۔ زمان رضاعت اور دورانِ طفولیت سے پاکیزگی، طہارت، احتیاط، ضبط اوقات، تہذیب اور حیاوعفت کے اعلیٰ اور لاجواب محاسن آپ کی عادات وطرز عمل سے پیدا و ہویدا ہوتے تھے۔ جو عموماً بچوں کے طبائع اور عادات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بالکل مخالف تھے یہ خصوصیات تنہا آپ کی عادات ہی سے متعلق نہیں تھیں بلکہ ضروریات روزمرہ میں بھی آپ کی احتیاط پابندی اوقات اور التزام پورے طور سے ظاہر ہوتا تھا۔ اسی وقت سے صبر، سکون، تحمل، استغناء اور قناعت طبع ہمایوں کے خاص جوہر معلوم ہوتے ہیں۔

محدث شیرازی حلیمہ سعدیہؓ کی زبانی لکھتے ہیں۔

حلیمہ رضی اللہ عنہا گوید کہ ہرگزے درجامہ خود بول وبراز درجامہ خود نکردی ہم چنانکہ عادت دیگر اطفال بود، روزمرہ۔ وقتے معین داشت کہ دران وقت بول و غائط کردی وتاردز دیگر تاہمابوقت بران احتیاج نداشتے وروایتے از حلیمہ است کہ گفت ہرگاہ خواستمی کہ وہاں مبارک ویراز شیرپاک کنم یا شست وشود ہم ضرورت نمید یدم واگر عورت دے ظاہر شدے۔ بغضب رفتی وفریاد کردے ناچامی پوشید می۔ وروایتے آںست از حلیمہ رضی اللہ عنہا کہ گفت چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم برفتار آمد کودکان را میدید کہ بازی میکر دند ازایشان دوری می جست وایشان راازبازی کردن منع می کرن ومیگفت مارابرائے بازی کردن نیافریدہ اند۔ حلیمہ رضی اللہ عنہا گوید کہ گریہ بدخوئی وبدخلقی نداشت وبدست چپ ہیچ چیزرا فرنگو فتی۔ بدست راست بستدی ۔حلیمۃ رضی اللہ عنہا گوید کہ روزے از رروز ہا پامن گفت یا اماہ۔ چوں است کہ باوران مارا بروز یمنی بینم گفتم جانمن فدائے تو بادایشان میروند کہ گو سفندان مراچرانند۔ بامد اور می روند وشبانگاہ باز می آئند گفت مرا این جا تنہا می گذاری وبایشان مرانیمفرستی۔ کہ من نیز باید کہ کارے بکنم۔ روضۃ الاحباب

جلد اول ص 90

ترجمہ: حلیمہؓ کہتی ہیں کہ اس وقت سے کہ آپ کی پاکیزگی طبع کا یہ عالم تھا کہ کہیں آپ نے روزمرہ کے کپڑوں میں عام بچوں کی طرح رفع حاجت نہ فرمائی۔ وقت کی پابندی اور احتیاط کا اسی زمانے سے یہ حال تھا کہ رفع حوائج ضروریہ کے لیے وقت خاص مقرر تھا۔ اس وقت رفع حاجت فرمائی جاتی تھی اور پھر روز آئندہ کے وقت مقرر تک اس کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مجھ کو رفتہ رفتہ روز کے مشاہدے سے اس کا پورا علم و تجربہ ہو گیا اور میں روزمرہ وقت مقررہ پر آپ کی ان ضروریات کو انجام دے دیا کرتی تھی۔ حیا و عفت کا بچپن سے ہی یہ عالم تھا کہ اگر میری غلطی اور غفلت سے اگر کسی وقت آپ کا کشف ستر ہو گیا تو اس حیائے مجسم اور ناموس الٰہی محرم پر غیض و غضب کا ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا اور شرم و حیا کے وفور سے آپ فوراً رونے لگتے تھے۔ میں رونا سن کر دوڑ پڑتی تھی اور کپڑا ڈال دیتی تھی یا اوڑھا دیتی تھی۔ عام بچوں کی طرح رونا، دودھ کے لیے مچلنا، میں نے رضاعت کے دوسالہ ایام میں کبھی نہ دیکھا۔ کبھی آپ نے کوئی چیز بائیں ہاتھ سے نہیں اٹھائیں۔ ہمیشہ سیدھے ہاتھ سے کام لیا۔ رشد و تمیز کا یہ عالم تھا کہ مجھ کو ہمیشہ ارمان رہا کہ وہ پلانے کے بعد عام بچوں کی طرح آپ کے دہان مبارک کو رومال سے پاک کر دیا کروں کبھی اس کی مجھے ضرورت ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس انداز و احتیاط سے دودھ پیا جاتا تھا کہ زیادتی مقدار کا کوئی اثر لب مظہر پر ظاہر نہیں ہونے پاتا تھا۔ حلیمہؓ کا یہی بیان ہے کہ جب آپ کو طاقت رفتار آ گئی تو آپ نے جب کبھی لڑکوں کو باہر کھیلتے ہوئے پایا۔ ان سے بخلاف فطرت کنارے ہو گئے۔ ان کو ہمیشہ کھیلنے کودنے سے منع فرماتے تھے اور ارشاد کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو کھیلنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ حلیمہؓ یہی کہتی ہیں کہ آپ نے ایک دن مجھ سے استفسار فرمایا کہ ہمارے بھائیوں کو آپ کہاں روز بھیج دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ میں ان کو دن بھر گھر میں نہیں دیکھتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ میری جان آپ پر فدا ہو وہ گھر کی بھیڑیں جنگل میں چرانے جایا کرتے ہیں۔ ہر روز سویرے صبح کو گھر سے بھیڑیں لے کر نکل جاتے ہیں دن بھر جنگل میں بھیڑیں چراتے ہیں اور شام کے وقت ہر روز گھر چلے آتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی انہیں کے ساتھ آپ کیوں نہیں بھیج دیا کرتیں۔ مجھے ہی کچھ کام کرنا ہے۔

ام ایمنؓ آپ کی مرضعہ (دودھ پلائی) تو تھی نہیں۔لیکن محصنہ (کھلائی) ضرور تھیں بیان کرتی ہیں۔

ام ایمن رضی اللہ عنہا گوید کہ ہرگز ندیدم کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از گرسنگی و تشنگی شکایت کردے۔ چوں باامداد شدے یک شربت آب زمزم بخوردی و تاشب ہیچ ناطلبیدے وبسیار بود کہ طعام چاشت برد عرض می کردم و او می گفت مرا رغبت بطعام نیست۔ روضۃ الاحباب ص 95

ترجمہ: ام یمنؓ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی آپ کو بھوک اور پیاس کی شکایت کرتے ہوئے نہیں سنا۔ ہر روز کا معمول تھا کہ میں آب زمزم کا شربت تیار کر کے دے دیتی تھی آپ پی لیتے تھے۔اور پھر شام تک کچھ بھی نہ مانگتے تھے۔اکثر میں طعام چاشت (ناشتہ) تیار کر کے حاضر کرتی تو ارشاد فرماتے کہ مجھ کو بھوک نہیں۔

یہ صبر، استغناء،قناعت اور زہد وتوکل کا دیباچہ مشق وریاضت تھا۔

نبوت کی قوت ارتقاءونمو

جوہرقدسیہ نے آپ کی قوت نامیہ میں اس قدر ارتقاء پیدا کر دیا تھا جو نبوت کی خصوصیت کو عام فطرت انسانی کی عمومیت سے بالکل علیحدہ ثابت کرتا ہے۔زرقانی اپنی شرح میں اس کی مفصلہ ذیل کیفیت وحقیقت بیان کرتے ہیں۔

انه صلى الله عليه واله وسلم لما صارا ابن شهر ين لان يتز خلف الصبيان الى كل جانب وفى ثلاثة اشهر كان يقوم على قدميه وفى اربعة كان يمسك الجدار ويمشى وفى خمسة حصل له القدرة على المشى ولما تم له ستة اشهر كان يسرع فى المشى وفى سبعة اشهر كان يسعئ ويغدوا الى كل جانب ولما مضى له ثمانية اشهر شرع يتكلم بكلام الفصيح وفى عشرة اشهرير فى السهام مع الصبيان۔زرقانی ج1ص 179

ترجمہ: جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم دومہینوں کے ہوئے تو بچوں کے پیچھے ہر طرف گھٹنوں چلنے لگے۔جب تین مہینوں کے ہوئے تو دونوں پاؤ سے زمین پر کھڑے ہونے لگے۔پانچویں مہینے آپ کو رفتار کی طاقت آ گئی۔چھٹے مہینہ رفتار میں سرعت کی قوت پیدا ہوگئی۔ساتویں مہینے آپ اچھی طرح ہر

طرف اپنے پاؤں سے چلنے پھرنے لگے اور جب کامل آٹھ مہینے کے ہو گئے تو آپ صفائی سے بولنے لگے۔ اور دسویں مہینے آپ بچوں کے ساتھ تیراندازی کرنے لگے۔ زرقانی ج اول ص 179

اقامت بنی سعد کے زمانے کا یہ واقعہ طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے۔

انه كان يخرج هو اخوه فيلعب مع الغلمان فينجمتهم عليه السلام وياخذبيد اخيه ويقول انالم يخلق لهذا

جب آپ کا رضاعی بھائی آپ کو ہمراہ لے کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے لے جاتے تھے اور کھیلنے لگتے تھے۔ تو آپ اپنے رضاعی بھائی کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ ہم اس کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔

ابھی سے اپنے وجود ذیجود کی اتنی کامل معرفت تھی۔ ایسا ہی حلیمہ سعدیہؓ سے یہ فرمانا کہ ہمیں بہن بھائیوں کے ساتھ بھیج دیا کیجئے۔ کیونکہ ہم کو بھی کچھ کام کرنا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ آپ کی سعی وریاضت کا مقدمہ تھا۔ حسنت جمیع حصاله۔:۔ صلو علیه واله

اوپر لکھا جا چکا ہے۔ کہ بنی سعد کے قبیلہ میں آپ کے چار سالہ ایام طفولیت تمام ہو گئے گو یا پانچویں برس کے آغاز سے اپنے خاص بیت الشرف کی طرف سعادت فرمائی۔ اور پھر چھ برس کے سن تک اپنی والدہ گرامی قدر کے دامن عاطفت میں پرورش پاتے رہے مگر مصلحت ایزدی نے اس زمانہ پرورش کو زیادہ دیر پا نہ رکھا۔ کل دو ہی برس کے بعد اس کی مدت تمام ہو گئی۔ عالیہ مکرمہ جناب آمنہ سلام اللہ علیہا نے مدینہ منورہ سے معاودت ہوتے ہوئے مقام ابوا میں انتقال فرمایا۔ ابن ہشام اور ابن سعد نے اس کی تفصیل مفصلہ ذیل عبارت میں لکھی ہے۔

ان أم رسول الله صلى الله عليه واله وسلم اٰمنة بنت وهب توفيت فرسول الله صلى الله عليه واله وسلم ابن ست سنين بألا بوابين مكة والمدينة وكانت قد قدمت به على اخواله من عدى بنى النجار بزيره اياهم فما تت وهى راجعة به الى مكة۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادر گرامی شان حضرت آمنہؑ بنت وہب نے جب آنحضرت صلعم کا سن کل چھ برس کا تھا۔ بمقام ابوا رحلت فرمائی۔ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ جناب آمنہ سلام اللہ علیہا اپنے ننہالی عزیزوں سے ملنے کے لیے مدینہ تشریف لے گئیں تھیں۔ وہاں سے رخصت ہو کر

مراجعت فرماتے وقت انتقال فرما گئیں۔

ابن سعد نے ابن ہشام سے زیادہ تفصیل سے آپ کے واقعہ وفات کو لکھا ہے۔ ان کی اصلی عبارت یہ ہے۔

ثم رجعت به امه الى مكة فلما كانوا بالا بوا توفيت امه امنه بنت وهب فقبرها هناك فرجعت به ام ايمن على البعير بن اللذين قدموا عليهما الى مكة كانت تحصنه مع امه ثم بعد ان ماتت۔ طبقات ص 77

آنحضرت صلعم اپنی مادر گرامی کے ساتھ مکہ لوٹے۔ جب مقام ابوا پہنچے تو آپ کی والدہ ماجدہ جناب آمنہؑ بنت وہب نے انتقال کیا اور وہیں مدفون کر دی گئیں۔ ام ایمن آپ کو لے کر انہیں دونوں اونٹوں پر مکہ واپس آئیں۔ جن پر سوار ہو کر مکہ سے مدینہ گئی تھیں ام ایمن حیات اور بعد وفات حضرت آمنہ کے بھی آں حضرت صلعم کو کھلاتی رہیں۔

ان دونوں عربی مؤرخین نے حضرت آمنہؑ کے مدینہ جانے کی وجہ ننہالی اقربا سے ملاقات بتلائی ہے۔ مگر ہمارے ہندی محقق شبلی صاحب نے حضرت عبداللہؑ کی قبر مطہر کی زیارت کو اس سفر کا خاص مدعا بتلایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں توجیہیں قلبی تعلقات کا پورا پتہ دیتی ہیں۔ مگر ہمارے شبلی صاحب کی توجیہہ تعلق کی مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے ضرور ترجیح کے قابل ہے۔

تاریخوں سے مستفاد ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مادر گرامی قدر کے ساتھ مدینہ میں کل ایک مہینہ قیام فرما رہے تھے۔

ماں کی قبر کی زیارت

واقعہ مندرجہ بالا کے ساتھ مشاہدات تاریخی یہ بھی بتلاتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نورانی دل میں اپنی والدہ گرامی شان کی ہمیشہ یاد زندہ تھی۔ اور ان کی مفارقت کے بعد اشفاق مادری کے آثار ویسے ہی تازہ تھے۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

فلما امر رسول الله صلعم فى عمرة الحديبية بالابوا قال ان الله قد اذن لمحمد فى زيارة قبر امه فاتاه رسول الله صلعم فاصلحه وبكى عنده وبكى المسلمون لبكآء رسول الله صلعم فقيل له فقال ادركتنى رحمتها فبكيت۔ ص 73

ترجمہ: عمرہ حدیبیہ کے بعد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام ابواء پہنچے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی والدہ گرامی قدر کی قبر کی زیارت کے لیے خدا کی طرف سے مجاز و ماذون کیا گیا ہوں یہ فرما کر آپ ان

کی قبر مطہرہ پر تشریف لے گئے اور ان کو نیکیوں کے ساتھ یاد کیا۔ اور اشکبار ہوئے آپ کو روتا دیکھ کر تمام اہل اسلام بھی رونے لگے۔ آپ سے سبب گریہ دریافت کیا گیا تو ارشاد فرمایا کہ مجھے اشفاق و مراحم یاد آ گئے ہیں اور میں بے اختیار ہو کر رو پڑا۔

حضرت عبدالمطلبؑ کی کفالت

اس میں کس کو اعتراض ہوسکتا ہے کہ اتنی صغرسنی کے زمانہ میں ماں سے مفارقت آنحضرت صلعم کے لیے سخت ترین مصیبت ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن حضرت عبدالمطلب کی شفقت دردمندی نے اس ودیعت وخداوندی کو فوراً اپنے کارہ عاطفت میں اٹھالیا۔ اور کیوں کر نہ اٹھاتے جناب عبدالمطلب اپنے جوانمرد صاحبزادے عبداللہ کے بعد اس دریتیم کو ان کا نعم البدل جانتے تھے اور جناب آمنہؓ کی حیات تک آپ کی پرورش و آرام رسانی کی طرف سے آپ کو گونہ اطمینان حاصل تھا۔ ہاں ان کے انتقال کر جانے کے بعد باوجود اس کے کہ آپ کی عمر اسی برس کی ہوچکی تھی اعصاب و جوارح جواب دے چکے تھے۔ متعدد جوان بیٹے اور ان کے جوان بال بچے بھی موجود تھے۔ تمام گھر بھرا پڑا تھا ممکن تھا کہ پیرانہ سالی کے عذر معقول کے باعث سے حضرت عبدالمطلب یتیم عبداللہ روحی لہ الفداہ کی پرورش و پرداخت ان کے کسی چچا سے متعلق کر دیتے اور آپ آرام کرتے۔ مگر نہیں۔ اس ضعف ونقاہت کے عالم میں بھی آنحضرت صلعم کی تمام خدمات اپنے ذمہ لی گئیں۔ جناب عبدالمطلب کو ان کی پرورش و پرداخت میں بڑی آسانی اور سہولیت مادر حضرت حمزہؓ کی جہت خاص سے حاصل ہوئی۔ جو حضرت آمنہؓ کی اپنی چچازاد بہن تھیں۔ اور ان دونوں خواتین باتمکین کی بیک وقت شادی ہوئی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

ان تمام قرائن و ذرائع پر غور کرنے کے بعد بھی یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ پرورش و حفاظت جان رسولؐ کی ایسی مہتم بالشان خدمت ان تعلقات ظاہری سے زیادہ مشیت کے نظام حقیقی سے متعلق تھی۔

یہ مسلم ہے کہ حضرت عبدالمطلب کو حضرت عبداللہ سے بمقابلہ اور فرزندوں کے مفرط درجہ کی محبت تھی۔ کیونکہ اصغر اولاد تھے اور فطرت انسانی کے اعتبار سے باپ کے سب سے زیادہ محبوب پھر ایسے محبوب ترین فرزند کا چشم و چراغ ایسے پارہ جگر کا نام ونشان کیوں کر تمام گھر سے زیادہ عزیز نہیں ہوسکتا ہے۔ اور پھر وہ بھی بذاتہ ایسا کہ اس کا دوسرا نعم البدل ممکن نہیں۔ باپ ولادت سے پہلے اُٹھ چکا۔ ماں بچ گئی تھی۔ وہ کل چھ برس کا چھوڑ کر گذر گئی۔ حقیقتاً یہ مصائب ایسے تھے جو بے واسطہ اور غیر سروکاری اشخاص کو بھی ایسے یتیم بے امان بچے کے ساتھ دلسوزی اور ہمدردی کی توجہ دلاتے ہیں۔ نہ یہ کہ صرف اس بزرگوار کو جو اپنی جان اور اپنے تمام خاندان سے اس کو زیادہ عزیز رکھا ہو۔ ابن سعد نے اپنے ایک جملہ میں ان تمام مدعا کو تمام کر دیا ہے وہ یہ ہے۔

فلما توفیت قبضة الیه جده عبدالمطلب ووضمة ورق علیه رقة لم یرق علیها

على ولده وكان يقربه منه ويدنيه ويدخل عليه اذا خلا واذا نام

ترجمہ: جناب آمنہؑ نے وفات پائی تو رسالت مآب صلعم کی پرورش و پرداخت کے تمام امور حضرت عبدالمطلب سے متعلق ہوئے اور حضرت عبدالمطلب نے اپنے محاسن اشفاق کے وہ مسالک آپ کے ساتھ اختیار فرمائے جو اپنی کسی اولاد کے ساتھ بھی نہیں ظاہر فرمائے تھے۔ تمام گھر والوں میں اس وقت قریب ترین عزیز و عزیز ترین یہی تھے۔ خلوت و جلوت میں آپ کو برابر ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اور آپ کے ساتھ سویا کرتے تھے۔ طبقات ص75

عرب کی قدیم تہذیب تھی کہ وہ کسی بزرگ خاندان کے برابر تعظیماً کسی عام یا خاص مجلس میں نہیں بیٹھتے تھے۔ اس قدیم آداب معاشرت کے خلاف ورزی کے اظہار پر اس کے عام کو عام اس سے کہ وہ کسی مایہ یا پایہ کا کیوں نہ ہو نہایت حقارت و نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس قومی دستور و اداب کے وہ اس قدر پابند تھے کہ غیر ممیز اطفال تک کو بھی ان اقسام کی جرأت کرتے ہوئے دیکھ کر چشم پوشی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کو اداب مجلس اور طریقہ نشست و برخاست بتلا دینے کی ضرورت سے فوراً متنبہ اور آگاہ کر دیتے تھے۔ اور ان کا یہ قدیم دستور، ان کا یہ قومی آداب اقطاع میں کم و بیش تمام قوموں کی تہذیب و معاشرت میں آج تک داخل ہے۔

قدیم آئین تعظیم سے رسول خداؐ کا استثناء

جناب عبدالمطلب نے اپنے جگر گوشہ یتیم عبداللہ کو اس قیود سے بالکل مستثنیٰ فرما دیا۔ ذیل کا واقعہ اس کا شاہد ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے۔

كان رسول الله صلعم مع جده عبد المطلب ابن هاشم وكان يوضع لعبد المطلب فراشه في ظل الكعبة فكان نبوه يجلسون حول فراشه ذلك حتى يخرج اليه لا يجلس عليه احد من بنيه اجلالاً له قال فكان رسول الله صلى الله عليه واله وسلم ياتي وهو غلام حقير حتى يجلس عليه فياخذا عمامه ليوخروه عنه فيقول عبد المطلب اذا رئ ذلك منهم دعو ابني فو الله ان له لشاناً ثم يجلسه معه عليه و يمسح بظهره بيده ويسره ما يراه يصنع۔ ابن هشام مطبوعه مصر ص57

ترجمہ: جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جد بزرگوار حضرت عبدالمطلب کی کفالت میں تھے۔ ایک بار ایک قومی مجلس کی ترتیب دی گئی تھی اور زیر کعبہ مشرفہ عبدالمطلب کے لیے جو اس زمانہ میں امیر مکہ اور متولی

خانہ کعبہ تھے ایک فرش خاص بچھایا گیا تھا اور آپ کی تمام اولاد وفرزندان اپنے اعزازی مراتب ومناصب کے لحاظ سے اس فرش کے دور میں چاروں طرف بیٹھے تھے اور صدر میں حضرت عبدالمطلب کے لیے خاص جگہ چھوڑی تھی۔ اوران کے ذاتی عظمت کے اعتبار سے آپ کے خاص فرزندوں میں سے بھی کوئی صاحب اس مقام خاص پر بیٹھنے کے مجاز نہیں تھے۔ حسن اتفاق سے جناب رسالت مآب ﷺ تشریف لائے۔ اس وقت تک کم سن بچے بھی تشریف لاتے ہی سیدھے اپنے جد بزرگوار کے مقام پر جا بیٹھے۔ آپ کے چچاؤں نے اٹھ کر آپ کو تھام لیا اور اپنے پاس بٹھلا لینا چاہا۔ اسی اثناء میں حضرت عبدالمطلب آ گئے اور یہ کیفیت دیکھ کر اپنے بیٹوں سے کہنے لگے کہ میرے فرزند کو کیوں روکتے ہو۔ چھوڑ دو۔ خدا کی قسم اس کے لیے ایک شان خاص ہے۔ یہ کہہ کر آپ جناب رسالت مآب ﷺ کو لے کر اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ اوران کے پشت مبارک پر اپنا دست شفقت پھیرنے لگے اور جو دل شکنی آپ کی ہوئی تھی اس کی نسبت تشفی ودلجوئی فرمائی۔

ظاہر میں تو اس واقعہ سے حضرت عبدالمطلب کے انتہائی اشفاق ظاہر ہوتے ہیں۔ جو موجودہ سلسلہ بیاں کا اصلی مدعا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ واقعہ نظام قدرت کی طرف سے مراتب رسالت کی معرفت کا مقدمہ ہے۔

دعائے استسقاء میں رسولؐ کی شرکت

ہم اپنے موجودہ سلسلہ بیان میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے متعلق بالترتیب وتفصیل وہ تمام واقعات لکھیں گے جو حضرت عبدالمطلبؑ کے زمانہ حیات میں واقع ہوئے۔ اسی سلسلہ میں دعائے استسقاء کا بھی ایک واقعہ ہے۔ جس میں جناب رسول خداصلعم کی شرکت برکت معلوم ہوتی ہے۔

عن قیقۃ بنت ابی صیفی بن ھاشم بن عبدمناف قالت تنابتت علی قریش سنون ذھبن بالاموال واشفین علی الانفس قالت فسمعت قائلاً یقول فی المنام یا معشر قریش ان ھذا النبی المبعوث منکم و ھذا ایان خروجہ وبہ یاتیکم الحیا والخصب فانظروا رجلا من اوسطکم نسباً طولا عظاما ابیض مقرون الحاجبین اھدب الا شفا رجعدد اسھل الخدین رقیق الغرنین فلیخرج ھو و جمیع ولدہ ولیخرج منکم من کل بطن رجل فتطھروا وتطیبوا ثم اسلمو الرکن

ثم ارقوا راس الى قبيس ثم يتقدم هذ الرجل فيستسقے وتومنون فانكم ستسقون فاصبحت فقصت روياها عليهم فتظروا فوجدواهده الصفة صفة عبدالمطلب فاجتمعوا عليه وخرج من كل بطن منهم رجل ففعلوا ما امرتهم به ثم علوا على ابو قبيس ومعهم النبى صلعم وهو غلام فتقدم عبدالمطلب وقال لاهّم هولآء عبيدك امائك وبنات اماتك و قدنزل بنا ما ترى وتتابعت علينا هذه السنون فذهبت بالنطلف والخف و اشقت على الانفس فاذهب عنا الحدب وائتنا بالحياء والخصب فما برحوا حتى سالت الا ودية و رسول الله صلى الله عليه والة وسلم سقوا ص 52۔

ترجمہ: رقیقہ بنت ابی صیفی ہاشم بن عبدمناف کا بیان ہے کہ ایک بار مکہ میں متواتر کئی برسوں تک قحط پڑتا رہا ۔نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں کے مال واسباب تلف ہو گئے اور بالاخر جانوں کے جانے کی نوبت آئی۔انہیں ایام میں مَیں نے ایک شخص کوخواب میں یہ کہتے سنا کہ اے قوم قریش نبیؐ زمانہ تو پیدا ہو چکا ہے اوراس کے ظہور کا وقت بھی قریب پہنچ گیا ہے۔جس کی برکت سے تمہیں فراغت خوشحالی نصیب ہوگی۔تم لوگ ایک ایسے آدمی کوتلاش کرو جوتم میں شریف النسل ہواس کے بدن کی ہڈیاں لمبی ہوں۔جس کی جلد بدن پر دہائی چشم کے پاس چمکدار ہو جسے آگے سر کے بال کم ہو گئے ہوں۔دونوں رخسار ہموار ہوں بھویں قریباً جتی ہوں اور دونوں ابرو تک ناک بریک ہوا یسے آدمی سے کہو کہ اپنی تمام اولا دواحفاء ساتھ لے کر باہر نکلے اور تم میں سے بھی ہر قبیلہ اور ہر عشیرہ کا ایک آدمی اس کے ساتھ ہو پہلے تم لوگ غسل کرو۔ پاک وپاکیزہ ہو۔خوشبولگاؤ اور رکن کعبہ کا استلام بجالاؤ۔اس کے بعد کوہ ابوقبیس کی چوٹی پر چڑھ جاؤ۔اوراس شخص کو اپنا پیشوا بناؤ اور اس سے کہو کہ پانی برسنے کی دعا کرے یقین رکھو کہ اسی تدبیر سے تم لوگ ضرور سیراب ہوں گے۔رقیقہ کا بیان ہے کہ صبح کو اٹھ کر میں نے اپنا خواب بیان کیا۔سب نے مل کر اس پر غور کیا اور پھر تلاش وفکر کے بعد حضرت عبدالمطلب کو ان صفات سے موصوف پایا۔تمام قبائل وعشائر کے لوگ آپ کے پاس جمع ہوئے۔صورت حال عرض کی۔ یہ فوراً مستعد ہو گئے۔پھر تمام لوگوں نے مل کر مراسم ولواز مذکورہ انجام دیئے اور حضرت عبدالمطلب ،ان کو اور تمام اولاد کو ساتھ لیکر کوہ ابوقبیس کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھ

گئے۔ اور انہی بزرگواران کے ساتھ جناب رسالت مآب ﷺ بھی تھے اور آپ اس وقت کمسن تھے۔ جماعت موجودہ کی اقتداء حضرت عبدالمطلب نے کی اور دعائے استسقاء ان الفاظ میں ادا فرمائی۔ یہ جماعت کے جماعت تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کی عیال۔ تیری کنیزیں ہیں اور تیری کنیزوں کی اولاد۔ جو مصیبت ہم لوگوں پر پڑی ہے وہ تجھ پر ظاہر ہے۔ ہم لوگوں پر گذشتہ کئی برسوں سے آفت پر آفت ہے اور تباہی و پریشانی اور اب تو ان کی جانوں پر آبنی ہیں۔ الٰہی اب اس مصیبت کو ہم پر سے اٹھالے اور ہم کو خوشحالی اور وسعت رزق عطا فرما۔ رقیقہ کا بیان ہے کہ قوم قریش کو کچھ نہیں نصیب ہوا تھا۔ وقتیکہ کہ اس تدبیر سے جماعت کی جماعت نے درگاہ رب العزت میں دعا نہیں کی اور جناب رسالت مآب ﷺ کی برکت سے سب کے سب سیراب ہو گئے۔ طبقات ابن سعد جلد ا ص ۵۲ مطبوعہ جرمن

اس واقعہ سے جہاں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے قدوم ممنیت لزوم کی برکت وسعادت ثابت ہوتی ہے۔ وہاں حضرت عبدالمطلب کی ذاتی وجاہت وعظمت کا بھی اظہا کامل ہوتا ہے۔ آپ کی اس وجاہت واقتدار کا یہ مرتبہ نہ صرف اس لیے تھا کہ آپ مکہ کے رئیس تھے اور قریش کے سردار بلکہ اس شہرت عامہ اور اعتبار واختیار کے باعث آپ کی خاص اخلاقی ایثار وآثار تھے۔ جو آپ کی ذات ستودہ صفات کو ممدوح روزگار بنائے تھے۔

ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

كان عبدالمطلب حسن قريش وجها وامده جسما وحلمه علما واجوده كفاًوابعدالناس من كل موبقة تقند الرجال ولم يره ملك قطالا كرامه وشفعه وكان سيد قريش حتى هلك فاتاه نفر من خزاعه فقالوا نحن قوم متجاورون فى الدراهم فلنحائفك فاجابهم الى ذالك واقبل عبدالمطلب فى سبعة نفر من بنى عبدالمطلب والارقم ابن فضله بن هاشم والضحاك وعمر ابن صيفى بن هاشم ولم يحضره من بنى عبد شمس ولا نوفل فدخلوا دارالندوة فتحالفوا فيها على التناصر والمواساة وكتبوا بينهم كتاباً وعلقواه فى الكعبة ص 51۔

ترجمہ: حضرت عبدالمطلب باعتبار ذاتی وجاہت کے تمام قریش میں وجیہہ ترین بزرگ تھے اور جسامت کے لحاظ سے سب سے زیادہ جسیم اور طویل، حلم وتحمل میں سب سے بڑھ کر حلیم۔ جود وسخاوت میں سب

سے زیادہ سخی وکریم۔فتنہ وفساد کوموقع پرسب سے دور رہنے والے جو دیکتا تھاوہ آپ کی تعظیم وتکریم کرتا تھا اورآپ کی ہدایتوں کو بجالاتا تھااور سلاطین ومعاصرین میں قبیلہ قریش کی امارت مادام الحیات آپ سے متعلق رہی۔ایک بار بنی خزاعہ کے لوگ آپ کی خدمت میں آکر کہنے لگے کہ آپ ہم لوگوں کو اپنا حلیف بنا کر اپنی پناہ میں لے آئیں آپ نے فوراً ان لوگوں کی استدعا کو قبول کرلیا اور بنی عبدالمطلب میں سے سات آدمیوں کو لے کراورارقم بن نصفہ بن ہاشم اورضحاک وعمر پسران ابی صیفی بن ہاشم کوبھی ان میں شامل کر کے دارالندوۃ میں تشریف لائے۔اس معاہدہ میں بنی عبدالشمّس (امیہ)اور بنی نوفل میں سے کوئی فرد واحد شریک نہ ہوا۔دارالندوۃ میں جانبین سے مواسات وحمایت کی باہمی معاہدے لکھے گئے اور دستور قدیم کےمطابق کعبہ میں آویزاں کردیئے گئے۔

بنی ہاشم کے یہ وہ حقیقی معارف ہیں جوقدیم سے ان کے اخلاقی اعزاز وامتیاز کی خصوصیات میں داخل ہیں اور یہ وہی مفاخر ہیں جوتمام قریش کیا تمام قبائل عرب پران کی تفصیل وترجیح کے سچے معیار ثابت ہوتے ہیں اور یہ تمام صفات ومحاسن جس طرح قصٰی کو اپنے وقت میں ہاشم کواپنی زمانہ میں حاصل تھے اسی طرح عبدالمطلب کواپنے عہد میں قدرت کی طرف سے بدرجہ اولیٰ حاصل تھے۔ بدرجہ اولیٰ اس لیے کہ ان تمام محاسن وصفات سے آراستہ وپیراستہ بزرگوار کے متعلق شہنشاہ رسالت کی کفالت ومتمم نبوت کی حفاظت بھی سپرد ہونے والی تھی۔

وفات حضرت عبدالمطلب علیہ السلام

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس کفالت وحفاظت کا زمانہ کل چار ہی برسوں میں تمام ہو گیا۔ حضرت عبدالمطلبؑ بوڑھے تو ہو ہی چکے تھے۔ شیوخیت سے گذر کر کہوتیت کا وقت آ ہی گیا تھا۔ بیاسی برس کی عمر ہو چکی تھی۔ بیمار پڑے۔ ضعیف تو تھے ہی ضعف اور علالت دنوں ملکر مرض الموت بن گئے۔ وفات کا وقت قریب ہوا تو باوجود کہ تمام عرب میں اکثر الاولاد مشہور تھے۔ ابن سعد لکھتے ہیں۔ فلم یکن فی العرب بنو اب مثل عبدالمطلب۔ عرب میں عبدالمطلب کے ایسے کسی باپ کی اولادیں نہیں تھیں۔ اس لیے محض تعلقات قلبی کی بنا پر ایسے بڑے خاندان کے بزرگ کی آنکھوں کے سامنے اس کے بستر مرگ پر اپنی اولاد وا حفا میں سے ایک ایک کی صورت میں موجود رہنی چاہیے۔ لیکن اس فطرتی جذبات کے برخلاف دو بزرگ خاندان اپنی اتنی کثر اولاد میں سے نہ کسی فرد احد کو بلاتا ہے۔ نہ یاد کرتا ہے اور نہ ان کے متعلق کوئی وصیت فرماتا ہے ہاں ایک ہشت سالہ بچہ کی یاد تعلقات اس کو ایسا بے چین اور مضطرب الحال کیے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتا ہے یا وصیت کرتا ہے وہ صرف اسی کے لیے اور کسی کے لیے بھی نہیں۔ اس طرح کہ اپنے قائم مقام اور اپنے وارث و وصی کو اپنے پاس بلاتا ہے اور اپنے شرعی وصیت کے الفاظ میں اس بچے کی کفالت، حفاظت، حمایت اور اعانت کے لیے اپنے بعد اس کو ذمہ دار بناتا ہے۔ طبری، ابن سعد اور ابن ہشام کے متفقہ نظریہ سے ذیل میں مندرجہ بالا مضامین کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

فتوفی عبدالمطلب بعد الفیل بثمانی ستین و کان عبدالمطلب یوصی برسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم عمه اباو ان اباطالب و عبداللہ ابا رسول اللہ صلعم کان لام فکان اباطالب ھو الذی یلی امر رسول اللہ بعد جدہ و کان یکون معه۔

ترجمہ: واقعہ فیل سے ارسٹھ (68) برس بعد حضرت عبدالمطلب انتقال فرما گئے۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے متعلق حضرت ابو طالب کو وصیت فرما گئے۔ کیونکہ حضرت ابی طالب علیہ السلام اور حضرت عبداللہ، سگے بھائی تھے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی ولایت کا منصب حضرت ابی طالب علیہ السلامؑ کو تفویض ہوا اور پھر آنحضرت ﷺ ہمیشہ ابی طالب علیہ السلامؑ کے ہمراہ رہے۔ طبری جلد اول ص 1123 جرمن۔

ان مشاہد تاریخی سے حضرت عبدالمطلب کے ان دلی جذبات اور قلبی تعلقات کے تمام حالات کا پورا انکشاف ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے منصب ولایت وحفاظت کی مخصوص اہمیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس عہدہ جلیل اور منصب عظیم کے لیے حضرت ابی طالب علیہ السلام کی تخصیص کی ظاہری توجیہہ تو مذکورہ بالا تاریخی اسناد سے معلوم ہو چکی۔ مگر غور و تلاش کے بعد یہ بھی ظاہر ہوتا

ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے اس ودیعت الٰہی کی ولایت کی تجویز وتفویض میں صرف ابی طالب علیہ السلام اور عبداللہ کی صلبی اور بطنی یکجہتی ہونے پر اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ حکم الٰہی کا انتظار اور استشار فرمالیا ہے۔ چنانچہ زرقانی شرح مواہب الدنیہ میں لکھتے ہیں۔

اقرع ابی طالب علیہ السلام بینھا فخرجت القرعۃ لابی طالب علیہ السلام۔

عبدالمطلب نے دونوں کے درمیان قرعہ ڈالا۔ تو قرعہ ابی طالب علیہ السلام ہی کے نام نکلا۔ زرقانی ص 228

حضرت عبدالمطلبؑ کے انتقال پر آنحضرتؐ کا حزن وملال

حضرت عبدالمطب نے جیسا بیان ہو چکا ہے۔ مکہ میں وفات پائی اور مقام حجو ن میں مدفون ہوئے۔ سن وفات عام الفیل مطابق 530 ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اپنی جد بزرگوار کی مفارقت کا بے حد ملال ہوا۔ ام ایمن کی زبان سے ابن سعد نے لکھا ہے۔

بانہ رسول اللہ صلعم یومئذ یبکی خلف سریر عبد المطلب۔

میں نے دیکھا رسول صلعم اس دن عبدالمطلب کے جنازے کے پیچھے پیچھے روتے جاتے تھے ص 78

حضرت ابی طالب علیہ السلامؑ اور رسول اللہؐ کی کفالت

حضرت عبدالمطلب کے روز وفات سے حضرت ابی طالب علیہ السلامؑ کی کفالت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں کس کو کلام ہوسکتا ہے کہ حضرت ابی طالب علیہ السلام اپنی پدر بزرگوار حضرت عبدالمطلب کے وصی تھے۔ جانشین تھے اور قائم مقام۔ اس لیے تمام خاندانی اور قومی اعزاز وامتیاز جو عبدالمطلب کو حاصل تھے وہ وراثتاً ان کو تفویض ہوئے اور انہیں ظاہری مشاورت ومعارف کے ساتھ کفالت وحفاظت رسول اللہ صلعم کے روحانی مفاخر بھی انہیں کی سعادت اور خوش نصیبی کا حصہ ٹھہرے۔ حالانکہ حارث سے لے کر عباس وحمزہ تک حضرت عبدالمطلب کے متعدد بیٹے تھے۔ جن میں اکثر ان سے سن میں بڑے تھے۔ اور گھر میں موجود تھے۔ مگر عبدالمطلب کو قدرت کی طرف سے انہیں کے انتخاب کا اشارہ ہوا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے کہ یہ انتخاب ایسا لاجواب ہوا کہ تمام قریش کیا تمام عرب میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

جناب ابی طالب علیہ السلام کی کفالت کا زمانہ آپ کے استقلال، پاداری، ہمت، صبر اور استقامت کی آماجگاہ تھا۔ زمانہ کی نامساعدت، قوم کے مخالف دشمنوں کی یورش، اپنی کثیر العیالی اور تنگ حالی ہمہ وقت دامن گیر رہتی تھی۔ مگر ان تمام تعلقات وترددات سے قطع نظر کر کے جگر گوشہ عبدالمطلب، یتیم عبداللہ کی حفاظت وحمایت کے خیال ہر وقت دل سے لگے تھے اور کیوں کر نہ لگے رہتے۔ گھر بھر میں خدا کی ودیعت تھا تو یہی تھا۔ باپ کی وصیت تھا تو یہی تھا اور اپنی ماں جائے بھائی کی نشانی اور مٹی ہوئی صورت تھا تو یہی تھا۔ اتنی

خصوصیات کے مقابلہ میں آنحضرت صلعم کو اپنی تمام اولاد پر کیوں کر ترجیح نہ دیتے۔ انہیں روحانی تعلقات اور قلبی جذبات نے ان کے دل پر سوائے یتیم عبداللہ کے اپنی کسی صلبی اولاد کی محبت والفت کے نقش نہ جمنے دیئے۔ اور حقیقت میں ایسی ہمت واستقلال، استحکام، خلوص ومحبت پر جو بزرگوار فائز ہوگا وہی ودیعت الٰہی کی حفاظت وحمایت کا خاص محافظ اور تنہا ذمہ دار بن سکتا ہے۔ اور یہ صفات کما لیہ حضرت ابی طالب علیہ السلام کی ذات میں مخصوص طور پر ثابت ہوتے ہیں جو مدبرین قدرت کی بارگاہ میں ان کے منتخب کیے جانے کے باعث ہوئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانہ کفالت کا ایک ایک واقعہ حضرت ابی طالب علیہ السلام کے لئے عدیم المثال اور بے نظیر ہمت واستقامت کا کامل دفتر ہے۔ جو ڈیڑھ ہزار برس مدت مدید کے بعد بھی آج تک عرب کے کارناموں میں ویسے ہی زندہ اور محفوظ ہے اور ابدالآباد تک قائم رہے گا۔ ذیل کے تاریخی مشاہدات جن کو ہم نے زمانہ وقوع کی ترتیب سے اپنے سلسلہ بیان میں لکھا ہے۔ ان واقعات کو پورا انکشاف کرتے ہیں۔ ابن سعد طبقات میں رقم طراز ہیں۔

محبت رسول اللہ صلعم ابی طالب علیہ السلام کے دل میں

کان ابی طالب علیہ السلام یحبه شدیداً لایحبه ولده وکان لاینام الی جنبه ویخرج فیخرج معه وبصب به ابی طالب علیہ السلام صابة بصب بها بشیء قط۔ ج۱ ص۷۴

ترجمہ: ابی طالب علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسی شدید محبت تھی۔ کہ ویسے اپنے کسی خاص بیٹے سے بھی نہیں تھی۔ راتوں کو ہمیشہ اپنے پہلو میں سلایا کرتے تھے۔ اور جہاں کہیں باہر جاتے آپ کو اپنے ہمراہ لے کر جاتے۔ اور جس چیز سے آپ کو رنج ہوتا اس سے ابی طالب علیہ السلام کو بھی ضرور رنج پہونچا کرتا تھا۔ حقیقتاً ابی طالب علیہ السلام کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسا تعلق اور تعشق تھا کہ ویسا دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اس ودیعت الٰہی کے ساتھ غایت درجہ کی محبت والفت کے شامل خلوص وعقیدت کا اقرار واظہار بھی کیا جاتا تھا ابن سعد لکھتے ہیں۔

ابی طالب علیہ السلام اور رسولؐ کی عقیدت

وکان یخصه باالطعام وکان اذا اکل عیال ابی طالب علیہ السلام جمیعا او فرادی لم یشبعوا واذا اکل معهم رسول اللہ صلعم شبعوا فکان اذا اراد ان یعذبهم قال کما انتم حتی یحضر بنی فیاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم

فیاکل معھم فکانوا یفضلون من طعامھم ان لم یکن معھم لم یشعبوا فیقول ابی طالب علیه السلام انك مبارك وکان الصبیان یصبحون ومصا شعثار ویصبح رسول الله ذھبنا کخیلا76

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے کھانے کا خاص طور پر انتظام مدنظر رکھا جاتا تھا اور یہ امر تجربتاً پایا جاتا تھا کہ ابی طالب علیہ السلام کے بچے عام اس کہ مجتمع ہو کر یا منفرد ہو کر کھائیں۔آسودہ نہیں ہوتے تھے۔اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھاتے تھے تو سیر ہو جاتے تھے۔اس لیے جناب ابی طالب علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ جب بچے کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو آپ ان سے فرماتے کہ تاوقتیکہ میرا فرزند (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ آئے۔کوئی کھانا نہ کھائے۔جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آلیتے تھے تو بچے مل کر سب کھانا کھایا کرتے تھے۔اور ابی طالب علیہ السلام اپنے بچوں سے بار بار کہا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھانے سے تمہارے کھانے میں برکت ہوتی ہے نہیں تو تم سب کے سب بھوکے رہ جاؤ اور کبھی نہ آسودہ ہو اگر کسی دن اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتھ نہ ہوتے تھے تو حقیقتاً بچے آسودہ نہ ہوتے تھے۔عام طور سے صبح کو بچے سو کر اٹھتے تو پریشان دل اور آلودہ چشم اٹھتے۔لیکن بخلاف ان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاف ستھرے اور مسرور الحال اٹھا کرتے تھے۔

اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ حضرت ابی طالب علیہ السلام کے دل میں اپنے فرزند عزیز کی طرف صرف محبت مربیانہ ہی نہیں تھی بلکہ عقیدت مخلصانہ بھی تھی اور عظمت عقیدت مندانہ بھی اور یہ ان کی معرفت رسالت کا بین ثبوت ہے۔

عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ حضرت ابی طالب علیہ السلام اپنے والد بزرگوار حضرت عبدالمطلب کے وصی تھے اور قائم مقام۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت وحفاظت میں ان کے بھی وہی طرز عمل ثابت ہوتے ہیں۔ جو حضرت عبدالمطلب کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ طبقات ابن سعد کے مفصلہ ذیل واقعات ہمارے بیان کے شاہد ہیں۔

کان ابوطالب تلقی لہ وسادۃ یقعد علیھا فجاء النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم وھو غلام فقعد علیھا فقال ابی طالب علیہ السلام لالہ ربیعہ ان ابن اخی لیحش بنعیم ص76

ترجمہ: جناب ابی طالب علیہ السلام کے بیٹھنے کے لیے ایک بار (دارلندوۃ میں) فرش بچھایا گیا تھا۔ اس اثنا میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اس وقت تک کم سن تھے تشریف لائے۔ اور اپنے چچا کے مقام پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ابی طالب علیہ السلام آ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر کہنے لگے کہ ربیعہ کے خدا کی قسم! میرے بھتیجے کے لیے ایک نعمت خاص کی نسبت ہے۔

یہ واقعہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم حضرت عبدالمطلب کے احوال میں لکھ آئے ہیں۔ اور اس سے یہ امر کما حقہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شان عمل کو آپ کی علو مرتبت کا مقدمہ سمجھا تھا اور اس کا اعلان واعتراف فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت ابی طالب علیہ السلام نے آپ کی روحانی عظمت وجلالت کی تصدیق وتوثیق فرمائی اسی کے ساتھ ایسا واقعہ ہے۔ زرقانی۔ شرح مواہب لدنیہ میں لکھتے ہیں۔

عن جلھمہ ابن عرفطۃ قال قدمت مکۃ وھی فی قحط فقالت قریش بعد ان تشاوروا فلفظ الحدیث عند ابن عساکر قدمت مکۃ وقریش فی قحط فقال منھم یقول اعمدو للات والعزی وقال منھم اعمدوا امناۃ الثالثۃ الاخری فقال شیخ وسیم حسن الوجھہ جیدا لرأی انی توفکون وفیکم باقیۃ ابراھیم وسلالۃ اسمعیل قالوا کانك عیت اباطالب قال ایھا فقاموا اجمعھم فقمت فد قفنا علیہ الباب فخرج الینا فنادوا الیہ یا ابا طالب قحط الوادی واجدب العیال فھلم فاستسق فخرج اباطالب و معہ غلام وھو النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم

کانه شمس دجن وحوله اغیلیه فاخذه الصق ظهره بالکعبة ولاذالغلام باصبعه وما فی السماء قزعه فاقبل السحاب من ھٰهنا وھٰهنا واغدق والخدوق وانفخر له الوادی واخصب الناوی والبادی ص۲۲۹

ترجمہ: ابن عساکر اپنی تاریخ میں جہلمہ ابن عرفطہ کا یہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ جہلمہ کا بیان ہے کہ میں ایک بار عین قحط کے موسم میں مکہ گیا، ابن عساکر کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ ابن عرفطہ کا بیان ہے کہ قریش سخت مصیبت قحط سے پریشان تھے۔ان میں سے ایک نے صلاح دی کہ لات وعزیٰ سے استغاثہ وفریاد کی جائے تیسرے نے کہا کہ منات سے جو ثالثۃ اخریٰ ہے چارہ جوئی کی جائے۔ان میں سے ایک معزز ذی وجاہت اور صاحب الرائے بزرگ بول اٹھا کہ مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ ابھی تم لوگوں میں ایک ایسا بزرگ قوم موجود ہے جو سلسلہ ابراہیمی کا بقیہ اور نسل اسماعیلی کا خلاصہ ہے اس کی طرف کیوں نہ رجوع کی جائے۔سب نے کہا کیا تمہارا اشارہ ابی طالب علیہ السلام کی طرف ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں۔انہیں کی طرف ہے۔جہلمہ کا بیان ہے کہ یہ سن کر سب کے سب کھڑے ہو گئے۔اور میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ہم سب ملکر ابی طالب علیہ السلام کے مکان پر آئے۔اور دروازہ کھٹکھٹایا۔حضرت ابی طالب علیہ السلام نکل آئے۔سب لوگوں نے عرض کی۔اے ابی طالب علیہ السلام! ہر طرف سے قحط عظیم آ گیا اور اہل وعیال کی بربادی کا وقت پہنچ گیا۔سب کو سیراب کیجئے۔یہ سنتے ہی ابی طالب علیہ السلام باہر نکل آئے۔آپ کے ساتھ ایک کمسن بچہ تھا اور وہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ان کا روئے منور آفتاب کی طرح روشن تھا۔ابی طالب علیہ السلام اس صاحبزادے کو انگلی پکڑائے ان کے اور لڑکے اس بچہ کو گھیرے ہوئے خانہ کعبہ میں آئے۔اور رکن کعبہ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔اور اس بچے کی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف بلند کر دیا اور طلب باران کی دعا کی۔پارہ ہائے ابر سطح آسمان پر نمایاں ہوئے۔اور تھوڑی دیر کے بعد پانی برسا اور پھر تو ایسا برسا کہ تمام پانی بہہ نکلا اور تمام صحرا و بیاباں سبز وشاداب ہو گئے۔

جناب ابی طالب علیہ السلام نے صرف اعلان شان نبوت کی ضرورت سے۔نہ اپنے اظہار مفاخر ومعارف کی غرض سے اس واقعہ کی یادگار میں ایک طویل قصیدہ نظم فرمایا ہے۔جو بالنما مہ سیرۃ ابن ہشام وغیرھم تمام عربی تاریخ ادب کی کتابوں میں مذکور ہے جس شعر خاص میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یمن وبرکت سے حصول باران کا اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے۔

وابیض یستسقے الغمام لوجهه
ثمل الیتامی عصمة للارامل

محمد صلعم ایسے خوش جمال شخص ہیں جن کی برکت سے ابر پانی برساتا ہے۔یتیموں کے لیے جائے پناہ ہے اور بیواؤں کے پردہ۔

گھر کی دنبیوں کی گلہ بانی

حضرت عبدالمطلبؑ کی وفات کے وقت آنحضرتؐ آٹھ برس کے ہو چکے تھے۔نفس قدسیہ کے روحانی اثر سے آپ کے تمام قوآئے مدرکہ آٹھ برس والے عام بچوں سے بدرجہ اولیٰ قوی تر اور کامل تر تھے۔دو برس ابی طالب علیہ السلام کی کفالت وحفاظت میں رہ کر آنحضرت صلعم کامل دس برس کے ہو گئے۔اور اب وہ وقت آ گیا کہ اس جہان بان عالمین کو فضائے قدرت کے اسباب وسامان مشاہدہ کرائے جائیں۔جن سے وہ صانع قدرت کے عجائب وغرائب کی حقیقت کامل کا ادراک کر سکے ان کی انتہائی علت کو سمجھے اور حقیقی اصلیت کو معلوم کرے۔معرفت الٰہی کی ابتدائی تحصیل میں غور وخوض کی مشق وریاضت شروع کی جائے۔اور ان ریاضتوں کی تیاریوں کے لیے خلوت ،محویت ،تنہائی اور ترک علائق کے سامان فراہم اور مرتب کر دیئے جائیں۔سیرت انبیاء علیہم السلام کے سیر کرنے والے حضرات جانتے ہیں کہ سبق آموزان معرفت ومبتدیان حقیقت کی تعلیم کے لیے۔ہر زمانہ اور ہر مقام میں قدرت کے یہی انتظام ہوتے ہیں۔اسی عادت اور دستور الٰہی کے مطابق مہتمم قدرت نے متمم رسالت کی تعلیم دہی کے لیے وہی قدیم انتظام جاری فرمائے اور دس برس کے سن میں آپ نے اپنے گھر کی دنبیوں کی گلہ بانی کا آغاز کیا۔ظاہر میں تو یہ معمولی گلہ بانی مگر حقیقت میں یہ کافۃ الناس کی پاسبانی کا دیباچہ تھا اور ان کی حفاظت ونگرانی کا مقدمہ۔تبلیغ رسالت کے سلسلہ کا مقدمہ اور تقدیم سیاست کی حکمرانی۔قدرت ہی اس نفس قدسیہ کی صانع تھی اور قدرت ہی اس انتظام کی ناظم۔اس لیے تعلیم الٰہی کے یہ تمام ابواب واسباب طبع رسالت کے مطابق اترے۔اس لیے یہ سادہ پاک وصاف اور محض آزاد حصہ عمر اور اس کے مشاغل کی یاد آنحضرتؐ کے قلب نورانی میں ہمیشہ زندہ اور قائم رہی۔اور زمان رسالت میں بھی عندالتذکرہ اس کا اکثر ذکر فرمایا جاتا تھا۔ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں۔

قال رسول اللہ صلعم ما بعث اللہ نبیا الا راعی الغنم قال له اصحابه وانت یا رسو اللہ ﷺ قال وانا رعیتها لاهل مکة بالقراریط۔

ترجمہ: جناب رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے گوسفندوں کی گلہ بانیاں کی ہیں۔اصحاب حاضرین نے پوچھا۔اور آپ نے یارسول اللہ؟ ارشاد فرمایا۔ہاں میں نے بھی اہل مکہ کی قراریط پر دنبیاں چرائی ہیں۔

اصحاب کا یہ متعجبانہ استفسار شان رسالت کی موجودہ جلالت واقتدار کے باعث تھا۔اس کے بعد ابن سعد ایک دوسرا قول ذیل کی عبارت میں لکھتے ہیں۔

مروالنبی صلعم بثمر لاراك فقال رسول الله صلی الله علیه واله وسلم علیکم بما اسود منه قال کنت اجتنیه اذانا راعی الغنم قالوا یارسول الله ورعیتها قال نعم ومامن بنی الاقدرعها۔

ترجمہ: ایک دفعہ آپ اصحاب کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے صحابہ جھربیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔آپ نے فرمایا جو سیاہ ہیں وہ زیادہ خوش ہیں۔میں اس کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میں بچپن میں دنبیاں چرایا کرتا تھا۔صحابہ نے عرض کی آپ نے بھی دنبیاں چرائی ہیں۔فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں جس نے دنبیاں نہ چرائی ہوں۔

صحابہ کا یہ استعجاب بھی اس بنا پر مبنی ہے۔مولانا شبلی صاحب سیرۃ النبیؐ میں اس مقام پر لکھتے ہیں۔کہ فرانس کے ایک مؤرخ نے لکھا ہے۔کہ ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے۔اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا۔بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے بچے بکریاں چرایاں کرتے تھے۔خود قرآن مجید میں ہے۔وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ﴿٦﴾ (نحل)

شبلی صاحب کا یہ جواب الفاظ قرآنی سے مستنبط ایک فرانسیسی عیسائی کے لیے کیسے قابل تسلیم ہوسکتا ہے۔اس کو آپ کی خوش فہمی کے سوا اور کیا کہا جائے اس کے ساکت کرنے کے لیے آپ کا اتنا ہی لکھ دینا کافی تھا اگر یہاں دنبیاں چرانے پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اپنے ہاں گدھے چرانے کے لیے کیا کہا جائے گا۔

حقیقت میں دنبیاں چرانا عیب ہے اور نہ گدھے چرانا یا پالنا بری بات ہے۔بات یہ ہے کہ ہم اپنے زمانہ، اپنے ملک اور اپنے ادب معاشرت کے مطابق چار ہزار اور دس ہزار برس کے گذشتہ تمدن معاشرت کا مقابلہ اور موازنہ کرنے بیٹھتے ہیں۔اس مدت میں انقلاب زمانہ اور اختلافات خیالات و مذاق کے مطابق بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اس وقت اچھی نہیں بری قرار پائی گئی ہیں۔

اس وجہ سے موجودہ زمانہ میں طبقہ اعلیٰ کی نسبت ان باتوں کا اگر ذرا سا بھی تعلق یا ذکر کیا جاتا ہے تو عموماً معمول پسند طبیعتیں اعتراض پر فوراً تیار ہوجاتی ہیں۔لیکن تاہم ان میں جو مائل اعتدال ہیں اور واقف حال۔وہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر خاموش رہ جاتی ہیں۔ مگر عیسائیوں کے تعصب سے نہ ہم کو اعتدال ہی کی امید ہے نہ تلاش حقیقت اور نہ تفحص احوال کی توقع۔پھر ان کے اعتراض کو ان کے تعصب اور نفسانیت کا خاص الخاص نتیجہ سمجھنا ہوگا۔

مولانا شبلی صاحب نے طبقات ابن سعد کے حوالہ سے ان دونوں مذکورہ بالا واقعات کو تحریر فرمایا ہے۔اور بکریاں چرانے کے

مضمون پر نمبر 1 کا نشان لگا کر سیرۃ النبیؐ کے زیر حاشیہ صفحہ 129 میں یہ عبارت لکھی ہے۔
بخاری نے کتاب الاجارۃ میں آنحضرت ﷺ کا قول نقل کیا ہے کہ میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید ابن عبید کی رائے ہے کہ قراریط قراط کی جمع ہے۔ اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔ اسی بنا پر ان کے نزدیک حدیث کی یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اجرت پر مکہ والوں کی بکریاں چراتے تھے۔ اور اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے۔ لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے لکھی ہے۔ اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے۔ (عینی ج 6 ص 631) نورالنبر اس میں یہ بحث زیادہ تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے ملاحظہ ہو سیرۃ النبیؐ جلد اول ص 129 حاشیہ
اس سے قبل کی عبارت میں شبلی صاحب کا یہاں تک لکھنا بالکل صحیح اور پر واقع ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہیں تھا۔ بڑے بڑے امراء شرفاء کے لڑکے بکریاں چراتے تھے۔ مگر اب ان کی اس مابعد کی عبارت سے حقیقت حال کا پورا انکشاف ہو گیا اور مخالفین کے اس تعریض اور طعن و تشنیع کا اصلی باعث معلوم ہو گیا کہ حقیقت میں عیسائی مورخ فرانسیسی کے اس اعتراض کی باعث شیخین بخاری اور ابن ماجہ کی عقلمندی ہے۔ جس کی تصدیق واقرار خود شبلی صاحب کو بھی کرنا پڑا اور لکھنا پڑا۔ حقیقت میں ان دونوں محدثین نے قراریط کے غلط معنی لگائے۔ اصل میں قراریط کو ایک مقام خاص کا نام تو نہ سمجھے بلکہ قیراط کی جمع سمجھے جس کے معنی درہم و دینار کے لیے۔ اور یہی غلط فہمی ان تمام فسادات کا باعث ہوئی۔ یہ کچھ ایسی مشکل آ پڑی کہ آخر شبلی صاحب کو شیخین بخاری و ابن ماجہ کے ایسے معتمد ترین محدثین کی تنقید و تردید کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اپنے ان تمام اصول تالیفی کو جو اپنے مقدمہ کتاب کے طومار میں مؤرخین پر محدثین کو ترجیح دیئے جانے کے متعلق لکھے ہیں۔ چھوڑنا پڑا اور بخاری صاحب کے ایسے استاد فن کی تکذیب کرنا پڑا۔ جن کی کتاب کو اصح الکتاب بعد الکتاب باری یقین کرنا آپ کا ایمان ہے اور ایسے سراپا اعتماد استاد و نقاد وحدیث کے قول کی تردید ابن حربی اور علامہ عینی کے ایسے نوآموزان فن کی تحقیقات سے کرنا پڑی تو گویا مقدمہ کتاب میں نقد روایت اور تحقیقی واقعات کے متعلق جن اصول کی پابندی کا دعویٰ کیا گیا تھا اور ان اصول کی ترتیب و تدوین کی تفصیل میں تاریخوں کی مندرجات پر پہلے صحاح کی مرویات اور پھر صحاح میں سب سے پہلے انہیں بخاری صاحب کی مرویات کو مرجح بتلایا گیا تھا۔ آپ کے موجودہ استدلال کے وقت وہ سب باتیں ہوا ہو گئیں گویا وہ قرارداد وہ اصول نہ قابل توجہ تھے نہ لائق اعتناء۔ اور نہ ان کے متعلق آپ کی پابندی اور مطابقت کے وعدے لائق ایفا۔ اب بھی شبلی صاحب کو اپنے مقدمہ کتاب کے طمطراق اور طومار اور اس کے لیے بے کار خامہ فرسائی کا یہی اعتبار ہوا یا نہیں۔
اب سنیے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قراریط ایک جنگل یا غیر آباد قطعہ زمین کا خاص نام ہے جو حوائے مکہ میں مقام اجیاد سے قریب ہے۔ آپ کے شیخین ابن ماجہ و بخاری صاحبان سے حقیقت میں بڑی غلطی ہو گئی کہ انہوں نے درہم و دینار کے معنی لگا کر اس سے اُجرت

کے مطلب نکالے۔اب آپ ہی انصاف سے فرمائیں کہ اس عیسائی فرانسیسی مؤرخ کا کیا قصور۔ یہ نہ اس کا اپنا قول ہے اور نہ اس کا اپنا نظریہ بلکہ یہ تو آپ ہی کا اقرار ہے۔جس کو وہ آپ کے ایسے مستند اور معتبر ماخذون سے مستنبط کرتا ہے۔ جو صداقت میں آپ کے نزدیک قرآن کے بعد ہے۔تو اس کا اعتراض بے دلیل کیسے کہا جا سکتا ہے۔آپ اس کی تردید میں جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس کی تردید نہیں۔ بلکہ آپ ہی کے معتبر اور مستند محدثین کی تکذیب ہے جس کے لیے وہ فرانسیسی مؤرخ نہ جوابدہ ہے نہ ذمہ دار۔اس مخالف اسلام کی تعریض کی ساری ذمہ داریاں ابن ماجہ اور بخاری کے سر جاتی ہیں جو قراریط کے ایسے معمولی لفظ کے اصلی معنی نہ سمجھ سکے تو اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ شان رسالت کی اصل حقیقت کو کب سمجھے ہوں گے۔

ابن ماجہ نے تو صرف ایک غلطی کی کہ اپنے شیخ کے قول کے مطابق قراریط کے معنی درہم ودینار کے سمجھے۔ بخاری صاحب نے تو دو غلطیاں کیں۔ پہلے تو قراریط کے معنی درہم ودینار کے اختیار کئے۔ دوسری قیامت یہ کی کہ اس حدیث کے لیے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا اور اس کو باب الاجارۃ کے خاص نام سے موسوم کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ عام وخاص آپ کے باب الاجارۃ کا عنوان دیکھ کر رسول عربی کی ابتدائی شان وشوکت، شخصیت وحیثیت اور معاشرت ومشغلت کو مکہ کے معمولی مزدوری کرنے والے چھوکروں میں شمار کرنے لگے۔(**نعوذ باﷲ من ذلك**)

ہمیں حضرت ابی طالب علیہ السلام کی ناتوجہی اور ناقدری کی بے جاہ شکایت پر اس عیسائی مصنف سے رنج وملال پیدا کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ جب ہم اسلامی محدثین ومعتبرین کے خاص قلم وزبان سے، ذات اعلائے رسالت اور پیکر وِلائے نبوت کی یہ توہین وحقارت تیار ومرتب دیکھتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اسلامی محدثین، تدوین احادیث کے غیر متحمل شوق وشغف کے ساتھ ساتھ مرویات ہیں۔واقعات اور حشویات کی اصل مقاصد اور زوائد کی بھی تفریق وتمیز کرتے جاتے تو پھر ان کے مرویات پر نہ کسی اسلامی محقق کو تحقیق وتنقید کی ضرورت ہوتی اور نہ کسی غیر اسلامی معترض کو تعریض وتردید کی جرأت۔

اس بحث کے ضمن میں ہمیں شبلی صاحب کے وہ اصل تحقیقی وتنقید روایات یاد دلاتے ہیں۔ جو وہ اپنے مقدمہ کتاب میں نہایت شدومد سے قلم بند فرما چکے ہیں۔ان کی طولانی عبارت کا خلاصہ یہ ہے۔

مغازی اور سیرۃ میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں موجود ہوتی ہیں وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار تک نہیں پہنچتیں۔اس لیے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے۔اس بنا پر سیرت وتاریخ ومغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔جس طرح امام بخاری اور مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے اسی طرح سیرت کی تصانیف میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا۔آج بیسوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں۔مثلاً سیرت ابن اسحٰق سیرت ابن ہشام، سیرۃ ابن سید الناس، سیرۃ ومیاطی، جلبی مواہب الدنیہ قسطلانی، کسی میں تو یہ التزام نہیں۔سیرۃ النبی حاشیہ زیر صفحہ 7۔ پھر اس سے قبل صفحہ 5 میں رقم طراز ہیں۔حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں۔جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں۔مثلاً بخاری اور مسلم کی صحیح۔

شبلی صاحب کی یہ عبارت اور صحت بخاری کی نسبت ان کا یہ دعویٰ اور پھر ان کا یہ اصول کہ حدیث کے مقابلہ میں سیرت کی کتابیں مستند نہیں۔ غرضیکہ ان کا یہ خیال التزام اور قیاسی طومار ان کی خاص تر دید و تنقید بخاری کی مرقومہ بالا عبارت سے القط ہو گیا اور بالکل بے کار۔ اور بالاخر ان کے خاص اعتراف سے ثابت ہو گیا کہ جس کتاب کی نسبت آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ اس میں کوئی ضعیف روایت بھی نہیں۔ اسی کی ایک ایسی غلط حدیث میں ایسا غلط بیان نکل آیا جس کی نسبت تنہا آپ کو اعتراف ہی کرنا نہیں پڑا بلکہ اس کی تنقید بھی اور تر دید بھی۔ اب آپ کے کس نظریہ کا اعتبار کیا جائے۔ آیا اس دعویٰ کا کہ بخاری میں ایک ضعیف روایت بھی نہیں۔ یا اس معترفانہ تنقید و تر دید کا جو اوپر ابھی لکھی گئی۔ آپ کے وہ اصول کہ حدیث کے مقابلہ میں سیرت کے واقعات قابل اعتماد نہیں۔ ایسی حالت میں مانے جائیں گے۔ یا اس واقعہ میں آپ کی رقم زدہ اور اقرار کردہ صورت حال پر اعتبار کیا جائے گا۔

صورت حال تو یہ بتلا رہی ہے کہ صحیحین بخاری اور ابن ماجہ نے اپنی غلط فہمی سے یا عربی کی عدم لغت دانی سے یا یوں کہیے کہ محض نادانی سے اس حدیث کو ایک غلط صورت میں دکھلا یا مگر انہیں نا معتمد علیہ سیرت نگاروں نے تو قراریط کے بالکل صحیح معنوں میں اسی طرح سمجھا ہے۔ جس طرح شبلی صاحب خود بھی سمجھے ہیں اور دنیا کو سمجھا رہے ہیں۔ طبقات ابن سعد حدیث کی کتاب نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ من حیث التاریخ ایک سیرۃ یا تذکرہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے اور نہایت معتبر اور اپنے استاد واقدی کی کتاب سے بھی معتبر ترین۔ ہم اپنے مرقومہ بالا سلسلہ بیان میں اس کی اصل عبارت سے لکھ چکے ہیں اور پھر اس واقعہ کی نسبت اس کے لفظ لکھ دیتے ہیں انا رعیتها لاهل المکة بالقراریط قراریط پر اہل مکہ کی دنبیاں چراتا تھا۔ اس سیرت نگار نے بالکل اپنے سیدھے سادے اور معمول کے اصول کے مطابق اس واقعہ کو آنحضرت صلعم کے دس برس کی عمر کے حالات میں اسی طرح مندرج کیا ہے۔ جس طرح شبلی صاحب نے اپنی سیرت میں، نہ بخاری صاحب کی طرح اس واقعہ کے لیے کوئی عنوان قائم کیا ہے اور نہ کوئی خاص باب باندھا ہے۔ اس کو رسول ؐ کی ابتدائی معیشت کے اسباب و ذرائع ٹھہرائے ہیں۔ نہ کہ اس کو مزدوری اور اجارہ بتلایا ہے جو لکھا ہے وہ اتنا ہے۔ ذکر رعیه رسول الله صلعم الغنم بمکة یعنی مکہ میں رسول صلعم کا دنبیاں چرانا۔

ایک لطیف بات تو یہ ہے کہ اس وقت قراریط کے متعلق جو صحیحین بخاری اور ابن ماجہ سے شبلی صاحب اختلاف واجتناب اختیار فرماتے ہیں اور مجبور ہو کر انہیں غیر مستند، نا معتمد اور غیر مفید سیرت نگاروں پر اعتبار کرتے ہیں۔ جب ایک محقق کے آگے آپ کے یہ اصول موضوعہ اور اہل صحاح کی ناانصافانہ جانب داری اور اہل سیرت کی بے اعتباری پیش کی جائے گی۔ جو آپ مقدمہ کتاب میں لکھ چکے ہیں تو وہ آپ کی جامعیت وصلاحیت پر حسرت و افسوس کرکے اتنا ضرور کہہ دے گا ؎

برین عقل و دانش بباید گریست۔

اصل واقعہ کی حقیقت کا انکشاف

اس بحث کے متعلق تمام مرقومہ بالا جزوی اور کلی ضروریات کو لکھ کر ہم اصلی واقعہ کی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ عرب کے قدیم دستور کے مطابق جیسا کہ شبلی صاحب لکھتے ہیں اور عرب کی تمام قدیم سیرت، تاریخ اور اشعار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایام طفولیت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی دنبیاں چرائی ہیں۔ اور اس وقت کے ملکی اور قومی تمدن معاشرت اور تہذیب کے اعتبار سے آپ کا یہ ابتدائی مشغلہ معیوب نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے اس کی وجہ سے نہ آپ کے خاندانی اعزاز واقتدار میں کوئی کمی آسکتی ہے اور نہ آپ کی روحانی عظمت پر اور شان رسالت پر کوئی حرف آسکتا ہے۔ خاندانی اعزاز کے لیے اس وجہ سے معیوب نہیں ہوسکتا۔ کہ عرب کے تمام امراء، روساء اور شرفاء کے عام طبقات میں جاری تھا۔ مرتبہ رسالت اور درجہ روحانیت کے لحاظ سے بھی اس لیے قابل الزام نہیں کہ تمام کتب انبیاءؑ سے حضرات انبیاء ومرسلین کا دنبیاں چرانا ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کی جلد اول میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علی نبینا والہ وعلیہ السلام کے حالات وواقعات میں بالتفصیل لکھا جاچکا ہے۔ اصلیت اور حقیقت یہ ہے کہ دنبیوں کی یہ گلہ بانی بھی حقیقتاً تخصیص تھی۔ یعنی آنحضرتؐ صرف اپنے گھر کی دنبیوں کی گلہ بانی اور نگرانی فرماتے تھے۔ عام طور سے اہل مکہ کی نہیں۔ محدثین نے غلط سمجھا ہے اور اسی غلط فہمی کے باعث اتنا فساد برپا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں اہل مکہ کا لفظ سیرت کی کتابوں میں بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا حدیثوں کی کتاب میں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اہل مکہ سے اپنا گھر اور اپنا قبیلہ مراد ہے۔ کیونکہ بنی عبدالمطلب یا بنی ہاشم قریشی بھی تھے اور مکی بھی۔ حدیث کی کتابیں اس تخصیص کو کہیں ظاہر نہیں کرتیں۔ سیرت نے جناب رسول خداصلعم کے خاص ارشاد سے اس تخصیص کا اظہار ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ اسی طبقات ابن سعد میں یہ واقعہ درج ہے جس سے حقیقت حال کا پورا پورا انکشاف ہوجاتا ہے۔ عبارت یہ ہے۔

ان النبی صلعم قال بعث موسیٰ علیہ السلام و ھو راعی غنم وبعث دا دو ھو راعی غنم وبعثت وانا ارعی غنم اھلی باجیاد۔ طبقات ابن سعد ج1ص80جرمن

ترجمہ: جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے وہ بھی دنبیوں کے چرواہے تھے اس کے بعد حضرت داؤدؑ مبعوث ہوئے وہ بھی دنبیوں کے چرواہے تھے۔ ان کے بعد میں مبعوث کیا گیا میں نے بھی اپنے گھر کی دنبیاں اجیاد (پہاڑ کا نام ہے جو قراریط کے پاس ہے) پر چرائی ہیں۔ طبقات ابن سعد ج1 ص80

شبلی صاحب نے اس مسئلہ میں تنقید وتردید سب کچھ تو تمام کر دیا۔ مگر اس کی تخصیص کی طرف ذرا توجہ نہ فرمائی۔ گویا آپ کی تحقیق میں پیغمبر عربؐ کا اُجرت ومعاوضہ پر تمام اقوام مکہ کی دنبیاں چرانا ثابت ہے۔ اور یہ امر آپ کے نزدیک نہ بنی ہاشم کی عظمت و اقتدار کا مخالف ہے اور نہ شان رسالت کا مناقص حالانکہ اصول تعلیم سے بھی اس وقت کی قدیم معاشرت، تہذیب وتمدن کے سراسر خلاف

ہے۔اور اس وقت بھی کوئی شخص نہیں مان سکتا کہ شرفاء، روساء اور امرائے مکہ کے بچے اپنے سے کم درجہ قبائل اور ارزل اقوام کی دنبیاں چرانا گوارا کرتے ہوں گے۔ بخلاف اس کے ہر شخص بلا تکلف مان لے گا کہ اس وقت کے شرفاء، روساء، اور امراء مکہ کے بچے اپنے گھر یا اپنے قبیلے کی دنبیاں شہر کے بیرونی مقامات میں چرایا کرتے تھے۔ جیسا کہ خود آنحضرتؐ کی زبانی ابن سعد کی عبارت سے ثابت ہے افسوس ہے کہ شبلی صاحب کی محققانہ نگاہ طبقات ابن سعد کے اس آخر واقعہ مندرجہ پر نہ پہنچ سکی۔ اگر پہنچ چکی ہوتی۔ تو ہمیں یقین ہے۔ وہ تخصیص کے مسئلہ کو بھی صاف فرما دیتے یہ تو مولف کی کوتاہ قلمی ہے یا قصیر النظری۔

سفر شام اور راہب بحیرا کا مشہور واقعہ

بارہ برس کے سن میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عم محترم حضرت ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ ملک شام کا سفر کیا۔ ابن سعد طبقات میں اس سفر کی کیفیت پر یوں لکھتے ہیں۔

لما بلغ رسول الله صلى الله عليه واله وسلم اثنى عشر سنة خرج به ابى طالب عليه السلام الى لشام فى العير التى خرج فيها للتجارة ونزلوابالراهب بحيرافقال لابى طالب عليه السلام فى النبى ماقال ومرة ان يحتفظ به فردوه ابوطلب معه الى مكة وشب رسول الله مع ابى طالب عليه السلام

ترجمہ: جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ برس کی عمر کے ہوئے تو جناب ابی طالب علیہ السلام ان کو ہمراہ لے کر قریش کے قافلہ تجارت کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ اور بحیرا نامی راہب عیسائی کے مسکن پر منزل گزیں ہوئے۔ راہب بحیرہ نے حضرت ابی طالب علیہ السلام سے جناب رسولِ خدا صلعم کی نسبت وہ سب باتیں کہہ دیں۔ جو اس کو آپ سے کہنی تھیں۔ اور آپ کی حفاظت و نگرانی کے متعلق تاکید کردی۔ چنانچہ حضرت ابی طالب علیہ السلام آپ کو وہیں سے اپنے ہمراہ مکہ واپس لائے۔

اس عربی کی مستندترین سیرت میں تو یہ واقعہ اتنا ہی ہے جو لکھا گیا۔ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شبلی صاحب نے حق ناحق اس کو ایک معرکۃ الاراء مسئلہ تاریخی بتادیا ہے۔ اور حدیث وسیرت کی تحقیق وتنقید کے باہمانہ امتزاج سے وہ غلط مبحث تیار کر لیا ہے۔ جو کہ صاف طبعانہ زمانہ کی عام بدمزگی اور ناگواری کا باعث ہوتا ہے۔ شبلی صاحب کی عبارت ذیل ملاحظہ ہو۔

ابوطالبؑ تجارت کا کاروبار کرتے تھے۔ قریش کا دستور تھا۔ سال میں ایک مرتبہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی۔ کہ ابوطالبؑ نے سفر شام کا ارادہ کیا۔ سفر کی تکلیف یا کسی اور خیال سے وہ آنحضرت صلعم کو ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن آنحضرت صلعم کو ابی طالب علیہ السلام سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابی طالب علیہ السلام چلنے لگے تو آپ

ان سے لپٹ گئے۔ابوطالبؑ نے اب ان کی دل شکنی گوارانہ کی اور ساتھ لے لیا۔عام مؤرخین کے بیان کے مطابق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا۔اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔کہ جب ابوطالب بصرے میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے۔ جس کا نام بحیرا تھا۔اس نے آنحضرت صلعم کو دیکھ کر کہا کہ یہ ختم المرسلین ہیں۔لوگوں نے پوچھا تم نے کیسے جانا تو اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے نیچے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لیے جھک گئے۔طبری نے مختلف طریقوں سے اس واقعہ کو لکھا ہے۔

طبری کے مختلف طریقوں میں سے صرف ایک طریقہ کا خلاصہ اور ماحصل شبلی صاحب نے لیا ہے اور اس پر ذیل کی تنقید لکھی ہے۔ یہ روایت مختلف طریقوں میں بیان کی گئی ہے۔تعجب ہے کہ اس روایت سے جس قدر تمام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔سرولیم میور، ڈریپر اور ماگولیوس وغیرہ سب اسے عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں۔اور اس بات کے مدعی ہیں۔کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے۔اور جو نکتے اس نے بتا دیئے تھے۔انہیں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔اسلام کے تمام عمدہ اصول انہیں نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اسی طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام حقائق سکھا دیئے جائیں۔اگر یہ کوئی خرق عادات تھا تو راہب بحیرا کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

مولانا شبلی اپنی جبلی عادت سے مجبور ہیں۔آپ ایک حد تک معقول اور کافی جواب دے چکے۔اب اس سے زیادہ انکشاف تو پھر وہی اپنا ہی پردہ فاش کرنا ہے۔اب ان الفاظ میں اس روایت کی تنقید کی تکذیب فرمائی جاتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔اس روایت کے جتنے طریقے ہیں سب مرسل ہیں۔یعنی راوی اول واقعے کے وقت موجود تھا۔اور اس راوی کا نام بھی نہیں بیان کرتا۔جو شریک واقعہ تھا۔اس کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

(1) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ حسن اور غریب ہے۔اور ہم اس حدیث کو اس طریقے کے سوا اور کسی طریقے سے نہیں جانتے ہیں۔

(2) حسن کا مرتبہ حدیث صحیح سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اور بھی گھٹ جاتا ہے۔

(3) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمن ابن غزوان ہے۔اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے جن میں سب سے منکر حدیث وہ ہے جس میں راہب بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

(4) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کے موضوع کو جھوٹا اور بنایا ہوا خیال

کرتا ہوں۔

(5) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلال اور ابوبکر بھی اس سفر میں شریک تھے۔ حالانکہ بلال کا اس وقت وجود بھی نہیں تھا اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔ (6) حدیث کے آخری راوی ابوموسیٰ اشعری ہیں جو خود شریک واقعہ نہیں تھے اور اوپر کے راوی کا خادم بھی نہیں بتاتے۔

(7) ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد اور مستدرک وغیرہ میں جو سلسلہ سند مذکور ہے۔ سب مرسل ہیں۔ یعنی بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے۔

(8) حافظ ابن حجر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شکایت یدا غلط ہے اس لیے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہوگیا ہے۔ لیکن حافظ ابن مجر کا یہ مدعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبدالرحمن بن عوف ان کی نسبت خود انہیں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا۔ اس کی طرف اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔ ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ سیرۃ النبی ص130-131

چونکہ شبلی صاحب نے اپنی تنقیدی عبارت نیچے نہیں لکھی ہے بلکہ اصلی کتاب کی عبارت میں داخل کردی ہے۔ اس لیے اس کی نسبت مجھ کو جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں بھی حاشیہ زیریں کے عبارت میں نہیں بلکہ اپنے اصل سلسلہ بیان میں منضم کرتا ہوں۔ شبلی صاحب کے ایسے محقق زمانہ کی مرقولہ بالا تنقید جو خاص کر عیسائیوں کے اعتراض کی تردید میں لکھی گئی ہے۔ جس وقت حقیقت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ تو جیسا ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس وقت بھی پھر وہی عرض کریں گے کہ آپ کے اس ناگوار اور غیر استوار طریقہ تنقید اور استدلال سے نہ معترضین کی تردید ممکن ہوسکتی ہے اور نہ تسکین بلکہ آپ کی موجودہ تنقید تو آپ کے محدثین و محققین کی کوتاہ رقتی، کوتاہ نظری او کوتاہ عقلی کی حقیقت مخالفین و معترضین اسلام پر واضح اور روشن کرتی ہے اور یہ آپ کی جدت پسندی کا وہ طریقہ ہے جو معترضین کے ارادہ تعریض اور حوصلہ تکذیب کو اور وسیع کر دیتا ہے۔ ہر شخص آپ کے مرقومہ بالا تنقید کو پڑھ کر بلا تکلف سمجھ لے گا کہ اسلامی مولفین اور مصنفین میں محدثین سے لے کر مؤرخین تک سب کے سب غلط نگار تھے اور کورانہ نقل کرنے کے عادی۔ بدقسمتی سے اس سلسلہ میں مؤرخین کا کیا ذکر۔ محدثین صحاح امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام مالک وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

آپ کی تنقید کی صورت حال کا ایک رخ تو یہ قائم ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا رخ یوں نمایاں ہوتا ہے کہ ترمذی صاحب اپنی صحیح میں اس واقعہ کو لکھتے بھی ہیں اور پھر اس کی صداقت میں عیب بھی لگا دیتے ہیں۔ پھر صحیح میں ایسے مشکوک یا ساقط از اعتبار مرویات کے اندراج کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حاکم صاحب بڑے شد و مد سے بخاری صاحب اور مسلم صاحب کی شروط پر اس کی صداقت و صحت کا چیلنج دیتے ہیں۔ لیکن ذہبی صاحب، حاکم صاحب کی انتہا پسندی کو اعتدال کے درجہ تک گھٹالاتے ہیں اور چونکہ امامین بخاری و مسلم کی شرط صحت لگی

ہے اس بنا پر اس کو غلط ٹھہرانے کی تو جرات نہیں کرتے بلکہ فرماتے ہیں کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع، جھوٹا اور اور بنا ہوا خیال کرتا ہوں۔ اگر غور سے موجودہ صورت حال پر نظر ڈالی جائے۔ تو شبلی صاحب کی اس تنقید میں مرقومہ بالا دونوں مؤرخوں کے علاوہ ایک تیسرا پہلو بھی نظر آتا ہے وہ حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری کا خاص طرز بیان ہے۔ اس بزرگ پر آخر شبلی صاحب کو غصہ ہی آ گیا اور ان پر رواۃ پرستی کا الزام لگا ہی دیا گیا آپ کے نزدیک ابن حجر نے نہایت نازیبا اور بدنما پہلو بدلا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس روایت کی صحت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے۔ یہاں تو ابن حجر نے اس کی صحت کی تصدیق کی وہاں کتاب تہذیب التہذیب میں عبدالرحمن ابن غزوان کو حدیث میں خطا کرنے والا بھی لکھ دیا ہے۔ ابن حجر کی اسی دورخی رائے پر شبلی صاحب کو طیش آ گیا۔

مگر ہم شبلی صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ آپ کا یہ عتاب بے جا ہے اور بے کار۔ جب آپ صاف صاف ابن حجر کا یہ قول خود لکھ رہے ہیں کہ روایت میں اس حصہ واقعہ کے داخل ہو جانے سے جو بدیہی غلط ہے۔ ان کو اس کے کل صحیح ہونے میں اختلاف ہے تو وجہ پا کر آپ کو بے وجہ برافروختہ ہونے کا کیا حق ہے۔ اب رہا یہ امر کہ ابن حجر بھی آپ اور آپ کے حسد میں ہم خیال مولفین، مؤرخین کی طرح اس روایت کے سراپا موضوع اور بالکل غلط ہونے کے کیوں قائل نہ ہوئے؟ تو آپ کا یہ تحکم آپ کے حسن وتعقل کا پتا اور نازیبا کا پورا مزہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے اور روشن۔ ابن حجر معمولی پایہ کے بزرگ نہیں تھے۔ صحیح بخاری کے شارح، شروح بخاری میں ان کی شرح کا سب سے پہلا نمبر ہے۔ وہ اپنے اصول ومختار مقررہ کے بڑے پابند تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صحیحین کے شروط کے مطابق ہے۔ جن میں بقول آپ کے ایک ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں درج کی گئی۔ پھر وہ ان کی مرویات کو سراپا غلط اور موضوع بتلاتے اور ایسی معتبر اور مستند اصح الکتاب کی عظمت گھٹاتے۔ ان کی شرح آپ کی سیرۃ النبی کا مقدمہ تو تھی ہی نہیں۔ جس میں ابتداء میں صحاح کو عموماً اور صحیحین بخاری ومسلم کو خصوصاً صحت وصداقت میں گویا قرآن مجید کا مترادف بتلایا جاتا ہے۔ اب فرمایا جائے کہ آپ کا یہ طریقہ موجودہ صورت حال میں آپ کے لیے کون رخ اختیار کرے گا۔ اور آپ اپنی اسی روش انحراف کے مقابلہ میں ابن حجر کے اختلاف کے لیے ان پر رواقبہ پرستی کا کیسے الزام لگا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بخاری ہوں، یا مسلم ہوں، یا ترمذی، مالک ہوں یا ابن حجر ہوں یا مولانا شبلی۔ اصلیت سے سب جدا اور حقیقت سے سب علیحدہ　چوں ندید در حقیقت رو افسانہ زوند۔ یہ واقعہ روایت اور درایت دونوں طریقوں سے صحیح ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ کی شرکت کے غلط اضافے نے یہ سارے مفسدے پیدا کر دیئے جو حقیقتاً ایسا سفید جھوٹ ہے جو کسی طرح نہیں چھپ سکتا۔ ایسی کوری بے عقلی ہے جس کی تاویل ممکن نہیں۔ ؎

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔

حقیقتاً ابن حجر سے کوئی بات نہیں بن سکتی تھی۔ انہوں نے صرف اس حصہ حدیث کے غلطی سے اصل حدیث میں محفوظ ہو جانے کا اعتراف کر دیا تو کیا برا کیا۔ یہ تو اس کا ضعف تمدن نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کا عین تمدن اور اپنے اصول کی کمال پابندی قرار دی جائے

گی۔شبلی صاحب اپنے مولفانہ تلوں پر ذرا بھی خیال نہیں فرماتے ۔میری دانست میں ابن حجر نے ذہبی سے زیادہ قصور نہیں کیا ہے۔آپ خود تلخیص متدرک سے ذہبی کا یہ قول اوپر نقل فرما چکے ہیں کہ میں اس حدیث کو موضوع ،جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں ۔اب اس بیان کو ابن حجر کے کلام سے ملایا جائے تو مدعا دونوں کا ایک ہی پایا جائے گا۔فرق یہ ہے کہ ذہبی نے بڑے احتیاط سے اس غلط حصہ روایت یا واقعہ کا نام نہیں بتلایا اور ابن حجر نے اپنے کمال سے اس غلط حصہ روایت یا اضافہ حدیث کو بتلادیا لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اب آپ کو یہ کون بتلائے کہ کن لوگوں نے کس غرض وغایت سے یہ بے جوڑ جوڑ لگایا۔

کنون کرادماغ کہ پرس زباغبان ۔:۔بلبل چہ گفت چہ شنید وصبا چہ کرد ۔:۔

صحیحین کے استحفاظ مراتب کا یہ مستحسن طریقہ تھا کہ یہ بحث یہیں تک رہنے دی جاتی اور اس اضافہ کی وجہ اور اضافہ کرنے والے کی تلاش نہ کی جاتی ۔ہمیں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ حدیث جو صحاح کے معتبر کتابوں میں سے لے کر حدیث کی تمام چھوٹی بڑی کتابوں میں اس وقت سے لے کر اِس وقت تک نقل ہوتی چلی آئی ہے ۔صرف اپنے ایک حصہ کی غلطی کی وجہ سے بالکل غلط ہوجائے گی ۔یہ اصول آ ئین تنقید کے مطابق ثابت ہوتا ہے اور نہ قواعد کلام کے موافق ۔عبدالرحمن ابن غزوان کی جرح وقدح بھی اصولاً ایسی مستحکم اور نا قابل التاویل نہیں معلوم ہوتی ۔اسی روایت کی نسبت آپ خود اعترافاً تحریر فرچکے ہیں کہ اس کو بہت سے لوگوں نے ثقہ بھی لکھا ہے اور بعض نے منکر بھی ۔اس بنا پر اس کے قطعی کاذب اور وضاع ہونے کی بھی دلیل قائم نہیں ہوسکتی ۔صرف ذہبی نے اس کو منکر لکھا ہے اور اس کے مرویات سے خصوصاً واقعہ راہب بحیرا کو موضوع بتلایا ہے ۔تو گویا اس کی تنقید میں وہ منفرد ہیں ۔اب ان کی منفردہ رائے کو کثیر التعداد محدثین کے نظریہ سے مقابلہ فرمائیں ۔جو اسکی توثیق وصحت کے قائل ہیں ۔تو ذہبی کے نظریہ منفردہ کا کیا وزن رہ جاتا ہے۔اس لیے شبلی صاحب کی یہ تمام کدوکاوش بے کار اور غیر مفید کوشش ہے۔

اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ عبدالرحمن نے حضرت ابوبکرؓ کی شرکت کے قبل تک اس واقعہ کو پوری اصلیت کے ساتھ بیان کیا۔اور بقیہ حصہ کو اس موضوع کے ساتھ بیان کیا جیسا کہ اس نے غیروں سے غلط سنا تھا اب رہا یہ امر کہ اس روایت کے تمام طریقہ مرسل ہیں ۔تو اولاً اصول نقد حدیث کے مطابق مراسیل صحابہ قطعاً درست ہیں ۔یہ اعتراض بے جا ہے ۔ثانیاً اس کے لیے صاحبان شیخین جوابدہ ہیں ۔جنھوں نے نقل ونقد حدیث کے اصول ،اقسام اور ابواب بھی قائم کیے اور اپنی اپنی تالیفات کو ان اصول موضوعہ کا بظاہر سخت پابند بھی بتلایا۔پھر ان موضوعات اور لغویات کی بھرتی ہی انہیں کتابوں میں بھردی۔اس کا جواب شیخین صحیحین دے سکتے ہیں ۔یا خود شبلی صاحب جو اپنے مقدمہ کتاب میں اتنے طمطراق سے ان بزرگوں کی مدح سرائی کر چکے ہیں۔

حقیقت میں شبلی صاحب کی یہ تنقید عیسائیوں کی فتح عظیم کی تردید تو کیا کرے گی تائید البتہ کرتی ہے۔کیونکہ یہ خانہ جنگی باہم تکذیب وتردید،تغلیط ،بعد تصحیح ،جو اسلامی دائرہ میں اکابرین صحاح سے لے کر عام محدثین وشارحین تک میں پھیلی ہوئی دکھلائی گئی ہے۔جس وقت مخالفین کی نگاہ سے گذرے گی ان کی تعریض وتردید کے حوصلوں کو اور بھی کشادہ کردے گی اور وہ سمجھ لیں گے کہ بس یہ

حضرات ایسے تھے اور اتنے۔ اپنے خیال میں شبلی صاحب نے عیسائیوں کو اس تنقید سے اپنی صفات دکھلائی ہے۔ مگر اس سے بھی ان کی قیاسی فتح عظیم کی بیخ کنی نہیں ہوئی اور اس کی دفعیہ کا کوئی پہلو بھی اس تحریر سے نہیں نکلا۔

سچ تو یہ ہے کہ شبلی صاحب کو وہ پہلو معلوم ہی نہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عیسائیوں کی ذراسی تعریض پر آپ اس قدر مضطرب الحواس ہو جاتے ہیں کہ حقیقی واقعات کو چھوڑ کر زوائد اور دوراز قیاس ذرائع سے جواب دینا چاہتے ہیں۔ اور اپنے علماء کی تغلیظ کے ثبوت دے کر ان کی تردید پیش کرتے ہیں۔ جو گویا جواب تسلیمی ہو جاتا ہے۔ دیکھیے شبلی صاحب اس روایت کو عیسائیت کی فتح عظیم سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقتاً ان کی شکست فاش ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جیسا آپ کو خوف ہے۔ عیسائی اس روایت سے آنحضرت ﷺ کا راہب بحیرا سے رموز نبوت اور اصول شریعت کی تعلیم حاصل کرنا ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ محض افترا اور قطعی بے دلیل ہے۔ یہ مسلم ہے کہ یہی دلیل ان کا اصلی ماخذ ہے۔ مگر اس کی بالتمامہ عبارت سے ان کے دعوے کا ایک حرف بھی ثابت نہیں ہوتا۔ روایت موجود ہے عبارت حاضر ہے الفاظ پیش نگاہ ہیں۔ کوئی عیسائی بتلا دے کہ اس کے کس جملہ کس حرف اور کس لفظ کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ راہب بحیرا نے محمدؐ کو نبوت کے رموز اور شریعت کے اصول بتلائے۔ جب ایسے معنی نہیں نکلتے تو وہ ضرور جھوٹے ہیں۔ اور ان کا دعویٰ سراسر جھوٹا ہے اور ان کی فتح عظیم خالی ہوا میں قلعہ بندی ہے۔

یہ تو سرسری طور پر ان کی موہوم فتح عظیم کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو شبلی صاحب کو اتنا مخوف پریشان اور مضطر بنائے ہوئے تھی۔ ہم نے اس کو ان کی شکست فاش قرار دیا ہے۔ ہم اب اس کو ثابت کرتے ہیں۔ تاریخ طبری کے الفاظ روایت یہ ہیں۔

ان اباطالب خرج فی رکب من قریش الی الشام تاجراً وتھیأ الرحیل واجمع السیر صَبَّ به رسول الله صلی الله علیه واله وسلم فیما یزعمون فوق له اباطالب فقال والله لا خرجن به معی ولا یفارقنی ولا افارقه ابداً وکما قال فخرج به معه فلما نزل الرکب بصری من ارض الشام وبها راھب الیه بصیر علمھم عن کتاب فیما یزعمون یتوارثونه کابرا عن کابر فلما نزلوا ذلك العام بحیرا صنع لھم طعاما کثیرا وذلك انه رای رسول الله صلعم وھو فی صومعته علیه غمامة تظله من بین القوم ثم ابتلوا حتی نزلوا فی ظل الشجرة قریبا منه فنظر الی الغمامة حین اظلت الشجرة وھصرت اَغْصَان الشجرة علی رسو الله صلعم حتی استظل تحتھا فلما اری ذلك بحیرا انزل صومعته ثم ارسل الیھم فدعاھم جمیعا فلما رای بحیرا رسول الله صلعم بلخیطة لحظا شدیدا وینظر الی اشیاء من جسده قد کان

يجدها عنده من صفته فلما فرغ القوم من الطعام وتفرقوا سئل رسول الله صلعم عن اشياء فی حالة يقظته وفی نومه فجعل رسول الله صلعم يجيره فيجدها بحيرا موافقه لما عنده من صفته ثم نظر الی ظهره خاتم النبوة بين كتفه قال بحير لعمه اباطالب ما هذا الغلام منك قال ابنی فقال له بحيرا ماهو ابنك لهذا لغلام ان يكون ابوه حيا قال انه ابن اخی قال فما فعل ابوه قال مات وامه حبلی به قال صدقت رجع به بلدك واحذرعليه يهو دفوالله لئن راؤه عرفوا منه ما عرفت ليبغنه شراً فانه كان شان عظيم فاسرع به الی بلده فخرج به عمه سريعا حتی اقدمه مكة

ترجمہ: جناب ابی طالب علیہ السلام قریش کے تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کے قصد سے جانے لگے جب اسباب سفر اور سواری کا سامان درست ہوگیا تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملول ہوئے اس وجہ سے کہ مشہور تھا کہ آپ کے عم محترم آپ کو اپنے ہمراہ اس سفر میں نہیں لے جائیں گے۔ حضرت ابی طالب علیہ السلام نے آپ کو ملول دیکھ کر اور ملال کا باعث اس غلط خبر کو پا کر فرمایا کہ میں اپنے جگر گوشہ کو لیے بغیر کہیں باہر نہیں جا سکتا اور نہ کسی حالت میں کسی وقت اپنے جگر پارہ کو جدا کر سکتا ہوں۔ چنانچہ ابی طالب علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہمراہ لیا۔ جب قافلہ شہر بصرہ میں جو علاقہ شام کے توابعات سے ہے، پہنچا تو وہاں ایک راہب نصرانی رہا کرتا تھا۔ جس کا نام بحیرا تھا۔ اس کا وہاں خاص صومعہ (خانقاہ) تھا اور وہ اس زمانے کے تمام نصرانیوں میں باعتبار علم کتب سماویہ اعلم الناس تھا اور یہ کمالات علمی اس کو وراثتاً اس کے سلسلہ میں ایک بزرگ کے بعد دوسرے بزرگ سے ملے تھے۔ اس کی بار یہ قافلہ تجارت قریش وہاں منزل گزیں ہوا تو بحیرا نے ان کی ضیافت کے لیے بافراط کھانا تیار کرلیا اور یہ اس باعث سے تھا کہ اس نے جناب رسول خداصلعم کو اس حالت میں دیکھ لیا اور پہچان لیا تھا کہ بخلاف اوراہلیان قافلہ کے آپ کے فرق مبارک پر ایک پارہ ابر سایہ فگن تھا اس اثنا میں قافلہ کے لوگ آئے اور اس کے صومعہ کے پاس ایک درخت کے سایہ میں فروکش ہوئے۔ راہب بحیرا اس ابر سایہ فگن کو برابر دیکھ رہا تھا کہ اس درخت کی ڈالیاں بھی رسول اللہ صلعم کی طرف سایہ کر دینے کی غرض سے جھکنے لگیں۔ تا آنکہ انہوں نے آپ کے فرق

مبارک پر پورا سایہ کرلیا۔ یہ دیکھ کر راہب بحیرا اپنے صومعہ سے نیچے آیا اور تمام مجمع قریش کو اپنے پاس بلایا جب بحیرا کی نظر آپ کے روئے منور کی طرف پڑی تو بڑی دیر تک آپ کے جمال مبارک کی زیارت کرتا رہا اور آپ کے جسم مطہر میں ان اشیاء کا مشاہدہ کرتا رہا جو آپ کی صفات کے متعلق اس کی کتابوں میں لکھے تھے۔ اس نے پڑھے تھے۔ تمام لوگوں نے جب کھانے سے فراغت کی تو بحیرا نے جناب رسول خداصلعم سے آپ کے خواب و بیداری کے حالات استفسار کیے۔ آپ نے اسے بتلائے تو اس نے آپ کے جوابات کو بھی ان صفات مخصوصہ کے مطابق پایا۔ جو اس کی کتابوں میں لکھی تھیں۔ اس کے بعد اس نے آپ کی پشت مبارک پر غور کیا۔ تو مہر نبوت کو دوش مطہر کے درمیان پایا۔ پھر آپ کے عم محترم ابی طالب علیہ السلام کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا یہ لڑکا تمہارا کون ہے۔ حضرت ابی طالب علیہ السلام نے کہا میرا بیٹا ہے۔ راہب بحیرا نے کہا کہ یہ بیٹا آپ کا ہو نہیں سکتا اس لیے کہ میرے علم میں اس کے باپ کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت ابی طالب علیہ السلام نے جواب دیا یہ میرا بھتیجا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ اس کا باپ کیا ہوا۔ ابی طالب علیہ السلام نے کہا کہ وہ مر گیا اور اس کی ماں بھی گذر گئی۔ بحیرا نے کہا کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ اچھا تو آپ اس کو اپنے ہمراہ اپنے شہر کی طرف یہاں سے واپس لے جائیں اور اس کے متعلق یہودیوں سے ہمیشہ خائف رہا کریں۔ قسم خدا کی اگر وہ اسے دیکھ پائیں گے اور اسی معرفت کے ساتھ جیسا کہ میں نے اس کو پہچان لیا ہے وہ بھی پہچان لیں گے۔ تو پھر اس کے ساتھ شر وفساد برپا کریں گے۔ کیونکہ اس کے لیے ایک شان عظیم ودیعت ہوئی ہے۔ یہ سن کر آپ کے عم محترم آپ اپنے ہمراہ لے کر وہاں سے واپس ہوئے اور داخل مکہ ہو گئے۔

دوسری روایت طبری کی یہ ہے۔

خرج ابوطالب الی الشام وخرج معه رسول الله صلی الله علیه واله وسلم فی اشیاخ من قریش فلما اشرفوا علی الراهب هبطوا فحلو ارحالهم فخرج الیهم الراهب وکانو قبل ذالك یمرون به فلا یخرج الیهم ولا یلفت قال فهم یحلون رحالهم فجعل یخلل هم حتی جاء فاخذ بید رسول الله صلعم فقال هذا رسول رب العلمین هذا یبعثه الله تعالیٰ رحمة اللعلمین فقال له اشیاخ قریش ما

علمك قال انكم حين اشرفتم من العقبة لم يبق شجرة ولا حجر الا خر ساجدا ولا يسجدون الا النبي واني اعرفه بخاتم النبوة اسفل من غضروف كتفه مثل التفاحه ثم رجع فصنع لهم طعاما فلما اتاهم به كان في رعية الا بل قالوا ارسلوا عليه فاقبل وعليه غمامة فقال انظروا اليه عليه غمامة تظله فلما دنى من القوم وجدهم قد سبقوه فيها الى فئ فلما جلس مال الشجرة عليه فقل انظر و الى في الشجرة مال عليه مال فبينما هو قائم عليهم وهو ينشدهم الا يذهبوا به الى الروم فان الروم ان رأوه عرفواه بالصفة فقتلوه فالتقت فاذا هو بسعة نفر قداقبلوا من الروم فاستقبلهم فقال ماجاء بكم قالوا جئنا ان هذا النبي خارج في هذا الشهر فلم يبق طريق الا بعث اليها ناس وانا اخترباخيرة بعثنا الى طريقك هذا قال لهم هل خلفكم خلفكم احد هو خير منكم قالو لا انما اخترنا خيرة لطريقك هذا قال افرأيتم امراً اراد الله ان يقضيه هل يستطيع احد من الناس رده قالوا لا فتا بعوه واقاموا معه قال فاتاهم فقال انشد كم الله ايكم ولية قالوا ابي طالب عليه السلام فلم يناشده حتى ردوه وبعث معه ابوبکر رضی اللہ عنہ وبلالاً وزودوه الراهب من الكعك والزيت۔ طبری ص1126 ج من

ترجمہ: حضرت ابوطالب نے شام کا سفر کیا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اور تمام اکابرین قریش بھی قافلہ میں شامل تھے۔ جب یہ لوگ دیرِ راہب کے پاس پہنچے تو اتر پڑے اور اپنے سامان بھی قیام کرنے کے قصد سے اتار لیے وہ راہب اپنے صومعہ سے باہر نکلا۔ حالانکہ اس سے قبل قریش کا قافلہ تجارتی چند بار آ چکا تھا اور وہیں قیام کر چکا تھا۔ مگر وہ راہب کبھی ان کے پاس آیا تھا اور نہ ان لوگوں سے ملتفت ہوا تھا۔ راہب کی اس صورت حال اور طرز سلوک سے سامان اتارنے والوں کو حیرت انگیز فکر دامن گیر ہوئی یہاں تک کہ اس راہب نے آتے ہی حضرت محمد صلعم کا دست مبارک تھام لیا اور کہا کہ یہ سید العالمین اور رسول رب العلمین ہیں اور یہ وہی ہیں جن کو خدائے سبحانہ نے دونوں جہانوں کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سن کر اکابر قریش نے پوچھا کہ یہ تم نے کیسے جانا راہب نے جواب دیا

کہ جس وقت تم لوگ یہاں سے آئے اور اپنا داخلہ اور سامان سفر وغیرہ اتارنے لگے تو میں نے دیکھا کہ کوئی شجر اور کوئی حجر ایسا باقی نہیں رہا جو ان کے سجدہ تعظیمی کے لیے نہ جھک گیا ہو اور سوائے نبیؐ کے اور کسی کے لیے سجدہ تعظیمی نہیں کیا جاتا اور میں نے ان کو مہر نبوت سے بھی پہچان لیا۔ جو ان کے دوش مبارک کے حصہ زیریں کی طرف نمایاں ہے۔ یہ کہہ کہ وہ چلا گیا۔ اور ان لوگوں کی دعوت کے لیے کھانے پکوا کر اپنے ہمراہ لایا۔ تو آنحضرت صلعم اونٹوں کو چرا رہے تھے۔ راہب نے کہا کہ ان کو بھلا بھیجو جب آپ آئے تو فرق مبارک پر پارہ ابر سایہ گستر تھا۔ بحیرا نے قریش سے خطاب کر کے کہا کہ اس پارہ ابر کو دیکھتے جاؤ جو ان کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے پھر جب آپ قوم سے قریب آ گئے تو اس شجر سے بھی وہی کیفیت ظاہر ہوئی جو پہلی روایت میں بیان ہو چکی ہے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درخت کے نیچے بیٹھ گئے تو وہ درخت آپ کے اوپر جھک گیا بحیرا نے پھر مجمع قریش سے کہا کہ اس درخت کے جھکنے کو دیکھو پھر وہ راہب مجمع قریش میں کھڑے ہو کر کہنے لگا کہ میں تم سے تاکید کرتا ہوں کہ تم ان کو (آنحضرت صلعم کو) روم میں (علاقہ شام اس وقت روم کے ماتحت تھا) نہ لے جاؤ کیونکہ اہل روم اگر ان کو ان صفات کے ساتھ پہچان لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے۔ چنانچہ وہ آدمی جو روم سے ہو کر آئے تھے۔ بحیرا پہلے انہیں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ ان مشاہدات کا تمہیں انکشاف ہوا۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے یقین کر لیا ہے کہ یہ خدا کے فرستادہ نبی ہیں اور کوئی طریقہ مذہب ایسا نہیں ہے جس میں ایک نبی نہ مبعوث کیا گیا ہو۔ اور ہم لوگ اس طریقے کو بہتر سمجھتے ہیں اور جو اس طریقہ میں نبی مبعوث ہوا ہے اسی کو اختیا کرتے ہیں۔ بحیرا نے کہا کیا تم ایسے شخص کو چھوڑ دو گے جس کو تم اپنے اسلاف میں سب سے بہتر سمجھتے ہو۔ سب نے کہا نہیں۔ کیونکہ ہم اس کو اس کے طریقے میں نیکوکار سمجھ کر اختیار کر چکے ہیں۔ بحیرا نے کہا کیا تم ان اقرار و اعتراف کے بعد خدائے تعالی سبحانہ کو جھٹلا سکتے ہو۔ کیا کوئی تم میں سے اس کی مشیت کو روک سکتا ہے۔ سب نے کہا کوئی نہیں۔ ہم سب اسکی بیعت کریں گے اور اس کے ساتھ رہیں گے۔ بحیرا ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم میں سے اس شخص کا ولی کون ہے۔ سب نے کہا ابوطالب اس کے ولی ہیں۔ پھر بحیرا نے ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ اپنے مناشدہ کو تمام کیا۔ جب تک کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہاں سے لے کر واپس نہ ہوئے اور ابوبکرؓ اور بلالؓ بھی

آپ کے ہمراہ واپس آئے اور بحیرا نے کعک اور زیت کے تحائف آپ کے ہمراہ کر دیئے۔

تاریخ طبری میں ان دونوں مرقومہ بالا طریقوں سے یہ روایت مندرج ہے۔جن کی اصل عبارت نقل کر دی گئی ہے آخر روایت کے کچھ حصہ کا غیر مسلسل طور پر مولانا شبلی صاحب نے بھی سیرۃ النبیؐ میں ترجمہ فرمایا ہے۔اس لیے یقین ہے کہ شبلی صاحب نے تالیف کتاب کے وقت طبری کی دونوں روایتیں اور ان کی عبارتیں ایک بار نہیں کئی بار ملاحظہ فرمائی ہوں گی۔شبلی صاحب نے عیسائیوں کے اس متعصّبانہ اور مغویانہ دعویٰ کی اہمیت اور اصلیت کو خود تحقیق فرما کر عربی ماخذوں کو سیرۃ النبی میں نقل فرما دیتے اور معترضین کو دکھلا دیتے کہ تم جن عربی ماخذوں پر صرف اتہام لگا کر اپنی فتح عظیم کے ہوائی قلعہ باندھ رہے ہو۔وہ تو ان اصلی ماخذوں کے ایک لفظ سے کیا ایک حرف سے بھی ظاہر نہیں ہوتا۔بس یہیں سے عیسائیوں کے غلط اتہام و الزام کی حقیقت کھل جاتی اور آپ کے خاطر مبارک سے بھی عیسائیوں کے اس اعتراض کا خوف و اندیشہ نکل جاتا۔جس کی وجہ سے سخت اضطراب کے ساتھ اس قدر خامہ فرسائی کی بے کار زحمت اٹھائی گئی۔میں نے اس واقعہ کو حدیث و تاریخ کے معتبر ماخذوں میں دیکھا ہے۔سب سے زیادہ مفصل اور مسلسل طور پر ابن ہشام نے اس واقعہ کی پوری کیفیت قلم بند کی ہے۔ہم ان کی اصل عبارت کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ان اباطالب خرج فی رکب تاجر الی الشام فلما تهیا للرحیل واجمع المسیر صب به رسول اللهﷺ فیما یزعمون فرق له وقال والله لا اخرجن به معی ولا یبفارقنی ولا افارقه ابدا او کما قال فخرج به معه فلما نزل الرکب البصری من ارض الشام وبها راهب یقال له بحیرا فی صومعة له وکان الیه علم اهل نصرانیة ولم یزل فی تلك الصومعة منذ قط راهب الیه بطر اعلمهم عن کتاب فیها یزعمون یتوارثونه کابرا عن کابرا فلما نزلوا ذلك العالم بحیرا وکانو کثیرا مایمرن به قبل ذلك فلا یکلمهم ولا یعرض لهم حتی کان ذلك العام فلما نزلوا به قریبا من صومعة صنع له طعاما کثیرا ذلك فیما ترعمون عن شیء راه وهو فی صومعته ویزعمون انه رئی رسول الله صلعم وهو فی صومعته فی الرکب حین قبلوا او غمامة تظله من بین القوم قال ثم اقبلوا فنزلوا فی ظل الشجرة قریبا منه فنظر الی الغمامة طین اظلت الشجرة وتهصرت اغضان الشجرة علی رسول الله صلعم حتی استظل تحتها فلما رائی فلك بحیرا نزل صومعته وقد امر بذلك الطعام فصنع ثم ارسل الیهم فقال انی اصنعت لکم طعاما یامعشر قریش فانا احب ان

تختروا كلكم صغيركم و كبيركم وعبدكم حركم قال له رجل منهم والله بالجيران لك لشان اليوم ما كنت تضع هذا بناوقد كنتم بك كثرا فما شانك اليوم قال له بحيرا صدقت قد كان ماتقول ولكنم ضيف وقد احببت ان اكرمكم واصنع لكم طعاما فتاكلون منه كلكم فاجتمعوا اليه وتخلف عليه رسول الله صلعم بين القوم لحداثة سنة فى رجال القوم تحت الشجرة فلما نظر بحيرا فى القوم ولم يرى صفته التى يعرف ويجد عنه فقال يا معشر القريش لا يتخلفن احدمنكم عن طعامى قالوا له يابحيرا ما تخلف عنك احد ينبغى له ان يأتيك الا غلاما و هو احدث القوم منا فتخلف فى رحالهم فقال لا تفعلوا ادعواه فليحضر الطعام منكم قال فقال رجل من قريش وللات والعزى ان كا انؤم بأن يتخلف ابن عبد الله بن عبد المطلب عن طعام من بيننا ثم قام اليه فاحتضنه واجلسه مع القوم فقال راه بحيرا جعل بلخطة لحظا شديدا وينظر الى اشياء من جسده وقد كان يجدها عنده عن صفته حتى اذا فرع القوم من
طعامهم وتصرفوا قام اليه بحيرا فقال يا غلام اسئلك بحق اللات والغزى الا ما اخبرتنى عما سئلك عنه وانما قال له بحيرا ذلك لانه سمع قومه يحلفون بهما فزعموا ان رسول الله صلى الله عليه واله وسلم قال لا تسئلنى بااللات والعزى شيئا فوالله ما انغضت شيئا قط بغضهما فقال له بحيرا فا الله الا ما خبرتنى عما اسئلك عنه فقال له سئلنى عما بنلك فجعل يساء له عن اشياء من حاله من نومه وهيئته واموره فجعل رسول الله صلى الله عليه واله وسلم بخبره فيوافق ذلك ماعند ابحيرا من صفته ثم نظر الى ظهره فراى خاتم النبوة بين كتفيه على موضعه من صفة النبى عنده (قال ابن هشام وكان مثل اثر الحجر) قال ابن اسحق فلما فرغ اقبل على عمه ابى طالب عليه السلام فقال له ما هذا الغلام منك قال ابنى قال له بحيرا ماهو بابنك وما ينبغى لهذا الغلام ان يكون ابوه حيا قال

فانه ابن اخی قال فما فعل ابوه قال مات وامه حبلی به قال صدقت فارجع بأابن اخيك الى بلده واحذر عليه يهود فوا لله لئن راوه وعرفوا منه ما عررفت له ليبينه شرا فانه كائن لابن اخيك هذا شان عظيم فاسرع به الى بلاد فخرج به عمهٔ ابی طالب علیه السلام سریعاً حتی اقدمهٔ مکة حین فرغ من تجارة بالشام فزعموا فیما روی الناس ان زریرا وتماما ودریسا وھم نفر من اھل الکتاب قد کانو ارؤا من رسول الله صلعم مثل ما رؤه بحیرا فی ذلك السفر الذی کان فیه مع عمه ابی طالب علیه السلام فارادوھم فردھم عنه بحیرا وذکرھم الله وما یجدون فی الکتاب من ذخره وصفته وانهم ان اجمعو لما ارادو به لم یخلصوا الیه ولم یزل ھم حتی عرفوا ماقال لھم وصدقوہ بما قال فترکوہ وانصرفوا عنه ابن ھشام جلد اول ص 62 مطبوعہ مصر

ترجمہ: حضرت ابی طالب علیہ السلام نے بغرض تجارت سفر شام کا قصد کیا اور سامان سفر وغیرہ جمع ہوگیا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملول خاطر ہوئے جیسا کہ مشہور تھا کہ ابی طالب علیہ السلام اس سفر میں آپؐ کو ساتھ نہ لے جائیں گے۔ یہ معلوم کرکے حضرت ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے بغیر کہیں باہر نہیں جاسکتا۔ اور میں کبھی تم کو اپنے ساتھ سے جدا نہیں کرسکتا۔ یہ فرما کر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے کر ہمراہ قافلہ تجارت قریش روانہ ہوئے۔ یہ قافلہ شہر بصریٰ میں جب متعلقات شام میں پہنچا تو وہاں ایک راہب رہتا تھا۔ جس کو بحیرا کہتے تھے اور اس کا ایک صومعہ خاص رہنے کے لیے تھا۔ اور وہ نصرانیت کا عالم متبحر تھا اور اس صومعہ میں اس سے بڑھ کر کوئی عالم ترین راہب نہیں گذرا تھا اور اس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس کا علم وکمال وراثتاً ایک بزرگ کے بعد دوسرے بزرگ سے سینہ بسینہ پہنچا تھا۔ اب کے بار یہ قریشیوں کا تجارتی قافلہ بخلاف اس کے قبل میں وہیں اکثر بار اتر چکا تھا مگر نہ اس راہب نے ان لوگوں سے گفتگو کی تھی اور نہ ان سے کسی قسم کا تعرض کیا تھا۔ اس بار جب یہ لوگ اس کے صومعہ کے قریب اترے تو بحیرا نے ان لوگوں کی ضیافت کے لیے افراط سے کھانے پکوائے اس کی نسبت ان لوگوں نے خیال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر اس نے یہ نوعیت کی ہے۔ کیونکہ جب

یہ لوگ اترے تھے۔تو وہ اپنے صومعہ سے دیکھ رہا تھا کہ اہل قافلہ کے درمیان آپ کے سر مبارک پر ایک پارہ ابر سایہ فگن ہے۔تا آنکہ اسی حالت سے قافلہ کے سب لوگ ایک درخت کے نیچے جو وہاں سے بالکل قریب تھا فروکش ہوئے تو پھر اہل قافلہ نے اس پارہ ابر کی طرف نظر کی تو اس کو اس درخت پر سایہ گستر دیکھا۔اور درخت کی شاخوں کو بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سایہ افگنی کی غرض سے سرنگوں پایا۔جب بحیرا نے یہ مشاہدہ کیا تو وہ اپنے صومعہ سے نیچے اترا۔تب ان لوگوں کی دعوت کا انتظام کیا اور جب کھانے پک چکے تو ان لوگوں کے پاس کہلا بھیجا کہ حضرات قریش میں نے آپ کی مہمانی کے لیے کھانے پکوائے ہیں اور میری استدعا ہے کہ آپ سب لوگ چہ بزرگ چہ اطفال چہ غلام چہ آزاد تشریف لا کر ماحضر تناول فرمائیں۔قریشیوں سے ایک صاحب کہنے لگے کہ اے بحیرا شاید آج کے دن کے لیے کوئی مخصوص شان ہے۔کیونکہ تم نے ہمارے ساتھ اس سے قبل کبھی ایسے محاسن سلوک ظاہر نہیں کیے تھے آج کی کیا شان ہے؟ بحیرا نے جواب دیا آپ لوگ سچ فرماتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ آپ لوگ مہمان ہیں۔آج میری یہ خواہش ہوئی کہ میں آپ حضرات کا اکرام وتواضع کروں اور آپ کے لیے کھانے تیار کراؤں کہ آپ سب لوگ مل کر کھائیں۔چنانچہ سب لوگ خوان دعوت پر جمع ہوئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صغر سنی اور نیز سامان کی نگرانی کی وجہ سے اسی درخت کے نیچے چھوڑ دیا۔جب بحیرا نے تمام لوگوں کے مجمع پر نظر کی اور کسی کو بھی ان میں سے اس صفت کا نہیں دیکھا جس کو وہ پہچان چکا تھا تو کہنے لگا کہ حضرات قریش! کیا آپ نے کسی آدمی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔اور اس کو دعوت میں شریک نہیں کیا ہے لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے ان تمام لوگوں میں سے جن کو تم نے دیکھا ہے کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔مگر ہاں ایک لڑکے کو البتہ اپنے سامان کی نگرانی کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔بحیرا نے کہا نہیں ایسا نہ کیجئے ان کو بھی بلا لیجئے اور دعوت میں شریک کر لیجئے۔اسی اثناء میں سے مجمع میں سے ایک صاحب بول اٹھے کہ لات وعزیٰ کی قسم یہ ہماری لئیم الطبعی ہے کہ اگر ہم اس دعوت میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یتیم فرزند کو چھوڑ دیں اور اس کو کھانے میں اپنا شریک نہ کریں۔یہ کہہ کر وہ اٹھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لا کر تمام قوم کے ساتھ خوان دعوت پر بٹھلا دیا۔جب بحیرا نے آپ کو دیکھا تو لحاظ خاص سے دیر تک خوب غور کرتا رہا اور پھر آپ کے جسم مبارک پر کچھ اشیاء کو دیکھتا اور تلاش کرتا رہا۔تا آنکہ ان تمام اشیاء کو پا گیا۔جن کو وہ آپ کے

صفات خاص کے متعلق خاص طور پر جانتا تھا جب تمام لوگ کھانے سے فراغت پا چکے اور ادھر اُدھر منتشر ہو گئے تو بحیرا نے آپ سے کہا کہ اے نوجوان! تجھ کو لات وعزیٰ کی میں قسم دیتا ہوں کہ میں تم سے اس وقت جو پوچھتا ہوں تم اس کا پورا جواب دو۔ بحیرا نے اس وجہ سے آپؐ کو لات وعزیٰ کی قسم دی تھی کیونکہ وہ آپ کے اہل قافلہ کو ان کی قسم کھاتے ہوئے سن چکا تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیرا کا یہ سوال سن کر ارشاد کیا کہ مجھ سے لات وعزیٰ کی قسم دے کر کوئی شے نہ پوچھو مجھے کسی شئے سے اتنی نفرت اور بغض نہیں ہے جتنا ان دونوں سے۔ یہ سن کر بحیرا نے پوچھا کہ اچھا تو آپ کو اب خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ میں اب جو کچھ آپ سے پوچھتا ہوں آپ مجھے اس کا پورا جواب دیں۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اب جو پوچھنا ہے وہ پوچھو۔ یہ سن کر بحیرا نے آپ سے آپ کی خواب و بیداری اور دیگر حالات وغیرہ کے متعلق سوال کیے اور آپ نے اس کے مستفسرات کے جواب اس کی معلومات کے مطابق دیئے۔ جو اس کو آپ کی صفات مخصوصہ کی نسبت پہلے سے حاصل تھی۔ اس کے بعد اس نے آپ کے دوش مبارک کے درمیان مہر نبوت کا مشاہدہ کیا اور یہ بھی ان علامات میں داخل تھی۔ جو اس کو آپ کی صفات کے متعلق پہلے سے معلوم تھی۔ ابن ہشام کہتے ہیں کہ مہر نبوت نشان حجامت یعنی پچھنے کے ایسے نشان تھے۔ جب بحیرا آپ کی تلاش حالات اور مشاہدات صفات وغیرہ سے فراغت کر چکا تھا تو جناب ابی طالب علیہ السلام سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا کہ یہ نوجوان آپ کا کیا لگتا ہے۔ ابی طالب علیہ السلام نے کہا میرا بیٹا ہے۔ بحیرا نے کہا یہ آپ کا بیٹا تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ مجھے جہاں تک اس کے متعلق علم اطلاع ہے۔ اس کا باپ زندہ نہیں ہوگا۔ ابی طالب علیہ السلام نے کہا میرا بھتیجا ہے۔ بحیرا نے کہا اس کے باپ کا کیا ہوا۔ ابی طالب علیہ السلام بولے انہوں نے قضا کی اور ان کی ماں بھی گذر گئیں۔ بحیرا نے کہا آپ سچ فرماتے ہیں۔ آپ اپنے بھتیجے کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے شہر کی طرف جلد واپس جایئے اور ان کی نسبت یہودیوں سے ہمیشہ خائف رہا کیجئے۔ کیونکہ وہ لوگ اگر انہیں دیکھ پائیں گے اور اسی معرفت سے جس معرفت سے میں نے انہیں پہچان لیا ہے پہچان لیں گے۔ تو ان کے لیے بہت سے مفاسد پیدا کریں گے۔ کیونکہ آپ کے اس بھتیجے کے لیے مرتبہ عظیم حاصل ہونے والا ہے اس لیے آپ جلد انہیں لے کر یہاں سے چلے جائیں۔ بحیرا کا یہ کلام سن کر حضرت ابی طالب علیہ السلام آنحضرتؐ کو لے کر بسرعت تمام وہاں سے روانہ

ہو گئے۔ اور داخل مکہ ہو گئے۔ جب اس قافلہ تجارت کو شام میں تجارت سے فراغت ہوئی۔ جیسا کہ بقول مشہور اہلیان قافلہ سے زیر تمامہ اور دریس نامی یہودیوں نے آنحضرتؐ کو ہمراہ ابی طالب علیہ السلام اس سفر میں دیکھ لیا تھا اور انہیں صفات مخصوصہ سے پہچان لیا تھا۔ تو آنحضرتؐ کی نسبت اسی وقت سے ارادہ بد کر لیا تھا۔ لیکن بحیرا نے اس پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ خدا کی قسم کیا تم نے اپنی کتاب میں اس کی یہ صفات اور حالات نہیں پائے ہیں اور اس خیال سے کہ وہ بد بخت آپ کے ساتھ ارادہ بد کر چکے ہیں۔ اس لیے بحیرا نے ان کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک ان لوگوں نے بحیرا کے اقوال معرفت آنحضرت صلعم کی صداقت نہ کر لی۔ اس کے بعد وہ لوگ اپنے مفسدوں کی نیت سے باز آئے اور وہاں سے چلے گئے۔

ہم نے مضمون زیر بحث کے متعلق عربی ماخذوں کی متعدد عبارتیں نقل کر دیں صرف اس لیے کہ دنیا دیکھ کر اور پڑھ کر بتلا دے کہ ان طویل اور پر تفصیل عبارتوں کے کس جملہ اور کس فقرے سے عیسائی مولفین آنحضرتؐ کی راہب بحیرا سے تعلیم پانے کے معنی لیتے ہیں اور اس بنا پر شبلی صاحب کو عیسائیت کی فتح عظیم کا خوف دلاتے ہیں۔ واقعات تو صاف صاف بتلاتے ہیں کہ بحیرا نے عادت انبیاء اور سیرت مرسلینؑ کے مطابق آپ سے آپ کے ذاتی حالات وصفات کے متعلق چند مستفسرے پیش کیے اور آپ نے اس کے تمام سوالوں کے کافی جواب دیئے۔ جن کو سن کر بحیرا نے آپ کو موصوف بصفات چند انبیاء ہونا بطور کامل یقین کر لیا اور بس۔

اتنی قلیل مکالمت اور مخاطبت سے کون بے عقل آنحضرتؐ کی نسبت تعلیم و تلقین یا تدریس پانے کے معنی لگائے گا ہاں اگر اس قلیل مکالمت کے علاوہ بحیرا کے ساتھ آپ کی صحبت، خلوت اور مشاورت کسی کتاب میں منقول ہوتی تو عیسائیوں کی ان بدگمانیوں کے لیے کسی قدر گنجائش ہو سکتی تھی۔ مگر یہاں تو سرے سے اس خیال کا وجود ہی نہیں۔ پھر ایسے بے وجود اور لا اصل خیال کی فکر کیسی اور خوف ہی کیا۔ یہ سب توہمات متعصّبانہ ہیں۔ جو مختلف قسم کے مہیب صورتوں میں پیدا ہو کر اقطاع عالم میں عالم فریبی کے خاص عالم دکھلا رہے ہیں۔ حقیقت شناس تو اس فتح عظیم کے وسواس کے پاس بھی نہیں جاتا۔ بلکہ حقیقت کی نگاہوں سے جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ان کی اس قیاسی فتح عظیم کو شکست کامل بتلاتا ہے کیونکہ صورت واقعہ ثابت کر رہی ہے کہ عیسائیت کے اتنے بڑے عالم متبحر نے جو علم وکمال کے اعتبار سے اس زمانے کی عیسائی دنیا میں اپنی مثال اور اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی کامل طور پر تصدیق کر لی۔ بلکہ مہر تصدیق بھی کیسی عامیانہ اور کورانہ نہیں بلکہ محققانہ اور معترفانہ علاوہ بریں۔ یہ تصدیق اور یہ توثیق بھی کیسے کی اور کیوں کر کی۔ اس طرح کے کتب سماویہ کے صفات مندرجہ سے مطابقت کرنے کے بعد اپنی تصدیق و تحقیق معرفت کا اظہار و اقرار کیا۔ اس تحقیق و تصدیق پر بھی اکتفا نہیں کی گئی۔ مشاہدہ کے بعد تجربہ بھی کر لیا گیا۔ جس طرح ابھی ابھی ابن ہشام کی عبارت سے ثابت ہوا کہ اول راہب نے ان صفات کو آپ میں مشاہدہ کر کے تمام قریش کی دعوت کا سامان کیا۔ لیکن مہمان جب کھانے کو بیٹھے تو بحیرا کی واقف کار اور محو انتظار آنکھوں نے اس صفت کا تمام مجمع میں کسی ایک کو بھی نہ پایا جس کے خیر مقدم میں اس ضیافت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا اور حقیقت حال یہ

تھی کہ ان صفات سے موصوفہ اور ان خصوصیات سے مخصوص جوذات مقدس تھی وہ اس مجمع میں بحیرا کے پیش نظر نہیں تھی تا آنکہ آنحضرت صلعم خاص طور پر بلوائے گئے۔ جب تشریف لائے تو بحیرا کو تمام اوصاف وخصائص نظر آنے لگے۔اس کے بعد طبری کے الفاظ میں راہب بحیرا کا کہنا ھذا سید المرسلین بعثہ رحمۃ اللعالمین اس کی تصدیق رسالت اور اقرار نبوت کا کامل ثبوت ہے۔

بحیرا کی یہ تصدیق نبوت ایسی کامل اور جامع تھی کہ جس کی توثیق وتطبیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔تو گویا راہب بحیرہ کی معرفت تمام کتب سماویہ کے مطابق تھی پھر اس کے کمال میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔اسی بنا پر اکثر علمائے اسلام نے اس کے سابق الایمان ہونے کی تصدیق فرمائی ہے۔دیکھو زرقانی جلد اول تذکرہ راہب بحیرا۔علاوہ بریں امام المتکلمین فخر الدین رازی کی معرفت نبوت کی قرارداد اصول کے مطابق اگر چہ ایسے شخص نے اقرار شہادتیں بھی نہ کیا ہو۔تاہم ایسے شخص کا ایمان بھی خالص ثابت ہوتا ہے اور اسلام بھی کامل (دیکھو الکلام شمس العلماء مولانا شبلی مطبوعہ حیدرآباد)

بحیرا کے اقرار نبوت کے بعد اس کا اعلان بھی مرقومہ بالا مشاہدہ تاریخی سے ثابت ہوتا ہے۔حضرت ابی طالب علیہ السلام کا آنحضرت صلعم کی شان عظیم سے آگاہ کرنا اور بصرے سے فوراً ہی مکہ واپس لے جانے کی تاکید شدید کرنا۔اشرار یہود کا جو ظاہر میں احبار یہود کہلاتے تھے مگر حقیقت میں خونخوار تھے اور سفاک۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ارادہ بد کرنا۔بحیرا کا ان کے مفسدوں پر ان کو سرزنش کرنا اور انہیں کی کتابوں سے ان کو معقول کرنا یہ سب کیا تھا۔نبوت کی سچی پہچان تھی اور رسالت کا نمایاں اعلان۔موجودہ صورت حال کو دیکھ کر اور پڑھ کر ہر شخص بلا تکلف سمجھ لے گا کہ اس عالم نصرانی کے موجودہ طرز عمل نے نصرانیت کی حقانیت پر محویت کا قلم پھیر دیا اور عیسائیت کو شکست کامل پہنچا کر صداقت اسلام کی فتح عظیم کا اعلان عام کر دیا ہے۔

مسیحی مصنفین کی خاص عادت ہے اور عیسائی معترضین کا قدیم طرز تحریر ہے کہ وہ اسلام کی نقل واقعات میں طرح طرح کی قلم کاریوں سے کام لیتے ہیں اور اپنے مغویانہ غرض ومقاصد سے ان کے غلط معانی لگانے اور خلاف مطلب بتلانے میں ذرا بھی شرم نہیں کرتے۔جیسا کہ راہب بحیرا کی حقیقت حال سے منکشف ہوا۔

اس مبحث طولانی کے خاتمہ میں ہمیں اتنا اور بتلا دینا ضروری ہے کہ شبلی صاحب ہوں یا سرسید احمد خان، ان حضرات کا اس واقعہ کے وجود سے ہی انکار کرنا ایک بے کار کوشش ہے۔کیونکہ ایسے صریح انکار سے مؤرخین اور محدثین اسلام پر کیا منحصر ہے موضوعیت اور کذب وافتراء کا التزام صحیحین تک پہنچ جاتا ہے اور معترضین کی نگاہوں میں اسلام کے ایسے مستند اور معتبرین علمائے محدثین کی بے اعتباری اور غلط نگاری ثابت کرتا ہے جن کی تالیفات اور تصنیفات کے اعتبار پر اصول اسلام کے دفتر کی شیرازہ بندی منحصر ہے۔ایسی حالت میں یہ تردید انکاری تمام کتب حدیث وصحاح کی کساد بازاری کر دے گی۔حالانکہ ان کی خطا ذرا بھی ثابت نہیں واقعہ صحیح ہے۔جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں مگر خوش قسمتی سے عقیدت مندوں نے جو جوڑ لگایا ہے۔وہ ایسا بے موقع اور بے تکا ہے کہ اصل وپیوند کا فرق صاف نظر آتا ہے۔یہ اہل صحاح کی سادہ لوحی ہے یا اپنے اصول اور طریقہ کی پابندی کہ اس عیب کو آج تک نہ نکال سکے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے سراپا موضوع ہونے کے متعلق شبلی صاحب نے صحیح ترمذی کا قول یا تاریخ طبری کی رواۃ کی جرح وقدح تعلیل وتعدیل قائم کی ہے۔ وہ سب دور از کار اور بے کار طومار ہے۔ خود شبلی صاحب نے سیرۃ النبی کے جلد اول اور جلد دوم میں بہت سی ایسی حدیثیں مندرج کی ہیں جو مراسیل، غریب، احاد اور ضعاف میں داخل ہیں۔ اور ان کتابوں سے برابر حوالے دیئے ہیں۔ جو تمام اقسام کی حدیثوں پر حاوی ہیں۔ ہم تو شبلی صاحب کے اس محققانہ اور متقدانہ احتیاط کے اس وقت قائل ہوتے جب ہم دیکھتے کہ اپنی ایسی کتابوں کو اپنا ماخذ نہ بنایا ہوتا شبلی صاحب کو سمجھنا چاہیے کہ ان کتابوں پر منحصر نہیں۔ ایک ترمذی کیا تمام کتب صحاح احادیث مراسل سے پُر ہیں۔ شبلی صاحب اگر صحاح میں صرف مصدوق ومرفوع کی تنہا شرط قائم کر دیں گے تو اس معیار پر نہ بخاری بخاری رہے گی اور نہ مسلم مسلم۔ چونکہ ہم اس بحث کو کسی قدر اوپر لکھ آئے ہیں اس لیے اس میں زیادہ طوالت بے کار ہے۔

باقی رہا شبلی صاحب کا یہ کہنا کہ ابوموسیٰ الاشعری چونکہ شریک واقعہ نہیں تھا اس لیے اس کا قول قابل قبول نہیں یہ آپ کا وہم ہے۔ جو سرسید کی طویل حسن خدمت سے عارض ہوا ہے۔ ان کو بھی خطبات کے اکثر مقامات میں ایسے ہی توہمات پیش آ چکے ہیں۔ اعتراض پہلے دونوں حضرت کو اپنی تعریض کی حقیقت اور مطابقت قائم کر لینی تھی اور وہ کسی طرح قائم نہیں ہوسکتی۔ ظہور رسالت کے واقعات جو صحابہ کی زبانی مرقوم ہیں۔ ان میں آپ حضرات ان کی ذاتی شرکت کی تلاش کیوں کر کر سکتے ہیں۔ اور ان کی شرکت کو کیسے پاسکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے ایسے قدیم صحابہ کی شرکت کو ابھی ابھی آپ خود موضوع ومجہول ثابت کر چکے ہیں اور حقیقتاً ہے بھی ایسا ہی۔ تو پھر ابوموسیٰ الاشعری اور دیگر متاخرین صحابہ کی شرکت کی تلاش تو ایک کھوئی ہوئی عقل والے کا کام ہوگا۔ حضرت ابوبکرؓ مذکورہ بالا واقعہ میں اگر شریک نہیں تھے تو پیدا تو ضرور ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کا اس واقعہ کا ذکر کرنا اگرچہ عقلاً مستبعد ہوگا مگر محال وناممکن نہیں ہوسکتا۔ لیکن ان کے ذکر شرکت پر ایسا شدید انکار کیا گیا تو پھر اس واقعہ میں ابوموسیٰ اشعری کے ایسے متاخرین صحابہ کی تلاش شرکت تو اپنے معیار سے خود انکار کرنا ہے اس لیے شرکت واقعہ کی دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ ہاں آپ کو اس کے پوچھنے کا حق ضرور حاصل ہے۔ کہ ابوموسیٰ نے کس سے سنا؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عالمان احادیث اور امامان مرویات نے قول صحابہ کو اتنی اہمیت اور عظمت دے کر نقد احادیث کے اصول میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ مراسیل صحابہ صحیح ہیں اور معتبر تو ایسی حالت میں اس مستفسرہ کا حق بھی آپ کو مشکل سے حاصل ہوسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس بحث کو اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتے اور اتنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔

راہب بحیرا کا واقعہ اسلام کی صداقت اور آنحضرت صلعم کی رسالت ونبوت کا معیار عظیم ہے۔ رحمۃ اللعالمین کے صفات قدسیہ اور سید المرسلین کے کمالات نبویہ کے متعلق اس عالم نصرانی کا اقرار، اعتراف اس کی تصدیق وتوثیق حقیقت میں اصول اسلام کی بنیاد کو ایسی مستحکم اور استوار کرتی ہے جو نصرانیت اور رہبانیت کے بڑے بڑے زور آزما پہلوانوں کے ہلائے نہ ہل سکتی ہے نہ گرائے گر سکتی ہے۔ عیسائیوں کی دراصل یہ کمزوری ہے اور اس کے اصول کا حقیقی ضعف جو اسلام کی ایسی عظیم الشان فتح کو صرف عالم فریبی کی غرض سے عیسائیت کی کامیابی بتلاتے ہیں۔ یہ ان کا ایسا غلط دعویٰ ہے جو نہ عقل سے ثابت ہوسکتا ہے نہ نقل سے۔

ہمیں آخر میں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ مولفین اسلامی سے اس واقعہ کی نقل واندراج میں غلطی بھی واقع ہوئی ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محدثین سے زیادہ مؤرخین کا طبقہ اس کے لیے زیادہ جوابدہ ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ بحیرا کے واقعہ کو تمام مؤرخین اسلامی نے عموماً واقعات تاریخی کے سلسلہ میں بیان کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نزدیک یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا جب سن مبارک بارہ تیرہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس بنا پر تمام تاریخوں نے ولادت آنحضرت صلى الله عليه وآله وسلم کے بارہویں سال کے تفصیلی حالات میں اس واقعہ کو قلم بند کیا ہے۔ مؤرخین کو اس کے نقل سے پہلے اس کی اصلیت اور مناسبت پر لحاظ کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں کہ یہ واقعہ آپ کی عمر کے بارہویں سال میں واقع ہوا لیکن سوائے اس تعلق اور مناسبت کے اس واقعہ کو آپ کے ذاتی حالات سے جو سیرت کا نہ اصل موضوع ہے اور نہ مقصود۔ کوئی علاقہ اور واسطہ نہیں۔ اس واقعہ میں جس قدر حالات ہیں وہ آپ کے صفات وعلامات نبوت وغیرہ کا انکشاف کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اس واقعہ کے نقل وذکر کا یہ مقام نہیں تھا۔ بلکہ اس کو اعلان نبوت اور اظہار رسالت کے قریب جگہ دینی چاہیے تھی اور نبوت کی پیشن گوئیوں اور سلسلہ بشارت میں ان کو قلم بند کرنا بہتر تھا۔ لیکن بایں ہمہ یہ مقامی نامناسبت اس واقعہ کی موضوعیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ مؤرخین نے چونکہ عام طور سے آپ کی بشارت کو وقوعات قبل از ولادت سمجھ کر اپنی اپنی تالیفات میں بہت کم بیان کیا ہے اور اپنے موضوع تالیفی سے زیادہ سمجھا ہے اور ایک حد تک صحیح سمجھا ہے۔ اس لیے اس واقعہ کو آپ کی صغرسنی کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ مگر وہ نقل بھی اسی حد تک ہے جس حد تک اس کی اصلیت ہے۔ اور وہ اتنی ہی ہے۔ کہ جناب رسالت مآب صلى الله عليه وآله وسلم کی ذات بابرکات میں بحیرا کی نبوت ورسالت کے وہ تمام صفات وعلامات جو اپنی کتب وصحائف میں اس نے پڑھے تھے۔ تمام کمال ومشاہدہ کیے۔ خود ان کی تصدیق کی اور دوسروں سے کرائی۔

مؤرخین اسلام کا اس واقعہ کے نقل وذکر سے صرف اس قدر مدعا تھا۔ اور اس کی حقیقت واصلیت بھی اتنی ہی تھی۔ عیسائی مصنفین کی دیانت داری اور حقیقت نگاری کا مقتضا یہی تھا کہ اس واقعہ کو وہیں تک محدود رکھتے جہاں تک انہوں نے اصل ماخذوں میں پایا تھا۔ جیسا کہ مولانا شبلی صاحب بتلا آئے ہیں۔ اور منشا دیانت وعدالت یہی تھا کہ اس کے مقاصد ومطالب میں مغویانہ قلم کاریوں سے کام نہ لیتے۔ تو اہل اسلام کو ان کے ان تحریفانہ طرز عمل کی تنفید وتردید کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن مقتضائے طبیعت نیست کہ مطابق ان کے تعصب اور نفسانیت نے اس موقع کو اپنی عالمفریب قلم کاریوں کے لیے غنیمت سمجھا اور اس سے وہ لایعنی اور مہمل معنی ومطالب نکالے جن کو نہ حقیقت سے واسطہ ہے اور نہ اصلیت سے سروکار۔

مرقومہ بالا واقعات سے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت ابی طالب علیہ السلام آنحضرت صلى الله عليه وآله وسلم کو لے کر اس مقام سے واپس آ گئے اور اپنے جگر گوشہ کی حفاظت جان کے مقابلہ میں مال تجارت کے نقصان یا اصل سرمایہ کے تاوان کا کوئی خیال اور کوئی پرواہ نہیں کی۔ قریش کا یہ سالانہ تجارتی قافلہ تھا اور اس میں ان کے قدیم دستور کے مطابق تمام قبائل عشائر کے اکابر وعمائدین میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ ابی طالب علیہ السلام کے سوا عبدالمطلب کے اور صاحبزادے بھی شامل تھے۔ بحیرا نے جناب رسالت مآب صلى الله عليه وآله وسلم کی

حفاظت ونگرانی سے متعلق جو کچھ کہا تھا اور تائید کی تھی وہ ان سب کے سامنے تھی۔ اور نیز آپ کی ذات میں نبوت ورسالت کے جو صفات وعلامات پائے تھے ان کا اعلان کیا تھا۔ وہ سب کے مقابلہ میں کیا تھا۔ لیکن بحیرا کی اس صلاح وتاکید کا جو کچھ اثر ہوا وہ صرف حضرت ابی طالب علیہ السلام کے قلب پر اور کسی پر نہیں۔ یہاں تک کہ عبدالمطلب کے اور بیٹوں میں سے کوئی صاحب اتنا بھی موثر نہ ہوئے کہ تجارت کے کاروبار میں چند دنوں بھائی بھتیجے کو بصرے سے مکہ تک پہونچا دیں۔ ابی طالب علیہ السلام اس کی اصلیت کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کی نسبت نہ بھائیوں سے اصرار کیا اور نہ التماس! اس لیے کہ وہ اپنے موجودہ منصب کی ذمہ داریوں سے خوب واقف تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ حضرت عبدالمطلب نے اس منصب کی تفویض میں تعمیم نہیں اختیار کی اور اس ودیعت الٰہی کی حفاظت ونگرانی کے لیے تخصیص جاری فرمائی۔ جو حقیقتاً نظام مشیت کا اصلی منشاء ومدعا تھا۔ تو پھر اس میں دوسروں کی امداد واعانت کا خواستگار ہونا نظام قدرت میں خلل ڈالتا ہے۔ حضرت ابی طالب علیہ السلام کی یہ احتیاط، یہ استقلال، اور یہ پاداری ان کے ان ذاتی خصوصیات وصفات کا پورا ثبوت دیتی ہے۔ جن کی بنا پر حفاظت رسول صلعم کے منصب اعلیٰ کے لیے مدبرین قدرت نے ان کا انتخاب فرمایا تھا۔ اور ان کے موجودہ اور آئندہ طرز عمل اور حسن خدمات نے اس کے لیے اس کو پورا موزوں اور مناسب ثابت کر دیا۔

محاسن اطوار قبل از بلوغ

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک اس وقت بارہ برس کا ہو چکا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ طفولیت تمام ہو رہی تھی اور شباب کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس سفر کے بعد پھر کامل جوان ہونے کے زمانہ تک آپ کا سفر کرنا صحیح طور پر ثابت نہیں۔ بعض حدیثوں کی کتابوں سے ہمراہی ابی طالب علیہ السلام آپ کا شام کی طرف دوبارہ جانا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ مرویات اصلاً ونقلاً وہی ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی مشارکت کی معتقدانہ تاویلات ہیں۔ اور صحت سے بالکل خالی۔ بعض مؤرخین نے محدثین کے زیر اثر اس کو جا بجا نقل بھی کر دیا ہے مگر وہ اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس سفر کے بعد پھر آپ نے کامل جوان ہونے کے زمانہ تک کہیں سفر نہیں کیا اور نہ ابی طالب علیہ السلام آپ کو پھر کسی سفر میں اپنے ہمراہ لے گئے۔

اس وقت سے لے کر جوان ہونے کے زمانہ تک آپ کی ذات بابرکات ان محاسن صفات سے تمام اعلیٰ اور یکتا جو ہر ظاہر و آشکار ہونے لگے جو عام فطرت انسانی میں نہایت کم بلکہ نہیں پائے جاتے تھے۔ آپ کے تمام قویٰ مدرکہ اسی وقت فضل وکمال کے اس حدود انتہائی تک پہنچے ہوئے تھے جن تک ان کا دسترس دشوار تھا۔ قوائے عملی، نظری اور حسنی کے کمالات سے آپ کے تمام محاسن اعمال اور مکارم اخلاق واضح تھے۔ نیک نفسی، سلامت روی، پاکیزہ طبعی ہر طرز عمل سے پیدا تھے۔ شرم وحیا، کرم وعطا، زہد واتقا، صبر وتحمل اور عدل وانصاف آپ کے خاص شعار صلہ رحم، ادائے حقوق جار اور اعانتِ مظلوم آپ کے صفات ذاتی کے اصلی معیار تھے۔ حلم ووقار، تواضع، راست گوئی اور امانت داری آپ کے فطرت صالحہ کے حقیقی جوہر، غور وفکر، ترک علائق اور استحقاق فی الحقائق، ترکیب طبع قدسیہ کے اصلی عنصر تھے۔ مقدس طبیعت اچھی باتوں پر جس طرح ہمیشہ راغب اور مائل رہا کرتی تھی۔ اسی طرح بری باتوں سے دور اور متنفر رہتی تھی۔ ایماندار، دیانتدار اور صداقت شعار لوگوں سے ملنے جلنے کے لیے جتنا میلان طبیعت تھا اتنا ہی مغرور، ظالم، درشت خو، کینہ پرور، کج خلق اور خود غرض لوگوں کی صحبت سے احتراز واستحفاظ اختیار کیا جاتا تھا۔ ان محاسن صفات کا اسی وقت سے مکہ کے تمام قبائل اور اقوام پر اتنا اثر تھا کہ ہر فرد بشر آپ کو ایک بڑی عظمت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ خلوت وجلوت کی صحبتوں میں آپ کا سکوت کم سخنی اور اکثر خاموشی، حاضرین کے قلوب پر خاص اثر کرتی تھی۔ مجمع میں تکلم کے وقت لفظ لفظ سے صحت وصداقت، فصاحت وبلاغت کی اس کثرت سے گوہر ریزی ہوتی تھی کہ کسی کو مجال سخن نہیں ہوتی تھی۔ ابن سعد نے طبقات میں ان تمام صفات کو ذیل کی عبارت میں نقل کیا ہے۔ طبری اور ابن ہشام بھی قریب قریب یہی عبارت درج ہے۔

وشب رسول الله صلى الله عليه واله وسلم مع ابى طالب عليه السلام يو كله الله ويحفظه ويحوطه من امور الجاهلية ومعا بينهالما يريد من كرامة وهو على دين قومه حتى بلغ ان كان رجلا افضل قومه مودة واحسنهم خلفا واكرمهم مخالطة واحسنهم جوارا واعظمهم حلماً وامانة واصدقهم حديثا وابعدهم من

الفحش ولا ذی وما رای ملاحیا ولا مما ریا احداً حتی سماہ قومہ الامین لما جمع الله له من الامور الصالحة فیه فلقد کا ن الغالب علیه بمکة الا مین وکان ابو طالب یحفظه ویعضدہ وینصرہ الی ان مات ص77

ترجمہ: جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عم محترم حضرت ابی طالب علیہ السلام کی حفاظت ونگرانی میں جوان ہوئے۔ پروردگار عالم نے ہر طبقہ سے آپ کی تائید کی۔اور مراسم جہالت کے تمام معائب ومناقص سے محفوظ ومصئون رکھا۔ کیونکہ ان کرامتوں سے ارادہ مشیت میں آپ کی قوم کو دینداری کے طریقہ پر لانا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ان تمام محاسن صفات سے آراستہ ہوکر سن بلوغت تک پہنچے تو تمام قبائل واقوام میں باعتبار خلق ومروت کے افضل ترین،حسن اخلاق میں نیکوترین، باہمانہ مراسم اور اتحاد میں اکرم ترین، حلم وامانت میں اعظم ترین اور تقریر وبیان میں صادق ترین مردم تھے۔ایذا رسانی،فحش زبانی اور دیگر افعال ذمیمہ رکھنے والے لوگوں سے زیادہ علیحدہ رہنے والے اور ہمیشہ پرہیز واحتیاط کرنے والے تھے۔کسی شخص نے آپ کو تندمزاج اور تلخ کلام نہیں دیکھا۔یہاں تک کہ تمام قوم قریش اور باشندگان مکہ نے اس وقت سے آنحضرت صلعم کو الامین کا خطاب دیا اور حضرت ابی طالب علیہ السلام برابر آپ کی حفاظت ونگرانی،اعانت اور نصرت فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔

حرب الفجار میں شرکت

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر بیس برس کی ہوئی تو عرب کی یہ مشہور ومعروف لڑائی موقوف ہوئی۔ جو ایام جہالت کا آخری معرکہ تھا۔ یہ جنگ بھی اہل عرب کے نامحدود سلسلہ جنگ کی ایک کڑی تھی۔اور ان کی جہالت میں مردم آزاری اور خونخواری کی ایک زندہ مثال۔ یہ لڑائی قبیلہ قریش اور قبیلہ قیس کے مابین ہوئی تھی۔سبب جنگ ابن سعد ان الفاظ میں بتلاتے ہیں۔

کان سبب حرب الفجار ان النعمان ابن منذر بعث یلطمه له الی سوق عکاظ الی التجارۃ واجارھاله الرجال عروہ ابن عینبیه ابن جابر ابن کلاب فنزل علی الداء یقال له اوادہ فوثب البراض بن قیس احد بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانه وکان خلیعا علی عروۃ فقتله وھرب الی خیبر فاستخفی بھا ص80

ترجمہ: حرب الفجار کا سبب یہ تھا کہ نعمان ابن منذر اپنے بار برداری کے جانوروں پر سامان تجارت لے کر

عکاظ کے میلہ میں تجارت کی غرض سے آیا تھا ان جانورانِ بار برداری کو عروہ ابن عینیہ نامی شخص نے جو بنی کلاب کے قبیلہ سے تھا۔ کرایہ پر لیا اور ان کو لے کر ایک پانی کے چشمہ پر جو اوواره کے نام سے مشہور تھا۔ اوتلہ، براض ابن قیس نے جو قبیلہ بنی بکر کا ایک آدمی تھا اور قوم وقبیلہ سے نکالا ہوا تھا عروہ کو غافل پا کر مار ڈالا اور بھاگ کر خیبر میں جا چھپا۔

جنگ کا سبب تو یہ تھا۔ اثر یہ ہوا کہ قریب قریب تمام قبائل وعشائر جہالت کے قدیم دستور کے مطابق آپس میں گتھم ہو گئے۔ قتل وقصاص کا معاملہ تھا اس لیے طرفین سے تحمل وسکوت اور واگذاشت قطعی ناممکن تھی۔ عروہ کے قتل کی خبر جب عکاظ کے میلہ میں پہنچی جو اس وقت تمام قبائل وعشائر کا مرکز تھا۔ تو اس خبر کے سنتے ہی قریش اوران کے حلیف اور طرفدار قبائل نے بنی کنانہ کا ساتھ دیا اور ابن قیس سے عروہ کا قصاص طلب کیا۔ قریش نے ابی قیس پر صرف یہی الزام نہیں لگایا تھا بلکہ ایام حرم میں خونریزی کرنے سے ان کو قومی مجرم بھی قرار دیا تھا۔ قریش بنی کنانہ اوران کے معاون قبائل عروہ کے خون ناحق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ سب کے سب عکاظ کے میلہ سے اپنا اپنا مال تجارت واپس لے کر مکہ چلے آئے اور بنی قیس سے مقابلہ ومقاتلہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ بنی قیس بھی عرب تھے۔ وہ کیوں دبنے لگے بالاخر جانبین سے مقابلہ ہو ہی گیا۔ اور سخت معرکہ پڑا اور بڑی خونریزی ہوئی۔ چونکہ اس میں تمام قریش کے قبائل داخل تھے۔ اس لیے بنی ہاشم بھی شریک تھے۔ اور اپنے اعمام کے ساتھ جناب خیر الانام علیہ والہ السلام بھی تھے میدان کارزار میں بنی قیس کو قریشیوں پر دوپہر تک غلبہ حاصل رہا۔ مگر دوپہر کے بعد قریش نے بنی قیس کو زیر کرلیا۔ اور آخر کار لڑائی جانبین سے صلح پر تمام کردی گئی۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معرکہ میں اپنی شرکت کا خود ذکر فرمایا ہے۔ **قال رسول الله صلعم وذکر الفجار فقال قد حضرته مع عمومتی**۔ میں اس معرکہ میں اپنے اعمام کے ساتھ شریک تھا۔ اس معرکہ میں آپ کی شرکت کا سبب اول تو یہ تھا کہ قریش حق پر تھے اور ایک خون ناحق کے طالب قصاص۔ اس سبب سے ان کا یہ طرز عمل ہر منصف مزاج اور عدالت پسند شخص کے نزدیک پسندیدہ تھا اور مناسب دوم یہ کہ اپنے قبیلہ کی عظمت واقتدار اور امر حق میں اپنے بزرگوں کی حمایت ونصرت بھی ضروری تھی۔ وقت اور موقع کی ان ناگزیر ضرورتوں نے اپ کو اس معرکہ میں شریک ہونے کے لیے تیار کردیا تھا۔ اور آپ کی یہ شرکت اپنی اعمام کی حمایت ونصرت تک محدود تھی۔ جیسا کہ ابن ہشام قول رسولؐ سے صاف طور سے ان الفاظ کی تصریح کردی ہے۔ **کنت انبل علی اعمامی ای اردعنهم نبل عدوهم اذا رموا هم بها** میں اپنے اعمام کی طرف سے تیر چلاتا تھا یعنی ان تیروں کورد کرتا تھا جو میرے اعمام پر ان کے دشمن چلاتے تھے۔ اس قول مبارک کی بنا پر اس جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل بالکل مدافعانہ ثابت ہوتا ہے نہ مخاصمانہ۔ اور حقیقت میں جس طرح جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض اپنے اعمام کی نصرت وحمایت کی ضرورت سے اس لڑائی میں شریک ہوئے تھے۔ اسی طرح بنی ہاشم بھی قریش کی قرابت اوران کے ساتھ مراسم کے لحاظ سے شریک جنگ ہوئے تھے۔ ورنہ اصل مخاصمت بنی کنانہ اور بنی قیس کی تھی۔

امام سہیلی نے ابن ہشام سے زیادہ تفصیل کے ساتھ تصریح کردی ہے۔

وانما لما تقاتل رسول اللہ ﷺ مع اعمامھم فی الفجار وقد بلغ من القتال لا نہا کانت حرب فجار وکانوا ایضا کلھم کفارا ولم یؤذن اللہ لمومن ان یقاتل لا یکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔

ترجمہ: جناب رسالت مآب ﷺ نے اپنے اعمام کا ساتھ دے کر اس جنگ میں شرکت نہیں کی۔ باوجودیکہ کہ آپ مقابلہ اور مقاتلہ کے سن تک پہنچ چکے تھے۔اس کا باعث یہ تھا کہ یہ جنگ ایام حرام میں واقع ہوئی۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ جانبین کفار تھے۔اور اہل ایمان کے لیے تو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کی تنہا غرض سے دست بقضیہ ہونے کا حکم ہے۔

حرب الفجار کی وجہ تسمیہ یہ ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ جنگ ایام حرام میں واقع ہوئی۔اور یہ وہ ایام مخصوصہ تھے کہ جن میں جہالت اور اسلام دونوں زمانوں میں عام طور سے جدال وقتال، فوج کشی اور خون ریزی وغیرہ قطعی ممنوع تھی۔اسی بنا پر اس جنگ کا نام حرب الفجار رکھا گیا۔

حلف الفضُول کے معاہدے میں شرکت

حرب الفجار کا فیصلہ طرفین کی مصالحت سے ہو گیا۔مگر کوئی زمانہ بھی نیک وبد، بے درد و ہمدرد طبیعت والوں سے خالی نہیں رہتا۔ اس لیے حرب الفجار سے اہل مکہ کی درمندانہ اور انصاف پسند طبیعت والے بے حد متاثر ہوئے اور ان میں سب سے زیادہ اثر لینے والے بنی ہاشم تھے۔ابن سعد نے ان کی تخصیص کی کامل تصریح کر دی ہے۔ان کے الفاظ یہ ہیں۔لا نعلم احدا سبق بنی ھاشم بھذا بخلف میری تحقیق میں بنی ہاشم پر کسی فرد واحد کی سبقت اس معاہدے میں ثابت نہیں ہوتی۔طبقات ج1 ص82۔اس معاہدے کا خیال بنی ہاشم میں سب سے پہلے زبیر بن عبدالمطلب نے پیدا کیا۔اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب فجار میں بنی قیس اور بنی کنانہ کے قتل وخونریزی کو دیکھ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کم سے کم مکہ سے ایسے مرکزی مقام کو تو عرب کی سفاک اور بے داد گر قوم کے حملات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔لیکن یہ استحفاظ باہمانہ اتحاد کے معاہدے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔اس غرض سے زبیر بن عبدالمطلب نے دیگر اکابر وعمائد قریش کو اس تجویز میں اپنا ہم خیال اور ہم کلام بنایا۔طبقات میں ان کی تجویز وتدبیر کی عملی صورت ان الفاظ کے ساتھ دکھلائی گئی ہے۔

کان حرب الفجار فی شوال و ھذا الحلف فی ذی العقدۃ وکان اشرف حلف کان قط اول من دعا الزبیر بن عبدالمطلب فاجتمعا بنوا ھا شم وزھرۃ وتیم فی دار عبداللہ بن جدعان فصنع لھم طعاماً فنعاقدوا تعاھدوا با اللہ القاتل لنکونن مع المظلوم حتی یوری الیہ طبقات 82

جنگ فجار شوال میں واقع ہوئی اور حلف الفضول ذی قعدہ میں اور یہ معاہدہ تمام سابقہ معاہدوں سے اشرف وافضل تھا سب سے پہلے اس معاہدے کی زبیر بن عبدالمطلب نے ابتدا کی اور لوگوں کو اس کی دعوت کی بنی ہاشم زہرہ اور تیم اس معاہدے کی غرض سے عبداللہ ابن جدعان کے مکان میں جمع ہوئے پہلے حاضرین کی ضیافت کی گئی۔ پھر سب نے مجلس مجوزہ کا انعقاد کیا اور خدا کو درمیان دے کر فیما بین معاہدہ کیا کہ وہ لوگ مظلومین کی طرف سے ظالمین کے ساتھ اس وقت تک مقابلہ کریں گے جب تک کہ ظالم اپنے مظالم کی دیت ومعاوضہ مظلوم کو نہ دے دے۔

اس معاہدے میں بنی ہاشم کے فرد واحد۔ بلکہ اُن کے سب کے مایۂ افتخار ہونے کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شریک تھے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

ما احب ان لی بحلف حضرته فی دار عبد الله بن جدعان حمر النعم وانی اعذرته هاُم وزهره و تیم و تحلفوا ان یکو نوامع المظلوم ولودعیت به لا جبت و هو حلف الفضول طباقات 82

اُس معاہدے کے عوض میں جو دار عبداللہ بن جدعان میں منعقد ہوا تھا اور جنہیں بنو ہاشم، بنوزہرہ اور بنو تیم نے اس امر پر قسم کھائی تھی۔ حلف اُٹھایا تھا کہ وہ مظلومین کی اعانت وحمایت کیا کریں گے مجھے سرخ رنگ والے اونٹ بھی دیئے جائیں تو میں نہ لوں اور آج بھی اگر ایسے معاہدے کے لیے مجھے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں وہ معاہدہ حلف الفضول تھا۔

یہ امر بھی ضرور بتلا دینے کے قابل ہے کہ حمایت مظلوم کے اس معاہدے میں صرف بنو ہاشم بنوزہرہ اور بنو تیم ہی شامل تھے۔ بنو امیہ کا نام کسی تاریخ سیرت یا حدیث کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے ہر شخص بلا تامل سمجھ لے گا کہ شبلی صاحب کا ابھی ابھی بتلایا ہوا اتنا بڑا ذی اثر اور مقتدر قبیلہ اخلاق میں کتنا کمزور اور مظالم کا کیسا خوگر تھا جو باوجود اُس کے کہ اوس معرکہ میں فوج قریش کا سپہ سالار اعظم تھا لیکن اس سے نہ کچھ متاثر ہوا اور نہ بعد اُس کے قوم کے اس معاہدے میں شریک ہوا۔ بلکہ اپنی جہالت پسند فطرت اور جفا جو طبیعت کے زیر اثر ہو کر استیصال مظالم اور قتال ظلمہ وقت کے جو انتظام عدالت پسنداں و دردمندان قوم نے تجویز کیے تھے اُس سے اغماض و روگردانی کر گیا۔ اور شریک نہ ہوا۔ افسوس شبلی صاحب نے جس قبیلہ کی قدامت اور عظمت ثابت کرنے کی بنیاد قائم کرنا چاہی ہے وہ آغاز ہی سے شقاوت شعار اور مظلومین کو چھوڑ کر ظالمین کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

جہاں تک تحقیق کیا گیا ہے اس معاہدے میں سوائے مرقومۂ بالا تین قبائل قریش کے کوئی دوسرا قبیلہ داخل نہیں تھا۔ بلکہ قبائل دیگر

ساکنان مکہ کی جگہ بیرونی قرب و جوار کے اکثر نفوس شامل تھے۔ یہ کس لیے تھا؟ اس لیے کہ اس معاہدے میں نہ شریک ہونے والے قبائل اپنی جنگ جو طبیعت سے مجبور تھے۔ اور جہالت کے اثر سے سفاکی اور خونریزی اور ہر قسم کے مظالم کو ہمیشہ کا پیشہ اور اپنی معیشت کا مستقل ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس سبب خاص سے وہ اس معاہدہ میں شریک ہونے پر راضی نہ ہوئے جو اُن کے اکتساب معیشت کے طریقوں میں سدباب ہوتا تھا۔

شبلی صاحب کی اُس تحریر سے جو انہوں نے اس حلف الفضول کی وجہ تسمیہ میں قلم بند فرمائی ہے۔ ہمارے مندرجہ بالا بیان کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ ''اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو ہوا اُن کے نام میں فضیلت کا مادہ داخل ہے۔ یعنی فضل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل۔ یہ لوگ بنی جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے لوگ تھے'' یہ تحریر بتلا رہی ہے کہ دیگر قبائل کے لوگ تو اس معاہدے میں شریک ہوئے لیکن قریش میں سوائے تین قبائل کے اور کسی کو اس میں شرکت کی توفیق نہ ہوئی۔ جس کی وجہ صرف وہی ہو سکتی ہے جو اوپر لکھی گئی ہے۔

لیکن شبلی صاحب نے اپنی اس تحریر میں اپنے سابق نظریہ سے انحراف فرمایا ہے۔ آپ کے سہو کا یہ طریقہ آپ کی تالیفات میں اکثر مقامات پر پایا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی ابتدا میں تحریر فرمایا گیا ہے۔ ''جنگ فجار سے لوگ واپس لوٹے تو زبیر ابن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگردہ تھے یہ تجویز پیش کی'' غرض کہ بنی ہاشم کے ساتھ اس خیال کی اولیت کا خود اعتراف فرما لیا گیا ہے اور اپنا یہ اقرار و اعتراف بھی طبقات ابن سعد کے حوالے پر محمول کیا ہے جس کی اصل عبارت ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اور جس میں آل ہاشم کا اس خیال و تجویز میں سب سے پہلے سبقت کرنا بالتصریح مندرج ہے۔ پھر باوجود اس اقرار و اعتراف کے مندرجہ بالا عبارت میں کیونکر اور کس بنا پر لکھا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا اُن کے نام میں لفظ فضیلت کا مادہ داخل تھا۔ یعنی فضل ابن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل۔ یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ سے تھے''۔ تو گویا معلوم ہوا کہ اس کی اولیت بنی ہاشم سے صحیح نہیں ہے بلکہ بنی جرہم اور بنی قطورا اس کے مؤجد اول ہیں۔ شبلی صاحب کے ان اعتراف و اختلاف کو غور سے دیکھ کر اہل بنیش آپ کی متلون مزاجی اور تغیر طبعی کا خود اندازہ کر لیں گے۔ وجہ تسمیہ جو مادہ فضل کی رعایت سے بتلائی گئی ہے اُس کے اصلی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ اور عبارت زیر بن حاشیہ میں امام سہیلی کی اسناد سے جو وجہ تسمیہ بتلائی گئی ہے وہ امام سہیلی کی خاص رائے ہے۔ اس بنا پر آپ کی دوسری توجیہ سے پہلی توجیہ زیادہ قریب الفہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبقات وغیرہ میں اس کی وجہ تسمیہ خاص طور پر نہیں لکھی گئی۔ متاخرین نے اپنی جدت طبعی سے قیاسی توجیہیں قائم کی ہیں ممکن ہے کہ اُن میں سے کوئی صحیح ہو لیکن ان پر قطعی اعتبار دشوار ہے۔

تزویج با حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا

شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ میں واقعہ تزویج کو بنائے کعبہ کے واقعہ کے بعد لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ص137۔ آپ کی یہ ترکیب آپ کی ذاتی تجدید ہے۔ اور ابن ہشام، طبری اور ابن سعد وغیرہم۔ قدیم عربی ماخذوں کی ترتیب سے بالکل خلاف ہے۔ میرے نزدیک ڈیڑھ ہزار برس بعد والے مؤلف کو ان امور میں مجدد بننے کے شوق سے مقلد رہنا ہی بہتر ہے۔ اس لیے ہم سیرۃ النبیؐ کی ترتیب کے خلاف اسوۃ الرسولؐ میں تزویج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعہ کو تعمیر کعبہ کے واقعہ سے پہلے بیان کرتے ہیں۔

حلف الفضول کے معاہدے کے وقت آپ کا سن بیس برس کا ثابت ہو چکا ہے۔ اور آپ کی تزویج کے وقت تمام مؤرخین و محدثین آپ کی عمر پچیس برس بتلاتے ہیں۔ اس نظریہ متفقہ کی رو سے واقعہ تزویج معاہدہ حلف الفضول کے پانچ برس بعد واقع ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ابی طالبؑ کی ہمراہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے قافلہ تجارتی کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اس وقت سن مبارک بارہ یا تیرہ برس سے زائد کا نہیں تھا۔ اس بنا پر ثابت ہے کہ آپ نے بارہ برس کی عمر ہی سے مشغلۂ تجارت کی طرف اپنی مقدس طبیعت کا میلان ظاہر فرمایا تھا۔ آپ کی طبیعت کی یہ قدرتی اور موروثی موزونیت تھی۔ قدرت کا منشا تو بالکل کھلا ہوا ہے۔ وہ یوں کہ اتنی کمسنی میں اس مشغلہ کاروبار کی طرف طبع مقدسہ کا میلان اور رجحان نمایاں ہونے لگا۔ جس زمانہ میں عام فطرت والے بچے سوائے کھیلنے کودنے کے ترتیب معاشرت اور تحصیل معیشت کی کسی فکر و تلاش کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ موروثی یوں کہ ولادت باسعادت سے ہزارہا سال بیشتر سے آپ کا خاندان اعلیٰ جو اولاً بنو اسمٰعیلؑ اور آخراً قریش کے مخصوص نام و لقب سے تمام اقطاع عالم میں مشہور و معروف تھا۔ ہمیشہ اور برابر تجارت پیشہ رہا۔

اس مشہور عالم سلسلہ میں قصیٰ کے وقت سے کاروبار تجارت کی فروغ یابی کی عملی تدبیرین جاری کی گئیں اور یکے بعد دیگرے آپ کے جد بزرگوار ہاشم ابن عبد مناف کے زمانہ میں وہ تدبیریں کامیابی کے نقطۂ کمال تک پہنچیں۔ یہاں تک کہ سلاطین غیر ممالک اور اقوام غیر نے بھی تجار قریش کی راہداری اور آسانی کاروبار کے لیے معاہدے لکھے اور پروانہ راہداری دیئے اور اپنے قلمدان اطلاع عام کی ضرورت سے اس کے اعلان جاری کیے۔ جیسا کہ ہاشم ابن عبدالمطلب کے حالات میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اسی طرح مسلسل طور پر ہاشم کے بعد مطلب، مطلب کے بعد عبدالمطلب اور عبدالمطلب کے بعد ابیطالب۔ اس سلسلہ کے تمام بزرگوار کاروبار تجارت فرماتے رہے اور معیشت کا وہ طریقہ اور عام ذریعہ جو مدت ہائے دراز سے اس سلسلہ میں چلا آتا تھا وہی اس وقت تک قائم اور مستقل رہا۔ اس بنا پر مولانا شبلی صاحب کا یہ کہنا بالکل صحیح اور فی الواقع ہے کہ سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب فکر معاش ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہیں آیا''۔

آپ نے اپنے اس موروثی مشغلہ کی ابتدا اپنے خاص اور تنہا سرمایہ سے نہیں کی۔ بلکہ مشترکہ سرمایہ سے۔ اس کی خاص وجہ خاص سرمایہ کی کمی تھی اور یہ بالکل ظاہر تھی اس لیے کہ نہ حضرت عبداللہ کوئی ایسا سرمایہ چھوڑ گئے تھے اور نہ حضرت ابیطالبؑ اپنی کثیر العیالی اور

خرچ عیالداری کی مجبوریوں سے کسی علیحدہ اور کافی رقم کا اُس پر اضافہ کر سکتے تھے۔ ان دقتوں کی وجہ سے مشترکہ سرمایہ سے آغاز تجارت کا طریقہ اختیار فرمایا گیا اور یہ نہایت آسانی سے قائم ہو گیا۔ اس لیے کہ اُس وقت یہ دستور جاری تھا کہ سہولت کی غرض سے اکثر لوگ اپنا سرمایہ کسی امانت دار اور ہوشیار شخص کو تجویز کر کے سپرد کر دیتے تھے۔ منافع میں اُس کو اپنا سہیم بنا لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کے مشغلہ کو اسی طریقہ سے شروع کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ معاملت کو کھلے دل سے قبول کر لیا۔ کیونکہ ہر شخص آپ کی دیانت امانت اور صداقت کا تجربہ کر چکا تھا۔

شبلی صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن معاملت کی چند مثالیں سیرۃ النبیؐ میں نقل کی ہیں۔ ہم بھی اُن کو اپنے بیان کی تصدیق کے لیے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

عبداللہ بن ابی الجملاء ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خرید و فروخت کا معاملہ کیا تھا۔ کچھ معاملہ ہو چکا تھا۔ کچھ باقی تھا۔ میں نے کہا پھر آؤں گا۔ اتفاق سے مجھ کو تین دن تک اپنا وعدہ یاد نہ آیا تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُسی جگہ منتظر پایا۔ لیکن اس خلاف وعدگی سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ صرف اس قدر فرمایا کہ تم نے مجھے زحمت دی۔ میں اس مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔

سائب نام ایک صاحب جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے اُن کی تعریف کی آپ نے فرمایا میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ سائب نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ میرے شریک تجارت تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔ فکنت لا تداری فلا تماری۔ نہ میرا آپ کے ذمہ نہ آپ کا میرے ذمہ کچھ باقی ہے۔

قیس ابن سائب مخزومی ایک اور صحابی تھے۔ آپ کے شریک تجارت تھے۔ وہ بھی انہیں الفاظ کے ساتھ آپ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول، ص136۔

سب کے ساتھ کاروبار میں آپ کی صفائی، معاملت تجارت میں اور شرائط مشارکت میں شرکاء کے ساتھ آپ کی سچائی چاروں طرف مشہور ہو گئی تھی۔ امانت و دیانت کا یہ عالم تھا کہ عموماً تمام تجار اور اہل کاروبار آپ کی خوش معاملگی اور صفائی کے گرویدہ تھے۔ تجارت کی غرض سے آپ نے بصریٰ اور شام کا سفر کیا تھا اور پہلے انہیں دونوں مقاموں میں اسباب تجارت فروخت کر کے اپنے حسن تدبیر اور خوش نظمی سے کافی نفع اُٹھایا تھا۔ پھر جوں جوں سرمایہ میں ترقی ہوتی گئی سلسلۂ تجارت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ شام و بصرے کے علاوہ اور مقامات میں بھی جو تجارت کے مرکزی مقام تھے، تشریف لے گئے۔ جعاشہ کا بازار عرب میں سالانہ ملکی کاروبار اور خرید و فروخت کے لیے بہت مشہور و معروف تھا۔ تجارت کی غرض خاص سے یہاں بھی آپ کا تشریف لانا تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔

یہ واقعات بتلا رہے ہیں کہ کاروبار تجارت میں آپ کی صفائی اور سچائی تمام تجارت پیشہ قوم و قبائل پر کامل طور سے اثر پذیر ہو چکی تھی۔ اور ہر شخص اپنے مقام پر آپ کو اپنا کاروبار تجارت سپرد کرنے کا متمنی تھا انہیں لوگوں میں جناب خدیجہؑ بھی تھیں۔

یہ خوش قسمت اور عالی منزلت خاتون شرفائے قریش کے ایک ممتاز خاندان سے تھیں۔ پانچویں پشت میں اس خاتون محترمہ کا

سلسلۂ نسب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ تجارت اور کاروبار کے اعتبار سے تجار مکہ میں کوئی ان کا مقابل نہیں تھا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا مال تجارت تمام قریش کے مال کے برابر ہوتا تھا۔ شبلی صاحب اس عبارت کو ابن سعد کی عبارت بتلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ عبارت طبقات ابن سعد کی نہیں ہے۔ بلکہ شرح زرقانی جلد اول صفحہ 239 میں واقدی اور دیگر مؤرخین سے نقل کی گئی ہے۔

شبلی صاحب اسی صفحہ کے زیر حاشیہ لکھتے ہیں۔ یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص 234 سے 236 تک دیکھنا چاہیے۔ حالانکہ حالات تزویج جناب خدیجہؑ شرح زرقانی میں صفحہ 237 سے شروع ہو کر صفحہ 245 میں تمام ہوئے ہیں۔ شبلی صاحب کی یہ سہو ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کے لیے اہل تالیف قطعی مجبور ہیں۔ کیونکہ ان کی بنا بالکل اُن لوگوں کی کثیر معروفیت اور سہوالنظری پر مبنی ہے۔ جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

ثروت و اقتدار کے اعتبار سے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا تمام تجار میں عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ مکہ اور قرب و جوار کے تمام تجارت پیشہ قوم و قبائل کے لوگ ان کے زیر اثر تھے اور دست نگر، عادات و اوصاف کے لحاظ سے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی پاک نفسی، حسن اخلاق اور عام ہمدردی مشہور آفاق تھی۔ انہیں محاسن ذاتی کی خصوصیات سے ایام جہالت ہی میں آپ کا لقب طاہرہ مشہور ہوگیا تھا۔ آپ کے ذاتی اوصاف کے متعلق ابن سعد یہ عبارت نقل کرتے ہیں۔

وھی یومئذاً اوسط قریش نبساً و اعظمھم شرفاً

یہ خاتون اُس وقت تمام قریش میں عالی نسب اور صاحب شرافت تھیں۔

ابن ہشام اور طبری کے یہ الفاظ ہیں:

و کانت خدیجۃ تاجرۃ ذات شرف و مال کثیر و تجارۃ تبعث بھا الی الشام فتکون عیرھا کعامۃ عیر قریش و کانت تستا جر الرجال و یدفع الیھم المال مضاربۃ

"جناب خدیجۃ الکبریٰؑ تاجرہ تھیں۔ صاحب شرافت اور اہل دولت ان کی تجارت کا یہ حال تھا کہ جب قافلہ تجار شام کو جاتا تھا تو اُس میں اکیلا ان کا مال تمام لوگوں کے مال کے برابر ہوتا تھا۔ تجار آپ سے مال لے کر تجارت کے لیے لے جاتے تھے اور منافع لے کر اصل سرمایہ واپس دیتے تھے"۔

شبلی صاحب نے بھی اس مضمون کو سیرۃ النبی صفحہ 136 میں لکھا ہے:

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہی حسن معاملات اور مکارم عادات حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے میلان خاطر کے باعث ہوئے اور حقیقت میں منشا قدرت کا یہ مقدمہ تھا۔ ابن ہشام اور طبری اس کی حقیقت ذیل کے الفاظ میں لکھتے ہیں:

فلما بلغھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ما بلغھا من صدق حدیثہ و

عظم امانته و کرم اخلاقه بعثت الیه فعرضت علیه ان یخرج فی مال لها الی الشام تاجرا و تعطیه افضل ما کانت تعطی غیرہ مع غلام لها یقال له میسرہ

جناب خدیجہؑ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت بیان اعلیٰ درجہ کی امانت داری اور اعظم ترین اخلاق کی خبریں پہنچیں تو انہوں نے خود اپنی طرف سے اس تصریح کے ساتھ پیغام بھیجا اور درخواست کی کہ آپ میرا اسباب تجارت لے کر میرے غلام میسرہ کے ساتھ شام کی طرف جائیں تو میں آپ کو اس کے معاوضہ میں اُس سے کہیں زیادہ دوں گی جو دوسرے تاجر آپ کو دیتے ہیں۔ ابن ہشام ۷۶ (مصر) طبری 1127 (جرمن)

طبقات اور مواہب لدنیہ کی عبارات سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے ساتھ تعلقات تجارت قائم کرنے کی مشاورت ابیطالبؑ نے دی تھی۔ اور جب اس امر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسمتزاج لے لیا تو حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہاؑ سے اس کی خود تحریک فرمائی۔ طبقات ص 82 زرقانی شرح مواہب لدنیہ ص 243۔ اگرچہ مندرجہ بالا عبارت سے آنحضرت صلعم کی ترتیب و درستی معیشت کی نسبت حضرت ابیطالبؑ کے خالص عربیا طرز عمل ثابت ہوئے ہیں لیکن جب اس کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالی جاتی ہے اور ابیطالبؑ کی حیا و ہمت صبر وقناعت پر جو بنی ہاشم کا تمغائے شرافت تھی۔ خیال کیا جاتا ہے تو ابن ہشام اور طبری کے بیانات و مندرجات صحت وواقعیت سے قریب تر ثابت ہوتے ہیں۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے اس پیام اور مجوزہ انتظام کو سن کر منظور فرمالیا اور ان کے غلام میسرہ نامی کے ہمراہ سامان تجارت لے کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں آپ کی حسن تدبیر اور سلیقہ شعاری سے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہاؑ کی تجارت میں اُمید سے زائد نفع ہوا۔ میسرہ ایک زمانہ سے اپنی مخدومہ کے کل کاروبار کا مختار تھا۔ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش نظمی اور لین دین خرید وفروخت میں خوش سلیقگی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ معاملات تجارت میں میسرہ نے آپ کی ایسی خوبیاں مشاہدہ کیں۔ جو اس نے دیکھیں کیا کبھی سنی بھی نہیں تھیں۔ کاروبار تجارت سے فراغت پا کر جب قافلہ مکہ میں لوٹ آیا تو میسرہ نے اپنے تمام مشاہدات جناب خدیجہؑ سے دہرا دیئے۔

تمام اہل تاریخ وسیرت نے اسی واقعہ کو حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے میلان خاطر کا باعث بتلایا ہے۔ اور اُن کے ساتھ تعلقات تجارت کے سلسلہ میں صرف اسی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر شبلی صاحب نے صحت کے ساتھ محققانہ طور پر ثابت فرمایا ہے کہ اس سے پہلے بھی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہاؑ کے کاروبار میں اپنی غایت درجہ کی خوش سلیقگی حسن معاملات اور دیانت وامانت ثابت فرمائی ہے۔ اُن کی مفصلہ ذیل عبارت سے پورا انکشاف حال ہوجاتا ہے۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا۔ ان میں جرش (۱) بھی تھی جو یمن میں ہے۔

حاکم نے مستدرک میں لکھا ہےاور ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے اور ہر دفعہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔سیرۃ النبی ص 138

ابن ہشام اور ابن سعد کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی طرف سے تزویج کی سلسلہ جنبانی شروع کی گئی اور نفیسہ بنت منبّہ شادی کا پیام لے کر جناب رسالت مابؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ابن سعد ابن الفاظ میں حقیقت حال کو بیان کرتے ہیں۔

عن نفیسه بنت منبه قلت کانت خدیجة بنت خویلد بن اسد بن عبد العزی بن قصی امو ارة حاذمة جلدة شریفة مع بار ا د الله بها من الکو امة والخبر و هی یو مئذا اوسط قریش نسبا وا عظمهم شر فا وا کثر هم ما لا و کل قومها کان حریصا علے نکامها حهالو قدر علیٰ ذلك قد طلبوا ها و بذلوا بها الا موال فارسلتنی وسیسا الیٰ محمد صلعم بعد ان ارجع فی غیر من الشام فقلت یا محمدﷺ ما یمنعك ان تزوج فقال ما بیدی ما اتزوج به قلت فان کضیف ذلك و دعیت الی الجمال و المال والشرف والکفاء ة الا تجیب قال فمن هی قلت خدیجة و قال کیف لی بذلك قالت قلت علیٰ قال فانا افعل فذ هبت فاخبر تها فارسلت الیه ان اُمت الساعة کذا و کذا وارسلت الی عمها عمر بن اسد لنزوجها فحضروا دخل رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم عمومته فزوحه احدهم طبقات ابن سعد ص 84

نفیسہ بنت منبّہ کا بیان ہے کہ خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصیٰ بڑی ہوشیار اور شریف ترین خاتون تھیں۔اور بایں ہمہ خدائے سبحانہ تعالیٰ کا ارادہ توفیق خیر و برکت کے ساتھ اُن کا رفیق تھا۔وہ اس زمانہ میں با اعتبار حسب ونسب کے اعلیٰ ترین قریش تھیں۔فضل وشرف کے لحاظ سے بھی اُن میں اعظم ترین اور مال دولت کے شمار سے تمام قریش سے زیادہ متمول اور خوشحال۔قوم وقبیلہ کے تمام لوگ ان سے نکاح کرنے کے متمنی تھے۔اور حتیٰ الامکان اس کے لیے ساعی تھی۔اگر چہ اس کے لیے جناب خدیجہ اُن کے تمام اموال بھی طلب فرماتیں تو وہ نذر کرنے کے لیے حاضر تھے۔نفیسہ کا بیان ہے کہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا شام سے قافلہ تجارت کے واپس آنے کے بعد مجھے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیام نکاح دے کر بھیجا۔میں نے حاضر خدمت ہوکر عرض کی۔اے محمد صلعم آپ کو اب اپنا

بیاہ کر لینے کے لیے کون سی شے مانع ہے۔ ارشاد ہوا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ جس سے میں اپنے بیاہ کا قصد کروں۔ میں نے کہا کہ اگر میں اس امر میں آپ کی کفالت کروں اور ایک ایسی جگہ آپ کی نسبت لگا دوں جو صاحب شرف و وجاہت اور صاحب مال و دولت بھی ہو اور آپ کی کفالت بھی کر سکے۔ تو کیا ایسی حالت میں میں آپ اُسے قبول فرمائیں گے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔ وہ کون ہے؟ میں نے کہا وہ خاتون معظّمہ خدیجہؑ ہیں۔ ارشاد ہوا وہ کیسے اس امر پر راضی ہوں گی۔ میں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ اچھا میں بیاہ کروں گا۔ نفیسہ کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلعم کا یہ ارشاد سن کر رخصت ہوئی اور جناب خدیجہؑ سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے آنحضرت صلعم کے پاس اُسی روز نکاح مقرر فرما کر کہلا بھیجا اور اپنی چچا عمر ابن اسد کو بھی اس کی خبر کر دی اور صیغۂ تزویج پڑھ دینے کے لیے کہلا بھیجا۔ وقت مقرر پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اعمام کے ساتھ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے عصمت سرا میں تشریف لے گئے اور آپ کے اعمام میں سے ایک صاحب نے آپ کا خطبۂ نکاح پڑھا۔

مولانا شبلی صاحب تزویج کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ واپس آنے کے تین مہینے بعد (سفر شام) حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے آپ کے پاس شادی کا پیام بھیجا۔ اُن کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن آپ کے چچا عمر ابن اسد زندہ تھے۔ عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں۔ اور اُس میں بالغہ یا نابالغہ کی قید نہ تھی۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے چچا کے ہوتے ہوئے خود براہ راست تمام مراحل طے کیے۔ تاریخ معین پر ابو طالب اور تمام رؤسا خاندان جن میں حضرت حمزہ بھی تھے۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے مکان پر آئے۔ ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ پانچ سو درہم طلائی مہر مقرر پایا۔ سیرۃ النبی ص 137

بالغہ کے لیے تو عرب پر موقوف نہیں تمام ممالک اسلام اور غیر اسلام میں بھی یہی حکم و دستور قائم ہے۔ لیکن نابالغہ کے لیے شبلی صاحب کی یہ تعمیم نہ شرعی طریقہ سے ماذون ہے اور نہ عقلی قرینہ سے موزون۔ کیونکہ نابالغہ میں جب تک سن رشد نہیں پایا جائے گا اس کا کسی قسم کا اقرار یا اعتراف قابل اعتبار نہ ہوگا۔ اس لیے احکام شریعت اور قانون حکومت دونوں نے نابالغہ کے عقد نکاح میں ولایت کی ضرورت کو مشروط کر دیا ہے اور یہ ایسا عام دستور ہے کہ زیادہ تصریح کا محتاج نہیں۔ اس بنا پر بالغہ اور نابالغہ کا ایک حکم خیال کرنا۔ عام اس سے کہ قبل اسلام ہو یا بعد اسلام شبلی صاحب کی عجلت رقمی ہے۔

حضرت ابوطالبؑ کا خطبۂ نکاح

شبلی صاحب نے ابیطالب کا خطبہ نکاح پڑھنا تو تحریر فرمایا ہے مگر اُس خطبہ کی عبارت نہیں نقل فرمائی۔ ہم جانتے ہیں۔ یہ آپ کی کوتاہ قلمی اور اختصار پسندی کا خاص مقام ہے۔ لیکن واقعات کو کامل تفصیل کے ساتھ خاص طور پر جب وہ بغیر تلاش موجود ہے اور تمام کتابوں میں منقول۔ لکھنا اور بیان کرنا بھی مولف کا خاص کام ہے۔ بہرحال امام قسطلانی مواہب لدنیہ میں، علامہ زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں، امام الحرمین بزرنجی السنی المطالب اور امام دُولابی نے اس خطبہ کو بیک لفظ تحریر فرمایا ہے۔ ہم زرقانی سے ذیل میں اس خطبہ کو نقل کرتے ہیں۔

الحمد لله الذی جعلنا من ذریة ابراهیم و زرع اسمٰعیل و ضئضعی معدو عنصر مضر و جعلنا خصنه بتیة و سواس حرمه و جعل لنا بیتا محجوجا و حرما امٰنا و جعلنا الحکام علی الناس ثم ان ابن اخی هذا محمد بن عبد الله لا یوزن برجل الا رجح به شرفاً و نبلاً و فضلاً و عقلاً فان کان فی المال قل دانّ المال ظل وزائل و امر حائلٌ مُحمدﷺ من قد عرفتم قوابته و قد خطب خدیجه بنت خویلد و بذل لها ما اجله و عا جله من ما لی کذا و هو و الله بعد هذ اله بناءٌ عظیم و خطر جسیم۔

تمام تعریف اُس خدائے بزرگ و برتر کے لیے سزاوار ہے جس نے ہم کو ذریت ابراہیمؑ، اولاد اسمٰعیلؑ نسل معد ابن عدنان اور صلب مضر سے پیدا کیا اور ہم کو اپنے بیت کا محافظ اور اپنے حرم محترم کا نگہبان مقرر فرمایا۔ ہمارے لیے ایک ایسا گھر قرار دیا۔ جس کا خلق خدا حج کرتی ہے اور ایسی متبرک زمین عطا کی کہ جہاں خدا کی مخلوق امن پاتی ہے۔ ماسوا اس کے خدا نے ہم کو لوگوں پر حاکم بنایا۔ امابعد میرا یہ بھتیجا محمد بن عبداللہؑ ہے جس کا اگر کسی شخص سے موازانہ اور مقابلہ کیا جائے تو از روئے فضل و کمال و باعتبار شرافت و ذہانت یہی گرائی تر نکلے گا۔ یہ مالداری اور دولت مندی میں کم ہے۔ مگر مال کیا ہے۔ ایک ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اور متغیر اور متبدل ہو جانے والا مال ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہی شخص ہے جس کی قرابت جو کچھ مجھ سے ہے آپ لوگ اُس کو خوب جانتے ہیں۔ اُس نے خدیجہؑ سے تزویج کا ارادہ کیا ہے اور اس طرح میں نے اپنے مال سے اُس کے (خدیجہؑ کے) مہر موجل (رقم مقررہ) اور صداق معجّل (رقم مہر جو بروقت ادا کی

جائے) ادا کر دیا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ محمدؐ وہ شخص ہے جس کے لیے کوئی خبر عظیم اور کوئی مہتم بالشان بہرہ یا حصہ نصیب ہونے والا ہے۔ زرقانی 242۔43

اس خطبہ کی پوری نقل و شرح کے بعد زرقانی لکھتے ہیں:

عن الدولا بی ان ابی طالب قال و قد خطب الیکم راغبا کریمتکم خدیجه و قد تبذل لھا من الصداق ما حکم عاجلة اثنا عشرة اوقیة ذھبا

دولابی لکھتے ہیں کہ خطبہ نکاح میں حضرت ابیطالب کے یہ الفاظ بھی داخل تھے معاشر قریش میں آپ لوگوں کے سامنے خاتون کریمہ خدیجہؑ کا خطبہ نکاح بطیب خاطر پڑھتا ہوں اور اُن کے صداق مؤجل میں بارہ اوقیہ سونا دیتا ہوں۔

حافظ جمال الدین محدث شیرازی۔ روضۃ الاحباب میں ابیطالب کے یہ الفاظ تحریر کرتے ہیں:

قد خطب ابو طالب خدیجة بنت خویلد و قال لھا الصداق اجلة و عاجلة عشرون بکرة من مالی

خدیجہ بنت خویلد کا میں (محمد صلعم کی طرف سے) خطبہ نکاح پڑھتا ہوں اور اُن کے مہر مؤجل و معجّل میں بیس مہار اونٹ جو میری ملکیت ہیں، میں ادا کرتا ہوں۔ روضۃ الاحباب 106۔ روضۃ الصفا، خاوند شاہ سمر قندی، جلد سوم میں بھی یہی الفاظ مرقوم ہیں۔

ورقہ بن نوفل کا خدیجہؑ کی طرف سے خطبۂ نکاح

فی المنتقی فلما اتم ابو طالب الخطبة تکلم ورقه بن نوفل فقال الحمد لله الذی جعلنا کما ذکرت و فضلنا کما علیٰ عددت فنحن سادة العرب و قادتھا وانتم اھل ذلك کلمه لا ینکره العشیرة فضلکم و لا یردا حد من الناس فخر کم و شر فکم و قدر غنبا فی الا تصال لجبلکم و شر فکم فا شھدواعلیٰ معاشر قریش بانی قد زوجت خدیجة بنت خویلد من محمد بن عبد الله علے اربعمائة دیناراً ثم سکت فقال ابو طالب قد احببتُ ان یشرك کل عمھا فقال عمھا یا معاشر قریش انی قد انکحت محمد بن عبد الله من خدیجة بنت خویلد و شھد علی ذلك صنادید قریش

منتقی میں مرقوم ہے کہ جب ابیطالب اپنا خطبہ نکاح ختم کر چکے تو ورقہ ابن نوفل نے یوں تقریر کی۔ وہ خدا قابل ستائش ہے جس نے ہم لوگوں کو اُن اوصاف سے موصوف کیا۔ جس کا آپ نے (ابو طالبؑ) ذکر کیا۔ اور ہم لوگوں کو وہ فضائل عنایت کیے جس کا شمار وانحصار آپ نے فرمایا۔ ہم لوگ سردار قوم عرب ہیں اور پیشوائے قوم اور آپ حضرات (بنی ہاشم) وہ بزرگوار ہیں جن کے فضائل سے کسی قبیلہ اور عشیرہ کو انکار ہو ہی نہیں سکتا اور آپ کی مفاخر ومشارف پر کسی فرد واحد کو حرف گیری کی جرأت ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم لوگوں نے بطیب خاطر آپ حضرات سے پیوند کرنا چاہا اور آپ کے مشارف میں شریک ہونا قبول کیا۔ اے معاشر قریش! آپ حضرات اس کے گواہ رہیں کہ میں نے خدیجہؑ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کے ساتھ چار سو دینار مہر پر بیاہ دیا۔ یہ کہہ کر ورقہ خاموش ہو گئے۔ تو حضرت ابیطالبؑ نے اُن سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ اس تصدیق وشہادت میں خدیجہ کے چچا کو بھی شریک کر لیں۔ یہ سن کر اُن کے چچا اسد اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اے معاشر قریش آپ حضرات گواہ رہیں کہ میں نے خدیجہؑ بنت خویلد کا نکاح محمدؐ بن عبداللہ سے کر دیا۔ تمام صنادید قریش نے اس پر گواہی کر دی ص 246۔

علامہ زرقانی اس کے بعد منتقی کے اسناد سے لکھتے ہیں:

فرح ابوطالب فرحاً شديدا وقال الحمد لله الذى اذهب عنا الكرب ورفع عنا الهموم

ابوطالبؑ کو اس تزویج سے بڑی مسرت ہوئی اور فرمایا خدا کا شکر ہے جس نے ہماری مشکلات ومہمات کو دور فرمایا۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت ونگرانی اور آرام رسانی کے متعلق حضرت ابوطالبؑ کے تعلقات اور جذبات کا اندازہ کرنا اور اُن کو عام واقعات کی طرح پایۂ ثبوت تک پہنچانا۔ اصول فطرت کے خلاف کوشش کرتا ہے۔ ہر باپ کو اپنے بچہ کی محبت ہونا لازمۂ فطرت ہے۔ اس لیے مشاہدات کا ثبوت کیسا اور بدیہات پر بحث کیسی۔ حضرت ابیطالب نے اپنے خطبہ میں اپنے ان جذبات کو جن بلیغ اور پرمعنی الفاظ میں بیان فرمایا ہے وہ انکشاف حقیقت کے لیے کافی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ **محمد من قد عو فتم قرابته** ۔ محمدؐ سے میری قرابت کو سب جانتے ہیں۔ اس سے زائد نہ کسی انکشاف کی صورت تھی اور نہ کسی تفصیل وتشریح کی احتیاج ابیطالب کا وہ خطبہ نکاح جو اوپر نقل ہو چکا ہے ماسوا اس کے کہ زبان عرب کی فصاحت وبلاغت کا بےنظیر وبے مثال نمونہ ہے اور مفاخر ومشارف بنی ہاشم اور اُن کے خاندانی عظمت ووجاہت کے کمالات کا آئینہ اور حقیقتاً حضرت ابی طالب کے یہ اظہار مفاخرت خودنمائی اور

خودثنائی کی غرض سے بےموقع اور ناموزوں نہیں تھے۔ بلکہ مناسبت وقت کے اعتبار سے بالکل مطابق۔ کیونکہ تاریخی مشاہد بتلا رہے ہیں کہ جناب خدیجہؑ کی خواستگاری کے لیے تمام اکابر وعمائد قریش اپنی مرفہ الحالی اور فارغ البالی کے لحاظ سے مدت سے ساعی تھے۔ اُن کی تمنا کے خلاف ابیطالب کے ایسے متوسط الحال شخص کے گھر میں حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا بیاہا جانا اور اُس نسبت پر اُس خاتون ذی اقتدار کا بلا عذر وتامل راضی ہوجانا عموماً حیرت خیز اور تعجب انگیز تھا۔ خصوصاً عمائدین واکابرین قریش کے اُسی طبقہ میں اس کے باعث اور وجہ کی تلاش دامنگیر تھی۔ جو حصول مدعا سے محروم وناکام رہ گئے تھے۔ اس بنا پر حضرت ابیطالبؑ کو یہ بتلا دینا نہایت ضروری تھا کہ مال و دولت کی کثرت حسبی عظمت اور نسبی شرافت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس میں شک نہیں کہ باعتبار قومیت کے تمام قریش یکساں ہیں لیکن تاہم بنی ہاشم کا قبیلہ اپنے اخلاقی وروحانی اوصاف سے اُن میں خاص طور پر ممتاز ہے اور صاحب اعزاز اور اُن کے بھی مفاخر ومشارف خاص طور پر اس تزویج کے اصلی باعث ہوئے ہیں۔ اور انہیں اوصاف مخصوصہ کو حضرت ابیطالبؑ نے نہایت وضاحت سے اپنے خطبہ تزویج میں اُن الفاظ کے ساتھ یاد دلایا ہے۔ **یعلنا حصنة بیته و سواس حرمه و جعل لنا بیتا محجوجاً و حرما امنا و جعلنا الحکام الناس**۔ خدا نے ہم کو اپنے گھر کا محافظ اور اپنے حرم کا نگہبان بنایا اور ہم کو وہ گھر دیا جس کا لوگ حج کرتے ہیں اور اُس کو تمام مخلوق کے لیے جائے امن بنایا اور ہم کو لوگوں پر حاکم بنایا"۔ یہ الفاظ بنی ہاشم کے فضائل وخصائص کو اس اہمیت سے ثابت کررہے ہیں کہ امراُ اور رؤساء قریش کے موجودہ مجمع میں کسی فرد واحد کو عذر وتامل کی مجال نہ ہوئی۔ بلکہ ورقہ بن نوفل نے اپنے خطبہ میں ان تمام مفاخر وخصائص کو معترفانہ طریقہ سے تسلیم کرکے بنی ہاشم کی ترجیح کو تمام قریش کے مقابلہ میں امر مسلمہ اور مسئلہ مصدقہ ثابت کردیا ہے۔ حضرت ابیطالب نے مال ودولت کی ہستی نااستوار اور وجود بےاعتبار کو جن الفاظ میں بیان کیا اُس سے بہتر بیان کے لیے کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنے مالی ضعف کے اعتراف کے ساتھ اپنے خاص سرمایہ سے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا مہر موجل ومعجّل طلائی سکوں میں ادا کردینا اُن کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے اظہار کے ساتھ صاف صاف بتلا رہی ہے کہ فیاض کا دست فیض کبھی نیچے نہیں رہ سکتا۔

ولیمۂ نکاح

تزویج کے متعلق عرب میں قدیم سے ایک خاص اور امتیازی دستور ہے۔ سیرۃ الحلبیہؒ میں خصوصیت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ پہلا ولیمہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے اپنے صرف خاص سے اس تقریب میں تمام قریش کو دیا اُن کی عبارت یہ ہے۔ **وھو اوّل ولیمة اولمھا صلی اللہ علیه وآله وسلم**۔

جناب خدیجہؑ کی طرف سے بھی ولیمہ کا سامان کیا گیا **امرت خدیجة عمھا نیحر ابکرا من بکر انك واطعم الناس و ھلم مع اھلك فاطعم الناس**۔ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا نے اپنے چچا سے کہا کہ آپ اپنے اونٹوں میں سے ایک اونٹ ذبح کریں اور مع اپنے اہل وعیال کے شریک ہوکر تمام لوگوں کو کھانا کھلوائیں۔ چنانچہ تمام لوگوں کو دعوت ولیمہ دی گئی۔

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی دعوت ولیمہ میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کا خوشنما منظر اور اس

تقریب میں جانبین کی قلبی مسرت کا عالم۔ صاحب کتاب منتقی نے ان الفاظ میں دکھلایا ہے۔

و دخل صلی الله علیه وآله وسلم و قال معها فقرء الله تعالیٰ عینه و فرح ابو طالب فرحا شدیدا

جب اس دعوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داخل ہوئے تو تمام حاضرین کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں اور حضرت ابیطالب کو بے حد مسرت حاصل ہوئی۔

واقعہ تزویج میں بھی بعض غلط بیانات داخل ہو گئے ہیں۔شبلی صاحب ان واقعات کی صفحہ 137 میں ان الفاظ کے ساتھ تنقید فرمائی ہیں۔بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے والد زندہ تھے اور اُن کی موجودگی میں نکاح ہوا لیکن وہ شراب میں مخمور تھے۔جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کر برہم ہوئے کہ برابر کا جوڑ نہیں، لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔

امام سہیلی نے بتصریح اور بدلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے والد جنگ فجار سے قبل انتقال کر چکے تھے۔اس کے علاوہ طبقات ابن سعد میں اگرچہ اس روایت کو نقل کیا ہے مگر پھر ان الفاظ میں تردید بھی کر دی ہے۔

فهذا كله عندنا غلط ولثبت عندنا المحفوظ عن اهل العلمات ابا ها خويلد بنت اسد مات قبل الفجار و ان عمها عمر ابن اسد زوجها رسول الله صلعم

یہ تمام واقعات میرے نزدیک بالکل غلط اور محض بے اصل ہیں اور صاحبان علم واطلاع کے محفوظ طریقہ سے جو میرے نزدیک ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے باپ خویلد بن اسد جنگ فجار سے قبل ہی مر چکے تھے اور اُن کے چچا عمر ابن اسد نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کو آنحضرت صلعم کے ساتھ بیاہا تھا۔

اسی طرح بعض کتابوں میں ایک اور غلط واقعہ اس کے متعلق پایا جاتا ہے۔جو شاید شبلی صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔اور اگر گزرا بھی تو آپ نے اُس سے خاص کر چشم پوشی اختیار فرمائی۔وہ غلط واقعہ آنحضرت صلعم کی محفل عقد میں حضرت ابوبکرؓ کی شرکت کا ہے جس کی حقیقت ہم شرح زرقانی سے ذیل میں لکھتے ہیں۔مواہب لدنیہ کے اس اصل فقرہ کی شرح میں کہ حضر ابو طالب و رؤسا مضر فخطب ابو طالب۔زرقانی کے الفاظ شرح یہ ہیں: هذا هو الصواب المذكور فی الروض وغيره و ما فی نسخ ابو بكر رضی الله عنه لا اصل له۔قول صحیح و درست یہی ہے جیسا کہ کتاب روض وغیرہ میں مذکور ہے(ابوطالب اور رئیسان مضر شریک تھے اور ابوطالب نے خطبہ پڑھا) اور کتابوں میں جو حضرت ابوبکرؓ کی شرکت کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ بالکل بے اصل ہے۔

تعمیر خانہ کعبہ

اس وقت تک کعبہ ایک مکعب چار دیواری تھی قد آدم اونچی۔ اوپر سے چھت نہ تھی۔ نہ دروازہ تھا نہ کواڑ۔ اہل عرب اپنے موجودہ تمدن کے مطابق اُس برہنہ دیواروں کی قیمتی پوششوں سے آرائش کیا کرتے تھے۔ اور ہر سال اپنے کمال عقیدت سے سوزن کار ریشمی پردے چڑھایا کرتے تھے۔ ان دیواروں کی سادگی پر بے قاعدگی اُس کی قدامت اور عظمت کی اصل حقیقت کو بتلاتی تھی۔ ایک بار خوشبو دان میں خوشبو سلگ رہی تھی۔ لوگوں کی غفلت سے خانۂ کعبہ کے پردے میں آگ لگ گئی۔ اور وہ مشتعل ہو کر چاروں طرف پھیل گئی۔ چھت ہوتی تو نقصان ہوتا برہنہ دیواروں کو تو کوئی حرج نہیں پہنچا۔ لیکن اوپر سے نیچے تک بالکل سیاہ ہوگئیں بعض روایتوں سے بیت الٰہی کی یہ بدنما سیاہی قریش کے لیے تعمیر کعبہ کی تجدید کا باعث ہوئی۔ مگر عام طور پر محققین نے ایک دوسرے باعث کو اس کی تعمیر کا سبب بتلایا ہے اور وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ نشیب میں واقع تھا۔ شہر کے بالائی حصہ سے ہر سال بکثرت پانی آتا تھا اور عمارت کو نقصان پہنچاتا تھا۔ قریش نے اس کی حفاظت کی یوں تدبیر کی تھی کہ اکثر مقامات میں پانی روکنے کے لیے بڑے بڑے بند باندھ دیے تھے لیکن سیلاب کی کثرت ان بندوں کو بھی توڑ دیتی تھی اور پانی کی روانی کعبہ کی دیواروں کو نقصان پہنچاتی تھی۔ بالآخر قریش نے اس کی از سرِ نو تعمیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔ حسن اتفاق سے ایک جہاز کنارے سے ٹکرا کر بندر جدہ میں تباہ ہوگیا تھا۔ قریش کو اس کی خبر لگ گئی۔ ولید ابن مغیرہ اس موقع کو غنیمت پا کر جدہ پہنچ گیا۔ جہاز تباہ شدہ کی لکڑیاں خرید لیں۔ لکڑیاں بھی مل گئیں اور لکڑیوں کے ساتھ نجار اور معمار بھی مل گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُس جہاز پر باقوم نامی ایک نجار تھا اور وہی اُس جہاز کا معمار تھا۔ جہاز کی تباہی کے باعث وہ بالکل آشفتہ حال اور پریشان روزگار ہو رہا تھا۔ باقوم رومی عیسائی تھا۔ بعض اُس کو قبطی الاصل بھی بتلاتے ہیں۔ ولید سے حقیقت اور ضرورت معلوم کر کے باقوم نے تعمیر کعبہ کا وعدہ کر دیا۔ ولید اُس کو اپنے ہمراہ مکہ میں لایا اور اُسی نے کعبہ کی عمارت کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ زرقانی خانہ کعبہ میں آتش زدگی کے واقعہ کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

روی یعقوب بن سفیان باسناد صحیح عن الزھری ان امراء ۃ اجرۃ الکعبۃ فطارت شرارتہ فی ثیابھا فاحرقتھا۔

یعقوب بن سفیان نے اسناد صحیح کے ساتھ زہری سے روایت کی ہے کہ ایک عورت نے خانہ کعبہ میں خوشبو لگائی اُس کی ایک چنگاری پردے پر پڑ گئی اور پھر تمام جل گیا۔

بقیہ واقعہ تعمیر کے متعلق ابن سعد کے یہ الفاظ ہیں:

کانت الجرف مطلۃ علیٰ مکۃ و کان السیل یدخل من اعلاھا حتے یدخل البیت فانصدع تخا فولان ینھدم و سرق منہ حلیہ و غزال من ذھب کان علیہ در و جوھر و کان موضوعا بالارض فاقبلت سفینۃ فی البحر فیھا روم وراسھم با

قوم و كان باينا فجنيتها الريح الى الشعيبة و كانت مرفاء السفنن قبل جدة فتحطمت السفينة فخرج الوليد بن المغيره فى نفر من قريش الى السفينة فابتاحوا خشبها و كلموا الرومے با قوم فقدم معهم و قالوا بنينا بيت ربنا فامر اوبالحجاوة لجمع و تنقى الضواحى منها فيتبنا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ينقل معهم وهو يومئذا ابن خمس ثلثون سنة ص 93۔ جرمن

شہر مکہ زمین نشیب میں واقع تھا اور بالائی اقطاع زمین سے شہر میں اکثر سیلاب آیا کرتا تھا اور خانہ کعبہ تک پہنچ کر نقصان پہنچایا کرتا تھا۔لوگوں کو انہدام عمارت کا خوف ہوا۔اور نیز اس وجہ سے کہ خانہ کعبہ سے غلاف پردے کی قسم سے کپڑے طلائی ہرنوں کے وہ دونوں مجسمے جن پر موتی اور دیگر جواہرات جڑے تھے۔اور وہ زمین میں مدفون تھے چوری چلے گئے تھے اس اثنا میں رومی نجار کی ایک کشتی آئی۔جس کا رئیس باقوم تھا اور وہی اُس کا معمار بھی تھا۔بادمخالفت نے اُس کشتی کو جدہ سے کچھ دور آ گے لا کر ایک کھاڑے میں ڈال دی اور وہیں وہ تباہ ہو گئے۔یہ خبر پا کر ولید ابن مغیرہ قریش کے اور چند لوگوں کو اپنے ہمراہ لے کر اُس کشتی کے مقام پر پہنچا اور کشتی کی تمام لکڑیاں جمع کر کے خرید کر لیں اور باقوم رومی سے گفتگو کی اور اُس کو اپنے ساتھ مکہ میں لائے اور تعمیر کعبہ پر اُس کو مقرر کیا اور اُس کی ہدایت کے مطابق پتھروں کو مٹی سے صاف کر کے جمع کر لیا۔انھیں پتھر ڈالنے والوں میں جناب رسالت مابؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ساتھ ساتھ پتھر اُٹھاتے تھے۔اُس وقت سن مبارک پینتیس سال کا ہو چکا تھا۔

تعمیر کے سب ضروری اسباب فراہم ہو چکے تو عمارت موجودہ کے گرانے کی ضرورت ہوئی۔خدا کا گھر کون ڈھائے۔سب کے پائے عقیدت میں لغزش تھی۔کوئی اس مقدس عمارت کے انہدام پر نہ ہاتھ اُٹھاتا تھا اور نہ پاؤں بڑھاتا تھا۔سمجھانے والے سمجھاتے تھے کہ یہ گرانا نہیں اُٹھانا اور یہ انہدام عین قیام و استحکام عمارت ہے۔الغرض اس مشکل کو بھی ولید بن مغیرہ نے دور کیا اور سب سے پہلے گرانے کی قصد سے کعبہ کی دیوار پر چڑھ گیا۔تاریخ طبری میں ہے:

فقال وليد ابن مغيرہ انا ابداء كم فى هدمها فأخذ المعول ثم قام عليها و هو يقول اللهم لا ترع اللهم لا نريد الا الخير ثم هدم من ناحية الركنين فتربص الناس به تلك الليلة و قالوا منظر فان احبب لم تهدم منها شيئًا وردونا ها كما كانت و ان لم يصبه شئ فقد رضى الله ما صنعنا هدمنا فاصبح الوليد بن

المغيرة من ليلة غادياً على عمله فهدم والناس معه حتے انتهى الهدم الى الاساس طبری ۱۱۳۵ جرمن

ولید بن مغیرہ نے کہا کہ میں اس کے انہدام کا کام شروع کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ کدال لے کر دیور پر چڑھ گیا اور کہنے لگا اے پروردگار تو غضب میں نہ آ۔ میری نیت سوائے خیر کے کچھ اور نہیں ہے۔ یہ کہہ کر ڈھانا شروع کر دیا۔ اُس دن دونوں رُکن تک کے سروں تک گرا کر کام ختم کر دیا۔ شام ہوگئی۔ تمام اہل مکہ کو رات بھر عجیب بے چینی تھی اور سب کے سب آپس میں کہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ کیونکہ خانہ کعبہ کی کوئی شے آج تک ہٹائی نہیں گئی تھی کہ پھر اپنے مقام پر نہ پہنچا دی گئی ہو۔ اگر رات بھر میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو سمجھا جائے گا کہ خداوند عالم ہمارے اس انہدام کے عمل سے رضامند ہوگیا۔ خدا خدا کر کے وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ صبح کو ولید ابن مغیرہ نے پھر اپنا کام شروع کیا تو اور لوگ بھی اب شریک ہوگئے۔ یہاں تک کہ دیواریں کھد کر بنیادوں تک پہنچ گئیں۔

انہدام کعبہ کے خوف وعذاب کی طرف سے جب قریش کو اطمینان ہوگیا تو تمام قبیلوں نے آپس میں انہدام کا کام شروع کر دیا اور سب نے مل کر اس کو انجام دیا۔ اس کے آغاز کے وقت ابووہب جو رؤسائے شہر اور شرفائے قریش میں ایک مشہور معروف بزرگ تھے۔ اور رشتہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں ہوتے تھے۔ مقامی حاضرین کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ابن ہشام، ابن سعد، طبری اور زرقانی نے اُن کی تقریر ان الفاظ میں قلم بند کی ہے۔

یا معشر قریش لاتدخلوا فی بنیانها من کسبکم الا طیبا الاتدخلوا فیها کهو بغی ولا بیع ربا ولا مظلمة احد۔ ابن هشام۔

اے گروہ قریش بنیاد کعبہ میں وہی شخص داخل ہو۔ جس کے کسب معاش کے طریقے ذریعہ حلال سے ہوں وہ شخص نہ آئیں جس کے ذمہ دین مہر باقی ہو۔ یا جو سود لیتا دیتا ہو۔ یا جس نے کسی پر ظلم کیا ہو۔

اس تحریر وتقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود عام جہالت کے قریش میں خاص احتیاط کرنے والے معدود سے چند حضرات اُس وقت بھی موجود تھے۔ بہر حال بنیادیں کھد کر صاف ہوگئیں۔ خدا کا گھر بننے لگا بڑے بڑے مال دار اور صاحب ثروت واقتدار خدا کے بندے، پہاڑ سے اپنے سروں پر پتھر ڈھوڈھو کر لانے لگے۔ فبینما النبی صلعم یحمل الحجارة من اجبال۔ انہیں لوگوں میں جناب رسول خدا صلعم بھی پہاڑ سے پتھر ڈھوڈھو کر لاتے تھے۔ صحیح بخاری میں اس اضافہ کے ساتھ ہے کہ اس محبت ومشقت کی وجہ سے آپ کے دونوں شانیں چھل گئے تھے۔ یہ حامل الوحی کے خلوص عبودیت کا مقدمہ ہے۔

موجودہ تعمیر میں نو ایجاد و اضافات

سلسلۂ تعمیر اسی طرح جاری رہا۔ عمارت بنتی رہی۔ خدا کے عقیدت مند بندے کمال خلوص وعقیدت سے کام کرتے رہے۔ اُن کے مجموعی خلوص میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن عین وقت پر سامان عمارت کم ہو گیا۔ ان سامانوں میں دیواروں کی ضرورت کی چیزیں گھٹ گئیں۔ جو عرب میں وقت پر ملنی دشوار تھیں۔ چھت کی کڑیاں بھی کم ہو گئیں۔ جو کسی طرح فراہم نہ ہو سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش نے قدیم بنیادوں کے طول وعرض پر اپنی موجودہ تعمیر کا کام آغاز کیا تھا اور موجودہ لکڑیوں سے اُس کے مطابق کافی ہو جانے کا اندازہ لگایا تھا۔ مگر جب دیواریں کھینچ کر ایک حد تک آ گئیں تو اُن کو اپنے غلط اندازہ کی حقیقت معلوم ہوئی۔ ان لوگوں نے طول وعرض میں کوئی اضافہ کیا نہیں تھا۔ لیکن سیلاب کے آ جانے اور نقصان پہنچانے کے حفظ ماتقدم کے خیال سے عمارت کی بلندی میں پہلے سے دو گناہ اضافہ کر دیا تھا۔ بالآخر آپس کی مشاورت سے اس مشکل کو یوں طے کر لیا کہ یہ لکڑی کے موجودہ انداز وتعداد کے موافق تیار شدہ عمارت پر چھت بنالی جائے۔ باقی عمارت زمین پر صرف چار دیواری بنا کر چھوڑ دی جائے۔ سال آیندہ لکڑی فراہم کر کے بنالی جائے گی۔ اسی صلاح پر اتفاق کیا گیا۔ ایک نئی دیوار کھینچ کر بقیہ زمین علیحدہ کر لی گئی۔ صرف چار دیواری کھینچی گئی۔ جو حطیم کے نام سے مشہور ہے اور بقیہ زمین پر خانہ کعبہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔

خانہ کعبہ کی تعمیر ہونے کے حالات کو اس تفصیل کے ساتھ عربی کی تاریخوں میں کسی مؤرخ نے ایسا نہیں لکھا جیسا کہ علامہ عبد الرزاق صاحب ''کتاب اخبار مکہ'' نے۔ ہم اُس کی اصل عبارت ذیل میں درج کرتے ہیں:

فلما اجتمع لھم ما یریدون من الحجارۃ والخشب و ما یحتا جون الیه ھدوا الی ھدمھا فھا بت قریش ھذہ و قالوا من یبدء انھدامه فقال الولید بن المغیرہ انا ابدء کم فی ھدمه انا شیخ کبیر فان اصا بنی امراً کان قددنا اجلی و اجلی و ان کان غیر ذٰلك لم یزید فی فعلا البیت فی یدۃ عتلة لھدمه بھا فصدمت قریش معه بھا فھدمت قریش معه حتے بلغوا لاساس الذی رفع علیه ابراھیم و اسمٰعیل القواعد من البیت فلما اجمعوا اخوجوا من النفقة قلت ما النفقة ان تیلفھم عمارۃ البیت و یترکوا بقیة فی الحجر علیه جداراً مداراً یطوف الناس من ورأہ فقعلوا ذلك و بنوا فی بطن الکعبة اساسا یبنون علیه من بثق الحجر و ترکوا من ورآء من بناء البیت فی الحجر ستته اذرع شبرا فبنوا علیٰ ذلك فلما و ضعوا اید یھم ۓ بناء ھا قالوا ارفعوا بابھا من الارض وا کیسوھا حتیٰ لاتدخلھا السیول

ولا ترقا الایسلم و لا یدخلها الامن اردتم ان کرهتم احداد افعتموہ ففعلوا ذلك ص109۔ اخبار للعبد الرزاق۔

جب پتھر اور لکڑی سب جمع ہو گئے تو قریش نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر سب وہم و وسواس میں گرفتار تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر ڈھادیں گے تو خدا جانے کیا آفت آئے گی۔ ولید بن مغیرہ نے اپنا دل کڑا کیا اور کہا کہ میں ڈھانا شروع کرتا ہوں۔ میں بوڑھا تو ہو ہی گیا ہوں اگر کچھ آفت آئے گی تو کیا۔ میرے مرنے کے دن تو قریب آ ہی چکے ہیں۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ کعبہ کی دیوار پر چڑھا اور کُدال سے ڈھانا شروع کیا۔ پھر سب مل کر ڈھانے لگے اور بنیاد تک جس پر سے حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے چنائی شروع کی تھی کھود کر برابر کر دیا۔ جب سب ڈھا چکے تو معلوم ہوا کہ جو کچھ سامان اُنہوں نے جمع کیا وہ اس سب کے بنانے کو کافی نہیں ہے۔ آخر کار سب نے مل کر مشورہ کیا اور اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ بنیاد تعمیر گھٹا دی جائے اور جس قدر امکان اور سامان کے مطابق ہو اُس قدر عمارت بنائی جائے اور بقیہ بنیاد چھوڑ دی جائے اور اُس پر صرف چار دیواری کھینچ دی جائے۔ لوگ پشت سے اُس کا طواف بجالایا کریں۔ اس مجبوری کی وجہ سے اُن کو اصل عمارت کے اندر سے ایک نئی دیوار بنانی پڑی۔ اور یہی دیوار عمارت مجوزہ کی آخری دیوار قرار پائی۔ جس قدر کہ اصل کعبہ سے زمین (حطیم) علیحدہ کردی گئی وہ چھ گز اور چھ بالشت۔ ان لوگوں نے کعبہ کو چار گز اور ایک بالشت کی کرسی دی اور اس قدر اونچی کرسی پر دروازہ رکھا تا کہ سیلاب کا پانی پھر اندر نہ گھسے اور کوئی شخص بغیر سیڑھی کے نہ چڑھ سکے اور اس ترکیب سے جس کو چاہیں نہ جانے دیں۔

حضرت محمد الامین صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم

الغرض خانہ کعبہ کی موجودہ عمارت طول میں گھٹا کر اور ارتفاع میں بڑھا کر تکمیل کے قریب پہنچ گئی۔ اور حجر الاسود کے نصب کا وقت آ گیا تو اس قدیم اور قابل التعظیم پتھر کو اس کے مقام پر رکھنے کے لیے قریش میں چشم کیں چلنے لگیں ہر شخص اس شرف یابی کے لیے خواہش مند اور اس اعزاز کے حصول کے لیے آپس کا اصرار بڑھتے بڑھتے پہلے تکرار پھر جنگ و پیکار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ قریشیوں میں سب سے زیادہ قبیلہ عبدالدار کشت وخون پر تیار ہو گیا۔ طبری میں اس کی حسب ذیل تفصیل لکھی ہے:

حتی اذا بلغ البنیان موضع الرکن اختصموا فیه کل قبیلة ترید ان ترفعه الی موضعه دون الاخری حتے تجاوزوا و تخالفوا و قواعد و اللقتال فقربت بنو عبد الدار جفنة مملوة دما ثم تعاقدوا هم و بنو عدی ابن کعب علے الموت و ادخلوا ایدیهم فی ذلك الدم فی الجفنة

یعنی جب حجر الاسود کو اپنے مقام پر نصب کرنے کا وقت آ گیا تو ہر شخص کی خواہش ہوئی کہ میں اس کو اس کے مقام پر رکھوں۔ اس بنا پر سب کے سب آپس میں حد تحمل سے تجاوز کر گئے۔ اور قسم کھا کھا کر جنگ و جدال کے لیے مستعد ہو گئے۔ بنی عبدالدار تو یہاں تک پر جوش ہو گئے جیسا کہ عرب میں سخت سے سخت قسمیں کھانے کا دستور تھا کہ انہوں نے خون تازہ سے ایک پیالہ بھر لیا اور دستور جہالت کے مطابق اپنے اور بنی عدی بن کعب کے قبیلہ والوں کے ہاتھ اُس خون سے بھرے ہوئے پیالے میں ڈلوائے۔ گویا کہ کُشت وخون پر نہایت استقلال سے اپنی آمادگی کا اعلان کیا۔

خیریت تھی کہ قریش کے تمام قبیلہ نہ اتنے پر جوش تھے اور اتنے برسر پرخاش۔ لیکن تاہم اُن کی انانیت اور مخالفت کیا کم تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کامل چار دن گزر گئے اور وہ اپنی ذاتی مشاورت سے اس امر کا تصفیہ نہ کر سکے۔ خدا کے بندے خدا کا گھر تو بناتے تھے لیکن اپنا گھر بگاڑ رہے تھے۔ حقیقی بندہ پرور کو یہ کب منظور ہوسکتا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنے نظام کبریائی کی خاموش تدبیر سے ایک ایسی تدبیر نکال دی کہ اُس کا گھر بھی بنے گا اور قریش کی بات بھی بن گئی۔ ولید ابن مغیرہ نے اُن کو یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ اس امر کو قدرت کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔ ذاتی انتخاب و تعین موقوف کیا جائے۔ جو شخص کل صبح کو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو وہی اس منصب جلیل کو انجام دے۔ خدا کو بات بنانی تھی۔ سب لوگوں نے یہ شرط مان لی جس اشتیاق و اضطراب میں قریش نے یہ رات کاٹی ہو گی۔ واقعہ کی اہمیت بتلا رہی ہے۔ خدا کی قدرت کی کس کو خبر۔ اُس کی مشیت کا کس کو علم صبح کو خدا کے گھر میں جو شخص سب سے پہلے داخل ہوا وہ قریشیوں کا الامین تھا اور رسول رب العلمین۔ عرب جس قدر جہالت میں پکے تھے اُس قدر قول و قرار میں سچے۔ اوّل تو نقص اقرار اور خلاف معاہدہ ہونے

کی وجہ سے اب ان کو تامل کی کوئی وجہ باقی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اس عہدہ جلیلہ کی نسبت جناب رسول خداؐ کی ہر طریقہ وعنوان سے موزونیت اور صلاحیت اُن کے تامل وعذر کے لیے کوئی شوشہ پیدا نہیں کر سکتی تھی اس لیے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی ہر شخص کی زبان سے اہلاً وسہلاً کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ابن ہشام نے ذیل کی عبارت میں اس کی تفصیل کی ہے:

اجتمعوا فی المسجد و تشاوروا و ثنا صفوا فن عم بعض اهل الروایة ان ابا امیه ابن المغیرہ و کان یومئذ اسن قریش کلها فقال یا معشر قریش اجعلوا بینکم فیما تختلفون فیه اوّل من یدخل من باب هذا المسجد یقضی بینکم فیه ففعلوا فکان اوّل من دخل رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فلما راؤہ و قالوا هذا الامین رضینا هذا محمد صلعم ص67 مطبوعه مصر

انہیں امور کے تصفیہ میں قریش کو چار یا پانچ راتیں گزر گئیں۔ آخر کار سب مسجد میں جمع ہوئے اور اس امر کے تصفیہ کی نسبت مشاورت کرنے لگے۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ آیا امیہ (ولید) بن مغیرہ جو قریش میں اُس وقت سب سے زیادہ معمر تھا کہنے لگا کہ اے قریش تم لوگ ان باتوں کا یوں تصفیہ کر لو کہ کل صبح کو جو شخص اس مسجد کے دروازے سے پہلے داخل ہو وہی اس خدمت کو انجام دے۔ سب نے اسی پر اتفاق کر لیا صبح کو سب سے پہلے جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ وہ جناب رسول خداؐ تھے جب لوگوں نے آپ کو دیکھا تو چلا اُٹھے یہ تو ہمارے امین ہیں یہ تو محمدؐ (صلعم) ہیں ہم لوگ انہیں پر راضی ہیں۔

قریش تو راضی ہو گئے مگر امین الٰہی کی عدالت تنہا اپنی شرف یابی اور امیدواری کی محرومی پر راضی نہ ہو سکی۔ اس خلق مجسم نے اُن کے شرف یاب ومثاب ہونے کی نہایت آسان اور سہل ترکیب نکال لی۔ اپنی ردائے مبارک بچھا دی۔ سنگ اسود کو اُس میں رکھ کر قریش کے قبائل اربعہ کے چار ممتاز ترین اشخاص کو بلایا۔ اور ردائے مبارک کا ایک ایک گوشہ اُن کے ہاتھوں میں دے دیا اور اس طرح اس ردا کو اُٹھا کر حجر الاسود کے مقام پر لے آئے۔ یہ لوگ اُس ردا کو اُٹھائے رہے آپ نے دست مبارک سے حجر الاسود کو اُس کے مقام پر نصب کر دیا۔ ابن ہشام ان الفاظ میں اس واقعہ کو لکھتے ہیں۔

قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم هلم اتی ثوبا فاتی به فاخذ الرکن فوضعه فیه بیدہ ثم قال لتاخذ کل قبیلة بنا حیة من الثوب ثم ارفعواه جمیعا ففعلوا حتی بلغوا به موضعه و ضعه هو بیدہ ثم بنی علیه ص 67

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ سب لائے آپ نے اپنے دست

مبارک سے حجرالاسود کواُس میں رکھا پھر فرمایا ہرقبیلہ اس کپڑے کے گوشہ کو پکڑ لے اوراونچا کرے۔سب نے ایسا ہی کیا۔حتیٰ کہ اُس کو اصلی مقام تک لے آئے۔تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مطہر سے اُس کو اُٹھا کر نصب کر دیا۔

حقیقتاً یہ ذات رسالت کی برکت تھی۔جس نے اس آسانی اورسہولت سے قریش کی مخاصمت کو رفع دفع کر دیا نہیں تو آپس کے کشت وخون سے خانہ کعبہ نہا دیا ہوتا۔اور پانی کی جگہ خون کا سیلاب حرم محترم میں چاروں طرف آجاتا۔ظاہر میں تو عمارت کی ابتدائے تعمیر کا یہ پتھر نصب کیا گیا تھا۔لیکن حقیقت میں خانۂ خدا کی تکمیل عظمت کا یہ سنگ آخری تھا جو متمم رسالت اور خاتم نبوت کے دست مطہر سے اس وقت رکھا گیا۔مولانا شبلی صاحب نے بھی اس خصوصیت کی نسبت اشارہ فرمایا ہے۔سیرۃ النبی صفحہ 134 کے زیر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں ''یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے۔جس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ میں نبوت کی عمارت کا آخری پھرا ہوں''۔لیکن میرے نزدیک یہ صرف تلمیح نہیں ہے بلکہ اس واقعہ کی تصریح اور کرشمۂ قدرت کی کامل توجیہہ۔

رسالت کی برکت سے قریش کی جہالت کا ایک بہت بڑا فساد عظیم جوایک دن برپا ہونے والا تھا رک گیا اور وہ نزاع باہمی سے علیحدہ ہو کر بڑی سرگرمی سے عمارت کی تکمیل پر متفق ہو گئے۔اور پھر جب تک کہ اس کی عمارت کا کام ختم نہ ہو گیا۔اُن میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہوا۔یہ رسالت کے فیصلہ کامل کا اثر تھا۔

بالآخر۔عمارت کعبہ بن گئی۔مگر کیسی بنی؟ عمارت ابراہیمی سے طول وارفاع میں جو کچھ فرق پیدا ہوا تھا۔اُس کو ہم اوپر بتلا آئے ہیں۔اوراختلافات جو واقع ہوئے۔اُن کو ہم اخبار مکہ کی اصلی عبارت سے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

فبنوا حتے ارفعوا اربعة اذرع و شبر ثم کیسوا ھا و وضعوا با بھا مرتفعا علی ھذہ الزرع فقال لھم یاقوم الروعی اتحبون ان تجعلون اسقفھا مکبسا اومسطحا فقالوا ابن بیت ربنا مسطحا قال فبنوہ مسطحا و جعلوا ست دعائم فی صفین فی کل صف ثلاث دعائم و اجعلوا ارتفاعھا من خارجھا من الارض اتی اعلاھا ثمانیة عشر ذراعھا و کانت قبل ذلك تسعه اذرع فزادت قریش ارتفاعھا فی السمآء تسعه ذرع اخزو جعلوا میزا بھا سمکت فی الحجر و جعلوا درجة من خشب فی بطنھا فی الرکن الشامی یصعد منھا الی ظھوھا ص 110۔

جب یہ تنازع رفع ہو گیا تو تعمیر شروع ہوئی۔جتنا کہ کعبہ پہلے زمین سے اونچا تھا۔قریش نے اُس سے دوگناہ بلند کیا یعنی زمین سے اٹھارہ گز اونچا اور پہلے صرف نو ہی گز تھا۔جب دیواریں بن چکیں تو باقوم نے

پوچھا کہ اس کی چھت کیسی بنائے جائے۔ بنگلہ نما یا چورس۔ سب نے کہا کہ ہمارے خدا کے گھر کی چھت چورس بناؤ۔ تب باقوم نے اُس کی غرض سے چھ ستون دو قطار میں اس غرض سے بنائے کہ ہر قطار میں تین ستون پڑ گئے۔ اور اُن پر چورس چھت بنا دی۔ (غالباً اس قدر لمبی لکڑی نہیں تھی کہ پورا شہتیر پڑ جاتا اس سبب سے بیچ میں ستون بنانے کی ضرورت ہوئی) اور شائد اس وجہ سے باقوم نے بنگلہ نما چھت بنانی چاہی ہوگی۔ تاکہ قینچی پڑ جائے اور بیچ میں ستون بنانے نہ پڑیں۔ چھت کا پرنالہ اُس جگہ میں ڈالا جو چھوڑ دی گئی تھی۔ (حطیم) میں اور کعبہ کے اندر ایک کاٹھ کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشن دان رکھا جس سے کعبہ کے اندر اُجالا بھی رہے اور اس میں سب جب ضرورت ہو کعبہ کی چھت پر چڑھ جائیں۔

ترجمہ منقول از خطاب سرسید احمد خان صفحہ 529۔

مفصلۂ ذیل تفصیل سے قدیم اور موجودہ پیائش پورے طور سے معلوم ہوجائے گی۔

حضرت ابراہیمؑ کی عمارتِ کعبہ کی تفصیل

بلندی: زمین سے چھت تک ۹ گز　　طول: حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز

عرض: رُکن شامی سے رکن غربی تک ۲۲ گز　　طول: رُکن غربی سے رُکن یمانی تک ۳۱ گز

عرض: رُکن اسود سے رکن یمانی تک ۲۰ گز

افسوس ہے کہ شبلی صاحب نے سیرۃ النبیؐ جلد اوّل ص 112 میں علامہ ارزقی کی تحریر سے عمارت ابراہیمیؑ کی جو پیائش لکھی ہے۔ وہ صرف ایک ہی جانب کے طول وعرض کی تصریح لکھ کر ختم کر دی گئی ہے۔ بقیہ دو طرف کی پیائش کو یہ خیال کر کے پڑھنے والے دو طرف کی پیائش کو بحساب مساوی خود سمجھ لیں گے نہیں لکھا ہے۔ آپ کی اس کوتاہ قلمی سے بہت بڑی غلط فہمی کی بنا ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص اس حساب پیائش سے عمات کعبہ کو مربع سمجھے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کعبہ کی عمارت ایک شکل مکعب ہے نہ مربع اور اسی رعایت سے اس عمارت مقدسہ کا نام کعبہ رکھا گیا۔ تعجب ہے کہ شبلی صاحب نے علامہ ارزقی کی جس عبارت سے اس پیائش کو لکھا ہے اُس کو پورا پڑھ بھی نہیں لیا۔ جس میں دونوں طرف کی پیائش میں اختلاف صاف صاف درج ہیں۔ اور جس کو ہم نے اوپر کا نقشہ کھینچ کر پوری تفصیل سے دکھلا دیا ہے۔ شبلی صاحب کے ایسے محقق کی یہ کوتاہ قلمی کہی جائے یا عجلت رقمی۔ سرسید نے شبلی صاحب سے زیادہ صحیح اور صاف طور پر دونوں عمارتوں کا اختلاف پیائش دکھلایا ہے۔ حالانکہ ماخذ دونوں کا وہی علامہ ازرقی کی کتاب تاریخ اخبار مکہ ہے۔

تمت بالخیر

❁❁❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁❁❁